برنیئر کا سفرنامہ ہند

شاہ جہاں' اورنگ زیب کے عہدِ حکومت کا
انتہائی دل چسپ اور حوالہ جاتی سفرنامہ

ڈاکٹر فرانسس برنیئر
ترجمہ و حواشی: خلیفہ محمد حسین

برنیئر کا سفر نامۂ ہند

بعہد شاہ جہان و اورنگ زیب عالمگیر

مصنف : ڈاکٹر فرانس برنیئر

ترجمہ و حواشی : خلیفہ سید محمد حسین

تخلیقات

علی پلازہ- 3 مزنگ روڈ لاہور' فون : 7238014

ناشر تخلیقات' لاہور
اہتمام لیاقت علی
ٹائیٹل ریاظ
کمپوزنگ بلھے شاہ کمپوزنگ سینٹر' لاہور
پرنٹرز اُجالا پرنٹرز' لاہور
سن اشاعت جون 2000ء
قیمت

فہرست

عرضِ ناشر

اس سفرنامے کا پہلا اردو ترجمہ کرنل ہنری مور نے 1875ء میں کیا تھا پھر بہ مشاورت کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب اسے خلیفہ سید محمد حسین کو بھیجا گیا۔ انہوں نے اس کا ازسرِ نو ترجمہ کیا اور کرنل ہالرائیڈ ہی کی خواہش پر خلیفہ سید محمد حسن نے اس پر نظرِ ثانی کی۔

اس اشاعت میں مندرجہ ذیل تحریریں حذف کر دی گئی ہیں :

کرنل ہنری مور کا انگریزی دیباچہ اور اس کا اردو ترجمہ اور منشی احمد الدین مراد آبادی کا دیباچہ کرنل مور کے اردو ترجمہ پر۔

یہ ترجمہ جب شائع ہوا تو برِعظیم پاک و ہند برطانوی نو آبادی تھا۔ بہت سے حواشی میں فاضل مترجم نے برطانوی عہدِ حکومت کے حوالے سے معلومات تحریر کی تھیں جو آج اس سفرنامے کے تناظر میں بے معنی ہیں۔ اس لئے اس اشاعت میں انہیں حذف کر دیا گیا ہے۔

برنیئر عیسائی تھا۔ دو مقامات پر اسلام کے بارے میں اس کے سوقیانہ ریمارکس جو فاضل مترجم نے "نقلِ کفر کفر نہ باشد" لکھ کر ترجمہ کر دیئے تھے، بھی اس اشاعت میں شامل نہیں کئے گئے۔

پروف ریڈنگ کی اغلاط کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ نیز بعض غیر مانوس الفاظ کو مانوس الفاظ میں بدل دیا گیا ہے۔ مثلاً

فرنگستان	یورپ
فرنگستانی/فرنگی	یورپی

ولایت	ملک
بید	وید
برانڈوں	برآمدوں
جانشینِ سابق	پیشرو
پیکن	بخشش

ڈاکٹر برنیئر کے سفر نامہ میں کچھ حالات اور واقعات کے بارے میں معلومات لاعلمی یا غلط فہمی کی بناء پر درست درج نہ تھیں۔ مترجم خلیفہ محمد حسین نے ان کے بارے میں معتبر کتب تواریخ اور دیگر دستیاب درست ذرائع سے وقیع حواشی تحریر کیے ہیں جو کتاب کے آخر میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ ایسے ہی دو حواشی جو مغل عہد اور ہندوستان کی تاریخ کے اہم کردار میر جملہ کی مہم آسام کے متعلق اور پرتگالیوں کی ہندوستان آمد اور ان کے کردار کے بارے میں ہیں عہدِ اورنگ زیب کے تذکرہ کے بعد ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

کتاب کو شائع کرنے اور ترتیب دینے میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا گیا ہے تاہم انسانی کوشش میں غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ اگر کوئی غلطی آپ کی نظر سے گزرے تو براہ کرم ادارہ کو مطلع کریں تاکہ کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی جائے۔

لیاقت علی

پیش لفظ

سفر نامہ لکھنے کا رواج زمانہ قدیم سے ہے۔ ہومر (Homer) کے اوڈیسی سے لے کر اب تک ہر زبان میں ان گنت سفر نامے لکھے جا چکے ہیں۔ مغربی سیاحوں میں مارکوپولو (1324-1254ء) اور عرب سیاحوں میں ابن بطوطہ (1368-1304ء) نے غیر معمولی شہرت پائی ہے۔

مسلم ہندوستان میں دنیا کے مختلف حصوں سے سیاح آئے اور انہوں نے اپنی تحریروں میں یہاں کے بارے میں بڑا متنوع اور دلچسپ مواد مہیا کیا ہے۔ ان کی اہمیت اس لحاظ سے اہم ہے کہ وہ عہدِ وسطیٰ کی سیاسی' معاشی اور معاشرتی زندگی کو اجاگر کرتے ہیں جس سے اس عہد کی تاریخیں عموماً خالی ہیں۔

یہاں آنے والے یورپی سیاحوں میں فرانسس برنیئر غالباً سب سے زیادہ عالم اور ذہین شخص تھا۔ وہ ایک فلسفی اور سیاح کی حیثیت سے ممتاز تھا۔ 1630ء کے لگ بھگ وہ فرانس میں انجیرز کے مقام پر پیدا ہوا۔ 1652ء میں اس نے ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری حاصل کی۔ تکمیل تعلیم کے بعد 1654ء میں وہ شام' مصر' فلسطین وغیرہ کے سفر پر گیا۔ ایک سال سے زائد قاہرہ میں مقیم رہا جہاں وہ طاعون سے بیمار ہوا۔ وہاں سے 1658ء کے اواخر میں سورت پہنچا اور تقریباً بارہ برس برعظیم پاک و ہند میں رہا۔ چھ دن دارا شکوہ کے ساتھ اور پھر اورنگ زیب کے مشہور امیر دانشمند خان سے وابستہ ہو گیا۔ یہاں سے براہِ ایران وہ اپنے وطن کو واپس گیا۔ 1670-1671ء میں اس کا سفر نامہ ہند فرانسیسی زبان میں پیرس سے شائع ہوا اور اسی زمانہ میں اس کا انگریزی ترجمہ لندن سے شائع ہوا۔

وہ جب برعظیم پاک و ہند پہنچا تو شاہ جہان کے بیٹوں میں جنگ تخت نشینی آخری مراحل میں تھی۔ اس نے سفر نامے کا آغاز اس جنگ کے بیان سے کیا ہے جو نہایت مفصل ہے۔ باقی سفر نامہ شاہی دربار کے حالات' آگرہ اور دہلی کے شہروں اور کشمیر اور بنگال کے صوبوں' شاہی فوج' سلطنت کے نظم و نسق' معاشی حالات اور ہندوؤں کے رسوم و عقائد کے بیان پر مشتمل ہے۔

اس نے بعض مقامات پر ٹھوکر کھائی ہے۔ شاہ جہان کے ذاتی کردار کے حوالے

سے جو کچھ اس نے تحریر کیا ہے وہ لائقِ اعتنا نہیں۔ منوچی نے بھی اس کی تردید کی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس نے بعض چیزوں کا سطحی طور پر مشاہدہ کیا اور سنی سنائی باتوں کو سچ جان لیا۔ اس کے باوجود اس کا سفر نامہ عہدِ شاہ جہان اور عہدِ اورنگ زیب کا ایک اہم ماخذ سمجھا جاتا ہے جس میں تاریخ کے طلباء اور عام قارئین سبھی کے لئے دلچسپی کا سامان موجود ہے۔

اس سفر نامہ کے اردو مترجم خلیفہ سید محمد حسین کے اجداد پٹیالہ سے اٹھارہ میل دور قدیم اور معروف قصبہ سامانہ میں آباد ہوئے۔ آپ کے دادا حکیم سید غلام حسن اپنے عہد کے نامور طبیب ہو گزرے ہیں۔ آپ کے والد حکیم سید سعادت علی عرصہ دراز تک مہاراجہ کرم سنگھ والی پٹیالہ کے ہاں طبیب شاہی کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ان کی قابلیت کے پیشِ نظر مہاراجہ نے انہیں ولی عہد نرندر سنگھ کا اتالیق بھی مقرر کیا۔ اس نسبت سے ان کا خاندان خلیفہ کے لقب سے مشہور ہوا۔ خلیفہ سے مراد اتالیق کا بیٹا ہے۔

خلیفہ سید محمد حسین ایک عالم اور نہایت باوقار اور سنجیدہ بزرگ تھے۔ آپ 1867ء سے 1874ء تک ریاست میں عہدۂ وکالت اور بعد ازاں میر منشی کے عہدہ پر فائز رہے۔ آپ نے نہایت وفاداری اور تدبّر کے ساتھ ریاست کی خدمات سرانجام دیں جس کے صلہ میں آپ کو انعامات اور جاگیریں ملیں۔ انگریزوں نے بھی آپ کی ممتاز حیثیت' قابلیت اور کارکردگی کے اعتراف میں ''مشیر الدولہ'' ''ممتاز الملک'' اور ''خان بہادر'' کے خطابات دیئے۔ آپ کو پنجاب کی پہلی مجلس آئین ساز کا رُکن منتخب کیا گیا۔

آپ اور آپ کے بڑے بھائی خلیفہ سید محمد حسن علی گڑھ تحریک کے معاون اور علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی تھے۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی میں بھی بہت سے وظائف اور تمغے جاری کئے جو اب تک جاری ہیں۔ آپ کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے معاملات سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اس کے انیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ علی گڑھ کے آپ صدر منتخب ہوئے۔ کبر سنی کے باوجود دُور دراز مقامات پر منعقدہ اجلاسوں میں شریک ہوتے اس ضمن میں آپ 1906ء میں ڈھاکہ اور 1907ء میں کراچی بھی گئے۔

آپ کو تصنیف و تالیف کا شوق بھی تھا۔ ترجمہ سفر نامہ برنیئر آپ کی واحد یادگار ہے۔

آپ کا انتقال 1908ء میں ہوا۔

ریاض احمد

لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

یہ کتاب جس حالت اور حیثیت میں میرے پاس پہنچی تھی وہ میرے معزز دوست جناب کرنل ہنری مور صاحب بہادر نے اپنے "انٹروڈکشن" میں مشروحاً لکھ دی ہے۔ اور اس دیباچہ سے جو کرنل صاحب موصوف کے مددکار ترجمہ منشی احمد الدین صاحب مرادآبادی نے اس کے پہلے ترجمہ کے لئے لکھا تھا۔ اور اب کرنل صاحب اور منشی صاحب کی خواہش کے موافق بیادگار اس تعلق کے اس کتاب میں لگایا گیا ہے کسی قدر معلوم ہو سکتا ہے کہ سابقہ ترجمہ کی طرز عبارت وغیرہ اور طور کی تھی اور یہ ترجمہ جو از سر نو کیا گیا ہے اور طرح پر ہے۔ کرنل صاحب نے اس کتاب کے بعض مضامین کا ترجمہ بھی نہیں کیا تھا کیونکہ مقصود خاص زیادہ تر انہی مطالب کے ترجمہ سے تھا جو سلطنت مغلیہ سے کچھ علاقہ رکھتے تھے لیکن میرا خیال یہ تھا کہ جو مطالب ہندوستان سے متعلق ہیں وہ سب ترجمہ ہو جائیں۔ اس لئے ایسا ہی کیا گیا۔ البتہ ڈاکٹر برنیئر کی ایک چٹھی کا جو اس نے شیراز سے اپنے ایک دوست کو لکھی تھی ترجمہ نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اس میں صرف مسئلہ جزلایتجزیٰ کی فلسفیانہ اور عام بحث ہے جس کو ہندوستان سے کوئی خصوصیت نہ تھی اور چونکہ نفس کتاب میں بعض مطالب قابل تصحیح تھے۔ یا روایات مسلمہ و مشہورہ عام کے برخلاف معلوم ہونے کی جہت سے مصنف کا بیان توثیق طلب تھا یا ناظرین کی مزید واقفیت اور بصیرت کے لئے کسی تشریح و تفصیل کی احتیاج تھی یا مقابلہ کے لئے موجودہ زمانہ کی بعض حالتوں کا دیکھنا مفید تھا اس لئے معتبر کتابوں اور صحیح ماخذوں سے جہاں کہیں موقع تھا حاشیوں کا لکھنا مناسب سمجھا اور چونکہ زمانہ حال کے یوروپین مصنفوں کے دستور کے موافق فقروں کے شروع میں مضمون کا خلاصہ اصل کتاب میں نہ تھا، نہ فہرست مطالب تھی جس سے کسی مضمون کی تلاش اور حوالہ دینے میں بڑی

وقت تھی لہٰذا اس کو بھی رفع کیا گیا۔ اور نظم وترتیب کے لحاظ سے کچھ ایسے تغیرات بھی کئے گئے کہ بعض مضامین کو ایک جلد سے دوسری جلد میں منتقل کیا گیا۔ اگرچہ ان امور کے باعث خصوصاً حاشیوں کے التزام سے محنت بہت ہی بڑھ گئی مگر الحمد للہ کہ یہ کام جناب اخ معظم وزیر الدولہ مدبّر الملک خلیفہ سید محمد حسن خان صاحب بہادر وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کی اعانت سے باوجودیکہ مجھے اپنے منصبی کاموں سے فرصت کم تھی انجام کو پہنچ گیا اور یہ دلچسپ کتاب جس کو اس وقت کی طرزِ حکومت اور حالتِ ملک کی ایک صحیح اور بے نظیر تصویر کہنا چاہئے نہ صرف ترجمہ بلکہ ایک طور کی تالیف کی صورت میں چھپ کر تیار ہوگئی۔ اس کی جلد ثانی اخیر ۱۸۸۸ء عیسوی میں تیار ہوگئی تھی مگر افسوس ہے کہ جلد اول کے کام میں بسبب کم فرصتی اور حاشیوں کے التزام کے خلاف توقع ایسی تاخیر ہوئی کہ اس وقت سے پہلے تیار نہ ہوسکی، اس لئے بعد تکمیل اب دونوں جلدیں ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں۔

دعا ہے کہ میرے اہلِ وطن اور ہندوستانی والیان ملک عموماً جن کے لئے یہ کتاب گویا سرمایۂ بصیرت ہے اس کے مطالعہ سے فائدہ پائیں۔ اور خصوصاً بندگان حضور فیض گنجور ولی نعمی ہز ہائنس فرزند خاص دولت انگلشیہ منصور زمان امیر الامراء مہاراجہ دھراج راجیشر سری مہاراجہ راجگان راجہ مندر مہندر بہادر فرمانروائے ریاست پٹیالہ دام اقبالہم کی نظرِ اشرف سے گزرے جن کے خوان نعمت سے میں نے اور میرے بزرگوں نے پرورش پائی ہے۔ اور جن کی قدیمی رعایا اور نمک خوار ہونے کا مجھے افتخار حاصل ہے۔ اور حضور ممدوح الشان اس کی مؤرخانہ اور دلچسپ حکایات اور حکیمانہ اور عبرت خیز بیانات کے ملاحظہ سے محظوظ اور متمتع ہوں۔

خاتمہ پر ناظرین اہل زبان کی خدمت میں التماس ہے کہ چونکہ خاکسار نہ لکھنؤ کا رہنے والا ہے اور نہ دہلی کا۔ بلکہ پٹیالہ اور سامانہ میرا اور میرے بزرگوں کا مولد و مسکن ہے، جہاں زبان اردو صحیح طور سے بولی نہیں جاتی۔ پس اگر کسی محاورہ میں کوئی غلطی معلوم ہو تو معذور تصور فرمائیں۔

والعذر عندکرام الناس مقبول

بندۂ خاکسار

سید محمد حسین

پروفیسر خلیق احمد نظامی

سترھویں صدی کے ایک فرانسیسی سیاح کے تاثرات

سترھویں صدی میں یورپ کے مختلف ممالک پرتگال ہالینڈ فرانس جرمنی اٹلی اور انگلستان سے کثیر تعداد میں سیاح ہندوستان آئے اور اپنے تاثرات کو سفرناموں خطوط یادداشتوں یا عرضداشتوں کی شکل میں قلمبند کیا۔ اس سلسلہ میں J.B Taverhi-er, F.Baretto, George Andries.W:ilim Finch, Manriam, Thomas Roe وغیرہم کے سفرنامے ہماری تاریخ کے بیش بہا ماخذ ہیں اور ان سے سیاسی اور سماجی زندگی کے کتنے ہی تاریک گوشے روشن ہو گئے ہیں۔ لیکن اس دور کے کسی سیاح نے ہندوستان کے حالات کا اتنا تفصیلی اور گہرا جائزہ نہیں لیا جتنا کہ مشہور فرانسیسی سیاح برنیئر (Bernier)(1) نے لیا تھا۔ وہ تقریباً چودہ سال تک یہاں رہا اور کشمیر سے لے کر گولکنڈہ اور سورت سے لے کر قاسم بازار تک ہر ہر جگہ گھوما۔ کبھی لال قلعہ سے ملک کے سیاسی اور سماجی حالات کا جائزہ لیا، کبھی بنگال کے تجارتی مرکزوں میں بیٹھ کر ہندوستان کی اقتصادی حالت پر نظر ڈالی۔ یہاں کی گرمی سے گھبرایا تو دوستوں کو لکھا:

''سارا بدن چھوٹے چھوٹے سرخ گرمی دانوں سے بھر گیا ہے جو سوئی کی طرح چبھتے ہیں۔ گرمی کا یہ عالم ہے کہ سیاہی قلم کی نوک پر خشک ہوئی جاتی ہے اور قلم ہاتھ سے گرا جاتا ہے''۔

جب کشمیر کے دلفریب مناظر میں پہنچا تو بے اختیار پکار اٹھا: ''کشمیر پر فریفتہ ہو گیا ہوں اس کی خوبصورتی میرے تخیلات اور تصورات سے بالاتر ہے۔ دنیا کا کوئی حصہ اس کی

(1) صحیح فرانسیسی تلفظ ''برنئے'' ہے لیکن برصغیر میں عام طور پر برنیئر ہی بولا جاتا ہے۔

خوبیوں کو نہیں پہنچتا"۔ جب پہلے پہل دہلی میں شہنائیاں' نفیریاں اور نقارے بجتے سنے تو کہنے لگا: "اس شور سے تو کان بہرے ہوئے جاتے ہیں"۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد ان سے اتنا مانوس ہو گیا کہ لکھا: "رات کو جب اپنے مکان کی چھت پر لیٹ کر اس کی آواز سنتا ہوں تو بہت بھلی اور سریلی معلوم ہوتی ہے"۔

ہندوستان کو قریب سے دیکھنے اور اس کو سمجھنے کا جذبہ برنیئر کو جگہ جگہ لے گیا۔ امراء کی مجلسوں میں پہنچا' نان بائیوں کی دکانوں پر بیٹھا' سورج گرہن کے میلوں میں شریک ہوا' جوگیوں اور فقیروں سے باتیں کیں' بنارس میں پنڈتوں سے ملا' پیر پنجال میں درویشوں سے ملاقات کی' لشکریوں کے حالات کی ٹوہ لگائی' ایک عورت کو ستی ہوتے ہوئے دیکھنے کے لئے دوپہر میں بھاگا بھاگا پھرا' ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھنے کی جستجو ہوئی تو خود اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیا' جغرافیائی حالات کی تحقیق کا خیال پیدا ہوا تو کشمیر کے چشموں تک جا پہنچا۔ غرض سیاسی' سماجی اور اقتصادی زندگی سے متعلق چھوٹی سے چھوٹی کوئی چیز ایسی نہ تھی جس پر اس کی نظر نہ گئی ہو۔ خود لکھتا ہے کہ میں نے پلوٹارک کے اس قول پر عمل کیا ہے کہ جزوی اور معمولی باتوں کو معلوم کرنا اور لکھنا چاہئے کیونکہ اس سے ایک قوم کے ذہن اور اس کی عادت کے متعلق رائے قائم کرنے میں بڑی بڑی باتوں کی نسبت کہیں زیادہ مدد ملتی ہے۔

برنیئر ۱۶۲۰ء میں فرانس کے شہر انجور کے ایک کاشتکار گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ ابتداء ہی سے اس کو علم حاصل کرنے اور دنیا کے مختلف ملکوں کو دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے ۱۶۴۷ء میں جرمنی' پولینڈ' سوئٹزر لینڈ اور اٹلی کی سیر کی اور ان ملکوں کی سیاسی اور سماجی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا۔ ۱۶۵۲ء میں اس نے ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری حاصل کی۔ فرانس کے مشہور فلسفی گیسندی نے اس کی تربیت اور ذہنی نشوونما میں خاص طور پر دلچسپی کا اظہار کیا اور حقیقت یہ ہے کہ برنیئر میں تنقیدی فکر اور تلاش و جستجو کا جو جذبہ نظر آتا ہے وہ گیسندی کا ہی فیضان ہے۔ ۱۶۵۴ء میں برنیئر مشرقی ممالک کو دیکھنے اور وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کی نیت سے نکل کھڑا ہوا۔ تین چار سال تک شام' مصر' فلسطین وغیرہ میں گھومتا رہا اور بالآخر ۱۶۵۸ء میں بندرگاہ سورت پر آ پہنچا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب شاہ جہاں کے بیٹوں میں خانہ جنگی کا بازار گرم تھا اور سارے ملک کی سیاسی زندگی اس ہنگامہ آرائی سے متأثر تھی۔ دارا شکوہ جب ناکام ہو کر گجرات کی طرف بھاگا تو راستہ میں اتفاقاً برنیئر سے ملاقات ہو گئی خود لکھتا ہے:

"عجیب و غریب اتفاق تھا کہ میں اسے راستہ میں مل گیا اور چونکہ کوئی طبیب اس کے ہمراہ نہ تھا اس لیے مجھے جبراً اپنے ساتھ لے لیا"۔

چند دن دارا شکوہ کے ساتھ رہنے کے بعد برنیئر دہلی آ گیا اور یہاں اورنگ زیب کے مشہور امیر، دانش مند خاں کے طبیبوں میں شامل ہو گیا۔ جس چیز نے دانش مند خاں سے اس کا گہرا تعلق پیدا کیا وہ اس کے مزاج اور کردار سے زیادہ اس کا علمی مذاق تھا۔ برنیئر کو اس کی صحبت میں فرانس کی علمی مجلسوں کا لطف آ گیا۔ صبح کے وقت تو دانش مند خاں اپنے منصبی کاموں میں مصروف رہتا تھا، لیکن سہ پہر کا سارا وقت کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتا تھا اور اس فرصت میں برنیئر اس کے پاس ہوتا تھا۔ اورنگ زیب نے اس کی علمی دلچسپیوں کے پیش نظر اس کو شام کے دربار میں حاضری سے معاف کر دیا تھا۔ برنیئر نے اس کے لیے فرانسیسی عالموں بالخصوص گیسنڈی اور دیکارت کی کتابوں کے ترجمے بھی کیے تھے۔

دانش مند خاں کی مجلسوں میں برنیئر کو نہ صرف امراء کے اندرونی حالات کا جائزہ لینے اور مختلف حکام سے ملنے کا موقع ملا۔ بلکہ ہندوستان کے مختلف مذہبی فرقوں کے اعتقادات اور ان کی مذہبی زندگی کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی سہولتیں بھی میسر آ گئیں۔ اس لیے کہ دانش مند خاں کو خود مذاہب کی تحقیق کا بڑا شوق تھا اور وہ دارا شکوہ کے بعض معتمد پنڈت عالموں کو اپنی صحبت میں رکھتا تھا۔ سفر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برنیئر نے بعض اہم سیاسی واقعات کا ذاتی مشاہدہ کیا تھا۔ جس وقت دارا شکوہ انتہائی کسمپرسی اور بے چارگی کے عالم میں گجرات اور سندھ کی طرف بھاگا بھاگا پھر رہا تھا، برنیئر نے چند دن تک قریب رہ کر اس کا حال دیکھا تھا۔ لکھتا ہے کہ "دارا شکوہ پر اس وقت ایسی مفلسی کا عالم تھا کہ خیمہ تک اس کے پاس نہ تھا۔ اس کی بیگم اور عورتیں صرف ایک قنات کی آڑ میں تھیں، جس کی رسیاں میری سواری کی بہلی کے پہیوں سے بندھی ہوئی تھیں"۔ برنیئر نے عورتوں کی گریہ وزاری کے دردناک مناظر خود دیکھے تھے اور اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔ پھر جب دارا شکوہ گرفتار کر کے دہلی لایا گیا اور ذلت کے ساتھ دہلی کے بازاروں میں اس کو گشت کرایا گیا، اس وقت بھی برنیئر وہاں موجود تھا۔ لکھتا ہے:

"میں بھی شہر کے سب سے بڑے بازاروں میں ایک اچھے موقع پر اپنے دو رفیقوں اور دو خدمت گاروں کے ساتھ عمدہ گھوڑے پر چڑھا کھڑا تھا اور ہر طرف سے رونے اور چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور مرد اور بچے اس طرح چلا چلا کر رو رہے تھے کہ گویا ان پر

کوئی بڑی ہی مصیبت پڑی ہے"۔

جس وقت شہزادہ سلیمان شکوہ کو ہتھکڑیاں پہنا کر اورنگ زیب کے سامنے لایا گیا' اس وقت بھی برنیئر دربار میں موجود تھا اور نہایت تعجب کے ساتھ اس نے اس ہنگامے کو دیکھا تھا۔ خانہ جنگی کے خاتمہ پر اورنگ زیب نے جو جشن کیا تھا اس میں برنیئر نے بھی شرکت کی تھی۔ لکھتا ہے: "کہ اس سے بڑھ کر کوئی تماشہ میں نے عمر بھر کبھی نہیں دیکھا"۔ اس جشن کی ایک ایک تفصیل برنیئر نے اپنے سفرنامے میں درج کی ہے۔

ہندوستان میں بارہ سال قیام کے بعد وہ اپنے وطن کو واپس ہوا اور لوئی چاردہم کی خدمت میں اپنا سفرنامہ ان الفاظ کے ساتھ پیش کیا کہ دریائے سین سے نکل کر دجلہ 'فرات' سندھ یا گنگا جہاں بھی وہ پہنچا' فرانس اور اس کے شہنشاہ کے متعلق لوگوں کی نہایت اعلیٰ رائے سننے میں آئی۔ انتساب کے ان الفاظ میں قومی برتری کا جو جذبہ پوشیدہ ہے اس کے اثرات سفرنامے میں کہیں کہیں ظاہر ہو گئے ہیں۔ علاوہ ازیں آئندہ صدی میں جو ذہنیت ہندوستان کو پرتگال' فرانسیسی اور برطانوی سامراجیت کا اکھاڑہ بنانے والی تھی اس کے خاموش اشارے بھی اس کے انداز گفتگو میں سے ہیں۔ ایک موقع پر تو وہ ہندوستانی فوجوں کا ذکر کرتے ہوئے بے اختیار کہہ اٹھا ہے:

"میں جب ان بے ترتیب فوجوں کو دیکھتا تھا کہ حیوانوں اور گلوں کے مانند چلتی ہیں تو ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ ہمارے صرف ۲۵ ہزار تجربہ کار سپاہی پرنس کونڈی یا مارشل تورین کی سرکردگی میں ہندوستان کی فوج پر' خواہ وہ کتنی ہی کیوں نہ ہو' غالب آسکتے ہیں"۔

قومی برتری کے اس احساس سے قطع نظر' برنیئر بہت سے ان تعصبات سے پاک تھا جن سے اس دور کے اکثر عیسائی مشنریوں کے سفرنامے آلودہ نظر آتے ہیں۔ وجہ یہ نہ تھی کہ عیسائیت یا اس کی ترویج و اشاعت میں وہ کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ اپنے اور ہم مذہبوں کی طرح وہ بھی عیسائیت کو ہندوستان میں ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس کی فلسفیانہ تربیت نے اس میں وہ وسعت نظر اور آزاد خیالی پیدا کر دی تھی جو ہر متعصبانہ حرکت پر برہم ہو جاتی تھی۔ ہندوستان میں مشنریوں کے کام کو جہاں اس نے کسی حد تک یہ کہہ کر سراہا ہے کہ:

"میری دانست میں ان لوگوں کا مقصد پسندیدہ ہے اور اس کام کے لیے جو یہ ایسے

بعید ملک میں آئے ہیں، بے شک تعریف کے لائق ہیں"۔

وہاں ان پر ان الفاظ میں تنقید بھی کی ہے:

"بد قسمتی سے بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے مذموم افعال سے مذہب کو بدنام کرتے ہیں، جن کا بجائے مشن کے مقدس کام کے، اپنے کانونٹوں میں ہی بند رہنا مناسب ہے کیونکہ ان کا دین و مذہب صرف ایک دکھاوا ہے اور بجائے اس کے کہ لوگوں کو ان سے ہدایت ہو، الٹے ان کی گمراہی کا باعث ہیں"۔

نقطۂ نظر کے اس اعتدال نے برنیئر کے سفر نامہ میں بڑی توانائی پیدا کر دی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکا ہے اس نے واقعات کی صحیح نوعیت کا پتہ لگانے کی جستجو کی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا ہے، لیکن ایک سیاح کے لیے ہر واقعہ کی تحقیق ممکن نہیں ہوتی۔ وہ کتنا ہی محتاط ہو، لیکن بعض اوقات افواہیں اور غیر مستند خبریں غیر ارادی طور پر اس کے قلم سے نکل ہی جاتی ہیں۔ ایسا برنیئر کے ساتھ بھی ہوا۔ شاہ جہاں کے متعلق اس نے بعض ایسی باتیں لکھی ہیں جو بالکل لغو اور بے بنیاد ہیں اور جن کی تصدیق کسی دوسرے مؤرخ یا تذکرہ نویس کے بیان سے نہیں ہوتی۔ ایسے چند مقامات کو چھوڑ کر اس کا سفر نامہ بحیثیت مجموعی سترھویں صدی کے ہندوستان کو سمجھنے کے لیے معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔

ہندوستان کے شہر برنیئر کی نظر میں

برنیئر نے مشرق و مغرب کے بے شمار شہروں کی سیر کی تھی۔ اس نے نئے شہروں کو ابھرتے اور پرانے شہروں کو زوال پذیر ہوتے دیکھا تھا۔ اس وسیع مشاہدہ نے اس میں ایسی بصیرت پیدا کر دی تھی کہ وہ ظاہری شان و شوکت سے دھوکا کھائے بغیر شہروں کے سماجی اور اقتصادی توازن کا جائزہ لیتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے شہروں کو دیکھ کر اس نے لکھا:

"یہاں کے شہر اور قصبے خواہ اس وقت خستہ حال اور ویران نہ ہوں، مگر ایسا شہر کوئی نہیں ہے جس میں جلد تباہ اور خراب ہو جانے کی علامتیں نہ ہوں"۔

برنیئر نے جن اسباب کی بنا پر یہ رائے قائم کی تھی ان کی پوری تشریح تو نہیں کی ہے لیکن یہ ضرور کہا ہے کہ شخصی حکومت کے خراب اثرات جب ظاہر ہوتے ہیں تو شہروں پر تباہی آ جاتی ہے۔ شہری زندگی پر بادشاہ کی موجودگی اور غیر موجودگی کا گہرا اثر پڑتا ہے۔

چنانچہ لاہور کے متعلق لکھتا ہے :

"چونکہ بیس برس سے زیادہ عرصے سے بادشاہ معہ امراء دربار آگرہ یا دہلی میں رہتا ہے اس لیے لاہور کے اکثر مکانات حالتِ ویرانی میں ہیں بلکہ واقعتاً بہت سی عمارتیں بالکل منہدم ہو گئی ہیں۔ اور پچھلے چند برسوں کی شدید بارشوں میں بہت سے باشندے بھی مکانات میں دب کر مر چکے ہیں۔ مگر اب تک بھی چار پانچ بازار بہت بڑے ہیں جن میں سے دو تین تو طول میں دو میل سے بھی متجاوز ہیں۔ لیکن ان میں سے بھی اکثر مکانات بالکل ڈھے پڑے ہیں"۔

برنیئر نے اپنے سفر نامہ میں متعدد موقعوں پر یہ بات کہی ہے کہ شہروں کی آبادی کا انحصار بادشاہ یا امراء کی موجودگی پر ہے۔ اس سے علیحدہ ان کے وجود کو سوچا ہی نہیں جا سکتا۔ دہلی کے سلسلے میں لکھتا ہے :

"اس ملک کے دارالحکومت یعنی شہر آگرہ یا دہلی کے باشندوں کی معاش کا بڑا دارومدار صرف فوج کی موجودگی پر ہے اور اس لیے وہ مجبور ہیں کہ جب کبھی بادشاہ کوئی لمبا سفر اختیار کرے تو وہ بھی ساتھ جائیں"۔

ایک اور موقعہ پر لکھتا ہے :

"دہلی کی تمام خلقت حقیقتاً لشکر میں شامل ہے کیونکہ ان کے کام کاج اور گزران' بادشاہ اور لشکر ہی پر منحصر ہے اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یا تو لشکر کے ساتھ جائیں یا دہلی میں پڑے بھوکے مریں"۔

برنیئر جس وقت دہلی پہنچا تو شاہ جہاں کی دلی' شاہ جہاں آباد کو آباد ہوئے چوتھائی صدی سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ یہاں رہ کر سب سے پہلے اس نے جس بات کو محسوس کیا وہ یہ تھی کہ دہلی میں کوئی درمیانی طبقہ نہیں ہے۔ یہاں یا تو لوگ بہت مالدار ہیں یا بہت غریب۔ مکانات یا تو نہایت عالی شان ہیں یا محض چھپر ہیں جن میں فوجی یا معمولی پیشہ ور لوگ رہتے ہیں۔ اوسط درجہ کے مکانات کا یہاں کوئی پتہ نہیں۔

امراء کے مکانات کے متعلق لکھتا ہے کہ عام طور پر ہوادار اور خوشنما ہوتے ہیں۔ ہر مکان میں وسیع صحن اور خوبصورت باغیچے ہیں۔ صدر دالان کے اندر اور دروازوں میں اکثر چھوٹے چھوٹے فوارے چلتے رہتے ہیں۔ گرمی میں استعمال کے لیے تہ خانے اور خس خانے بنانے کا رواج ہے۔ لکھتا ہے کہ تہ خانوں کی نسبت اکثر لوگ خس خانوں کو زیادہ پسند کرتے

ہیں۔ یہ خس خانے چمن کے اندر حوض کے قریب بنائے جاتے ہیں تاکہ خدمت گار ڈول سے ان پر پانی چھڑکتے رہیں۔

نشست کے لیے صدر دالان میں روئی کا موٹا گدیلا بچھایا جاتا ہے۔ گرمی کے دنوں میں اس پر چاندنی' جاڑوں میں ریشمیں قالین بچھتے ہیں۔ صاحب خانہ یا مخصوص مہمانوں کے لیے بیچ میں خوبصورت گدیلے ہوتے ہیں جن پر عموماً سنہری زری کی دھاریاں بنی ہوتی ہیں۔ کم خواب اور مخمل کے گاؤ تکیے اس پر لگا دیئے جاتے ہیں۔ طاقوں میں چینی کے برتن اور گلدان سجائے جاتے ہیں۔ اس صدر دالان کی چھت نقش و نگار سے مزین ہوتی ہے۔

خس پوش مکانات بھی خاصے سلیقے سے بنائے جاتے ہیں لمبے اور مضبوط بانسوں کے چھپر چھا کر نہایت عمدہ کہگل اور سفیدی کر دی جاتی ہے۔ یہ خس پوش مکانات کہیں علیحدہ نہیں بنائے گئے ہیں بلکہ بڑے مکانوں کے ساتھ بنے ہوئے ہیں۔ ان مکانات میں معمولی فوجی سوار' خدمت گار' وغیرہ رہتے ہیں۔ ان چھپروں میں آگ لگنے کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔ خود برنیئر کی موجودگی میں ایک بار ان مکانوں میں آگ لگی اور تقریباً ساٹھ ہزار جھونپڑے جل کر خاکستر ہو گئے۔ لکھتا ہے کہ اس حادثہ میں جانوروں کے علاوہ کچھ عورتیں بھی جل گئیں کیونکہ پردہ کی پابندی کے باعث وہ جلدی سے گھروں سے باہر نہیں نکل سکتی تھیں۔

ان خس پوش مکانوں کی کثرت کو دیکھ کر برنیئر نے دہلی کے متعلق جو رائے قائم کی تھی وہ بڑی دلچسپ ہے۔ لکھتا ہے:

"ان کچے خس پوش مکانوں کے باعث میں ہمیشہ یہ خیال کرتا ہوں کہ سوائے اتنے فرق کے کہ آرام کے بعض سامان اس میں زیادہ ہیں دہلی گو دیہات کا مجموعہ یا فوج کی چھاؤنی ہے۔

قلعہ کی زندگی

برنیئر نے اپنے سفرنامے میں قلعہ کی زندگی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں اس کی معلومات کچھ تو ذاتی مشاہدے پر مبنی تھیں اور کچھ اس نے خواجہ سراؤں اور شاہی ملازمین کے ذریعہ حاصل کی تھیں۔

لکھتا ہے کہ قلعہ کے دو اہم حصے ہیں' محل اور محل سرا۔ محل سرا کے حالات کا پتہ

اگانا محال ہے۔ وہاں کسی شخص کا گزر ممکن نہیں۔ فوجیوں میں ایک مثل مشہور ہے کہ تین موقعوں سے بچنا اور احتیاط کرنا چاہئے' کوتل گھوڑوں سے' شکار گاہ سے اور محل سرا یا بیگمات شاہی کی سواری کے قریب جانے سے۔

قلعہ کے دروازے پر دو بڑے ہاتھی نصب تھے جن پر راجہ جے مل اور اس کے بھائی کے مجسمے تھے۔ لکھتا ہے: "یہ ہاتھی جن پر یہ دونوں بہادر سوار ہیں بڑے شان و شوکت کے ہیں اور ان کو دیکھ کر رعب اور ادب کا ایک ایسا خیال مجھ پر چھا گیا جس کو میں بیان نہیں کر سکتا"۔ اس دروازہ سے قلعہ میں داخل ہو کر ایک وسیع راستہ ملتا ہے جس کے وسط میں ایک نہر جاری ہے۔ اس نہر کے دونوں جانب ایک چبوترہ ہے۔ اس کو چھوڑ کر دونوں طرف آخر تک محراب دار دالان بنے ہوئے ہیں۔ ان دالانوں میں کارخانوں کے داروغہ اور کم درجہ کے عہدہ دار اپنا کام کرتے رہتے ہیں جو منصب دار رات کو چوکی دینے آتے ہیں وہ اس چبوترے پر ٹھہرتے ہیں۔

قلعہ کے دوسرے دروازے سے بھی اندر داخل ہونے پر ایک خاصی چوڑی سڑک پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس سڑک کے دونوں جانب چبوترے تو ویسے ہی ہیں لیکن دالانوں کی جگہ دکانیں بنی ہوئی ہیں۔ ان دو بڑی سڑکوں کے علاوہ جو قلعہ کے دروازوں تک جاتی ہیں' چھوٹی چھوٹی اور بھی متعدد سڑکیں ہیں۔ یہ سڑکیں ان مکانات تک جاتی ہیں جو امراء نے چوکی دینے کے موقع پر اپنے آرام کے لئے بنائے ہیں۔ چوکی دینے کے لیے امراء کی باریاں مقرر ہیں۔ چنانچہ باری باری وہ آکر قلعہ میں رات بھر پہرہ دیتے ہیں۔ یہ دیوان خانوں کے طرز کے مکانات ہیں جن کے سامنے باغیچے حوض اور فوارے لگے ہوئے ہیں۔ امراء اپنے خرچ سے ان دیوان خانوں کو آراستہ پیراستہ رکھتے ہیں۔ جس امیر کی چوکی ہوتی ہے اس کے لیے کھانا خاصے سے آتا ہے۔ جس وقت کھانے کے خوان آتے ہیں وہ امیر' محل کی طرف رخ کر کے تین دفعہ آداب بجالاتا ہے۔ امراء کے ان دیوان خانوں کے علاوہ محل کے اندر سرکاری دفتروں کے لیے بھی دیوان خانے بنے ہوئے ہیں۔

محل میں کارخانے بھی ہیں جن میں صبح سے شام تک چکن دوز' مصور' نقاش' درزی' موچی' جولاہے وغیرہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔

ان دیوان خانوں' اور دفتروں سے گزرنے کے بعد "خاص و عام" تک رسائی ہوتی ہے۔ یہ ایک وسیع مربع مکان ہے جس کے چاروں طرف محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ سامنے ایک

بڑا بالا خانہ ہے جس پر نفیریاں، شہنائیاں اور نقارے رکھے ہیں اس نقار خانے سے گزر کر ایک دالان میں پہنچتے ہیں۔ اس دالان کے ستونوں پر اور چھت پر سنہری نقش و نگار ہیں۔ اس دالان کی کرسی بہت اونچی ہے اور وہ تین طرف سے کھلا ہوا ہے۔ ایک دیوار کے وسط میں جو محل سرا سے اس کو علیحدہ کرتی ہے، وہاں ایک بڑا "شہ نشین" بنا ہوا ہے۔ دوپہر کو بادشاہ یہاں آکر بیٹھتا ہے۔ دائیں بائیں شہزادے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کچھ فاصلہ چھوڑ کر چاندی کا جنگلا ہے جس میں امراء، راجا اور غیر ملکوں کے سفیر کھڑے ہوتے ہیں۔ ان سے جو جگہ باقی بچتی ہے اس میں رعایا کا ہر کس و ناکس آکر کھڑا ہو سکتا ہے۔ عموماً یہ جگہ بلکہ پورا صحن ان لوگوں سے بھرا رہتا ہے جو مختلف قسم کی عرضیاں لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو "خاص و عام" کہتے ہیں۔ یہاں ڈیڑھ دو گھنٹے تک لوگوں کے سلام اور مجرا کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پھر گھوڑے اور ہاتھی پیش کیے جاتے ہیں، ہاتھیوں کو نہلا کر ان کے جسم پر کالا رنگ کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ان کی سونڈ پر لال خط کھینچ دیئے جاتے ہیں۔ تبت سے سفید سر والی گایوں کی دمیں بڑی قیمت پر خریدی جاتی ہیں اور اس طرح ان ہاتھیوں پر لٹکائی جاتی ہیں کہ وہ بڑی مونچھیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ ہاتھی زربفت کی جھولیں لٹکائے، چاندی کی گھنٹیاں بجاتے ہوئے گزرتے ہیں اور جب تخت کے قریب پہنچتے ہیں تو سونڈ اٹھا کر چنگھاڑتے ہیں۔ یہ ان کی سلامی سمجھی جاتی ہے۔ پھر گھوڑا، ہرن، نیل گائیں، گینڈے، بنگال کے بھینسے اور دوسرے جانور پیش کیے جاتے ہیں۔ تاتار وغیرہ سے کتے منگائے گئے ہیں جو سرخ رنگ کی جھولیں ڈالے ہوئے سامنے سے گزرتے ہیں۔ آخر میں ہر قسم کے شکاری پرندے لائے جاتے ہیں۔ ان تمام ہنگاموں کے بعد بادشاہ نہایت توجہ کے ساتھ سواروں کو ملاحظہ کرتا ہے۔ برنیئر کا بیان ہے:

"جب سے لڑائی بند ہوئی ہے کوئی سوار یا پیدل ایسا نہیں جس کو بادشاہ نے بہ چشم خود نہ دیکھا ہو اور اس اس سے اپنی واقفیت حاصل نہ کی ہو۔ چنانچہ اس نے کسی کی تنخواہ بڑھا دی کسی کی کم کر دی اور کسی کو بالکل ہی موقوف کر دیا"۔

اس کے بعد لوگ عرضیاں پیش کرتے ہیں، یہ عرضیاں تمام و کمال بادشاہ کے ملاحظے اور سماعت میں آتی ہیں۔ بادشاہ خود دریافتِ حال کرتا ہے اور معاملات کی تحقیق میں دلچسپی لیتا ہے۔ ان مستغیثوں میں سے جن لوگوں کے معاملات زیادہ تحقیق طلب اور قابل غور ہوتے ہیں ان لوگوں کی عرضیاں سنتا ہے۔ اس موقع پر ان عرضیوں کو پیش کرنے کا کام ایک نیک مسن اور دولت مند شخص کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ عدل و انصاف میں بادشاہ کی

دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے برنیئر لکھتا ہے۔

"اس سے بخوبی ظاہر ہے کہ ایشیائی بادشاہ جن کو اہل یورپ جاہل اور ناتراشیدہ خیال کرتے ہیں وہ ہمیشہ ہی اپنی رعایا کی داد رسی اور انصاف رسانی سے جو ان پر واجب ہے' غفلت نہیں کرتے"۔

دربار میں خوشامد کا ماحول رہتا ہے۔ جو لفظ بھی بادشاہ کی زبان سے نکلتا ہے درباری اس پر عجیب انداز سے اظہار تحسین کرتے ہیں۔ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر وہ "کرامات" "کرامات" پکارتے ہیں۔ خوشامد کی عادت پوری سوسائٹی میں سرایت کر گئی ہے۔ لکھتا ہے کہ حد یہ ہے کہ جب کوئی امیر مجھے علاج کے لیے بلاتا ہے تو پہلے یہ کہتا ہے کہ آپ تو اپنے وقت کے ارسطو' بقراط اور بو علی سینا ہیں۔

"عام و خاص" کے بڑے دالان کی بغل میں ایک "خلوت خانہ" ہے جسے "غسل خانہ" کہتے ہیں۔ اس پر نہایت خوبصورت سنہری روغن ہے۔ یاں ایک اونچی کرسی پر بیٹھ کر بادشاہ امراء اور صوبہ داروں کی عرضیاں سنتا ہے۔ یہاں چند مخصوص لوگوں کے سوا کوئی حاضر نہیں ہو سکتا۔ جس طرح صبح کو "خاص و عام" کے دربار میں حاضر نہ ہونے پر امراء کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے' یہاں شام کو غیر حاضری پر سزا ملتی ہے۔ البتہ دانشمند خاں کے علمی ذوق کے پیش نظر بادشاہ نے ان کی غیر حاضری معاف کر دی ہے۔ لیکن چہار شنبہ کو جو ان کی چوکی کا دن ہے ان کو بھی اور امراء کی طرح محل میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔

محل سرا کے حالات کے متعلق برنیئر نے خواجہ سراؤں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہاں بیگمات کے لیے حسب مراتب علیحدہ علیحدہ محلات ہیں جن کے دروازوں کے سامنے حوض' باغیچے' روشیں' فوارے لگے ہوئے ہیں۔ دریا کی طرف ایک چھوٹا سا بُرج ہے جس کا رنگ لاجوردی ہے اور بڑے بڑے آئینے چاروں طرف لگے ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ برنیئر کو بڑی بیگم کے علاج کے سلسلے میں محل سرا میں بلایا گیا۔ بیگم شدید علیل تھیں اور باہر کے دروازے تک آنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ برنیئر کو اندر لے جایا گیا لیکن اس طرح کہ ایک کشمیری شال سر سے پاؤں تک اس پر ڈھک دی گئی اور ایک خواجہ سرا اندھے کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر تک لے گیا۔

برنیئر نے محل کی زندگی کی تفصیلات کے سلسلے میں مینا بازار کا بھی ذکر کیا ہے' لکھتا ہے کہ کبھی کبھی ایک فرضی بازار لگا کرتا ہے جس میں امراء اور بڑے بڑے منصب داروں

کی بیگمات دکانیں لگا کر بیٹھتی ہیں۔ بادشاہ بیگمیں اور شہزادیاں خریدار بنتی ہیں اس میلے کا بڑا لطف یہ ہے کہ ہنسی اور مذاق کے طور پر خود بادشاہ ایک ایک پیسہ کے لیے جھگڑتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بیگم صاحب بہت گراں فروش ہیں۔ دوسری جگہ اس سے اچھی اور سستی چیز مل سکتی ہے ہم ایک کوڑی بھی زیادہ نہ دیں گے۔ ادھر وہ کوشش کرتی ہے کہ اپنا مال زیادہ قیمت کو بیچے۔ جب دیکھتی ہے کہ بادشاہ زیادہ قیمت نہیں لگاتا تو گفتگو اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ کہہ اٹھتی ہے کہ آپ اور چیزوں کی خبر لیں' ان چیزوں کی قیمت آپ کیا جانیں۔ یہ آپ کے لائق نہیں ہیں۔ لیکن یہ محض دکھاوٹی ہوتا ہے۔ بعد کو بادشاہ اور بیگمات روپیہ کی جگہ اشرفیوں میں چیزیں خریدتی ہیں۔

دہلی کے بازار اور دُکانیں

برنیئر کا زیادہ وقت دہلی میں گزرا تھا' اس لیے یہاں کے حالات کو اس نے نسبتاً زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بازاروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یوں تو دہلی کے گلی کوچوں میں بے شمار بازار ہیں لیکن بعض بازار اپنی وسعت اور خوبصورتی کی بنا پر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دہلی میں بڑے بازار سات ہیں۔ شہر کے دو بڑے بازار شاہی چوک کے دروازے پر (جو قلعہ سے ملحق ہے) آکر ختم ہوتے ہیں ان کا عرض ۲۵' ۳۰ قدم کے قریب ہے اور جہاں تک نظر پہنچتی ہے وہ سیدھے چلے گئے ہیں۔ جو بازار لاہوری دروازہ کو جاتا ہے۔ وہ بہت لمبا ہے اس کے دونوں جانب محراب دار دکانیں ہیں جن میں بیوپاری' اہل حرفہ اور صراف اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ دکانوں کے پیچھے کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں جن میں رات کو سامان بند کر دیا جاتا ہے۔ ان دکانوں کے اوپر بالاخانے بنے ہوئے ہیں جو بازار کی طرف سے بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں ویسے بھی نہایت آرام دہ اور ہوادار ہیں۔ رات کو بیوپاری انہی بالاخانوں میں سوتے ہیں۔

یہ بالاخانے شہر کے ہر بازار میں نہیں ہیں۔ متمول بیوپاری دکانوں یا بالاخانوں پر نہیں سوتے۔ وہ کاروبار سے فارغ ہو کر اپنے اپنے مکانوں کو چلے جاتے ہیں۔

دکانوں کے سلسلے میں برنیئر نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہاں ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اگر ایک دکان میں پشمینہ' کمخواب' اور زری کا سامان رکھا ہے تو پاس ہی کوئی پچیس دکانوں میں گھی' تیل' آٹا' چاول وغیرہ فروخت ہوتا ہے۔ صرف بعض جگہ میووں کے

بازار تو علیحدہ ہیں۔ باقی سب بازار ملے جلے ہیں۔ بیوپاری اپنا سب مال دکانوں پر نہیں رکھتے۔ ان کا بیشتر سامان گوداموں میں بند رہتا ہے۔ حلوائیوں کی دکانیں کثرت سے ہیں۔ لیکن نہ مٹھائی اچھی بنتی ہے نہ اس کو گرد اور مکھیوں سے بچایا جاتا ہے۔

دہلی کے بازاروں میں ایک اور چیز جو برنیئر کے لیے جاذب نظر تھی وہ رمالوں، جیوتشیوں اور نجومیوں کی کثرت تھی۔ جہاں دیکھیے دھوپ میں میلا سا قالین کا ٹکڑا بچھائے بیٹھے ہیں۔ علم ریاضی کے کچھ پرانے آلات سامنے سجے ہوئے ہیں، ایک بڑی کتاب جس پر بارہ برجوں کی شکلیں بنی ہوئی ہیں، کھلی ہوئی سامنے رکھی ہے اور کثیر تعداد میں عورتیں سفید چادروں میں لپٹی ہوئی ان کے گرد کھڑی ہیں اور اپنے معاملات ان سے بیان کر رہی ہیں۔

اشیاء خوردونوش

برنیئر نے کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق اپنے تاثرات مختلف موقعوں پر بیان کیے ہیں۔ روٹی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہاں نان بائی بے شمار ہیں لیکن ان کے تنور فرانسیسی تنوروں سے مختلف ہیں اور بہت بڑے ہیں نان بائیوں کی پکائی ہوئی روٹی اچھی سکی ہوئی نہیں ہوتی۔ البتہ قلعہ میں روٹی کسی قدر اچھی پکتی ہے۔ اس میں دودھ، مکھن اور انڈا خوب ڈالا جاتا ہے۔ بازاروں میں مختلف قسم کے کباب اور کلیجے بکتے ہیں۔ لیکن گوشت کے متعلق شک ہی رہتا ہے کہ کس جانور کا ہے۔ لکھتا ہے:

"مجھے معلوم ہے کہ کبھی کبھی اونٹ یا گھوڑے یا قریب المرگ بیل کا گوشت بھی استعمال کر لیتے ہیں"۔

اسی بنا پر برنیئر نے یہ رائے قائم کی تھی کہ ہندوستان میں جو کھانا گھر پر تیار نہ ہوا ہو وہ معین صحت نہیں ہو سکتا۔ خود اس کے لیے کھانے کا اہتمام کرنا مشکل تھا، اس لیے اس نے ایک عجیب ترکیب نکالی۔ شاہی باورچی خانہ* کے داروغہ سے اس نے معاملہ کر لیا۔ چنانچہ روزانہ نوکر وہاں بھیج کر کھانا منگا لیتا تھا۔ کھانے کی قیمت تو اسے کچھ زیادہ ادا کرنی پڑتی تھی، لیکن کھانا بہت اعلیٰ درجہ کا حاصل ہو جاتا تھا۔ دانشمند خاں کو جب اس کا علم ہوا تو بہت ہنسا اور اس کی چوری اور چالاکی پر تعجب کا اظہار کیا۔ برنیئر نے جواب دیا کہ اگر ایسا نہ کرتا تو فاقوں سے مر جاتا، اس لیے کہ ڈیڑھ اشرفی ماہانہ جو آپ کی سرکار سے ملتے ہیں میرے لیے کافی نہیں۔ حالانکہ فرانس میں صرف آٹھ آنہ روز میں ایک بادشاہ کا سا کھانا کھا سکتا ہوں۔

قصائیوں کی دکانوں پر دبلی بکریوں کا گوشت ملتا ہے۔ عام طور پر لوگوں کی غذا گھی تیل' دال' چاول' گیہوں ہے۔ بیشتر ہندو اور سب غریب مسلمان یہی کھاتے ہیں گوشت کا استعمال نہیں کرتے۔ آگے چل کر لکھتا ہے۔

"خصی مرغ دہلی میں بالکل نہیں دکھائی دیتا۔ کیونکہ اس ملک کے لوگ جانوروں پر عموماً رحم کرتے ہیں۔ اگرچہ انسانوں پر رحم نہیں کرتے"۔

پھلوں کا استعمال بہت ہوتا ہے۔ پھلوں کے بازار بھی علیحدہ ہیں۔ ایران' بلخ' بخارا' اور سمرقند سے میوے برابر آتے رہتے ہیں۔ دہلی میں روئی کی تہ میں لگے ہوئے انگور اور اور تین تین چار قسم کی ناشپاتیاں کثرت سے ملتی ہیں۔ میووں میں سب سے زیادہ قیمت سردے کی ہے۔ ایک سردہ پونے چار روپیہ کو آتا ہے لیکن گرانی کے باوجود دہلی کے لوگ اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔ امراء بالخصوص میووں کا استعمال بہت کثرت سے کرتے ہیں۔ دانش مند خاں کے یہاں دن کے ناشتہ پر بیس اشرفیوں کا میوہ خرچ ہوتا ہے۔

ہندوستان میں خربوزہ بہت سستا ہوتا ہے لیکن زیادہ لذیذ نہیں ہوتا۔ بعض امراء اس کا بیج ایران سے منگواتے ہیں' لیکن ایک سال کے بعد یہ تخم بھی بگڑ جاتا ہے۔ آم کی کثرت دو مہینے رہتی ہے۔ سب سے عمدہ آم بنگال' گولکنڈا اور گوا میں ہوتا ہے اور وہاں سے دہلی آتا ہے۔ یہ آم اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ کوئی مٹھائی اس کی شیرینی اور خوشبو کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

"پرند بازاروں میں سستے اور کثرت سے ملتے ہیں۔ کبوتر اور تیتر تو آسانی سے مل جاتے ہیں لیکن ان کے بچے نہیں ملتے کیونکہ ہندوستان کے لوگ بچوں کا مار ڈالنا بے رحمی کا کام سمجھتے ہیں"۔

نواح دہلی کے ماہی گیر اپنے پیشے میں ہوشیار نہیں ہیں۔ یہاں کی "سنگھاڑا" اور "روہو" مچھلی جو فرانس کے پائک اور کارپ کی شکل کی ہوتی ہے اچھی ہوتی ہے۔ ماہی گیر جاڑوں میں مچھلی نہیں پکڑتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ سردی سے بہت ڈرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے اہلِ فرنگ گرمی سے ڈرتے ہیں۔

شراب دہلی کی کسی دکان پر نہیں ملتی۔ اگر کبھی کہیں عمدہ شراب ملتی ہے تو وہ شیراز وغیرہ کی ہوتی ہے۔ لیکن یہ باہر کی آئی ہوئی شرابیں بے حد گراں ہیں۔ ہندوستانی کہتے ہیں کہ ان کی قیمت اس کے مزے کو بے لطف کر دیتی ہے۔ ہندوستان کی [illegible] دیسی شراب "عرق"

کہلاتی ہے۔ یہ بہت تیز اور تند ہوتی ہے اس کے بیچنے پر ممانعت ہے۔ عیسائیوں کے سوا کوئی شخص اعلانیہ شراب نہیں پی سکتا۔ لکھتا ہے:

"یہ عرق ویسا ہی تند تیز ہے جیسا کہ پولینڈ میں اناج سے بناتے ہیں اور اس کا تھوڑا سا بھی مقدار سے زیادہ استعمال کیا جائے تو لاعلاج اعصابی امراض پیدا ہو جاتے ہیں پس عقلمند آدمی یہاں یا تو صرف خالص پانی پینے کی عادت رکھے گا یا لیموں کا شربت پیے گا۔"

گنگا کا پانی پینے کے لیے دور دور لے جاتے ہیں۔ برنیئر جب دانش مند خاں کے ساتھ کشمیر گیا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے امراء نے گنگا جل اونٹوں پر لاد کر ساتھ لے لیا ہے۔ خود اورنگ زیب کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے چار خیمے ایسے ہوتے تھے جن میں پھل اور گنگا جل رکھا جاتا تھا۔

زراعت

لکھتا ہے کہ ہندوستان کا زیادہ حصہ نہایت زرخیز ہے لیکن زراعت کے طریقے ناقص اور خراب ہیں۔ قابلِ زراعت زمین کا حصہ کاشت کاروں کی قلت کے باعث خالی پڑا ہے۔ حکام کی بدسلوکی اور ظالمانہ برتاؤ نے کاشتکاروں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ چنانچہ کاشت کاروں میں زراعت چھوڑ کر شہر میں ملازمت تلاش کرنے کا رُجحان ترقی کر رہا ہے۔ یہ پریشان اور مفلوک الحال کاشتکار شہروں میں آجاتے ہیں اور فوج میں پانی بھرنے یا سائیسی کا کام کرنے لگتے ہیں۔ یا پھر جس راجہ کے علاقہ میں ظلم و ستم کم دکھائی دیتا ہے، وہاں بھاگ جاتے ہیں۔

زراعت کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"کوئی شخص اس قابل نہیں پایا جاتا کہ اپنی خوشی سے ان نہروں اور نالیوں کی مرمت کرے جو آب پاشی کے لئے بنی ہوئی ہیں۔ ایک طرف تو کاشتکار اپنے دل میں ہمیشہ یہ خیال کرتے ہیں کہ کیا ہم اس لیے محنت کریں کہ کوئی ظالم آئے اور سب کچھ چھین لے جائے۔ اور دوسری طرف جاگیردار اور صوبہ دار اور مستاجر یہ سوچتے ہیں کہ ہم کیوں افتادہ اور ویران زمین کا فکر کریں اور اپنا روپیہ اور وقت اس کے بار آور بنانے میں لگائیں کیونکہ نہ معلوم کس وقت یہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے"۔

برنیئر نے زراعت کی اس ابتر حالت کا بڑا سبب یہ قرار دیا ہے کہ کاشتکار کو زمین

پر حق ملکیت نہیں ہے۔ لکھتا ہے:

"میں نے یورپ کی حکومتوں کی حالت کا جہاں زمین کا حق ملکیت رعایا کو حاصل ہے اور ان ملکوں کی حالت کا جہاں یہ حق ان کو حاصل نہیں ہے' احتیاط کے ساتھ مقابلہ کیا ہے"۔

پیداوار

برنیئر نے ملک کا سب سے زیادہ زرخیز علاقہ بنگال کو قرار دیا ہے۔ لکھتا ہے:

"بنگال میں دو مرتبہ جانے سے جو واقفیت مجھ کو اس ملک کی نسبت حاصل ہو سکی ہے اس سے مجھ کو یقین ہے کہ جو فضیلت ملک مصر سے منسوب کی گئی ہے وہ زیادہ تر بنگالہ کا حق ہے"۔

بنگال کا چاول سراندیپ اور جزائر مالدیپ تک جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں کی شکر گولکنڈہ اور کرناٹک کے علاوہ عرب اور عراق میں فروخت ہوتی ہے۔ بنگال کا گیہوں ڈچ اور انگریز سستے داموں میں خرید کر اس سے بسکٹ تیار کرتے ہیں اور یہ بسکٹ سمندری سفر میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہاں روئی اور ریشم کی پیداوار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن بنگالی ریشم' ایران اور شام کے ریشم کا مقابلہ نہیں کرتا۔ لیکن "اگر عمدہ چھانٹ لیا جائے اور احتیاط سے صاف کیا جائے تو اس سے نہایت ہی عمدہ کپڑا بن سکتا ہے۔ ان چیزوں کے علاوہ بنگال میں گوند' افیون وغیرہ کی پیداوار بھی کافی ہوتی ہے۔

بنگال کے بعد پیداوار کے لحاظ سے برنیئر نے کشمیر کی تعریف کی ہے۔ لکھتا ہے کہ یہاں انگور' سن' زعفران' گیہوں' دھان اور ترکاریوں کے بہت کھیت ہیں' سیب' ناشپاتی' آلوچہ' خوبانی' اخروٹ وغیرہ کے درختوں کی بے حد کثرت ہے۔ پھر لکھتا ہے:

یہاں کے پھل ہمارے ملک کے میووں سے خوبی میں بلاشک کم ہیں اور نہ اتنی قسم ہی کے ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ یہاں کی زمین کا قصور نہیں بلکہ اس کا باعث کاشتکاروں اور باغبانوں کی نادانی ہے جو اہل فرانس کی طرح فن زراعت درختوں میں پیوند وغیرہ لگانے کے ہنر کے ماہر نہیں ہیں"۔

دہلی کے اردگرد کے علاقے کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ بہت زرخیز ہے' اور اکثر گیہوں' جو' دھان' باجرہ' جوار' مونگ' ماش' موٹھ وغیرہ جو عام لوگوں کی خوراک ہے یہاں

بہت کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔

مصنوعات

برنیئر نے ملک کے مختلف حصوں کی مصنوعات کا جائزہ بھی بہت غور سے لیا ہے اور ترقی و تنزل کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس نے امکانات کی نشاندہی بھی کی ہے اور کمزوریوں اور نقائص کا پتہ بھی دیا ہے۔ لکھتا ہے کہ کشمیر میں لکڑی کا کام نہایت اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ وہاں کے بنے ہوئے صندوق قلمدان وغیرہ تمام ملک میں جاتے ہیں۔ وارنش کا کام بھی نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ لکھتا ہے :

''یہاں کے لوگ روغن بنانے اور استعمال کرنے کے فن میں نہایت کامل ہیں۔ اور نہایت باریک اور نفیس سنہری تاروں کو کسی چیز میں جما کر ہر ایک قسم کی لکڑی کے رگ و ریشہ کی ایسی خوبصورتی سے نقل اتارتے ہیں کہ میں نے کبھی کوئی ایسی نفیس اور بے عیب شے نہیں دیکھی۔''

کشمیر کی شال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جس چیز نے وہاں کی سوداگری کو فروغ دیا ہے اور کشمیر کو دولت سے مالامال کر دیا ہے وہ وہاں کی شال ہے۔

''اس کی کثرت کے باعث ان کے چھوٹے چھوٹے بچے تک بیکار نہیں رہے''۔

شالیں دو قسم کی تیار کی جاتی ہیں ایک کشمیری اون کی دوسری پشم کی جو توز (؟ توسا) کہلاتی ہے۔ کشمیری اون اسپین کی پشم سے زیادہ نفیس اور ملائم ہوتی ہے۔ ان کی اون تبت کی جنگلی بکریوں کے سینے سے اتاری جاتی ہے۔ نفاست میں ''سگ آبی'' کی پوستین بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ برنیئر لکھتا ہے کہ پٹنہ ' آگرہ اور لاہور میں کشمیری طرز کی شالیں بنانے کی کوشش کی گئیں۔ لیکن بار آور نہیں ہوئیں۔ اس ناکامی کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :

''اور یہ شاید اس ملک کے پانی ہی کا خاصہ ہے جس کے باعث کشمیری ریزے کو بے نظیر نفاست حاصل ہے۔ چنانچہ مچھلی پٹن کی چھینٹوں وغیرہ کی اعلیٰ رنگت کو بھی جن کو ہاتھ سے چھاپتے ہیں اور دھل کر ہر بار عمدہ ہی نکلتی ہیں وہاں کے پانی ہی کی خاصیت سے منسوب کرتے ہیں''۔

بنگال میں کپڑا نہایت عمدہ تیار ہوتا ہے اور انگریز اور پرتگالی اس کی خاص طور پر تجارت کرتے ہیں۔ ڈچ لوگ تو یہاں کا کپڑا جاپان اور یورپ تک بھیجتے ہیں۔ قاسم بازار میں

ڈچ لوگوں کے ریشم کے کارخانے ہیں جن میں سات سات سو آٹھ آٹھ سو آدمی کام کرتے ہیں۔

بنگال شورے کی بڑی منڈی ہے۔ یہاں سے شورا ہندوستان کے مختلف مقامات کے علاوہ یورپ تک جاتا ہے۔

شاہی کارخانوں میں بہترین مصنوعات تیار ہوتی ہیں۔ برنیئر نے خاص طور پر اس کپڑے کا ذکر کیا ہے جو بیگمات کے پاجاموں کے لیے ان کارخانوں میں تیار ہوتا تھا۔

مصوروں اور نقاشوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ان کے باریک اور نازک کام کو دیکھ کر اکثر حیرت میں رہ گیا ہوں۔ ایک مصور نے اکبر کی بڑی بڑی مہموں کی تصویر ایک ڈھال پر سات سال میں تیار کی تھی۔ برنیئر نے جب اس ڈھال کو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ اس تعریف کے باوجود اس نے ہندوستانی مصوروں کی ایک کمزوری کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ یہ مصور انسانی چہرہ کی کیفیات ظاہر کرنے میں کچے ہیں۔ لیکن بعض کاریگر اتنے ماہر بھی ہیں کہ اپنے ہاتھ سے ایسی چیزیں تیار کر لیتے ہیں کہ یورپ میں مشین سے بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور اصل و نقل میں فرق کرنا دشوار ہوتا ہے مثلاً یہاں کی بندوقیں بالکل یورپ کی بندوقوں کے مشابہ ہوتی ہیں۔ سونے کے زیور تو اتنے عمدہ تیار ہوتے ہیں کہ کوئی یورپین سنار ان سے بڑھ کر شاید ہی بنا سکے۔

کاریگروں کی حالت

برنیئر نے کاریگروں کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے کئی اہم اور دلچسپ باتیں کہیں ہیں۔ اس کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ہنر کی کمی نہیں لیکن اس کی قدر جیسی ہونی چاہیے ویسی نہیں ہوتی۔ یہاں کی صنعت و حرفت کا سارا انحصار بادشاہوں اور امیروں کی سرپرستی پر ہے۔ عام طور پر دہلی میں نہ کاریگروں کے کارخانے ہیں نہ ان کو عوام کی سرپرستی حاصل ہے لکھتا ہے :

"اگر کاریگروں اور کارخانہ داروں کو کچھ ہمت دلائی جائے تو بے شک مفید اور عمدہ صنعتوں کو ترقی ہو سکتی ہے۔"

ملک کے بہترین کاریگر دربار سے وابستہ ہو جاتے ہیں جو باقی رہ جاتے ہیں ان کی حالت بڑی کسمپرسی کی ہوتی ہے۔ ان کی واجبی اجرت بھی نہیں ملتی۔ جب کسی امیر یا منصب

دار کو کسی کاریگر کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کو بازار سے بلوا لیتا ہے اور جبراً کام لیتا ہے اور جو مزدوری جی چاہتا ہے دے کر ٹال دیتا ہے۔ کوئی کاریگر اصرار کرتا ہے تو اس پر سختی کی جاتی ہے اور کوڑوں سے اس کی خبر لی جاتی ہے۔ لکھتا ہے :

"پس اس حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ کاریگر اور کارخانہ دار لوگ ایک دوسرے سے بڑھ کر ہنر دکھانے میں سعی کریں۔ بلکہ ان کو تو شہرت اور ؟ پیدا کرنے کے لیے کوشش کرنے کی جگہ صرف یہ فکر رہتی ہے کہ کہیں جلدی پیچھا چھوٹ جائے اور اس قدر مزدوری مل جائے جس میں گزراوقات ہو جائے۔"

ہندوستان میں سونے اور چاندی کی کھپت

ہندوستان کی درآمد اور برآمد کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد برنیئر نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ :

"سونا چاندی دنیا بھر میں پھر پھرا کر جب ہندوستان میں پہنچتا ہے تو یہیں کھپ جاتا ہے"۔

لکھتا ہے کہ امریکہ 'یورپ اور جاپان سے جو روپیہ ہندوستان آتا ہے وہ پھر یہاں سے واپس نہیں جاتا۔ صورت یہ ہے کہ امریکہ سے یورپ آئے ہوئے روپیہ کا ایک حصہ مختلف ذریعوں سے ترکی پہنچتا ہے اور کچھ روپیہ ریشم کی قیمت کی صورت میں ایران چلا جاتا ہے۔ ترکی کے لوگ یمن سے قہوہ خریدتے ہیں۔ اس طرح اس روپیہ کا کافی حصہ یمن پہنچ جاتا ہے۔ ترکی 'یمن اور ایران تینوں ملک ہندوستان سے بہت سی چیزیں منگاتے ہیں اور اس طرح امریکہ سے چلا ہوا بہت سا روپیہ ہندوستان آجاتا ہے 'ڈچوں 'پرتگالیوں اور انگریزوں کے جہاز ہندوستانی مال 'پیگو 'سیلم 'جزائر مالدیپ وغیرہ مقامات پر لے جاتے ہیں اور اس تبادلہ میں سونا چاندی ہی لاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ڈچ لوگ جاپان کی کانوں سے جو سونا نکالتے ہیں اس کا کچھ حصہ کسی نہ کسی طرح ہندوستان آجاتا ہے" اور جو روپیہ براہِ راست فرانس اور پرتگال سے آتا ہے وہ بھی شاذ و نادر یہاں سے پھر باہر جاتا ہے کیونکہ اس کے ' بھی مال و اسباب ہی دیا جاتا ہے۔

ہندوستان کو غیر ممالک سے جو چیزیں منگانی پڑتی ہیں وہ یہ ہیں : تانبا 'سیسہ ' لونگ ' جائفل ' دار چینی وغیرہ ' ہاتھی 'گھوڑے 'گینڈے کے سینگ ' ہاتھی دانت 'سردے '

سیب' انگور' ناشپاتی' بادام' پستہ' خندق' کشمش' خوبانی وغیرہ' کوڑیاں موتی' عنبر' مشک' چینی کے برتن۔

یہ چیزیں یورپ کے مختلف ممالک' نیز ازبکستان' حبش' عرب' فارس' چین' جزائر مالدیپ وغیرہ سے آتی ہیں۔ مگر :

"ان چیزوں کے بدلے سونا چاندی نہیں جاتا کیونکہ جو سوداگر یہ چیزیں لاتے ہیں اس میں زیادہ فائدہ سمجھتے ہیں کہ ان کے تبادلہ میں یہاں کی چیزیں اپنے ملک کو لے جائیں"۔

برنیئر نے یہ ساری تفصیل فرانس کے مشہور ماہر اقتصادیات وزیر کول بیر کو لکھ کر بھیجی تھی اور کہا تھا کہ اگرچہ ہندوستان میں سونے چاندی کی دکانیں نہیں ہیں لیکن سونے چاندی کی بہت افراط ہے۔ بظاہر اس افراط کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے اس لیے کہ لوگ زیورات بنوا کر یا زمین میں گاڑ کر اس کو گردش میں آنے سے روک لیتے ہیں۔ کاروبار میں روپیہ لگانے سے عام طور پر لوگ گریز کرتے ہیں' لکھتا ہے :

"رعایا کی یہ غلامانہ حقیر حالت ترقی' تجارت کی مانع اور لوگوں کی اوضاع و اطوار اور طریقِ معاشرت کی خرابی کا باعث ہے اور تجارت کرنے کا کسی کو اس لیے حوصلہ نہیں ہوتا کہ منافع کی صورت میں بجائے اس کے کہ وہ اسے اپنے عیش و آرام میں صرف کرے اس کو دیکھ کر کسی ظالم اور ذی اختیار ہمسایہ کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔

زیور کا استعمال اس قدر عام ہے کہ فوجی چاہے خود بھوکا مرتا ہو لیکن اپنی بیوی اور بچوں کو زیور ضرور پہنائے گا۔ زیورات مثلاً کڑوں' توڑوں' بالیوں' نتھوں' انگوٹھیوں کے بار بار بننے میں کافی سونا کھنچ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں کافی مقدار زردوزی' کارچوبی کام کے کپڑوں' پگڑیوں کے طروں پٹکوں وغیرہ کے بنانے میں خرچ ہو جاتی ہے۔

تعلیمی حالات

برنیئر نے کہیں کہیں ہندوستان کے تعلیمی حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے بنارس کے متعلق اپنے تاثرات خاص طور پر بیان کیے ہیں۔ لکھتا ہے کہ بنارس کو ہندوؤں کا دارالعلم خیال کرنا چاہئے۔ ہندوستان میں اس کا مرتبہ وہی ہے جو قدیم یونان میں ایتھنز کا تھا۔ یہاں دور دور سے برہمن اور پنڈت آتے ہیں اور برسوں رہ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ طرزِ تعلیم قدیم مکتبوں کا ہے' باقاعدہ جماعتیں نہیں ہوتیں۔ پنڈت اپنے گھروں پر یا

شہر کے باغوں میں رہتے ہیں۔ چار سے لے کر ۵ اشاگرد تک ایک پنڈت کے پاس رہتے ہیں۔ عموماً ایک پنڈت چھ یا سات سے زیادہ شاگرد اپنی نگرانی میں نہیں لیتا۔ کوئی بہت ہی بڑا فاضل ہو تو پندرہ شاگردوں کی تعلیم و تربیت اپنے ذمے میں لیتا ہے۔ یہ شاگرد دس دس بارہ بارہ سال اپنے استادوں کے پاس رہتے اور تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایام طالب علمی میں ان کو صرف کھچڑی کھانے کے لیے ملتی ہے۔ اس کھچڑی پر جو صرف ہوتا ہے وہ دولتمند ساہوکار ادا کرتے ہیں۔ یہ ہندو طالب علم پہلے سنسکرت زبان سیکھتے ہیں پھر پرانوں کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اس کے بعد بعض طالب علم، علم فلسفہ حاصل کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ لکھتا ہے کہ ہندوستانیوں کی طبیعت میں سستی اور کاہلی ہوتی ہے۔ اس لیے فلسفہ میں بہت کم ترقی کرتے ہیں۔ طب پر ہندوؤں کے پاس بہت سی چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں لیکن ان کی ترتیب ناقص ہے۔ ان کو صرف نسخوں کا مجموعہ سمجھنا چاہئے علم ہیئت میں ہندوؤں کو خاصی مہارت ہے اور اپنے پتروں کی رو سے گرہن وغیرہ کے حساب صحیح بتا دیتے ہیں علم جغرافیہ سے ہندو ناواقف ہیں۔ دنیا کو چپٹی اور مثلث شکل کی بتاتے ہیں' کہتے ہیں کہ اس میں سات ولایتیں ہیں' اور ہر ولایت اپنے خاص سمندر سے گھری ہوئی ہے۔

بنارس میں سنسکرت کی کتابوں کا خاصہ ذخیرہ ہے۔ ایک بہت بڑا کمرہ ان سے بھرا ہوا ہے۔ ویدوں کے نسخے آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ لکھتا ہے کہ :

"دانش مند خاں کو وید حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ لیکن بڑی تلاش کے باوجود بھی دستیاب نہ ہو سکے۔

مسلمانوں کے نصابِ تعلیم کے متعلق اورنگ زیب کی رائے برنیئر نے بڑی تفصیل سے نقل کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نصاب تعلیم کے ناقص ہونے کا احساس کم از کم اونچے طبقہ میں پیدا ہو چلا تھا۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد اس کے استاد ملا محمد صالح دربار میں حاضر ہوئے امید یہ تھی کہ اب گرانقدر انعام ملیں گے اور مراتب میں اضافہ ہوگا۔ لیکن اورنگ زیب نے تین ماہ تک ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ پھر ایک دن خلوت میں طلب کیا۔ جہاں برنیئر کا آقا دانشمند خاں بھی موجود تھا اورنگ زیب نے اپنے استاد سے جو گفتگو کی تھی وہ برنیئر کو اپنے آقا ہی سے معلوم ہوئی۔ اورنگ زیب نے ملاجی کے طریقہ تعلیم، معلومات نصاب' ہر چیز کی تنقید کی اور کہا کہ آپ کی جغرافیہ دانی اور تاریخ کی معلومات کا یہ حال ہے کہ آپ نے مجھے پڑھایا کہ یورپ ایک چھوٹے سے جزیرہ سے زیادہ

نہیں ہے اور فرانس اور اندلس کے بادشاہ ہندوستان کے چھوٹے راجاؤں کی طرح ہیں۔

"کیا مجھ جیسے شخص کے استاد کو لازم نہ تھا کہ وہ دنیا کی ہر ایک قوم کے حالات سے مطلع کرتا۔ مثلاً ان کی جنگی قوت سے ان کے وسائل آمدنی اور طرز جنگ سے ان کے رسم ورواج، مذاہب اور طرز حکمرانی سے اور خاص امور سے جن کو وہ اپنے حق میں زیادہ مفید سمجھتے ہیں، تفصیل کے ساتھ علیحدہ علیحدہ مجھ کو بتاتا اور علم تاریخ مجھے ایسا سلسلہ وار پڑھاتا کہ میں ہر ایک سلطنت کی جڑ بنیاد اور اسبابِ ترقی و تنزل اور ان حادثات و واقعات اور غلطیوں سے واقف ہو جاتا جن کے باعث ان میں بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آئے ہیں"۔

اورنگ زیب نے پھر یہ اعتراض کیا کہ اس کا زیادہ وقت عربی زبان اس کی صرف و نحو کے سکھانے میں ضائع کر دیا گیا۔ حالانکہ چاہئے یہ تھا کہ ہمسایہ قوموں کی زبانیں سکھائی جاتیں۔

ملا صالح سے گفتگو کی یہ تفصیل تو دانش مند خاں نے برنیئر کو بتائی تھی۔ بعد کو بعض اور لوگوں سے اس نے یہ سنا کہ اورنگ زیب نے اپنی گفتگو میں کئی اور اہم باتیں بھی کی تھیں مثلاً یہ کہ کیا نماز صرف عربی زبان ہی کے ذریعہ ادا ہو سکتی ہے اور ہماری اصلی زبان میں اسی طرح نہیں ہو سکتی؟ آپ نے جو فلسفہ پڑھایا تھا اور جس طرح پڑھایا تھا اس سے ذہن کی تربیت کی امید نہیں ہو سکتی۔ ایسا فلسفہ پڑھانا چاہئے جس سے ذہن اس قابل ہو جائے کہ بغیر دلیلِ صحیح کسی چیز کو تسلیم نہ کرے۔ اس میں ضبط اور قابو پیدا ہو جائے کہ ترقی اور تنزل دونوں حالتوں میں اپنے آپ پر قابو رکھ سکے۔

اورنگ زیب کی یہ تنقید صرف ملا صالح کے طرز تعلیم پر نہ تھی بلکہ اس نصاب تعلیم کے خلاف آواز تھی جو سترھویں صدی میں رائج تھا اور جس کی افادیت مشتبہ ہو چلی تھی۔

ہندوستانی طریقۂ علاج

برنیئر طبیب تھا اور اسی حیثیت سے دانش مند خاں کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس نے ہندوستان کے طریقہ علاج کے متعلق بعض بے حد دلچسپ باتیں کہی ہیں لکھتا ہے کہ ہندوؤں کا خیال ہے کہ بخار میں فاقہ سب سے بڑا علاج ہے۔ وہ اس مرض میں شوربہ یا یخنی

سے زیادہ مضر کسی چیز کو نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں بخار والے کے معدہ میں فوراً خراب ہو جاتی ہیں۔ ہندو اطباء عام طور پر فصد لینے کو اچھا نہیں سمجھتے۔ مسلمان طبیب بھی بعض معالجات ہندوؤں کے طرز پر کرتے ہیں۔ بخار میں شوربہ اور یخنی سے پرہیز کرتے ہیں۔ فصد کے معاملہ میں ان کا نظریہ ہندوؤں سے مختلف ہے' وہ فصد بہت کھلواتے ہیں اور خون کافی مقدار میں نکلوا دیتے ہیں۔ بعض اوقات تو اٹھارہ یا بیس اونس خون تک فصد کے ذریعہ نکلوا دیتے ہیں۔

لکھتا ہے کہ ہندو علم تشریح اعضاء سے ناواقف ہیں۔ "کیونکہ وہ کبھی کسی انسان یا حیوان کے جسم کو نہیں چیرتے"۔ خود اپنا مشاہدہ بیان کرتا ہے کہ جب کبھی میں دانش مند خاں کو بکری چیر کر پکٹ (Pecquet) کے دوران خون کے نظریات سمجھاتا تھا تو ہندو ہمارے گھر سے حیران اور خوف زدہ ہو کر بھاگ جاتے تھے۔ کہتا ہے کہ اس رویہ کے باوجود ہندو اس فن سے ناآشنائے محض نہیں ہیں۔۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کے جسم میں پانچ ہزار رگیں ہیں نہ زیادہ نہ کم' گویا کہ بڑی صحت اور غور سے انہوں نے ان کا شمار کیا ہے۔"

ہندو مذہب کے متعلق برنیئر کی تحقیق

برنیئر نے ہندوستان میں قیام کے دوران میں ہندو مذہب کے بنیادی عقائد کے متعلق بھی تحقیق کی تھی۔ اس تحقیق میں اس کو دانشمند خاں کے علمی ذوق سے بڑی مدد مل گئی تھی۔ اس نے ہندو مذہب کے متعلق ایک علیحدہ رسالہ بھی لکھا تھا جس میں ہندوؤں کے مندروں کی تصویریں جمع کی تھیں۔ ہندوستان چھوڑنے سے کچھ عرصہ قبل وہ بنارس گیا جہاں ایک بہت بڑے پنڈت سے ملا اور اس کا کتب خانہ دیکھا اس پنڈت نے چھ اور پنڈتوں کو بھی بلا لیا۔ برنیئر نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور بت پرستی کے متعلق ہندو مذہب کا بنیادی نقطۂ نظر معلوم کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جو جواب دیا وہ برنیئر نے اسی طرح نقل کر دیا ہے۔ اس کو کم یا زیادہ کر کے نہیں لکھا" انہوں نے کہا:

"ہمارے مندروں میں بے شک مختلف مورتیں مثلاً برہما' مہادیو' گنیش اور گوری کی ہیں۔ جو ہمارے سب سے بڑے دیوتا ہیں۔ ان کی مورتوں اور بہت سی اور مورتوں کا جو ان سے درجے میں کم ہیں' ہم بڑا ادب کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے آگے ڈنڈوت کرتے ہیں اور بڑی عقیدت سے پھول' چاول' گھی' زعفران' خوشبوئیں اور ایسی ہی چیزیں ان پر چڑھاتے

ہیں۔ مگر باوجود اس کے ہمارا یہ اعتقاد نہیں کہ یہ مورتیں خود برہما یا بشن ہیں۔ بلکہ یہ قریب قریب ان کی اصل مورتوں یا شبیہوں کی ہیں۔ اور ہم ان کا ادب صرف اس دیوتا کی وجہ سے کرتے ہیں جس کی یہ مورتیں ہیں۔ اور جو پوجا ہم کرتے ہیں وہ دیوتا کے واسطے ہے نہ کہ مورت کے لیے۔ ہمارے مندروں میں یہ مورتیں اس لیے رکھی جاتی ہیں کہ دل قائم رکھنے کے واسطے جب تک نظر کو کسی خاص چیز پر نہ جمایا جائے پوجا عمدہ طور پر نہیں ہو سکتی۔ لیکن حقیقت میں اعتقاد ہمارا یہی ہے کہ خدا صرف وہی ایک ذات مطلق ہے اور صرف وہی سب کا مالک اور سب سے بڑھ کر ہے"۔

برنیئر کو یہ جواب سن کر شک پیدا ہوا کہ پنڈتوں نے عمداً اپنے خیالات کو ایسے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے جس سے رومن کیتھولک فرقے کے خیالات سے مشابہت پیدا ہو جائے کیونکہ اور برہموں کے خیالات اس سے بالکل مختلف تھے"۔

برنیئر نے ہندو مذہب کے متعلق جو معلومات فراہم کی تھی اور جو خیالات قائم کیے تھے ان کا خلاصہ یہ ہے۔ ہندو ویدوں کو الہامی کتاب مانتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ وید میں سب علوم ہیں۔ ہندو تناسخ یعنی آواگون کے قائل ہیں اور اسی وجہ سے جانوروں کے مارنے اور کھانے کو حرام سمجھتے ہیں۔ گائے کا خاص طور پر اس لیے احترام کرتے ہیں کہ اس کی دم پکڑ کر اس دریا (یعنی بے ترنی) سے پار ہوتا ہے جو دنیا اور آخرت کے مابین حائل ہے۔ پھر اس مسئلہ پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتا ہے:

"ممکن ہے کہ جن لوگوں نے پرانے وقتوں میں ایسے قانون بنائے تھے انہوں نے مصر کے چرواہوں کو اسی طرح بائیں ہاتھ سے بھینس یا گائے کی دم پکڑے ہوئے اور ان کے ہانکنے کے لیے دائیں ہاتھ میں لاٹھیاں لیے ہوئے دریائے نیل سے پار ہوتے دیکھا ہوگا۔ یا گائے کا اتنا بڑا لحاظ غالباً اس وجہ سے ہوگا کہ وہ ایک نہایت ہی فائدہ بخش جانور ہے اور دودھ اور گھی جو ان کی بڑی غذا ہے' اس سے حاصل ہوتا ہے اور یہ کہ بیل زراعت کا بڑا بھاری ذریعہ ہے اور اس وجہ سے گویا کہ گائے بیل ان کی زندگی کے محافظ ہیں۔ پس اگر ہندوستان میں فرانس اور انگلستان کی طرح گوشت کھایا جائے تو تمام جانور نابود ہو جائیں اور ملک بالکل بے زراعت رہ جائے۔"

وید کے مطابق ہر ہندو کا فرض ہے کہ رات دن میں تین مرتبہ مشرق کی طرف منہ کر کے پوجا اور تین ہی مرتبہ اشنان کرے۔ برنیئر نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ یہ قانون

ایسا ہے، جس پر سردی کے موسم میں سرد ملکوں میں عمل کرنا ناممکن ہے ہندوؤں نے جواب دیا کہ "ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمارا قانون ہر جگہ برتا جاسکتا ہے بلکہ خدا نے یہ محض ہمارے ہی واسطے بنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم غیر شخص کو اپنے مذہب میں نہیں لاسکتے"۔

وید کا قول ہے کہ جب خدا نے دنیا کو پیدا کرنا چاہا تو اپنا یہ ارادہ پورا کرنے کے لیے تین دیوتا۔ برہما' بشن' مہادیو پیدا کیے۔ برہما کے ذریعے اس نے دنیا کو پیدا کیا' بشن کے وسیلے سے وہ اس کو قائم رکھتا ہے' مہادیو کے ہاتھوں اس کو نیست و نابود کر دے گا۔ برنیئر کے بعض عیسائی دوستوں نے اس نظریئے سے اپنا مسئلہ تثلیث کی تائید کرنی چاہی تھی۔

ہندوؤں کا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری روحیں ذات الٰہی کا جزو ہیں۔ بعض فاضل پنڈتوں نے برنیئر سے صاف طور پر یہ کہا کہ اوتاروں کے قصے بالکل لغو ہیں اور محض اس لیے وضع کر لیے گئے ہیں تاکہ لوگ کسی نہ کسی قسم کے مذہب کے پابند رہیں۔

ہندوؤں کی تمام پوتھیوں میں اصول و مبادی اشیاء کا ذکر ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر چیز چھوٹے ناقابل تقسیم اجسام سے مرکب ہے۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ ہر چیز مادہ اور صورت سے مرکب ہے۔ لیکن اس فرق کو صاف طور پر واضح نہیں کرپاتے۔ بعض کی یہ رائے ہے کہ ہر چیز عناصر اربعہ اور لاشے یعنی "آکاش" سے مرکب ہے۔ لیکن وہ عناصر کے آپس میں مل جانے کی نسبت کچھ نہیں کہتے۔ بعض ہندو نور اور ظلمت ہی کو اصل مانتے ہیں۔ مختلف حلقوں میں مختلف اصولوں پر زور دیا جاتا ہے۔ لیکن سب میں ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ اصول و مبادی اشیاء ازلی و ابدی ہیں۔ دنیا کی عمر وہ چار جگ یعنی کروڑ سال بتاتے ہیں۔ پنڈتوں نے کہا کہ پہلے تین جگ اور چوتھے کا بیشتر حصہ یعنی "کل جگ" گزر چکا ہے۔ چوتھے جگ کے خاتمے پر دنیا نیست و نابود ہو جائے گی۔ بعض پنڈتوں نے بتایا کہ درختوں کے بیج نئے پیدا نہیں ہوتے بلکہ ابتدائے آفرینش سے ان کا وجود چلا آتا ہے اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے اور دوسرے مادوں میں ملے جلے پڑے رہتے ہیں۔ جس وقت برنیئر ہندوستان آیا تھا' ہندوستان میں بعض مسلمان مفکر اور ہندو فاضل وحدت وجود کے مسئلہ پر غور و فکر کر رہے تھے۔ ملا شاہ' دارا شکوہ' سرمد' وغیرہ اس نظریہ کے پرجوش مبلغ تھے۔ ادھر شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی کے مکتب خیال کے لوگ اس کی مخالفت پر کمر بستہ تھے۔ برنیئر لکھتا ہے:

"تھوڑا ہی عرصہ گزرا کہ اس مسئلہ کی بابت ہندوستان میں بڑا شور و غل تھا"۔

برنیئر نے وہ تمام تشبیہیں اور استعارات نقل کر دیئے ہیں جن کی مدد سے صوفیہ (جن کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ گلشن راز سے بہت متاثر ہیں) اور پنڈت اس مسئلہ کی تائید کیا کرتے تھے۔ برنیئر کا استاد گیسندی اس مسئلہ کا شدید ترین مخالف تھا اس بنا پر برنیئر نے بھی اس مسئلہ پر مخالفانہ انداز میں گفتگو کی ہے اور اس مسئلہ کے سماجی اور فکری امکانات کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔

ناگا فقیروں کے متعلق برنیئر کے تاثرات

برنیئر کو ہندو اور مسلمان فقیروں سے ملاقات کے بہت مواقع ملے اپنے سفر نامہ میں اس نے کئی جگہ ان فقیروں کی زندگی اور ان سے متعلق توہمات اور عوام کے عقاید کا ذکر کیا ہے۔

جوگیوں کے متعلق لکھتا ہے کہ بہت سے جوگی بالکل ننگے رہتے ہیں اور مندروں کے اردگرد یا تالابوں کے پاس بڑے بڑے درختوں کے نیچے راکھ کا بستر لیے پڑے رہتے ہیں۔ بعض کی لٹیں پنڈلیوں تک لٹکی ہوتی ہیں اور الجھ کر ان میں بہت سی گرہیں پڑ جاتی ہیں۔ بعضوں کے ناخن بڑھ کر مڑ جاتے ہیں۔ ایک جوگی کے ناخنوں کو برنیئر نے ناپا تو اس کی آدھی چھنگلی سے زیادہ نکلے۔ بعض جوگیوں نے اپنے ہاتھ اوپر کو اٹھا رکھے تھے اور سوکھ کر نہایت دبلے ہو گئے تھے۔ ان کے متعلق اپنے تاثرات اس طرح پیش کرتا ہے۔

"جوگیوں کا ننگا اور کالا جسم، لمبے لمبے بال، دبلی اور پتلی پتلی باہیں اور بل کھاتے ہوئے ناخن اور ڈراونی وضع جو میں نے بیان کی ہے اس عالم سفلی میں اس سے زیادہ مقہور شکل خیال میں نہیں آسکتی۔

برنیئر نے جب سرمد کو دہلی کے بازار کوچوں میں ننگا پھرتے ہوئے دیکھا تو اس کو بڑی نفرت پیدا ہوئی لکھتا ہے یہاں ناگا فقیروں کی ٹولیاں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں۔

برنیئر نے بہت سے فقیروں کو غیر طبعی طریقوں پر ریاضت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ لکھتا ہے:

"ان میں سے بہت سی صورتیں تو اس قدر سخت اور مشکل ہیں کہ ہمارے ملک کے نٹ بھی ان کی تقلید نہیں کر سکتے"۔

برنیئر نے ابتدا میں جب ان لوگوں کو دیکھا تو خیال ہوا شاید تقویٰ کی آخری منزل پر

پہنچ گئے ہیں لیکن بعد کو اس نے یہ رائے قائم کی کہ "آوارہ گردی کاہلی اور مطلق العنانی کی زندگی ان پر قوی اثر رکھتی ہے۔"

ستی کے متعلق برنیئر کے خیالات

ستی کی رسم کے متعلق برنیئر نے سیاحوں سے بہت کچھ سنا تھا۔ ہندوستان آکر اس نے اس مسئلہ کو بھی پوری طرح تحقیق کی۔ لکھتا ہے کہ سیاحوں کے بیانات میں بلاشک مبالغہ ہے۔ پہلے کی نسبت ستی کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے کیونکہ مسلمان بادشاہ اس رسم کے نیست ونابود کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ لیکن اس کے انسداد کے لیے انہوں نے کوئی قانون نہیں بنایا:

"کیونکہ ان کی پالیسی کا یہ ایک جزو ہے کہ ہندوؤں کی خصوصیات میں جن کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے دست اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ ان کی مذہبی رسوم کے بجالانے میں ان کو آزادی دیتے ہیں"۔

چنانچہ مسلمان بادشاہوں نے کوئی صاف قانون اس سلسلے میں نافذ کرنے کے بجائے یہ حکم دے دیا ہے کہ کوئی عورت اپنے صوبے کے حاکم کی اجازت کے بغیر ستی نہیں ہو سکتی۔ حاکم سے جب اجازت مانگی جاتی ہے تو وہ خود سمجھاتا ہے اور عورت کو اپنی محل سرا میں بھیج دیتا ہے تاکہ بیگمات اس کو سمجھائیں۔ اس تمام کوشش کے باوجود ستی ہونے والی عورتوں کی تعداد کافی ہوتی ہے۔

برنیئر نے ستی کے متعلق گفتگو کی تو اس کو اندازہ ہوا کہ ستی ہونا محبت کے سبب سے نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک خاص طور کی تعلیم وتربیت کا نتیجہ ہے۔ ہر ماں اپنی بیٹی کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ عورت کی پارسائی اور تعریف اسی میں ہے کہ اپنے خاوند کے ساتھ ستی ہو جائے۔ لکھتا ہے کہ جو عورتیں چتا میں سے بھاگ نکلتی ہیں وہ پھر ہندوؤں میں شامل نہیں ہو سکتیں اور خاکروبوں کے ساتھ رہ کر زندگی بسر کرتی ہیں۔ برنیئر خود ایک ایسی عورت سے ملا تھا جس نے خاکروبوں کی مدد سے اپنی جان بچائی تھی۔ لکھتا ہے کہ مغل بھی ایسی عورت کی جان بچانے سے ڈرتے ہیں۔ البتہ پرتگالیوں نے بعض بندرگاہوں میں ایسی عورتوں کو پناہ دی تھی۔

برنیئر نے اپنے مشاہدات اس سلسلے میں تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اس کا ایک

دوست بندی داس تپ دق میں مبتلا ہوا۔ خود برنیئر نے دو سال تک اس کا علاج کیا لیکن سود مند نہ ہوا۔ جب وہ مر گیا تو اس کی بیوہ نے ستی ہونے کا ارادہ کیا۔ برنیئر نے دانش مند خاں کی مدد سے اس عورت کو ستی ہونے سے روکا۔ جب برنیئر احمد آباد سے راجستھان ہو کر آگرہ جا رہا تھا تو ایک قصبے میں اس نے ایک عورت کو ستی ہوتے دیکھا تھا اور اس سے وہ بے حد متاثر ہوا تھا۔

برنیئر کے ان تمام تاثرات اور مشاہدات کو ایک مضمون میں سمیٹنا ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے اس نے ہندوستان کی سیاسی' سماجی اور اقتصادی زندگی کے ہر گوشے کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے تاثرات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں تخت نشینی کے لیے جنگ بالکل ناگزیر ہے کیونکہ جانشینی کے واضح اصول نہ ہونے کی وجہ سے کسی شہزادہ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہوتا کہ یا تو تخت کو خود حاصل کرے یا پھر اپنے بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہونے کے لیے تیار ہو جائے۔ امراء کے اعزاز موروثی نہ ہونے کی وجہ سے ایک مستقل طبقہ امراء وجود میں نہیں آ پاتا۔ جب تک ایسا نہ ہو گا سیاسی نظام کا استحکام ممکن نہیں ہے۔ کاشتکاروں کو زمین پر حق ملکیت حاصل ہونا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہونے کی وجہ سے کاشتکار کی زمین میں دلچسپی ختم ہو گئی ہے۔ ہندوستان کی پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے۔ یہاں کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ ضرورت ہے کہ کاشتکاری کے طریقوں میں اصلاح کی جائے۔ ہندوستان میں اہل ہنر کی کمی نہیں لیکن ان کی قدردانی صرف سلاطین و امراء تک محدود ہے۔ جب تک عوام' اہل حرفہ کی قدردانی نہ کریں گے صنعت و حرفت کی ترقی نہ ہو گی۔ تجارت کی طرف سے غفلت اور سونے کو دبا کر یا زیور بنا کر گردش سے روک لینا' اقتصادی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ مختصرا اس کے بارہ سالہ مشاہدات کا نچوڑ یہ ہے کہ ہندوستان میں مادی دولت بھی ہے اور انسانی ہنر کی دولت بھی' لیکن ان دونوں کا استعمال صحیح نہیں ہوتا۔

مصنف کا شام اور مصر کی سیر کے بعد بحر احمر کی راہ سے جدہ ہوتے ہوئے ''مخا'' میں پہنچنا اور وہاں سے حبش کا ارادہ چھوڑ کر ہندوستان میں آنا

چونکہ دنیا کی سیر کا مجھے نہایت شوق تھا۔ اس لئے ملک شام اور مصر کے دیکھ لینے کے بعد میں نے اپنے دل میں یہ ٹھہرایا کہ اپنی اس سیاحت کو کچھ اور وسعت دوں اور دریافت و تحقیقِ حالات کے لئے اس سرے سے اُس سرے تک بحر احمر کا سفر کروں۔ چنانچہ اپنے اس ارادہ کے پورا کرنے کے لئے ملک مصر کے دارالسلطنت قاہرہ (۱) سے کہ جہاں میں ایک برس سے زیادہ مقیم رہا تھا روانہ ہوا اور بتیس گھنٹے کے عرصہ میں (کارواں کے سفر کے حساب سے) شہر سویز میں آپہنچا اور یہاں سے ایک جہاز پر سوار ہو کر سترہ دن میں مقام جدہ جو مکہ (معظمہ) سے قریب دو پہر کے سفر کے ہے پہنچ گیا۔ یہاں پہنچنا میری توقع کے برخلاف تھا اور اس وعدہ کے بھی مخالف تھا جو مجھے بحر احمر (۲) کے ترکی حاکم کی طرف سے دیا گیا تھا۔ پس بہ مجبوری میں مسلمانوں کی اس مقدس زمین پر جہاز سے اترا جہاں کوئی عیسائی تاوقتیکہ غلام نہ ہو قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ الغرض ایسی حالت میں اس جگہ پانچ ہفتے قیام کر کے میں ایک چھوٹے سے جہاز پر جو ساحل یمن کو جاتا تھا سوار ہو لیا اور پندرہ دن کے عرصہ میں بمقام ''مخا'' جو آبنائے باب المندب کے نزدیک ہے پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر میرا یہ قصد تھا کہ مصوع اور آرکی کو کے جزیروں سے جو راستے میں ملیں گے گزرتا اور ان کو دیکھتا بھالتا ہوا ملک حبش کے پایۂ تخت گونڈار کو چلا جاؤں۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ حبش میں رومن کیتھلک مذہب کے لوگوں کو (جس کے ہم فرانسیسی

پیرو ہیں) سخت خطرہ ہے۔ کیونکہ جب سے بادشاہ حبش کی ماں کی کارسازیوں سے اس ملک میں پرتگیز قتل ہو چلے ہیں اور باقی ماندہ فرقہ جیسوئیٹ (۳) کے بڑے پادری سمیت جس کو وہ گوا (۴) سے اپنے ساتھ لائے تھے وہاں سے خارج کئے گئے اس ملک میں رومن کیتھلک محفوظ اور بے خطر نہیں ہیں۔ بلکہ میں نے یہ بھی سنا کہ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ مقام سواکن ایک بے چارے بد نصیب رومن کیتھلک درویش تک کا اس جرم میں سر کاٹا گیا ہے کہ اس نے اس ملک میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تھا۔ اس لئے یہ تدبیر مناسب اور کم خطر معلوم ہوئی کہ میں ایک یونانی یا ارمنی کا بھیس بنالوں اور اس بھیس میں جب بادشاہ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ میں اس کے واسطے کچھ مفید اور کارآمد ہو سکتا ہوں تو غالب ہے کہ وہ مجھے کچھ زمین دے دے گا اور بشرطیکہ مجھے اس قدر مقدور ہوا کچھ غلام خرید کر میں اس کا تردد دور کر سکوں گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کھٹکا پیدا ہوا کہ اس صورت میں مجھے وہاں شادی بھی ضرور کر لینی پڑے گی جیسے کہ ایک یورپی راہب کا جس نے اپنے کو ایک طبیب باشندہ یونان ظاہر کیا ہوا تھا جبراً بیاہ کر دیا گیا تھا اور پھر اس حالت میں مجھے اس ملک کے چھوڑنے کی امید قطع کرنی ہو گی۔

ان خیالات نے مع اور چند باتوں کے جن کا ذکر آگے کیا جائے گا مجھے اس امر پر مائل کیا کہ گوندا جانے کا ارادہ چھوڑ دوں اور اس لئے ایک ہندوستانی جہاز پر سوار ہو کر آبنائے باب المندب کی راہ سے بائیس دن میں مقام سورت جو ہندوستان کی ایک بندرگاہ سلطنتِ مغلیہ میں ہے آپہنچا۔

شاہ جہاں اور اس کا نسب

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بادشاہِ وقت کا نام شاہ جہاں ہے جو جہانگیر کا بیٹا اور اکبر کا پوتا اور ہمایوں کا پڑپوتا ہے۔ اور ہمایوں سے اوپر اس کا سلسلۂ نسب تیمور لنگ سے جا ملتا ہے۔ جس کو ہم یورپی عموماً "ترلین" کہتے ہیں۔ اس طرح پر کہ شاہ جہاں سلسلہ وار اس سے دسویں پشت میں ہے۔ (۵)

ہندوستان میں لفظ مغل کا صرف مغلوں سے مخصوص نہ ہونا اور سرکاری عہدوں کے ملنے میں اُن کی خصوصیت کا ہونا

تیمور جس کی ملک گیری کے واقعات مشہور و معروف ہیں اس نے اپنی ایک

رشتہ دار عورت یعنی اس بادشاہ کی اکلوتی بیٹی سے شادی کر لی تھی جو اس وقت تاتاریوں کی اس نامور قوم کا' جن کو مغل کہتے تھے فرماں روا تھا(۶)۔ مگر اب لفظ مغل ان سب غیر ملک کے رہنے والوں پر بولا جاتا ہے جو فی زمانہ ہندوستان پر (جس کے معنی ہیں ہندوؤں یا ہندیوں کا ملک) حکومت کرتے ہیں۔ مگر یہ قیاس نہ کرنا چاہئے کہ سلطنت مغلیہ میں بڑے بڑے معزز اور معتبر منصب صرف مغلوں ہی کو ملتے ہیں یا صرف یہی لوگ فوج میں عہدے پاتے ہیں بلکہ یہ منصب اور عہدے مغلوں اور سب ممالک کے مسلمانوں کو بغیر کسی طرح کی خصوصیت کے دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اکثر تو ایرانیوں کو اور بعض بعض عربوں کو اور کچھ ترکوں کو۔

مغل اور فرنگیوں اور ہندوؤں کی پہچان

جن لوگوں کو آج کل یہاں مغل کہا جاتا ہے ان کی پہچان کے واسطے یہ نشان کافی ہے کہ چہرہ کا رنگ گورا ہو اور مذہب اسلام۔ اور یورپ کے عیسائیوں کی جن کو یہاں فرنگی کہتے ہیں یہ پہچان ہے کہ رنگ سفید ہو اور مذہب عیسائی اور ہندوؤں کی یہ علامت ہے کہ رنگ گندمی ہو اور مذہب بت پرستی۔(۷)

شاہ جہاں کی ضعیفی اور اس کے بیٹوں کا باہمی فساد

میں نے یہاں آکر یہ بھی معلوم کیا کہ شاہ جہاں کی عمر اس وقت قریب ۷۰ برس کے ہے اور اس کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں اور چند سال ہوئے کہ اس نے چاروں بیٹوں کو اپنی نیابت اور قائم مقامی کے طور پر ہندوستان میں بڑے بڑے چار صوبے' جن کو سلطنت کے حصے کہنا چاہئے' دے دیئے ہیں اور یہ بھی دریافت ہوا کہ بادشاہ ایک سال کے عرصہ سے ایسا بیمار رہتا ہے کہ جس سے اس کی زندگی کا اندیشہ ہے اور اس کے بیٹوں نے باپ کی یہ حالت دیکھ کر حصول سلطنت کے لئے منصوبے باندھنے اور چالیں چلنی شروع کر رکھی ہیں اور ان کے باہم جنگ وجدال جاری ہے۔

مصنف کا نوکری اختیار کر لینا

چونکہ میں اس ملک میں پہنچ کر غارت گروں کے ہاتھ سے مال واسباب سے لٹ

جانے اور پانچ ہفتہ کے سفر کے اخراجات کثیر کی وجہ سے جو سورت سے آگرہ اور دہلی تک پہنچنے میں مجھے پیش آئے تھے تنگ دست ہو گیا تھا اس لئے طبیبوں کی ذیل میں میں نے سرکار شاہی میں نوکری اختیار کر لی تھی اور پھر تھوڑی مدت بعد دانشمند خاں (۸) کی سرکار سے میرا تعلق ہو گیا جو اوّل میر بخشی کے عہدہ پر مامور تھا اور نہایت ذی اقتدار اور ممتاز ترین اُمرائے دربار سے ہو گیا تھا اور ممالک ایشیا میں ایک بہت بڑا عالم فاضل تھا۔ چونکہ آٹھ برس تک کے تعلقات کے سبب سے جو دربار مغلیہ سے مجھے رہے تھے اس جنگ و جدال کے بعض اہم واقعات کو میں نے بچشم خود دیکھا ہے اس لئے میں ان کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔

شاہ جہاں کی اولاد کے نام اور وجہ تسمیہ

شاہ جہاں کے بڑے بیٹے کا نام دارا شکوہ، دوسرے کا سلطان شجاع، تیسرے کا اورنگ زیب، چوتھے کا مراد بخش اور دونوں بیٹیوں میں سے بڑی کا نام بیگم صاحب (۹) اور چھوٹی کا روشن آرا بیگم تھا۔ اس ملک میں یہ دستور ہے کہ خاندان شاہی کے سلاطین اور بیگمات کے نام ایسے رکھتے ہیں جو شان و شوکت سلطنت پر دلالت کریں۔ چنانچہ شاہ جہاں کی بیگم جو حسن و جمال میں مشہور تھی اس کا نام تاج محل (۱۰) تھا جس کا وہ عالیشان اور اعجوبۂ روزگار مقبرہ آگرہ میں ہے جس کے مقابلہ میں اہرام مصر (۱۱) جو منجملہ عجائبات دنیا سمجھے جاتے ہیں محض ان گھڑ پتھروں کے ڈھیر اور ناموزوں تودہ ہائے سنگ نظر آتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جہانگیر کی بیگم کا نام اوّل نور محل (۱۲) تھا۔ پھر نور جہاں بیگم ہوا، جس نے مدت تک اپنے شوہر کی ایسی حالت میں کہ بجز شراب خوری اور عیش پسندی کے اس نے سب کاموں کو چھوڑ رکھا تھا' امور سلطنت اور ملک داری کو خود انجام دیا۔

اُمرائے سلطنت کا مالک زمین نہ ہونا اور صرف شاندار خطابوں سے ملقب کیا جانا

ہندوستان میں جو یہ بڑے بڑے اور ممتاز نام اعیان خاندان شاہی اور امرا کے رکھے جاتے ہیں اور یورپ کی طرح ایسے خطاب نہیں دیئے جاتے جو مشتق اور منسوب بہ ملکیت اور قبضہ اراضیات و ممالک ہوں' اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں تمام مملکت کی زمینیں خالصہ شریفہ یعنی ملک سرکار شاہی سمجھی جاتی ہیں۔ اس لئے یورپ کی طرح یہاں کوئی

ارل یا مارکوئس یا ڈیوک نہیں ہو سکتا کیونکہ امرائے دربار کو خواہ جاگیر' خواہ نقد جو کچھ دیا جاتا ہے وہ صرف بطور پنشن اور ذاتی مدد معاش کے دیا جاتا ہے۔ جس کا مقرر کرنا صرف بادشاہ وقت کی مرضی پر موقوف ہے اور جب وہ چاہتا ہے اس میں کمی یا بیشی کر دیتا ہے۔ خواہ ضبط کر لیتا ہے۔ اس لئے یہ بات کچھ قابلِ تعجب نہیں کہ امرائے سلطنت صرف مذکورہ بالا طور کے ذیشان خطابوں سے مشرف و ممتاز کئے جائیں۔ مثلاً کوئی شیر افگن خاں! کوئی صف شکن خاں! کوئی رعد انداز خاں! کوئی برق انداز خاں! اور علیٰ ہٰذ القیاس' دیانت خاں' دانشمند خاں' فاضل خاں وغیرہ وغیرہ۔

دارا شکوہ کے مزاج اور خصلت کا بیان

اوصافِ حمیدہ اور خصائلِ پسندیدہ کی دارا شکوہ میں کچھ کمی نہ تھی۔ وہ گفتگو میں بہت شیریں زبان اور حاضر جوابی میں تیز اور نہایت خوش خلق اور بے حد فیاض اور دریادل تھا۔ مگر بااین ہمہ بڑا ہی خود پسند اور خود رائے تھا اور اس کو یہ گھمنڈ تھا کہ میں اپنی عقل کی رسائی اور خوش تدبیری سے ہر امر کا بندوبست اور انتظام کر سکتا ہوں اور کوئی فرد بشر ایسا نہیں جو مجھے صلاح و مشورہ دے سکے۔ وہ اُن لوگوں سے جو اُسے ڈرتے ڈرتے کوئی صلاح دینے کی جرأت کر بیٹھتے تھے تحقیر اور اہانت سے پیش آتا تھا۔ چنانچہ اس ناپسندیدہ سلوک ہی کے سبب سے اس کے دلی خیر خواہ بھی اُس کے بھائیوں کی پوشیدہ اور مخفی بندشوں سے اسے آگاہ نہ کر سکے! وہ ڈرانے اور دھمکانے میں بڑا تیز تھا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے امرا کو بُرا بھلا کہہ بیٹھتا اور ان کی ہتک کر ڈالتا تھا۔ لیکن اس کا غصہ اور بد مزاجی ایک آن کی آن میں جاتی رہتی تھی۔ یہ شہزادہ ازروئے ولادت جس طرح مسلمان پیدا ہوا تھا اگرچہ شعائر مذہب اسلام کی بجاآوری کے موقعوں میں ہمیشہ شریک ہوتا رہتا تھا اور اُسی طرح پر گویا اس مذہب کے متبع اور پیرو ہونے کا اعلانیہ اقرار کرتا تھا لیکن اپنے اوقات تخلیہ میں ہندوؤں کے ساتھ ہندو اور عیسائیوں میں عیسائی تھا۔ چنانچہ پنڈتوں اور ہندو سادھوؤں کو ہمیشہ اپنی صحبت میں رکھتا تھا اور ان کے لئے بڑے بڑے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ ان حالات سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں ہی کے اثرِ صحبت سے اس کے عقیدۂ اسلام سے بوئے ضعف آنے لگی تھی۔ لیکن اس مقدمہ میں ہم اپنی رائے اس موقع پر بیان کریں گے جہاں ہندوؤں کے طریقِ عبادت اور پرستش کا ذکر لکھیں گے۔ علاوہ بریں کچھ دنوں

تک پادری بوزی صاحب مقتدائے فرقہ جیسوئیٹ کے مواعظ دینیہ کو بھی بہت رغبت سے سنتا رہا تھا اور ان مواعظ کی خوبیوں اور صداقت پر کچھ اعتقاد بھی رکھنے لگا تھا۔ مگر بعض یوں کہتے ہیں کہ در حقیقت کسی مذہب کا بھی معتقد نہ تھا۔ اور یہ ظاہری حالات اور خیالات محض دل لگی اور شوقِ تحقیقات کے لئے اس نے اختیار کر رکھے تھے اور بعض کی یہ رائے ہے کہ کبھی جو وہ عیسائی پن دکھاتا تھا تو اس میں یہ مصلحت تھی کہ عیسائی لوگ جو اس کے توپخانہ میں بھرتی تھے اور جن کی تعداد بھی ذرا زیادہ تھی اس کو پسند کریں۔ اور ہندو پن ظاہر کرنے سے یہ غرض تھی کہ باج گزار ہندو راجاؤں کی تالیف قلوب کر کے اپنی محبت اُن کے دل میں پیدا کرے۔ اور حقیقت میں ذی اقتدار راجاؤں سے باخلاق و محبت پیش آنا اُس کے لئے ایک ضروری امر تھا تاکہ ضرورت کے وقت اُن کا اتفاق اور رفاقت حاصل کر سکے۔ لیکن عیسائیوں خواہ ہندوؤں کے مذاہب اور عقائد کی طرف میل کرنے کے یہ جھوٹے حیلے کسی طرح سے اس کے منصوبوں کی کامیابی میں کچھ کار آمد اور مفید نہ ہوئے۔ بلکہ برخلاف پڑے۔ چنانچہ اس تاریخ (۱۳) کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اورنگ زیب نے جو اس کا قتل جائز ٹھہرایا تھا تو اس کی وجہ یہی ظاہر کی تھی کہ وہ کافر اور لامذہب ہو گیا ہے۔

سلطان شجاع کے خصائل و شمائل کا بیان

شاہ جہاں کا دوسرا بیٹا سلطان شجاع اوضاع و عادات میں اکثر اپنے بھائی دارا شکوہ کے مشابہ تھا۔ لیکن یہ زیادہ فہیم اور اپنے عزم اور ارادوں میں زیادہ قائم و مستقل اور دارا شکوہ سے حسنِ تمیز اور ہوشیاری اور ایسے اوضاع و اطوار میں جو شہزادوں کے لئے زیبا ہیں بڑھا ہوا تھا۔ سازشوں اور بندشوں کو خوبی عمل میں لانا جانتا تھا۔ اور بذریعہ ایسے انعاموں کے جو بارہا مخفی اور پوشیدہ طور پر دیا کرتا تھا بڑے بڑے ذی قدرت امرائے دربار اور خصوصاً بڑے بڑے ذی اقتدار راجاؤں مثل جسونت سنگھ (۱۴) وغیرہ سے دوستی کا پیدا کرنا خوب جانتا تھا۔ مگر باوجود ان اوصاف کے نہایت عشرت پسند اور مغلوب العیش تھا اور جب اپنی بے شمار حرموں اور اربابِ نشاط وغیرہ کے جلسہ میں ہوتا تو تمام دن اور رات رقص و سرود اور شراب نوشی میں بسر کرتا اور کوئی مصاحب جس کو اپنی خیریت درکار تھی ایسے اوقات میں اُس کو ان حرکات سے روکنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی وجہ سے اس

کے امور سلطنت اکثر درہم وبرہم رہتے تھے اور اس کی محبت رعایا کے دل میں اکثر کم تھی۔ اگر چہ اس کا باپ اور بھائی ترکان روم یعنی اہلِ سنت وجماعت کا مذہب رکھتے تھے' مگر سلطان شجاع ایرانیوں کے عقائد یعنی مذہب شیعہ کا علانیہ معتقد اور مُقر تھا۔ واضح ہو کہ دین اسلام میں بہت سے فرقے ہیں جیسا کہ کتاب گلستاں کے نامور مصنف شیخ سعدی کے ایک شعر کے ترجمہ سے جو ذیل میں درج ہے دریافت ہوتا ہے۔ ترجمہ بیت (۱۵)" میں ایک درویش بادہ نوش اور محض رندِ مشرب ہوں اور بہتر فرقے مجھ کو خوب جانتے ہیں"۔ منجملہ ان فرقوں کے دو فرقے ایسے ہیں جن کا باہمی تعصب اس درجہ کو پہنچا ہوا ہے کہ دونوں آپس میں جانی دشمن ہیں۔ ایک ان میں سے ترک یعنی رومی ہیں جس کو ایرانی لوگ عثمانی یعنی پیروانِ عثمان کہتے ہیں اور یہ عثمان کو سچا اور اصلی قائم مقام اور خلیفہ اپنے پیغمبر کا سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ خلیفہ یعنی سب اہلِ اسلام کا فرماں روائے اعلیٰ' جو تاویلات الفاظ قرآنی اور اجتہاد کر سکتا ہو اور فیصلہ قضایا اور مباحث اور تنازعات شرعیہ کا استحقاق رکھتا ہو' صرف وہی ہے (۱۶)۔ دوسرا فرقہ ایرانیوں کا ہے جس کو ترک لوگ رافضی یا شیعہ اور علی مردان کہتے ہیں۔ ان لفظوں کے معنی ہیں ایک ایسا فرقہ جو عام فرقہ اہل اسلام سے خارج ہو یا بدعتی اور طرفداران علیؑ۔ کیونکہ ایرانی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خلافت وامامت صرف علی کا حق تھا جو پیغمبر کے داماد تھے۔ سلطان شجاع نے جو مذہب شیعہ قبول کر لیا تھا حسبِ ظاہر اس میں یہ حکمت تھی کہ اس بات کو اپنے امور سلطنت کی مطلب برآری کا ذریعہ جانتا تھا کیونکہ شاہ جہاں کی سلطنت میں ایرانی بڑے بڑے مقتدر عہدہ دار اور دربار میں بے حد صاحبِ اختیار تھے اور شجاع کو یہ امید تھی کہ جب کبھی کوئی معرکہ آن کر پڑے گا اور موقع پیش آئے گا تو مجھے اُن سے بحالتِ ضرورت ہر قسم کی مدد ملے گی اور فائدہ پہنچے گا۔

اورنگ زیب کے مزاج اور عادت کا بیان

تیسرا بھائی اورنگ زیب اگر چہ اس قدر خوش اخلاقی اور کشادہ روئی اور فراخ مزاجی کی صفات سے' جو داراشکوہ میں موجود تھیں' موصوف نہ تھا۔ لیکن اس کی رائے ایسے معتمد اور وفادار شخصوں کے انتخاب کرنے میں جو اس کی خدمات کو نمک حلالی اور قابلیت کے ساتھ بجالانے کی بہت زیادہ لیاقت رکھتے تھے' بہت سلیم اور صائب تھی۔ اور اگر چہ انعام و اکرام یہ بھی کثرت سے دیا کرتا تھا لیکن موقع اور امتیاز سے اور صرف اُن

لوگوں کو دیتا تھا جن کی رضامندی اور تالیف وترغیب کو ضروری سمجھتا تھا۔ وہ اپنے بھید کو نہایت چھپائے رکھتا تھا اور مکاری اور ریاکاری کے فن میں تو کامل استاد تھا۔ چنانچہ جب اپنے باپ کے دربار اور دارالسلطنت میں حاضر و موجود ہوتا تو بناوٹ سے بلاناغہ لباسی عبادت بجا لاتا اور دنیاوی حشمت و مکنت کی نسبت حقارت اور نفرت ظاہر کرتا۔ حالانکہ آئندہ کی شوکت اور سربلندی کے لئے درپردہ راستہ نکالنے میں استحکام کے ساتھ سعی و کوشش کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ جن دنوں اس کو دکن کا صوبہ دار مقرر کیا گیا تب بھی اہل دربار کو یہی جتلاتا رہا کہ اگر مجھے ترکِ دنیا اور درویشی کی اجازت مل جاتی تو زیادہ خوش ہوتا کیونکہ میری دلی تمنا یہی تھی کہ باقی زندگی پارسائی اور عبادت ہی میں صرف کروں اور افکار دنیاوی اور امورِ سلطنت کی ذمہ داری میں پڑنا مجھے نامرغوب اور ناپسند ہے۔ اگرچہ حقیقتاً اس کی عمر فریبوں اور سازشوں اور منصوبوں ہی میں گزری لیکن اس فریب کی چال کو اس عقلمندی سے چلتا تھا کہ دربار میں سوائے اُس کے بھائی داراشکوہ کے ہر ایک نے اُس کے اس رویہ کے سمجھنے میں دھوکا کھایا۔ شاہ جہاں کے حسنِ ظن پر جو اس کو اپنے اس چھوٹے بیٹے کی نسبت تھا داراشکوہ کو بہت حسد ہوتا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی اپنے ہمدرد مصاحبوں سے کہا کرتا تھا کہ مجھے اپنے سب بھائیوں میں سے اگر شبہ اور خوف ہے تو انہی حضرتِ دیندار اور نمازی صاحب کا ہے۔

شہزادہ مراد بخش کی سیرت کا بیان

مراد بخش جو شاہ جہاں کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اپنے بڑے بھائیوں سے دانائی اور ہوشمندی میں کم تھا اور صرف خوش خوری اور شکار ہی کا اس کو زیادہ شوق تھا۔ مگر بہر حال سخی اور خلیق بھی تھا اور اکثر یوں شیخی بگھارا کرتا تھا کہ ہمیں بھید اور رازداریوں سے سروکار نہیں ہے۔ وہ سازشوں اور تخلیوں کو حقیر و خوار سمجھتا تھا اور اس بات کا اعلان و اشتہار اُس کو منظورِ خاطر تھا کہ میں صرف اپنی تلوار اور قوتِ بازو پر بھروسہ رکھتا ہوں اور فی الواقع مراد بخش شجاعت اور دلیری کا پتلا تھا اور شجاعت کے ساتھ اگر کسی قدر بیداری اور ہوشیاری بھی اُس میں ہوتی تو غالباً اپنے تینوں بھائیوں پر غالب آتا اور بے خلش ہند کا فرماں روا ہو جاتا۔ (۱۷)

شاہ جہاں کی بڑی بیٹی بیگم صاحب کا ذِکر

شاہ جہاں کی بڑی بیٹی بیگم صاحب بے حد حسین اور خوش اندام اور باپ کی

نہایت ہی پیاری تھی۔ ایسے غیر طبعی میلان کی افواہ کی نسبت اشارہ کرنا ایک بہت نا مطبوع واقعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ عذر بے گناہی و برأت جس پر شاہ جہاں کے دل کو اس معاملہ میں اطمینان ہو گیا مُلا اور فقیہہ لوگوں کا وہ جھوٹا فتویٰ (۱۸) تھا جو اس تمہید سے دیا گیا تھا کہ بادشاہ کو اس درخت کے میوہ سے متمتع ہونا جس کو اس نے خود اگایا ہے۔ جائز اور درست ہے!۔ شاہ جہاں کو اپنی اس منظور نظر فرزند پر بے حد اعتماد تھا اور وہ اس کی سلامتی کی محافظ اور نگہبان تھی اور یہاں تک احتیاط رکھتی تھی کہ کسی قسم کا کھانا کیوں نہ ہو جب تک خاص اس کے روبرو تیار نہ ہوتا تھا بادشاہ کے دستر خوان پر نہیں لگایا جاتا تھا۔ پس بیگم صاحب کو امور شاہ جہانی میں اس قدر بے حد اقتدار و اختیار کا حاصل ہونا اور بادشاہ کے مزاج کی باگ اس کے ہاتھ میں ہونی اور سلطنت کے بڑے اور اہم معاملات میں اُس کی قدرت اور اختیارات کا ایسا کامل ہونا کوئی عجیب امر نہیں ہے۔

اس شہزادی نے اپنے کثیر المقدار شاہی علوفوں اور وظیفوں سے جو اس کے لئے مقرر تھے اور ان بے بہا پیشکشوں اور نذرانوں سے جو چاروں طرف سے بطور نذرانہ اور شکرانہ درستی ان بے شمار معاملات کے اس کے لئے آتے تھے جو صرف اسی کی رائے پر انتظام و انصرام پاتے تھے بہت کچھ دولت جمع کی تھی (۱۹)۔ یہاں تک کہ اُس کے بھائی دارا شکوہ کے معاملات کی کامیابی اور سرسبزی بھی اُسی کے وسیلہ سے تھی اور بادشاہ کی مہربانی اور نظر عنایت صرف اسی وجہ سے اس کو حاصل تھی کہ بیگم صاحب نے نہایت مستعدی اور سرگرمی سے اُس کی نفع رسانی اپنے ذمہ لے لی تھی اور اپنے تئیں علانیہ اس کا طرفدار ظاہر کرتی تھی۔ ادھر دارا شکوہ کے دل پر بھی بیگم صاحب کی رفاقت اور امداد کا نقش خوبی جم گیا تھا۔ چنانچہ اکثر لوگ یہ خیال کیا کرتے تھے کہ اس کے عوض میں اس نے بیگم صاحب سے یہ وعدہ کیا ہوا تھا کہ اپنی تخت نشینی کے وقت آپ کو نکاح کر لینے کی اجازت دے دوں گا۔ دارا شکوہ کا یہ وعدہ سلاطین ہندوستان کے آئین کے برخلاف تھا جس کی رو سے شہزادیوں کی شادی بالکل ممنوع ہے (۲۰)۔ اس ممانعت کی وجہ اوّل تو یہ ہے کہ کوئی شخص بادشاہی خاندان کے رشتہ اور قرابت کے لائق نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری یہ کہ یہ کھٹکا رہتا ہے کہ کہیں شہزادی کا شوہر اس تقریب سے اقتدار پا کر تاج و تخت کی جستجو اور حرص نہ کرنے لگ جائے۔

میں اس جگہ دو داستانیں جو اس شہزادی کی عشق بازی سے متعلق ہیں بیان کرنی چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ کوئی شخص میری نسبت یہ گمان نہ کرے گا کہ میں نے ان مضامین کو افسانہ طرازی اور اعجوبہ نگاری کی تمنا سے بیان کرنا چاہا ہے۔ کیونکہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ ایسے واقعات ہیں جو تاریخ میں کارآمد ہیں۔ اور میرا خاص مدعا اور مطلب یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کے رسوم وعادات کے صحیح اور درست حالات بیان کروں۔

حرکات عشقیہ اگرچہ ہر ملک میں مذموم اور باعث جرائم ہیں مگر جس شدت سے ممالک ایشیا میں خطرناک ہیں اس قدر یورپ میں نہیں ہیں۔ چنانچہ ہمارے ملک فرانس میں ایسی حرکتوں کے ذکر ومذکور اگرچہ چندروز کے لئے لوگوں کو صرف ایک ہنسی اور خوش طبعی کا ذریعہ رہتے ہیں جس کو تھوڑے عرصہ میں سب بھول بھال جاتے ہیں لیکن مشرقی ملکوں میں ایسی صورتیں بہت کم پائی جاتی ہیں کہ جن میں عشقیہ تعلقات سے بدانجام واقعات اور نہایت ہیبت ناک مصائب اور حرکات سرزد نہ ہوتی ہوں۔

بیگم صاحب کا ایک شخص سے تعشق پیدا کرنا اور اُس کا حمام کی دیگ میں جلایا جانا

کہتے ہیں کہ بیگم صاحب اگرچہ محل سرا میں حسب معمول محصور رہتی تھی اور محل کی اور مستورات کی طرح اُس کی بھی نگہبانی ہوتی تھی مگر کسی مخفی طور سے اُس کے پاس ایک نوجوان شخص کی آمد ورفت ہوگئی جو اگرچہ کوئی خاندانی آدمی نہ تھا مگر حسین بہت تھا لیکن اُس کی کسی ایسی حرکت کا اس کی ہم جنس اور ہر وقت کی محافظوں سے مخفی رہنا ممکن نہ تھا اور جبکہ یہ عورتیں بیگم صاحب کے رشک وحسد سے پہلے ہی جل رہی تھیں تو یہ بھید کس طرح نہ کھل جاتا۔ الغرض شاہ جہان بھی بیگم صاحب کی خطا ولغزش سے واقف ہوگیا اور یہ ارادہ کر کے کہ خلافِ معمول محل میں جاکر اس ماجرا کو دریافت کرنا چاہئے ناگہاں وہاں چلا گیا۔ اب چونکہ بادشاہ کے آنے کی خبر بیگم صاحب کو ایسی جلدی نہ مل سکی کہ اس شخص کو کسی مناسب جگہ چھپادیتی اس لئے "بہ ناچاری" اُس کے خوف زدہ جوان عاشق کو حمام کی ایک بڑی دیگ میں چھپنا پڑا۔ اس واردات کے ملاحظہ سے بادشاہ کے چہرہ پر نہ توکچھ تعجب ہی کے آثار ظاہر ہوئے اور نہ کچھ غصہ اور ناخوشی ہی معلوم ہوئی بلکہ بیٹی سے معمولی باتیں کرتا رہا۔ لیکن کسی قدر بات چیت کے بعد کہا کہ معلوم ہوتا ہے تم

نے آج حسبِ معمول غسل نہیں کیا! حمام کرنا چاہئے اور خواجہ سراؤں کو حکم دیا کہ دیگ کے تلے آگ جلائیں۔ اور جب تک کہ انہوں نے اسے یہ نہ جتلا دیا کہ اس کا وہ قسمت کا مارا کشتۂ رقابت جل کر خاک ہو گیا ہے، وہاں سے نہ ہلا۔

بیگم صاحب کا ایک دوسرے شخص سے تعلق پیدا کرنا اور اس کا انجام کار

چند مدت بعد بیگم صاحب نے ایک اور مشغلہ پیدا کیا۔ جس کا نتیجہ اور انجام بھی ایسا ہی دردناک ظہور میں آیا۔ یعنی آپ نے اپنی خانسامانی کے عہدہ کے واسطے ناظر خاں یا نذیر خاں (۲۱) نامی ایک ایرانی نوجوان کو، جو مشہور و معروف صاحب جمال اور نہایت قابل و دانشمند اور ازبس شجاع و صاحب حوصلہ امیر تھا اور جس کو تمام اہلِ دربار عزیز رکھتے تھے، پسند فرمایا۔ چونکہ اورنگ زیب کا ماموں شائستہ خاں بھی اس کو بہت اچھا اور معقول شخص سمجھتا تھا اس لئے اس نے اس جوکھوں میں پڑنے کی دلیری کر کے بادشاہ سے عرض کیا کہ یہ شخص اس قابل ہے کہ بیگم صاحب کا عقد اس سے کیا جائے۔ مگر شائستہ خاں کی اس تجویز کو شاہ جہاں نے نہایت ناشائستہ اور ناپسندیدہ سمجھا اور چونکہ وہ پہلے ہی سے کسی قدر کھٹکا ہوا تھا کہ اس کے اور شہزادی کے باہم کسی قسم کا ناجائز تعلق ہے، اس سے اس کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا اور یہ سنتے ہی اس بے چارہ نوجوان کو اس دنیا سے چلتا کرنے کے لئے کسی بڑی تدبیر یا زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہ سمجھی اور فوراً اظہار مہربانی کے طور پر دربار عام میں اپنے ہاتھ سے ایک پان کا بیڑہ اُس صاف باطن جوان کو، جس کے دل میں کسی طرح کا شک و شبہ نہ تھا، عنایت کیا۔ ! چونکہ اس سلطنت میں یہ رسم ایک نہایت اعزاز و امتیاز کی علامت ہے اس لئے وہ اس پان کو لے کر دستور کے موافق چبانے لگا اور کم بخت نے ذرا بھی خیال نہ کیا کہ مجھے اس ہنس مکھ بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے زہر دے دیا ہے۔ بلکہ اس خیال باطل میں کہ غالباً اب بادشاہ کی نظر الطاف سے میرے لئے روز افزوں ترقیاں ہونے والی ہیں، مسرور و محظوظ دربار سے رخصت ہو کر اپنی پالکی میں سوار ہوا۔ مگر زہر کی تیزی اور سرعت اس درجہ تھی کہ وہ گھر پہنچنے سے پہلے ہی دوسرے گھر پہنچ گیا۔

ہندوستان کے لوگ پان میں ایک چیز کے کچھ باریک اور نازک سے ورق اور تھوڑا سا چونہ جو کوڑیوں سے بنتا ہے اور کچھ اور مصالحہ ملایا کرتے ہیں۔ اور پان کھانے سے یہ مدعا ہے کہ منہ معطر اور خوشبودار اور لب سرخ ہو جاتے ہیں۔

روشن آرا بیگم کے مزاج اور عادت کا ذکر

شاہ جہاں کی چھوٹی بیٹی روشن آرا بیگم اگر چہ بہن سے حسن و جمال میں کم اور خوش فہمی میں بھی کچھ ایسی مشہور نہ تھی۔ مگر باوجود اس کے وہی زندہ دلی اُس کے مزاج میں بھی موجود اور ویسی ہی عیش پسند تھی اور جس قدر بیگم صاحب دارا شکوہ کی طرفدار تھی' اتنی ہی یہ اورنگ زیب کی خالص جانب دار اور ان دونوں کی علانیہ دشمن تھی اور یہی سبب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس نہ تو اتنی دولت ہی تھی اور نہ امورِ سلطنت ہی میں اس قدر اختیار اور دخل تھا۔ مگر پھر بھی چونکہ محل میں بود و باش کی شریک اور فنِ فریب میں کامل تھی' جاسوسوں کی معرفت کام کی باتیں اور ضروری خبریں اورنگ زیب کے پاس پہنچاتی رہتی تھی۔

بیٹوں کی مفسد مزاجی سے شاہ جہاں کا متوہم ہونا اور اُن کو دُور دست صوبوں میں حاکم بنا کر بھیج دینا

لڑائی سے چند سال پہلے شاہ جہاں کا دل اپنے مفسد مزاج بیٹوں کی طرف سے خوف اور اضطراب میں تھا اور اگر چہ وہ چاروں عاقل و بالغ اور صاحبِ اہل و عیال تھے لیکن برادرانہ سلوک اور ایسے مضبوط رشتہ کی رعایت کو بالائے طاق رکھ کر سلطنت کی ہوس میں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ دربار میں ان کے طرفداروں کے بھی جدا جدا دھڑے بندھ گئے تھے۔ ان سببوں (وجوہات) سے بادشاہ جو اپنی سلامتی ہی کے لئے لرزتا کانپتا رہتا تھا' جب ان کی ایسی ناگوار حرکتیں مشاہدہ کرتا (جن کے خمیازے آخر کار اُس کو خود اٹھانے پڑے) تو اپنے کو ایک عجیب طرح کے عذاب میں گرفتار سمجھ کر نہایت آرزو کے ساتھ یہ چاہتا تھا کہ ان کو گوالیار کے قلعہ میں جو بڑا مضبوط اور مستحکم اور ایک بلند اور کڈھب چٹان دار پہاڑی پر بنا ہوا ہے اور جس کا فتح کرنا مشکل ہے اور جس میں بادشاہی خاندان کے سلاطین وغیرہ اکثر مقید اور نظر بند رہا کرتے ہیں' قید کرے۔ لیکن اس نے سوچ سمجھ کر آخر کار اپنے دل میں اس بات کو مان لیا تھا کہ حقیقت میں یہ اب ایسے زبردست ہو گئے ہیں کہ ان سے اس قسم کا سلوک کرنا ایک سرسری اَمر نہیں رہا۔ اس کو ان کی طرف سے رات دن یہی تردّد اور تفکر لاحق رہتے تھے کہ اگر یہ باہم بھڑ گئے تو یا اپنے

لئے علیحدہ علیحدہ مستقل سلطنتیں قائم کرلیں گے یا پائے تخت کو میدان جنگ بنا کر خلق خدا کی خونریزی اور قتل و قمع کے بعد اپنی اپنی قسمت کا فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ اس نے ان پیش آنے والی آفتوں اور قضیوں سے بچنے کے لئے یہ تجویز نکالی کہ چاروں کو چار دور دست صوبوں کی حکومتیں دے کر الگ الگ کر دیا جائے۔ پس سلطان شجاع کو بنگالہ اورنگ زیب کو دکن مراد بخش کو گجرات اور داراشکوہ کو ملتان اور کابل کا حاکم مقرر کیا (۲۲)۔

داراشکوہ کے سوا تینوں بھائیوں کا اپنی اپنی جائے مقررّہ کو چلے جانا اور اُن کی خودسرانہ کارروائیوں کا بیان

داراشکوہ کے سوا یہ سب شہزادے بلا توقف اپنے اپنے صوبوں کو چلے گئے۔ مگر وہاں پہنچتے ہی اپنی مفسد طبیعتوں کے بخار نکالنے لگے۔ اور خودسر بادشاہوں کی سی حکمرانیاں شروع کر دیں۔ چنانچہ ملک کی آمدنی اپنے ذاتی امور میں صرف کرنے لگے اور ہر ایک نے بڑی بڑی مہیب فوجیں اس بہانہ سے بھرتی کر لیں کہ پائے تخت کی کمک اور ملک میں امن وامان قائم رکھنے اور حدود ممالک غیر پر رعب وداب کے لئے اس کی ضرورت ہے۔

داراشکوہ کا پائے تخت کو نہ چھوڑنا اور باپ بیٹے کا منافقانہ برتاؤ

لیکن داراشکوہ نے جو سب سے بڑا اور اسی وجہ سے تخت نشینی (۲۳) کا متوقع تھا پائے تخت کو نہ چھوڑا اور اس سبب سے کہ شاہ جہاں نے بھی اُس کو احکام شاہی کے اجرا کے اختیارات سپرد کر دیئے تھے اور یہ بھی اجازت دے دی تھی کہ ایک چھوٹے تخت پر جو بادشاہی تخت سے نیچا ہو خود بادشاہ کے سامنے دربار میں جلوس کیا کرے۔

ایک ہی وقت میں دو مساوی الاختیار فرمانروا دربار میں جلوہ گر نظر آنے لگے۔ ان باتوں سے اگرچہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود بادشاہ ہی داراشکوہ کی امیدوں کی تائید کرتا تھا۔ لیکن اس بات کے باور کر لینے کی معقول وجہ موجود ہے کہ اگرچہ داراشکوہ باپ کے ساتھ ادب و محبت کے طریقوں سے پیش آتا تھا مگر شاہ جہاں ریاکاری اور دو رنگی برتتا تھا اور اس کہن سال بادشاہ کو برابر یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں مجھ کو زہر نہ دے دیا جائے اور ظن غالب ہے کہ بادشاہ کی پوشیدہ خط و کتابت اورنگ زیب سے جاری رہتی تھی جس کی نسبت اس کو ہمیشہ اعتماد تھا کہ سلطنت اور ملک داری کے لئے یہ لڑکا بہت لائق و فائق ہے۔

اس کتاب کے ان مطالب کی توضیح و تشریح کے لئے جن کا ذکر آئندہ آنے والا ہے یہ مختصر بیان شاہ جہاں اور اس کے بیٹوں کی باہمی حالت کا بطورِ تمہید لکھ دینا ضروری تھا اور اسی طرح اس کی دونوں بیٹیوں کا بھی کچھ کچھ حال درج کر دینا واجب تھا کیونکہ یہ بھی ان دردناک واقعات میں ایک بڑی حصہ دار تھیں اور اس کے سوا ہندوستان اور قسطنطنیہ اور اور (دیگر) ایشیائی ملکوں میں بڑی بڑی سنگین اور اہم وارداتیں اکثر عورتوں کے اختیار و اقتدار کے باعث سرزد ہو جایا کرتی ہیں اور اکثر لوگ ان کے وقوع کے اصلی سببوں (وجوہات) سے ناواقف ہوتے ہیں اور ان کا باعث بعض اور باتوں کو سمجھ لیا کرتے ہیں۔

میر جُملہ کا ذِکر

اب شاہ جہاں کے بیٹوں کے جنگ و جدال کے واقعات لکھنے سے پہلے اگر اسی طرح کچھ حالات اورنگ زیب اور شاہ گول کنڈا اور اس کے وزیر میر جُملہ کے بھی مجمل طور پر لکھ دیئے جائیں تو اُمید ہے کہ ناظرین کو مطالب کتاب کے سمجھنے میں زیادہ آسانی اور غالباً اس شخص کی چالاکیوں اور فیلسوفیوں کی نسبت 'جو اس تمام تاریخی کارنامہ کا رُستم اور ہندوستان کا آئندہ بادشاہ ہے' ایک بصیرت حاصل ہو جائے گی۔

میر جُملہ نے جن تدبیروں اور حکمتوں سے شاہ جہاں کے فرزندِ ثالث کے اقتدار اور سلطنت کی بنیاد قائم کی اس کی شرح اس طرح ہے۔

جس وقت اورنگ زیب کو دکن کی صوبہ داری سپرد کی گئی تھی' میر جُملہ (۲۴) شاہ گول کنڈا کا وزیر اور اس کی تمام فوج کا سپہ سالار اور تمام ہندوستان میں ایک مشہور و معروف شخص تھا اور اگرچہ خاندانی اور پشتینی امیر نہ تھا لیکن نہایت ہی قابل اور ذی لیاقت انسان تھا اور جیسا کہ سپاہ گری میں کامل تھا ویسا ہی معاملاتِ تجارت کو بھی خوب سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی دولت 'جو بہت ہی تھی صرف گول کنڈا کی متمول سلطنت کی وزارت کے وسیلہ سے نہیں بلکہ اپنی وسیع تجارت کے ذریعہ سے جو اکثر ملکوں میں جاری تھی اور ہیروں کی کانوں کے ٹھیکوں سے جو اور شخصوں کے ناموں سے لے رکھے تھے' حاصل کی تھی۔ ان کانوں کی کھدائی انتھک محنت اور سرگرمی سے جاری رہتی تھی اور ہیروں کی برآمد اس کثرت سے تھی کہ اس کے ہاں یہ قاعدہ اور معمول تھا کہ ان کا شمار نہ کیا جاتا تھا۔ بلکہ ہیروں سے بھری ہوئی ٹاٹ کی تھیلیوں کو تُلوایا جاتا تھا (۲۵)۔ اور جب

اس بات پر خیال کیا جائے کہ وہ صرف اپنے بادشاہ ہی کی فوج کا سپہ سالار نہ تھا بلکہ خاص اپنے خرچ سے اپنی ایک جرار فوج مع ایک توپخانہ کے جس میں اکثر عیسائی لوگ ملازم تھے ہمیشہ تیار رکھتا تھا تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اس کا پولیٹیکل رعب وداب اور اختیار و اقتدار کس قدر بڑھا ہوا ہوگا اور یہاں یہ بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ اس نے ملک کرناٹک کی فتح کا بہانہ بنا کر وہاں کے ہندوؤں کے تمام مندروں اور قدیمی عبادت خانوں کو لوٹ لیا تھا اور اس طرح سے اپنی دولت و حشمت بے قیاس حد کو پہنچالی تھی۔

میر جملہ کی ان بن اس کے آقا بادشاہ گولکنڈا سے

میر جملہ کی اس طاقت و شوکت کو دیکھ کر شاہ گول کنڈا کے دل میں رشک و حسد کا پیدا ہونا ایک طبعی امر تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی سرگرمی سے لیکن نہایت اخفا اور سکوت کے ساتھ اس کے قتل کرانے یا اپنے ہاں سے نکال دینے کی تدبیریں سوچنی شروع کیں۔ کیونکہ بجائے ایک مطیع نوکر کے وہ اب اس کو ایک خطرناک رقیب سمجھنے لگا تھا۔ اور وزیر کے خیر خواہ اور جاں نثار لوگوں کی وجہ سے جو اس کے گردوپیش موجود رہتے تھے اپنے اس ارادہ کو احتیاطاً بہت مخفی رکھتا تھا۔ لیکن ایک موقع پر جب کہ اول ہی دفعہ اس کو یہ خبر ملی کہ میر جملہ اور اس کی والدہ کے باہم جو ہنوز صاحب حسن و جمال تھی ایک نامناسب تعلق ہے (۲۶)۔ وہ عداوت جو اس کے دل میں پہلے سے تھی پوشیدہ نہ رہ سکی اور بے اختیار بول اٹھا کہ اس زبردست مجرم سے اس حرکت کا انتقام لینا ضروریات سے ہے۔ اب اگرچہ یہ اس وقت کرناٹک میں تھا لیکن اس سبب سے کہ دربار کے سب بڑے بڑے عہدہ دار اس کے رشتہ دار تھے اس خطرناک واقعہ کی اس کو بہت جلد خبر پہنچ گئی۔ اس لئے اس چالاک اور حیلہ ساز وزیر نے پہلے تو یہ کام کیا کہ اپنے اکلوتے بیٹے محمد امیر خاں (۲۷) کو جو بادشاہ کی خدمت میں حاضر تھا، اس مضمون کا خط لکھا کہ جس حیلہ اور بہانہ سے ممکن ہو اس مہم میں اپنے شریک ہونے کی ضرورت شدید ظاہر کر کے فوراً میرے پاس چلے آؤ اور جب اس کے وہاں سے بچ کر نکل آنے سے بباعث اس سخت نگرانی کے جو بادشاہ کی طرف سے اس پر تھی مایوس ہوا تو مستعدی کے ساتھ فوراً وہ بے باکی اختیار کی جس نے شاہ گول کنڈا کو بربادی اور تباہی کے کنارے پہنچا دیا۔ عقلمندوں نے سچ کہا ہے کہ "جو بادشاہ اپنے بھید اور مشورے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا وہ اپنی سلطنت کو نہیں بچا سکتا"۔

میر جملہ کا اورنگ زیب کو عریضہ لکھنا اور پناہ دہی کے عوض میں گولکنڈا کے فتح کرا دینے کا وعدہ کرنا

میر جملہ نے اورنگ زیب کو جو دولت آباد (۲۸) میں تھا اس مضمون کا عریضہ لکھا کہ ''میں نے بادشاہ گول کنڈا کی وہ بڑی بڑی خدمتیں کی ہیں کہ جن کو تمام زمانہ جانتا ہے اور جن کے لئے اس کو میرا بہت ہی ممنون ہونا چاہئے مگر اس پر بھی وہ میری اور میرے خاندان کی بربادی اور بیخ کنی کی فکر میں ہے' اس لئے میں آپ کی پناہ لینا اور آپ کے حضور میں حاضر ہونا چاہتا ہوں اور اس درخواست کی قبولیت کے شکرانہ میں کہ جس کی پذیرائی کی آپ کی جانب سے کامل امید ہے ایک منصوبہ عرض کرتا ہوں کہ جس کے ذریعہ سے آپ بآسانی اس بادشاہ کو گرفتار کر کے اس کے ملک پر قبضہ کر سکیں گے۔ آپ میرے اس وعدہ کی سچائی پر اعتبار اور بھروسہ فرمائیں۔ اور یہ مہم انشاء اللہ نہ تو کچھ مشکل ہی ہوگی اور نہ کچھ خطرناک ہی۔ یعنی آپ پانچ چار ہزار چیدہ سواروں کے ساتھ بہت جلد اور بلا توقف کوچ کرتے ہوئے گول کنڈا کی طرف چلے آئیں جس میں صرف سولہ دن لگیں گے اور یہ مشہور کر دیں کہ شاہ جہاں کا سفیر شاہ گول کنڈا سے بعض ضروری معاملات میں گفتگو کرنے کو بھاگ نگر (۲۹) جاتا ہے۔ اور یہ فوج اس کی اردلی میں ہے اور چونکہ وہ ''دبیر'' جس کے توسط سے ہمیشہ ایسے امور کی اطلاع بادشاہ کو ہوا کرتی ہے' میرا قریبی رشتہ دار ہے۔ اور اس پر مجھے کامل بھروسہ ہے' میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک ایسا حکم جاری ہو جائے گا کہ جس کی وجہ سے بغیر پیدا ہونے کسی شک وشبہ کے' آپ بھاگ نگر کے دروازہ پر پہنچ جائیں گے اور گولکنڈا والے آپ کو سفیر کے سوا کوئی اور شخص نہ سمجھیں گے۔ پس جب بادشاہ معمول کے موافق فرمان کے استقبال کو جو سفیر کے پاس ہوا کرتا ہے' آئے تو آپ اس کو بآسانی پکڑ کر جو کچھ مناسب جانیں اس کی نسبت تجویز کر سکتے ہیں۔ مع ہٰذہ اس مہم کا کل خرچہ میں آپ کو دوں گا اور اس کے اختتام تک پچاس ہزار روپیہ روز دیتا رہوں گا۔

میر جملہ کے لکھنے کے موافق اورنگ زیب کا ایک فریب سے گولکنڈا کو کوچ کرنا اور بے خلش بھاگ نگر پہنچ جانا اور شاہ گولکنڈا کا بھاگ کر قلعہ

میں پناہ لینا

اورنگ زیب جو ہمیشہ ایسے ہی منصوبوں میں لگا رہتا تھا میر جملہ کی استدعا کے موافق فوراً تیاری کر کے گول کنڈا کی طرف چل کھڑا ہوا اور ایسی ہوشیاری سے اس تدبیر کو بجالایا کہ بھاگ نگر پہنچ گیا اور کسی نے نہ جانا کہ یہ مہیب فوج سفیر کی ہمرکابی کے سوا کسی اور مقصد سے آئی ہے۔ یہاں تک کہ بادشاہ اس دستور کے موافق جو ایسے سفیروں کے آنے کے موقع کے لئے مقرر تھا اس مصنوعی ایلچی کی ملاقات کے واسطے اپنے باغ کو سوار ہو آیا۔ مگر جبکہ وہ بلا وسواس اپنے دغاباز دشمن کی طرف جا رہا تھا اور قریب تھا کہ اس تدبیر کے بموجب جو پہلے سے گانٹھی ہوئی تھی اس کو دس بارہ غلام گرفتار کر لیں اور اورنگ زیب کا منصوبہ چل جائے اُس کی خوش قسمتی سے ایک امیر نے جو اِس راز سے واقف اور اِس میں شریک تھا ناگہاں پشیمانی اور ترحم کی وجہ سے چلا کر کہہ دیا کہ "جہاں پناہ جھٹ پٹ نکل جایئے ورنہ آپ پھنس جائیں گے۔ یہ اورنگ زیب ہے ایلچی نہیں"۔ اس موقع پر بادشاہ کو جو حیرانی اور پریشانی لاحق ہوئی اس کا کیا کہنا! پس وہ گھوڑے پر سوار ہو کر بگٹٹ قلعہ گولکنڈا کی طرف جو اس کی معمولی قیام گاہ بھاگ نگر سے صرف ایک فرسنگ کے قریب تھا بھاگا اور اس میں جا داخل ہوا۔ (۳۰)

اورنگ زیب کا بھاگ نگر کو لوٹ کر گول کنڈا کو گھیر لینا اور محاصرہ اٹھا لینے کے لئے شاہ جہاں کی طرف سے فرمان کا پہنچنا اور اس کا سبب اور ذِکر اُن شرطوں کا جو اورنگ زیب نے گولکنڈا کے بادشاہ پر عاید کیں

اورنگ زیب اگرچہ اپنے شکار سے ناامید ہوا لیکن خیال کیا کہ اب ڈرنے کا موقع نہیں ہے۔ بلا خوف وخطر اس کی گرفتاری کے واسطے کوشش اور تدبیر جاری رکھنی چاہئے۔ پس سب سے پہلے یہ کام کیا کہ بھاگ نگر کے تمام شاہی محلوں کو لوٹ لیا اور کل قیمتی اور بیش بہا اجناس واسباب پر قبضہ کر لیا (۳۱)۔ لیکن محل کی عورتوں کو مشرقی بادشاہوں کے دستور کے موافق بڑی احتیاط سے بادشاہ کے پاس بھیج دیا اور اگرچہ توپوں کے نہ ہونے کے سبب سے ناچار تھا مگر تاہم یہی ٹھان لیا کہ قلعہ کا محاصرہ کرنا چاہئے کیونکہ اس صورت میں بادشاہ کو رسد وغیرہ کے نہ پہنچنے کے سبب سے دیر تک بچاؤ کرنا مشکل ہوگا! لیکن محاصرہ سے

دو مہینے بعد شاہ جہاں کی طرف سے اس مضمون کا قطعی حکم پہنچا کہ مہم سے ہاتھ اٹھا کر بلا توقف دکن کو لوٹ جاؤ۔ اب اگرچہ اس کو بخوبی معلوم تھا کہ یہ حکم داراشکوہ اور بیگم صاحب کی تحریک و ترغیب سے صادر ہوا ہے (کیونکہ دُور اندیشی اور عاقبت بینی سے ان کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ اگر اورنگ زیب کو بادشاہ گول کنڈا کی نسبت اپنے منصوبوں کے عمل میں لانے کی اجازت مل جائے گی تو وہ بہت زبردست ہو جائے گا) اور اس وجہ سے دل ہی دل میں بہت پیچ و تاب کھایا۔ لیکن نہایت درجہ اطاعت دکھانے کی غرض سے حکم کی تعمیل کو مقدم رکھا مگر محاصرہ اٹھا لینے سے پہلے فوج کشی کے اخراجات کا ایک بڑا معاوضہ اور حرجانہ شاہ گول کنڈا سے وصول کیا اور یہ عہد و پیمان ٹھہر الیا کہ میر جُملہ کو اپنے خاندان اور مال و اسباب اور فوج سمیت صحیح سلامت چلے جانے کی اجازت دی جائے اور گول کنڈا کے روپیہ پر شاہ جہاں کا سکہ لگا کرے۔ اس کے علاوہ محمد سلطان (۳۲) کی شادی بادشاہ کی بڑی بیٹی سے کر لی۔ اور جبراً یہ وعدہ بھی کرا لیا کہ شہزادہ موصوف اب سے سلطنت گول کنڈا کا ولی عہد (۳۳) سمجھا جائے گا اور جہیز میں رام گڑھ کا قلعہ بھی مع اس کے تمام توابع اور متعلقات کے لے لیا۔

اورنگ زیب کا میر جُملہ کو ساتھ لے کر دولت آباد کو واپس جاتے ہوئے راستہ میں بدر کو فتح کر لینا

اورنگ زیب نے دکن کو واپس جاتے ہوئے میر جُملہ کے اتفاق سے جو اس کی پناہ میں آچکا تھا اوّل (۳۴) بدر کے قلعہ کو جو بیجاپور کے ملک میں ایک مستحکم جگہ ہے' گھیر کر فتح کر لیا اور پھر دونوں دولت آباد پہنچ کر اتحاد اور محبت کے ساتھ رہنے اور آئندہ شوکت و عظمت کے لئے بڑے بڑے منصوبے باندھنے لگے۔ چنانچہ ان کے اس اتفاق کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم اور قابلِ یادگار واقعہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اورنگ زیب کو شہرت عظمت اور سلطنت جو کچھ حاصل ہوا وہ سب اسی اتفاق کی بدولت تھا۔

میر جُملہ کا حسب الطلب آگرہ آنا اور شاہ جہاں کو اپنی بھاری پیشکش میں ایک بے نظیر ہیرا نذر کرنا اور گولکنڈا اور بیجاپور پر چڑھائی کرنے کی

ترغیب دینا

دولت آباد پہنچتے ہی میر جملہ نے اپنی حسن تدبیر سے ایسے منصوبے دوڑائے کہ شاہ جہاں کی طرف سے حاضر دربار ہونے کے لئے متواتر پیغام آگئے اور آخر کار وہ پایہ تخت آگرہ میں جا پہنچا اور بادشاہ کے لئے نہایت عجیب و غریب پیشکش اپنے ساتھ لایا۔ کیونکہ اس کو امید تھی کہ اس ذریعہ سے شاہجہاں کو گول کنڈا اور بیجاپور اور پرتگیزوں سے لڑائی شروع کر دینے کی ترغیب دے سکوں گا۔ چنانچہ جب دربار میں حاضر ہوا تو وہ الماس نذر کیا جو مقدار اور خوبصورتی میں عموماً بے نظیر سمجھا جاتا ہے اور گول کنڈا کی فتح کے بہت سے فوائد بیان کئے اور عرض کیا کہ گول کنڈا کے جواہرات قندھار کے پتھروں اور چٹانوں کی نسبت جس پر حضور آج کل مہم کرنا چاہتے ہیں یقیناً زیادہ لحاظ اور شاہانہ توجہ کے قابل ہیں اور یہ بھی گزارش کیا کہ حضور کو گولکنڈا کی سمت میں اپنی جنگی تدبیر میں اس وقت تک کہ تمام ملک راس کماری تک فتح ہو جائے برابر جاری رکھنی چاہئیں۔ (۳۵)

ہیروں اور جواہرات کے لالچ یا دارا شکوہ کے دھمکانے ڈرانے کی غرض سے میر جملہ کی تجویز کا منظور ہونا اور اُسی کو سپہ سالار بنا کر بھیجا جانا

کچھ بعید نہیں کہ ہیروں کے لالچ نے شاہ جہاں کے دل پر یہ تاثیر کی ہو کہ اس نے میر جملہ کی تجویز کو قبول کر لیا۔ لیکن اکثر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اصل میں شاہ جہاں نے دارا شکوہ کی روز افزوں بے ادبیوں کے روکنے کی غرض سے اس مہم کو نئی فوج بھرتی کر لینے کے لئے ایک معقول بہانہ سمجھ کر میر جملہ کی صلاح کو مان لیا تھا۔ بہر حال شاہ جہاں کا کچھ ہی مطلب و مدعا ہو مگر اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ دکن کی طرف ایک فوج بہ سپہ سالاری میر جملہ بھیجی جائے۔

ان دِنوں دارا شکوہ کی نسبت شاہجہاں کی ناراضی بڑھ جانے کی وجہ

دارا شکوہ سے شاہ جہاں کے ناراض ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے خود سر اور مختار مطلق بن جانے کے لئے ان دنوں بعض اعلانیہ کوششیں کی تھیں بلکہ ایک ایسی حرکت ہو گئی تھی کہ جس کے باعث شاہ جہاں کو اس سے سخت نفرت اور خوف ہو گیا تھا اور اس کی اس خطا کے معاف کرنے پر مائل نہ تھا۔ یعنی سعد اللہ خاں کو جسے شاہ جہاں تمام

ممالک ایشیا میں ایک بڑا ہی قابل اور لائق وزیر سمجھتا تھا اور جس سے اس قدر اُلفت رکھتا تھا کہ تمام دربار میں اُس کی محبت ضرب المثل ہو گئی تھی' مرواڈالا تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ کیا جرم تھا جس کے سبب سے دارا شکوہ نے اسے واجب القتل تصور کیا۔ شاید یہ سمجھا ہو گا کہ شاہ جہاں کے گزر جانے کی حالت میں اپنے اقتدار کی وجہ سے یہ امر اس کے اختیار میں ہو گا کہ جسے چاہے تخت پر بٹھا دے۔ یا بادشاہت کا تاج سلطان شجاع کے سر پر رکھ دے۔ کیونکہ وہ اس کا حامی اور طرفدار معلوم ہوتا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے دل میں لوگوں کی بعض افواہوں نے جو سعد اللہ خاں کے ارادوں کی نسبت مشہور تھیں' اثر کیا ہو۔ مگر اس کے ساتھ یہ امر بھی غور کے قابل ہے سعد اللہ خاں جو نسل کے اعتبار سے ایک ہندوی الاصل شخص (۳۶) تھا' اس سے ایرانی امرا کو بڑا حسد تھا' چنانچہ ان افواہوں میں سے جو اس کی نسبت اڑادی گئی تھیں ایک افواہ یہ تھی کہ اس نے یہ منصوبہ باندھ رکھا ہے کہ شاہ جہاں کی وفات کے بعد اولادِ تیمور کو تخت سے محروم کر کے یا تو پٹھانوں (۳۷) کے شاہی خاندان کو پھر قائم کرے گا یا خود تخت نشین ہو جائے گا یا اپنے بیٹے کو بادشاہ بنائے گا اور اس افواہ کی تائید کے لئے یہ قرینہ تھا کہ سعد اللہ خاں کی بیوی قوم کی پٹھانی تھی اور ایک یہ بات بھی گھڑی گئی تھی کہ اس نے پٹھانوں کے کئی مستعد دستے اپنے منصوبہ کی تائید کے واسطے متفرق مقامات میں لگا رکھے ہیں۔ (۳۸)

اورنگ زیب کی طاقت بڑھ جانے کے اندیشہ سے دارا شکوہ کا اس مہم کی کارروائی کے متعلق بادشاہ سے چند شرطیں مقرر کرانا

چونکہ دارا شکوہ خوب جانتا تھا کہ یہ بڑی فوج جو دکن کو بھیجی جاتی ہے اس سے اورنگ زیب کے زور و طاقت کو تقویت ہو جائے گی اس لئے اس نے اس معاملہ میں بہت کچھ بحث مباحثہ کیا اور ہر حکمت اور حیلہ سے جو اس سے بن سکا اس منصوبہ کو روکنا چاہا لیکن جب دیکھا کہ بادشاہ کو اس سے باز رکھنا ناممکن ہے تو آخر کار کچھ سمجھا بجھا کر یہ شرطیں مقرر کرادیں۔

اول یہ کہ اورنگ زیب اس معرکہ میں کسی قسم کا دخل نہ دے۔

دوسری یہ کہ وہ اپنا قیام بالکل دولت آباد میں رکھے۔

تیسری یہ کہ جو ملک اس کے سپرد ہے اس کے نظم و نسق کے سوا اورنگ زیب

کو اس مہم سے کچھ سروکار نہ ہوگا۔

چوتھی یہ کہ فوج کی سپہ سالاری و حکومت اور جزو کل اختیار صرف میر جملہ کے ہاتھ میں رہے مگر وہ تمام اپنے اہل و عیال کو اپنی وفاداری کی کفالت کے طور پر دربار میں چھوڑ جائے۔

یہ پچھلی بات اگرچہ میر جملہ کو نہایت ناگوار تھی لیکن شاہ جہاں نے یہ سمجھا کر راضی کر لیا کہ یہ صرف دارا شکوہ کی خوشی کی خاطر اور رفع وسواس کے لئے ہے اور تخوبی مطمئن کر دیا کہ تمہارے اہل و عیال عنقریب تم سے آملیں گے۔ الغرض میر جملہ اس جرار فوج کا سپہ سالار بن کر دکن کی طرف روانہ ہوا اور وہاں سے بلا توقف کوچ کر کے بیجاپور کے ملک میں جا داخل ہوا اور کلیانی کا محاصرہ شروع کر دیا جو ایک بڑی مضبوط اور مستحکم جگہ ہے۔(۳۹)

ایسے نازک اوقات میں عیاشی کی افراط سے شاہ جہاں کا سخت مریض ہو جانا

اس وقت جبکہ سلطنت کا یہ نقشہ تھا اور شاہ جہاں کی عمر ستر سے تجاوز کر چکی تھی وہ ایسی بیماری (۴۰) میں مبتلا ہو گیا جس کی حقیقت کا بیان کرنا مناسب نہیں ہے اور صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ایک ایسی عمر کے آدمی کو بہت نازیبا ہے کہ احتیاط کے ساتھ حفاظت کرنے کے عوض اپنی طبیعت کی باقی ماندہ طاقت اور توانائی کو بھی برباد اور تلف کر دے۔

چاروں شہزادوں کا حصولِ سلطنت کے ارادہ سے فوجیں جمع کرنا اور طرح طرح کی چالیں چلنا

بادشاہ کی اس بیماری سے تمام قلمرو میں ایک سخت پریشانی اور تہلکہ پڑ گیا۔ چنانچہ دہلی اور آگرہ میں جو پائے تخت سلطنت میں دارا شکوہ نے ایک بڑی زبردست فوج جمع کی اور بنگالہ میں شجاع نے ایسی ہی تیاریاں کیں ادھر دکن اور گجرات میں اورنگ زیب اور مراد بخش نے ایسی فوجیں بھرتی کیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کا کیا ارادہ ہے اور چاروں نے ہر طرف سے اپنے اپنے رفیق اور مددگار بلا کر جمع کئے اور ادھر ادھر خط لکھ بھیجے اور بڑے

بڑے وعدے اور عہد و پیمان لئے اور طرح طرح کی بندشیں اور سازشیں کرنی شروع کیں۔

داراشکوہ کا ان کے بعض سازشی کاغذ پکڑ کر باپ کو دکھانا مگر بادشاہ کا اس سے بدستور متوہم اور مشتبہ رہنا

اگرچہ داراشکوہ نے ان میں سے کچھ کاغذ پکڑ کر باپ کو دکھائے اور بھائیوں کی سخت شکایتیں کیں اور بیگم صاحب نے بھی موقع دیکھ کر بہت سا لگاؤ بجھاؤ کیا۔ لیکن بادشاہ کو داراشکوہ پر بالکل اعتبار نہ تھا یہاں تک کہ اسے کامل شبہ تھا کہ وہ اسے زہر دلوانے کی فکر میں ہے اور اس سبب سے کھانے پینے میں بہت ہی احتیاط برتتا تھا۔ بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے اورنگ زیب سے بھی کچھ خط و کتابت کی تھی جس کی خبر پا کر اور طیش میں آ کر داراشکوہ نے باپ کو بہت سا دھمکایا تھا۔

بادشاہ کا زیادہ بیمار ہو جانا اور اس کے مرنے کی افواہ اُڑ جانے کی وجہ سے شہر اور دربار میں ایک ہولناک کھلبلی پڑ جانا

اس عرصہ میں بادشاہ کی علالت اس قدر بڑھ گئی کہ اس کے مرنے کی افواہ اُڑ گئی اور تمام دربار درہم و برہم ہو گیا اور آگرہ میں یہاں تک خوف و خطر پھیلا کہ بازاروں میں کئی روز تک ہڑتال رہی اور چاروں شہزادے اعلانیہ کھل کھیلے اور صاف کہہ دیا کہ اب اس مقدمہ کا فیصلہ صرف تلوار ہی سے ہو گا اور واقعی ان کو اپنے اس ارادہ سے دست بردار ہونا مشکل بھی تھا کیونکہ فتح یابی کی حالت میں تو تخت کی امید تھی اور شکست کی صورت میں جان کے جانے کا یقین کلی تھا اور اب صرف دو ہی باتیں تھیں یا موت یا سلطنت اور جس طرح (۴۱) شاہ جہاں خاص اپنے بھائیوں کے خون سے ہاتھ بھر کر تخت نشین ہوا تھا اسی طرح ان کو یقین واثق تھا کہ اگر ہم اپنی امیدوں میں ناکامیاب رہیں گے تو غالب اور فتح یاب حریف حسد کے مارے ہم کو ضرور قتل کرا دے گا۔

سب سے پہلے سلطان شجاع کا فوج لے کر آگرہ کی طرف کوچ کرنا

پس سب سے پہلے سلطان شجاع (جس نے کچھ تو بعض راجاؤں کو برباد کر کے اور کچھ اور لوگوں کو لوٹ کھسوٹ کر اپنے صندوق بھر لئے تھے اور اس سبب سے ایک فوج کثیر کا

جمع کر لینا اس کو کچھ مشکل نہ تھا اس کے علاوہ اپنے ہم مذہب ایرانی امرائے دربار کی اعانت اور امداد پر بھی اسے پورا بھروسہ تھا) فوج و لشکر جمع کر کے نہایت سرعت کے ساتھ آگرہ کی طرف چل کھڑا ہوا اور یہ اشتہار دیا کہ "چونکہ بادشاہ کو دارا شکوہ نے زہر دے کر مار ڈالا ہے اس لئے ہم اس خون ناحق اور حرکت ناشائستہ کا انتقام لیں گے اور تخت سلطنت پر جو خالی ہے جلوس کریں گے" اور اگرچہ شاہ جہاں نے دارا شکوہ کی صلاح سے بہت جلد اس افواہ کی جو اس کی موت کی نسبت مشہور ہو گئی تھی تردید کی اور صاف لکھا کہ علاج و معالجہ سے بیماری کو افاقہ ہوتا جاتا ہے اور بہ تاکید حکم دیا کہ تم اپنے صوبہ کو فوراً لوٹ جاؤ۔ لیکن اس سبب سے کہ اس کے ہوا خواہ برابر یہ خبریں بھیجتے تھے کہ بادشاہ کی بیماری لاعلاج ہے' آگرہ کی طرف بدستور بڑھا چلا آیا اور یہ حیلہ بنایا کہ مجھے بندگان والا کی سلامتی کی خبر پر یقین نہیں آتا اور بالفرض اگر وہ زندہ اور سلامت ہیں تو قدم بوسی حاصل کرنے اور ارشاد و احکام سے سرفراز ہونے کی مجھے بڑی تمنا ہے۔

اورنگ زیب کا آگرہ کی طرف کوچ کرنا اور سلطان مراد بخش اور میر جملہ کو ایک عجیب طور سے اپنا شریک حال بنانا

اورنگ زیب نے بھی اسی طرح اپنے اشتہار جاری کئے اور فوج کو کوچ کا حکم دیا اور ٹھیک انہی دنوں میں جبکہ سلطان شجاع نے کوچ کیا تھا اس نے بھی آگرہ کی طرف بڑھنے کا عزم کیا اور اگرچہ اس کو بھی وہی امتناعی احکام بادشاہ اور دارا شکوہ کی طرف سے پہنچے اور دارا شکوہ نے تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ اگر تم دکن سے حرکت کرو گے تو سزا پاؤ گے۔ مگر شجاع کی طرح اس نے بھی وہی حیلہ بنا کر اسی عذر سے جواب روانہ کیا اور چونکہ اس کی آمدنی بہت زیادہ نہ تھی اور فوج بھی بہ نسبت اوروں کے کم تھی (۴۲) اس لئے اس نے چالاکی سے اس چیز کا حاصل کرنا چاہا جو صرف اس کی تلوار اور قوت بازو سے غیر ممکن تھی اور چونکہ مراد بخش اور میر جملہ ہی دو ایسے شخص تھے جو آسانی سے ساتھ اس کے دم میں آسکتے تھے اس لئے اس نے مراد بخش کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "بھائی تم کو اس بات کے یاد دلانے کی کچھ حاجت نہیں کہ امور سلطنت کی محنت اٹھانی میرے اصلی مزاج اور طبیعت کے کس قدر مخالف ہے اور اس وقت میں جبکہ دارا شکوہ اور شجاع نہایت سرگرمی سے حصول سلطنت کے لئے کوشش اور سعی کر رہے ہیں تو میں صرف ایک جان زاہی کی

حفاظت اور فقیرانہ زندگی بسر کرنے میں متردّد ہوں۔ اور اگرچہ سلطنت کے حق حقوق اور دعوؤں سے میں بالکل دست بردار ہوں مگر تاہم اے میرے قدیمی اور نہایت گرامی عزیز میں تم کو اس رائے اور خیالات سے مطلع کرنا واجب جانتا ہوں کہ یہی نہیں کہ دارا شکوہ فرماں روائی کے اوصاف سے خالی ہے۔ بلکہ لامذہب اور کافر ہونے کی وجہ سے بالکل تاج و تخت کے لائق نہیں اور بڑے بڑے امرائے سلطنت اور ارکان دولت سب اس سے متنفر ہیں اور علیٰ ہٰذالقیاس شجاع بھی سلطنت کے قابل نہیں کیونکہ رافضی مذہب اور ہندوستان کا دشمن ہے۔ پس اس صورت میں اس عظیم الشان سلطنت کی فرماں روائی کے لائق صرف آپ ہی ہیں۔ اور یہ رائے صرف میری ہی نہیں بلکہ اس میں پائے تخت کے مشیر اور امیر جو آپ کے بے بدل شجاع ہونے کے بہ دل قائل و معترف ہیں سب متفق الرائے اور ہم زبان اور دارالخلافت میں آپ کی رونق بخشی کے منتظر ہیں اور میری بابت تو یہ تصور کر لیجئے کہ اگر آپ کی طرف سے موثق اور مستحکم طور پر مجھے یہ وعدہ مل جائے گا کہ جب بفضلِ خدا آپ بادشاہ ہو جائیں گے تو مجھے اپنی قلمرو میں کوئی خلوت کے موقع کا گوشۂ عافیت باطمینان خاطر عبادتِ الٰہی بجالانے کو عنایت فرما دیجئے گا تو میں فوراً آپ کی طرفداری میں خدمت بجالانے کو آمادہ اور تیار ہوں اور صلاح و مشورہ سے ' اپنے دوستوں اور رفیقوں سے ' اپنی تمام فوج آپ کے تحت حکم کر دینے سے 'غرض کسی قسم کی مدد دینے سے بھی مجھے دریغ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بالفعل آپ کی خدمت میں ایک لاکھ روپیہ بھیجتا ہوں اور امیدوار ہوں کہ آپ اس کو بطور نذر قبول فرمائیں کہ باعث میری ترقیٔ اخلاص اور خوشی کا ہوگا اور اب ہنر آزمائی اور جوہر نمائی کا وقت ہے۔ پس آپ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیجئے اور موقع کو غنیمت سمجھئے اور جلدی سے سورت (۴۳) کے قلعہ پر جہاں مجھے خوب معلوم ہے کہ بہت سے بادشاہی دفاین و خزاین مدفون و مخزون ہیں قبضہ کر لیجئے۔ (۴۴)

اورنگ زیب کے دم میں آکر مراد بخش کا آمادہ ہو جانا اور شاہی خزانہ لوٹ لینے کے قصد سے قلعہ سورت پر فوج بھیج دینا

مراد بخش جس کی دولت اور قوت بہ نسبت اوروں کے کم تھی بھائی کی اس درخواست سے جس کے ساتھ ایک ایسی بڑی رقم بھی آئی تھی بہت ہی خوش ہوا اور اس کی

امیدوں کو ایک بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس امید سے کہ جوان اور سپاہی پیشہ لوگ اس کے مضمون سے واقف ہو کر فوج میں بھرتی ہونے پر زیادہ راغب اور آمادہ ہوں گے اور اس خبر کو سن کر سوداگر لوگ زیادہ رضامندی سے وہ بڑی بڑی رقمیں قرض دینے پر مائل ہو جائیں گے جو اُن سے وہ بہ سختی طلب کرتا تھا۔ یہ خط (۴۵) جا جا دکھایا گیا اور اب اس نے سچ مچ سارے کروفر اور شان و تزکِ شاہانہ بنا لئے اور لوگوں کو بڑے بڑے انعام و اکرام کا متوقع کیا اور حسنِ اتفاق سے ان سب باتوں میں اس کی تدبیریں اور منصوبے ایسے بن پڑے کہ بہت جلد ایک خاصی فوج جمع ہو گئی جس میں سب کاموں سے پہلے تین ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ زیرِ حکومت (۴۶) شاہ عباس خواجہ سرا جو بڑا بہادر اور سپاہی منش تھا قلعہ سورت کے محاصرہ کے واسطے بھیج دیا گیا۔

اس کے بعد اورنگ زیب کا میر جُملہ کی طرف متوجہ ہونا اور اپنے بڑے بیٹے کو اس کے پاس بھیجنا اور اس کا آنے سے انکار کرنا

جب مراد بخش کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو اورنگ زیب نے اپنا بڑا بیٹا محمد سلطان (جس کی شادی شاہ گول کنڈا کی بیٹی سے ہوئی تھی) میر جُملہ کے پاس بھیجا کہ ''بڑا ہی ضروری کام ہے۔ آپ فوراً یہاں آکر ذرا مجھے مل جائیں''لیکن میر جُملہ اپنی فراست سے اس ضروری کام کو فوراً تاڑ گیا اور جواب دیا کہ کلیانی کا محاصرہ چھوڑ کر اور فوج سے علیحدہ ہو کر میرا دولت آباد آنا نہیں ہو سکتا اور آپ یقین فرمائیں کہ میں نے آگرہ سے ابھی تازہ خبر پائی ہے کہ شاہ جہاں ہنوز زندہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات ہے کہ جب تک میرے اہل و عیال دارا شکوہ کے قابو میں ہیں میں آپ کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتا بلکہ میرا اصل منشا تو یہ ہے کہ میں اس ہنگامہ میں کسی کا بھی طرف دار نہ ہوں۔

اورنگ زیب کا اس کے پاس سلطان معظم کو مکرر پیغام دے کر بھیجنا اور اس کا چلے آنا اور قید ہو جانا

جب محمد سلطان نے دیکھا کہ میر جُملہ میرے ساتھ جانا نہیں چاہتا تو وہ نہایت ناراض ہو کر دولت آباد کو چلا گیا۔ لیکن اس ناکامیابی سے اورنگ زیب کسی طرح ناامید نہ ہوا اور اپنے دوسرے بیٹے سلطان معظم کو پھر اس کے پاس بھیجا اور اپنی پہلی خواہش کا اعادہ

کیا۔ اس شہزادہ نے اپنے پیام و سلام کو اس خوبی سے ادا کیا اور سابقہ محبت و اتحاد کو اس قابلیت سے جتایا کہ میر جملہ اس کی مؤکد درخواستوں سے انکار نہ کرسکا اور اس نے کلیانی کے محاصرہ کو اس قدر سخت اور تنگ پکڑا کہ مخالفوں نے ناچار ہو کر آخر کار قلعہ خالی کر دیا اور بعد اس فتح کے یہ اپنی چیدہ فوج ساتھ لے کر نہایت عجلت کے ساتھ دولت آباد کو چلا آیا۔ چنانچہ بوقت ملاقات اورنگ زیب نہایت مہربانی اور گرمجوشی سے پیش آیا اور گفتگو میں بابا اور بابا جی وغیرہ بہت بڑے بڑے تعظیمی الفاظ کے ساتھ اس سے مخاطب ہوا اور اس مبارک مہمان کو کئی بار گلے لگایا اور پھر خلوت میں لے جا کر یہ کہا کہ "مجھے معلوم ہے کہ آپ نے جو محمد سلطان سے انکار کیا تھا وہ مجبوری کے باعث سے تھا اور بے شک میرے سب فہمیدہ اور دور اندیش اہلِ دربار کی بھی یہی رائے ہے کہ جب تک آپ کے اہل و عیال دارا شکوہ کے قابو میں ہیں آپ کو علانیہ اور برملا کوئی ایسی حرکت ہرگز نہ کرنی چاہئے جو بظاہر ہمارے حق میں مفید نظر آتی ہو۔ لیکن آپ جیسے عقیل شخص کو سمجھانے کی کیا حاجت ہے کہ دنیا میں ہر مشکل کام کی آخر ایک تدبیر ہے۔ چنانچہ ایک منصوبہ میرے خیال میں گزرا ہے جس سے بظاہر اگرچہ آپ حیران ہوں گے لیکن جب اس کے نشیب و فراز پر خوبی غور کریں گے تو بے شبہ آپ کے اہل و عیال کی سلامتی کے لئے ایک یقینی ذریعہ ہوگا اور وہ یہ ہے کہ آپ بظاہر قید ہو جانا گوارا کر لیں اس سے تمام جہان کو میری آپ کی دشمنی کا یقین کامل ہو جائے گا اور اس حکمت سے ہم اپنی تمام خواہشوں میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کیونکہ کوئی شخص ہرگز ایسا گمان بھی نہ کرے گا کہ آپ جیسے رتبہ کا کوئی آدمی اس طرح اپنی خوشی سے قید ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی میں آپ کی فوج کا ایک حصہ جس وضع اور حیثیت سے آپ کو پسند اور مناسب معلوم ہو نوکر رکھ لوں گا اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جس طرح پہلے آپ بارہا مجھ سے وعدے کرتے رہے ہیں اس وقت کچھ روپیہ دینے سے بھی انکار نہ کریں گے۔ کیونکہ روپیہ کی بہت ضرورت ہے اور آپ کے اس روپیہ اور لشکر سے میں اپنی بخت آزمائی کروں گا۔ پس اجازت ہو تو میں آپ کو اسی وقت قلعہ دولت آباد میں پہنچا دوں اور اس جگہ میرا ایک بیٹا آپ کا نگران حال رہے گا اور بعد اس کے ہم اور آپ اس مہم کی درستی کی تدبیروں کی نسبت باہم غور و فکر کرسکیں گے اور اس صورت میں ہرگز میرے خیال اور قیاس میں نہیں آتا کہ دارا شکوہ کے دل میں کوئی شبہ پیدا ہو اور وہ ایسے شخص کے اہل و عیال سے کوئی بدسلوکی کرے جو بظاہر میرا اس قدر دشمن ہو۔

اس امر کی تحقیق کہ میر جُملہ حقیقتاً مجبور ہو کر قید ہو گیا تھا یا یہ صرف ایک حیلہ اور بناوٹ تھی

ہم معتبر سند سے بیان کر سکتے ہیں کہ اورنگ زیب کی تقریر کا مدعا یہی تھا اور اگرچہ وہ خیالات اور حالات جن کو سوچ سمجھ کر میر جُملہ نے ان خواہشوں کا جواب دیا ہوگا ٹھیک معلوم نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات بالکل یقینی ہے کہ اس نے ان سب باتوں کو قبول کر لیا تھا یعنی وہ اس پر بھی راضی ہو گیا تھا کہ اپنی فوج کو اورنگ زیب کے زیرِ حکومت کر دے اور روپیہ کا دینا بھی قبول کر لیا اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ اس کی مرضی کے موافق سچ مچ قید ہو کر قلعہ دولت آباد میں چلا گیا!!

اب اس معاملہ کی نسبت بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ میر جُملہ کو اورنگ زیب نے سمجھا بجھا کر فی الواقع اس بات کا یقین کرا دیا تھا کہ آپ کے برضامندی قید ہو جانے سے بہت فائدے ہوں گے اور چونکہ پہلے سے آپس میں دوستی اور اتحاد تھا اس وجہ سے اورنگ زیب نے اسے قید ہو جانے پر حقیقتاً راضی کر لیا تھا اور بعض کی یہ رائے ہے (جو غالباً زیادہ معقول اور قرینِ قیاس ہے) کہ اس نے صرف ڈر کے مارے ان باتوں کو قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ اورنگ زیب کے دو جوان بیٹے ایک سلطان معظم دوسرا محمد سلطان اس ملاقات اور سوال و جواب کے وقت سر پر کھڑے تھے اور اگرچہ سلطان معظم کا مسلح ہونا بھی زبان حال سے گویا یہی کہہ رہا تھا کہ انکار کی حالت میں بہت ہی بُرا ہو گا مگر سلطان تو سچ مچ تلوار لئے ہوئے مونچھوں کو اس طرح تاؤ دے رہا تھا کہ بس مار ہی ڈالے گا اور چونکہ اسی ملاقات کے معاملہ میں میر جُملہ کی طرف سے اس کی شان و عزت کی حقارت ہو چکی تھی کیونکہ اس کا چھوٹا بھائی اپنی سفارت میں سُرخرو اور کامیاب ہوا تھا۔ اس لئے اس کو اپنی رنجش پوشیدہ کرنے کی کچھ پروا بھی نہ تھی۔ (۴۷)

اورنگ زیب کا میر جُملہ کے رفیقوں اور اس کی فوج کو پھسلا کر اپنا رفیق بنانا

القصہ جب میر جُملہ کی گرفتاری کی خبر برملا ہو گئی تو اس کی فوج کے اس دستہ نے جو بیجاپور سے اس کے ساتھ آیا تھا بڑے زور سے کہا کہ ہمارے سردار کو چھوڑ دینا چاہئے

اور اگر اورنگ زیب اپنی حکمت عملی سے فوراً ان کی تسلی تشفی نہ کر دیتا تو بے شبہ وہ اپنے سردار کو چھڑا لیتے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے ان کے بڑے بڑے سرداروں کو تو یہ سمجھا کر کہ وہ بالکل اپنی خوشی اور مرضی سے نظر بند ہوا ہے اپنا رفیق بنالیا۔ اور ان کے ذہن نشین کر دیا کہ یہ محض ایک حکمت اور منصوبہ ہے جو اصل میں ہماری اور امیر کی باہمی صلاح ہی سے تجویز ہوا ہے اور سپاہ کو خوب دل کھول کر انعام و اکرام دیئے یعنی سرداروں سے تو آئندہ ترقی کے صرف بڑے بڑے وعدے ہی کئے مگر سپاہیوں کی تنخواہ حقیقتاً بڑھادی بلکہ بطور ثبوتِ صداقت اپنے وعدوں اور اظہارِ سیر چشمی کے فوراً تین مہینے کی تنخواہ بطور پیشگی دے دی اور اس تدبیر سے میر جُملہ کی فوج اس مہم میں شریک ہونے کو راضی ہو گئی جو اورنگ زیب کو مد نظر تھی اور اب اس کے پاس لڑنے بھڑنے کے لائق اچھی خاصی جمعیت ہو گئی۔

اورنگ زیب کا مراد بخش کی امداد کو سورت کی طرف کوچ کرنا اور قلعہ سورت کے فتح ہو جانے کی خبر پا کر اس سے بالاتفاق آگرہ کی طرف کوچ کرنے کی استدعا کرنا

اس کے بعد اورنگ زیب نے سورت کی طرف کوچ کیا کیونکہ اہلِ قلعہ خلافِ توقع اب تک مراد بخش کی فوج سے مغلوب نہ ہوئے تھے اور اورنگ زیب کا مدعا یہ تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو یہ قلعہ فتح ہو جائے۔ لیکن اس نے کوچ سے چندروز بعد یہ خبر پائی کہ وہ فتح ہو گیا۔ پس اس نے مبارکباد کا خط مراد بخش کو تحریر کیا اور اس میں ان واقعات و حالات سے جو اس کے اور میر جُملہ کے باہم گزرے تھے بدیں مضمون اطلاع دی کہ "میں نے ایک جرار فوج جمع کر لی ہے اور خزانہ بھی بافراط موجود ہے اور عمائد و امرائے دربار شاہی سے بھی سب طرح پخت و پز ہو چکی ہے اور برم پور (۴۸) اور آگرہ کی طرف چل پڑنے میں اب میری طرف سے کچھ دیر نہیں ہے اور التجا کی کہ آپ کوچ میں دیر نہ کیجئے اور دونوں لشکروں کے مل جانے کے لئے کوئی جگہ قرار دے کر جلد مطلع کیجئے۔

قلعہ سورت کے خزانہ کا ذِکر

قلعہ سورت میں خلافِ مراد تھوڑا سا خزانہ ملنے سے مراد بخش بہت ناامید ہوا۔

اس کی کا سبب یا تو یہ تھا کہ محض مبالغہ آمیز افواہوں سے اس کی اس قدر کثرت مشہور ہو گئی تھی یا یہ وجہ تھی (جیسا کہ عموماً لوگوں کو شبہ تھا) کہ وہاں کے قلع دار نے بہت سا خورد بُرد کر لیا تھا۔ بہر حال جو روپیہ مراد بخش کے ہاتھ لگا وہ صرف اتنا ہی تھا کہ اس سے فقط ان سپاہیوں کی تنخواہ دے سکا جو یہ طمع دے کر نوکر رکھ لئے گئے تھے کہ سورت سے بہت سا مال ودولت ہاتھ آئے گا۔

ڈچ لوگوں سے سرنگ لگانے کی ترکیب سیکھے بغیر مراد بخش سے اس قلعہ کا فتح نہ ہو سکنا

سورت کے محاصرے اور اس کے فتح کرنے کی تدبیروں میں مراد بخش کی کوئی جنگی لیاقت ظاہر نہیں ہوئی۔ کیونکہ باوصف اس کے کہ قلعہ کی فصیلیں جیسی چاہئیں جنگی قاعدہ کے موافق خوب مستحکم نہ تھیں۔ پھر بھی باوجود بہت بڑی کوششوں اور عرق ریزیوں کے اہلِ قلعہ ایک مہینے تک برابر لڑا کئے اور جب تک کہ ڈچ قوم کے سپاہیوں نے سرنگ لگانے کی حکمت نہ سکھلائی محاصرہ وغیرہ سے کچھ فائدہ نہ ہوا البتہ جب ان کی (۴۹) پہلے ہی پہل کی سکھائی ہوئی تدبیر سے قلعہ کی فصیل کا ایک بڑا حصہ اڑا دیا گیا تو محصوروں نے متحیر ہو کر اور بعض شرطیں لے کر قلعہ حوالہ کر دیا۔

اس فتح سے مراد بخش کی ناموری

اس فتح سے مراد بخش کا بڑا نام ہو گیا اور جو باتیں اس کے پیش نہاد خاطر تھیں اب ان کی درستی میں ایک بڑی آسانی ہو گئی اور چونکہ سرنگ لگانے کی تدبیر سے یہاں کے لوگ بخوبی واقف نہ تھے اس لئے مراد بخش کی نئی حکمت نے لوگوں کے دلوں پر بہت ہی عجیب اثر کیا۔ اس کے علاوہ یہ بات علی العموم مشہور ہو گئی کہ سورت کا بہت سا دفینہ مراد بخش کے ہاتھ آ گیا ہے۔

شہباز خواجہ سرا کا مراد بخش کو اورنگ زیب کی شمولیت سے منع کرنا اور اس کا نہ ماننا

لیکن باوجود اس تمام شہرت اور ناموری کے جو اس فتح سے حاصل ہوئی تھی اور

باوصف اورنگ زیب کے بہت سے خوشامد آمیز اور ابلہ فریب وعدوں کے شہباز خواجہ سرا مراد بخش کو یہی سمجھاتا رہا کہ "آپ بھائی صاحب کی فضول باتوں پر ہرگز بھروسہ اور اعتبار نہ کریں اور جلدبازی کر کے ان کے قابو میں نہ آجائیں اور اس خیر خواہ خواجہ سرا نے صاف کہہ دیا کہ "آپ اب بھی میری صلاح مان لیں اور اگر آپ کی ایسی ہی مرضی ہے تو خیر اورنگ زیب کو چکنی چپڑی باتوں میں پھسلائے رکھیں لیکن فوج اور لشکر سمیت اس سے جاکر شامل ہو جانے کا ارادہ ہرگز نہ فرمائیں اور بالفعل آگرہ کی طرف اس کو اکیلا ہی جانے دیں۔ رفتہ رفتہ جب ہم کو بادشاہ کی صحت اور مرض کی پختہ خبریں اور صحیح حالات معلوم ہو جائیں گے تو اس وقت جو مصلحت معلوم ہوگا اس پر عمل کیا جائے گا اور اس عرصہ میں آپ قلعہ سورت کا استحکام کرلیں جو اس طرف میں سب سے زیادہ کارآمد مقام ہے اور اس جگہ کے قابو کر لینے سے ایک وسیع سیر حاصل اور زرخیز ملک کی حکومت آپ کے ہاتھ آجائے گی اور پھر تھوڑی سی تدبیر سے شہر برہان پور بھی جو صوبہ دکن کا دروازہ اور نہایت کارآمد مقام ہے آپ کے قبضہ میں آجائے گا"۔ مگر چونکہ مراد بخش کے پاس اورنگ زیب کے خطوط برابر چلے آتے تھے اس نے اپنے عزم اور کوشش کو سست نہ کیا اور بے چارے شہباز کی صلاح نہ مانی۔ یہ دانا اور دوراندیش امیر نہایت ہی سچا ناصح اپنے آقا کا دلی خیر خواہ تھا۔ پس اس جوان شہزادہ کے حق میں بہت ہی بہتر ہوتا اگر اس کی معقول صلاح کو مان لیتا۔ لیکن اوّل تو بادشاہ بن جانے کے بعد شوق ہی میں مراد بخش اندھا ہو رہا تھا اور اس پر اس کے مکار بھائی کے خط جو جانفشانی اور ہوا خواہی کے وعدوں کے اظہار میں روزمرہ چلے آتے تھے بہت بڑے محرک اس کے ارادوں کے تھے۔ علاوہ بریں اس نے یہ بھی سوچا کہ یہ مہم جس میں بادشاہی اور سلطنت حاصل ہو جانے کی امید ہے مجھ سے اکیلے انجام نہ ہو سکے گی۔ اس لئے احمد آباد سے جہاں ڈیرے ڈالے پڑا تھا کوچ کر دیا اور گجرات سے روانہ ہو کر پہاڑوں اور جنگلوں کا سیدھا راستہ اختیار کیا تاکہ جلدی سے اس جگہ پہنچ سکے جہاں اورنگ زیب چند روز پہلے سے اس کے انتظار میں ٹھہرا ہوا تھا۔

دونوں بھائیوں کا فوجوں سمیت مل جانا اور اورنگ زیب کی مکاریاں

القصہ جب دونوں لشکر (۵۰) مل گئے تو بڑی خوشیاں اور جشن منائے گئے اور اورنگ زیب نے اپنی محبت کے پائیدار اور مستحکم اقرار از سر نو تازہ کئے اور اپنی کمال بے

غرضی اور بے طمعی کا اظہار کیا اور دونوں بھائی کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے اور اورنگ زیب بار بار یہی جتاتا تھا کہ بادشاہی اور سلطنت کی تو مجھے ذرا بھی ہوس نہیں اور یہ فوج کشی میں نے صرف اس واسطے کی ہے کہ جس طرح بن پڑے دارا شکوہ سے جو میرا اور آپ کا مشہور جانی دشمن ہے لڑ بھڑ کر آپ کو تختِ سلطنت پر جو خالی پڑا ہے بٹھادوں۔ جس زمانہ میں دونوں فوجیں پائے تخت کی طرف جا رہی تھیں اورنگ زیب ہمیشہ حاضر و غائب خاص و عام کے روبرو جس طرح پر کہ یہاں کی رعایا کے لوگ بادشاہ کو حضرت کہہ کر بولتے ہیں مراد بخش کو یہی لفظ کہہ کر بولتا تھا۔ اور سب موقعوں پر بڑی تعظیم اور تکریم سے پیش آتا تھا اور فی الواقع یہ بات نہایت عجیب ہے کہ مراد بخش نے اورنگ زیب کے خلوص نیت پر کچھ بھی شبہ نہ کیا اور وہ علانیہ دغابازی جو گولکنڈا کے معاملہ میں وہ ابھی کر چکا تھا ایسی صریح بات سے بھی اس کے دل پر ذرا اثر نہ ہوا۔ بات یہ ہے کہ یہ شہزادہ اپنی خیالی سلطنت کی ہوس میں ایسا اندھا ہو رہا تھا اور عقل پر ایسا پردہ پڑ گیا تھا کہ اتنی موٹی بات بھی اس کی سمجھ میں نہ آئی کہ جو شخص کل اس قدر بے ایمانی کے ساتھ ایک سلطنت کے چھین لینے کے لئے کوشش کر چکا ہے آج کس طرح ممکن ہے کہ اس کے خیالات ایسے بدل گئے ہوں کہ بجز فقیرانہ گزران کرنے کے اس کی کچھ اور آرزو ہی نہیں ہے۔

آگرہ میں ان خبروں کے پہنچنے سے تہلکہ پڑ جانا

اب ان متفقہ فوجوں نے ایک بڑی شان و شوکت پیدا کی اور ان کے کوچ کی خبریں سن کر پائے تخت میں ایک تہلکہ پڑ گیا اور دارا شکوہ تو اس قدر مشوش اور مضطرب ہوا کہ جس کی انتہا نہیں۔ اور انجام کار پر نظر کر کے شاہ جہاں بھی ڈر گیا اور اگرچہ اپنے خیال میں اس فساد کے حالیہ نتائج کی نسبت اس نے کچھ ہی اندازہ کیا ہو لیکن اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ اورنگ زیب کی قابلیت اور دانائی اور مراد بخش کے تہور اور شجاعت کے متفق ہو جانے سے ایسا کوئی امر نہیں ہے کہ جو نا ممکن الوقوع ہو۔

باوجود ممانعتی احکام کے ان شہزادوں کا آگرہ کو بڑھے چلے آنا

شاہ جہاں نے ہر چند ان کے پاس قاصد پر قاصد یہ پیغام دے کر روانہ کئے کہ مابدولت کو اب آرام اور افاقہ ہے اور اگر تم اپنے صوبوں کو لوٹ جاؤ گے تو تمہاری اس

حرکت سے چشم پوشی کی جائے گی اور داخل نافرمانی نہ سمجھا جائے گا۔ لیکن یہ سب تحریریں اور احکام بے فائدہ تھے اور متفقہ فوجیں برابر بڑھی چلی آتی تھیں۔ اور چونکہ بادشاہ کی علالت واقعی مہلک سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے یہ اپنے وہی عذر اور بہانے کئے جاتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ جو خط خطوط شاہی مہریں لگ کر آتے ہیں وہ جعلی اور بالکل دارا شکوہ کی بناوٹ اور ایجاد ہیں اور "حضرت" یا تو مر چکے یا قریب المرگ ہیں۔ اور بالفرض اگر ہماری خوش نصیبی سے وہ زندہ ہیں تو ہم ان کی قدم بوسی کے مشتاق ہیں۔ اور دارا شکوہ نے جو انہیں ہر طرح سے بے بس اور مسلوب الاختیار کر رکھا ہے اس حال سے بھی ہم ان کو نکالنا چاہتے ہیں۔

شاہ جہاں کی مجبورانہ اور پُر اندوہ حالت

ان دنوں شاہ جہاں کا فی الواقع بہت پتلا حال تھا اور علاوہ شدید اور تکلیف مرض کے وہ حقیقتاً دارا شکوہ کے پنجہ سرکشی میں پھنسا ہوا تھا اور اُدھر تو دارا شکوہ کے دل میں قہر و غضب کی آگ بھڑک رہی تھی اور لڑائی کے سوا کچھ خیال ہی نہ تھا اور مستعدی کے ساتھ تیاری کر رہا تھا اور ادھر شاہ جہاں کے دوسرے بیٹے باپ کے تاکیدی اور متواتر احکام پر مطلقاً لحاظ اور التفات نہ کر کے برابر آگرہ کی طرف بڑھے چلے آرہے تھے۔ اور ایک طرف بے چارے بادشاہ کو یہ فکر تھی کہ اگر میرے جمع کئے ہوئے دفینے اور خزانے ان نوجوان شہزادوں کے ہاتھ آجائیں تو خدا جانے کس کس طرح اُڑا کر برباد اور تلف کر دیں گے۔

مجبور ہو کر بادشاہ کا بعض امرا کو لڑائی کے لئے مامور کرنا

غرض کہ جب اس بڈھے بادشاہ کو کوئی چارہ باقی نہ رہا تو اس نے مجبور ہو کر اپنے وفادار جنگ آزمودہ اور کار آگاہ سرداروں کو اپنے پاس طلب کیا۔ اگرچہ یہ امرا دارا شکوہ سے اکثر ناموافق تھے اور بادشاہ کو بھی اس کی بہ نسبت اپنے تینوں حملہ آور بیٹوں سے زیادہ محبت تھی مگر پھر بھی اس کو اس کے کاموں کی درستی مدنظر تھی اور انہی امیروں سے جو اکثر اس سے ناراض تھے سرانجام مہم کا کام لینا اور ان کو اپنے باغی بیٹوں کے مقابلہ پر سر لشکر بنا کر بھیجنا امر ضروری تھا چنانچہ اس بات کا لحاظ کر کے کہ جدھر سے شجاع بڑھا چلا آتا تھا ادھر کا زیادہ اندیشہ تھا۔ ایک فوج تو فوراً اس کے مقابلہ کے واسطے روانہ کی گئی اور ایک دوسری فوج اس غرض سے تیار اور جمع کی گئی کہ بشرط ضرورت اورنگ زیب اور مراد

بخش کی متفقہ فوج سے جنگ کرے۔ چنانچہ دارا شکوہ کا بڑا بیٹا سلیمان شکوہ اس فوج کا سپہ سالار مقرر ہوا جو شجاع کے مقابلہ کے واسطے بھیجی گئی تھی۔ اس کی عمر قریب پچیس برس کے تھی اور بڑا خوبصورت اور وجیہہ اور سخی شہزادہ تھا۔ سب لوگ اسے پسند کرتے تھے اور قابلیت و لیاقت میں بھی بہت خاصہ تھا۔ شاہ جہاں کو بھی اپنے اس پوتے سے بہت محبت تھی اور اس نے کئی بار اس کو بہت سامال و دولت دیا تھا بلکہ یہ ارادہ تھا کہ دارا شکوہ پر اس کو ترجیح دے اور اپنا ولی عہد مقرر کرے۔

بادشاہ کی مخفی ہدایتیں جے سنگھ کو مگر لڑائی کا نہ ٹل سکنا اور شجاع کی شکست

چونکہ شاہ جہاں کا اصل مطلب یہ تھا کہ اس غیر طبعی اور ناحق کے فساد میں حتی الامکان خونریزی نہ ہونے پائے اس لئے اس نے ایک مُسِن راجہ کو جس کا نام جے سنگھ (۵۱) ہے اور جو اس وقت کے راجاؤں میں سب سے زیادہ دولتمند اور غالباً ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ قابل شخص ہے بطور مشیر خاص اپنے پوتے کے ہمراہ روانہ کیا اور اس کو پوشیدہ یہ ہدایت کی کہ حتی الامکان جنگ نہ ہونے دینا اور شجاع کو اس امر کی فہمائش میں کہ وہ اپنے متعلقہ صوبہ کو لوٹ جائے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا بلکہ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اس سے کہہ دینا کہ "ارشاد شاہی کے موافق واپس چلے جانا تم پر صرف فرض واجب ہی نہیں بلکہ فنِ حکومت و سلطنت کی رُو سے بھی یہ امر نہایت ضروری ہے کہ تم سر دست اپنے زور و طاقت کا اظہار نہ کرو اور جب تک کہ ایک ٹھیک اور مناسب موقع اس کام کا نہ آجائے یعنی تاوقتیکہ ہماری بیماری مجربہ ہلاکت نہ ہو جائے یا اورنگ زیب اور مراد بخش کی متفقہ فوجوں کا کچھ انجام نہ معلوم ہو چکے ایسی جلدبازی تمہاری لئے مصلحت نہیں ہے"۔

لیکن جے سنگھ کی کوششیں انسداد جنگ کے باب میں سب بے سود رہیں۔ کیونکہ ادھر تو سلیمان شکوہ بلند حوصلگی اور نوجوانی کے نشہ میں جنگ جوئی کی امنگ اور ناموری کے شوق سے بے تاب ہو رہا تھا۔ اُدھر شجاع کو یہ خیال تھا کہ اگر کوچ میں دیر کروں گا تو اغلب ہے کہ اورنگ زیب دارا شکوہ کو مغلوب کر کے دارالسلطنت آگرہ اور دہلی پر قابض ہو جائے پس جونہی دونوں فوجیں ایک دوسرے کو دکھائی دینے لگیں فوراً دونوں طرف سے دنادن گولہ اندازی شروع ہو گئی۔

لیکن میں اس مقام پر ضرورت نہیں سمجھتا کہ اس لڑائی کے حالات بہ تفصیل بیان کروں۔ کیونکہ اس دوسری لڑائی کے واقعات جو اس سے زیادہ اہم ہیں بیان کرنے ہیں اور ناظرین کے لئے یہاں پر صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ دونوں طرف سے بڑی سختی اور سرگرمی سے حملے ہوئے اور ایک بڑی کوشش کے بعد سلطان شجاع کو ایسا مغلوب ہونا پڑا کہ آخر کار سراسیمہ ہو کر بھاگ نکلا اور یقین ہے کہ اگر جے سنگھ اور اس کا دلی دوست دیر خاں (۵۲) پٹھان جو بڑا بہادر سپاہی تھا' قصداً پیچھے نہ ہٹے رہتے تو فوج مخالف بالکل تباہ ہو جاتی بلکہ خود شجاع بھی گرفتار ہو جاتا۔ لیکن راجہ نے ازراہِ دانائی مناسب نہ جانا کہ شاہی خاندان کے شہزادے اور اپنے آقا کے بیٹے پر ہاتھ ڈالے اور یہ بھی ہے کہ اس نے شجاع کو بھاگ جانے کی مہلت دینے میں بادشاہ کی ہدایتوں پر عمل کیا۔ اس شکست میں اگرچہ شجاع کا کچھ زیادہ نقصان نہ ہوا تھا۔ لیکن چونکہ کھیت سلیمان شکوہ کے ہاتھ رہا اور چند توپیں بھی اس کے قبضہ میں آگئی تھیں اس لئے دربار شاہی میں یہ خبر عام ہو گئی کہ سلیمان شکوہ نے کامل فتح پائی اور اس سے سلیمان شکوہ کی نیک نامی اور شجاع کی بڑی بدنامی ہوئی اور ان ایرانی امرائے دربار کی سرگرمی اور دلسوزی بھی جو شجاع کی طرفداری کرتے تھے بہت ٹھنڈی پڑ گئی۔

اورنگ زیب اور مراد بخش کی چڑھائی کی خبر سن کر سلیماں شکوہ کا ارادہ مراجعت کرنا

سلیماں شکوہ ابھی شجاع کے تعاقب میں کسی قدر لگا ہوا تھا کہ خبر ملی کہ اورنگ زیب اور مراد بخش بڑی مستعدی اور استقلال سے آگرہ کی طرف بڑھے آتے ہیں اب چونکہ اس کو اپنے باپ کی عقل و دانش کا اندازہ بخوبی معلوم تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے گرد و پیش پوشیدہ دشمن جمع ہیں اس لئے کمال دور اندیشی سے آگرہ کو واپس آنے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ ظن غالب یہی تھا کہ دارالسلطنت کے آس پاس ہی کہیں نہ کہیں دارا شکوہ ان سے لڑے گا۔ سب لوگ متفق الرائے ہیں کہ سلیمان شکوہ کی یہ تجویز بہت ہی دانائی اور ہوشیاری کی تھی اور اگر یہ نوجوان شہزادہ اپنی فوج سمیت بروقت پہنچ جاتا تو اورنگ زیب ان کی ایسی بڑی فوجوں سے ٹکر لینے میں کبھی کامیاب نہ ہوتا بلکہ شاید مقابلہ ہی نہ کرتا۔

اورنگ زیب اور مراد بخش کی راہ روکنے کے لئے قاسم خاں اور مہاراجہ

جسونت سنگھ کا مامور ہونا

باوجود اس کامیابی کے جو سلیماں شکوہ کی (۵۳) سپاہ کو بمقام الہٰ آباد (جہاں جمنا اور گنگا باہم ملتی ہیں) حاصل ہو چکی تھی یہاں آگرہ کی طرف معاملات کی کچھ اور ہی صورت تھی۔ یعنی جب دارالسلطنت میں یہ خبر پہنچی کہ اورنگ زیب بُرہان پور کے پاس دریا کے وار اتر آیا ہے اور ان دشوار گزار پہاڑوں کی گھاٹیوں کو بھی بزور طے کر چکا ہے جن پر ہر طرح سے مزاحمت اور بچاؤ کا بہت بڑا بھروسہ تھا تو دربار میں بڑی گھبراہٹ اور حیرانی پیدا ہوئی اور فوج کی تیاریاں شروع ہوئیں مگر بڑی جلدبازی کے ساتھ سب سے پہلے فوراً ایک دستہ اس مراد سے اُجین کو بھیجا گیا کہ جلدی سے پہنچ کر دریا کے گھاٹ (۵۴) کو روک لیں اور مخالفوں کو پار اترنے سے روکیں اور اس پیش زودستہ کی سرداری کے واسطے دو امیر جو نہایت با اقتدار اور لائق و فائق تھے' انتخاب کئے گئے۔ ان میں سے ایک کا نام قاسم خاں تھا جو بڑا ہی مشہور و معروف سپاہی اور شاہ جہاں کا دلی خیر خواہ تھا۔ لیکن یہ چونکہ دارا شکوہ سے متنفر اور بیزار تھا اس لئے اس نے یہ سرداری بخوشی اختیار نہیں کی تھی۔ بلکہ محض شاہجہاں کے حکم کی تعمیل تھی۔ دوسرا سردار راجہ جسونت سنگھ تھا جو درجہ اور اقتدار میں جے سنگھ سے کم نہ تھا۔ یہ راجہ اس زبردست رانا (۵۵) کا داماد تھا جو اکبر کے زمانہ میں سب راجاؤں کا مہاراجہ گنا جاتا تھا۔ دارا شکوہ نے ان دونوں سرداروں سے نہایت تملق اور شیریں زبانی سے گفتگو کی اور جب وہ لشکر میں جانے لگے تو بڑے بڑے بھاری خلعت ان کو دیئے مگر شاہ جہاں نے جو ہدایتیں شجاع کے بارہ میں راجہ جے سنگھ اور دلیر خاں کو کی تھیں ویسے ہی احتیاط سے کام کرنے کی بابت ان کو بھی کیں۔

قاسم خاں اور مہاراجہ جسونت سنگھ کو اورنگ زیب کے یکایک آپہنچنے کی خبر ملنا اور اُن کا دریا کے گھاٹ کو روکنا

لیکن جبکہ اس طرف سے اس قسم کے تأمل و تذبذب ہو رہے تھے' اورنگ زیب کی جانب کمال مستعدی کے ساتھ لڑائی کی پوری تیاری تھی۔ چنانچہ بادشاہ کی نصیحت اور ہدایت کے موافق جو قاصد متواتر یہ پیام دے کر اس کے پاس بھیجے جاتے رہے کہ آپ کو دکن کو لوٹ جانا چاہئے' ان میں سے کوئی بھی واپس آنے نہ پایا۔ بلکہ واپسی کی جگہ اس کی

فوج یکایک ایک بلند ٹیلہ پر جو دریا (۵۶) سے تھوڑے فاصلہ پر تھا نمودار ہوئی۔ چونکہ گرمی کا موسم تھا اور سخت دھوپ پڑتی تھی اور اس وجہ سے دریا پایاب ہو رہا تھا' قاسم خاں اور راجہ نے یہ خیال کر کے کہ اورنگ زیب پار اترا چاہتا ہے لڑائی کی تیاری کر دی۔ لیکن واقع میں اورنگ زیب کی پوری فوج ابھی پیچھے تھی اور اس تھوڑی سی سپاہ کو آگے بھیج دینا بالکل ایک دھوکا تھا کیونکہ اورنگ زیب کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں بادشاہی فوج دریا کے پار نہ اتر آئے جس سے ہمارا پانی بند ہو جائے اور وہ ہماری تھکی ماندی فوج پر حملہ کر دے اور اس طرح پر جنگ کا مفید موقع ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے اور اس کا یہ اندیشہ حقیقت میں درست تھا۔ کیونکہ اس وقت اس کی فوج مقابلہ کے لائق نہ تھی اور اگر قاسم خاں اور راجہ حملہ کر دیتے تو بآسانی غالب ہو سکتے تھے۔

میں اس موقع پر بذاتِ خود موجود نہ تھا۔ لیکن جن لوگوں نے اس لڑائی کو دیکھا ہے خصوصاً فرانسیسی افسر جو اورنگزیب کے توپخانہ میں ملازم تھے ان سب کی یہی رائے ہے۔ مگر یہ سردار ایسا کس طرح کرتے کیونکہ بادشاہ کے مخفی احکام کے باعث صرف اتنا ہی کر سکتے تھے کہ دریا کے وار اپنا مورچہ جمائیں اور اگر اورنگ زیب دریا سے بزور اترنا چاہے تو روکیں۔

اورنگ زیب کی فتح، قاسم خاں کی نسبت دغابازی کا شبہ اور جسونت سنگھ کا شکست کھا کر اپنی ریاست گاہ جودھ پور کو چلا جانا

القصہ جب اورنگ زیب کی فوج نے دو تین روز دم لے لیا تو دریا سے بزور اترنے کی تیاری کر دی۔ چنانچہ پہلے تو اس نے اپنا توپخانہ ایک بلند جگہ پر قائم کیا۔ اور پھر فوج کو حکم دیا کہ توپوں کی پناہ میں آگے بڑھے۔ مگر ان کی پیش قدمی روکنے لئے اس طرف سے بھی توپیں چلنی شروع ہوئیں اور اگرچہ ابتدا میں سخت جوش و خروش اور سرگرمی سے مزاحمت کی گئی اور جسونت سنگھ نہایت ہی شجاعت اور دانائی کے ساتھ حملہ آوروں کو ہر ہر قدم پر روکتا رہا مگر قاسم خاں نے باوجودیکہ اس کی سپاہ گری اور بہادری میں کسی کو کلام نہیں اس موقع پر نہ تو کچھ بہادری ہی دکھائی اور نہ کچھ سپاہیانہ دانائی ہی ظاہر کی بلکہ اس پر دغا بازی اور سازش کا شبہ ہے (۵۷)۔ کیونکہ اس نے لڑائی سے پہلے ہی رات کے وقت اپنا بہت سا بارود گولہ ریت میں چھپا دیا تھا جس کے سبب سے صرف چند باڑیں چلانے کے بعد فوج کے پاس یہ سامان نہ رہا۔ خیر اس کی اصل خواہ کچھ ہی ہو مگر لڑائی بہر حال بہت

سخت ہوئی اور گھاٹ کے روکنے میں سپاہ نے بڑی شجاعت دکھائی۔ ادھر اورنگ زیب کی فوج کا یہ حال تھا کہ بڑے بڑے پتھروں کی وجہ سے جو دریا کے پاٹ میں تھے اس کو سخت تکلیف پہنچی اور کناروں کی کذھب بلندی کے باعث سے اوپر چڑھنا سخت مشکل تھا۔ مگر مراد بخش کی تیزی اور شجاعت ان سب دشواریوں پر غالب آئی اور وہ اپنی خاص فوج کے ساتھ دریا کو عبور کر آیا اور آخر کار باقی سپاہ بھی پیچھے سے بہت جلد آ پہنچی۔ اس وقت قاسم خاں بڑی بدنامی کے ساتھ میدان سے بھاگ نکلا اور جسونت سنگھ کو صریح جان جوکھوں میں چھوڑ گیا۔ اب اگرچہ اس بہادر راجہ پر چاروں طرف سے دشمن کی فوج ٹوٹ پڑی مگر اس کے شجاع اور بہادر راجپوتوں نے اپنی جانیں لڑا کر بچالیا۔ اور ایسی جان توڑ کر لڑے کہ آٹھ ہزار میں سے لڑائی کے خاتمہ پر صرف پانچ سو کے قریب باقی رہ گئے۔

اس واقعہ کے بعد راجہ نے آگرہ جانا مناسب نہ جانا اور ان بچے کھچے وفادار سپاہیوں کے ساتھ سیدھا اپنی ریاست گاہ کو چلا گیا۔(۵۸)

راجپوتوں کی سپاہ گری کے متعلق ان کی بعض عادتوں اور رسموں کا اور اُن کی شجاعت کے باعث مسلمان بادشاہوں کے نزدیک اُن کے محلِ اعتماد ہونے کا ذِکر

لفظ راجپوت کے معنی ہیں راجہ کا بیٹا۔ یہ لوگ پشت ہا پشت سے سپاہی پیشہ ہیں اور ابتدائے عمر سے یہی تعلیم پاتے ہیں اور ان کے راجہ معاش کے لئے اس شرط پر ان کو جاگیریں دیا کرتے ہیں کہ جنگی ضرورت کے وقت اپنے آقا کی خدمت کے لئے حاضر ہو جائیں۔ لارڈ وغیرہ موروثی امرائے یورپ کی طرح ان راجپوت ٹھاکروں کو بھی اس ملک کے خاندانی سردار کہا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ ان کی جاگیریں ناقابلِ ضبطی اور موروثی ہوں' یہ لوگ ابتدائے عمر سے افیون کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کو افیون کے بڑے بڑے انٹے کھاتے دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی اور لڑائی کے دن تو یہ معمول سے دوگنی افیون کھا کر ایسے مدہوش سے ہو جاتے ہیں کہ بے فکر واندیشہ اپنے آپ کو ہر ایک جان جوکھوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر کوئی راجہ خود بھی بہادر ہو تو اس کے دل میں کبھی یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ میرے راجپوت کبھی کسی مشکل میں میرا ساتھ چھوڑ دیں گے۔

لڑائی کے وقت یہ لوگ شاید اتنی بات کے تو محتاج ہیں کہ کوئی ان کا پیش رو اور لڑانے والا ہو۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے رئیس کے سامنے جان دے دینا اپنا فخر سمجھتے ہیں اور اس کو دشمن کے ہاتھ میں کبھی نہیں چھوڑ دیتے۔ میدان جنگ میں جانے سے پہلے جب یہ افیون کے نشہ میں جھومتے ہوئے مرنے کے یقین سے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر رخصت ہوا کرتے ہیں تو یہ تماشا دلچسپ اور قابلِ دید ہوتا ہے اور اس صورت میں محلِ تعجب نہیں ہے کہ یہ مغل بادشاہ اگرچہ مسلمان اور بت پرستوں کے مخالف مذہب ہیں لیکن بہت سے راجاؤں کو ہمیشہ اپنی ملازمت میں اور اکثرا اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ ویسے ہی سلوک کرتے ہیں جیسے کہ اپنے مسلمان امیروں اور سرداروں کے ساتھ! اور مسلمان امیروں کی مانند ان کو بھی فوج کی حکومتوں اور سرداریوں پر مقرر اور مامور کرتے ہیں۔

گھر پہنچنے پر جسونت سنگھ کے ساتھ اس کی رانی کا ایک عجیب و غریب طور سے پیش آنا

اس موقع پر جسونت سنگھ کی رانی جس سلوک سے اپنے شوہر کے ساتھ پیش آئی وہ بھی سننے کے لائق ہے۔ یعنی رانی نے جب سنا کہ راجہ پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ معرکہ سے جان بچا کر نکل آیا ہے تو اس نے بجائے اس کے کہ اس آفت سے بچنے کی مبارک باد دیتی اور تسلی کرتی' فوراً حکم دیا کہ "قلعہ کے دروازے بند کر دو ایسے بے غیرت نامرد کو میں قلعہ میں ہرگز نہ آنے دوں گی! ایسا شخص اور میرا شوہر! میرے باپ کا داماد اور ایسا بے غیرت! میں ہرگز اس کا منہ دیکھنا نہیں چاہتی! جو شخص ایسے نامور رانا کا رشتہ دار ہو چاہئے کہ اس کی شجاعت اور نیک نامی کی تقلید اور پیروی کرے اور اگر فتح نہ پا سکے تو بہادری سے جان دے دے" اور اس سے تھوڑی دیر بعد اس کے دل میں کچھ اور خیالات گزرے اور کہا کہ میرے لئے ابھی چتا تیار کرو' مجھے دھوکا ہوا۔ میرا شوہر حقیقت میں مارا گیا۔ اور یہی سچ ہے پس اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتی! اور تھوڑے عرصہ بعد پھر غصہ میں آ کر بدستور لعن طعن کرنے لگی اور اسی حالت میں اس کو آٹھ دن گزر گئے اور شوہر کا منہ نہ دیکھا۔ لیکن آخر جب اس کی ماں اس کے پاس آئی تب کچھ تسلی تشفی کر کے سمجھایا کہ گھبراؤ نہیں راجہ ذرا دم لے کر اور از سر نو فوج جمع کر کے اورنگ زیب پر پھر حملہ کرے گا اور اپنی شجاعت

اور بہادری کے نام کو بدستور قائم رکھے گا۔

ہندوستان کی باغیرت عورتوں کی نسبت مصنف کی رائے

اس حکایت سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ اس ملک کی عورتوں کے دل میں حفظ ننگ و ناموس اور عزت کا کس قدر خیال ہے۔ چنانچہ میں اس قسم کی مثالیں اور بھی بیان کر سکتا ہوں کیونکہ میں نے بہت سی بیبیوں کو اپنے خاوندوں کی لاش کے ساتھ جلتے ہوئے بچشم خود دیکھا ہے۔ لیکن ان واقعات کو میں کسی اور مقام پر لکھوں گا جہاں بیان کروں گا کہ انسان کے دل پر اپنی امیدوں اور کثرتِ رائے اور کسی عام عقیدے اور عزت و حرمت کے خیالات کا کیسا زبردست اور قوی اثر ہوتا ہے۔

شکست کی خبر سن کر مشتبہ لوگوں کی طرف سے دارا شکوہ کا طیش میں آنا اور بادشاہ کا سمجھا بجھا کر اُس کو ٹھنڈا کرنا

جس وقت دارا شکوہ اُجین کی اس نامبارک اور غمناک واردات سے مطلع ہوا تو غیظ و غضب کے مارے یہ حالت تھی کہ اگر نصیحت اور فہمائش سے شاہ جہاں ذرا ٹھنڈا نہ کرتا تو خدا جانے اس وحشت اور جلد بازی میں کیا کر بیٹھتا اور کچھ شک نہیں ہے کہ اگر قاسم خاں اس کے قابو میں آجاتا تو اس کا سر ضرور کٹوا دیا جاتا اور چونکہ میر جُملہ (۵۹) کی نسبت بھی اس کو یہ گمان تھا کہ اورنگ زیب کو اپنی فوج اور روپیہ دے کر وہی اصل اصول اور بانی مبانی اس تمام فتنہ و فساد کا ہوا ہے اس لئے قریب تھا کہ اس کے بیٹے محمد امین خاں کو بھی مروا ڈالے اور اس کی بیوی اور بیٹی کو بازاری عورتوں کے چکلہ میں بھیج دے مگر بادشاہ کی فہمائش بلیغ کے باعث آخر کار اس کا جوش و غضب فرو ہوا اور میر جُملہ کے اہل و عیال کی عزت اور جان بچ گئی۔ یعنی بادشاہ نے اس کو سمجھایا کہ یہ امر ہر گز ممکن نہیں ہے کہ میر جُملہ اورنگ زیب سے سازش رکھتا ہو اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایسا دور اندیش اور دانا آدمی ایسے شخص کے فائدہ کے واسطے جس سے وہ کچھ الفت و محبت نہیں رکھتا اپنے اہل و عیال کو ایسے شدید خطرہ میں ڈال دے بلکہ بر خلاف اس کے یہ امر ظاہر ہے کہ وہ خود اورنگ زیب کے دامِ فریب میں پھنسا ہوا ہے۔

فتح کے بعد اورنگ زیب اور مراد بخش کی چال ڈھال

ادھر حملہ آوروں کا یہ حال تھا کہ خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے تھے اور یہ

گھمنڈ ہو گیا تھا کہ ہم کسی سے مغلوب نہیں ہو سکتے اور کوئی ایسا مشکل کام نہیں جس کو ہم انجام نہ دے سکیں اور فوج کی ہمت وجرأت بڑھانے کو اورنگ زیب علانیہ کہتا تھا کہ دارا شکوہ کی فوج میں تیس ہزار مغل ہمارے لئے اپنی جانیں لڑا دینے کو تیار ہیں اور اس کی یہ لاف زنی چنداں بے اصل بھی نہ تھی کیونکہ ناظرینِ کتاب جلد معلوم کر لیں گے دارا شکوہ سے فی الواقع بعض امراء نے دغابازی کی۔ اب مراد بخش اگرچہ تیز مزاجی سے قیام کا متحمل نہ تھا اور اس کا شوق یہی چاہتا تھا کہ آگے بڑھے چلئے۔ لیکن اورنگ زیب نے روکا اور کہا کہ اس خوشنما دریا (نربدا) (۶۰) کے کنارے ٹھہر کر ذرا دم لینا اور آرام کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ہم کو اپنے دوستوں اور خیر خواہوں سے خط وکتابت کر کے دارالسلطنت کے حالات جانچنے اور معلوم کرنے کا موقع ملے گا۔ غرض کہ اب ان کا کوچ آہستہ آہستہ ہوتا تھا اور آگرہ سے جو خبریں آتی تھیں ان پر غور کر کے آگے کو بڑھتے تھے۔

شاہ جہاں کی مجبوری اور دارا شکوہ کی خودرائی

اس وقت شاہ جہاں ایک عجیب ناامیدی اور غم میں مبتلا تھا۔ کیونکہ ایک طرف تو یہ دیکھتا تھا کہ اب یہ دونوں کسی طرح دارالسلطنت میں داخل ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔ دوسری جانب دارا شکوہ کو لڑائی کی بڑی بڑی تیاریاں کرتے دیکھ کر اسے سخت اضطراب ہوتا تھا کیونکہ خوب جانتا تھا کہ جن آفتوں کو وہ طرح طرح کی تدبیروں سے ٹالنا چاہتا تھا اب اس خاندان پر آنے والی ہیں۔ مگر دارا شکوہ کی خواہشوں کو روک بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اوّل تو بیماری کی سختیوں ہی سے چھٹکارا نہیں ہوا تھا اس کے علاوہ دارا شکوہ کی منہ زوریوں سے مجبور ہو کر فوج اور ملک کے کام سے ہاتھ اٹھا بیٹھا تھا اور امرا اور وزرا کو کہہ چکا تھا کہ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں۔ غرض کہ ان دنوں اس کی یہ حالت تھی کہ گویا دارا شکوہ تو بادشاہ اور حاکم تھا اور وہ نوکر اور محکوم۔

دارا شکوہ نے جو فوج جمع کی تھی اُس کی تعداد

اس لئے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ دارا شکوہ نے بآسانی اس قدر فوج جمع کر لی جو ہندوستان میں کسی لڑائی کے موقع پر شائد ہی کبھی ہوئی ہو۔ چنانچہ ایک لاکھ سوار (۶۱) اور بیس ہزار پیدل اور اسی توپیں اور بے انتہا نوکر چاکر اور بنئے بقال اور مزدور اور حمال جو

رسد رسانی اور اَور (دیگر) کاموں اور خدمتوں کے لئے صلح ہو یا جنگ، بہر حال درکار ہوتے ہیں، جمع ہو گئے۔ پس اکثر مؤرخ جو یہ لکھ دیا کرتے ہیں کہ فلاں جگہ تین چار لاکھ آدمی کا لشکر تھا مجھے شک ہے کہ وہ غلطی سے باہر کے لوگوں کو بھی لڑنے والے سپاہیوں کے شمار میں داخل کر لیتے ہیں۔

باوجود کثرتِ فوج کے دارا شکوہ کی ناکامیالی کے آثار نمایاں ہونا

اگرچہ یہ بات مسلّم ہے کہ دارا شکوہ کی فوج اس قدر زیادہ تھی کہ حسبِ ظاہر اورنگ زیب کی سی دو تین فوجوں پر غالب آسکتی تھی (کیونکہ اوّل تو اس کی سب قسم کی فوج چالیس ہزار سے کسی طرح زیادہ نہ تھی۔ اور پھر تیز دھوپ اور گرمی میں کڑے کڑے کوچ کئے چلے آنے سے اکثر تھکی ماندی تھی) مگر اس پر بھی کسی کو اس کی کامیابی کا یقین نہ تھا اس لئے کہ جن سپاہیوں اور سرداروں کی نسبت یہ بھروسہ ہو سکتا تھا کہ نمک حلال اور وفادار رہیں گے وہ صرف وہ لوگ تھے جو سلیمان شکوہ کے ساتھ گئے ہوئے تھے اور دربار کے جتنے بڑے بڑے امیر تھے ان کی طرف سے ایسے آثار ظاہر تھے کہ ان کو نہ تو کچھ اس سے محبت ہی ہے اور نہ کچھ اس کا فائدہ ہی چاہتے ہیں۔

دارا شکوہ کے خیر خواہوں اور خود بادشاہ کا اس کو لڑائی سے منع کرنا اور اس کا نہ ماننا

اس لئے اس کے خالص خیر خواہوں نے نہایت منت اور سماجت سے یہ صلاح دی کہ آپ اس خطرناک لڑائی کی سلسلہ جنبانی نہ کریں اور خود شاہ جہاں کی بھی نہایت مضبوطی کے ساتھ یہی رائے تھی بلکہ باوجود ضعف و نقاہت کے اس نے یہاں تک کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ اورنگ زیب کے مقابلہ کو بذاتِ خود جاؤں اور فی الواقع یہ تدبیر نہایت ہی عمدہ اور معقول تھی اور ضرور لڑائی ٹل جاتی اور اورنگ زیب جو نہایت ہی مغرور ہو رہا تھا اس طریق سے اس کی کامیابی بے شک رُک جاتی اور اوّل تو اورنگ زیب اور مراد بخش باپ کے ساتھ غالباً مقابلہ سے پیش ہی نہ آتے۔ اور اگر ایسی حرکت کر بھی بیٹھتے تو یقیناً تباہ اور برباد ہو جاتے کیونکہ اورنگ زیب اور مراد بخش کے سب سردار اور اہلِ فوج بادشاہ سے بہ دل گرویدہ تھے اور جب اس نے کسی طرح سے بھی ان کی اس صلاح کو نہ مانا تو بہ ناچاری انہوں

نے یہ سمجھایا کہ سلیمان شکوہ جو آپ کی امداد کے لئے بہت جلد چلا آرہا ہے اس کے آجانے تک توقف کیجئے۔ اور فی الواقع یہ بھی ایک اچھی اور مفید صلاح تھی کیونکہ اس نوجوان شہزادہ سے اکثر لوگ راضی تھے اور محبت رکھتے تھے اور وہ اپنے ساتھ ایک ایسی فوج لئے آتا تھا جس میں اکثر دارا شکوہ کے ذاتی ملازم تھے اور سلطان شجاع پر ابھی فتح پا چکی تھی لیکن اس کو بھی نہ مانا کیونکہ اس نے یہی ایک بات ٹھان لی تھی کہ اپنے اس ارادہ پر قائم رہ کر جس طرح بن پڑے اورنگ زیب سے سبقت لے جانا چاہئے۔ اگر دارا شکوہ خوش نصیب ہوتا اور موقع شناسی سے کام کرتا تو غالباً بازی لے جاتا۔ (۶۲)

دارا شکوہ نے جن خیالات سے ان مشوروں کو نہ مانا اُن کی تشریح

جن خیالوں سے اس نے ان تجویزوں کو نہ مانا اور جلدی سے بھڑ جانا ہی پسند کیا ان میں سے ایک تو یہ تھا کہ اس نے سوچا کہ اس وقت بادشاہ یہاں تک میرے قابو میں ہے کہ اس کی ذاتِ خاص پر بھی مجھے اختیارِ کلی حاصل ہے۔ دوسرا یہ کہ بادشاہی خزانہ سب میرے قبضہ میں ہے۔ تیسرا یہ کہ کل بادشاہی فوج میرے تحتِ حکومت ہے۔ چوتھا یہ کہ سلطان شجاع نے ایسی شکست کھائی ہے کہ گویا تباہ ہی ہو چکا ہے اور اورنگ زیب اور مراد بخش جو ایک کمزور اور تھکی ماندی فوج لے کر آئے ہیں گویا "بپائے خود بگور آمد" کا مصداق بننے کو آتے ہیں اور اس حالت میں اگر ان کو ایک بار شکست مل جائے گی تو پھر کہیں ان کا ٹھور ٹھکانا نہ رہے گا اور اس طرح سے روز روز کا قصہ ایک ہی دفعہ پاک ہو کر بلا شریک و سہیم سلطنت کا مالک اور بادشاہ بن جاؤں گا۔ اور یہ بھی خیال کیا کہ اگر خود بادشاہ کو مقابلہ کے لئے جانے دوں گا تو ضرور صلح ہو جائے گی اور سب بھائی اپنے اپنے صوبوں کو واپس چلے جائیں گے اور بادشاہ جو پہلے کی بہ نسبت تندرست ہوتا جاتا ہے عنان حکومت پھر اپنے ہاتھ میں لے لے گا اور امور سلطنت جس صورت پر پہلے تھے اسی شکل پر پھر ہو جائیں گے اور سلیماں شکوہ کے انتظار کرنے کی نسبت اس نے یہ سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے آنے تک بادشاہ میری خرابی کے لئے کوئی منصوبہ باندھ لے یا اورنگ زیب ہی سے کوئی ایسا عہد و پیمان کر لے جو میرے حق میں مضر ہو اور یہ بھی خیال کیا کہ اگر اس کے آنے تک صبر کیا جائے اور بفرض اس کے کہ اس وقت لڑائی ہو کر فتح ہو جائے تو لوگ اس کو سلیمان شکوہ ہی سے منسوب کریں گے جس کی بہادری کی پہلے ہی بہت کچھ دھاک پڑ گئی ہے اور اس حالت میں

کون کہہ سکتا ہے کہ اس دل چلے اور نوجوان لڑکے کی طبیعت پر لوگوں کی تعریف و توصیف سے کس قسم کا اثر پیدا ہوگا۔ اور جبکہ خاص داوا اور امرائے دربار تحسین و آفرین کریں گے تو کیا معلوم ہے کہ اس کے خیالات کہاں تک بلند پروازی کریں اور باپ کی محبت اور ادب کا کچھ لحاظ باقی رہے یا نہ رہے۔

دارا شکوہ کا آگرہ سے کوچ کر کے دریائے چنبل کے گھاٹوں کو جا روکنا

غرض کہ ان توہمات سے دارا شکوہ بہک گیا۔ اور اپنے خیر خواہوں اور دوستوں کی نیک اور عاقلانہ صلاح بالکل نہ مانی اور فوج کو لڑائی کے لئے تیار ہو کر کوچ کرنے کا حکم دیا اور رخصت ہونے کو قلعہ میں بادشاہ کے پاس آیا اور یہ بوڑھا باپ اول تو بیٹے سے بغلگیر ہو کر بے اختیار رونے لگا مگر پھر ذرا سنبھل کر بولا کہ "خیر بیٹا تم نے اپنی مرضی کا کام کیا۔ خدا تم کو اس میں سرخرو اور کامیاب کرے۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر لڑائی بگڑ گئی تو پھر آکر مجھے کیا منہ دکھاؤ گے" مگر اس نے ان باتوں کی کچھ پروا نہ کی اور جھٹ پٹ رخصت ہو کر چنبل کی طرف جو آگرہ سے قریب بیس فرسنگ کے ہے کوچ کر دیا اور اس خیال سے کہ مخالف فوج یہیں سے گزر کرے گی دریا کے گھاٹ روک کر مورچے جما دیئے۔ (۶۳)

اورنگ زیب کا دارا شکوہ کو دھوکے میں رکھ کر ایک غیر معروف گھاٹ سے آگرہ کے قریب آپہنچنا

لیکن وہ تیز نظر اور چالاک "فقیر" (۶۴) جس نے ہر جگہ جاسوس اور مخبر لگا رکھے تھے اس بات کو خوب سمجھے ہوئے تھا کہ اس قدر مخالف فوج کی موجودگی میں دریا سے اترنا کس قدر دشوار ہے۔ مگر بہر حال اس نے اپنے ڈیرے خیمے اُس پار آن لگائے۔ اور عمداً ایسے نزدیک قائم کئے کہ دارا شکوہ ان کو دیکھ سکے اور اس کے ساتھ ہی یہ تدبیر کی کہ چمپت (۶۵) نامی ایک راجہ کو کچھ انعام و اکرام اور وعدے وعیدے کر یہ بندوبست کر لیا کہ فوج اس کے علاقہ میں سے گزر کر فوراً اس گھاٹ کو جالے جو پایاب تھا اور اس راجہ نے اس بن اور کوہستان کے مشکل راستہ سے جس کی نسبت دارا شکوہ کو شاید یہ گمان تھا کہ اس طرف سے اورنگ زیب نہ آسکے گا، خود ساتھ ہو کر عبور کرا دینے کا ذمہ کر لیا اور اس تجویز کے موافق مخالفوں کو دھوکا دینے کے لئے ڈیرے خیمے بدستور کھڑے چھوڑ دیئے اور خود مع

فوج چل دیا اور دشمن کو خبر ہونے سے پہلے چنبل سے اتر آیا۔(۶۶)

دارا شکوہ کا چنبل کے کنارے سے مورچے اٹھا کر اورنگ زیب کی فوج کے مقابلہ میں لشکر لا ڈالنا اور بادشاہ کی رائے کے برخلاف لڑائی میں عجلت کرنا

اب دارا شکوہ کو بھی مجبوراً اپنے مورچے چھوڑ کر اس کا تعاقب کرنا پڑا جو چنبل سے اتر کر بڑی سرعت کے ساتھ جمنا کے کنارے پہنچ گیا اور فوج کو آرام دینے کی غرض سے مورچے جمائے دیکھ رہا تھا کہ دارا شکوہ کب آتا ہے۔(یہ جگہ جہاں اس نے اپنے مورچے قائم کئے تھے آگرہ سے قریب پندرہ میل کے ہے اور اس کا نام پہلے سموگڈھ تھا اور اب اس وجہ سے کہ اورنگ زیب نے یہاں فتح پائی تھی فتح آباد کہا جاتا ہے) پس وہ بھی جھٹ پٹ آن پہنچا اور اورنگ زیب کے لشکر اور آگرہ کے مابین جمنا کے کنارے ڈیرے آن لگائے۔ مگر تین چار روز تک دونوں لشکر آمنے سامنے اسی طرح چپ چاپ پڑے رہے اور اس عرصہ میں اگرچہ شاہ جہاں نے خط پر خط بھیجے اور لکھا کہ سلیمان شکوہ قریب پہنچ گیا ہے خبردار سوئے تدبیری سے بے موقع جلدی نہ کر بیٹھنا بلکہ مناسب یہ ہے کہ آگرہ سے کسی قدر اور قریب ہو جاؤ اور سلیمان شکوہ کے آجانے تک لشکر کو کسی مناسب جگہ ٹھہرا کر اردگرد خندق کھدوا لو اور مورچے باندھ لو۔ مگر اس نے ان کے جواب میں صرف اتنا ہی لکھ بھیجا کہ حضور کچھ اندیشہ نہ فرمائیں انشاء اللہ تین دن گزرنے نہ پائیں گے کہ اورنگ زیب اور مراد بخش کو ہاتھ پاؤں باندھ کر حاضر کردوں گا۔ اس وقت حضور کو اختیار ہے کہ جو مناسب ہو ان کو سزا دیں اور یہ جواب روانہ کرکے لڑائی کی تیاری کر دی۔(۶۷)

دارا شکوہ کی صف آرائی

چنانچہ سب سے آگے تو توپخانہ قائم کیا اور آہنی زنجیروں سے توپوں کو اس طرح باہم جکڑ دیا کہ دشمن کے سواروں کو حملہ کرکے گھس آنے کی گنجائش نہ رہی اور اس کے پیچھے زنبور خانہ کے رسالوں کا پرا جمایا جن کے اونٹوں کی پیٹھ پر زنبورک جو ہماری جہازی جزائلوں سے مشابہ ہیں' کسے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ لوگ ان کو اونٹ پر چڑھے چڑھائے بآسانی بھر کر چلا سکتے ہیں اور ان کے پیچھے بہت سی صفیں پیدل بندوقچیوں کی تھیں اور باقی

فوج سواروں کی تھی جن کے پاس یا تو تلواریں اور برچھیاں تھیں یا تلواریں اور تیر کمان۔ چنانچہ برچھی توراجپوتوں کا ہتھیار ہے اور تیر وکمان عموماً مغلوں کا۔ اور یہ بات میں پہلے لکھ ہی چکا ہوں کہ آج کل ہندوستان میں گورے رنگ کے سب نووارد مسلمانوں کو خواہ عرب ہوں خواہ رومی ایرانی ہوں خواہ تورانی، مغل ہی کہتے ہیں۔

اس کے بعد دارا شکوہ نے فوج کے تین حصے قرار دیئے۔ چنانچہ دائیں پرے کا سردار، خلیل اللہ خاں کو بنایا جس کے تحت میں تیس ہزار مغل تھے اور بائیں پرے کی سرداری رستم خاں دکھنی کو، جو بڑا شجاع اور نامور سردار تھا، تفویض ہوئی اور راؤ ستر سال (ہاڑہ) اور رام سنگھ (رانھور معروف روٹھلہ) کو اس کے شامل کر دیا۔ خلیل اللہ خاں کو دانشمند خاں کی جگہ (جس کی کچھ دنوں بعد میں نے ملازمت اختیار کر لی تھی) سواروں کی فوج کا ''بخشی'' یعنی سپہ سالار بنایا گیا تھا اور اس کی یہ وجہ تھی کہ دانشمند خاں کو یہ بات ہرگز گوارا نہ تھی کہ کوئی شخص شاہ جہاں کے شاہانہ اختیارات میں مداخلت کرے اور چونکہ یہ امر دارا شکوہ کی ناراضی کا باعث تھا اس لئے اس نے اپنے منصب سے استعفادے دیا تھا۔

اورنگ زیب اور مراد بخش کے لشکر کی صف بندی

اورنگ زیب اور مراد بخش نے بھی قریباً اسی قاعدہ سے اپنی فوج کو میدان میں کھڑا کیا البتہ یہ بات زیادہ کی کہ امرا کی فوجوں میں جو دونوں طرف یعنی دائیں بائیں تھیں کچھ ہلکی توپیں پوشیدہ طور پر لگا دیں۔ کہتے ہیں کہ یہ حکمت میر جملہ کی بتائی ہوئی تھی جس کا نتیجہ کسی قدر اچھا ہی نکلا۔

ہندوستان کے فن جنگ کی نسبت مصنف کی رائے

مجھے معلوم نہیں کہ اس لڑائی میں کوئی اور جنگی حکمت بھی کی گئی ہو بجز اس کے کہ مقابل کی صف کے اکثر حصوں سے ایک قسم کے بان دونوں طرف کے سواروں پر چلائے جاتے تھے۔ جن سے اکثر گھوڑے بھڑک جاتے تھے اور کبھی کبھی کچھ آدمیوں کا بھی نقصان ہو جاتا تھا۔ مگر میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہاں کے سواروں کی چلت پھرت بہت اچھی ہے اور لڑائی کے وقت گھوڑوں کو بآسانی پھرانے اور چکر وغیرہ دینے میں بہت مشاق ہیں اور تیر اندازی تو ایسی عجیب سرعت کے ساتھ کرتے ہیں کہ جتنی دیر میں برقنداز

دو بند وقیں چھوڑے سوار چھ تیر چلا سکتا ہے اور نہایت اچھی طرح سے صف بندی قائم رکھتے اور خوبی مجتمع رہتے ہیں۔ خصوصاً حملہ کے وقت دشمن پر خوب اکھٹے ہو کر گرتے ہیں۔ مگر باایں ہمہ میں ان کو لڑائی کے فن میں یورپ کی فوج سوار کے مانند قابل اور ہوشیار نہیں سمجھتا اور اس کا سبب اس کتاب کے ایک اور مقام میں بیان کروں گا۔

لڑائی کا بیان

اب لڑائی کی کیفیت سنئے کہ جس وقت دونوں طرف خوبی تیاریاں ہو چکیں تو یہاں کے دستور کے موافق اوّل گولہ چلنا شروع ہوا اور پھر تیر اس کثرت سے برسنے لگے کہ گویا بادل چھا گیا مگر لڑائی کی گرما گرمی میں یکا یک مینہ کا ایک ایسا چھینٹا پڑا کہ لڑائی جو خوب سرگرمی سے ہو رہی تھی تھوڑی دیر کے لئے ذرا ٹھنڈی پڑ گئی۔ مگر بارش کے رکتے ہی پھر توپیں چلنے لگیں اور دارا شکوہ اس وقت سراندیپ کے ایک خوبصورت ہاتھی پر سوار ہو کر نکلا اور سب طرف سے دھاوا کرنے کا حکم دیتا ہوا بذاتِ خود سواروں کی ایک فوج کے ساتھ دشمن کی توپیں چھین لینے کو بڑی جرأت سے بڑھا۔ مگر مخالفوں نے ایسی مستعدی اور استقلال سے مقابلہ کیا کہ دارا شکوہ کے ارد گرد آن کی آن میں کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور نہ صرف وہ فوج جو اس کے ساتھ تھی بلکہ بہت سی اور بھی جو پیچھے سے آن ملی تھی سب تتر بتر کر دی لیکن دارا شکوہ ایک عجیب استقلال کے ساتھ میدان میں قائم اور ہاتھی پر بیٹھا چاروں طرف بڑی دلیری اور بے باکی سے برابر نظر ڈالتا ہوا لڑائی کی درستی میں مصروف تھا۔ چنانچہ اس کی دیکھا دیکھی اہلِ فوج بھی دلیر ہو گئے اور نا مستقل مزاج اور تھڑ دلے سپاہی جو جگہ چھوڑ گئے تھے پھر اپنے اپنے موقع پر آن جمے اور دارا شکوہ نے اگرچہ پھر کئی متواتر حملے کئے مگر اورنگ زیب تک نہ پہنچ سکا کیونکہ دشمن کے توپ خانہ نے اس قدر نقصان پہنچایا اور ایسا زور باندھا کہ بعض سپاہیوں کے دل چھوٹ گئے بلکہ کچھ بھاگ بھی نکلے لیکن دارا شکوہ کی شجاعت و دلیری نے ایسا اثر کیا کہ اکثر سپاہیوں نے منہ نہ موڑا اور اپنے بہادر سپہ سالار کی رکاب میں اس تیزی سے بڑھے کہ آخر کار توپوں تک جا ہی پہنچے اور ان کی زنجیریں کھول ڈالیں اور دشمن کی خیمہ گاہ میں جا گھسے اور زنبور خانہ کے رسالوں اور پیادوں کی فوج کو مار کر بالکل بھگا دیا۔ مگر اس وقت سواروں کی فوجوں کے باہم نہایت ہی زور شور سے لڑائی ہوئی اور اس کثرت سے تیر برسے کہ آسمان کا دکھائی دینا دشوار ہو گیا یہاں تک کہ خود دارا شکوہ نے

اپنا ترکش خالی کر ڈالا۔ مگر ان تیروں سے فریقین کا چنداں نقصان نہیں ہوا کیونکہ دس میں سے نو تیر یا تو نشانہ تک پہنچتے ہی نہ تھے یا ادھر ادھر جا گرتے تھے۔ جب ترکش خالی ہو چکے تو تلواروں کی نوبت آئی اور فریقین اس شدت سے لڑے کہ جس قدر سپاہی مارے جاتے تھے اسی قدر جوش بڑھتا جاتا تھا اور دارا شکوہ بڑی شجاعت سے پکار پکار کر اہل فوج کو برابر تسلی اور بڑھاوے دیئے جاتا اور حملہ پر حملہ کئے جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار دشمن کے سواروں کو بھی بھگا دیا اور اورنگ زیب نے جو ہاتھی پر سوار اور نزدیک ہی تھا ہر چند سپاہ کے قائم رکھنے میں بہت کوشش کی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اور اگرچہ اپنے خاص الخاص سواروں سے بھی چاہا کہ دارا شکوہ کو روکیں لیکن ان کو بھی میدان جنگ سے نہایت ابتری کے ساتھ بھاگنا ہی پڑا۔ مگر واہ رے اورنگ زیب تیری دلاوری! جب دیکھا کہ تمام فوج بھاگ گئی اور جو لوگ اب تک صحیح و سالم اور حاضر رکاب ہیں وہ بھی ایک ہزار سے زیادہ نہیں! (بلکہ میں نے سنا ہے کہ قریب پانچ سو ہی کے تھے) اور اس حالت پر بھی غور کیا کہ بلا لحاظ زمین کی ناہمواری اور نشیب و فراز کے (جو دونوں لشکروں میں حائل تھی) دارا شکوہ اب ہماری اس تھوڑی سی باقی ماندہ فوج پر ضرور حملہ کرے گا تو ذرا بھی نہیں ڈرا بلکہ اپنے سرداروں کو نام لے کر پکارا کہ بہادرو! خدا پر نظر رکھو! بھاگنے سے کیا ہوگا! خدا سب جگہ ہے! کیا تم نہیں جانتے کہ ملک دکن کس قدر دور ہے!

اورنگ زیب کا اپنے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈال دینے کا حکم دینا اور راجپوتوں کے نہایت سخت حملوں میں اس کا اور مراد بخش کا ثابت قدم رہنا

اورنگ زیب نے اپنا یہ عزم جتانے کو کہ خواہ کچھ ہی ہو میدان سے ہرگز نہ ٹلوں گا یہ عجیب (۲۸) حکم دیا کہ "ہمارے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈال دو"۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کے حاضر رکاب رفقا اور جاں نثار سردار اس نازک وقت میں وفاداری اور ہمت میں کچھ کمی کرتے تو ہاتھی کے پاؤں میں ضرور زنجیر ڈال دی جاتی مگر ان لوگوں نے بالاتفاق اپنی جان نثاری اور وفاداری کے مضبوط وعدوں سے اورنگ زیب کو ایسا نہ کرنے دیا اور دارا شکوہ نے اگرچہ نہایت کوشش کی کہ جس طرح ممکن ہو اورنگ زیب کو جا لے۔ لیکن زمین کے نشیب و فراز اور دشمن کے شکست یافتہ سواروں کی وجہ سے جو اب تک میدان میں اور ٹیلوں پر ادھر ادھر موجود تھے (گو بے ترتیب طور پر پھر رہے تھے) اس تک نہ پہنچ سکا۔ دارا شکوہ کا

یہ خیال بے شک صحیح تھا کہ اورنگ زیب کے مارے یا پکڑے جانے کے بغیر فتح ناقص ہے اور چونکہ اورنگ زیب اب مقابلہ کے قابل نہ رہا تھا اس لئے اس کو فی الواقع ایسا ہی کرنا واجب تھا کہ فوراً حملہ کر کے اپنے اس خوفناک رقیب کو بآسانی پامال کر دیتا۔ لیکن بعض واقعات کے سبب سے جن کا ذکر میں ابھی کرتا ہوں دارا شکوہ کا خیال ایک اور طرف رجوع ہو گیا اور اورنگ زیب جوکھوں سے بچ گیا۔ یعنی دارا شکوہ کو اس خطرناک موقع پر اپنی فوج کے بائیں پرے میں بڑی ہل چل نظر آئی اور اس کا ایک مصاحب یہ خبر لایا کہ رستم خاں اور ستر سال کام آئے اور رام سنگھ روٹھلہ جو بڑی شجاعت کے ساتھ دھاوا کر کے دشمن کی فوج میں جا گھسا تھا' گھر گیا ہے۔ پس اورنگ زیب پر دھاوا کرنے کا ارادہ چھوڑ کر اسے اپنے بائیں پرے کی مدد کو نہایت جلدی کے ساتھ جانا پڑا اور دارا شکوہ کے بذاتِ خود پہنچ جانے کی وجہ سے ایک سخت چپقلش کے بعد لڑائی کا رنگ پھر بدل گیا اور چاروں طرف سے فوج مخالف کو پیچھے ہٹا دیا گیا۔ لیکن انہوں نے ابھی ایسی شکست نہیں کھائی تھی کہ دارا شکوہ کو بالکل بے فکری ہو جاتی اس مار دھاڑ میں رام سنگھ روٹھلہ نے ایک بے نظیر شجاعت کے ساتھ مراد بخش کو جا زخمی کیا اور کمال دلیری سے اس کی عماری کے چند رسوں (۶۹) کو کاٹ ڈالا اور قریب تھا کہ حریف کو ہاتھی سے گرا لے۔ مگر مراد بخش کی پھرتی اور شجاعت کے باعث ناکامیاب رہا۔ مراد بخش اگرچہ زخمی (۷۰) اور راجپوتوں کے نرغہ میں تھا لیکن ڈھال سے اپنے سات برس کے بچے کو جو پہلو میں بیٹھا ہوا تھا بچائے ہوئے بڑے استقلال سے بدستور لڑتا رہا اور تاک کر ایسا تیر مارا کہ یہ بہادر راجہ وہیں کھیت رہا۔ دارا شکوہ کو اگرچہ اس خبر سے بہت رنج ہوا مگر چونکہ اس نے سنا کہ اپنے مالک کے مارے جانے کی وجہ سے راجپوتوں نے نہایت غیظ و غضب کے ساتھ مراد بخش کو گھیرا ہوا ہے' اس لئے باوجود چند طرح کی مشکلوں کے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ مراد بخش پر حملہ کیا جائے اور اس صورت میں اگرچہ اورنگ زیب گرفتاری سے بچ جاتا تھا اور یہ ایک غلطی تھی' مگر مراد بخش کے ہاتھ آ جانے کو بھی وہ اورنگ زیب کے پکڑے جانے سے کچھ کم نہیں سمجھتا تھا۔

خلیل اللہ خاں کی دغابازی اور دارا شکوہ کی شکست

لیکن خلیل اللہ خاں کے دغا دینے سے بازی بگڑ گئی اور یہ دغابازی ایسی عجیب تھی کہ ایک آن کی آن میں دارا شکوہ کی دائمی بربادی کا سبب ہو گئی۔ یہ شخص دائیں پرے کا سردار

تھا جس میں تیس ہزار مغل تھے اور یہ ایسی اچھی فوج تھی کہ اورنگ زیب کی تمام سپاہ کے شکست دینے کو صرف یہی کافی تھی مگر جبکہ داراشکوہ بذاتِ خود بائیں پرے کی فوج کو بڑی شجاعت اور کامیابی سے لڑا رہا تھا یہ مطلقاً اس کا شریک نہ ہوا۔ اور یہ بہانہ بنائے رکھا کہ ہماری فوج کے لئے تو یہ حکم ہے کہ بطورِ کمک اپنی جگہ قائم رہے۔ اور جب تک کوئی شدید ضرورت پیش نہ آئے ایک قدم آگے بڑھنے اور ایک تیر تک کے چلانے کا حکم نہیں۔ مگر اصل یہ ہے کہ اس کا اس طرح پر الگ تھلگ رہنا پرلے سرے کی بے ایمانی اور دغابازی پر مبنی تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اب سے چند سال پیشتر داراشکوہ نے اس کی کچھ بے عزتی کر ڈالی تھی اور اس کینہ کی آگ اس کے دل کو جلائے رکھتی تھی۔ پس اس نے خیال کیا کہ بدلہ لینے کا اب وقت ہے۔ مگر داراشکوہ کا جو نقصان اس نے اپنے الگ رہنے میں سوچا تھا وہ نہ ہوا۔ کیونکہ دائیں پرے والوں کی مدد کے بغیر ہی وہ دشمن پر غالب آگیا تھا۔ مگر اس دغاباز نے اب ایک اور چال چلی یعنی جبکہ داراشکوہ مُراد بخش کے دبانے کو اپنی سپاہ کی امداد کے لئے جا رہا تھا یہ مکار! مع اپنے چند رفیقوں کے گھوڑا دوڑائے آیا اور دور سے پکار کر کہا "مبارک باد حضرت سلامت! الحمد للہ! الحمد للہ! حضور کو خیر و سلامتی بادشاہی اور فتح مبارک ہو! لیکن حضور یہ تو فرمائیں کہ ایسے خطرناک موقع میں جبکہ عماری کے سائبان سے کئی گولیاں اور تیر پار ہو چکے ہیں اتنے بڑے ہاتھی پر کیوں سوار ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان بے شمار تیروں اور گولیوں میں سے کوئی جسمِ مقدس کو چھو جائے تو ہم لوگوں کا کہاں ٹھکانا ہے! خدا کے واسطے جلد اترئیے اور گھوڑے پر سوار ہو لیجئے! اور اب کیا رہ گیا ہے! صرف اتنی ہی بات باقی ہے کہ ان چند بھگوڑوں کا زیادہ ترچستی اور مستعدی سے تعاقب کیا جائے! اور میں پھر عرض کرتا ہوں کہ اب حضور ان کو اس قدر مہلت نہ دیں کہ بھاگ سکیں"۔ اگر داراشکوہ ہاتھی پر سے اترنے کو نقصان سمجھتا اور یہ سوچتا کہ اس ہاتھی ہی کی بدولت آج میں کیسے کیسے کام کر سکا ہوں اور فوج کو میرے دکھائی دیتے رہنے سے کیسا کچھ فائدہ ہوا ہے تو وہی تمام بادشاہت کا مالک ہوتا لیکن زود اعتقاد اور سادہ دل شہزادہ فریب میں آگیا اور ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس کو شک ہوا اور پوچھا کہ خلیل اللہ خاں کہاں ہے۔ مگر وہ اب کہاں تھا اور کب اس کے ہاتھ آتا تھا اور داراشکوہ اگرچہ اس کو بہت برا بھلا کہتا رہا اور یہ بھی کہا کہ میں اسے زندہ نہ چھوڑوں گا۔ لیکن اس کا یہ غصہ اور دھمکیاں سب بے کار اور بے فائدہ تھیں! کیونکہ سپاہ نے جب دیکھا کہ ہمارا مالک ہاتھی پر نہیں ہے تو فوراً اس کے

مارے جانے کی افواہ اڑ گئی! اور تمام فوج اس دھوکے میں پڑ کر حواس باختہ ہو گئی اور عام تہلکہ پڑ گیا اور سب کو اورنگ زیب کے قہر و غضب کے اندیشہ سے اپنی اپنی جان کی پڑ گئی! اور چند لمحہ میں تمام فوج تتر بتر ہو گئی اور عجب انقلاب ہوا کہ غالب مغلوب اور مغلوب غالب ہو گیا اور عجیب ماجرا ہے کہ اورنگ زیب نے صرف پاؤ گھنٹے ہاتھی پر سوار رہنے سے یہ نتیجہ پایا کہ تمام ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا اور دارا شکوہ کو چند لمحہ قبل از وقت اپنے ہاتھی پر سے اترنے کا یہ پھل ملا کہ ہاتھی سے کیا اُترا گویا اوج سلطنت سے گر گیا اور بد بخت بادشاہوں اور شہزادوں کی فہرست میں داخل ہو گیا! دیکھئے انسان کیا کوتاہ اندیش ہے اور ایک چھوٹی سی بات سے اس دنیا میں کیسے کیسے بڑے نتیجے پیدا ہو جاتے ہیں!

کثرت کی بہ نسبت فوج کے قلیل مگر باقاعدہ ہونے کا فائدہ اور ہندوستانی اور فرانسیسی فوج کی حالت کا مقابلہ

اگرچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لشکروں سے بڑے بڑے نمایاں کام بن پڑتے ہیں۔ لیکن فوج کی کثرت میں یہ بڑی خرابی ہے کہ ایک بار ابتر ہو جائے تو پھر اس کو حالت سابقہ پر لانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور جیسے کوئی بڑا دریا اچھل کر کناروں سے باہر بہہ نکلتا اور اس کا پانی پھیل جاتا ہے اسی طرح ابتری کے بعد بڑے لشکروں کو قابو میں لانا ناممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ میں جب ان بے انتظام فوجوں کو دیکھتا تھا کہ حیوانوں کے گلوں کی مانند چلتی ہیں تو ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ ہمارے صرف پچیس ہزار کار آزمودہ سپاہی زیر حکم پرنس کانڈی یا مارشل تورین ہندوستان کی فوج پر جو کتنی ہی کیوں نہ ہو غالب آ سکتی ہیں۔ اور جب میں کتابوں میں پڑھتا ہوں کہ یونانیوں کی دس ہزار سپاہ نے کیا کچھ کر دکھایا تھا اور مقدونیہ کے پچاس ہزار سپاہیوں نے جو سکندر کے ساتھ تھے ایران کے بادشاہ دارا کے چھ سات لاکھ آدمیوں کے لشکر کو شکست دی تھی (بشرطیکہ یہ بات سچ بھی ہو کہ دارا کی فوج بہیرؔ کے سوا فی الواقع اتنی ہی تھی) تو باقاعدہ اور بے قاعدہ فوجوں کی حالت پر لحاظ کرنے کے بعد مجھے ان روایتوں کی صحت پر کچھ تعجب نہیں ہوتا۔ اور میری دانست میں فرانسیسی سپاہ دشمن کے حملے کو اپنے معمولی استقلال سے رد کر کے ہر ایک ہندوستانی فوج کو سخت تہلکہ میں ڈال سکتی یا سکندر کی طرح دشمن کی صف کے ایک خاص حصہ پر اپنا تمام زور ڈال کر باقی سپاہ میں اپنا سخت خوف اور عام بدنظمی اور انتشار پھیلا سکتی ہے۔

فتح کے بعد امرائے سلطنت کے ساتھ اورنگ زیب کے توڑ جوڑ اور سب سے پہلے خلیل اللہ خاں کا اس کے پاس حاضر ہونا اور اورنگ زیب کا مراد بخش کو پھسلائے رکھنا

اورنگ زیب جو اپنی مطلب براری کے واسطے ہر ایک کمینہ حرکت اور فن و فریب کے ارتکاب کے لئے ہمیشہ ہی تیار رہتا تھا۔ یہ غیر مترقب اور خداداد فتح پا کر اور یہ سمجھ کر کہ میرے معمولی ہتھکنڈوں کے کام میں آنے کا اب موقع ہے' اپنی مکاری کی چالوں اور توڑ جوڑوں میں مصروف ہوا۔ چنانچہ سب سے پہلے دغاباز خلیل اللہ خاں آن موجود ہوا اور تسلیم بجا لا کر عرض کیا کہ "بجا آوری خدمات کے لئے حاضر ہوں اور جس قدر فوج بر دست اس طرف سے پھٹ کر میرے ساتھ آ گئی ہے، وہ بھی حاضر ہے"۔ چنانچہ شہزادہ (اورنگ زیب) نے بے حد اظہار عنایت کیا اور بڑے بڑے وعدے دیئے۔ مگر احتیاطاً سب وعدے مراد بخش کی طرف سے کرتا رہا اور اس کے پاس لے گیا اور موقع وقت کے موافق اس نے بھی بہت ہی کچھ آؤ بھگت اور خاطر داری کی اور اورنگ زیب اگرچہ بظاہر مراد بخش کو برابر شاہ ہندوستان کہہ کر گفتگو کرتا رہا اور خلیل اللہ سے کہا کہ صرف حضرت ہی تخت نشینی کے لائق ہیں اور یہ فتح محض انہی کی قابلیت اور شجاعت سے حاصل ہوئی ہے مگر باطن کا یہ حال تھا کہ شب و روز امرائے سلطنت کو تحریریں بھیج بھیج کر بتدریج اپنی طرف متوجہ اور رجوع کرتا جاتا تھا۔

شائستہ خاں کی کوششوں سے اورنگ زیب کو نفعِ کثیر پہنچنا

ان دنوں اورنگ زیب کا ماموں شائستہ خاں بھی اپنے اس بھانجے کے حق میں بہت کچھ کوشش کرتا تھا اور فی الحقیقت اس کی مدد سے اورنگ زیب کو فائدہ بھی بہت ہی پہنچا۔ کیونکہ شائستہ خاں ایک چست و چالاک اور نہایت مدبر اور ذی اقتدار امیر تھا اور تمام ہندوستان میں اس کے یہ اوصاف مشہور تھے کہ حسن تقریر اور خوبی انشا و تحریر و فصاحت بیانی اور شیریں زبان سے بڑے بڑے کام نکال سکتا ہے اور مشہور ہے کہ بہ باعث کسی اصلی یا خیالی تحقیر کے جو دارا شکوہ کی طرف سے اس کی نسبت ظہور میں آئی تھی یہ اس سے نہایت نفرت رکھتا تھا اور اسی وجہ سے دارا شکوہ کی بربادی کے لئے اس موقع کو اس نے بھی

غنیمت سمجھ لیا تھا۔(۷۱)

اورنگ زیب کا بظاہر یہ کہتے رہنا کہ میں تو ایک فقیر ہوں اور مراد بخش بادشاہ ہے

باوجود اس فتح کے حضرت اورنگ زیب بہادر اپنی وہی معمولی چال چلے جاتے تھے۔ یعنی بے غرضی اور خلوصِ نیت کے لباس میں حصولِ سلطنت کے منصوبہ کو پوشیدہ کئے ہوئے تھے اور جو کچھ پیام و سلام اور وعدے وعید اور کارروائیاں کی جاتی تھیں وہ سب مراد بخش کے نام سے ہوتی تھیں اور اسی کو بادشاہ بنا رکھا تھا اور اپنے تئیں صرف اس کا نائب اور ایک فرمانبردار خیر خواہ بیان کرتا اور ایسی باتیں بناتا تھا کہ سلطنت کی شان و شوکت اور کروفر گویا اُسے مرغوب ہی نہیں بلکہ فقیرانہ گزران کرنا اور حالتِ فقیری ہی میں مرجانا اُس کی دلی مراد اور عین تمنا ہے۔

دارا شکوہ کی نا اُمیدی اور بادشاہ کی طرف سے تسلی و تشفی کے پیغام اور اس کا دہلی کو بھاگ جانا

اس وقت دارا شکوہ خوف و خطر کے دریا میں ڈوبا ہوا اور محض ناامید تھا۔ اور اگرچہ فوراً آگرہ چلا آیا تھا لیکن چونکہ وہ الفاظ اس کو یاد تھے جو شاہ جہاں نے لڑائی پر جاتے کو کہے تھے۔ اس لئے بادشاہ کے سامنے نہ ہو سکا مگر شاہ جہاں نے بہر حال ایک وفادار خواجہ سرا کی زبانی اس بد نصیب شہزادہ کی تسلی اور تسکین کے لئے یہ کہلا بھیجا کہ "میں اب بھی تم کو ویسا ہی چاہتا ہوں اور تمہاری اس مصیبت کا مجھے بہت رنج ہے! بلکہ یہ بھی کہہ بھیجا کہ ابھی سلیمان شکوہ کی فوج اور لشکر سب صحیح و سلامت ہے' ناامید ہونے کی کوئی بات نہیں اور ہماری صلاح ہے کہ بالفعل تم دہلی کو چلے جاؤ۔ صوبہ دار کو حکم بھیج دیا گیا ہے وہ تم کو بادشاہی اصطبل میں سے ایک ہزار گھوڑا اور خزانہ اور ہاتھی دے گا۔ اور آگرہ سے دور نہ جانا چاہئے۔ بلکہ ایک ایسے معقول فاصلہ پر ٹھہرنا مناسب ہے کہ جہاں ہماری تحریریں تم کو بآسانی ملتی رہیں اور ہم کو اب تک یہ امید ہے کہ ہم اورنگ زیب کو قابو میں لا سکیں بلکہ سزا دے سکیں گے"۔ مگر دارا شکوہ ایسا شکستہ خاطر اور اس قدر غمگین تھا کہ ان محبت آمیز باتوں کا کچھ جواب نہ دے سکا بلکہ معقول طور پر اتنا بھی نہ کہہ سکا کہ آپ کا پیغام میرے پاس

پہنچ گیا اور اس کے بعد بیگم صاحب کے پاس چند پیغام بھیج کر آدھی رات کے وقت مع اپنی بیگم اور بیٹیوں اور اپنے فرزند سپہر شکوہ اور قریب تین چار سو آدمیوں کے دہلی کی طرف چل دیا۔

اورنگ زیب کا سلیمان شکوہ کے ہمراہی سرداروں کو اپنی طرف کر لینے میں کوشش کرنا

اب ہم دارا شکوہ کے دہلی جانے کے احوال کو کہ وہ کس غمگینی اور شکستہ دلی سے روانہ ہوا یہیں چھوڑتے ہیں اور اورنگ زیب کے ان توڑ جوڑوں کا حال لکھتے ہیں جو اس نے بڑی دور اندیشی اور حسنِ تدبیر سے آگرہ پہنچ کر کئے۔ چنانچہ سب سے پہلے یہ تدبیر کی کہ سلیمان شکوہ کے لشکر میں نا اتفاقی کا بیج بویا بلکہ بعض سرداروں کو اپنی طرف کر بھی لیا۔ اور اس تدبیر سے دارا شکوہ کی امیدوں کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ یعنی راجہ جے سنگھ اور دلیر خاں جو سلیمان شکوہ کے لشکر کے سب سے بڑے سردار تھے، ان کو لکھا کہ دارا شکوہ بالکل تباہ اور وہ بڑا لشکر جس پر اس کو اس قدر گھمنڈ تھا شکست فاش کھا کر ہمارا مطیع ہو گیا ہے اور وہ ایسی بے سروسامانی سے بھاگا جاتا ہے کہ سواروں کا ایک رسالہ تک ساتھ نہیں اور امید ہے کہ ہم بہت جلد اس کو گرفتار کر لیں گے اور حضرت (شاہ جہاں) اس قدر علیل ہیں کہ صرف چند روز کے مہمان اور چراغِ سحری ہیں پس اس حالت میں اگر تم ہم سے مقابلہ کرو گے تو نتیجہ بجز خرابی اور ہلاکت کے کچھ نہ ہو گا اور دارا شکوہ کی اس ابتر حالت میں اس کی طرفداری کرنا نہایت ہی نادانی ہے اور تمہارے حق میں اب یہی بہتر ہے کہ ہمارے پاس حاضر ہو جاؤ اور سلیماں شکوہ کو جو بآسانی گرفتار ہو سکتا ہے پکڑ کر ساتھ لیتے آؤ۔

راجہ جے سنگھ اور دلیر خاں کا سلیماں شکوہ سے برگشتہ ہو جانا اور جے سنگھ کا اس کو سری نگر کے راجہ کے پاس چلے جانے کی صلاح دینا

جے سنگھ اور دلیر خاں اگرچہ چندے متأمل اور متردد رہے۔ کیونکہ اب تک شاہ جہاں اور دارا شکوہ سے ڈرتے تھے اور شہزادہ پر ہاتھ ڈالنے سے بھی اس وجہ سے خوف کرتے تھے کہ ایسی حرکت بالفعل یا آئندہ کسی دن ہمارے حق میں مضر اور موجب سزا ہو سکتی ہے اور عجب نہیں کہ خود اورنگ زیب ہی کے ہاتھ سے سزا مل جائے اور یہ بھی خوب

معلوم تھا کہ سلیمان شکوہ کیسا عالی دماغ و غیور اور بلند حوصلہ و دلیر شہزادہ ہے اور بیشک جان دے دے گا مگر قید کبھی نہ ہوگا۔ مگر آخر کار دونوں نے یہ ٹھہرایا کہ راجہ جے سنگھ سلیمان شکوہ کے خیمہ میں جائے اور اورنگ زیب کی تحریریں دکھا کر اپنی رائے سے اس کو مفصل اور پوست کندہ مطلع کر دے۔ چنانچہ راجہ نے شہزادہ سے جا کر کہا کہ جس خطرناک حالت میں آپ پڑے ہوئے ہیں مناسب نہیں کہ میں اس کو آپ سے پوشیدہ رکھوں اور معاملات کی حالت ایسی بدل گئی ہے کہ اب آپ کو نہ تو دلیر خاں ہی پر اعتماد کرنا چاہئے اور نہ داؤد خاں اور اپنی فوج ہی پر۔ اور اگر آپ اپنے باپ کی امداد کے ارادہ سے ذرا بھی آگے بڑھیں گے تو بے شک تباہ اور برباد ہو جائیں گے۔ پس مناسب یہ ہے کہ آپ سری نگر کے پہاڑوں کو چلے جائیں۔ وہاں کا راجہ یقیناً آپ کو بہت خاطر داری سے رکھے گا اور ملک کے دشوار گزار ہونے کے باعث اورنگ زیب سے اس کو کچھ ڈر نہیں ہے اور اس محفوظ جگہ میں کچھ دنوں ٹھہر کر آپ حالات اور واقعات پر نظر رکھیں اور جب موقع معلوم ہو تو بآسانی وہاں سے نیچے آ کر مقتضائے وقت کے موافق عمل کر سکتے ہیں۔

سلیمان شکوہ کا سری نگر کو روانہ ہونا اور جے سنگھ اور دلیر خاں کا اس کے مال واسباب کو لوٹ لینا اور اس کے رفیقوں کی تباہی۔ مگر شہزادہ کا سری نگر پہنچ جانا

شہزادہ یہ گفتگو سنتے ہی سمجھ گیا کہ اب نہ تو جے سنگھ ہی اپنا ہے اور نہ لشکر ہی! اور سب برگشتہ ہیں اور یہاں ٹھہرنا جان جوکھوں میں پڑنا ہے۔ پس ناچار فوج و لشکر کو وہیں چھوڑ کر اپنے چند نمک حلال اور خاص رفیقوں کے ساتھ جو اکثر منصب دار اور ذات کے سید تھے اور جنھوں نے اس کی رفاقت کا ترک کرنا خلاف شرافت سمجھا، کوہستان کی طرف چل دیا۔ مگر جے سنگھ اور دلیر خاں ایسے کمینے نکلے کہ کچھ سپاہی بھیج کر اس بے چارہ کا مال و اسباب لوٹ منگایا۔ جس میں اشرفیوں سے لدا ہوا ایک ہاتھی بھی تھا اور ان کی اس نالائق حرکت کے باعث سلیمان شکوہ کے بہت سے ہمراہی شکستہ خاطر ہو کر اس سے جدا ہو گئے اور جو باقی رہے ان کو اکثر دیہاتی گنواروں نے لوٹ کھسوٹ کر تباہ کر دیا بلکہ ان کے ہاتھوں سے بہتیرے مارے بھی گئے مگر جس طرح بن پڑا یہ مرتا بھرتا اپنی بیگم اور اہل و عیال کو

ساتھ لئے ہوئے سری نگر جا پہنچا اور وہاں کا راجہ اس کے رتبہ کے لائق تعظیم و تکریم سے پیش آیا اور تسلی کی کہ جب تک آپ اس ملک میں ہیں' میری تمام سپاہ آپ کی مدد کے لئے حاضر ہے اور آپ کو کچھ خوف و خطر نہیں ہے۔ (۷۲)

اورنگ زیب کا آگرہ میں آنا اور باپ بیٹے کے باہم منافقانہ سلام و پیام اور آخر کار شاہ جہاں کا قید ہو جانا

اب ہم ان واقعات کا ذکر پھر شروع کرتے ہیں جو آگرہ کی طرف وقوع میں آئے۔ سموگڑھ کی لڑائی کے تین چار روز بعد دونوں شہزادوں نے ایک باغ میں جو آگرہ کے سامنے قریب تین میل کے ہے، ڈیرے آن لگائے اور ایک خواجہ سرا کو جو اورنگ زیب کا نہایت معتمد علیہ اور چالاکی و عیاری میں گویا خود اورنگ زیب ہی تھا' شاہ جہاں کے حضور میں بھیجا اور اس نے اس بڈھے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ادائے تسلیمات کے بعد اپنے آقا کی طرف سے بے حد ادب و تعظیم اور محبت و فرمانبرداری کا اظہار کیا اور عرض کی کہ "یہ جو کچھ گزرا صرف داراشکوہ کی کج رائی اور بے جا جاہ طلبی کے خیالات کے باعث ہوا۔ اورنگ زیب نے حضور کی خدمت میں حصول صحت کی مبارک باد عرض کی ہے اور ان واقعات کے وقوع میں آنے کا اُس کو نہایت ہی رنج و افسوس ہے اور اس کا آگرہ آنا محض اس غرض سے ہے کہ جو کچھ ارشاد ہو وہ بسر و چشم اس کی تعمیل کرے"۔ جس کے جواب میں شاہ جہاں نے بھی اپنے فرزند سعادت مند کے طور و طریق کی نسبت ایسی ہی ظاہر داری اور تملق کے ساتھ اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا کہ "اس کی سعادتمندی اور ایسی فرمانبرداری سے ہم نہایت راضی اور خوش ہیں"۔ اگرچہ شاہ جہاں اورنگ زیب کی مکاری اور شوق جہانداری سے بخوبی واقف تھا اور اس کی ان ظاہری باتوں پر اس کو ہرگز اعتماد نہ تھا مگر باوجود اس کے اس نے صفائی کے ساتھ معاملہ کو یکسو نہ کیا یعنی اگرچہ یہ واجب تھا کہ دربار میں امرا اور ارکان دولت کو جمع کر کے خود اس کے مقابلہ کو نکلتا اور اس طرح خلائق کی نظر میں اس کو علانیہ باغی ثابت کرتا حالانکہ ان امور کے لئے اب تک موقع تھا۔ مگر کچھ نہ کیا اور اس کے عوض صرف چالاکی اور دم بازی سے اورنگ زیب جیسے شخص پر جو ایسی باتوں میں دنیا بھر کے مکاروں کا استاد ہے، غالب آنا چاہا۔ پس اس کا خود اس جال میں پھنس جانا جو بیٹے کے لئے بچھایا تھا کچھ تعجب کی بات نہیں اور اس کی تفصیل اس طرح

پر ہے کہ شاہ جہاں نے ایک معتبر خواجہ سرا کو اورنگ زیب کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ بے شک دارا شکوہ نے جو کچھ کیا وہ سب نامناسب تھا اور اس کی بے سمجھی اور نالائقی کی باتیں یاد دلا کر کہا کہ تم پر تو ہم ابتدا ہی سے دلی شفقت رکھتے ہیں۔ بس تم کو ہمارے پاس جلد آنا چاہئے تاکہ تمہارے مشورہ سے ان امور کا انتظام کیا جائے جو اس افراتفری کے باعث خراب اور ابتر پڑے ہوئے ہیں۔ مگر اس محتاط شہزادہ نے بدگمانی سے بادشاہ پر اعتماد کر کے قلعہ میں چلے جانے کی دلیری نہ کی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ بیگم صاحب کسی وقت بادشاہ سے جدا نہیں ہوتی اور اس کے مزاج پر اس قدر حاوی ہے کہ جو کچھ وہ چاہتی ہے، وہی ہوتا ہے اور یہ پیغام اسی کا ایک چکمہ ہے اور اس نے قلماقنیوں (۷۳) میں سے جو محل سرا میں چوکی پہرہ کے کام پر تعین رہتی ہیں کچھ قوی ہیکل اور مضبوط اور مسلح عورتیں اس قصد سے لگا رکھی ہیں کہ جب وہ قلعہ میں داخل ہو تو فوراً اس پر آن پڑیں۔ اور اگرچہ اس نے بارہا اپنی حاضری کی تاریخیں اور دن معین کئے لیکن کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹالتا ہی رہا۔ اور ادھر اپنی معمولی کارروائیاں کرتا رہا یہاں تک کہ اکثر بڑے بڑے ذی اقتدار امیروں کا عندیہ دریافت کر لیا۔ اور جب سب بندوبست ہو گیا تو یکایک اس کا بیٹا محمد سلطان آ کر قلعہ پر قابض ہو گیا جس سے سب لوگ ہکے بکے رہ گئے۔ اس جانباز اور عالی ہمت جوان نے کچھ سپاہی پہلے سے قلعہ کے آس پاس لگا رکھے تھے۔ پس اس بہانہ سے کہ بادشاہ کی خدمت میں کچھ پیغام لے کر جاتا ہے یکایک ان سپاہیوں پر آ پڑا جو قلعہ کے دروازہ پر متعین تھے اور جو سپاہی ادھر ادھر گھات میں لگائے ہوئے تھے جھٹ پٹ آ پہنچے اور اہل قلعہ کو مغلوب کر کے جن کو اس کا کچھ وہم و گمان بھی نہ تھا قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

اس وقت شاہ جہاں کو جس قدر خوف و اضطراب ہوا ہو گا وہ ظاہر ہے پس جس شخص کے پکڑ لینے کے لئے وہ اتنے دنوں سے گھاتیں لگا رہا تھا اب خود ہی اس کا قیدی بن گیا۔

شاہ جہاں کا محمد سلطان کو سلطنت کی ترغیب دینا اور اورنگ زیب اور شاہ جہاں اور محمد سلطان کی تدبیروں کی نسبت مصنف اور اور لوگوں کی رائیں

کہتے ہیں کہ اس بدنصیب بادشاہ نے قید ہوتے ہی محمد سلطان کو یہ پیغام بھیجا کہ میں تم سے تخت (۷۴) کی قسم کرتا ہوں اور قرآن مجید میرے تمہارے درمیان ہے کہ

اگر تم اس وقت مجھ سے ایمانداری برتو تو میں تمہی کو بادشاہ بنا دیتا ہوں اور اس موقع کو غنیمت جان کر ہاتھ سے نہ دو اور فوراً چلے آؤ اور دادا کو قید سے چھڑا دو اور یاد رکھو کہ اس سے تم کو ثوابِ آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی ایک دائمی نیک نامی حاصل رہے گی۔

لوگوں کا قول ہے کہ اگر محمد سلطان ذرا جرأت کر کے شاہ جہاں کے کہنے کو مان لیتا تو غالباً وہی سب کچھ ہو جاتا۔ کیونکہ اب تک بھی لوگوں کے دل میں شاہ جہاں کا ادب اور لحاظ بہت کچھ باقی تھا اور اگر یہ شہزادہ اسے قلعہ سے نکلنے دیتا اور یہ بڈھا بادشاہ کچھ فوج لے کر بذاتِ خود اورنگ زیب پر حملہ کرتا تو غالباً کل فوج اس کی فرمانبرداری کرتی اور ذی اقتدار امیر نمک حلالی اور وفاداری سے پیش آتے اور اس بات پر بھی سب لوگ متفق الرائے ہیں کہ اس موقع پر محمد سلطان سے ویسی ہی غلطی سرزد ہوئی جیسی کہ سموگڈھ کی لڑائی کے بعد شاہ جہاں سے ہوئی تھی۔

اب چونکہ اس جگہ بادشاہ کی غلطیٔ رائے کا پھر ذکر آ گیا ہے تو انصاف یہ چاہتا ہے کہ میں اس کی نسبت یہ بھی ظاہر کر دوں کہ تمام حالات پر نظر کر کے بہت سے ذی رتبہ مدبر لوگوں کی بالاتفاق یہ رائے تھی کہ دارا شکوہ کی شکست کے بعد اس بوڑھے بادشاہ کو قلعہ ہی میں رہنا اور اورنگ زیب کو فریب ہی سے گرفتار کرنا مناسب تھا اور ان کا قول تھا کہ خلائق کا یہ قاعدہ ہی ہے کہ نتیجہ کے ظہور کے بعد کسی تدبیر کو بُرا یا بھلا بتلایا کرتے ہیں اور اکثر اوقات جبکہ نہایت ہی کچے منصوبے چل جاتے ہیں تو لوگ ان کی بھی تعریف و توصیف کیا کرتے ہیں۔ پس شاہ جہاں کا الفت و محبت اور صفائے نیت جتا کر اورنگ زیب کو گرفتار کر لینا کچھ ناممکن نہ تھا اور اس صورت میں اس کے فہم فراست کی ویسی ہی تعریف اور ناموری ہو جاتی جیسے کہ اب سب بُرا کہتے ہیں اور یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ عقل سے خارج بڈھا ایک ایسی عورت (بیگم صاحب) کے کہنے پر چلنے سے اس حال کو پہنچا جو صرف کینہ اور عداوت کے جوش سے اندھی ہو رہی تھی اور بے عقلی سے یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ وہ سیانا کوا!! (اورنگ زیب) قلعہ میں ہم سے ملنے کو آئے گا اور اس جانور کی طرح جو خود بخود پنجرہ میں آن پھنسے، گرفتار ہو جائے گا۔

اب محمد سلطان کی سنیئے۔ اس کی نسبت عموماً اس ملک کے مدبّر لوگ یہ کہتے ہیں کہ تاج شاہی اس کو مفت ہاتھ آتا تھا۔ مگر اس سے لیا نہ گیا۔ حالانکہ اس میں بموجب قول مشہور ''ہم خرما و ہم ثواب'' سلطنت اور دادا کے قید سے چھڑا دینے کی نیک نامی دونوں

حاصل ہوتی تھیں۔ پس اگر وہ ایسا کرتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ یہ نوجوان شہزادہ بجائے اس کے کہ قلعہ گوالیار (۵ ۷) میں پڑا زندگی کے دن گنا کرتا ہے، کل امور سلطنت کا وہی مالک و مختار ہو جاتا اور اگرچہ چند شخص یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ اس نے باپ کی اطاعت اور حق پدری پر نظر کر کے بادشاہ کی درخواست کو قبول نہ کیا۔ مگر ظن غالب یہ ہے کہ اس کو شاہ جہاں کے عہد و پیمان پر سچائی کا بھروسہ نہ ہوا اور اس نے یہ بھی سوچا کہ ایسے عقلمند اور شجاع شخص سے جیسا کہ اورنگ زیب ہے لڑائی خریدنا محض بے فائدہ اور سراسر خطرناک ہے۔ بہر حال شہزادہ کا خیال خواہ کچھ ہی ہو مگر خلاصہ یہ ہے کہ اس نے اس بدنصیب بادشاہ کی تجویز نہ مانی بلکہ پاس جانے سے بھی یہ عذر پیش کر کے انکار کر دیا کہ مجھے اورنگ زیب کی طرف سے حضور میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ تاکیدی حکم یہ ہے کہ قلعہ کے کل دروازوں کی کنجیاں خود اپنی سپردگی میں لے کر میں یہاں سے نہایت جلد واپس جاؤں کیونکہ وہ حضور کی قدم بوسی کے ازبس مشتاق ہو رہے ہیں اور صرف اتنی ہی دیر ہے کہ اس امر سے اطمینان ہو جائے تو فوراً حاضر ہو جائیں۔

شاہ جہاں کا محمد سلطان کو قلعہ کی کنجیاں حوالہ کر دینا

اب دو دن تک تو شاہ جہاں کنجیوں کے دینے میں ہیر پھیر کرتا رہا۔ لیکن جب دیکھ لیا کہ سب لوگ اسے چھوڑے جاتے ہیں، خصوصاً یہ سن کر کہ تھوڑی سی فوج جو دریچۂ خاص کی محافظ تھی وہ بھی چل دی۔ اور اب بچاؤ کی کوئی امید باقی نہیں، ناچار قلعہ کی کنجیاں حوالے کر دیں اور بہ تاکید کہلا بھیجا کہ اورنگ زیب کو اب تو آنا ہی چاہئے اور لازمہ دانائی یہی ہے کہ وہ جلد ہم سے ملنے کو آئے۔ کیونکہ سلطنت کے بعض ضروری اسرار ہم اس کو سمجھانا چاہتے ہیں۔

اعتبار خاں خواجہ سرا کا قلعدار آگرہ مقرر ہونا اور بادشاہ کی سخت قید

لیکن "وہ مکار فقیر" اب بھی بدستور ہوشیار اور اپنی چال سے چوکنے والا نہ تھا۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ اس ارشاد کی تعمیل کرے فوراً اعتبار خان نامی اپنے ایک معتمد خواجہ سرا کو قلعدار مقرر کر دیا (۷۶)۔ جس نے پہنچتے ہی سب بیگموں اور بیگم صاحب اور خود شاہ جہاں کو قید کر دیا۔ بلکہ قلعہ کے اکثر در تک چنوا دیئے اور بادشاہ اور اس کے خیر خواہوں کے باہم آمد و رفت تو کیسی خط کتابت اور سلام پیام کے ذریعے بھی سب مسدود کر دیئے! اور شاہ

جہاں کو اتنی بھی اجازت نہ رہی کہ قلعہ دار کی اطلاع کے بغیر اپنے کمرے سے باہر نکل سکے۔

قید کرنے کے عذر میں اورنگ زیب کا باپ کی خدمت میں عریضہ بھیجنا

اب اورنگ زیب نے باپ کو ایک عریضہ لکھا جو روانہ کرنے سے پہلے قصداً سب لوگوں کو سنایا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ "یہ بے ادبی مجھ سے اس لئے سرزد ہوئی ہے کہ حضور ظاہراً میری نسبت اظہار الفت و مہربانی فرماتے تھے اور ارشاد ہوتا تھا کہ ہم دارا شکوہ کے طور و طریق سے سخت ناراض ہیں مگر مجھے پختہ خبر ملی ہے کہ حضور نے اشرفیوں سے لدے ہوئے دو ہاتھی اس کے پاس بھیجے ہیں جن سے وہ نئی فوج تیار کرے گا اور اس خوں ریز لڑائی کو طوالت دے گا۔ پس حضور ہی غور فرمائیں کہ یہ حرکتیں جو فرزندوں کے معمولی طریق کے برخلاف اور سخت معلوم ہوتی ہیں مجھ سے ان کے سرزد ہو جانے کا باعث کیا صرف دارا شکوہ کی خود سری اور عناد ہی نہیں ہے؟ بلکہ فی الواقع حضور کی اسیری اور اتنی دیر تک شرفِ قدم بوسی سے میری محرومی اور حضور کے خلافِ توقع فرزندانہ خدمات کی بجا آوری میں اس قدر درنگ کا باعث محض وہی ہے اور میں حضور سے بہ کمال معذرت یہ التجا کرتا ہوں کہ میری اس حرکت کی تعجب انگیز ظاہری صورت پر لحاظ نہ فرما کر اس زوال آزادی کو جو صرف چند روز کے لئے ہے تحمل کے ساتھ گوارا فرما لیں اور جب دارا شکوہ امن و امان میں خلل انداز ہونے اور حضور کو اور مجھ کو ایذا دینے کے قابل نہ رہے گا تو میں فوراً قلعہ کی طرف از خود دوڑا چلا آؤں گا اور حاضر ہو کر دست بستہ عرض کروں گا کہ اب کچھ روک ٹوک نہیں ہے۔

اورنگ زیب نے باپ کی نسبت جو الزام لگایا تھا اُس کی تحقیق

اگرچہ میں نے سنا ہے کہ شاہ جہاں نے فی الواقع یہ اشرفیاں اسی رات کو دارا شکوہ کے پاس بھیجی تھیں جب کہ وہ پنجاب کی طرف روانہ ہوا تھا اور اس کی خبر روشن آرا بیگم نے اورنگ زیب کو پہنچائی تھی اور یہ خبر بھی اسی نے دی تھی کہ قلعہ میں آؤ گے تو قلماقنیاں تم پر حملہ کریں گی اور یہ بھی کہتے ہیں کہ شاہ جہاں کے کئی خط جو اس نے دارا

شکوہ کے نام روانہ کئے تھے اورنگ زیب کے ہاتھ آ گئے تھے۔ مگر اکثر دانشمند اور فہمیدہ لوگ ان باتوں کی صحت سے انکار کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ وہ کاغذ جو سر عام سنایا گیا تھا محض بے اصل اور صرف لوگوں کے دھوکا دینے اور شاہ جہاں کے خیر خواہوں اور طرفداروں کی طفل تسلی اور زباں بندی کے لئے تھا جو لطور واجب اورنگ زیب کی اس ناشائستہ حرکت کا چرچا کرتے تھے۔

بادشاہ کے قید ہو جانے کے بعد چند لوگوں کے سوا کل امراء کا اورنگ زیب اور مراد بخش کو جا سلام کرنا اور ان کے اس روّیہ کی نسبت مصنف کی رائے

خیر یہ باتیں صحیح ہوں یا غلط لیکن یہ بات بالکل سچ ہے کہ جب بادشاہ ایسے سخت طور سے قید ہو گیا تو قریباً تمام امرا اورنگ زیب اور مراد بخش کے دربار میں تسلیمات کے لئے جا حاضر ہوئے اور میں جب یہ سوچتا ہوں کہ اس بے چارے بڈھے اور مظلوم بادشاہ کی حمایت میں کسی امیر نے ذرا بھی ہاتھ پاؤں نہ ہلائے اور کسی کے چھوٹے منہ سے بات تک بھی نہ نکلی تو مجھے نہایت ہی رنج ہوتا اور غصہ آتا ہے! افسوس یہ لوگ ان ظالموں کے آگے سر جھکانے کو جاتے تھے جنہوں نے ان کے آقا اور مالک پر ایسی سختی کی۔ حالانکہ ان کے موجودہ مرتبے اور درجے اور دولت و حشمت ' سب کچھ صرف اسی کی مہربانی کا نتیجہ تھا اور اس دربار کی رسم کے موافق اس نے ان کو ادنیٰ ادنیٰ درجوں سے مراتبِ اعلیٰ پر پہنچایا تھا۔ یہاں تک کہ بہت سے ان میں سے ایسے تھے جو غلامی کی حالت سے امارت کے درجہ کو پہنچے تھے۔ مگر ہاں چند شخص ایسے بھی تھے مثلاً دانشمند خاں (۷۷) جنہوں نے کسی کی بھی جانب داری اختیار نہیں کی تھی۔ لیکن ان کے سوا اور سب کا عموماً یہ حال تھا کہ اب اورنگ زیب ہی کا دم بھرتے تھے مگر ان امراء کی خاص طور کی حالت پر جب میں خیال کرتا ہوں تو ان کے اس کفران نعمت اور احسان فراموشی کی نسبت میرا لعن طعن کرنے کا جوش کچھ ٹھنڈا ہو جاتا ہے یعنی ہندوستان کے امرا چونکہ فرانس وغیرہ ممالکِ یورپ کے امرا کی طرح مستقل مالک کسی جائیداد' زمینداری وغیرہ کے نہیں ہیں۔ اس وجہ سے ان کی آمدنیوں کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے۔ جس کو بادشاہ وقت سے کچھ تعلق نہ ہو۔ بلکہ جیسا میں پہلے

لکھ چکا ہوں ان کی آمدنیاں صرف وہ روزینے ہوتے ہیں، جن کا تقرر محض بادشاہ کی مرضی پر موقوف ہے اور ان کا جاری رکھنا پابند کرنا صرف اسی کے اختیار میں ہے اور جب یہ وظائف بند ہو جاتے ہیں تو یہ لوگ بالکل تباہی میں آجاتے ہیں، یہاں تک کہ تھوڑا سا قرض بھی کہیں سے ان کو نہیں مل سکتا۔ (۷۸)

اورنگ زیب اور مراد بخش کا دارا شکوہ کے تعاقب میں روانہ ہونا اور اورنگ زیب کا دغابازی سے مراد بخش کو قید کر لینا

القصہ دونوں شہزادوں نے باپ کے معاملہ سے فارغ ہو کر امرا کی نذریں لیں اور اپنے ماموں شائستہ خاں (۷۹) کو آگرہ کا صوبہ دار بنا کر اور خزانہ شاہی سے اخراجات ضروری کا انصرام کر کے دارا شکوہ کے تعاقب میں کوچ کیا۔ اور جب فوج کا آگرہ سے کوچ ہونے کو تھا تو مراد بخش کے خالص ہوا خواہوں خصوصاً شہباز خواجہ سرا نے اس کو بہت سمجھایا کہ "آپ کو مع اپنے لشکر کے آگرہ یا دہلی سے دور جانا نہیں چاہئے اور غایت درجہ کا ادب و آداب اور بے حد میٹھی باتیں جو اورنگ زیب کر رہا ہے فریب اور دغابازی کا نشان ہے اور جبکہ خاص و عام بلکہ خود وہ بھی اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ اب بادشاہ آپ ہیں تو پھر یہ کیونکر مناسب ہے کہ آپ آگرہ اور دہلی کے نزدیک نہ رہیں اور کہیں دور چلے جائیں۔ پس آپ اسی کو دارا شکوہ کے تعاقب میں جانے دیجئے۔"

چنانچہ میری دانست میں اگر وہ یہ معقول صلاح مان لیتا تو اورنگ زیب کو بہت مشکل پڑ جاتی لیکن اس نے ایک نہ مانی اور بھائی کے ساتھ دہلی کو چل کھڑا ہوا کیونکہ اس کے موکد اور مستحکم وعدوں اور بے ہودہ قسموں پر، جو بارہا قرآن درمیان رکھ کر کھائی ہوئی تھیں، اس کو پورا بھروسہ تھا لیکن جب دونوں نے متھرا پہنچ کر مقام کیا جو آگرہ سے قریب تین چار منزل کے ہے تو مراد بخش کے خیر خواہوں نے جو اس عرصہ میں بہت کچھ دیکھ اور سن چکے تھے ناچار ہو کر آپس میں یہ صلاح کی کہ ایک دفعہ تو اس کو پھر سمجھانا چاہئے، آگے وہ جانے مانے یا نہ مانے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے کہا کہ ہم کو کئی جگہ سے پختہ خبریں ملی ہیں کہ اورنگ زیب کا بے شک کچھ برا ارادہ ہے اور کسی خوفناک منصوبہ کے لئے بہت کچھ بندشیں ہو چکی ہیں، اس واسطے اس کی ملاقات کو خاص اس کے لشکر میں آپ کا جانا مناسب نہیں اور زیادہ نہیں تو آج کی رات تو ہرگز نہ جائیے اور اس آفت کے ٹال دینے کی

بہت آسان سبیل یہ ہے کہ ناسازیٔ طبیعت کا بہانہ کر لیجئے اور وہاں نہ جایئے۔ یہ سن کر جیسا کہ معمول ہے اورنگ زیب خود ہی چند آدمیوں کے ساتھ آپ کے پاس آجائے گا۔ لیکن نہ توان تقریروں اور دلیلوں ہی نے کچھ اثر کیا اور نہ منت وسماجت ہی کچھ کارگر ہوئی۔ کیونکہ وہ ایک ایسی حالت میں تھا گویا کسی نے اس پر جادو کیا ہوا ہے۔ چنانچہ اورنگ زیب کی ظاہری اطاعت اور دکھاوے کی محبت سے فریب میں آکر باوجود ممانعت اپنے رفیقوں اور خیر خواہوں کے اس کے ہاں جو میر خاں وغیرہ اپنے تین چار محرم راز مصاحبوں کے مشورہ سے گھات میں لگا ہوا اس کے آنے کا منتظر تھا ضیافت کھانے چلا گیا۔ اور جب یہ سادہ لوح شہزادہ وہاں پہنچا تو اورنگ زیب نے معمول سے زیادہ اور بہت ہی بڑھ کر تعظیم وتکریم کی اور اس قدر خوشی کا اظہار کیا کہ آنکھوں سے چند آنسو بھی نکال دیئے اور خاص اپنے ہاتھ سے مراد بخش کے چہرہ کی گرد صاف کی اور پسینہ پونچھا اور جب کھانا کھانے کو بیٹھے تو نہایت ہی گرم جوشی دکھائی اور اظہار مسرت کے لئے ہنسی اور مذاق کی بے حد باتیں بنائیں اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب عمدہ کابلی اور شیرازی شراب پیش ہوئی تو آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مسکرا کر بولا "حضرت کو معلوم ہے کہ میں اپنے مذہبی خیالات کے باعث اس صحبت عیش ونشاط میں حاضر رہنے سے مقصر ہوں اور اگرچہ میں مرخص ہوتا ہوں لیکن یہ سب لوگ جو اس پُر لطف جلسہ کے شریک ہیں اور میر خاں (۸۰) اور میرے اور مصاحب آپ کی خدمت گذاری کے لئے حاضر ہیں۔ پس مراد بخش شراب دوست تو تھا ہی، اس پر یہ طرہ کہ ایسی عمدہ صحبت اور ایسی لطیف شرابیں، غرض خوب پی اور یہاں تک پی کہ بالکل غٹ ہو گیا اور اورنگ زیب کا جو یہ مدعا تھا کہ وہ مدہوش ہو کر سو جائے پورا ہو گیا۔ پس اول تو مراد بخش کے نوکروں کو اس حیلہ سے رخصت کر دیا گیا کہ اس کے خواب راحت میں خلل نہ آئے اور اس کے بعد میر خاں نے اس کی تلوار اور جمدھر کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور تھوڑی ہی دیر بعد اورنگ زیب اس کو اس نازیبا خواب سے جگانے کے بہانہ سے خیمہ میں آیا اور اس تمام مصنوعی ادب ولحاظ سے ہاتھ اٹھا کر اس خفتہ بخت کے اول تو چند ٹھوکریں ماریں! اور جب اس نے ذرا آنکھیں کھولیں تو یہ ذوفنون! ملامت کی راہ سے بولا کہ بڑی شرم کی بات ہے کہ تم بادشاہ ہو کر ایسے غافل اور بے خبر ہو جاؤ۔ بھلا دنیا کے لوگ تم کو بلکہ مجھ کو بھی کیا کہیں گے! اور لوگوں کو اشارتاً کہا کہ "اس بدمست ومخمور کے ہاتھ پاؤں باندھ کر خلوت خانہ میں لے جاؤ کہ نشہ کے اُترنے تک اس بے شرمی کا سونا وہاں سوئے"۔ پس

تعمیل حکم میں کیا دیر تھی فوراً پانچ چھ مسلح شخصوں نے آن دبایا اور ہر چند چلاتا اور زور کرتا رہا لیکن پاؤں میں بیڑی اور ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال ہی دی اور قیدی بنا کر ایک علیحدہ جگہ میں ڈال دیا۔

مراد بخش کا قید ہو جانا سن کر اس کے ملازموں کا آمادۂ فساد ہونا اور اورنگ زیب کا ان کو گانٹھ لینا

یہ سختی اور بدسلوکی خواہ کیسی ہی مخفی طور پر کی گئی تھی مگر مراد بخش کے ان ملازموں پر ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی جو باہر بھیج دیئے گئے تھے پس جب انہوں نے اس کی بھنک سنی تو کسی قدر شور و غوغا مچایا اور چاہا کہ بزور اندر گھس آئیں لیکن مراد بخش کے میر آتش علی قلی نے جس کو اورنگ زیب نے کچھ دے کر پہلے سے گانٹھا ہوا تھا سمجھا اور دھمکا کر خاموش کرا دیا۔ اسی طرح اس کے لشکر میں بھی اگرچہ کچھ شور و شر شروع ہو گیا تھا اور اندیشہ تھا کہ کہیں وہ یکایک چڑھ نہ آئے لیکن رات ہی کو کچھ لوگ بھیج دیئے گئے جنہوں نے جا کر یہ مشہور کر دیا کہ اورنگ زیب کے ڈیرہ میں جو ماجرا گزرا ہے وہ کچھ بڑی بات نہیں ہے۔ کیونکہ ہم بھی وہیں تھے اور صرف اس قدر ہے کہ مراد بخش شراب ذرا زیادہ پی گیا تھا اور یہاں تک بدکلامی کرنے لگ گیا تھا کہ اور تو کوئی کیا خود اورنگ زیب کو بھی مغلظات گالیاں دیں اور ایسا اودھم مچایا کہ ناچار خلوت خانہ میں بند کرنے کی ضرورت پڑی۔ سو یہ کچھ بات نہیں صبح کو جب نشہ اتر جائے گا تو چڑھ کر صحیح و سلامت اپنے لشکر میں آ جائے گا۔

اب ادھر تو اہل سپاہ کو یہ دم دے کر چپ کرایا گیا اور اُدھر راتوں رات بڑی بڑی رشوتیں اور بڑے بڑے وعدے دے کر لشکر کے بڑے بڑے سرداروں کو الگ گانٹھ لیا گیا اور معاً تمام فوج کی تنخواہ بڑھا دی گئی غرض کہ وہ شورش اور ہنگامہ جو برپا ہوا تھا صبح ہوتے کو اس کا نام و نشان بھی نہ تھا کیونکہ ایسے لوگ بہت ہی تھوڑے تھے جو یہ نہ سمجھتے ہوں کہ مراد بخش کسی بلا میں پھنسنے والا ہے ورنہ اس کے سب سردار اور سپاہی اس بات کو بخوبی جانے ہوئے تھے کہ کسی نہ کسی دن یہ ضرور پھنس جائے گا۔

مراد بخش کو قلعہ سلیم گڈھ میں بھیج دینا

جب یہ سب بندوبست ہو چکا اور اطمینان ہو گیا کہ اب کچھ جائے اندیشہ نہیں

ہے تو اس نامراد کو ایک زنانی عماری میں بند کر کے دہلی کو چلتا کیا اور قلعہ سلیم گڈھ میں جو جمنا میں بنا ہوا ہے قید کیا گیا۔(۸۱)

اورنگ زیب کا دارا شکوہ کے تعاقب میں لاہور اور ملتان جانا

اب بجز شہباز خواجہ سرا کے جس کے ساتھ اورنگ زیب کو کسی قدر دقت اٹھانی پڑی' مراد بخش کے ہمراہیوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے اورنگ زیب کی ملازمت اور اطاعت قبول نہ کرلی ہو۔ پس اس کی فوج کو بھی اپنی سپاہ میں شامل کر کے دارا شکوہ کے تعاقب میں جو نہایت جلدی کے ساتھ لاہور کو بھاگا جا رہا تھا روانہ ہوا۔ کیونکہ دارا شکوہ کا یہ ارادہ تھا کہ اس شہر کی مورچہ بندی کر کے اپنے رفیقوں اور خیر خواہوں کو وہاں جمع کرلے۔ لیکن اس کا یہ مستعد دشمن ایسی چستی سے پیچھے لگا چلا آتا تھا کہ اس کے مستحکم کرنے کی مہلت نہ ملی اور اس نے وہاں سے ملتان کا راستہ لیا۔ مگر اورنگ زیب کے مستعدانہ تعاقب نے وہاں بھی پاؤں جمنے نہ دیئے۔ اورنگ زیب جس چستی اور چالاکی سے اس مہم میں کام کرتا تھا اس کی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی۔ یعنی اگرچہ موسم نہایت گرم تھا لیکن اس کی فوج رات دن برابر کوچ کرتی تھی اور وہ خود سپاہ کی جرأت اور ہمت بڑھانے کے لئے صرف چند آدمیوں کے ساتھ اکثر چار پانچ کوس فوج سے آگے رہتا تھا اور ایک ادنیٰ سپاہی کی مانند برے بھلے پانی اور روکھی سوکھی روٹی پر قناعت کر کے رات کو پلنگ اور امیرانہ فرش فروش کے بغیر صرف زمین پر بستر جما کر لیٹ رہتا تھا۔

دارا شکوہ کا قلعہ ٹھٹہ میں جاکر پناہ لینا اور اورنگ زیب کا مطمئن ہو کر دارالسلطنت کو لوٹ آنا

ہندوستان کے دانا لوگوں کی یہ رائے ہے کہ دارا شکوہ کو لاہور سے کابل جانا مناسب تھا لیکن اس کے خیر خواہوں نے ہر چند اس کو وہاں جانے کے لئے کہا مگر یہ معما کسی پر نہ کھلا کہ اس نے ایسی دانشمندانہ صلاح کیوں نہ مانی۔ کیونکہ مہابت خاں جو امرائے ہندوستان میں ایک بڑا پرانا اور زبردست امیر تھا اور جس کی اورنگ زیب کے ساتھ ہمیشہ سے ان بن چلی آتی تھی وہاں کا صوبہ دار تھا۔ اور افغانوں اور ازبکوں اور ایرانیوں کے مقابلہ

کے لئے دس ہزار سے زیادہ فوج موجود تھی۔ اور چونکہ اس کے پاس روپیہ بہتیرا تھا، یہ تمام فوج اور خود مہابت خاں بخوشی مدد دینے کو تیار ہو جاتا اور ان فوائد کے علاوہ سرحد ایران اور ملک ازبک سے بھی نزدیک ہو جاتا۔ اور اغلب تھا کہ وہاں کے فرمانروا بہت کچھ مدد دے سکتے اور اس کو یاد کرنا چاہئے تھا کہ ہمایوں نے باوجود شیر خاں کی مخالفت کے جو پٹھان قوم کا بادشاہ تھا اور جس نے اسے ہندوستان سے نکال دیا تھا ایرانیوں ہی کی مدد سے پھر اپنی سلطنت حاصل کر لی تھی (۸۲)۔ لیکن بدنصیب دارا شکوہ کی قسمت میں ہمیشہ یہ لکھا ہوا تھا کہ خواہ کیسی ہی نیک صلاح اُس کو دی جاتی وہ اس پر التفات ہی نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اب بھی اس نے ایسا ہی کیا کہ کابل کی عوض سندھ کو چلا گیا اور قلعہ ٹھٹھ میں جا کر پناہ لی جو دریائے سندھ کے وسط میں ایک مشہور مستحکم مقام ہے۔

جب اورنگ زیب کو معلوم ہو گیا کہ دارا شکوہ کا ارادہ کابل جانے کا نہیں ہے اور اطمینان ہو گیا کہ اب معاملہ چنداں مشکل نہیں تو خود اس کے تعاقب میں جانا غیر ضروری خیال کیا اور سات آٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ اپنے کوکہ میر بابا (شیخ میر) کو دارا شکوہ کی نقل و حرکت کی دیکھ بھال کے لئے مامور کر دیا اور اس اندیشہ سے کہ نہ معلوم پیچھے کیا کیا فتور برپا ہو جائیں ویسی ہی جلدی سے جیسی کہ دارا شکوہ کے تعاقب میں کی تھی آگرہ کو لوٹ آیا۔ (۸۳)

اس کو یہ خدشہ تھا کہ مبادا جسونت سنگھ یا جے سنگھ سا کوئی زبردست راجہ شاہ جہاں کو قید سے چھڑا دے یا سری نگر کے راجہ کی مدد سے سلیمان شکوہ سیلاب کی طرح پہاڑوں سے یکایک اتر آئے یا موقع دیکھ کر سلطان شجاع ہی پھر آگرہ کی طرف چڑھائی کر دے۔

اس سفر کے متعلق اورنگ زیب کے استقلالِ طبع اور حسنِ تدبیر کی ایک مثال

اب میں ایک مختصر سا واقعہ کا جو اورنگ زیب کو اسی سفر میں پیش آیا تھا ذکر کرتا ہوں جس سے اس کتاب کے پڑھنے والے یہ اندازہ کر سکیں گے کہ وہ کسی ناگہانی مشکل کے پیش آجانے پر کیسی چستی سے اس کا فی الفور انتظام کر لینے کی لیاقت رکھتا تھا۔ یعنی ملتان سے واپسی کے وقت جبکہ وہ اپنی معمولی سرعت کے ساتھ کوچ کرتا چلا آتا تھا راجہ جے

سنگھ کو چار پانچ ہزار جرار راجپوتوں کو اپنی طرف لئے آتا دیکھ کر حیرت میں آ گیا۔ یہ اس وقت حسب معمول تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ اپنی فوج سے آگے تھا اور راجہ کو شاہ جہاں کے ساتھ جو مضبوط تعلق تھا وہ اس سے مخفی نہ تھا۔ پس بآسانی خیال میں آسکتا ہے کہ اس نے اپنے کو سخت خطر کی حالت میں پایا اور طبعاً اس کو یہی اندیشہ پیدا ہونا چاہئے تھا کہ جے سنگھ اپنے محترم آقا کے اس قید بے جا کی تکلیف سے جھٹ پٹ چھڑا لینے اور ایسے بے رحم اور ناخلف فرزند کے سزا دینے کے اس عمدہ موقع کو جس کے ہاتھ سے اس پر بلا وجہ ظلم و ستم ہوا ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دے گا۔ اور یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ فی الواقع راجہ کا آنا صرف اسی ارادہ سے تھا کہ اورنگ زیب کو گرفتار کر لے اور اس رائے کے قرار دیئے جانے کی وجہ یہ تھی کہ اورنگ زیب کو تھوڑی ہی دیر پہلے خبر لگ چکی تھی اور وہ اس کے موافق یقین کئے ہوئے تھا کہ راجہ دہلی میں ہے مگر اس نے ایسی عجیب سرعت سے ایسی بعید مسافت طے کی کہ لاہور اور ملتان کے راستہ میں آ ملا۔ لیکن اورنگ زیب کی ہوشیاری اور متانت نے اسے اس بڑی جوکھوں سے بچالیا۔ چنانچہ اس نے مطلق کچھ خوف و اضطراب ظاہر نہ کیا بلکہ یہ دکھانے کو کہ اس کا آنا اس کی بڑی ہی خوشی کا باعث ہے گھوڑا دوڑا کر نہایت کشادہ پیشانی کے ساتھ ہاتھ سے "جلد آیئے! جلد آیئے" کا اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھا اور پکار کر کہا "سلامت باشید راجہ جی! سلامت باشید بابا جی!" اور جب دونوں ذرا نزدیک پہنچے تو پھر کہا "خوش آمدید! خوش آمدید! میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے آپ کے آنے کا کس قدر انتظار تھا! بہت ہی خوب ہوا کہ آپ آگئے مگر لڑائی ختم ہوگئی اور دارا شکوہ تباہ و برباد خاک چھانتا پھرتا ہے اور میں نے میر بابا کو اس کے پیچھے بھیج دیا ہے اور اغلب ہے کہ جلد گرفتار ہو جائے گا" اور نہایت مہربانی اور التفات کے اظہار کی غرض سے موتیوں کی مالا جو پہنے ہوئے تھا اتار کر راجہ کے گلے میں ڈال دی اور کہا کہ "ہماری فوج بہت تھکی ہوئی ہے اس لئے آپ کو بہت جلد لاہور پہنچ جانا چاہئے مبادا وہاں کچھ بے انتظامی اور شورش ہو جائے اور میں آپ کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کرتا ہوں اور کل اختیار نظم و نسق دیتا ہوں اور میں بھی جلد آپ کے پاس پہنچتا ہوں۔ لیکن رخصت کرنے سے پہلے مجھ کو واجب ہے کہ سلیمان شکوہ کے معاملہ میں جو آپ نے کارگزاری کی ہے اس کا شکریہ ادا کروں۔ مگر آپ نے دلیر خاں کو کہاں چھوڑا؟ میں اس کو خوب سزا دوں گا اور آپ جلدی لاہور کو تشریف لے جائیں اور اچھا خدا حافظ۔" (۸۴)

دارا شکوہ کا قلعہ ٹھٹھ کی حفاظت کے واسطے کچھ پٹھانوں اور فرنگیوں کو چھوڑ کر کچھ بھج کے رستہ سے گجرات میں جا داخل ہونا اور وہاں کے صوبہ دار شاہ نواز خاں کا بہ اطاعت پیش آنا

جب دارا شکوہ ٹھٹھہ میں پہنچا تو اس نے ایک خواجہ سرا کو جو دانشمندی اور شجاعت دونوں میں مشہور تھا وہاں کا قلعہ دار بنایا اور بہت سے پٹھان اور پرتگیز اور انگریز اور فرانسیسی اور ملک جرمنی کے رہنے والے یورپی توپ خانہ میں نوکر رکھ لئے اور ان سے وعدہ کیا کہ اگر ہم بادشاہ ہو جائیں تو تم کو امارت کے درجے دیئے جائیں گے۔ اور اس طرح پر قلعہ کا بندوبست کر کے اپنا خزانہ وہاں چھوڑ دیا۔ کیونکہ اب تک اس کے پاس اشرفی اور روپیہ بہت تھا اور تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ دریائے سندھ کے کنارے کنارے شان و شوکت سے کوچ کرتا ہوا راجہ کچھ کی عملداری سے گزر کر گجرات میں پہنچ گیا اور احمد آباد کے باہر جا ڈیرہ کیا۔ یہاں کا صوبہ دار شاہ نواز خاں جو اورنگ زیب کا خسر تھا اگرچہ مسقط کے سلاطین سابق کے خاندان سے تھا اور بہت مہذب اور نہایت ذی لیاقت شخص تھا مگر سپاہی منش نہ تھا بلکہ عیش دوست تھا۔ پس اگرچہ احمد آباد میں شاہی فوج بہ تعداد کثیر موجود تھی اور خوب مقابلہ کر سکتی تھی لیکن اس کی کم ہمتی یا دارا شکوہ کے ناگہاں آ پہنچنے سے شہر کے دروازے کھول دیئے گئے اور شاہ نواز خاں بڑی تعظیم و تکریم اور نہایت ادب سے پیش آیا (۸۵) اور معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس کی اس قدر خاطر داری اور تعظیم و تکریم کی کہ اس نے اس کو اپنا خیر خواہ اور طرفدار سمجھ لیا اور اگرچہ لوگوں نے اس کی خیانت سے آگاہ کر دیا تھا لیکن شہزادہ نے دھوکہ میں آ کر بے احتیاطی سے بھروسہ کر لیا اور اپنے تمام منصوبے اور ارادے اور راز اس سے ظاہر کر دیئے اور جسونت سنگھ اور اور خیر خواہ لوگ جو سپاہ جمع کر کے مدد کی تیاریاں کر رہے تھے ان کے خط وغیرہ سب اس کو دکھائے۔

اورنگ زیب کی تردّد آمیز حالت اور سلطان شجاع کے ساتھ لڑائی اور راجہ جسونت سنگھ کی دغابازی اور شجاع کی شکست

اورنگ زیب کو جب یہ خبر لگی کہ دارا شکوہ نے احمد آباد لے لیا ہے تو وہ نہایت

حیران اور مضطرب ہوا کیونکہ جانتا تھا کہ دارا شکوہ کے پاس روپیہ پیسہ ابھی بہت ہے اور ایک جگہ میں اگر اس کے پاؤں جم گئے تو نہ صرف اس کے متوسل اور خیر خواہ بلکہ وہ لوگ بھی جو کسی سبب سے مجھ سے ناراضامند ہیں سب کے سب ہندوستان کی تمام اطراف سے آن کر اس کے پاس جمع ہو جائیں گے اور اگرچہ اس بات کو خوب سمجھے ہوئے تھا کہ بذاتِ خود جانا اور ایسے مقام سے اس کے پاؤں اکھیڑ دینے ایک ضروری امر ہے لیکن اس نے سوچا کہ شاہ جہاں کو آگرہ میں پیچھے چھوڑ کر اس قدر دور چلے جانا اور اپنے لشکر کو ایسے صوبہ (راجپوتانہ) میں سے لے جانا جہاں جے سنگھ اور جسونت سنگھ جیسے بڑے بڑے راجاؤں کے علاقے ہیں کسی طرح مصلحت نہیں بلکہ محلِ خطر ہے۔ اس کے علاوہ شجاع کی طرف سے بھی جو ایک بڑی فوج ساتھ لئے ہوئے جلد جلد بڑھا چلا آتا تھا، اس کو سخت تردّد تھا اور سلیمان شکوہ کی طرف سے بھی کھٹکا تھا جو سری نگر کے راجہ کے اتفاق اور مدد سے مہم کی تیاریاں کر رہا تھا۔ غرض کہ وہ اس وقت ایک بہت مشکل اور خطرناک حالت میں تھا۔ لیکن اس نے سوچ سمجھ کر سب سے بہتر تجویز یہ ٹھہرائی کہ سردست دارا شکوہ اور شاہ نواز خاں کے معاملہ کو حال خود چھوڑ کر شجاع کی خبر لینی چاہئے جو الٰہ آباد کی طرف دریائے گنگا کے پار اتر آیا تھا۔ سلطان شجاع نے اپنا کیمپ موضع کھجوہ (۸۶) میں جو بسبب موجود ہونے ایک بڑے تالاب کے اچھا موقع تھا قائم کیا تھا اور اپنے نزدیک اس بات کو مناسب سمجھا تھا کہ یہیں ٹھہر کر اورنگ زیب کے حملہ کا انتظار کیا جائے۔ پس اورنگ زیب نے آکر اپنا لشکر دریا کی شاخ کی ایک کنارے مخالف فوج سے ساڑھے چار میل کے فاصلہ پر قائم کیا۔ چنانچہ دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک بہت وسیع میدان تھا جس میں دونوں طرف کی فوجیں لڑائی کے وقت بخوبی دوڑ دھوپ کر سکتی تھیں۔ اور چونکہ اورنگ زیب یہ چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو لڑائی کا خاتمہ کیا جائے اس لئے لشکر گاہ میں پہنچتے ہی بہیر وغیرہ کو دریا کے اسی کنارے چھوڑ کر خود حملہ کے ارادہ سے اُس پار جا اُترا اور اس کے دوسرے دن لڑائی شروع ہونے سے پہلے صبح کے وقت (۸۷) میر جملہ بھی دولت آباد سے آکر شامل ہو گیا تھا۔ کیونکہ دارا شکوہ کے بھاگ جانے کے بعد اس کے اہل و عیال تو قید سے رہائی پا ہی چکے تھے اور اورنگ زیب کے مطلب کی خاطر اب خود اس کا بھی زیادہ قید رہنا کچھ ضرور نہ تھا۔ غرض کہ لڑائی بڑے جوش و خروش سے شروع ہوئی اور اگرچہ اورنگ زیب کی فوج نے بے حد شجاعت اور سرگرمی سے حملے کئے لیکن شجاع اپنے مورچوں سے ہرگز آگے نہ بڑھا اور اپنی ہی جگہ قائم

رہ کر حملہ آوروں کو بڑے نقصان کے ساتھ پسپا کرتا رہا اور اس کی اس تدبیر نے اورنگ زیب کو نہایت ہی پریشان کیا۔

شجاع کی اس تدبیر کا اصل مدعا یہ تھا کہ اگر ہم بدستور اپنے مورچوں میں قائم رہ کر لڑے جائیں گے تو گرمی (۸۸) کے مارے تھوڑی دیر کے بعد اورنگ زیب خود ہی دریا کی طرف ہٹنے پر مجبور ہوگا اور اس وقت ہم کو اس کی فوج کے پچھلے حصہ پر حملہ کرنے کا موقع ملے گا۔ اورنگ زیب بھی بھائی کی اس حکمت کو خوب سمجھے ہوئے تھا اور اس لئے وہ برابر آگے بڑھے جانے پر زور دے رہا تھا لیکن ایسے نازک وقت میں یہ ناگہانی حادثہ پیش آیا کہ راجہ جسونت سنگھ نے جو بظاہر بڑے خلوص کے ساتھ اس سے آن ملا تھا اس کی پچھلی فوج پر یکایک ایسا حملہ کر دیا کہ وہ سب شکست کھا کر بھاگ گئی اور اس نے تمام خزانہ اور اسباب کو لوٹنا شروع کر دیا اور چونکہ یہ خبر بہت جلد تمام لشکر میں پھیل گئی اس لئے ایشیائی فوجوں کے دستور کے موافق اورنگ زیب کی سپاہ بہت ہی ہراساں اور بے دل ہوگئی اور اگرچہ اس سبب سے اورنگ زیب کے خطرات اور بھی زیادہ ہو گئے لیکن اس کی مستقل مزاجی میں ذرا بھی فرق نہ آیا اور چونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر پیچھے ہٹا تو سب امیدیں خاک میں مل جائیں گی اس لئے اس نے جس طرح کہ دارا شکوہ کے مقابلہ میں یہ ٹھان لی تھی کہ خواہ کچھ ہی ہو میدان جنگ میں قائم رہ کر نتیجہ کو دیکھنا چاہئے، اُسی طرح اب بھی جمے رہنے کا پکا ارادہ کر لیا اور اگرچہ اس کی فوج میں دم بدم پریشانی بڑھتی جاتی تھی اور شجاع نے اس حالت کو غنیمت سمجھ کر ایک بڑا سخت حملہ کیا اور اتفاقاً ایک تیر لگ کر مہاوت کے مارے جانے سے اورنگ زیب کا ہاتھی ایسا بے قابو ہو گیا کہ وہ گھبرا کر اس پر سے اترنا چاہتا تھا مگر میر جملہ نے جو نزدیک تھا اور جس کی جرأت اور بہادریوں کو دیکھ کر سب اہلِ فوج دنگ ہو رہے تھے پکار کر کہا "دکن کو! دکن کو!" یعنی خیال کرو کہ دکن کہاں ہے اور کیا غضب کرتے ہو کیا اب بھاگ کر دکن جاؤ گے؟ اور اس بہادرانہ نصیحت سے اس کو تباہ ہوتے ہوتے بچا لیا۔

اگرچہ اورنگ زیب کی تباہی میں اس وقت کوئی دقیقہ باقی نہ رہا تھا اور اس کی حالت لاعلاج نظر آتی تھی بلکہ اس کو خود اندیشہ تھا کہ اب کوئی دم میں دشمن کے پنجہ میں پھنس جاؤں گا۔ مگر قسمت کا پھیر بھی ایک عجیب چیز ہے کہ بجائے اس فکر و تردد کے یہ تو فتح یاب ہو گیا اور جس طرح سموگڈھ کی لڑائی میں ایک ادنیٰ حرکت کے باعث دارا شکوہ کو

صرف جان لے کر میدان سے بھاگنا پڑا تھا شجاع کو بھی وہی حادثہ پیش آیا یعنی یہ بھی اورنگ زیب کی بھاگی ہوئی فوج پر زیادہ چستی کے ساتھ حملہ کرنے کے لئے اپنے ہاتھی سے اتر پڑا اور اگرچہ یہ تحقیق نہیں ہے کہ اس کو بھی یہ صلاح بدنیتی سے دی گئی تھی یا کہ خیر خواہی سے مگر اس میں شک نہیں ہے کہ اللہ وردی خاں نے جو اس کا ایک بڑا سردار تھا اس وقت بڑی ہی التجا سے کہا کہ گھوڑے پر سوار ہو جایئے اور جو لفظ خلیل اللہ خاں نے سموگڈھ کی لڑائی میں کہے تھے اس کے لفظ بھی بعینہ ویسے ہی تھے یعنی دست بستہ ہو کر بڑی منت سے یہ کہا کہ ''حضور! اس بڑے ہاتھی پر ایسی جان جوکھوں میں کیوں بیٹھے ہیں کیا ملاحظہ نہیں فرماتے کہ دشمن بھاگے جاتے ہیں اور اب چستی سے ان کا تعاقب نہ کرنا سخت غلطی ہے پس جلدی گھوڑے پر سوار ہو کر ان کا پیچھا کیجئے! اور پھر دیکھ لیجئے کہ ہندوستان کا تخت آپ کے قدموں کے نیچے ہے اور آپ ہندوستان کے بادشاہ ہیں''۔ چنانچہ اس حرکت سے جو حادثہ دارا شکوہ کو پیش آیا تھا وہی شجاع کو پیش آیا یعنی جوں ہی وہ فوج کی نظر سے غائب ہوا اس کے دل میں شبہ گزر گیا کہ یا تو مارا گیا یا کہیں فریب سے پکڑا گیا اور اس کی فوج فوراً ایسی بے انتظام اور تتر بتر ہو گئی کہ دوبارہ جمع کرنا ناممکن تھا۔ (۸۹)

شائستہ خاں کا خودکشی کے لئے تیار ہو جانا

جسونت سنگھ نے جب دیکھا کہ معاملہ الٹا ہو گیا ہے تو لوٹ کا مال سمیٹ کر فی الفور اس ارادہ سے آگرہ کے لئے چل دیا کہ وہاں سے اپنے وطن کو چلا جائے اور چونکہ آگرہ میں یہ افواہ اڑ گئی تھی کہ اورنگ زیب شکست کھا کر قید ہو گیا ہے اور شجاع مع فوج کثیر آگرہ کو آرہا ہے اور یہاں تک اس بات نے شہرت پکڑی کہ شائستہ خاں نے بھی اس کو سچ جان لیا۔ پس جسونت سنگھ کا شہر کے قریب پہنچ جانا سن کر جس کی دغابازیوں سے وہ خوب واقف تھا مایوسی کی حالت میں زہر کا پیالہ پی کر خودکشی پر آمادہ ہو گیا اور بے شک پی ہی لیتا اگر اس کی مستورات اس پر نہ آگرتیں اور پیالہ چھین کر نہ پھینک دیتیں۔ اور لڑائی کے اصلی حال سے دو دن تک آگرہ والے اس قدر بے خبر تھے کہ اگر جسونت سنگھ ذرا جرأت کر کے لوگوں کو کچھ تو دھمکاتا اور کچھ بڑے بڑے وعدے کر کے آئندہ کی بہتری کا متوقع کرتا تو بے شبہ شاہ جہاں کو قید سے چھڑا دیتا لیکن معاملات کی حالت جو تھی وہ اس کو معلوم ہی تھی اس لئے آگرہ میں زیادہ ٹھہرنا یا ایسے بکھیڑوں پر پڑنا اس نے مناسب نہ جانا اور صرف شہر میں

سے ہوتا ہوا اپنے اصلی ارادہ کے موافق اپنے ملک کو چلا گیا۔ (۹۰)

اورنگ زیب کا آگرہ لوٹ آنا

اورنگ زیب کو بھی جسونت سنگھ کی کرتوتوں کا بڑا کھٹکا تھا اور خیال تھا کہ آگرہ سے شورش کی کوئی جلد خبر آئے گی اس لئے شجاع کا کچھ زیادہ پیچھا نہ کیا اور مع کل لشکر کے جلدی سے دارالسلطنت کی طرف کوچ کر دیا۔ مگر یہ مشکل پیش آئی کہ اس کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ غنیم کے لشکر کا اس لڑائی میں کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ بلکہ شجاع کی دولتمندی اور فیاضی کی شہرت کے باعث وہ سب راجے جن کی ریاستیں گنگا کے دونوں کناروں پر ہیں اس کی مدد کے لئے اپنی فوج بھیج رہے ہیں اور اس کی طاقت بڑھتی جاتی ہے اور یہ بھی اطلاع پہنچی ہے کہ الہ آباد میں اپنے پاؤں جمانا چاہتا ہے تاکہ گنگا کے اس مشہور گھاٹ کو جو واقع میں صوبہ بنگال کا دروازہ سمجھا جاتا ہے ہاتھ سے نہ جانے دے۔ پس اس نے سوچا کہ صرف دو شخص اس قابل ہیں جو ان مشکلات میں مجھے مدد دے سکتے ہیں، ایک محمد سلطان دوسرا میر جملہ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ تردد بھی تھا کہ جو شخص کوئی نمایاں خدمت بجا لاتا ہے تو اکثر ایسا اتفاق ہو جاتا ہے کہ خواہ اس کو کیسا ہی صلہ کیوں نہ دیا جائے مگر وہ اسے اپنی خدمت کے مقابلہ میں بے حقیقت ہی سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ دیکھتا تھا کہ محمد سلطان کو میری اطاعت ابھی سے ناگوار ہے اور قلعہ آگرہ پر قابض ہو جانے اور شاہ جہاں کو قید کر لینے کی وجہ سے بڑی تعلّی کیے لیتا ہے۔ اب رہا میر جملہ سو اگرچہ وہ اس کی کمال دانائی اور سنجیدگی اور دلاوری کا قائل تھا لیکن اس کے انہی اوصاف سے ڈرا بھی تھا۔ کیونکہ ایک تو دولتمندی کا بہت ہی شہرہ تھا اس کے علاوہ تمام ہندوستان میں ایک ایسا دانا اور دوراندیش اور کامل وزیر سمجھا جاتا تھا کہ مشکل سے مشکل معاملات کو اپنے حسنِ تدبیر سے سرانجام کر سکتا ہے اور ان وجوہ سے اورنگ زیب اس عجیب شخص کو بھی بہ لحاظ اس کے بلند ارادوں اور خیالاتِ جاہ طلبی کے، محمد سلطان سے کچھ کم نہیں سمجھتا تھا۔ پس اگرچہ یہ مشکلیں ایسی تھیں جو ایک معمولی عقل کے آدمی کو ضرور دقتوں میں پھنسا دیتیں لیکن اورنگ زیب نے ایسی حکمت اور ہوشیاری سے کام کیا کہ ان کو دارالسلطنت سے دھکیل بھی دیا اور دونوں میں سے کوئی شاکی بھی نہ ہونے پایا۔ یعنی ایک بڑی فوج سپرد کر کے شجاع کے مقابلہ کو روانہ کر دیا اور رخصت کے وقت میر جملہ کو تو یہ سمجھا کر راضی کر دیا کہ فتح کے بعد بنگال

کے زرخیز صوبہ کی حکومت مدت العمر کے لئے آپ ہی کے واسطے ہے بلکہ آپ کے بعد آپ کا بیٹا بھی مستحق اس صوبہ داری کا سمجھا جائے گا اور اگرچہ آپ کی خدمتیں بہت سی عنایتوں کے قابل ہیں مگر ان میں سے بالفعل یہ ایک ہے اور جب آپ شجاع پر فتح پا لیں گے تو امیر الامراء (۹۱) کا خطاب جو ہندوستان میں سب سے بڑا خطاب ہے آپ کو عطا کیا جائے گا اور محمد سلطان سے یہ کہا کہ بیٹا خیال کرو کہ میری اولاد میں تم سب سے بڑے ہو اور اپنے ہی کام پر جاتے ہو اور بے شک تم نے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو ابھی کچھ بھی نہیں کیا کیونکہ تاوقتیکہ شجاع کو جو ہمارے مخالفوں میں ایک بہت بڑا شخص ہے شکست دے کر پکڑ نہ لاؤ سارے ہی کام ادھورے ہیں۔ بعد اس فہمائش کے اورنگ زیب نے دونوں کو حسبِ معمول بڑے بڑے ''سروپا'' یعنی خلعت دیئے اور چند گھوڑے اور ہاتھی عمدہ ساز و سامان سمیت عنایت کئے اور جس طرح سے ہو سکا محمد سلطان کی بیگم اور میر جملہ کے بیٹے محمد امین کو ان کے ساتھ نہ جانے دیا یعنی محمد سلطان کی بیگم کو تو جو شاہ گولکنڈا کی بیٹی تھی اس حیلہ سے ٹھہرا لیا کہ ایسی عالی خاندان شہزادی کا لڑائی کے وقت لشکر کے ساتھ جانا کسی طرح زیبا اور مناسب نہیں اور محمد امین خاں کو اس بہانہ سے روک لیا کہ ابھی یہ بہت کم سن ہے اور از راہ شفقت ہم چاہتے ہیں کہ خاص اپنے زیر نظر رکھ کر اس کو تعلیم و تربیت کرائیں لیکن اصل یہ ہے کہ دونوں کو اُول کے طور پر رکھا تھا تاکہ شہزادے اور میر جملہ سے کسی بے وفائی کا اندیشہ نہ رہے۔

شجاع کا الٰہ آباد سے اوّل مونگیر اور پھر راج محل جانا اور میر جملہ اور محمد سلطان کا فتح کے بعد وہیں توقف کرنا

اب شجاع کا حال سنئے کہ چونکہ اس کو برابر یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ مبادا بنگال کے نیچے کے حصہ کے وہ راجہ جو میری چھینا جھپٹیوں اور زیادہ ستانیوں سے دل میں ناراض ہیں کسی کے بہکانے سے پیچھے فساد کر بیٹھیں اس وجہ سے جب اورنگ زیب کے ان بندو بستوں سے مطلع ہوا تو فوراً الٰہ آباد سے ڈیرہ ڈنڈا اٹھا کر بنارس اور پٹنہ کی طرف کوچ کر گیا۔ کیونکہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ غالباً میر جملہ بجائے الٰہ آباد کے کسی اور گھاٹ سے گنگا کو عبور کر کے میرے بنگالہ کے واپس جانے کے راستہ کو روکنا چاہے گا۔ چنانچہ انہی اندیشوں سے بنارس اور پٹنہ سے بھی پیچھے مونگیر کو چلا گیا جو گنگا کے کنارے ایک چھوٹا سا شہر ہے اور

ایک طرف پہاڑ اور دوسری جانب جنگل اور دریا ہونے کی وجہ سے ایک کار آمد مقام اور بنگالہ کا دروازہ سمجھا جاتا ہے اور یہاں پہنچ کر مورچہ بندی کر لی اور شہر اور دریا کے کنارے سے لے کر پہاڑ تک ایک بڑی گہری خندق کھدوا لی۔ چنانچہ اس واقعہ کے کئی سال بعد اس خندق (۹۲) کو میں نے بھی دیکھا تھا اور اس مستحکم مقام میں گنگا کے گھاٹ کو روکے ہوئے فوج مخالف کے حملہ کا منتظر تھا کہ یکایک اسے یہ افسوس ناک خبر ملی کہ وہ لشکر جو بتدریج دریا کے کنارے کنارے بڑھا آتا تھا صرف دھوکا دینے کی غرض سے تھا اور میر جملہ اس میں نہیں ہے بلکہ وہ ان راجاؤں کو جن کی ریاستیں دریا کے دائیں کنارے کوہستان میں ہیں گانٹھ کر پہاڑوں سے عبور کرتا ہوا مع محمد سلطان اور کسی قدر اپنی چیدہ اور منتخب سپاہ کے راج محل کی طرف اس غرض سے جا رہا ہے کہ ہمارا پیچھے ہٹنے کا راستہ روک کر ہم کو بنگالہ کے اندر کی طرف نہ جانے دے۔ پس یہ خندق اور مورچے جو ایسے بڑے اہتمام سے تیار ہوئے تھے یونہی چھوڑ دینے پڑے اور چونکہ مونگیر اور راج محل کے درمیان گنگا اس طرح حائل ہے کہ کئی چکر اور پھیر کھا کر گزری ہے اس سبب سے اگرچہ بہت سی تکلیفیں اٹھانی پڑیں مگر پھر بھی میر جملہ سے کئی روز پہلے راج محل (۹۳) میں جا پہنچا بلکہ کچھ مورچے باندھ لینے کی بھی فرصت مل گئی۔ کیونکہ میر جملہ اور محمد سلطان یہ دیکھ کر کہ اس کو اب راج محل پہنچنے سے روکنا ناممکن ہے اپنے بائیں ہاتھ بعض نہایت دشوار گزار راستوں سے گزرتے ہوئے اس غرض سے گنگا کے رخ ہو گئے کہ اپنے بھاری توپخانہ اور مابقا فوج اور بھیر دغیرہ کو جو دریا کے راستہ سے آ رہی تھی اپنے ساتھ شامل کر لیں اور جب ان کا یہ مدعا حاصل ہو گیا تو راج محل پہنچ کر لڑائی شروع کر دی اور اگرچہ پانچ روز تک شجاع خوب لڑا مگر جب دیکھا کہ میر جملہ کے توپخانہ کی متواتر مار میرے مورچوں کو (جو درختوں کی شاخوں اور لکڑیوں سے بُرج کی صورت کے مٹی اور ریت بھر کر بنا لئے گئے تھے) برباد کئے جاتی ہے اور یہ بھی خیال کیا کہ برسات کا موسم قریب آ گیا ہے، اس وقت ان کو اور بھی زیادہ نقصان پہنچے گا تو رات کے پردہ میں وہاں سے نکل گیا، مگر دو توپیں جو بہت بھاری تھیں یہیں چھوڑ گیا اور میر جملہ اس خوف سے اس کا پیچھا نہ کر سکا کہ شب خون کے ارادہ سے کہیں وہ ہماری گھات میں لگا ہوا نہ ہو اور شجاع کی خوش نصیبی سے صبح ہونے سے پہلے اس زور کا مینہ برسا کہ اس کے تعاقب کے لئے راج محل سے کوچ کا خیال تک کرنا ناممکن ہو گیا۔ یہ بارش نہایت ہی شدید اور برسات کا آغاز تھی جو بنگالہ میں جولائی سے اکتوبر تک

بہت ہی کثرت سے ہوا کرتی ہے اور راستے ایسے خراب ہو جاتے ہیں کہ کسی حملہ آور فوج کے سفر کے قابل نہیں رہتے۔ پس میر جملہ کو واجب ہوا کہ برسات کے ختم ہونے تک راج محل میں ٹھہر کر اپنی فوج کو شجاع کی سپاہ کے مکانوں میں آرام دے۔

شجاع کا مکرر فوج بھرتی کرنا جس میں بہت سے پرتگیز بھی تھے

اس مہلت سے شجاع کو خوب گنجائش مل گئی کہ جس جگہ مناسب سمجھا وہاں ٹھہر کر اپنے حسب حال تدبیریں کرتا رہا اور بہت سی نئی فوج نوکر رکھ لی۔ جس میں بہت سے پرتگیز بھی تھے جو مع چند توپوں کے بنگال کے ان ضلعوں سے آگئے تھے جو نیچے کی طرف ہیں کیونکہ ملک کی کمال زرخیزی کے باعث اکثر یورپی اس نواح میں آجاتے ہیں اور ایسے وقت میں فی الحقیقت یہ امر شجاع کی خوش تدبیری اور دانائی میں داخل تھا کہ اس نے ان اجنبی لوگوں کو دل افزائی اور خاطر داری سے اپنی سپاہ میں بھرتی کر لیا۔ کیونکہ پرتگیز اصیل اور دوغلے سب ملا کر اس وقت کم سے کم نو دس ہزار یہاں موجود تھے اور فی الواقع اس کو بہت مدد دے سکتے تھے۔ اس نے اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ ان کے پادریوں کی بہت دلداری اور تالیف قلوب کی تھی اور انعام و اکرام کے وعدوں کے علاوہ یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ اپنی مرضی کے موافق جہاں چاہو اپنے گرجا بنا لینا۔

محمد سلطان اور میر جملہ میں نااتفاقی کا پیدا ہونا اور شہزادہ کا سلطان شجاع کے پاس چلا جانا اور شجاع کا اس کو منہ نہ لگانا اور اورنگ زیب کے حکم سے قلعہ گوالیار میں اس کا قید کیا جانا

اس عرصہ میں میر جملہ کو یہ عجیب مخمصہ پیش آیا کہ اس میں اور محمد سلطان میں سخت نااتفاقی پیدا ہو گئی۔ وجہ یہ ہوئی کہ ایک تو اس کی نہایت آرزو تھی کہ کل لشکر کی حکمرانی میرے اختیار میں ہو۔ دوسرے میر جملہ کے ساتھ توہین و تحقیر سے پیش آتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات باپ کی نسبت بھی کچھ ایسے الفاظ کہہ اٹھتا تھا جو نہ فرزندانہ اطاعت اور ادب ہی کے شایاں تھے اور نہ باپ کے شاہانہ منصب ہی کے اور اعلانیہ کہہ دیا کرتا تھا کہ آگرہ کی تسخیر میں میں نے وہ وہ کام کئے ہیں کہ حضرت کو واجب ہے کہ اپنی کامیابی میں میرے ممنون ہوں۔ پس آخر کار نتیجہ ان حرکتوں کا یہ ہوا کہ باپ کو سخت ناراض کر لیا اور

پھر جب اس کی ناراضی کی خبریں سنیں تو اس ڈر کے مارے کہ مبادا میر جملہ کے پاس میری گرفتاری کا حکم آجائے اور وہ مجھے قید کر لے صرف گنتی کے آدمیوں کے ساتھ راج محل سے چل دیا (۹۴) اور سلطان شجاع کی خدمت میں اطاعت ظاہر کر کے بجا آوری خدمات کے لئے اپنی آمادگی ظاہر کی۔ لیکن شجاع کو ان باتوں پر کچھ یقین نہ آیا بلکہ یہ شبہ کرتا رہا کہ شاید اورنگ زیب اور میر جملہ نے مجھے بے وقوف بنانے کو یہ ایک حکمت کی ہے اور اس کے بڑے بڑے وعدوں اور قسموں پر اعتبار نہ کر کے اپنی فوج کی کوئی بڑی حکومت اسے سپرد نہ کی بلکہ ہمیشہ اس کا نگران حال رہا اور اس طرز سلوک کا انجام یہ ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں شجاع سے بھی متنفر ہو گیا اور آخر کار چند مہینوں کے بعد ناامید ہو کر پھر میر جملہ کے پاس چلا آیا اور میر جملہ نے خاطر داری اور کسی قدر اعزاز و اکرام کے ساتھ لشکر میں اتار لیا اور کہا کہ اگرچہ آپ نے بہت بڑا قصور کیا ہے مگر خیر میں بادشاہ سے سفارش کر کے معافی کی درخواست کروں گا۔

میں نے بہت لوگوں سے سنا ہے کہ یہ عجیب حرکت جو محمد سلطان سے ظہور میں آئی تھی حقیقت میں اورنگ زیب کا ایک منصوبہ تھا جو یہ چاہتا تھا کہ میرا بیٹا خواہ اپنے کو کسی خطرناک کام ہی میں کیوں نہ ڈال دے مگر سلطان شجاع تباہ ہو جائے (۹۵)۔ بہر حال اصل حقیقت خواہ کچھ ہی ہو مگر جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ وہ راج محل کو لوٹ آیا ہے تو موقع دیکھ کر اب محمد سلطان کو بھی کسی حراست کی جگہ بھیج دینے کا خاصہ بہانہ ہاتھ آگیا ہے واقعی یا بناوٹی خفگی کے ساتھ اس کو ایک تاکیدی فرمان بھیجا کہ فوراً بلا توقف دہلی کو چلا آئے۔ اب بدنصیب شہزادہ تعمیل حکم سے سرتابی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ پس جوں ہی گنگا کے اس پار اترا لوگوں کے ایک مسلح گروہ نے گرفتار کر لیا اور زبردستی ایک عماری میں بٹھا کر گوالیار کو لے گئے اور یقین ہے کہ اس کی عمر کا خاتمہ اب اسی جگہ ہو گا۔ (۹۶)

اورنگ زیب کا سلطان محمد معظم کو بھائی کی حالت سے عبرت دلانا اور محمد معظم کے چلن کی نسبت لوگوں اور خود مصنف کی رائے

اس طرح پر اپنے بڑے بیٹے کا خرخشہ مٹا کر اورنگ زیب نے شہزادہ معظم سے فرمایا کہ "ایسا نہ ہو کہ کہیں تم بھی سرکشی اور بلند پروازی کے خیالات میں بھائی کی تقلید کر بیٹھو اور وہی معاملہ تم کو بھی پیش آئے جو اس کو پیش آیا ہے۔ یاد رکھو کہ سلطنت ایک ایسا

نازک معاملہ ہے کہ بادشاہوں کو اپنے سایہ سے بھی حسد اور بدگمانی ہو جاتی ہے پس یہ خیال کبھی نہ کرنا کہ اورنگ زیب بھی بیٹوں کے ہاتھ سے وہی کچھ دیکھ سکتا ہے جو جہاں گیر نے شاہ جہاں (۹۷) کے ہاتھوں دیکھا تھا یا جس طرح شاہ جہاں نے تخت و تاج کھودیا اورنگ زیب بھی اسی طرح کھو سکتا ہے"۔ لیکن سلطان محمد معظم کے تمام طور و طریق پر لحاظ کرکے میری یہ رائے ہے کہ اورنگ زیب کا اس کی طرف سے کسی بُرے ارادہ کا شبہ کرنا بے وجہ ہے۔ کیونکہ وہ تو ایک ادنیٰ غلام سے بھی زیادہ فرمانبرداری کرتا ہے اور مطیع سے مطیع شخص سے بھی یہ ممکن نہیں کہ غیر قانع اور حریص طبیعت کے جوش پر اپنے اقوال و افعال سے کسی قدر پردہ ڈال سکے۔ چنانچہ خود اورنگ زیب بھی حصولِ اختیار و اقتدار کی جانب سے کبھی اس قدر بے پروا نہیں نظر آیا اور نہ خیرات اور دینیات ہی میں اتنا مصروف دکھائی دیا۔ مگر بایں ہمہ اکثر ہوشیار لوگوں کی یہ رائے ہے کہ بمقتضائے (اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیهِ) یہ اس کی بناوٹ ہے اور حصولِ سلطنت کے خیالات اسی طرح دل میں چھپائے ہوئے ہے جس طرح اس کا باپ چھپائے ہوئے تھا۔(۹۸)

بنگالہ کی طرف لڑائی کا جاری رہنا اور اورنگ زیب کا تختِ سلطنت پر جلوس کرنا

اب بنگالہ کا حال سنئے: کہ اگرچہ لڑائی بدستور جاری تھی مگر کسی قدر سستی کے ساتھ تھی۔ شجاع حتی المقدور مقابلہ کئے جاتا تھا اور اس کا ہوشیار دشمن میر جملہ گنگا سے اترنے اور بے شمار ندی نالوں کے طے کرنے میں جو اس ملک میں بکثرت ہیں، جس طرح سے مناسب اور مصلحتِ وقت جانتا تھا عمل کرتا تھا اور اس عرصہ میں اورنگ زیب آگرہ کے نواح میں مقیم تھا۔ مگر آخر کار جب مراد بخش کو قلعہ گوالیار میں بھیج چکا تو دہلی جاکر ان سب دھوکے کی ٹٹیوں کو جو اب تک لوگوں کے فریب دینے کو بنا رکھی تھیں، اٹھا ڈالا اور تختِ سلطنت پر جلوس کرکے اچھی خاصی طرح بادشاہ بن بیٹھا۔(۹۹)

دارا شکوہ کا گجرات سے اجمیر آنا اور جسونت سنگھ اور شاہ نواز خاں کی دغا بازی اور شاہ نواز خان کا قتل اور دارا شکوہ کی تباہی

اب اورنگ زیب کی تمام توجہ دارا شکوہ کے گجرات سے نکلنے کی تدبیروں میں

مصروف تھی لیکن ان وجوہ سے جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں اس دلی مدعا کا حاصل ہونا آسان نہ تھا مگر آخر کار اس کی عجیب و غریب ہوشمندی اور روز افزوں خوش اقبالی سب مشکلوں پر غالب آ گئی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جسونت سنگھ نے گھر پہنچتے ہی اس مال و دولت سے جو کھجوہ سے لوٹ کر لایا تھا ایک مضبوط فوج بھرتی کرنی شروع کر دی اور دارا شکوہ کو لکھ بھیجا کہ آپ بلا توقف آگرہ کو چلے آیئے میں اپنی تمام فوج کے ساتھ راستہ میں آن ملوں گا۔ اب چونکہ شہزادہ نے بھی ایک فوجِ کثیر (۱۰۰) جمع کر لی تھی، اگرچہ بہت عمدہ نہ تھی۔ پس اس امید پر کہ جب میں ایسے نامی راجہ کو ساتھ لئے ہوئے دارالسلطنت کے قریب پہنچ جاؤں گا تو میرے منتشر شدہ ہوا خواہوں کو بھی میرے نشان کے نیچے آن کر جمع ہو جانے کی جرأت ہو جائے گی، احمد آباد سے کوچ کر دیا اور بہت سرعت کے ساتھ اجمیر میں آ پہنچا جو آگرہ سے سات آٹھ منزل کے فاصلہ پر ہے۔ لیکن جسونت سنگھ اپنے عہد پر قائم نہ رہا۔ وجہ یہ ہوئی کہ راجہ جے سنگھ نے یہ خیال کر کے کہ لڑائی کے تمام رنگ ڈھنگ سے اورنگ زیب ہی کے غلبہ کی امید ہوتی ہے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے جسونت سنگھ کو دارا شکوہ کی طرفداری چھوڑ دینے کی صلاح دینا مصلحت جانا اور اس کو لکھا کہ "تم نے اس میں ایسا کیا فائدہ سوچا ہے کہ ڈوبتے کے ساتھی بنتے ہو اور اگر تم اسی بات پر قائم رہو گے تو اس کا کچھ فائدہ ہونا تو معلوم مگر ہاں تمہارا خاندان اور تم بے شک برباد ہو جاؤ گے اور اورنگ زیب تم کو کبھی معاف نہ کرے گا اور چونکہ میں بھی راجہ ہوں اس لئے بہ منت التماس کرتا ہوں کہ بے چارے راجپوتوں کا خون کرانے سے باز آیئے اور اس گھمنڈ میں نہ رہئے کہ اور راجہ بھی تمہارے شریک ہو جائیں گے کیونکہ یہ میں کبھی نہ ہونے دوں گا اور چونکہ یہ ایک ایسا امر ہے جو ہر ایک ہندو شخص سے تعلق رکھتا ہے اس لئے آپ کو ایسی آگ کے بھڑکانے کی کس طرح اجازت دی جا سکتی ہے جو تمام ملک میں پھیل جائے اور پھر کوئی بھی اس کو بجھا نہ سکے اور اگر تم دارا شکوہ کو حالِ خود چھوڑ دو گے تو اورنگ زیب آپ کی پچھلی خطائیں سب معاف کر دے گا اور اس شاہی خزانہ کا بھی مطالبہ نہ کرے گا جو آپ نے کھجوہ کی لڑائی میں لوٹ لیا تھا۔ بلکہ فوراً گجرات کی صوبہ داری پر سرفراز کئے جاؤ گے اور ایسے صوبہ کی حکومت میں جو آپ کے علاقہ سے متصل ہے جو فوائد ہیں وہ آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں اور وہاں آپ بغیر کسی طرح کے خوف و خطر کے نہایت آرام سے رہیں گے اور ان وعدوں کا کامل طور سے پورا کرنا میرے ذمہ ہے"۔ خلاصہ کلام یہ ہے

کہ جسونت سنگھ اس امر پر مائل ہو گیا کہ گھر سے قدم باہر نہ نکالے (۱۰۱) اور اورنگ زیب مع اپنی تمام فوج و لشکر کے اجمیر میں دارا شکوہ کی فوج کے سامنے آن موجود ہوا۔

اب ایسا کون شخص ہو گا جو اس تاریخ کو پڑھے گا اور اس بات پر افسوس نہ کرے گا کہ بد نصیب دارا شکوہ کو لوگوں نے کیسی کیسی الٹی تدبیریں بتائیں اور آخر کار دغا کی۔ جسونت سنگھ کی بد عہدی کا حال اگرچہ دارا شکوہ پر کھل گیا مگر اس کے ہولناک نتیجوں کا اب کیا علاج تھا۔ وہ بے شک اپنی فوج کو احمد آبا لے جاتا مگر گرمی کی شدت اور پانی کے قحط کی وجہ سے جو اس موسم میں راجپوتانہ میں ہو جاتا ہے یہ امر سخت دشوار تھا کہ پینتیس روز تک ان راجاؤں کے ملک میں سفر کرے جو جسونت سنگھ کے رفیق اور دوست ہوں اور ان پر طرہ یہ ہو کہ اورنگ زیب سا مستعد دشمن ایسی بڑی اور تازہ دم فوج کے ساتھ نہایت سرگرمی سے اس کا پیچھا کرے۔ اس لئے اب اس نے سپاہیانہ موت سے مرجانا ہی بہتر سمجھا اور اگرچہ جانتا تھا کہ برابر کی لڑائی نہیں ہے مگر تاہم یہی ٹھان لی کہ یا دشمن کو مار لیا یا آپ مر گئے مگر اب تک بھی اس کو اپنی مصیبت کی انتہا معلوم نہ تھی کیونکہ جن لوگوں پر خیانت اور دغا بازی کا کچھ بھی شک و شبہ نہ تھا سب کچھ وہی کرنے کو موجود اور گھات میں لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ بد ذات شاہ نواز خاں جس پر دارا شکوہ کامل بھروسہ کئے ہوئے تھا اس کی خط و کتابت اورنگ زیب سے برابر جاری تھی اور وہ اس کے سب منصوبوں سے اس کو مطلع کرتا رہتا تھا۔ لیکن اپنی بے ایمانی کی سزا اس نے جلد ہی پالی یعنی اسی لڑائی میں تلوار سے قتل کیا گیا۔ چنانچہ بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ خود دارا شکوہ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ مگر ظن غالب یہ ہے دارا شکوہ کے ان مخفی طرفداروں نے جو اورنگ زیب کے لشکر میں تھے اس خوف سے اسے مار ڈالا کہ اگر یہ زندہ رہا تو ہم سب کا بھید کھول دے گا اور ان سب عرضیوں کا حال اس سے کہہ دے گا جو ہم دارا شکوہ کی خدمت میں بھیجتے رہے ہیں۔

لیکن اس دغا بازی کی موت سے اب کیا فائدہ تھا کیونکہ دارا شکوہ کو لازم تو یہ تھا کہ جس روز سے اس نے احمد آباد کو لیا تھا اسی روز سے اپنے خیر خواہوں کی دانشمندانہ صلاح اس کی نسبت سنتا اور جس بے اعتباری اور بے عزتی کے لائق تھا اس سے اسی طرح پیش آتا۔

الغرض قریب پہر دن چڑھے کے لڑائی شروع ہوئی اور دارا شکوہ کے توپ خانہ سے جو ذرا اونچی اور مناسب جگہ پر قائم تھا اگرچہ خالی آوازیں تو بڑے زور شور کی سنائی دیں مگر کہتے ہیں کہ دغابازی کا جال یہاں تک پھیلا ہوا تھا کہ توپوں میں خالی تھیلیاں بغیر گولوں کے

بھری ہوئی تھیں۔ اس لڑائی کی بشرطیکہ اس کو لڑائی کہا جائے تفصیل لکھنی بے فائدہ ہے اور صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ پہلے گولے کے چلتے ہی جے سنگھ ایک ایسے مقام پر آ کھڑا ہوا جہاں سے دارا شکوہ اس کو دیکھ سکے اور اپنا ایک سردار یہ پیغام دے کر دارا شکوہ کے پاس بھیجا کہ "اگر گرفتاری سے بچنا چاہتے ہو تو فوراً میدان جنگ سے علیحدہ ہو جاؤ"۔ اس پیغام سے اس بے چارے شہزادہ پر ایسا ناگہانی خوف طاری ہوا اور ایسی حیرت چھائی کہ فوراً اس کی صلاح مان لی اور ایسا سراسیمہ ہو کر بھاگا کہ بہیر کی نسبت بھی کچھ حکم نہ دیا اور فی الواقع اس وقت وہ ایسی ہی آفت میں مبتلا تھا کہ اس نے اتنی ہی مہلت کو غنیمت جانا کہ اپنے اہل و عیال کو اس تہلکہ سے نکال لے جائے۔ کیونکہ کچھ شک نہیں ہے کہ وہ اس وقت جے سنگھ کے قابو میں آ چکا تھا اور راجہ کے اس اغماض کا سبب یہ تھا کہ وہ ہمیشہ یہ سمجھ کر کہ کسی شہزادہ سے بدسلوکی کرنا کسی نہ کسی دن سخت خطرہ کا باعث ہے، شاہی خاندان کے لوگوں کے ساتھ بہت ادب اور لحاظ سے پیش آتا تھا۔ (۱۰۲)

شکست کے بعد دارا شکوہ کا پھر گجرات کی طرف جانا اور حاکم احمد آباد کی نمک حرامی اور دارا شکوہ کا کَچھ کے راجہ کے ملک میں پہنچ جانا اور اس کے افسوسناک مصائب

آفت رسیدہ اور برباد شدہ دارا شکوہ جس کی جانبری صرف احمد آباد پر دوبارہ قبضہ حاصل کرنے میں منحصر تھی ایسے دور و دراز ملک میں سے گزرنے پر مجبور تھا جو قریباً سب کا سب مخالف راجاؤں کے قبضہ میں تھا اور ایسی بے سروسامانی تھی کہ خیمہ تک پاس نہ تھا اور زیادہ سے زیادہ دو ہزار آدمی ہمراہ تھے۔ گرمی بہت سخت پڑتی تھی اور اس پر یہ ایک اور آفت تھی کہ کولی لوگ رات دن پیچھا نہ چھوڑتے تھے اور اس کے سپاہیوں کو اس قدر لوٹا اور قتل کیا تھا کہ صرف چند قدم پیچھے رہ جانا بھی نہایت خطرناک تھا۔ یہ کولی اس ملک کے کسان ہیں اور بڑے ہی لٹیرے اور ہندوستان بھر میں ایک ہی بدذات ہیں۔ پس اگرچہ ان سب مشکلوں اور آفتوں سے بچ کر دارا شکوہ ایک ایسے مقام تک پہنچ گیا جہاں سے احمد آباد صرف ایک منزل تھا اور اسے اب یہ امید تھی کہ کل کو احمد آباد میں جا داخل ہوں گا اور پھر ایک فوج بھرتی کر لوں گا۔ لیکن بدنصیب اور شکست خوردہ لوگوں کی امیدیں بھی

سرسبز نہیں ہوتیں۔ چنانچہ اس شخص نے جس کو دارا شکوہ احمد آباد میں قلعہ دار اور حاکم بنا کر پیچھے چھوڑ آیا تھا یہ بے وفائی اور پاجی پن کیا کہ اورنگ زیب کے دھمکانے یا امیدوار کرنے کے باعث اپنے آقا سے پھر گیا اور یہ لکھ بھیجا کہ شہر کے نزدیک نہ آیئے دروازے بند اور لوگ مقابلہ کے لئے مسلح اور تیار ہیں۔

دارا شکوہ کے اس پُر مصیبت سفر میں مصنف کا تین دن تک اس کے ہمراہ رہنا

اس وقت میں بھی تین دن سے دارا شکوہ کی ہمراہی میں تھا اور یہ ایک نہایت ہی عجیب و غریب اتفاق تھا کہ میں اسے راستہ میں مل گیا اور کسی طبیب کے ہمراہ نہ ہونے کی وجہ سے اس نے جبراً مجھے اپنے ساتھ لے لیا۔ احمد آباد کے حاکم کے کاغذ کے پہنچنے سے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ دارا شکوہ نے مجھ سے فرمایا کہ مبادا تمہیں کولی مار ڈالیں اور اس لیے بہ اصرار مجھ کو اس کاروان سرا میں لے گیا جہاں خود ٹھہرا ہوا تھا اور اب اس کا یہ حال تھا کہ خیمہ تک اس کے پاس نہ تھا اور اس کی بیگم اور عورتیں صرف ایک قنات کی آڑ میں تھیں جس کی رسیاں میری سواری کی بہلی کے پہیوں سے جس میں مَیں آرام کرتا تھا باندھی ہوئی تھیں۔ جو لوگ اس امر سے واقف ہیں کہ ہندوستانی امرا اپنی مستورات کے پردہ کے معاملہ میں کس قدر مبالغہ کرتے ہیں وہ میرے اس بیان پر اعتبار نہ کریں گے۔ مگر میں نے یہ واقعہ بطور ثبوت اس دردناک حالت کے لکھا ہے جس میں یہ شہزادہ اس وقت مبتلا تھا۔

اسی شب کو پو پھٹے کے قریب احمد آباد کے حاکم کا جب مذکورہ بالا پیغام آیا تو مستورات کی گریہ وزاری نے ہم سب کو رُلا دیا۔ اس وقت ایک عجیب پریشانی اور مایوسی چھا رہی تھی اور ہر کوئی خوف سے خاموش ایک دوسرے کا منہ تکتا تھا اور کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ دم بھر میں کیا ہو جائے گا۔ دارا شکوہ زنانہ میں سے باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ مردہ کی سی حالت تھی اور کبھی اِس سے اور کبھی اُس سے کچھ کہتا اور ایک ادنیٰ سپاہی کے پاس بھی کھڑا ہو کر پوچھتا تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے اور جب اس نے دیکھا کہ ہر ایک کے چہرہ سے خوف کے آثار نمایاں ہیں تو یقین ہو گیا کہ غالباً ان میں سے ایک بھی میرا ساتھ نہ دے گا اور نہایت حیران تھا کہ اب کیا ہو گا اور مجھے کدھر جانا چاہئے

اور توقف کی حالت میں تو سراسر بربادی ہی بربادی نظر آتی تھی۔

اس تین دن کے عرصہ میں جبکہ میں اس شہزادہ کے ہمراہ تھا رات دن بلا توقف ہم کو کوچ کرنا پڑا اور گرمی اس شدت کی تھی اور اس قدر گرد و غبار اڑ تا تھا کہ دم گھٹا جاتا تھا اور میری بہلی کے تین عمدہ اور قد آور گجراتی بیلوں میں سے ایک مر چکا تھا اور ایک قریب المرگ تھا اور ایک اس قدر تھک گیا تھا کہ چلنے سے مجبور تھا اور اگرچہ دارا شکوہ بہت چاہتا تھا کہ میں اس کے ہمراہ رہوں خصوصاً اس وجہ سے کہ اس کی ایک بیگم کی ٹانگ میں ایک بہت بُری طرح کا زخم تھا لیکن وہ ایسی لاچاری کی حالت کو پہنچ گیا تھا کہ دھمکانے اور منت سماجت کرنے پر بھی کسی نے اس کو میری سواری کے لئے کوئی گھوڑا یا بیل یا اونٹ نہ دیا اور جب کوئی سواری میسر نہ آئی تو بناچارے میں پیچھے رہ گیا اور چار پانچ سو سواروں کے ساتھ اسے جاتے دیکھ کر جو گھٹتے گھٹتے اب صرف اسی قدر رہ گئے تھے میں بے اختیار رو پڑا مگر اب تک بھی وہ ہاتھی اس کے ساتھ تھے اور لوگ کہتے تھے کہ ان پر روپے اور اشرفیاں لدی ہوئی ہیں اور اس وقت میں سمجھتا تھا کہ وہ ٹھٹہ کی طرف جائے گا اور حالاتِ موجودہ کے لحاظ سے یہ تجویز شاید بُری بھی نہ تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ادھر بھی مصیبت تھی اور ادھر بھی۔ مجھے ہرگز یہ امید نہ تھی کہ وہ اس ریگستان سے جو احمد آباد اور ٹھٹہ کے بیچ میں ہے سلامت گزر جائے گا۔ چنانچہ واقعی ایسا ہی ہوا کہ اس کے ہمراہیوں میں سے اگرچہ عورتیں بھی بہت سی مر گئیں مگر مردوں پر تو یہ مصیبت گزری کہ بھوک پیاس' تکان اور بے رحم کولیوں کے ہاتھ سے کوئی ہی زندہ بچا۔ کاش! اس پُر آفت سفر میں اگر دارا شکوہ خود بھی مر جاتا تو میں اس کو بڑا ہی خوش نصیب کہتا۔ لیکن وہ ہر طرح کی مصیبتیں جھیلتا اور مرتا بھرتا آخر کار کچھ کے علاقہ میں جا پہنچا اور وہ اس سے بڑی مہماں نوازی سے پیش آیا اور کہا کہ اگر آپ اپنی بیٹی کی شادی میرے بیٹے سے کر دیں تو میری تمام فوج آپ کی مدد کو حاضر ہے لیکن جس طرح جے سنگھ کا منتر جسونت سنگھ پر اثر کر گیا تھا ویسا ہی اس پر بھی چل گیا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کے تیور بدلے ہوئے نظر آنے لگے اور دارا شکوہ کو بعض معقول وجوہ سے جب یہ اندیشہ ہوا کہ یہ وحشی میری جان ہی لینے کی فکر میں ہے تو فوراً ٹھٹہ کی طرف چل دیا۔

مصنف کی سرگزشت

اب اگر میں اپنا کل ماجرا جو میرے اور ان بدذات کولیوں کے باہم گزرا اور

جس ڈھنگ سے میں نے ان کو اپنی نسبت مہربان بنایا اور وہ تھوڑا سا روپیہ جو میرے پاس تھا بچایا بیان کروں تو غالباً اس کتاب کے پڑھنے والے دق ہو جائیں گے۔ پس مختصر یہ کہ میں نے اپنی طبابت کی بڑی تعریفیں کیں اور میرے دو نوکروں نے بھی جو اسی خوف میں مبتلا تھے جس میں میں تھا ان کو یہی جتایا کہ ہمارے آقا کی برابر کوئی حکیم دنیا میں نہیں ہے اور دارا شکوہ کے سپاہیوں نے اس کو ایسا ستایا ہے کہ جو کچھ قیمتی مال و اسباب اس کے پاس تھا وہ سب چھین لے گئے ہیں۔ قصہ مختصر ہماری بڑی ہی خوش نصیبی تھی کہ ہمارے اس کہنے سننے سے ان کے دل کسی قدر پسیج گئے اور ہم کو سات آٹھ روز تک روکے رکھنے کے بعد آخر کار ایک بیل ہماری گاڑی میں جوت کر ہم کو وہاں تک پہنچادیا جہاں سے احمد آباد کے بُرج نظر آتے تھے اور اس شہر میں میری ایک امیر سے ملاقات ہو گئی جو دہلی کو جاتا تھا اور میں اس کی پناہ میں یہاں تک چلا آیا اور راستہ میں آدمیوں اور ہاتھیوں اور گھوڑوں اور اونٹوں اور بیلوں کی لاشیں ہم کو جا بجا پڑی ہوئی نظر آئیں جو دارا شکوہ کی تباہ شدہ فوج کی مصیبتوں کا قصہ گویا زبانِ حال سے سنا رہی تھیں۔

راجہ سری نگر کا سلیماں شکوہ کو حوالہ نہ کرنا اور اورنگ زیب کی فوج کی اس پر چڑھائی اور ناکامیابی

جس زمانہ میں دارا شکوہ ٹھٹہ کے پُر مصیبت سفر میں مصروف تھا بنگالہ میں لڑائی بدستور جاری تھی اور سلطان شجاع اپنے دشمنوں کی امید سے بہت بڑھ کر ہمت اور کوشش دکھا رہا تھا لیکن اورنگ زیب کو ادھر کے معاملات کا چنداں اندیشہ نہ تھا کیونکہ میر جملہ کی دانشمندی اور خوش تدبیری اس کو بخوبی معلوم تھی اور بنگالہ اور آگرہ کے بُعدِ مسافت کی وجہ سے بھی یہ معاملہ سر دست زیادہ اہم نہ تھا البتہ جس بات کا اسے نہایت کھٹکا تھا وہ یہ تھی کہ سلیمان شکوہ نزدیک تھا اور یہ اندیشہ عموماً پھیلا ہوا تھا کہ سری نگر سے جہاں سے آگرہ آٹھ روز سے بھی کم کا راستہ ہے وہ اور راجہ فوج سمیت اترنے والے ہیں اور اورنگ زیب ایسا غافل نہ تھا کہ ایسے دشمن کو حقیر سمجھتا۔ پس اب اس کو زیادہ تر اسی بات کی فکر تھی کہ کس طرح سے اس کو اپنے قابو میں لائے۔ پس سب سے بہتر تدبیر اس نے یہ خیال کی کہ راجہ جے سنگھ ہی کی معرفت اس راجہ سے بھی کچھ بندوبست کیا جائے۔ چنانچہ

جے سنگھ نے اس کو اس مضمون کے خط پر خط لکھے کہ اگر آپ سلیمان شکوہ کو پکڑ کر بھیج دیں تو بڑے بڑے انعام ملیں گے ورنہ آپ کے حق میں بہت ہی برا ہوگا۔ مگر اس نے ان کا یہی جواب دیا کہ خواہ میرا تمام ملک چھن جائے مگر میں کبھی ایسی بے عزتی اور نامردی کی حرکت کا مرتکب نہ ہوں گا۔ پس جب اورنگ زیب نے دیکھ لیا کہ خواہ دھمکایا جائے، لالچ دیا جائے، یہ کسی طرح بھی اپنے اس شریفانہ طریق سے پھرنے والا نہیں تو اپنی فوج کو دامن کوہ کی طرف روانہ کیا اور بے شمار بیلدار پہاڑوں کو کاٹ کر راستہ ہموار اور فراخ کرنے کے لئے مامور کئے لیکن راجہ مخالفوں کی ان بے ہودہ کوششوں کو جو اس کے ملک میں داخل ہونے کے لئے کی جارہی تھیں عبث اور بچوں کا کھیل سمجھ کر ہنستا تھا اور فی الواقع اس کا ہنسنا بجا تھا۔ کیونکہ اگر اورنگ زیب جیسے چار بادشاہ جمع ہو کر اس کوہستان پر چڑھائی کرتے تو ان کڈھب پہاڑوں میں رسائی ناممکن تھی۔ چنانچہ آخر کار ایسا ہی ہوا کہ لاحاصل غصہ دکھانے کے بعد فوج واپس بلا لی گئی۔

دارا شکوہ کا ٹھٹھ کے قریب پہنچ جانا اور اورنگ زیب کے مقابلہ میں وہاں کے قلعہ دار کی ثابت قدمی

اس عرصہ میں دارا شکوہ ٹھٹھ کے نزدیک جا پہنچا تھا اور صرف دو ہی تین منزلیں باقی رہ گئی تھیں اور مجھ کو ان فرانسیسیوں اور کئی اور یورپی لوگوں کی زبانی جو اس قلعہ کی فوج میں تھے معلوم ہوا کہ یہاں پہنچ کر دارا شکوہ کو یہ خبر ملی کہ میر بابا نے جو مدت سے قلعہ کو گھیرے ہوئے تھا محصوروں کو یہاں تک تنگ کر دیا ہے کہ آدھ سیر گوشت یا چاول وغیرہ ڈھائی روپیہ سے زیادہ کو ہاتھ آتے ہیں اور باقی اجناس کی بھی سخت گرانی ہے۔ لیکن بہادر قلعہ دار اب تک اپنے انہی اوسانوں کے ساتھ ہے۔ بلکہ اکثر اوقات قلعہ سے باہر نکل کر دشمنوں پر اچھے خاصے حملے کرتا اور ہر طرح سے دانائی اور شجاعت اور نمک حلالی دکھاتا تھا اور ہمت کے ساتھ میر بابا کے سخت حملوں کو رد کرتا اور اورنگ زیب کی دھمکیوں اور وعدوں پر ہنستا ہے چنانچہ اس کے اس قابلِ تعریف کام کی ان بہت سے یورپی لوگوں نے بھی جو اس کی فوج میں تھے تصدیق کی اور مجھ سے یہ بھی کہا کہ جب اس کو دارا شکوہ کے قریب پہنچ جانے کی خبر ملی تو زیادہ داد و دہش کرنے لگا اور اس طرح پر سپاہیوں کا دل ایسا ہاتھ میں کر لیا کہ تمام اہلِ قلعہ محاصرین کو ہٹا کر دارا شکوہ کے قلعہ میں لے آنے کے واسطے

بخوشی اپنی جانیں لڑا دینے کو تیار تھے۔

اس کے علاوہ اس ذی ہوش سردار نے کئی طرح کی عمدہ تدبیروں سے بہت ہوشیار جاسوسوں کو میربابا کے لشکر میں بھیج کر محاصرین کو یہ یقین کرا دیا کہ دارا شکوہ ایک جرار فوج ساتھ لئے ہوئے محاصرہ اٹھا دینے کے ارادہ سے جلد پہنچنے والا ہے اور اس میں یہاں تک مبالغہ کیا کہ ہم دارا شکوہ اور اس کی فوج کو بچشم خود دیکھ کر آئے ہیں۔ چنانچہ یہ منصوبہ ایسی خوبی سے چل گیا کہ ان کے چھکے چھوٹ گئے اور کچھ شک نہیں کہ اگر دارا شکوہ اس وقت آپہنچتا تو میربابا کا لشکر ضرور تتر بتر ہو جاتا۔ بلکہ ان میں سے بعض لوگ اس سے آن ملتے لیکن اس کی قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا کہ کسی مہم میں بھی سرسبز نہ ہو۔ پس یہ سمجھ کر کہ ان چند آدمیوں کے ساتھ محاصرہ کا اٹھادینا ناممکن ہے پہلے تو اس کا یہ ارادہ ہوا کہ دریائے سندھ سے اتر کر ایران کو چلا جائے اگرچہ اس تجویز کا عمل میں آنا بھی بہت ہی مشکل تھا۔ کیونکہ پٹھانوں اور بہت سے ایسے چھوٹے سرداروں کے ملک میں سے جانا پڑتا جو نہ ایران ہی کے مطیع ہیں اور نہ ہندوستان ہی کے اور بیچ میں ایسا بیاباں حائل تھا کہ جس میں پانی میسر آنا بھی مشکل تھا۔ لیکن ان امور سے قطع نظر اس کی بیگم نے ایک ضعیف اور واہیات سی بات کہہ کر اس کا یہ ارادہ ترک کرادیا۔ یعنی یہ کہہ دیا کہ اگر آپ ایران کا قصد کریں گے تو خوب سمجھ لیجئے کہ مجھ کو اور میری بیٹی دونوں کو شاہ ایران کی لونڈیاں بننا پڑے گا! اور یہ ایک ایسی بے عزتی ہے کہ ہمارے خاندان میں سے کسی کو بھی گوارا نہ ہوگی۔ اور اس بات کو بیگم اور دارا شکوہ دونوں بھول گئے کہ ہمایوں جب ایسی ہی مصیبتوں میں مبتلا ہو کر ایران گیا تھا اور اس کی بیگم بھی ساتھ تھی تو کوئی نازیبا سلوک اس سے نہ ہوا تھا۔ بلکہ بہت ہی تعظیم و تکریم اور خاطر و مدارات ہوئی تھیں۔ القصہ دارا شکوہ کو اس کشش و پنج اور تذبذب کی حالت میں یہ خیال آیا کہ جیون خاں پٹھان کے پاس جانا بہتر ہے جو کسی قدر ذی شہرت اور باوقعت سردار ہے اور اس کا علاقہ چنداں دور بھی نہ تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ اس کی بغاوت اور سرکشی کی وجہ سے شاہ جہان نے دو مرتبہ اس کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا ڈالنے کا حکم دیا تھا اور دونوں ہی دفعہ صرف دارا شکوہ کی سفارش سے جان بچی تھی اور اس کے پاس جانے سے مقصود یہ تھا کہ کچھ فوج کی مدد لے کر میربابا کو قلعہ ٹھٹھہ سے ہٹائے اور وہ خزانہ جو وہاں کے قلعہ دار کی تحویل میں تھا اس کو لے کر قندھار چلا جائے اور وہاں سے بآسانی کابل پہنچ جائے اور اس کو یقین تھا کہ میرے وہاں پہنچ

جانے پر مہابت خاں صوبہ دار کابل (جو ایک بڑا مقتدر امیر تھا اور کابل والے اس سے بہت مانوس تھے) بلا تامل اور بڑی سرگرمی سے میری رفاقت اختیار کرلے گا اور چونکہ کابل کی صوبہ داری اس کو اسی کی وساطت سے ملی تھی اس لئے یہ توقع کچھ بے وجہ بھی نہ تھی کہ وہ خلوص اور صداقت سے پیش آئے گا اور اس کے کام میں دل سے کوشش کرے گا۔ لیکن داراشکوہ کی مستورات میں اس کے اس عزم سے بہت ہی مضطرب اور فکر مند ہوئیں اور انہوں نے بہزار منت وزاری اس کو سمجھایا کہ ملک جیون کے ہاں جانا مصلحت نہیں ہے۔ بلکہ بیگم اور اس کی بیٹی اور بیٹے سپہر شکوہ نے پاؤں پر گر گر کر اور رو رو کر اس ارادہ سے باز آنے کے لئے التجا کی اور کہا کہ یہ پٹھان ایک مشہور سرکش اور لٹیرا ہے، ایسے شخص پر بھروسہ کرنا اپنی موت آپ خریدنا ہے اور یہ بھی سمجھایا کہ ٹھٹھ کا محاصرہ اٹھانا کچھ ایسا ضروریات سے نہیں ہے اس مہم کی جوکھوں میں پڑے بغیر بھی آپ کابل کی راہ لے سکتے ہیں۔ کیونکہ یقین ہے کہ میر بابا ٹھٹھ کا محاصرہ چھوڑ کر آپ کا راستہ روکنے نہ آئے گا۔ مگر چونکہ داراشکوہ کی الٹی سمجھ ہمیشہ ہی سیدھی راہ سے اس کو بھٹکا دیتی تھی یہ معقول باتیں بالکل اس کی سمجھ میں نہ آئیں اور بولا کہ کابل کا سفر نہایت خطرناک اور مشکل ہے (جو فی الواقع سچ تھا) اور کہا کہ جس شخص کی جان میں نے اس طرح سے بچائی ہو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ایسی خیانت کرے؟ پس باوجود ان کی اس قدر التجا اور منت وزاری کے اس کے ہاں چلا ہی گیا(۱۰۳) اور افسوس کہ اس بات کو بہت جلد ثابت کر دکھایا کہ بدذات آدمی اپنی غرض کے لئے کسی بدنامی کی مطلق پرواہ کر کے اپنے محسنوں اور خیر خواہوں کی جان لینے کو کیسے بلادریغ تیار ہو جاتے ہیں! چنانچہ یہ پٹھان جب تک یہ سمجھتا رہا کہ داراشکوہ کے ساتھ ایک بڑا لشکر آتا ہوگا اس وقت تک تو بظاہر تعظیم و تکریم سے پیش آیا اور شہزادہ کے ہمراہی سپاہیوں کو لوگوں کے مکانوں میں اتروادیا اور بہت تاکید کی کہ جو کچھ ان کو درکار ہو حاضر کریں اور برادرانہ اور دوستانہ سلوک سے پیش آئیں۔ لیکن جب یہ معلوم ہو گیا کہ دو تین سو آدمی سے زیادہ ساتھ نہیں ہیں تو فوراً آنکھیں بدل لیں اور یہ امر تحقیق نہیں ہوا کہ اس نے یہ حرکت اورنگ زیب کی ترغیب سے کی یا خود ہی اس سخت خیانت کا مرتکب ہوا۔ مگر ظن غالب یہ ہے کہ اشرفیوں سے لدی ہوئی چند خچریں جو قزاقوں کی روزمرہ کی لوٹ مار سے اب تک بچی ہوئی تھیں ان کو دیکھ کر اسے لالچ آ گیا۔ بہرحال اس نے یہ بدذاتی کی کہ رات کے وقت بہت سے ہتھیار بند آدمی جمع کر کے اوّل سب روپیہ پیسہ مستورات کے

زیور اور جواہرات سمیت چھین کر قابو کر لیا اور پھر دارا شکوہ اور سپہر شکوہ پر آحملہ کیا اور جن لوگوں نے ان کو بچانا چاہا انہیں قتل کر ڈالا اور دارا شکوہ کو باندھ کر ہاتھی پر چڑھا دیا اور ایک جلاد اس غرض سے پیچھے بٹھا دیا کہ اگر وہ یا اس کا کوئی طرفدار ذرا بھی ہاتھ پاؤں ہلائے تو فوراً شہزادہ کا سر اڑا دے اور ایسی بے عزتی کے ساتھ میر بابا کے لشکر میں جو ٹھٹہ کو گھیرے ہوئے تھا، لا کر اس کے سپرد کر دیا اور میر بابا (۱۰۴) نے حکم دیا کہ اس کو لاہور ہوتا ہوا دہلی لے جائے۔

دارا شکوہ کا گرفتار ہو کر دہلی میں پہنچنا اور بڑی بے عزتی کے ساتھ تشہیر کیا جانا

الغرض جب بد نصیب دارا شکوہ دہلی کے قریب پہنچا تو اورنگ زیب نے اپنے اہلِ دربار سے اس امر میں مشورہ کیا کہ قلعہ گوالیار میں بھیجنے سے پہلے اسے تشہیر کرنا چاہئے یا نہیں؟ پس بعض کی تو رائے یہ تھی کہ ایسی حرکت مناسب نہیں کیونکہ اوّل تو ایسا امر خاندانِ شاہی کی عزت کے بر خلاف ہے۔ دوسرے اس میں شورش اور فساد کے ہو جانے کا احتمال ہے اور کچھ تعجب نہیں کہ لوگ اسے چھڑا لیں۔ لیکن اکثر کی یہ رائے ہوئی کہ نہیں ضرور تشہیر کرنا چاہئے تاکہ لوگوں کو خوف اور عبرت ہو اور ان کے دلیر بادشاہ کی شوکت اور دبدبہ کا نقش ہو جائے اور بعض امرا اور اَور لوگوں کو جو اس کے گرفتار ہو جانے کے باب میں اب تک شبہ ہے وہ رفع ہو جائے اور اس کے مخفی جانب داروں کی امیدیں بالکل قطع ہو جائیں۔ چنانچہ اورنگ زیب نے بھی اسی رائے کو مناسب جانا اور تشہیر کا حکم دیا۔ پس یہ بد نصیب قیدی اور اس کا بیٹا سپہر شکوہ دونوں ایک ہی ہاتھی پر برابر بٹھائے گئے اور جلاد کی جگہ بہادر خاں کو پیچھے بٹھایا گیا اور تشہیر کیا گیا (۱۰۵) مگر یہ وہ سراندیپ یا پیگو کا ہاتھی نہ تھا جس پر دارا شکوہ ایک نہایت عمدہ اور زرق برق عماری میں سواری کیا کرتا تھا اور پُر زر جھول اور سونے کا ساز پڑا ہوا ہوتا تھا۔ بلکہ ایک نہایت ہی سڑیل اور میلا کچیلا جانور تھا اور خود اس کے گلے میں بھی اب نہ وہ بڑے بڑے موتیوں کی مالا ہی تھی جو ہندوستان کے بادشاہ اور شہزادے پہنا کرتے ہیں اور نہ وہ مکلف اور عمدہ پگڑی اور قبائے زربفت ہی۔ بلکہ باپ بیٹا دونوں میلے اور موٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور ایک کشمیری اونی کپڑے کا بہت حقیر سا عمامہ جو ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے پہننے میں آتا ہے سر پر تھا۔ غرضیکہ اس حال

سے تمام شہر اور بازاروں میں پھرایا گیا اور بار بار مجھ کو یہ وہم ہوتا تھا کہ غالباً اب یہاں کچھ کشت و خون ہو جائے گا اور سخت متعجب تھا کہ ایسے شہزادے کے لئے جس کو عوام الناس نہایت عزیز جانتے ہیں ایسی بے عزتی تجویز کرنے کی جرأت اہلِ دربار کو کیونکر ہوئی اور حفاظت کے لئے کچھ مسلح فوج ساتھ نہ دیکھ کر اور بھی تعجب ہوتا تھا۔ خصوصاً اس حالت میں کہ اورنگ زیب کی ناشائستہ اور خلافِ انسانیت حرکتوں سے سب لوگ کچھ عرصہ سے بالکل ناراض تھے۔ یعنی اوّل باپ اور بیٹے (محمد سلطان) اور پھر بھائی (مراد بخش) کو قید کر لینے کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں نہایت نفرت اور بے زاری پیدا ہو گئی تھی۔

اس نالائق تماشے کے دیکھنے کو ایک بھیڑ جمع ہو گئی تھی اور لوگ جا بجا رو رہے اور داراشکوہ کی بد قسمتی پر ترس کھا رہے تھے چنانچہ میں بھی شہر کے سب سے بڑے بازار میں ایک اچھے موقع پر مع اپنے دو رفیقوں اور دو خدمت گاروں کے عمدہ گھوڑے پر چڑھا کھڑا تھا اور ہر طرف سے رونے اور چلانے کی آواز آ رہی تھی اور عورتیں اور مرد اور بچے اس طرح چلا چلا کر رو رہے تھے کہ گویا ان پر کوئی بڑی ہی مصیبت پڑی ہے اور جیون خاں گھوڑے پر سوار بد نصیب داراشکوہ کے برابر جاتا تھا اور چاروں طرف سے اس پر گالیوں اور لعن طعن کی بوچھاڑیں پڑ رہی تھیں بلکہ کئی ایک فقیروں اور غریب آدمیوں نے تو پٹھان پر پتھر بھی پھینکے۔ لیکن پیارے اور عزیز شہزادہ کے چھڑا لینے کی کسی کو جرأت نہ پڑی۔

داراشکوہ کا قتل اور سپہر شکوہ کا قلعہ گوالیار میں قید کیا جانا

جب یہ نازیبا سواری شہر میں گشت کر چکی تو بے چارہ قیدی اسی کے ایک باغ میں جس کا نام حیدر آباد (۱۰۶) ہے، قید کیا گیا۔ مگر اس کی تشہیر کی ناشائستہ حرکت کا جو اثر عام خلائق کے دل پر ہوا اور لوگ جیون خاں پر جس قدر غضبناک ہوئے اور اس کو پتھر مار مار کر مار ڈالنا چاہا اور شورش اور بلوۂ عام ہو جانے کا اندیشہ ہوا، وہ اورنگ زیب نے جلد سن لیا اور اس لئے پھر ایک مجلس منعقد ہوئی اور اس امر میں مشورہ ہوا کہ پہلی تجویز کے موافق گوالیار بھیج دینا چاہئے یا فوراً قتل کر ڈالنا بہتر ہے۔ پس بعض کی رائے تو یہ تھی کہ قتل کی کوئی ایسی قوی ضرورت نہیں اور گوالیار بھیج دینے میں بشرطیکہ حفاظت کے لئے کافی جمعیت ساتھ ہو کوئی اندیشہ نہیں۔ چنانچہ دانشمند خاں نے باوجود اس نااتفاقی کے جو داراشکوہ کے ساتھ چلی آتی تھی بڑے اصرار اور بہت سے دلائل کے ساتھ اس

کے گوالیار بھیج دینے ہی پر زور دیا مگر آخر کار کثرت رائے اسی پر آن کر ٹھہری کہ اس کو قتل کیا جائے اور سپہر شکوہ کو گوالیار بھیج دیا جائے۔ اس موقع پر روشن آرا بیگم نے بھی وہ دلی عداوت جو اس کو اپنے اس بے بس بھائی سے تھی نہایت شدت سے ظاہر کی۔ چنانچہ دانشمند خاں کی رائے کو برابر رَد کرتی اور اورنگ زیب کو اس بے رحمانہ اور خلافِ انسانیت قتل کے وقوع میں آنے کے لئے بہت ہی ابھارتی رہی اور خلیل اللہ خاں اور شائستہ خاں جو دونوں دارا شکوہ کے قدیمی دشمن تھے، یہ بھی اُسی کی رائے کی تائید کرتے تھے اور تقرب خاں جس کا نام حکیم داؤد تھا اور کسی الزام کی وجہ سے ایران سے بھاگ کر یہاں آ گیا تھا اور جو ابتدا میں صرف ایک طبیب تھا اور امرا کے دستر خوانوں پر خوشامدی ٹکڑے کھایا کرتا تھا اور تھوڑے ہی دنوں سے امارت کے درجہ کو پہنچا تھا، بڑے زور سے ان کا ہم داستان تھا۔ چنانچہ اس نے اس مجلس میں سب سے بڑھ کر سخت زبانی کی اور بڑے دعوے کے ساتھ یہ الفاظ منہ سے نکالے کہ "دارا شکوہ کو زندہ چھوڑنا ہرگز مناسب نہیں اور سلطنت کی سلامتی اور حفاظت اسی میں ہے کہ فوراً گردن مارا جائے اور مجھے تو اس کے قتل کی صلاح دینے میں ذرا بھی تامل نہیں کیونکہ وہ علانیہ بے دین اور کافر اور مرتد ہے اور اگر ایسے شخص کے قتل سے کچھ گناہ عائد ہو تو میری گردن پر"۔ چنانچہ انتقامِ الٰہی ملاحظہ کیجئے کہ جیسا اس کے منہ سے نکلا تھا فی الواقع ویسا ہی ہوا یعنی یہ خونِ ناحق اسی کے سر پڑا اور جلد بے عزت اور ذلیل ہو کر آخر کار بڑے عذاب سے مارا گیا(۱۰۷)۔ القصہ اس ناشائستہ اور نہایت بے رحمانہ قتل کے لئے نذیر (۱۰۸) نامی ایک غلام جو شاہ جہاں کا پروردہ اور کسی بد سلوکی کے باعث دارا شکوہ سے رنجیدہ تھا مقرر ہوا۔ چنانچہ زہر دے دینے کے اندیشہ سے وہ اور سپہر شکوہ اپنے ہاتھ سے بیٹھے دال پکا رہے تھے کہ یکایک یہ چار اور بد ذاتوں کو ساتھ لئے ہوئے پہنچا جنہیں دیکھ کر دارا شکوہ نے سپہر شکوہ کو پکار کر کہا کہ لو بیٹا "ہمارے قاتل آ پہنچے" اور یہ کہہ کر اگرچہ اس نے باورچی خانہ کی ایک چھوٹی سی چھری اٹھالی کیونکہ کوئی اور ہتھیار پاس نہ تھا۔ مگر ان جلادوں میں سے ایک نے تو سپہر شکوہ کو قابو کر لیا اور باقی اس کو لپٹ گئے اور زمین پر گرا کر تین نے تو پکڑے رکھا اور نذیر نے سر کاٹ لیا! اور فوراً اورنگ زیب کے پاس لے گیا اور اس نے ایک طشت میں رکھوا کر چہرہ کا خون دھلوایا اور جب دیکھ لیا کہ حقیقت میں اسی کا سر ہے تو آنکھوں سے آنسو نکال کر بولا "اے بدبخت" اور پھر کہا کہ اچھا اس دردانگیز صورت کو میرے سامنے سے جلد لے

جا کر ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کر دو۔ اب دارا شکوہ کے کنبہ کا حال سنئے کہ اس کی بیٹی تو اسی رات کو محل میں بھیج دی گئی جو کچھ دنوں بعد شاہ جہاں اور بیگم صاحب کی التجا سے ان کے سپرد کر دی اور اس کی بیگم نے پہلے ہی یہ سوچ کر کہ ہم پر کیسی آفتیں پڑنے والی ہیں راستہ ہی میں بمقام لاہور اپنی زندگی کا خاتمہ زہر سے کر دیا تھا۔ رہا سپہر شکوہ، سو اسے گوالیار کے قلعہ میں بھیج دیا گیا۔(۱۰۹)

جیون خاں کا دہلی سے رخصت کیا جانا اور وطن کے قریب پہنچ کر چوروں کے ہاتھ سے قتل کیا جانا

ان دردناک واقعات کے بعد جیون خاں فوراً حضور میں بلایا گیا اور چند چیزیں انعام دے کر دہلی سے رخصت کیا گیا۔ لیکن یہ شخص بھی اپنی بد کرداری کا نتیجہ پائے بغیر نہ رہا۔ یعنی جبکہ وہ دہلی سے واپس ہو کر ایسی جگہ پہنچ گیا تھا کہ جہاں سے اس کا علاقہ دس بارہ ہی کوس کے فاصلہ پر تھا تو چند آدمیوں نے جو پہلے سے ایک جنگل کے اندر گھات میں لگے ہوئے تھے اسے مار ڈالا۔

افسوس! اس جنگلی شخص نے یہ نہ سوچا کہ اگرچہ ظالم لوگ اپنی مطلب براری کے لئے بڑے سے بڑے گناہوں کی نسبت بھی بظاہر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ لیکن دل میں اس کے عمل میں لانے والوں سے سخت نفرت رکھتے ہیں اور جب مطلب نکل آتا ہے تو ان کے اعمال کی سزا دینے میں کچھ بھی تامل نہیں کیا کرتے۔

دارا شکوہ کے قتل سے کچھ عرصہ پہلے اُس سے اُس بہادر اور وفادار خواجہ سرا کے نام جو اُس کی طرف سے ٹھٹھہ میں لڑ رہا تھا جبراً اس مضمون کا ایک حکم نامہ حاصل کر لیا گیا تھا کہ فوراً قلعہ حوالہ کر دے۔ لیکن اس نے کچھ جلدی نہ کی بلکہ اس بات پر اڑا رہا کہ قلعہ کے خالی کرنے سے پہلے حفظ عزت وغیرہ کی چند معقول شرطیں دی جائیں۔ جن کو میر بابا نے دغابازی اور بے ایمانی سے بلا قصد ایفا بہت خوشی سے قبول کر لیا اور شہر میں داخل ہو گیا مگر جب اپنے تھوڑے سے بہادر رفیقوں کے ساتھ یہ نمک حلال شخص لاہور میں آیا تو خلیل اللہ خاں نے جو اس وقت یہاں کا صوبہ دار تھا نہایت بری طرح سے سب کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اس ظالمانہ فعل کا سبب یہ تھا کہ اگرچہ بظاہر یہی کہتا تھا کہ ہم یہاں سے دہلی کو جائیں گے (کیونکہ اورنگ زیب اس کی شجاعت اور بہادری کی وجہ سے اسے دیکھنا چاہتا تھا)

لیکن اصلی ارادہ یہ تھا کہ ہمراہیوں سمیت سری نگر پہنچ کر سلیمان شکوہ سے جا ملے۔ اس کے رفیقوں میں بہت سے یورپی لوگ بھی تھے جن کو مع اپنے اور رفقا کے اس نے بہت سے انعام واکرام دیئے تھے۔

سلیمان شکوہ کا گرفتار ہو کر دہلی میں آنا

دارا شکوہ کے خاندان میں اب صرف سلیمان شکوہ باقی رہ گیا تھا اور اگر راجہ کو اپنے وفائے عہد اور ایمانداری کا خیال ہوتا تو اس کا سری نگر سے نکالنا آسان نہ تھا۔ لیکن جے سنگھ کے منصوبوں اور اورنگ زیب کے وعدوں اور دھمکیوں اور دارا شکوہ کے قتل اور قرب وجوار کے راجاؤں کی جنگی تیاریوں نے اس چھوٹے دل کے راجہ کو آخر کار ڈرا دیا۔ چنانچہ جب سلیمان شکوہ یہ دیکھ کر کہ یہاں اب کچھ بھروسہ نہیں ہے باوجود اس کے کہ راستہ ایک ایسے کڈھب اور بے موقع ملک میں کو تھا جہاں سوائے ویران پہاڑوں کے کچھ نہ تھا بڑی تبت کی طرف چلے جانے کے قصد سے چل دیا تو راجہ کے بیٹے نے پیچھا کر کے آن لیا اور زخمی ہو کر پکڑا گیا اور دہلی پہنچادیا گیا اور قلعہ سلیم گڈھ میں جہاں پہلے سے مراد بخش قید تھا، قید کیا گیا (۱۱۰)۔ اور اورنگ زیب نے پہچاننے کی غرض سے، جس طرح دربار میں دارا شکوہ کا سر منگوایا تھا اور اسی طرح اور اُسی غرض سے سلیمان شکوہ کے لئے حکم دیا کہ دربار کے وقت تمام امرا کی موجودگی میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ میں بھی اس نازیبا تماشے کے دیکھنے کو گیا تھا اور جس شوق اور تعجب سے میں نے اسے دیکھا اس کا بیان کرنا دشوار ہے۔ یعنی دربار میں لانے سے پہلے بیڑی تو نکال دی گئی تھی لیکن ہتھکڑی جس پر سنہری ملمع کیا ہوا تھا بدستور موجود تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس سرو قد اور نہایت حسین وجمیل جوان کو دیکھ کر اکثر اہلِ دربار کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے اور وہ بیگمیں بھی جن کو دیوار کی جالیوں میں سے دیکھ لینے کی اجازت دی گئی تھی بہت ہی غمگین ہوئیں۔ بلکہ اورنگ زیب نے بھی بھتیجے کی بدبختی پر افسوس کیا اور ظاہرا شفقت سے بولا کہ خدا پر نظر رکھو اور مطمئن رہو کہ تم کو کچھ ضرر نہ پہنچے گا اور مہربانی کی جائے گی اور تمہارا باپ تو صرف اس وجہ سے قتل ہوا ہے کہ وہ کافر اور لامذہب ہو گیا تھا۔ اس پر شہزادہ نے تسلیمات کی یعنی ہندوستان کی رسم کے موافق ادائے شکر کی علامت کے طور پر تامقدور جھک کر اپنے دونوں ہاتھ سر تک لایا اور اس کے بعد بڑے استقلال سے یہ عرض کیا کہ اگر حضور کا

یہ منشا ہو کہ مجھے پوست پلائے جایا کریں تو بہتر ہے کہ ابھی قتل کرا دیا جاؤں۔ جس کے جواب میں اورنگ زیب نے بطورِ مستحکم وعدہ کے پکار کر کہا کہ نہیں تم کو پوست ہر گز نہیں پلائے جائیں گے، بالکل اطمینان رکھو جس پر اہلِ دربار کے کہنے سے اس نے دوبارہ تسلیمات کی اور اس کے بعد جب بادشاہ کی خواہش کے موافق اس ہاتھی کے معاملہ میں چند باتیں پوچھ لی گئیں جس پر اشرفیاں لدی ہوئی تھیں اور سری نگر جانے کے وقت اس سے چھن گیا تھا تو اس کو دیوانِ عام سے لے گئے اور اگلے روز گوالیار کو روانہ کر دیا۔

قیدی شہزادوں کو جس غرض سے پوست پلائے جاتے تھے، اُن کا ذِکر

''پوست'' سے جس کا ذِکر میں نے ابھی کیا یہ مراد ہے کہ خشخاش کے چھلکے کو پانی میں بھگو کر اور مل کر نچوڑ لیا جاتا ہے اور ایک بڑا سا پیالہ بھر کر ہر روز نہار منہ ان شہزادوں کو پلایا جاتا ہے، جو اس وجہ سے گوالیار کے قلعہ میں قید کئے جاتے ہیں کہ ان کا علانیہ سر کٹوا دینا بادشاہ خلاف مصلحت جانتا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ تاوقتیکہ اسے نہ پی لیں ان کو کھانا نہیں دیا جاتا۔ چنانچہ یہ پوستوں کا عرق ان بے چارے قسمت کے مارے مظلوموں کو رفتہ رفتہ بالکل نچوڑ ڈالتا اور عقل و توانائی دونوں پر پانی پھیر دیتا ہے اور آخر کار گئے گزرے اور حواس باختہ ہو کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اس پوست کے پیالہ ہی سے سپہر شکوہ اور مراد بخش کے پوتے اور سلیمان شکوہ کو موت کا کڑوا گھونٹ پلایا گیا تھا۔ (۱۱۱)

سلطان مراد بخش کا قتل کیا جانا

مراد بخش اگرچہ قید تھا لیکن لوگوں کو اس سے اب بھی بہت محبت تھی اور اس کی شجاعت اور سپہ سالاری کی تعریف میں شعرا اکثر اشعار اور قصیدے کہا کرتے تھے۔ اس لئے اورنگ زیب کی مصلحت ملکی کا یہ اقتضا ہوا کہ وہ بھی علی الاعلان گردن مارا جائے تاکہ اس کے کسی طرف دار کے دل میں یہ امید باقی نہ رہے کہ ابھی وہ زندہ ہے اور چونکہ پوست پلا پلا کر مخفی طور پر جان لے لینے سے یہ مدعا حاصل نہیں ہو سکتا تھا اس لئے یہ تدبیر نکالی گئی کہ کوئی الزام قائم کر کے اس کی سزا کے طور پر علانیہ قتل کرا دیا جائے اور یہ امر کچھ مشکل ہی نہ تھا کہ اس بد نصیب شہزادہ کی نسبت کوئی الزام پیدا کر لیا یا گھڑ لیا جائے۔ چنانچہ ایک سید کے لڑکے (جن کے باپ کو اس کے مال و دولت کے لالچ سے اس نے اس وقت احمد

آباد میں مروا ڈالا تھا جبکہ اس لڑائی کے لئے تیاریاں کر رہا تھا) دربار میں استغاثہ کو آن موجود ہوئے جو پکار پکار کر اور دہائی دے دے کر انصاف مانگتے اور یہ عرض کرتے تھے کہ قصاص کے طور پر اس کا سر کاٹا جائے اور کسی امیر میں یہ جرأت کہاں تھی کہ ان فریادیوں کو ہٹا سکے کیونکہ ایک تو وہ بے گناہ مقتول سید اولاد رسول تھا جن کی لوگ بہت تعظیم کرتے ہیں دوسرے ہر کسی کو معلوم تھا کہ انصاف کے پردہ میں رقیب کی ہلاکت کے لئے یہ ایک بادشاہی منصوبہ ہے۔ پس مقتول سید کے بیٹوں کا دعویٰ مسموع اور قبول ہوا اور بغیر کسی قسم کی کارروائی اور ضابطہ عدالت کے فوراً حکم دیا گیا تھا کہ قصاص میں قاتل کا سر کاٹا جائے اور مستغیث یہ حکم لے کر گوالیار کو چلتے ہوئے۔ (۱۱۲)

سلطان شجاع کے حالات کا اخیر بیان اور اس کا ڈھاکہ کو بھاگ جانا اور راجہ اراکان سے پناہ کا طالب ہونا

اب یہ پُر درد کہانی خاتمہ کے قریب آ پہنچی ہے۔ کیونکہ تمام خاندان شاہی میں سے اب صرف سلطان شجاع ہی ایک ایسا شخص باقی رہ گیا تھا جو اورنگ زیب کو دہشت اور فکر میں ڈالے رکھتا تھا اور اب تک بڑی ہمت اور جوانمردی دکھاتا رہا تھا۔ مگر اب اس نے بھی دیکھ لیا کہ اورنگ زیب کی طاقت اور اقبال کا مقابلہ ناممکن ہے۔ کیونکہ میر جملہ کے پاس برابر کمک پہنچتی رہتی تھی اور اس کی فوجوں نے شجاع کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ پس جان بچانے کی خاطر ڈھاکہ کو بھاگ گیا جو سمندر کے کنارے بنگالہ کا سب سے اخیر شہر ہے۔ اب یہاں اس کے پاس نہ تو کوئی جہاز ہی تھا کہ سمندر پار ہو جائے اور نہ یہ جانتا تھا کہ پناہ کی خاطر کس طرف جائے اس لئے اس نے اپنا بڑا بیٹا سلطان باقی (۱۱۳) ملک اراکان (۱۱۴) کے بت پرست راجہ کے پاس (جس کو مگہ لوگوں کا ملک بھی کہتے ہیں) اس درخواست سے روانہ کیا کہ اگر چند روز پناہ دے سکو تو ہم تمہارے پاس آ جائیں او جب ہوائے موافق کے چلنے کا موسم آ جائے تو مخا تک پہنچ جانے کے لئے ایک جہاز بہم پہنچا دو تا کہ ہم اوّل مکہ اور پھر وہاں سے روم یا ایران کو چلے جائیں۔ راجہ نے یہ درخواست قبول کی اور بہت مہربانی سے پیش آیا۔ چنانچہ سلطان باقی بہت سی کشتیاں (جن کے ملاح یورپی لوگ یعنی گوا وغیرہ سے بھاگے ہوئے وہ پرتگیز اور آوارہ گرد عیسائی تھے جنہوں نے اس راجہ کی نوکری کر لی تھی اور جن کا بڑا پیشہ بنگالہ کے ان ضلعوں کو لوٹتے رہنا تھا جو ڈھاکہ اور اراکان کی جانب

سمندر کے قریب ہیں) ساتھ لے کر واپس آیا اور شجاع اپنی بیگم (۱۱۵) اور تینوں بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ ان پر سوار ہو کر اراکان کو چلا گیا اور راجہ نے اگرچہ اس کی خاطر تواضع کچھ بہت بڑھ کر تو نہ کی مگر ضرورت کی معمولی چیزیں مہیا و موجود کرا دیں۔

راجہ کا آئندہ طرزِ سلوک اور میر جملہ کے توڑ جوڑ اور شہزادہ کا بیٹی کی شادی کر دینے کے پیغام سے مجبور ہو کر راجہ پر حملہ کرنے کی تدبیر کرنا اور راز کا کھل جانا اور شجاع کا انجامِ کار

اب یہاں اگرچہ کئی مہینے گزر گئے اور ہوائے موافق کا موسم بھی آگیا مگر مخا جانے کے لئے جہاز بہم پہنچا دینے کا کسی نے ذکر تک نہ کیا۔ حالانکہ شجاع صرف اتنی بات کا خواستگار تھا کہ ایک جہاز کرایہ پر مل جائے۔ کیونکہ اس کے پاس زر و جواہر خوب موجود تھا۔ بلکہ غالباً اس کی ہلاکت کا بڑا باعث یہ دولت ہی ہوئی۔

اصل یہ ہے کہ یہ وحشی بادشاہ اور راجہ سچی مروّت اور فیاضی کو جانتے ہی نہیں اور اپنے وعدوں کی پابندی اور ایفا کا شاذ و نادر ہی خیال کرتے ہیں بلکہ بالفعل کی غرض کو مقدم سمجھ کر اسی کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور اس شیطنت اور قساوت کے نتیجوں کی طرف سے جو اکثر خود انہی کو بھگتنے پڑتے ہیں مطلقاً بے پروا نظر آتے ہیں اور ان کے ہاتھ سے یا تو مفلسی جا سکتی ہے یا اس قدر زور جو اُن کی طاقت سے زیادہ ہو۔

غرض شجاع کی طرف سے مخا جانے کے لئے بہتیری ہی التجائیں ہوئیں لیکن یہ جنگلی راجہ اصلاً ملتفت نہ ہوا بلکہ یہاں تک بے مروت اور گستاخ ہو گیا کہ شہزادہ کی نسبت یہ عتاب ظاہر کیا کہ اب تک ہم سے ملنے کو کیوں نہیں آیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ شجاع نے کسر شان کے خیال سے اس بت پرست سے ملاقات نہیں کی تھی یا اس خوف سے اس کے مکان پر نہیں گیا تھا کہ مبادا گرفتار کر لے اور سب مال و اسباب لوٹ لے۔ اسی اثنا میں راجہ کو میر جملہ نے بھی شجاع کے پکڑ کر حوالہ کر دینے کی شرط پر اورنگ زیب کی طرف سے بہت سے فائدوں اور زرِ کثیر کے حاصل ہونے کی طمع دِلا بھیجی تھی۔ بہر حال راجہ کی خفگی رفع کرنے کو اگرچہ سلطان شجاع خود تو اب بھی اس کے مکان پر نہ گیا مگر سلطان باقی کو بھیج دیا۔

کہتے ہیں کہ جب یہ شہزادہ راجہ کے محل کے قریب پہنچا تو سر سواری غریب غربا کی طرف بہت سے روپے اور اشرفیاں (۱۱۶) پھینکیں اور جب راجہ کے پاس پہنچا تو بہت سے زربفت وغیرہ کے تھان اور مرصع زیور پیشکش کیے اور اپنے باپ کے بذاتِ خود حاضر نہ ہونے کی نسبت یہ عذر کیا کہ وہ علیل ہیں اور بڑی التجا سے درخواست کی کہ وہ جہاز جس کے بہم پہنچادینے کے لئے اتنے دنوں سے وعدے ہوتے رہے ہیں اب تو بہت ہی جلد عنایت ہو۔ مگر اس ملاقات سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا اور پہلی درخواستوں کی طرح یہ درخواست بھی بالکل یوں ہی گئی اور اس وحشی نے اپنا وعدہ مطلق وفا نہ کیا بلکہ اس عالی منزلت پناہ گیر کی پریشانی اور رنج بڑھانے کے لئے اس سے پانچ ہی چھ روز بعد صاف صاف یہ سوال دے دیا کہ اپنی بیٹی کی شادی ہم سے کردو۔ اور شجاع کے اس سے انکار کرنے پر ایسا غضب ناک ہوا کہ شہزادہ کی حالت نہایت پُرخطر ہوگئی۔ اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا گویا ہلاکت کا منتظر رہنا تھا اور سفر کا موسم گزرا جاتا تھا اور اس لئے کوئی نہ کوئی اخیر بات قرار دینی ضروری تھی۔ پس اس نے ایک ایسی تدبیر سوچی جس سے فضول تر کوئی حرکت نہ تھی اور جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی ناامیدی کس حالت کو پہنچ گئی تھی اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ اراکان کا راجہ بت پرست ہے لیکن مسلمان بھی وہاں بہتیرے ہیں جو یا تو خوشی آن بسے ہیں یا وہ پرتگیز جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جو سمندر کے کناروں کے ضلعوں میں لوٹ مار کیا کرتے ہیں ان کو پکڑ کر اور غلام بنا کر یہاں لے آئے ہیں۔ پس شجاع نے ان کو گانٹھ لیا اور ان کو اور اپنے دو تین (۱۱۷) سو آدمیوں کو جو بنگالہ سے ساتھ آئے تھے ملا کر اس تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ یکایک راجہ کے محل پر حملہ کر کے اس کو اور اس کے خاندان کو تہ تیغ کر ڈالے اور خود فرماں روابن جائے۔ یہ جسارت اگرچہ احتیاط کے خلاف اور ایک متہورانہ حرکت تھی لیکن میں نے بعض پرتگیزوں اور مسلمانوں اور ڈچوں سے جو خاص وہاں موجود تھے سنا ہے کہ اس تدبیر کی کامیابی چنداں محال اور امکان سے خالی نہ تھی مگر اس منصوبے کے عمل میں لانے کے لئے جو دن مقرر ہوا تھا اُس سے ایک روز پہلے یہ راز افشا ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے رہے سہے کام ہی نہیں بگڑے بلکہ سارا کنبہ ہی ہلاک ہو گیا۔ چنانچہ اس بھید کے کھل جانے پر اس نے چاہا کہ پیگو کو بھاگ جائے لیکن اس ارادہ کا عمل میں لایا جانا قریب ناممکن کے تھا کیونکہ راہ میں ایسے سخت پہاڑ اور دشوار گزار جنگل اور بَن حائل تھے کہ ان میں سے ہو کر کوئی ایسا رستہ کبھی ہوا ہی نہیں جس

سے مسافر آتے جاتے رہے ہوں غرض کہ تعاقب کیا گیا اور بھاگنے سے آٹھ پہر بعد لوگوں نے اسے جالیا اور جیسی کہ اس اسم با مسمیٰ شجاع شہزادہ سے توقع ہونی چاہئے یہ ویسی ہی شجاعت سے لڑا اور بہت سے وحشی خاص اُس کی تلوار سے قتل ہوئے۔ مگر آخر کار دشمنوں کے ہجوم سے جو پیچھے سے اور آتے جاتے تھے مغلوب ہو کر ایسی لڑائی سے جو کسی طرح بھی برابر کی نہ تھی دست بردار ہو گیا۔

سلطان باقی جو باپ سے ذرا پیچھے رہ گیا تھا وہ بھی ویسا ہی لڑا جیسے کہ بہادر لڑا کرتے ہیں لیکن دشمنوں نے چاروں طرف سے اس قدر پتھر مارے کہ تمام بدن چور چور اور لہولہان ہو گیا اور آخر یہ جنگلی اسے اور اس کی والدہ اور دونوں چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کو پکڑ کر لے گئے۔

سلطان شجاع کی موت وحیات کی نسبت مختلف روایتوں کا ذکر

اب اس سے آگے اس کی بابت کوئی ایسی ٹھیک بات جو زیادہ بھروسہ کے لائق ہو معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ کچھ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ میدان جنگ سے نکل کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر جاچڑھا تھا اور اس کے ہمراہ ایک خواجہ سرا اور ایک عورت اور دو شخص اور تھے اور سر میں پتھر کا ایک ایسا زخم لگا ہوا تھا کہ وہاں پہنچ کر گر پڑا مگر جب اس زخم کو اس خواجہ سرا نے اپنی پگڑی سے باندھ دیا تو اٹھ کر جنگل میں جا گھسا۔ اسکے علاوہ چار روایتیں اور سنی ہیں اور اگرچہ ان لوگوں کی زبانی ہیں جو عین موقع پر موجود تھے، مگر باوجود اس کے ایک دوسری سے نہیں ملتی۔ چنانچہ بعض لوگوں نے مجھے اس امر کا یقین دلایا کہ اس کی لاش مُردوں میں ملی تھی لیکن صورت پہچانی مشکل تھی اور ڈچوں کے کارخانہ کے ایک افسر اعلیٰ کی چٹھی میں نے بچشم خود دیکھی ہے اس میں بھی یوں ہی لکھا تھا۔ لیکن پھر بھی جیسا کہ چاہئے یقینی بات کوئی نہیں ہے اور اسی وجہ سے دہلی میں کئی بار ایسی افواہیں اڑتی رہیں کہ جن سے خواہ مخواہ لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے (۱۱۸) چنانچہ ایک بار تو یہ غل ہوا کہ شجاع مچھلی پٹن پہنچ گیا ہے اور گولکنڈا اور بیجاپور کے بادشاہوں نے اس سے یہ عہد اور اقرار کر لیا ہے کہ اپنی اپنی تمام فوج سے آپ کی مدد کریں گے اور پھر بڑے پختہ طور پر یہ خبر اڑی کہ وہ دو جہازوں پر جن پر سرخ نشان چڑھے ہوئے تھے سورت کے سامنے سے ہو کر گزرا ہے اور یہ جہاز اس کو شاہ پیگو یا شاہِ سیام نے دیئے ہیں۔ پھر ایک یہ چرچا ہوا کہ وہ ایران پہنچ گیا ہے اور شیراز

میں لوگوں نے دیکھا ہے اور کچھ دنوں بعد ان افواہ اڑانے والوں نے اسے قندھار پہنچادیا اور مشہور کر دیا کہ وہاں سے کابل پر چڑھائی کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے ایک دفعہ اورنگ زیب نے کہا کہ ''شجاع تو آخر حاجی ہو گیا'' یعنی مکہ جا پہنچا۔ مگر اس کا یہ کہنا غالباً ظرافت کے طور پر تھا اور اب تک بہتیرے آدمی اس بات پر یقین کئے ہوئے ہیں کہ وہ استنبول میں کچھ عرصہ رہ کر اور وہاں سے بہت سامال و دولت لے کر ایران میں آگیا ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ سب افواہیں محض بے بنیاد ہیں اور وہ چٹھی قابل اعتماد ہے جو ڈچوں کے کارخانہ تجارت کے افسر اعلیٰ کی طرف سے تھی اور جس میں یہ لکھا تھا کہ شجاع اراکان سے بھاگنے کی حالت میں مارا گیا۔ چنانچہ اس کے ایک خواجہ سرانے جس کے ساتھ میں بنگالہ سے مچھلی پٹن گیا تھا اور ایک اور شخص نے جو اس کے توپ خانہ کا سردار تھا اور اب شاہ گول کنڈا کا ملازم ہے مجھ سے کہا کہ فی الحقیت ہمارا آقا مر چکا ہے۔ لیکن اس کی تفصیل مجھ سے بیان کرنی نہیں چاہی اور بعض فرانسیسی سوداگروں سے جو سیدھے اصفہان (۱۱۹) سے آرہے تھے دہلی میں میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ایران میں ہم نے کبھی اس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ اس کے سوا اس کے زندہ نہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ شکست کے ساتھ ہی اس کی تلوار اور خنجر پڑا ہوا ملا تھا اور اگر وہ واقعی جنگل میں بھاگ گیا ہو جیسا کہ بعض لوگوں کا اِدّعا ہے تو اس صورت میں بھی جانبر ہونے کی بہت ہی کم امید ہے کیونکہ وہاں یا تو چوروں اور رہزنوں وغیرہ نے قطعاً مار ڈالا یا شیر اور ہاتھی وغیرہ درندہ جانوروں نے جو وہاں کے جنگلوں میں بکثرت ہیں، چیر پھاڑ ڈالا ہو گا۔

شجاع کے اہل و عیال پر جو گزری، اس کا بیان

بہر حال سلطان شجاع کی موت و حیات کی نسبت خواہ کچھ ہی شکوک اور احتمالات ہوں، لیکن اس کے کنبہ کے لوگوں پر جو جو آفتیں اور مصیبتیں پڑیں ان کے متعلق روایتوں کی صحت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ چنانچہ ان بے چاروں کی مصیبتوں کی تفصیل اس طرح پر ہے کہ جب ان کو قید کر کے واپس لائے تو کیا مرد، کیا عورتیں، کیا بچے سب کے سب قید خانے میں ڈال دیئے گئے اور نہایت ہی بے رحمی اور سختی کی گئی۔ مگر چند مدت بعد ان کو چھوڑ دیا گیا اور کسی قدر مہربانی کی گئی اور شجاع کی بڑی بیٹی سے راجہ نے شادی کر لی اور اس کی ماں سلطان باقی سے خود اپنا عقد کر لینے کی بڑی خواہش مند تھی کہ اتنے میں

سلطان باقی کے چند نوکر انہی مسلمان لوگوں سے مل کر جن کا ذکر ابھی ہو چکا ہے پھر اسی قسم کے منصوبہ کی فکر میں پڑ گئے لیکن اُن میں کا ایک بے احتیاط اور جلد باز شخص جو غالبا شراب پی کر اور بھی زیادہ بے عقل ہو گیا تھا نشہ کی ترنگ میں اس راز کو مخفی نہ رکھ سکا اور عین حملہ کے روز اس سے یہ بھید کھل گیا اور اگرچہ اس قصہ کی نسبت بھی ہزاروں روایتیں سننے میں آئی ہیں لیکن جو بات اطمینان اور اعتماد کے ساتھ بیان کی جاسکتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اس حرکت سے راجہ ایسا برہم اور غضبناک ہوا کہ شجاع کے تمام کنبہ کے قتل کا حکم دے دیا یہاں تک کہ وہ شہزادی جس سے اس نے عقد کر لیا تھا باوجودیکہ حاملہ تھی اس کے وحشیانہ حکم سے وہ بھی قتل کی گئی اور سلطان باقی اور اس کے بھائیوں کے سر کند کلہاڑی سے کاٹے گئے اور اس بدبخت کنبہ کی باقی ماندہ عورتیں اپنے اپنے مکانوں میں ایسی سختی سے قید کی گئیں کہ فاقوں کے مارے وہیں ہلاک ہو گئیں۔

الغرض یہ لڑائی کی آگ جو ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی خاطر چاروں بھائیوں کے باہم بھڑکی تھی پانچ یا چھ سال کے اندر یعنی تقریباً ۱۶۵۵ء (۱۲۰) سے لے کر ۱۶۶۰ سولہ سو ساٹھ یا اکسٹھ تک اس طرح پر خاتمہ کو پہنچی اور اورنگ زیب اس عظیم الشان سلطنت کا اکیلا ہی مالک بن گیا۔ (۱۲۱)

خوانین ازبک کے سفیروں کا اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہونا

لڑائی کے ختم ہوتے ہی ازبک قوم کے تاتاریوں نے بڑی عجلت کے ساتھ اپنے سفیر اورنگ زیب کے پاس بھیجے۔ جس زمانہ میں شاہ جہاں نے اس کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنا کر خان سمرقند (۱۲۲) کی مدد کو جو خان بلخ سے لڑ رہا تھا بھیجا تھا۔ یہ بہت سی لڑائیوں میں اس کی بہادری اور جنگی لیاقتیں دیکھ چکے تھے اور اس سبب سے ڈرتے تھے کہ مبادا اُس کو ان کی وہ دغابازی یاد ہو کہ جب وہ دُشمن کے تخت گاہ بلخ پر قبضہ کر لینے کو تھا، انہوں نے باہم صلح کر کے اس کی سپاہ کو اپنے ہاں سے نکال دینے کے لئے اس وجہ سے بالاتفاق کوششیں کی تھیں کہ کہیں اسی طرح دونوں ہی کا ملک نہ چھن جائے جس طرح اکبر نے کشمیر چھین لیا تھا۔ (۱۲۳)

چونکہ یہ ان تمام واقعات سے جو ہندوستان میں گزرے تھے اور اورنگ زیب کی فتوحات اور سلطنت کے دوسرے دعویداروں کی کامل بربادی اور موت سے خوب واقف تھے

اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگرچہ شاہجہاں زندہ ہے مگر فی الواقع اب اس کے بیٹے کے بادشاہ ہونے کو سب نے مان لیا ہے، اس لئے انتقام کے خوف یا جبلی طمع اور طبعی لالچ کی تحریک سے اس امید پر کہ شہنشاہ ہندوستان کے ہاں سے عمدہ عمدہ تحفے ہاتھ آئیں گے، مبارک باد کہنے اور خدمت کے لئے اپنی آمادگی ظاہر کرنے کو انہوں نے اپنے ایلچی روانہ کئے مگر فتح کے بعد یہ پیغام جس قدر کے قابل تھے اورنگ زیب اس سے بخوبی واقف تھا اور خوب جانتا تھا کہ صرف سزا کے خوف یا مال کی طمع سے ان کو بھیجا ہے۔ لیکن تاہم مناسب طور پر ان کا استقبال اور خاطر تواضع عمل میں آئی اور چونکہ اس روز دربار میں میں بذات خود موجود تھا اس لئے ہر ایک بات کو صحیح طور پر بیان کر سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ انہوں نے دربار ہندوستان کی رسم ادب کے موافق کسی قدر فاصلہ سے بادشاہ کو سلام کیا۔ یعنی سر جھکا کر اور تین دفعہ اپنے ہاتھ زمین تک لے جا کر اور پھر پیشانی تک لا کر تین بار سلام کیا اور اس کے بعد اگرچہ وہ اس قدر نزدیک پہنچ گئے کہ اورنگ زیب خود ان کے ہاتھ سے خریطے لے سکتا تھا لیکن یہ رسم ایک امیر کی معرفت ادا ہوئی۔ یعنی اس نے ان سے لے کر کھولے اور پھر بادشاہ کو دیئے اور اس نے بڑی متانت اور وقار سے پڑھ کر حکم دیا کہ ہر ایک سفیر کو "سراپا" (جس کے معنی ہیں سر سے پاؤں تک کا لباس) عنایت ہو۔ چنانچہ زربفت کی ایک ایک قبا اور ایک ایک پگڑی اور ایک ایک زرکار ریشمی پٹکہ عطا ہوا اور اس کے بعد جو تحائف وہ اپنے اپنے "خان" کی طرف سے لائے تھے، پیش ہوئے۔ یعنی نہایت عمدہ لاجورد (۱۲۴) کے بنے ہوئے کئی صندوقچے اور لمبے لمبے بالوں والے کئی اونٹ اور چند نہایت خوبصورت ترکی گھوڑے (اگرچہ وہاں کے گھوڑوں کی زیادہ تعریف اصالت ہی کی ہے) اور بمقدار کئی اونٹوں کے بوجھ کے تازے میوے مثل سیب ناشپاتی انگور اور سردوں کے جو دہلی میں اکثر اسی ملک سے آتے اور جاڑے بھر بکا کرتے ہیں۔ اور اسی قدر خشک میوے مثل آلو بخارا خوبانی اور کشمش اور دو قسم کے اور سفید اور سیاہ انگور جو بہت بڑے بڑے اور نہایت لذیذ تھے۔ جن کو ملاحظہ فرما کر اورنگ زیب نے سفیروں سے فرمایا کہ خان صاحبوں کے ان تحائف سے ہم بہت خوش ہوئے اور میووں کی خوبی اور اونٹوں اور گھوڑوں کی عمدگی کی بڑے مبالغے سے تعریف کی۔ پھر ان کے ملک کی زرخیزی کا کچھ ذکر کر کر اور سمرقند کے مدرسہ اعظم کی بابت چند باتیں پوچھ کر کہا کہ اچھا اب آرام کیجئے اور گاہ گاہ دربار میں آتے رہئے ہم آپ کی ملاقات سے خوش ہوں گے۔ چنانچہ جس طرح ان ایلچیوں کا

استقبال وغیرہ ہوا اس سے یہ بہت خوش اور رضامند دربار سے رخصت ہوئے اور ہندوستان کے طرزِ سلام سے جو فی الواقع ایک ذلت ہے کچھ رنجیدہ نہ تھے اور نہ اس سے کچھ ناراض تھے کہ خود بادشاہ نے ہمارے ہاتھ سے خریطے کیوں نہ لئے اور مجھے یقین تھا کہ اگر ان سے آدابِ زمیں بوس (۱۲۵) بجالانے یا اس سے بھی زیادہ کسی اور رسم انکسار کے ادا کرنے کی خواہش کی جاتی تو یہ اس کو بھی بلاعذر قبول کر لیتے لیکن یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ اگر یہ اپنے ملک کے دستور کے موافق سلام کرنے یا بادشاہ کو اپنے ہاتھ سے خریطے دینے کی استدعا کرتے تو یہ منظور بھی نہ ہوتا۔ کیونکہ یہ رعایتیں صرف ایران ہی کے سفیروں کے ساتھ ملحوظ رہتی ہیں۔ بلکہ ان کو بھی ہزار وقت سے یہ اجازت ملتی ہے۔

یہ لوگ چار مہینے سے زیادہ دہلی میں رہے اور اگرچہ کئی بار چاہا مگر رخصت نہ ملی اور اتنے دنوں تک یہاں رہنا ان کی تندرستی کے لئے ایسا مضر ہوا کہ یہ اور ان کے اکثر ہمراہی علیل ہوگئے۔ بلکہ کئی شخص تو مر بھی گئے۔ مگر مجھے شبہ ہے کہ ان کو گرمی کے باعث جس کے یہ عادی نہ تھے، یہ تکلیف ہوئی یا کہ جسم اور لباس کی کثافت اور خوراک کی قلت کے سبب سے کیونکہ ازبک غالباً تمام دنیا کے لوگوں سے بڑھ کر خسیس اور بخیل اور کثیف رہنے والے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ اس سفارت میں آئے تھے سب کے سب جو روپیہ خرچ کے طور پر اورنگ زیب کی طرف سے ان کو ملتا تھا برابر جمع کئے جاتے تھے اور ایسی خست سے گزران کرتے تھے جو کسی طرح بھی ان کے مناسب حال نہ تھی مگر بااین ہمہ ان کی رخصت کے وقت بڑی دھوم دھام اور رسم رسوم کا عملدر آمد ہوا یعنی ایک ایسے دربار میں کہ جس میں تمام امراء حاضر تھے دونوں ایلچیوں کو بڑے بیش قیمت سراپا عطا ہوئے اور حکم ہوا کہ دونوں کے ڈیرے آٹھ آٹھ ہزار روپیہ نقد بھی بھیجا جائے۔ اور ان کے آقاؤں کے لئے بھی بہت گراں بہا سراپا یعنی بہت سے عمدہ عمدہ تھان زربفت کے اور کتنے ہی تھان تن زیب اور ململ کے اور چند الا یچے جو ایک ایسا کپڑا ہوتا ہے جو سنہری روپہلی زری اور ریشم ملا کر بُنا جاتا ہے اور چند قالین اور جڑاؤ قبضہ کے دو خنجر انہیں حوالہ کئے۔ (۱۲۶)

سفیرانِ ازبک کے ساتھ مصنف کی ملاقات اور کھانا کھانا اور حرف وحکایات

ان کے قیام دہلی کے زمانہ میں میری تین ملاقاتیں ان سے ہوئیں اور مجھے

میرے ایک دوست نے جس کا باپ ملک از بک سے دربار مغلیہ میں آکر بہت دولتمند ہو گیا تھا یہ کہہ کر کہ یہ ایک طبیب ہیں، ان سے ملا دیا تھا۔ ان ملاقاتوں سے میرا یہ مدعا تھا کہ حتی الامکان ان کے ملک کے کچھ حالات دریافت کروں مگر وہ اس قدر بے علم اور جاہل نکلے کہ جس کا مجھے وہم وگمان بھی نہ تھا۔ یہاں تک کہ اپنے ملک کی حدود سے بھی واقف نہ تھے اور جن تاتاریوں نے چند ہی سال گزرے ملک چین پر غلبہ حاصل کیا تھا ان کا کچھ بھی حال نہ بتا سکے۔ خلاصہ یہ کہ ان سے ایک بھی نئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ ایک دفعہ مجھے یہ شوق ہوا کہ ان کے ساتھ کھانا کھاؤں اور چونکہ یہ رسوم تکلف سے چنداں آشنا نہ تھے اس لئے ان کے شریکِ طعام ہو جانے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ مگر ان کا کھانا بہت ہی عجیب وغریب نظر آیا۔ یعنی بجز گھوڑے کے گوشت کے کوئی بھی چیز نہ تھی۔ مگر بہر حال میں نے اپنے کھانے کا کچھ ڈھنگ نکال لیا کیونکہ دستر خوان پر ایک قاب میں کچھ گوشت ایسی ترکیب (۱۲۷) سے پکا ہوا بھی تھا کہ جس کو میں نے کھانے کے قابل سمجھا اور آدابِ مجلس کے لحاظ سے اس کی تعریف بھی کرتا رہا۔ کیونکہ ان کے نزدیک وہ نہایت ہی خوش ذائقہ غذا تھی۔ کھانا کھانے میں ایک حرف بھی کسی کے منہ سے نہیں نکلتا تھا اور یہ لطیف مزاج! میزبان جس قدر منہ میں سما سکتا تھا! ہاتھ سے گھوڑے کا گوشت ٹھونسے چلے جاتے تھے کیونکہ چمچہ سے کھانا بالکل جانتے ہی نہ تھے۔ (۱۲۸) لیکن اس لطیف غذا سے جب خوب پیٹ بھر گیا تب تو ان کی زبان کھلی اور خوش اختلاطی کی راہ سے مجھ سے یہ دلائل کہنے لگے کہ از بک سب لوگوں سے زیادہ قوی ہیکل ہیں اور تیر اندازی میں دنیا کی کوئی قوم ان کی برابری نہیں کر سکتی اور یہ کہہ کر اپنے تیر اور کمانیں منگائیں جو فی الواقع ہندوستان کی کمانوں اور تیروں کی بہ نسبت بہت لمبی تھیں اور کہا کہ ہم شرط لگاتے ہیں کہ اپنے تیر گھوڑے یا بیل کے جسم سے پار کر دے سکتے ہیں اور پھر اپنی دیہاتی عورتوں کی طاقتوری اور بہادری کی اس قدر تعریف کرنی شروع کی کہ گویا امیزنوں (۱۲۹) کو بھی ان کے مقابلہ میں بہت نازک اندام اور ڈرپوک سمجھنا چاہئے اور ان کی بہادری وغیرہ کے بہت سے قصے سنائے۔ چنانچہ بالتخصیص ایک قصہ نے تو مجھ کو بھی تعجب میں ڈال دیا۔ مگر افسوس ہے کہ میں اس کو اس آب و تاب کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا کہ جس کے ساتھ انہوں نے بیان کیا تھا یعنی جس زمانہ میں اورنگ زیب از بکوں کے ساتھ لڑائی میں مصروف تھا اتفاقاً پچیس تیس سواروں کا ایک گروہ جو ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا گھسا اور گھروں کو لوٹنے اور غلام بنا

نے کے لئے لوگوں کو پکڑنے باندھنے لگا تو ایک بڑھیا نے ان سے کہا کہ بیٹا میری صلاح مانو اور ان حرکتوں سے باز آؤ اور اپنی خیریت چاہتے ہو تو جلد یہاں سے نکل جاؤ ورنہ میری بیٹی جو باہر گئی ہوئی ہے اور جلد آیا چاہتی ہے اگر تم پر آن پڑے گی تو تمہارا کیا اور نہ کیا سب برابر ہو جائے گا۔ لیکن انہوں نے اس بے چاری نیک دل بڑھیا کی بات یوں ہی ٹھٹھے میں اڑا دی اور بدستور گھروں کو لوٹتے اور لوگوں کو پکڑتے باندھتے رہے مگر جب لوٹ کے مال سے اپنے گھوڑے ٹٹو لاد لئے اور گاؤں کے بہت سے باشندوں اور خود اس بے چاری بڑھیا کو بھی قید کر کے لے چلے تو کوس ڈیڑھ کوس بھی نہ گئے ہوں گے کہ یہ بڑھیا جو بار بار پیچھے کو مڑ مڑ کر دیکھتی جاتی تھی خوشی سے چلا کر بولی "میری بیٹی!" "میری بیٹی" اور اگرچہ وہ ابھی نظر سے اوجھل تھی مگر معمول سے زیادہ گرد اڑتی دیکھ کر اور گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سن کر اس کی فکر مند ماں کے دل میں شک نہ رہا تھا کہ میری بہادر بیٹی مجھے اور میرے رفیقوں کو بے رحم دشمنوں کے ہاتھ سے چھڑا لینے کے لئے آ پہنچی ہے اور وہ یہ الفاظ کہہ نہ چکی تھی کہ وہ لڑکی ایک برق وش گھوڑے پر سوار گلے میں کمان ڈالے اور کمر سے ترکش باندھے ہوئے دکھائی دی اور دور ہی سے للکاری! کہ اگر سب مال رکھ دو اور قیدیوں کو چھوڑ کر چپکے اپنے مکان کو چلے جاؤ تو میں اب بھی تمہاری جان بخشی کرتی ہوں! مگر انہوں نے جس طرح بے چاری بڑھیا کی منت و سماجت پر کچھ خیال نہ کیا تھا اُسی طرح اس کی بات پر بھی کچھ توجہ نہ کی لیکن جب اس نے آن میں تین چار تیر مار کر اتنے ہی سپاہیوں کو زمین پر گرا دیا تب تو وہ سخت حیران ہوئے! اور فوراً اپنی کمانیں سنبھال لیں! لیکن لڑکی ان کی زد سے بہت دور تھی اور ہنستی تھی کہ کیا خوب! یہ نامرد اب اپنے رفیقوں کا بدلہ لینا چاہتے ہیں! الغرض وہ اس زور سے تیر مارتی اور ایسا ٹھیک نشانہ لگاتی تھی کہ جسے دیکھ کر یہ خوف زدہ ہندوستانی سوار ہکے بکے رہ گئے اور اس نے آدھے تو تیروں سے مار لئے اور باقی رہتوں پر تلوار پکڑ کر آن پڑی اور سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

اورنگ زیب کا تپ سے بیمار ہونا اور اس کے متعلق بعض واقعات

ابھی یہ تاتاری سفیر دہلی ہی میں تھے کہ اورنگ زیب ایک سخت بیماری میں مبتلا ہوا۔ چنانچہ شدتِ بخار سے ہذیان ہوتا تھا اور زبان ایسی اینٹھ گئی تھی کہ بات مشکل سے منہ سے نکلتی تھی۔ طبیب ناامید ہو گئے تھے اور عموماً یہ افواہ اڑ گئی تھی کہ بادشاہ مر گیا ہے۔ مگر

روشن آرا بیگم کسی غرض سے اس بات کو چھپائے ہوئے ہے اور یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ راجہ جسونت سنگھ صوبہ دار گجرات، شاہ جہاں کو قید سے چھڑانے کے لئے چلا آتا ہے اور اسی ارادہ سے مہابت خاں صوبہ دار کابل بھی (جس نے آخر کار اورنگ زیب کی اطاعت قبول کر لی تھی) تین چار ہزار سواروں کے ساتھ آگرہ کی طرف بڑھا آتا ہے۔ بلکہ لاہور سے بھی آگے نکل آیا ہے اور یہ بھی شہرت تھی کہ اعتبار خاں خواجہ سرا، شاہ جہاں جس کی حراست میں تھا، نہایت بے قراری سے چاہتا ہے کہ اس بڈھے بادشاہ کو رہائی دینے کی ناموری مجھے حاصل ہو۔

اُدھر سلطان محمد معظم کا یہ حال تھا کہ امیروں کو وعدے وعید اور رشوتیں دے کر اپنا طرفدار بنانے کے لئے کوشش کر رہا تھا یہاں تک کہ ایک روز رات کو بھیس بدل کر راجہ جے سنگھ کے مکان پر بھی گیا اور نہایت منت سماجت کے ساتھ اس سے کہا کہ آپ علانیہ طور پر میرے جانب دار بن جایئے ادھر روشن آرا بیگم نے کئی ایک امیروں کے اتفاق سے جن میں (توپخانہ کا افسر اعلیٰ) فدائی خان میر آتش بھی تھا، یہ بندوبست کر رکھا تھا کہ اورنگ زیب کے تیسرے بیٹے سلطان اکبر کو جس کی عمر ابھی سات آٹھ ہی برس کی تھی تخت نشین کریں اور دونوں فریق نے مشہور کر رکھا تھا کہ ہمارا اصل مدعا شاہ جہاں کا قید سے چھڑا دینا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف عوام الناس کی تالیفِ قلوب کے لئے ایک بہانہ تھا اور یہ بھی غرض تھی کہ اگر بالفرض اعتبار خاں یا اور امیروں کی مخفی سازش سے وہ چھوٹ جائے تو لوگوں کی نظر میں ہماری بات بنی رہے حالانکہ جتنے ذی رتبہ اور مقتدر لوگ تھے شاہ جہاں کا مکرر تخت نشین ہونا دل سے کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ بجز جسونت سنگھ اور مہابت خاں اور بعض اور امیروں کے جو علانیہ شاہ جہاں کی مخالفت کے مرتکب نہیں ہوئے تھے ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو اس بے چارے ذی حق بادشاہ کو چھوڑ کر نمک حرامی سے کھلم کھلا اورنگ زیب کا ساتھی نہ بن گیا ہو۔ اس لئے یہ لوگ بخوبی جانتے تھے کہ اس کا قید سے نکل جانا گویا ایک بپھرے ہوئے شیر کا چھوٹ جانا ہے اور اس کی رہائی کے اندیشہ سے تمام اہلِ دربار ہراساں ہو رہے تھے اور سب سے زیادہ اعتبار خاں ڈر رہا تھا جو اس بے چارے بد نصیب قیدی بادشاہ سے بے وجہ بڑی سختیوں اور گستاخیوں سے پیش آتا رہا تھا لیکن اورنگ زیب باوجود شدتِ مرض کے باپ کی نگہبانی اور سلطنت کے کام کی طرف سے غافل نہ تھا اور اگرچہ سلطان معظم کو اس کی تاکیدی ہدایت اور نصیحت یہی تھی کہ اگر

میں مر جاؤں تو شاہ جہاں کو قید سے چھوڑ دینا مگر اعتبار خاں کو جو فرمان پر فرمان لکھواتا رہا ان میں برابر یہ تاکید تھی کہ خبردار اپنے کام میں سستی اور غفلت نہ کرنا اور بیمار ہونے سے پانچویں روز جبکہ مرض نہایت شدت پر تھا کہا کہ ہم کو دربار میں لے چلو جس سے یہ غرض تھی کہ بعض لوگوں کو جو اُس کے مر جانے کا گمان ہو گیا تھا وہ جاتا رہے اور کوئی عام شورش یا ایسا واقعہ جس سے شاہ جہاں قید سے نکل جائے ہونے نہ پائے۔ چنانچہ انہی خیالات سے ساتویں اور نویں اور دسویں دن بھی دربار میں آتا رہا اور نہایت تعجب کی بات تو یہ ہے کہ تیرھویں روز اگرچہ اتنی دیر تک غش میں رہا کہ عموماً اس کا مر جانا مشہور ہو گیا مگر تاہم جوں ہی ذرا افاقہ ہوا تو باہر آیا اور راجہ جے سنگھ اور دو تین اور بڑے بڑے امیروں کو بلا بھیجا تاکہ لوگوں پر ثابت ہو جائے کہ وہ زندہ اور سلامت ہے اور خدمتگاروں سے فرمایا کہ ہم کو پلنگ پر ذرا اٹھا دو اور اعتبار خاں کے نام کچھ لکھنے کے لئے کاغذ اور قلم دان منگایا اور سلطنت کی بڑی مہر جو ایک چھوٹی سی تھیلی میں جس پر بادشاہ کی دستی مہر لگی ہوئی روشن آرا بیگم کے سپرد رہتی تھی ایک خاص آدمی کے ہاتھ منگوا بھیجی جس سے یہ امتحان منظور تھا کہ بیگم نے اپنی کسی ناجائز غرض کے لئے اسے استعمال تو نہیں کیا۔ چنانچہ جس وقت میرے آقا نے یہ سب خبریں سنیں تو میں نے دیکھا کہ اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے "واہ واہ کیا استقلال طبع! اور کیا حوصلہ ہے! اورنگ زیب خدا تجھے سلامت رکھے تو نے ابھی بڑے بڑے کام کرنے ہیں اور بالضرور ابھی تیری زندگی باقی ہے" اور فی الحقیقت اس حالت کے بعد اس کی صحت میں رفتہ رفتہ ترقی ہونے لگی۔

اورنگ زیب کا دارا شکوہ کی بیٹی سے سلطان اکبر کی شادی کا ارادہ کرنا اور اس شہزادی کا اس کو نہ ماننا

اب چونکہ اورنگ زیب کی طبیعت روز بروز اعتدال پر آتی جاتی تھی اس کی یہ مرضی ہوئی کہ دارا شکوہ کی بیٹی کو شاہ جہاں اور بیگم صاحب کے پاس سے منگا کر سلطان اکبر سے جس کی نسبت ولی عہد بنائے جانے کا احتمال ہے اس کی شادی کر دے جس سے اس کی ولی عہدی کو تقویت ہونے کی امید تھی کیونکہ یہ شہزادہ اگرچہ ابھی بچہ ہے لیکن بہت سے مقتدر امرا اس کے قرابتی ہیں اور نواز خاں (شاہ نواز خاں صفوی) کے نواسہ ہونے کی وجہ سے ایسے خاندان سے علاقہ رکھتا ہے جو کسی زمانہ میں مسقط کے بادشاہ تھے اور محمد سلطان اور محمد

معظم کی مائیں (۱۳۰) صرف راجاؤں کی بیٹیاں ہیں۔

اگرچہ بادشاہانِ ہند مسلمان ہیں مگر ہندوؤں کے ہاں شادی کر لینے میں ان کو کچھ تامل نہیں ہوتا خصوصاً جبکہ کوئی ایسا رشتہ امورِ سلطنت کے لئے مفید معلوم ہوتا اور خوبصورت بیوی ہاتھ آتی ہو۔ لیکن اورنگ زیب کا یہ منصوبہ چل نہ سکا کیونکہ شاہ جہاں اور بیگم صاحب نے بڑی نفرت کے ساتھ اس سے انکار کیا بلکہ خود اس نو عمر شہزادی نے بھی نہایت بیزاری ظاہر کی اور مدت تک اس خیال سے کہ مبادا زبردستی لے جائیں نہایت تردد اور بے قراری کی حالت میں رہی اور علانیہ کہتی رہی کہ "جان دے دوں گی! مگر اس شخص کے بیٹے سے شادی نہ کروں گی جس نے میرے باپ کو مارا ہے"۔

اورنگ زیب کا شاہ جہاں سے بعض جواہرات کا طلب کرنا اور اس کا تختی سے جواب دے دینا

اسی طرح اورنگ زیب شاہ جہاں سے بعض خاص جواہرات کے حاصل کرنے میں بھی کامیاب نہ ہوا جن کو اس مشہور و معروف تخت میں لگانا چاہتا تھا جس کو دیکھ کر ایک عالم کو حیرت ہوتی ہے اور قیدی بادشاہ نے نہایت غصہ سے یہ کہہ بھیجا کہ اورنگ زیب دانائی اور انصاف سے سلطنت کا کام کرتا رہے مگر تخت کے معاملہ میں دخل نہ دے اور جواہرات کی بابت اگر مجھے پھر ستائیں گے تو خبردار! ان پتھروں کو کوٹ کر چورا کر دوں گا۔

ڈچوں کے سفیر مسٹر ایڈریکن کا تخت نشینی کی ادائے تہنیت کے لئے حاضر ہونا اور اس کے مراسمِ ملاقات

آخر کار ڈچوں نے بھی اورنگ زیب کو تخت نشینی کی مبارکباد دینے میں پیچھے رہنا نہ چاہا اور سفیر بھیجنے کا ارادہ کیا اور اس کام کے لئے ایڈریکن کو تجویز کیا جو ان کی سورت کی کوٹھی کا کارپردازِ اعلیٰ اور بہت متدین اور ذی لیاقت اور سلیم الرائے شخص تھا اور چونکہ اس کی یہ عادت تھی کہ تجربہ کار لوگوں کی رائے اور مشورت پر چلنے میں اس کو کبھی انکار نہ ہوتا تھا اس لئے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس نے اس کام کو اپنے ہم وطنوں کے اطمینان کے قابل انجام دیا۔ اور اگرچہ اورنگ زیب دربار کے ضابطوں اور دستوروں میں ہمیشہ بڑی

کروفر اور شان و شوکت دکھاتا ہے اور اپنی دین داری کا اظہار بھی نہایت ہی کرتا ہے اور اس لئے عیسائیوں کو ذرا حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے تاہم اس سفیر کے ساتھ وہ بڑی مہربانی اور اخلاق سے پیش آیا بلکہ یہ بھی فرمایا کہ ہماری یہ خوشی ہے کہ مسٹر ایڈریکن اول ہندوستان کے دستور کے موافق آداب بجالائے یعنی آداب گاہ پر تسلیمات ادا کرے اور پھر نزدیک آکر خاص اپنے ملک کی رسم کے موافق سلام کرے اور اگرچہ یہ سچ ہے کہ جو خریطہ مسٹر ایڈریکن لے کر حاضر ہوا تھا اورنگ زیب نے وہ ایک امیر کی وساطت سے لیا تھا مگر اس کو کچھ توہین کی علامت سمجھنا نہیں چاہئے کیونکہ ازبکوں کے سفیروں کے ساتھ بھی ایسا ہی عمل ہوا تھا۔ بعد طے ہونے ان ابتدائی رسوم کے مسٹر ایڈریکن کو اپنے تحائف پیش کرنے کا حکم ہوا اور اس کو اور اس کے چند یورپین ہمراہیوں کو زربفت کے "سراپا" پہنائے گئے چنانچہ منجملہ ان تحائف کے کچھ تو سرخ اور سبز رنگ کی عمدہ بانات کے تھان تھے اور کچھ بڑے بڑے آئینے اور کچھ چین اور جاپان کی بنی ہوئی عمدہ چیزیں جن میں ایک پالکی اور تخت رواں نہایت ہی خوبصورت تھا اور بہت ہی پسند ہوا۔

شاہان مغلیہ کی یہ عادت ہے کہ غیر ملکوں کے سفیروں کو جہاں تک بہ معقولیت ممکن ہوتا ہے اس غرض سے ٹھہرائے رکھتے ہیں کہ ان کا دربار میں حاضر رہنا اور ادب و تعظیم بجالانا سلطنت کی شان و شوکت کا باعث (۱۳۱) ہے پس ایڈریکن بھی جس جلدی کے ساتھ رخصت ہونا چاہتا تھا نہ ہو سکا۔ اگرچہ تاتاری سفیروں کی نسبت اس کو بہت جلد رخصت حاصل ہو گئی یعنی جب اس کا سکریٹری دہلی ہی میں چل بسا اور کئی اور شخص بھی بیمار ہو گئے تو اورنگ زیب نے اس کو رخصت کر دیا اور زربفت کا ایک "سراپا" اس کو اور اس سے بھی زیادہ قیمت کا "سراپا" اور جڑاؤ خنجر اور مہربانی آمیز ایک شقہ بٹیویا (۱۳۲) کے گورنر کے لئے عنایت ہوا۔

سفیر کے بھیجنے سے ڈچوں کی اصل غرض

سفیر کے بھیجنے سے ڈچوں کی اصل غرض یہ تھی کہ دربار میں رسائی پیدا کر کے بادشاہ کا التفات حاصل کریں اور اپنی قوم اور اپنے ملک کے حال سے اس کو کسی قدر مطلع کریں تاکہ بندرگاہوں اور اور مقامات کے حاکموں اور عاملوں کے دل پر جہاں ان کی تجارتی کوٹھیاں تھیں ان کی نسبت ایک مفید اثر پیدا ہو اور ان کو امید تھی کہ یہ لوگ یہ معلوم

کر کے کہ ڈچ بھی ایک زبردست سلطنت کی رعایا ہیں اور بادشاہ تک رسائی رکھتے اور خود اس کی خدمت میں اپنا عرضِ حال کر کے انصاف حاصل کر سکتے ہیں، ہماری حقارت نہ کیا کریں گے اور نہ تجارت میں خلل انداز ہوں گے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اہلِ دربار کو اس بات کے یقین دلانے میں کہ ہماری تجارت ہندوستان کو بہت بڑا فائدہ ہے بہت کوشش کی اور بہت سی جنسیں جو وہ یہاں سے خریدتے تھے ان کی ایک بڑی لمبی چوڑی فہرست اس غرض سے دکھلاتے تھے کہ ان کے ذہن نشین ہو جائے کہ ان جنسوں کے خریدنے کے لئے وہ بہت سا سونا چاندی اپنے ملک سے یہاں لاتے ہیں۔ مگر اس بات کو ظاہر ہونے دینا نہیں چاہتے تھے کہ سال بہ سال تانبا'سیسہ' دار چینی'لونگ' جائپھل' کالی مرچیں' عود اور ہاتھی وغیرہ بیچ کر کس قدر دولت کھینچ لے جاتے ہیں۔

ایک امیر کا اورنگ زیب کو سلطنت کے کام میں زیادہ محنت کرنے سے منع کرنا اور اس کا اس کے جواب میں اپنے فرائض کا اظہار کرنا

انہی دنوں میں ایک بڑے امیر نے اورنگ زیب سے عرض کیا کہ حضور جو کام میں اس قدر مصروفیت فرماتے ہیں اس سے اندیشہ ہے کہ مبادا صحت جسمانی بلکہ قوائے دماغی کے اعتدال اور طاقت کو کچھ نقصان پہنچے۔ جس کو سن کر بادشاہ نے اس عقل مند ناصح کی طرف سے تو منہ پھیر لیا گویا سنا ہی نہیں اور ذرا ٹھہر کر ایک اور بہت بڑے امیر کی طرف جو نہایت دانا اور ذی علم تھا متوجہ ہو کر فرمایا (اس کی یہ تقریر خاص اس امیر کے بیٹے نے جو ایک نوجوان اور طبیب اور میرا دلی دوست تھا مجھ سے نقل کی تھی) کہ آپ تمام اہل علم اس باب میں متفق الرائے ہیں کہ مشکل اور خوف کے زمانہ میں بادشاہ کو جان جوکھوں میں پڑ جانا اور ضرورت کے وقت رعایا کی بہتری کے لئے جو خدا نے اس کے سپرد کی ہے تلوار پکڑ کر میدانِ جنگ میں جان دے دینا فرض واجب ہے۔ مگر اس کے برعکس یہ نیک اور باتمیز شخص یہ چاہتا ہے کہ رعایا کے آرام و آسائش کے لئے مجھے ذرا بھی تکلیف نہ اٹھانی چاہئے اور بغیر اس کے کہ ان کی رفاہ و فلاح کی تدبیروں کے سوچنے میں مجھے ایک رات بھی بے آرام رہنا پڑے یا ایک دن بھی بے عیش و عشرت اور لہو و لعب کے بسر ہو یہ مدعا یوں ہی حاصل ہو جائے اور اس کی یہ رائے ہے کہ میں صرف اپنی تندرستی کو مقدم جانوں اور زیادہ عیش و عشرت اور آرام و آسائش ہی کے امور میں مصروف رہوں اور اس کا یہی نتیجہ

ہو سکتا ہے کہ میں اس وسیع سلطنت کے کام کو کسی وزیر کے بھروسہ پر چھوڑ بیٹھوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ جس حالت میں مجھے خدا نے بادشاہی خاندان میں پیدا کر کے تخت پر بٹھایا ہے تو دنیا میں اپنے ذاتی فائدہ کے لئے نہیں بھیجا بلکہ اوروں کے آرام کے لئے محنت کرنا مجھ پر فرض کیا گیا ہے۔ پس میرا کام یہ نہیں ہے کہ اپنی ہی آسائش کی فکر کروں البتہ انہی کے رفاہ کی غرض سے جس قدر آرام لینا ضروری ہے اس کا مضائقہ نہیں اور بجز اس حالت کے کہ انصاف و عدالت اس کی مقتضی ہو یا اقتدار سلطنت کے قائم رکھنے یا ملک کی حفاظت کے لیے ضروری ہو اور کسی صورت میں رعایا کے آرام و آسائش کا نظر انداز کرنا جائز نہیں ہے اور رعیت کی آسائش و بہبود ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جس کا فکر مجھے ہونا چاہئے۔ مگر یہ شخص اس بات کی تہ کو نہیں پہنچا کہ اس آرام سے جو یہ میرے لئے تجویز کرتا ہے کیا کیا قباحتیں پیدا نہ ہوں گی اور یہ بھی اس کو معلوم نہیں کہ دوسروں کے ہاتھ میں حکومت کا دے دینا کیسی بُری بات ہے۔ اور سعدی نے جو یہ کہا ہے کہ "بادشاہوں کو چاہئے کہ بذات خود کاروبار سلطنت کا بوجھ اپنے اوپر لیں ورنہ بہتر ہے کہ بادشاہ کہلانا چھوڑ دیں" تو کیا اس بزرگ کا یہ قول لغو ہے؟ پس اپنے اس دوست سے کہہ دیجئے کہ اگر ہم سے تحسین و آفرین حاصل کرنا چاہتا ہے تو جو کام اس کے سپرد ہے اس کو اچھے طور سے کرتا رہے اور خبردار! ایسی صلاح جو بادشاہوں کے سننے کے لائق نہیں ہے پھر کبھی نہ دے اور افسوس ہے کہ تن پروری اور آرام طلبی اور ایسے خیالات سے بچنا جو دوسروں کی بہبودی کے فکر و تردد میں آدمی کو گھلا ڈالتے ہیں انسان کا طبعی اور جبلی امر ہے۔ پس ایسے فضول صلاح کاروں کی ہم کو حاجت نہیں اور عیش و آرام کی صلاحیں تو ہماری بیگمیں بھی دے سکتی ہیں۔

ایک واقعہ کا ذکر جس سے یہ ثابت ہوا کہ خوجوں کو بھی تعشق ہو سکتا ہے

انہی دنوں میں ایک ایسا افسوس ناک واقعہ دہلی میں ہوا کہ جس کا تمام شہر اور بالتخصیص شاہی محل سرا میں بہت چرچا تھا اور جس سے میری اور دوسرے لوگوں کی اس رائے کی کہ جو شخص رجولیت سے محروم کر دیا جائے اس کو تعشق نہیں ہو سکتا غلطی ثابت ہو گئی (۱۴۳) یعنی دیدار خاں نامی ایک ذی رتبہ خواجہ سرا نے ایک مکان بنایا تھا جہاں تفریح خاطر کے لئے کبھی کبھی جاتا اور بعض اوقات رات کو وہیں سو بھی رہتا تھا اور اس کے

ہمسایہ میں ایک ہندو کا گھر تھا جو عرائض نویسی وغیرہ کا کام کیا کرتا تھا۔ یہ خواجہ سرا اس کی بہن پر جو بہت خوبصورت تھی عاشق ہو گیا اور اگرچہ کچھ عرصہ تک ان کے باہم ناجائز تعلق رہا مگر کسی کو کچھ شبہ نہ ہوا کیونکہ یہ خوجہ تھا اور زنانہ میں آنے جانے سے خوجوں کو کوئی بھی مانع نہیں ہوتا۔ مگر آخر کار ان کا تعشق یہاں تک بڑھ گیا کہ اس ہندو کو بھی اس قسم کی خبریں پہنچ گئیں کہ لوگ اس کی بہن کی پاک دامنی کی نسبت شبہ کرتے ہیں اور اس نے غصہ میں آکر اپنے دل میں یہ ٹھان لیا کہ اگر یہ سچ ہے تو دونوں کو مار ڈالوں گا۔ چنانچہ کچھ زیادہ عرصہ نہ لگا کہ ایک رات کو یہ دونوں اکٹھے سوتے دیکھ لئے گئے۔ پس اس نے دیدار خاں کو تو چھاتی میں خنجر مار کر مار ڈالا اور بہن کو بھی ایسا زخمی کیا کہ اس کی دانست میں مر ہی چکی تھی اور اس واردات سے محلسرائے شاہی میں نہایت تہلکہ اور شور و شر پیدا ہوا اور خواجہ سراؤں اور محل کی عورتوں نے باہم ایکا کر لیا کہ جس طرح بنے اس شخص کو قتل کرنا چاہئے۔ چنانچہ اورنگ زیب جو اس ہندو کے مسلمان ہو جانے کو اس کے اس گناہ کا کافی کفارہ خیال کرتا تھا اگر ان کی ان بندشوں سے ناراض نہ ہو جاتا تو اس کا بچنا مشکل تھا مگر اس پر بھی لوگوں کی رائے عموماً یہ ہے کہ خواجہ سراؤں کی عداوت اور ان کے زور کی وجہ سے یہ بے باک شخص دیر تک سلامت نہ رہ سکے گا۔

خوجوں کی خصلت کی نسبت اہل ہند اور مصنف کی رائے

ہندوستانیوں کا یہ خیال ہے کہ اگرچہ خصی کر دینے سے جانور غریب اور سیدھا ہو جاتا ہے مگر آدمی پر اس عمل کا اثر برعکس ہوتا ہے اور ان کا قول ہے کہ کیا کوئی خواجہ سرا ایسا بھی ہے جو شریر اور مغرور اور بے رحم نہ ہو؟ حالانکہ اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بے شک ان میں بہت سے وفادار اور فیاض اور شجاع بھی ہوتے ہیں۔

روشن آرا بیگم کی نسبت دو نامحرموں کے محل میں بلا لینے کا شبہ ہونا

انہی ایام کے قریب اورنگ زیب روشن آرا بیگم پر دو نامحرم شخصوں کے محل میں بلا لینے کے شبہ سے بہت ناراض ہوا مگر چونکہ شبہ ہی تھا اس لئے بھائی بہن میں جلد صفائی ہو گئی اور اورنگ زیب ان دونوں آدمیوں کی نسبت اس بے رحمی سے بھی پیش نہ آیا جو شاہ جہاں نے اس بدبخت گرفتار عشق سے برتی تھی جو حمام کی دیگ میں جا چھپا تھا۔ میں اس قصہ کو ٹھیک اسی طرح پر کہ جس طرح ایک دو غلی پرتگیزن بڑھیا نے جو بہت عرصہ سے

لونڈیوں کے طور پر محل میں خدمت کرتی اور باہر آنے جانے کی بھی مجاز تھی مجھے سنایا تھا، بیان کرتا ہوں:

یعنی روشن آرا بیگم نے ان میں سے اوّل تو ایک جوان کو کئی دن تک اپنے پاس چھپائے رکھ کر حظِ صحبت حاصل کیا اور بعد ازاں بعض اپنی خدمتگار عورتوں کو جنہوں نے وعدہ کر لیا تھا کہ ہم رات کے پردہ میں اس کو محل سے باہر کر دیں گی، سپرد کر دیا۔ مگر یا تو ان عورتوں کو ایسا کرتے ہوئے کسی نے دیکھ پایا یا وہ خود ہی افشائے راز کے اندیشہ سے ڈر گئیں یا کچھ اور سبب ہوا لیکن خلاصہ یہ ہے کہ وہ تو اس کو چھوڑ کر بھاگ گئیں اور یہ خوف زدہ نوجوان محل کے باغوں میں اکیلا اور حیران پھرتا ہوا پکڑا گیا اور محل کے پاسبان وغیرہ اس کو کشاں کشاں اورنگ زیب کے حضور میں لے گئے اور چونکہ باوجود بہت ہی پرسش اور تفتیش کے اس نے کسی جرم کے ارتکاب کا اقرار نہ کیا اور صرف اتنا ہی کہا کہ میں دیوار پر سے کود کر اندر آ گیا تھا اس لئے اورنگ زیب نے حکم دیا کہ جس طرح سے یہ شخص یہاں تک آیا ہے اس کو چاہئے کہ اُسی طور سے باہر نکل جائے لیکن خواجہ سراؤں نے بادشاہ کے حکم سے غالباً تجاوز کر کے اس کو دیوار سے نیچے گرا دیا اور دوسرا شخص بھی اسی طرح باغ میں ادھر ادھر پھرتا ہوا پکڑا گیا تھا اور اس نے ظاہر کیا کہ میں دروازہ کے راستہ سے آیا ہوں جس پر بادشاہ نے اس کو تو اسی راستہ سے باہر نکلوا دیا مگر خواجہ سراؤں کو عبرتاً سخت سزا دینے کا مصمم ارادہ کیا کیونکہ نہ صرف حفظ ناموس کی خاطر بلکہ بادشاہ کی ذاتِ خاص کی حفاظت کے لئے بھی محلسرا کی ڈیوڑھی کا زیادہ سخت انتظام کیا جانا ضروری تھا۔

شریف مکہ اور سلطان یمن اور پرنس بصرہ اور بادشاہ حبش کے ایلچیوں کا آنا اور آخر الذکر سفیروں کی نسبت ایک دلچسپ اور ظرافت آمیز بیان

اس واقعہ سے چند مہینے بعد قریباً ایک ہی وقت میں پانچ ایلچی دہلی میں آئے چنانچہ ان میں سے جو سب سے پہلے آیا وہ شریف مکہ کی طرف سے تھا اور جو تحائف وہ لایا تھا ان میں چند عربی گھوڑے اور ایک جھاڑو تھی جو اس معبد کے جھاڑنے بوہارنے کے کام میں آ چکی تھی جو اس مشہور و معروف مسجد کے وسط میں بنا ہوا ہے جو مکہ میں ہے اور جس کی مسلمان لوگ بڑی تعظیم کرتے اور اس کو "بیت اللہ" یعنی خدا کا گھر کہتے ہیں اور ان کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ سب سے پہلا مکان ہے جو خدائے برحق کی عبادت کے واسطے مخصوص کیا

گیا تھا اور اس کو حضرت ابراہیم نے بنایا تھا۔

دوسرا ایلچی بادشاہ یمن نے بھیجا تھا اور تیسرا بصرہ کے "پرنس" (۱۳۴) نے اور یہ دونوں بطور تحفہ عربی گھوڑے لائے تھے اور باقی دو سفیر شاہ اتھوپیا (حبش) کے تھے۔ ان میں سے پہلے تین سفیروں کی خاطر تواضع اس قدر کم ہوئی جو بہ منزلہ نہ ہونے کے تھی۔ کیونکہ ان کا ساز و سامان ایسا حقیر تھا کہ ہر ایک شخص یہ خیال کرتا تھا کہ ان کا آنا صرف اس غرض سے ہے کہ جو تحفے وہ لائے تھے ان کے اور نیز ان بہت سے گھوڑوں اور اور تجارتی جنسوں کے عوض جو اپنا ذاتی اسباب بتا کر بلا ادائے محصول ساتھ لے آئے تھے بہت سارو پیہ کما کر لے جائیں۔ چنانچہ فی الواقع جو روپیہ ان کے تحائف کی عوض میں اور سوداگری مال و اسباب کے فروخت سے حاصل ہوا تھا اس سے انہوں نے یہاں کی تجارتی جنسیں خریدیں اور بلا ادائے محصول ان کو اپنے ساتھ لے جانے کا استحقاق ظاہر کیا۔

مگر شاہ حبش کی طرف سے جو ایلچی آئے تھے ان کا حال کسی قدر توجہ طلب ہے۔ ان سفیروں کے آنے کا یہ سبب تھا کہ جو انقلابِ سلطنت یہاں وقوع میں آیا تھا شاہ حبش کو اس کی مشروحا خبر پہنچ چکی تھی اس لئے اس کو یہ خواہش ہوئی کہ اپنے اقتدار! اور شان و عظمت کے موافق سفارت بھیج کر اس وسیع سلطنت میں اپنی ناموری پھیلائے۔ لیکن بدگمان لوگوں کا یہ قول تھا اور فی الواقع سچ بھی تھا کہ سفیروں کے بھیجنے سے اس حبشی کو صرف وہ قیمتی تحائف مدنظر تھے جن کے حاصل ہونے کی اورنگ زیب کے فیاض ہاتھ سے اس کو یقیناً امید تھی اور جو ایلچی اس نے بھیجے تھے فی الواقع اس کے دربار میں بہت معزز و ممتاز اور ان بڑے بڑے مقاصد کے حاصل کر دینے کے قابل تھے جو اس کے مدنظر تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک ایلچی تو ایک مسلمان (۱۳۵) سوداگر تھا جو چند سال ہوئے جبکہ میں بحر احمر کے راستہ سے بندر مخا میں آیا تھا وہاں مجھ کو ملا تھا اور اس کو عظیم الشان آقا نے بہت سے غلام دے کر اس غرض سے وہاں بھیجا تھا کہ ان کو بیچ کر اس قابلِ تعریف طریقہ سے جو روپیہ ہاتھ آئے اس کے عوض ہندوستانی مال و اسباب خرید لائے۔ واہ! عیسائی ہو کر یہ نامور افریقی بادشاہ کیا عمدہ تجارت کرتا ہے اور دوسرا ایک عیسائی ارمنی سوداگر تھا جو حلب میں پیدا ہوا اور وہیں اس نے شادی بھی کر لی تھی اور اتھوپیا میں اس کا نام مراد مشہور تھا اور مخا میں اس سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی اور اس نے نہ صرف اپنا نصف مکان میرے لئے خالی کر دیا تھا بلکہ وہ صلاح بھی اسی نے دی تھی جس سے میں نے اپنا حبش کا جانا

موقوف رکھااور جس کا ذکر میں نے اپنی اس کتاب کے شروع میں کیااور یہ بھی اسی مذکورہ بالا غرض سے وہاں بھیجا ہوا آیا تھا۔ یہ شخص ہر سال مخا میں شاہ اتھوپیا کی طرف سے انگریزوں اور ڈچوں کی کمپنیوں کے لئے جو ہندوستان میں تجارت کرتی ہیں تحفتا چھ چھ چیزیں لاتااور ان کی طرف سے اپنے بادشاہ کے لئے گونڈار کو لے جاتا ہے۔ چونکہ یہ بادشاہ یہ چاہتا تھا کہ اس کے سفیر ایسی شان و شوکت کے ساتھ جائیں جو اس موقع کے لائق ہو۔ پس اس نے ان کے اخراجات کے لئے بڑی ہی فیاضی ظاہر کی یعنی دونوں کو بتیس بتیس جوان لونڈیاں اور غلام عنایت کئے کہ ان کو مخا میں بیچ کر جو روپیہ اس مبارک تدبیر سے ہاتھ آئے اس کو معاملاتِ سفارت میں خرچ کریں۔ واہ واہ کتنی بڑی فیاضی ہے کیونکہ مخا میں جوان لونڈی غلام حساب اوسط پچیس یا تیس کراون (۱۳۶) قیمت پاتا ہے ان کے علاوہ نہایت ہی چھانٹ کر پچیس غلام خاص اورنگ زیب کے لئے بھیجے تھے جن میں نو یا دس بہت کم سن اور خوجہ بنانے کے قابل تھے۔ واہ کیا کہنا ہے! ایک عیسائی بادشاہ نے ایک مسلمان بادشاہ کے لئے کیا ہی مناسب تحفہ بھیجا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اتھوپیا میں مذہب عیسوی کی کیا حالت ہے۔ ان کے علاوہ شہنشاہ مغل کے لئے پندرہ حبشی گھوڑے جو عربی گھوڑوں کے برابر سمجھے جاتے ہیں اور چھوٹی قسم کا ایک خچر جس کی کھال میں نے بھی دیکھی تھی جو ایسی خوبصورت تھی کہ کسی شیر کے بھی ایسے خط و خال نہیں ہوتے اور نہ ہندوستان کے کسی الائچہ میں جو ایک قسم کا ریشمی کپڑا ہوتا ہے ایسی خوشنما اور طرح طرح کی دھاریاں ہوتی ہیں اور ہاتھی کے دو دانت جو معمول سے زیادہ ایسے بڑے اور بھاری تھے کہ ایک مضبوط شخص ان میں سے ایک کو زمین سے بمشکل اٹھا سکتا تھا اور بیل کا ایک بہت بڑا سینگ جس میں سیویٹ (۱۳۷) بھری ہوئی تھی اور جس کا قطر منہ کی طرف سے نصف فٹ فرانسیسی سے زیادہ میرے ناپنے میں آیا تھا، ان سفیروں کو سپرد ہوئے تھے۔

یہ دونوں ایلچی جب ایسے شاہانہ اور فیاضانہ طور پر ساز و سامان سے درست کئے جا کر گونڈار سے جو ملک حبش کا پائے تخت اور صوبہ ڈیمبیا میں ہے، روانہ کئے گئے تو ان کو ایک ویران ملک میں سے گزرنا پڑا اور بھلول تک پہنچنے میں، جو باب المندب کے قریب مخا کے مقابل ایک غیر آباد بندرگاہ ہے، دو مہینے لگے۔ ان لوگوں کے کاروان کے معمولی راستہ سے جو چالیس روز میں بآسانی طے ہو جاتا ہے آرکیکو کو جانے کی جرأت نہ کرنے کا یہ باعث تھا کہ آرکیکو سے جزیرہ مصوع کو جانا پڑتا ہے جہاں سلطنت ترکی کی کچھ فوج

رہتی ہے۔ جبکہ یہ لوگ بحر احمر سے عبور کرنے کی خاطر مخا کو جانے والے جہاز کے انتظار میں بہلول میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اشیائے مایحتاج کے موجود نہ ہونے سے بہت تکلیف میں رہے اور کئی غلام مر گئے اور اس کے سوا مخا میں پہنچنے پر یہ معلوم ہوا کہ اب کی دفعہ بردے بہت کثرت سے آئے ہیں اور اس لئے جو لونڈیاں اور غلام باقی رہ گئے تھے وہ بھی کم قیمت پر بیچنے پڑے۔ بہر حال جب لونڈی غلام بک چکے تو انہوں نے اپنا سفر پھر شروع کیا اور ایک ہندوستانی جہاز پر سوار ہو کر جو سورت کو آتا تھا پچیس دن کے عرصہ میں جو اس سفر کے لئے چنداں زیادہ نہ تھا منزل مقصود پر پہنچ گئے مگر بہت سے گھوڑے اور کئی ایک غلام غالباً کافی خوراک نہ ملنے سے مر گئے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس باشان و شوکت! سفارت کے پاس اتنا روپیہ کہاں تھا جو خرچ کے لئے مکتفی ہوتا اور جہاز ہی میں وہ بے چارہ خچر بھی مر گیا لیکن یہ اس کی کھال حفاظت سے لیتے آئے جس کو میں نے بھی دہلی میں دیکھا تھا۔

ان کو سورت میں پہنچے ہوئے چند ہی گھنٹے گزرے تھے کہ بیجاپور کے ایک مشہور باغی نے جس کا نام سیواجی ہے شہر کو آ کر لوٹ لیا اور آگ لگا دی اور اس عام آتش زدگی میں اگرچہ وہ مکان بھی جہاں یہ ٹھہرے ہوئے تھے جل گیا مگر آگ اور دشمن دونوں کے ہاتھ سے جس طرح بن پڑا ان کی سفارت کی سندیں اور وہ چند غلام جو کسی وجہ سے یا تو سیواجی کے ہتھے نہ چڑھے یا جن کو بیمار دیکھ کر اس نے خود ہی چھوڑ دیا اور ان سفیروں کے حبشی لباس جو اس کو پسند نہ آئے اور وہ خچر کا چمڑہ جس کی اس نے کچھ پروا نہ کی اور وہ بیل کا سینگ جس کو سیویٹ سے پہلے ہی خالی کر چکے تھے بچ رہے۔

ان عالی شان! سفیروں نے اپنے لٹ جانے کی نسبت بڑے بڑے مبالغے کئے مگر بدگمان ہندوستانی جنہوں نے ان کو جہاز سے اترتے وقت اس حالت میں دیکھا تھا کہ نہ تو اچھا لباس و پوشاک ہی تھی اور نہ روپیہ یا کسی مہاجن کے نام کی ہنڈی ہی پاس تھی بلکہ فاقوں کے مارے نیم مردہ ہو رہے تھے، یہ کہتے تھے کہ فی الواقع یہ تو ان کی خوش نصیبی تھی کہ سورت کے لٹنے اور جلائے جانے کے باعث یہ اس ذلت سے بچ گئے جو ان کو اپنے ذلیل اور ناچیز تحائف کے دہلی تک لانے میں اٹھانی پڑتی اور سیواجی کی بدولت ان کو سورت کے صوبہ دار کے سامنے فقیرانہ حالت میں جانے اور دار السلطنت تک پہنچنے کے لئے خرسواری مانگنے کا ایک عمدہ بہانہ ہاتھ آ گیا اور غلام اور سیویٹ بیچ کر کھا جانے کے الزام سے بھی

بری رہے۔

میرے لئیق دوست ڈچوں کے کارخانہ کے مختار مسٹر ایڈریکن نے مراد کو میرے نام کی ایک سفارشی چٹھی دی تھی جو اس نے دہلی میں آکر مجھے دی اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ پانچ چھ برس بعد اس سے اس طرح پر پھر ملاقات ہوئی اور وہ اس بات کو بالکل بھول گیا تھا کہ میں مخا میں اسی کے ہاں ٹھہرا تھا۔ پس میں اپنے پرانے دوست سے بغلگیر ہوا اور وعدہ کیا کہ حتی الوسع میں تم کو مدد دوں گا۔ اگرچہ اہلِ دربار سے میری بہت کچھ رسائی اور ملاقات تھی مگر ان تہی دست ایلچیوں کی امداد ایک مشکل کام تھا۔ کیونکہ بجز خچر کے اس چمڑے اور بیل کے اس سینگ کے جس میں انہوں نے اپنے پینے کے لئے قندی شراب جو ان کو بہت مرغوب ہے بھر رکھی تھی اور کچھ باقی نہ تھا اور بیش قیمت تحائف کے موجود نہ ہونے سے لوگوں کی نظروں میں ان کی حقارت تھی اس کو ان کی ظاہری ذلیل حالت نے اور بھی بڑھادیا تھا اور وہ بدوؤں کا سا لباس پہنے ہوئے پالکی کے بغیر پا پیادہ شہر میں پھرا کرتے تھے اور سات آٹھ غلام سروپا برہنہ پیچھے پیچھے ہوتے تھے جن کے پاس سوائے ایک مکروہ چھوٹے سے تہمت اور ایک پھٹی پرانی چادر کے جسے بائیں کاندھے پر ڈال کر داہنے بازو کے نیچے سے نکالے ہوئے ہوتے تھے کچھ پوشاک اور لباس نہ تھا اور بجز ایک ٹوٹی پھوٹی کرایہ کی بہلی اور ایک گھوڑے کے جو ہمارے پادری صاحب کا تھا اور کوئی گھوڑا بھی ان کے پاس نہ تھا یا کبھی کبھی میرا گھوڑا مانگ لیتے تھے جس کو سواری لے لے کر قریب المرگ کر دیا تھا۔ پس ہر چند میں نے ان ذلیل اور حقیر سفیروں کے لئے بہت کوشش کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا کیونکہ لوگ ان کو فقیر سمجھ کر کچھ ملتفت نہ ہوتے تھے۔ لیکن بہر حال ایک روز جبکہ میں اپنے آقا دانشمند خاں کے پاس (جو ممالکِ غیر کے معاملات کا وزیر ہے) خلوت میں بیٹھا تھا میں نے شاہ ایتھوپیا کی شان و عظمت کا ذکر ایسی آب و تاب سے کیا کہ اورنگ زیب ان کو اپنے حضور میں بلانے اور خریطہ کے قبول کرنے پر مائل ہو گیا اور جب یہ حاضر ہوئے تو دونوں کو زر بفت کا ایک ایک ''سراپا'' اور ریشمی زری کارپٹکہ اور مندیل عنایت کی اور مراسم مہمان داری کے لئے بھی حکم ہو گیا اور چند ہی روز بعد جب رخصت کئے گئے تو پھر ایک ایک ''سراپا'' مع چھ ہزار روپیہ نقد کے مرحمت ہوا مگر یہ روپیہ مساوی طور نہ دیا گیا تھا بلکہ مسلمان کو چار ہزار اور مراد کو عیسائی ہونے کی وجہ سے صرف دو ہزار ملا اور ان کے آقا کے لئے بطور تحفہ ایک نہایت بھاری ''سراپا'' اور چاندی کے ملمع کی دو شہنائیں اور چاندی کے نقارے اور

یاقوت کے جڑاؤ قبضہ کا ایک خنجر اور بیس ہزار روپیہ نقد عنایت ہوا اور چونکہ ملک حبش میں سکہ کا چلن نہیں ہے اس لئے اورنگ زیب نے براہ مہربانی یہ فرمایا کہ امید ہے یہ نقد تحفہ خصوصیت کے ساتھ قبولیت کے لائق ہوگا اور ایک اعجوبہ چیز خیال کیا جائے گا۔ مگر شہنشاہ مغل خوب جانتا تھا کہ ان میں سے ایک روپیہ بھی ہندوستان سے باہر نہ جائے گا اور یہ لوگ اس سے کار آمد جنسیں خرید لیں گے۔ چنانچہ ویسا ہی ہوا اور انہوں نے اس روپیہ سے کچھ تو گرم مصالحے لے لئے اور کچھ مہین سوتی کپڑے کے تھان بادشاہ اور ملکہ اور ولی عہد کے پیراہنوں کے لئے اور الاچے جو ایک ریشمی دھاری دار کپڑا ہے اور سنہری یا روپہلی زری ملا کر بنا جاتا ہے قبا اور پاجامے بنانے کی خاطر خرید لئے اور بادشاہ کی دو عباؤں کے لئے جو عربوں کا ایک لباس ہے سرخ اور سبز رنگ کی انگریزی بانات اور ان کے سوا بہت سا کپڑا مگر ذرا کم قیمت محلسرا کی معزز عورتوں اور ان کے لڑکے بالوں کے لئے خریدا اور اس سفارت پر آنے کی وجہ سے اس تمام اسباب کا محصول تو معاف ہی تھا۔

اگرچہ مراد میرا بہت دوست تھا مگر تین باتوں سے مجھے اس کے حق میں کوشش کرنے سے پشیمانی ہوئی۔ ایک یہ کہ اس نے باوجود وعدہ کرنے کے پچاس روپیہ کو میں اپنا بیٹا تمہارے پاس بیچ ڈالوں گا کہہ بھیجا کہ تین سو روپیہ سے کم کو نہیں دوں گا اور میں اس پر بھی راضی تھا کہ تین سو ہی دے کر خرید لوں تاکہ مجھ کو اس بات کے کہنے کی گنجائش ہو کہ ایک شخص نے خاص اپنا بیٹا میرے پاس بیچ ڈالا تھا۔ یہ لڑکا خوب تازہ توانا اور سڈول بدن کا تھا اور رنگ بھی خوب صاف سیاہ تھا اور اور حبشیوں کی طرح ناک بھی چپٹی نہ تھی اور نہ ہونٹ ہی موٹے تھے مگر چونکہ اس کے باپ نے وعدہ خلافی کر کے مجھے نہ دیا تو اس سے میں بہت ہی ناخوش ہوا۔

دوسری یہ کہ اس نے اور اس کے مسلمان رفیق نے اورنگ زیب سے پختہ وعدہ کیا تھا کہ ہم اپنے بادشاہ سے اس مسجد کی مرمت کی بالضرور اجازت لے دیں گے جو پرتگیزوں کے وقت سے ویران اور کھنڈر پڑی تھی۔ چنانچہ اورنگ زیب نے اس کی مرمت کے لئے بھی دو ہزار روپیہ ان کو حوالہ کیا۔ یہ مسجد ایک شیخ یا درویش کے مقبرے کے طور پر بنائی گئی تھی جو مکہ سے ملک حبش میں صرف اس غرض سے چلا گیا تھا کہ وہاں دین اسلام پھیلائے اور یہ ان پرتگیزوں نے مسمار کر دی تھی جو گوا سے فوج لے کر اس ذی حق بادشاہ کی مدد کو آ گئے تھے جو عیسائی ہو گیا تھا اور جس کو خارج کر کے ایک مسلمان شہزادہ تخت پر ہو

بیٹھا تھا۔

تیسری یہ کہ اس نے شاہ حبش کی طرف سے اورنگ زیب سے یہ درخواست کی کہ ایک قرآن اور آٹھ اور کتابیں (جن کے نام سے بھی میں واقف ہوں اور جو ان کتابوں میں اوّل درجہ کی مشہور ہیں جو مذہب اسلام کی تائید میں تصنیف ہوئی ہیں) عنایت ہوں اور میری رائے میں ایک عیسائی بادشاہ کے ایک عیسائی سفیر کا ایسا کرنا ایک نہایت ہی ذلیل اور معیوب امر تھا اور مخا میں جو کچھ میں نے سنا تھا کہ حبش میں دین عیسوی کی کیسی مبتذل حالت ہے اس سے اس کی خوبی تصدیق ہو گئی۔

بے شبہ اس بادشاہ کی حکمرانی کے تمام طور وطریق اور رعیت کے اوضاع واطوار سے اسلام کی بُو آتی ہے اور بے شک جب سے وہ بادشاہ مر گیا ہے جس کو پرتگیزوں نے اپنی فوج کی مدد سے تخت پر بٹھایا ہوا تھا جو لوگ کہ صرف نام کے عیسائی ہیں ان کی تعداد بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ اس بادشاہ کے مرتے ہی اس کی ماں کی فتنہ پردازیوں سے پرتگیز کچھ تو مارے گئے اور کچھ نکال دیے گئے اور فرقہ جیسویٹ کے پیٹری آرک یعنی بڑے پادری کو جسے اس کے ہم وطن پرتگیز گوا سے لائے تھے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔

جس زمانہ میں یہ سفیر دہلی میں تھے میرے آقا دانشمند خاں جو نئی معلومات کا ہمیشہ سے شائق ہے ان کو اکثر اپنے ہاں بلا کر ان کے ملک اور طریق حکمرانی کی بہت سی باتیں پوچھتا رہتا تھا۔ لیکن اس کا اصل مدعا یہ تھا کہ دریائے نیل کا مخرج معلوم کرے۔ یہ لوگ دریائے نیل کو ابابیل کہتے ہیں اور ان کا قول ہے کہ اس کا مخرج خوبی معلوم ہے چنانچہ مراد اور ایک مغل نے جو اس کا ہم سفر تھا بالاتفاق بیان کیا کہ ہم نے اس مقام کو دیکھا ہے اور انہوں نے جو کچھ کہا وہ بعینہ وہی تھا جو میں نے مخا میں سنا تھا یعنی یہ کہ اس کا مخرج ملک اگوس میں ہے اور وہ قریب قریب دو جوشندہ چشمے ہیں جو باہم مل کر تیس یا چالیس قدم کے طول کی ایک چھوٹی سی جھیل بن جاتے ہیں اور جو پانی اس جھیل سے نکلتا ہے اگر چہ وہ خود بھی ایک اچھے خاصے دریا کے موافق ہے مگر آئندہ چھوٹے چھوٹے بہت سے ندی نالوں سے جو قدم قدم پر اس سے آکر ملتے جاتے ہیں بڑھتا جاتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ دریا اس طرح پر چکر کھا کر بہا ہے کہ گویا بیچ میں ایک بڑا جزیرہ بن گیا ہے۔ اور کئی ایک سیدھی چٹانوں پر سے اتر کر ایک بہت ہی بڑی جھیل میں جا گرتا ہے جس میں بہت سے زرخیز جزیرے ہیں اور گھڑیال بھی کثرت سے ہیں اور بشرطیکہ سچ ہو، ایک اور جانور اس

میں بتایا جو بہت ہی اعجوبہ ہے یعنی ایک دریائی جھرا جس کے منہ کے سوا فضلہ کے خارج ہونے کے لئے اور مخرج ہی نہیں ہے۔ اور یہ جھیل ڈیمبیا کے ملک میں گونڈار سے تین مختصر منزلوں اور نیل کے مخرج سے چار یا پانچ دن کے سفر کے فاصلہ پر بتائی اور کہا کہ جب یہ دریا اس جھیل سے نکل کر آگے کو بڑھتا ہے تو بہت سے دریاؤں اور برساتی نالوں کی وجہ سے جو اس جھیل میں آکر گرتے ہیں اس کا پاٹ بہت بڑھ جاتا ہے خصوصاً برسات میں جو ہندوستان کی طرح یہاں بھی ایک معین موسم ہے اور تقریباً جولائی کے آخر سے شروع ہوتا ہے۔

میرے نزدیک یہ اخیر بات ایک طرح سے امر اہم اور قابلِ لحاظ ہے کیونکہ اس سے اس دریا کی طغیانی کی وجہ معلوم ہوتی ہے اور انہوں نے کہا کہ دریا اس جھیل سے نکل کر جس کا ابھی ذکر ہوا شہر "سے نار" کی طرف جاتا ہے جو "فن جی" کا پائے تخت ہے جو شاہ اتھوپیا کا ایک باجگزار ملک ہے اور اسی طرح آگے کو بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ آخر کار مصر کے میدانوں میں جا پہنچتا ہے۔ ان سفیروں نے اپنے بادشاہ کی شان و شوکت اور فوجی قوت کا حال اس قدر بڑھا کر بیان کیا کہ مجھے اور دانشمند خاں دونوں کو ناپسند ہوا۔ مگر ان کا وہی رفیقِ سفر مغل اس مدح سرائی میں شریک نہ تھا اور ان کی غیبت میں اس نے ہم سے کہہ دیا کہ میں نے دو دفعہ وہاں کی فوج کو عین میدان اور ایسے وقت میں دیکھا جب کہ خود بادشاہ اس سے کام لے رہا تھا اور میرے خیال میں کسی فوج کا اس سے زیادہ شکستہ حال اور بے انتظامی یک حالت میں ہونا ممکن نہیں اور ایسے ہی اور بہت حالات اس ملک کے ہم کو سنائے جو سب میرے روزنامچہ میں لکھے ہوئے ہیں اور امید ہے کہ کسی دن لوگوں کی اطلاع کے لئے میں ان کو چھپوا سکوں گا اور بالفعل میں صرف تین چار ہی باتوں کے لکھنے پر جو مراد نے ہم سے بیان کی تھیں قناعت کرتا ہوں اور چونکہ وہ ایسی سر زمین سے علاقہ رکھتی ہیں جو عیسائیوں کا ملک سمجھا جاتا ہے اس لئے نہایت تعجب کے لائق ہیں۔ چنانچہ اس نے بتایا کہ حبش میں چند ہی آدمی ایسے ہوں گے جن کے کئی کئی بیویاں نہ ہوں اور بغیر کسی طرح کے شرم و لحاظ کے خود اپنی بابت بھی کہہ دیا کہ منکوحہ بیوی کے سوا جو حلب میں ہے دو جورئیں اور بھی ہیں اور بیان کیا کہ جس طرح ہندوستان کے مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کی بھی عورتیں پردہ میں رہتی ہیں حبش میں نہیں رہتیں اور غریب گھرانوں کی عورتیں خواہ بیاہی ہوں یا کنواری اور لونڈی ہوں یا آزاد رات دن ایک ہی مکان میں باہم رہتی ہیں اور رشک و حسد

کے خیالات جو اور قوموں کی عورتوں میں عموماً ہوتے ہیں یہ جانتی بھی نہیں اور بڑے بڑے امیروں کے گھروں کی عورتیں اور ان کی جوروئیں اگر کسی خوبصورت سوار سپاہی پر طبیعت آجائے تو اس کے چھپانے کی چنداں پروا نہیں کرتیں بلکہ جب چاہتی ہیں بے خوف و خطر اس کے گھر چلی جاتی ہیں اور یہ بھی کہا کہ اگر تم وہاں جاتے تو خواہی نخواہی شادی کرنی ہی پڑتی چنانچہ چند سال ہوئے کہ ایک یورپین درویش کو جس نے اپنے تئیں ایک طبیب باشندۂ یونان ظاہر کر رکھا تھا زبردستی جورو کرا دی گئی اور لطف یہ کہ جس عورت کو اس نے اپنے بیٹے کی شادی کے لئے تجویز کیا تھا اسی سے اس کا نکاح پڑھوا دیا گیا اور ایک قصہ یہ سنایا کہ ایک اسی برس کے بڈھے نے اپنے چوبیس بیٹے جو جوان اور ہتھیار باندھنے کے قابل تھے بادشاہ کے رُو برو پیش کئے بادشاہ نے پوچھا کہ کیا تیرے صرف اتنے ہی لڑکے ہیں؟ جب اس نے عرض کیا کہ ہاں لڑکے تو اتنے ہی ہیں مگر چند لڑکیاں بھی ہیں تو بادشاہ نے جھنجلا کر کہا کہ "او بڈھے بیل میرے سامنے سے دور ہو! مجھ کو تعجب آتا ہے کہ شرمندہ ہونے کی جگہ تو شیخی بگھارتا ہے! کیا ہمارے ملک میں عورتوں کا کال پڑ گیا ہے کہ تیری سی عمر کا آدمی صرف دو درجن لڑکوں کا باپ ہونے پر اتراتا ہے" اور اس نے کہا کہ ہمارے بادشاہ کے کم سے کم اسی لڑکے بالے ہیں جو محل میں جدھر دیکھو وہی دوڑتے پھرتے نظر آتے ہیں اور ان کی یہ پہچان ہے کہ ہر ایک کے پاس بادشاہ کی دی ہوئی ایک گول رنگین چھڑی ہوتی ہے جس کو یہ نسبت اور لڑکوں کے وہ اپنے لئے "سیپ ٹر" (۱۴۸) کی طرح باعثِ امتیاز سمجھ کر خوشی خوشی ہاتھ میں لئے پھرا کرتے ہیں۔

میرے آقا کی طرح اورنگ زیب نے بھی دو دفعہ ان سفیروں کو اس امید سے اپنے حضور میں بلایا کہ ان سے ان کے ملک کے کچھ حالات معلوم ہوں۔ مگر اس کی زیادہ تر غرض یہ معلوم کرنا تھا کہ دینِ اسلام کی وہاں کیا حالت ہے اور وہ خچر کی کھال بھی منگوا کر دیکھی جو نہ معلوم کس طرح قلعہ ہی میں بادشاہی عہدہ داروں کے پاس رہ گئی اور مجھے اس کے حاصل ہونے کا ارمان ہی رہ گیا۔ کیونکہ انہوں نے میری کارگزاری کے صلہ میں اس کے دے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اور میں یہ خیال کر کے کہ کسی دن اپنے ملک میں پہنچ کر عجیب چیزوں کے کسی شوقین شخص کی نذر کر سکوں گا دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا اور میں نے ان سفیروں کو بہت تاکید سے یہ بھی کہا تھا کہ اس کھال کے ساتھ بادشاہ کو وہ سینگ بھی ضرور دکھانا مگر انہوں نے اس خوف سے اس کو پیش نہ کیا کہ مبادا ہم سے یہ پوچھا جائے کہ سورت

کی لوٹ میں جب یہ بچ رہا تو اس کے اندر کی خوشبودار چیز کہاں گئی! اور ہم اس کا کیا جواب دیں گے۔!

اورنگ زیب کا اپنے تیسرے لڑکے سلطان اکبر کی تعلیم و تربیت کے لئے اتالیق تجویز کرنا اور شہزادوں کے نقصِ تربیت کے نتائج کی ایک مکمل تصویر

شاہ حبش کے سفیر ابھی دہلی ہی میں تھے کہ اورنگ زیب نے اپنے دربار کے خاص خاص امرا اور علما کو اس مشورت کے واسطے جمع کیا کہ اپنے تیسرے لڑکے سلطان اکبر کی تعلیم و تربیت کے لئے جس کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا ایک اتالیق تجویز کرے اور ان سے فرمایا کہ میری بڑی آرزو ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت ایسی کی جائے کہ جس سے کامل توقع اس امر کی ہو سکے کہ ہر طرح کی لیاقتوں کے لحاظ سے یہ لڑکا مشہورِ آفاق ہو۔ چنانچہ میری رائے میں کوئی شخص اورنگ زیب سے زیادہ اس امر سے واقف نہیں کہ شہزادوں میں ہر ایک طرح کے مفید علموں اور ہنروں کا موجود ہونا ضروری اور لابدی ہے۔ کیونکہ ان کی نسبت یہ امید ہوتی ہے کہ کسی آئندہ وقت میں فرماں روا اور حاکم بنیں گے۔ اس کا قول ہے کہ جس طرح سے باعتبار اپنے مرتبہ اور اختیار کے ان کو اور لوگوں پر فضیلت ہے اسی طرح لازم ہے کہ دانائی اور صفاتِ حمیدہ میں بھی ان سے افضل ہوں اور وہ خوب جانتا ہے کہ ممالکِ ایشیا میں جو آفتیں اور مصیبتیں سلطنتوں پر پڑا کرتی ہیں اور وہ بد عملی اور بد انتظامی جس سے آخر کار وہ برباد اور تباہ ہو جاتی ہیں اس کا باعث اگر ڈھونڈا جائے تو ہمیشہ یہی نکلے گا کہ شہزادوں کی تعلیم و تربیت ناکافی اور برے طور پر ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ بچپن ہی سے عورتوں اور خواجہ سراؤں یا ان غلاموں کے سپرد رہتے ہیں جو ملک روس اور سرکیشیا اور مغولستان اور گرجستان اور حبش سے آتے ہیں اور کم بخت غلامی کا یہ خاصہ ہی ہے کہ اس سے عقل و تمیز خراب اور یہ عادت ہو جاتی ہے کہ اپنے سے زبردستوں کے سامنے بہت ہی عجز اور فروتنی سے پیش آتے اور کمزوروں اور ماتحتوں پر خواہ مخواہ زور و زیادتی جتاتے ہیں۔ پس یہ شہزادے جب محلوں میں سے نکل کر تخت نشین ہوتے ہیں تو وہی ظالمانہ اور خراب عادتیں جو سیکھی ہوئی ہوتی ہیں ساتھ لے آتے ہیں اور ان فرائض سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں جو ان کی اس نئی حالت کو

لازم ہیں اور اپنی زندگانی کی اس تماشاگاہ میں اس طرح پر خلائق کے سامنے آتے ہیں کہ گویا کسی اور ہی دنیا سے آئے ہیں اور ہر ایک چیز کو ایسے بھولے پن اور حیرانی کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ گویا کسی اندھیری کوٹھڑی یا تہہ خانہ میں سے آج ہی پہلے پہل نکلے ہیں اور یا تو بچوں کی طرح ہر بات پر یقین کر لیتے یا ہر چیز سے ڈرتے اور خوف کھاتے ہیں یا ایسے ہٹیلے اور بے پروا اور احمق ہوتے ہیں کہ معقول صلاح اور مشورہ کی بات کو سنتے ہی نہیں اور کیسا ہی خراب کام کیوں نہ ہو اس کے کر بیٹھنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے اور تخت پر بیٹھ کر یا تو اپنی جبلی طبیعت اور مزاج کے سبب سے یا ان خیالات کی وجہ سے جو پہلے سے ان کے دل میں ٹھائے ہوئے ہوتے ہیں ایک مصنوعی وقار اور تمکنت دکھاتے ہیں۔ مگر ہر کسی کو بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ اصل سنجیدگی اور وقار ان میں نام کو بھی نہیں اور یہ ظاہرداری صرف کسی بری سکھاوٹ کا اثر ہے جس کو بجائے متانت اور سنجیدگی کے ایک حیوانیت اور بے ہودہ نمائش کہنا چاہئے اور بہ تکلف ایک ایسی خوش خلقی اختیار کرتے ہیں جو بادشاہوں کی شان کے ہرگز لائق نہیں ہوتی اور بناوٹی ہونے کی وجہ سے مکروہ معلوم ہوتی ہے۔ پس ایسا کون شخص ہے جو ممالک ایشیا کی تاریخ سے واقف ہو اور میرے اس بیان کی صحت سے جو ایشیائی شہزادوں کی حالت کی ایک ٹھیک تصویر ہے، انکار کر سکے۔ اور میں پوچھتا ہوں کہ کیا ممالک ایشیا کے بادشاہ آنکھیں بند کر کے حیوانوں کی سی بے رحمیاں نہیں کرتے رہے اور ان کی بے رحمی کیا کبھی کسی معین طریقہ پر ہوتی تھی؟ اور کیا وہ مطلقاً نامنصفانہ نہ تھی؟ اور کیا وہ بے حد شراب خوری کی ذلیل اور کمینہ عادت میں مبتلا اور بغیر کسی طرح کی شرم کے عیاشی و شہوت پرستی میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں؟ اور حرموں کی صحبت میں اپنی تندرستی اور عقل بالکل غارت اور برباد نہیں کرتے؟ اور کیا انہوں نے سلطنت کے کاروبار کی عوض اپنا تمام وقت سیر و شکار ہی میں نہیں کھویا؟ اور اگرچہ ان بے درد بادشاہوں کو اپنے شکاری کتوں سے بہت محبت ہوتی ہے اور ان کی غور و پرداخت کا بہت خیال کرتے ہیں مگر ان بے چارے غریب لوگوں کی مصیبتوں کی جو شکار میں ساتھ جانے کے لئے بے گار میں پکڑے جاتے اور گرمی اور سردی کی شدت اٹھاتے اور بھوک اور تکان سے مر جاتے ہیں ان کو مطلقاً پروا بھی نہیں ہوتی۔

ایشیائی شہزادوں کے بد عادتوں میں مبتلا ہونے اور ان کی غفلت شعاری اور وزیر یا کسی لونڈی یا خواجہ سرا کے زور و تسلط اور اس کے نتائج کا بیان

الغرض ایشیائی بادشاہ نہایت ہی ہولناک بد عادتوں میں مبتلا رہتے ہیں اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ان کی یہ خراب عادتیں انواع و اقسام کی ہوتی ہیں اور اس اختلاف کا سبب یا تو ان کا طبعی میلان ہوتا ہے یا وہ خیالات ان کا باعث ہوتے ہیں جو ابتدائے عمر سے ان کی طبیعت میں بٹھا دیئے جاتے ہیں اور شاذ نادر ہی کوئی بادشاہ ایسا ہوتا ہے جو اپنی سلطنت کے اندرونی اور پولیٹیکل امور سے بدرجہ غایت ناواقف نہ ہو۔ وہ اپنی سلطنت کی باگ اکثر کسی وزیر کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں جس کا منصوبہ یہ ہوتا ہے کہ خود مختارانہ اور بلا روک ٹوک اور بغیر کسی طرح کے خوف و خطر کے حکومت کرنے کی غرض سے حقیر اشغال میں اپنے آقا کے مبتلا رہنے کی اور بھی تائید کر کے اس کی طبیعت کو امور سلطنت کی واقفیت سے باز رکھتا ہے اور اگر وزیر اعظم امور سلطنت کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتا تو بادشاہ کی ماں جو اصل میں کوئی لونڈی باندی ہوتی ہے اور کچھ خواجہ سرا ملک پر حکومت کرتے ہیں جن کی تدبیریں وسیع اور آزادانہ خیالات پر مبنی نہیں ہوتیں بلکہ ہمیشہ انہی بے رحمانہ جوڑ توڑوں میں لگے رہتے ہیں کہ اپنے ہم جنسوں میں سے کسی کو پھانسی دیں اور کسی کو قید یا جلاوطن کریں اور ہم جنسوں پر ہی کیا منحصر ہے یہی سلوک وہ اکثر اوقات بڑے بڑے امرا بلکہ خود وزیر کے ساتھ بھی کرتے ہیں اور فی الواقع ان کے تسلط کے زمانہ میں جو سلطنت کے لئے شرم کا موجب ہوتا ہے کسی شخص کی زندگی جو کچھ بھی مال و دولت رکھتا ہو، ایک دن کے لئے بھی محفوظ نہیں ہوتی۔

سفیر ایران کا دہلی میں آنا

اورنگ زیب کے حضور میں مذکورہ بالا ملکوں کے سفیر جب حاضر ہو چکے تو آخر کار دربار شاہی میں یہ خبر پہنچی کہ ایران کا سفیر بھی سرحد پر پہنچ گیا ہے اور یہاں کے ایرانی امرا اور اہل ایران نے یہ مشہور کر دیا کہ نہایت ہی اہم معاملات اس کے آنے کے باعث ہوئے ہیں۔ لیکن سمجھ دار لوگوں نے اس پر بالکل یقین نہیں کیا کیونکہ اہم معاملات کا وقت گزر چکا تھا اور یہ بات ظاہر تھی کہ ان لوگوں کے ایسا مشہور کرنے کا سبب بجز اس بے ہودہ خواہش کے کہ اپنے ملک کی عظمت و اقتدار کا اظہار کریں اور کچھ نہ تھا۔ ان کا یہ بھی ادعا تھا کہ جو امیر اس کے استقبال اور تواضع و تکریم کے واسطے مامور ہوا ہے، اس کو بہ تاکید یہ فہمائش ہوئی ہے کہ جس طرح ممکن ہو دہلی پہنچنے سے پہلے سفیر کے آنے کا اصل مدعا دریافت کرے اور اس کو

یہ بھی ہدایت ہوئی ہے کہ اس مدمع سفیر کو رفتہ رفتہ اس امر پر مائل کر دے کہ وہ دربار میں ہندوستان کے قاعدہ کے موافق رسم تسلیمات بجالائے اور اس کو یہ بھی سمجھا دے کہ قدیم سے یہ دستور ہے کہ شاہ ایران کا نامہ بلاواسطہ کسی امیر کے خود بادشاہ کو نہیں دینا چاہئے۔ لیکن جو کچھ میں نے دیکھا اس سے ظاہر ہو گیا کہ یہ سب لغو کہانیاں تھیں اور جو مرتبہ خدا نے اورنگ زیب کو بخشا ہے وہ ایسی باتوں کا محتاج نہیں ہے۔

سفیر ایران کی جس طرح پر تعظیم و تکریم ہوئی اور جس طرح سے اورنگ زیب اس سے پیش آیا اور جو تحائف اس نے پیش کئے ان کا بیان

جب یہ سفیر دار السلطنت دہلی میں پہنچا تو اس کی تعظیم و تکریم کا اظہار واجب طور سے کیا گیا یعنی جن بازاروں میں سے وہ ہو کر گزرا ان پر سفیدی وغیرہ از سر نو کرائی گئی اور تین میل کے قریب دو رویہ سواروں کی فوج صف بستہ کھڑی کی گئی اور بہت سے امرائ اپنے اپنے باجے گاجوں کے اس کی سواری کے ساتھ تھے اور قلعہ شاہی کے دروازہ میں پہنچتے ہی توپ خانہ سے سلامی ہوئی اور اورنگ زیب اس سے نہایت اخلاق اور مہربانی سے پیش آیا اور اہل ایران کے طور پر اس کے سلام کرنے سے ناخوش نہیں ہوا اور اس کے ہاتھ سے شاہ کا خریطہ بھی بلاتردد لے لیا۔ بلکہ بطور تعظیم اس کو اپنے تاج کے قریب تک لے گیا اور پھر ایک خواجہ سرا سے اس کی مہر کھلوا کر نہایت متانت کے ساتھ ملاحظہ کیا اور حکم دیا کہ سفیر کو سراپا پہنایا جائے۔ چنانچہ قبائے زربفت اور مندیل اور ریشمین زری کار پٹکہ عنایت ہوا اور اس رسم کے بعد سفیر کو تحائف پیش کرنے کا اشارہ ہوا۔ چنانچہ پچیس ایسے خوبصورت گھوڑے جو میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے مع زردوزی اور زربفت کی گردنیوں کے اور بیس نہایت اعلیٰ نسل کے ایسے قوی اور قد آور اونٹ جن کو ہاتھی کے پاٹھے کہنا زیبا ہے اور بہت سے صندوق عمدہ گلاب اور ایک اور عرق کہ جس کو بید مشک کہتے ہیں اور جو نہایت مفرح سمجھا جاتا ہے اور کمیاب چیز ہے اور پانچ چھ بڑے بڑے اور خوبصورت قالین اور کئی بہت ہی بڑھیا تھان زربفت کے جن پر نہایت باریک گلکاری کی ہوئی تھی اور ایسے سبک اور پاکیزہ وضع کے تھے کہ مجھے شک ہے کہ کبھی کوئی ایسی نفیس چیز یورپ میں دکھائی دی ہو اور جڑاؤ قبضہ کے چار دمشقی خنجر اور چار مرصع پیش قبض اور پانچ یا چھ گھوڑوں کے بہت ہی خوبصورت ساز جن کو سب لوگوں نے خصوصیت سے پسند کیا اور واقع میں بہت ہی خوشنما اور قیمتی تھے اور جن پر

چھوٹے چھوٹے موتیوں اور پرانی کان کے فیروزوں سے نہایت ہی اعلیٰ قسم کی مرصع کاری کی ہوئی تھی پیش ہوئے۔ اورنگ زیب نے سب چیزوں کو بڑے غور سے ملاحظہ کیا اور حاضرینِ دربار کو اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان عمدہ تحائف سے بہت ہی زیادہ بلکہ معمول سے بڑھ کر خوش ہوا ہے۔ اس نے ان چیزوں کی خوبی اور نفاست اور کمیابی اور شاہ کی اس مہربانی اور کشادہ دلی کی کہ کیسے کیسے بیش بہا تحفے بھیجے ہیں، بار بار تعریف کی اور سفیر کو بڑے ذی مرتبہ امرا میں جگہ دی اور اس کے دور و دراز سفر کا ذکر کر کے اس معزز اور عالی مرتبہ مہمان سے فرمایا کہ اس وقت آپ آرام کریں اور ہم آپ کو ملاقات کے لئے ہر روز بلایا کریں گے۔

یہ سفیر چار پانچ مہینے دہلی میں رہا اور اس کے سب اخراجات بہت تکلف کے ساتھ خزانہ شاہی سے ہوتے رہے اور امرائے دربار نے نوبت بہ نوبت بڑی بڑی ضیافتیں کیں اور بوقت رخصت بادشاہ نے ایک اور بھاری سراپا مع کئی بیش بہا چیزوں کے عنایت کیا اور شاہ ایران کے لئے تحائف بھیجے جانے کی نسبت یہ تجویز ٹھہری کہ پیچھے سے ایک اپنے سفیر کی معرفت بھیجے جائیں گے۔ چنانچہ اس سفارت کے لئے ایک امیر مقرر بھی کیا گیا۔ (۱۳۹)

اہلِ ایران مقیم دہلی کا نامہ شاہ ایران کے مضمون کے باب میں مختلف افواہیں اڑانا اور ان کی نسبت مصنف کی رائے

اگرچہ بہ نسبت اور سفیروں کے جو پہلے آچکے تھے اورنگ زیب نے اس سفیر کا بہت ہی اعزاز کیا اور دل سے خاطر و مدارات کی۔ مگر اس پر بھی ان ایرانیوں نے جو دہلی میں تھے یہ بات مشہور کر دی کہ شاہ نے اپنے نامہ میں اورنگ زیب کو دارا شکوہ کے قتل اور شاہ جہاں کی قید کی بابت بہت ہی ملامت کی ہے اور لکھا ہے کہ جو سلوک تم نے ان سے کیا ہے کوئی بھائی، بھائی کے ساتھ اور کوئی بیٹا باپ کے ساتھ نہیں کر سکتا اور کسی ایماندار مسلمان سے ہرگز ایسی حرکت نہیں ہو سکتی اور یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ اپنا لقب عالمگیر کیوں مقرر کیا ہے اور اس کو سکہ پر کیوں منقش کرایا ہے اور اس بات کو انہوں نے یہاں تک بڑھایا کہ نامہ میں صاف لکھا ہوا ہے کہ اگر آپ عالمگیر ہیں تو یہ گھوڑے اور یہ تلوار حاضر ہے! بسم اللہ! آیئے ادھر سے ہم بھی آتے ہیں! میرے نزدیک اگر یہ بات سچ ہوتی تو شاہ ایران کی طرف

سے گویا پیغامِ جنگ تھا۔ لیکن میں نے جیسا سنا، ویسا لکھ دیا ہے اور اس کو میں غلط ثابت نہیں کر سکتا۔ اگرچہ اس دربار کا راز ہر کسی کو معلوم ہو سکتا ہے، بشرطیکہ زبان سے واقفیت اور چند شخصوں سے ملاقات رکھتا ہو اور میری طرح عجائب باتوں کے دریافت کرنے میں دل کھول کر روپیہ خرچ کرنے کی بھی کچھ پروا نہ کرتا ہو لیکن میں تو آسانی سے ایسی بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ شاہِ ایران نے ایسے الفاظ اپنے نامہ میں لکھے ہوں کیونکہ گو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایرانیوں کی یہ عادت ہے کہ جب کسی کو اپنا زور و طاقت جتانا چاہتے ہیں تو ایسی ہی تعلّی کر لیا کرتے ہیں۔ مگر ایسے لفظوں سے تو علاوہ ایک بڑی ہی خالی شیخی کے دھمکی کی بو بھی آتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ اکثر باخبر لوگوں کی یہ رائے ہے اور خود میرا بھی خیال یہی ہے کہ ایران میں یہ طاقت ہی کہاں ہے کہ ہندوستان جیسی سلطنت پر حملہ کرے اور اس کو تو یہی غنیمت ہے کہ قندھار جو ایران کی عمل داری میں ہندوستان کی طرف سرحد پر ہے اس کے قبضہ میں رہے یا یہ کہ اپنے ملک کو حدود سلطنتِ روم کی جانب سالم اور محفوظ رکھ سکے۔ ایران کی سپاہ و دولت کا حال مدبرانِ سلطنتِ ہند کو خوب معلوم ہے اور وہ واقف ہیں کہ وہاں کے تخت پر ہمیشہ شاہ عباس (۱۴۰) ہی نہیں ہے جو ایک نامور اور مدبر بادشاہ اور اس قابل تھا کہ جو معاملہ پیش آئے اس کو اپنے ہی مدعا کے موافق بنالے اور بڑے بڑے منصوبے تھوڑے سے سامان سے انجام دے لے اور اگر ایران کا ارادہ اس سلطنت پر کوئی مہم کرنے کا ہے اور حالیہ وارداتوں کی وجہ سے اس کو اورنگ زیب کی نسبت اس قدر تنفر پیدا ہوا ہے تو وہ کیوں ان جانکاہ واقعات کو خاموشی اور بے غرضی کی نگاہ سے دیکھتا رہا جو ان لڑائیوں میں پیش آئے، جو ہندوستان میں ہو رہی تھیں اور باوجودیکہ دارا شکوہ اور شاہ جہاں اور سلطان شجاع اور شاید صوبہ دار کابل بھی اس سے امداد کے لئے ملتجی ہوئے مگر اس کے دل پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ حالانکہ وہ تھوڑی سی فوج سے ہندوستان کے ایک نہایت عمدہ حصہ پر یعنی کابل سے لے کر دریائے سندھ کے کنارے، بلکہ اس سے آگے تک قبضہ کر سکتا اور اس طرح پر یہاں کے ہر ایک جھگڑے میں ہمیشہ کے لئے اپنے تئیں ثالث بنا سکتا تھا۔

اورنگ زیب کا عتاب سفیرِ ایران کی نسبت اور اس کا سبب

بہر حال خواہ تو شاہِ ایران کے نامہ ہی میں کوئی ناملائم فقرہ تھا یا اورنگ زیب خود

اس سفیر ہی کی کسی حرکت یا کسی گفتگو سے ناراض ہو گیا تھا جو اس کے دہلی سے رخصت ہونے کے دو یا تین ہی روز بعد اس نے اس امر کی شکایت کی کہ جو گھوڑے شاہِ ایران کی طرف سے آئے ہیں، سفیر نے ان کے پچھلے پاؤں کی نسیں (۱۴۱) کٹوا دی تھیں اور حکم دیا کہ اس کو سرحد پر روک لیا جائے اور تمام ہندوستانی لونڈی غلام جو وہ یہاں سے لے گیا ہے، چھین لئے جائیں جن کی تعداد بلاشبہ بہت ہی زیادہ تھی اور قحط کی وجہ سے بہت ہی سستے اس کے ہاتھ آگئے تھے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے نوکر چاکر بہت سے بچوں کو چرا کر بھی لے گئے تھے۔(۱۴۲)

سفیر ایران کے ساتھ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے مختلف طور کے برتاؤ کا ذکر

جب تک یہ سفیر دہلی میں رہا اورنگ زیب اپنی تمام حرکات و سکنات میں سخت احتیاط کا پابند رہا۔ برخلاف شاہ جہاں کے جس نے نامور شاہ عباس کے سفیر کو کبھی تو بے موقع نخوت دکھا کر ناراض کر لیا اور کبھی ایسی بے تکلفی اختیار کی جو اس کی شان کے لائق نہ تھی جس سے سفیر کی نظر میں اس کی خفت ہوئی۔

سفیر ایران اور شاہ جہاں کے چند ظریفانہ سوال و جواب کا ذکر اور مصنف کی رائے میں ان کا سفیروں کے مناسب حال نہ ہونا

جب کوئی ایرانی ہندوستانیوں کی ہنسی اڑانا چاہتا ہے تو مندرجہ ذیل قصے بیان کرتا ہے۔ اوّل یہ کہ جب شاہ جہاں کی کوئی تدبیر نہ چل سکی کہ سفیر ایران ہندوستان کے درباری قاعدہ کے موافق رسم تسلیمات، جس سے اس کو انکار تھا، بجالائے تو اس نے یہ تدبیر نکالی کہ عام و خاص کے دروازہ کا پھاٹک تو بند کروادیا اور صرف کھڑکی کھلی رہنے دی جس میں سے بغیر سر جھکائے گزر نہیں ہو سکتا تھا۔ شاہ جہاں کو امید تھی کہ اس تدبیر سے ہم کو اس بات کے کہنے کا موقع ملے گا کہ سفیر ایران کو دربار میں حاضر ہونے کے وقت ہندوستان کی رسم سے بھی زیادہ سر جھکانا پڑا۔ لیکن یہ سرکش اور چالاک ایرانی فوراً تاڑ گیا اور شاہ جہاں کی طرف پیٹھ کر کے کھڑکی میں داخل ہوا۔ شاہ جہاں یہ دیکھ کر کہ اس چال میں بھی وہی ورر ہا بہت جھنجلایا اور سفیر کو حقارت سے مخاطب کر کے بولا "اے بدبخت کیا تو اپنے جیسے گدھوں کا

طویلہ سمجھ کر اس میں داخل ہوا ہے؟" اس نے کہا بیشک میں یہی سمجھا تھا۔ کیونکہ ایسے دروازہ میں سے گزر کرتے ہوئے کون شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ گدھوں سے ملنے کے سوا وہ کسی اور جگہ جاتا ہے۔

دوسرا یہ کہ شاہ جہاں نے سفیر ایران کے کسی بے ادبانہ اور کرخت جواب سے ناراض ہو کر کہا "اے بدبخت! شاہ عباس کے دربار میں کیا کوئی شریف آدمی نہ تھا جو تجھے خردماغ کو میرے پاس بھیجا؟" اس نے کہا "کیوں نہیں بہت سے مہذب اور لئیق لوگ موجود ہیں مگر وہ اگلے کی لیاقت کے موافق سفیر بھیجا کرتا ہے"۔

تیسرا یہ کہ ایک دن شاہ جہاں نے سفیر ایران کو اپنے ساتھ کھانا کھانے کو بلایا اور حسب معمول اس کے چھیڑنے کے لئے موقع دیکھتا رہا۔ پس جب سفیر نے قاب میں سے ڈھونڈ کر ہڈیاں نکالیں اور چچوڑنی شروع کیں تو بادشاہ نے چپکے سے کہا "ایلچی جی کتے کیا کھائیں گے؟" اس نے کہا "کھچڑی" جسے بادشاہ بڑی رغبت سے نوش جاں فرما رہے تھے۔ کھچڑی ایک کھانا ہے جو چاول اور مونگ یا ماش وغیرہ ملا کر پکایا جاتا ہے اور جس کو عموماً ہندوستان کے غریب آدمی کھاتے ہیں۔ پھر بادشاہ نے پوچھا کہ تم ہمارے شہر دہلی کو (جو اس وقت نیا تیار ہو رہا تھا) اصفہان کے مقابلہ میں کیسا خیال کرتے ہو؟ سفیر نے بلند آواز سے جواب دیا کہ "واللہ باللہ اصفہان تو آپ کے شہر کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا" اس کو بادشاہ نے تو تعریف سمجھا اور سفیر نے گویا ہجوِ ملیح کی تھی۔ کیونکہ شاہ جہان آباد کا گرد و غبار بہت ہی تکلیف دہ ہے۔ ایک قصہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جب شاہ جہاں نے سفیر کو اس امر پر مجبور کیا کہ ٹھیک طور پر بتائے کہ ایران اور ہندوستان کی سلطنت کی قوت میں کس قدر فرق ہے تو اس نے عرض کیا کہ ہندوستان چودھویں رات کے چاند کے موافق ہے اور ایران محض دوسری یا تیسری رات کے چاند کے مطابق۔ جس سے شاہ جہاں خیال اپنی عظمت کے بہت ہی خوش ہوا۔ لیکن جب اس ذو معنی جواب کا اصل مطلب خیال میں آیا جو یہ تھا کہ سلطنتِ ہند زوال کے قریب ہے اور ایران ایک بڑھتی دولت ہے تو دل ہی دل میں بہت پیچ و تاب کھایا۔ الغرض ہندوستان میں جو ایرانی رہتے ہیں وہ اپنی ذہانت اور حاضر جوابیوں کی نسبت اسی طرح کی شیخیاں بگھارا کرتے ہیں اور ایسے قصے بیان کرتے ہوئے کبھی سیر ہی نہیں ہوتے۔ مگر میری رائے میں بہ نسبت تعلی اور بدمغ پنے اور طنز و ایما کے سفیروں کے لئے زیبا طریق یہ ہے کہ وہ متانت اور وقار اور ادب کو ملحوظ رکھیں۔

شاہ جہاں کا ناراض ہو کر اشارہ سے سفیر ایران پر مست ہاتھی کا چھڑوا دینا اور اپنی چالاکی اور دلیری سے سفیر کا اس آفت سے بچ نکلنا

شاہ عباس کا یہ سفیر اگرچہ ان پسندیدہ اوصاف سے تو معرّا ہی تھا مگر تعجب تو اس بات کا ہے کہ اس کو اتنا معمولی شعور بھی نہ تھا کہ اپنی جان اور آبرو کو بچائے رکھنا اور خواہ مخواہ ایک خود سر بادشاہ کو اپنی نسبت غضبناک کر لینا نہیں چاہیے۔ چنانچہ ایک واقعہ سے جس میں اس کی جان جانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رہا تھا، ثابت ہوتا ہے کہ ایسی ہی نادانی کی باتوں سے اس نے شاہ جہاں کو اپنے سر کر لیا تھا۔ یعنی اس بادشاہ کو اس سے ایسی دلی رنجش ہو گئی تھی کہ اس سے بات چیت کرنے میں حقارت آمیز الفاظ اعلانیہ کہہ بیٹھتا تھا بلکہ مخفی طور پر یہ حکم دے دیا تھا کہ جب وہ دربار کو آئے تو عام و خاص کے راستہ میں (جو مثل ایک لمبے اور تنگ کوچہ کے ہے) ایک خونی ہاتھی اس پر چھوڑ دیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اگر یہ شخص چالاک اور دلیر نہ ہوتا تو ضرور مارا جاتا لیکن وہ اپنی پالکی سے ایسی پھرتی کے ساتھ کود گیا اور اس نے اور اس کے ہمراہیوں نے ایسے تیر پر تیر مارے کہ ہاتھی بھاگ گیا اور اس کی جان بچ گئی۔

اورنگ زیب کا اپنے استاد ملا صالح کے ساتھ عجیب سلوک

جس مہینے سفیر ایران اپنے ملک کو واپس گیا ملا صالح کی دربار میں مشہور آؤ بھگت ہوئی۔ یہ بڈھا (۱۴۳) عالمگیر کا استاد تھا اور ایک مدت سے اپنی جاگیر میں جو شاہ جہاں نے اسے دے رکھی تھی، رہتا تھا۔ جب اس نے سنا کہ شہزادوں کی باہمی لڑائیاں ختم ہو چکیں اور اس کے شاگرد نے اپنی اولوالعزمانہ تجویزوں میں پوری کامیابی حاصل کر لی تو فوراً دہلی میں آیا اور اس کو پوری امید تھی کہ اب امارت کا درجہ بہت جلد حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ جو لوگ دربار میں ذی وجاہت تھے، سب اس نے اپنے جانب دار بنا لئے، یہاں تک کہ کئی شخصوں بلکہ روشن آرا بیگم نے بھی اورنگ زیب کو یاد دلایا کہ آپ کا قابل التعظیم اور کامل الاخلاص استاد عزت و اکرام کا ضرور مستحق ہے۔ مگر تین مہینے تک تو اس نے یہ بھی جاننا نہ چاہا کہ وہ دربار میں آتا بھی ہے یا نہیں! لیکن آخر کار جب اس کو دیکھتے دیکھتے تنگ آ گیا تو حکم دیا کہ ملا خلوت کے دربار میں حاضر ہو۔ جہاں صرف حکیم الملک دانشمند خاں اور تین چار اور امیر جو

علم و فضل میں مشہور ہیں، موجود تھے۔ اگرچہ میں اس موقع پر حاضر نہ تھا اور ہوتا بھی تو ناممکن تھا کہ اس طول طویل گفتگو کو یاد رکھتا جو اورنگ زیب نے مُلا سے کی تھی۔ مگر جو کچھ اپنے آقا کی زبانی میں نے سنا ہے، کچھ شک نہیں کہ اس کا مطلب حسب ذیل تھا۔ یعنی اورنگ زیب نے فرمایا:

"مُلا جی! براہ مہربانی یہ تو فرمائیے کہ آپ ہم سے چاہتے کیا ہیں؟ کیا آپ کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم آپ کو دربار کے اوّل درجہ کے امرا میں داخل کر لیں؟ لیکن اس سے پہلے اس بات کا ثابت کرنا ضروریات سے ہے کہ آپ کسی نشان عزت کے مستحق بھی ہیں یا نہیں۔ ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ اگر آپ ہماری تعلیم و تربیت شائستہ طور پر کرتے تو ضرور ایسی ہی عزت کے مستحق ہوتے۔ آپ ہم کو ایک تربیت یافتہ نوجوان شخص بتائیے تاکہ ہم بتا دیں کہ اس کی تعلیم و تربیت کی بابت شکر گزاری کا زیادہ مستحق اس کا استاد ہے یا اس کا باپ۔ فرمائیے تو سہی کہ آپ کی تعلیم سے کون سی واقفیت مجھے حاصل ہوئی ہے۔ کیونکہ آپ نے تو مجھ کو یہ بتایا تھا کہ تمام یورپ ایک چھوٹے سے جزیرہ سے زیادہ نہیں ہے جس میں سب سے بڑا بادشاہ اوّل شاہ پرتگال تھا۔ پھر بادشاہ ہالینڈ ہوا اور ان کے بعد شاہ انگلستان اور یورپ کے اور بادشاہوں مثلاً فرانس اور اندلس کی بابت آپ یہ بتایا کرتے تھے کہ یہاں لوگ ہمارے ہاں کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے موافق ہیں اور یہ کہ ہندوستان کے بادشاہوں میں صرف ہمایوں' اکبر' جہانگیر اور شاہ جہاں ہی ایسے شہنشاہ ہوئے ہیں جن کے آگے تمام دنیا کے بادشاہوں کی شان و شوکت مدھم ہے اور یہ کہ ایران' ازبک' کاشغر' تاتار' پیکو' سیام' چین اور ماچین کے بادشاہ سلاطینِ ہند کے نام سے کانپتے ہیں۔ سبحان اللہ! آپ کی اس جغرافیہ دانی اور کمال علم تاریخ کا کیا کہنا ہے! کیا مجھ جیسے شخص کے استاد کو لازم نہ تھا کہ دنیا کی ہر ایک قوم کے حالات سے مجھے مطلع کرتا؟ مثلاً ان کی قوتِ جنگی سے؟ ان کے وسائلِ آمدنی اور طرزِ جنگ سے؟ ان کے رسم و رواج اور مذاہب اور طرزِ حکمرانی سے؟ اور ان خاص خاص امور سے جن کو وہ اپنے حق میں زیادہ مفید سمجھتے ہیں، بتفصیل اور جدا جدا مجھ کو آگاہ کرتا؟ اور علم تاریخ مجھے ایسا سلسلہ وار پڑھاتا کہ میں ہر ایک سلطنت کی جڑ بنیاد اور اسباب ترقی و تنزل اور ان حادثات و واقعات اور غلطیوں سے واقف ہو جاتا جن کے باعث سے ان میں ایسے بڑے انقلابات ظہور میں آتے رہے ہیں۔ اور قطع نظر اس سے کہ آپ مجھ کو بنی آدم کی وسیع اور مکمل تاریخ سے آگاہ کرتے، آپ نے تو ہمارے ان مشہور و معروف

بزرگوں کے نام بھی اچھی طرح نہیں بتائے جو ہماری سلطنت کے بانی تھے اور ان کے سوانح عمری اور اُن خاص طور کی لیاقتوں سے جن کے باعث وہ بڑی بڑی فتوحات کرنے کے قابل ہوئے۔ اور ان فتوحات سے پہلے جو واقعات ظہور میں آئے ان سے بھی ناواقف رکھا اور باوجودیکہ بادشاہ کو اپنی ہمسایہ قوموں کی زبانوں سے واقف ہونا ضروری ہے، بجائے ان کے، آپ نے مجھ کو عربی لکھنا پڑھنا سکھایا۔ اگرچہ اس زبان کے سیکھنے میں میری عمر کا ایک بڑا حصہ ضائع ہوا۔ مگر بیشک آپ نے یہ سمجھا تھا کہ آپ مجھ پر ایک ایسی زبان کے سکھانے سے جو دس بارہ برس برابر محنت کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، ایک دائمی احسان کرتے ہیں۔ آپ نے بغیر اس کے کہ یہ سوچیں کہ ایک شہزادہ کو زیادہ تر کن کن علوم کے پڑھانے کی ضرورت ہے، صرف صرف و نحو اور ایسے فنون کی تعلیم کو جو ایک قاضی کے لئے ضروری ہیں، مقدم جانا اور ہماری جوانی کے ایام کو بے فائدہ اور لفظی بحثوں کے پڑھنے پڑھانے میں ضائع کیا"۔ پس یہ الفاظ تھے جن میں اورنگ زیب نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ لیکن بعض پڑھے لکھے آدمی یا تو بادشاہ کی خوشامد اور اس کے کلام کی قوت دکھانے کو یا مُلا صالح کے حسد کے مارے یوں کہتے ہیں کہ بادشاہ کا مُلا کو ملامت کرنا اسی پر ختم نہیں ہوا۔ بلکہ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے دوبارہ مُلا کو کہا۔

"کیا آپ کو معلوم نہ تھا؟ کہ بچپن میں جبکہ قوت حافظہ قوی ہوتی ہے، ہزاروں معقول باتیں ذہن نشین ہو سکتی ہیں اور آسانی کے ساتھ انسان ایسی مفید تعلیمیں حاصل کر سکتا ہے کہ جن سے دل میں نہایت اعلیٰ خیال پیدا ہو جاتے ہیں اور انسان بڑے بڑے نمایاں کاموں کے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ کیا نماز صرف عربی زبان ہی کے ذریعہ سے ادا ہو سکتی ہے اور ہماری اصلی زبان میں اسی طرح نہیں ہو سکتی؟ اور تحصیل مسائل شرعیہ کیا زبان عربی ہی پر موقوف ہے؟ آپ نے ہمارے والد ماجد کو تو یہ سمجھا دیا کہ ہم اسے فلسفہ پڑھاتے ہیں اور مجھے خوب یاد ہے کہ آپ برسوں تک ایسے بے ہودہ اور لغو مسائل سے میرے دماغ کو پریشان کیا کئے جن کے حل ہو جانے کے بعد بھی کچھ اطمینان خاطر حاصل نہیں ہوتا اور معاملات دنیاوی میں کبھی کار آمد نہیں ہوتے اور صرف ایسے غیر معین اور فضول خیالات اور توہمات ہیں جو سمجھ میں تو بڑی مشکل سے آتے ہیں مگر بہت ہی جلد پھر بھول جاتے ہیں اور جن کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ دماغ پریشان اور عقل خبط ہو کر آدمی ایسا منہ زور اور جھگیلا ہو جائے کہ لوگ اس سے دق ہو جائیں۔ بے شک! آپ نے میرے اوقات

گراں مایہ کے کئی سال ایسے مسائل مفروضہ کی تعلیم میں جو آپ کو مرغوب تھے، صرف کرائے۔ مگر جب میں آپ کی تعلیم سے علیحدہ ہوا تو کسی بڑے علم کے جاننے کا فخر نہیں کر سکتا تھا بجز اس کے کہ ایسی چند عجیب اور غیر معروف اصطلاحوں سے واقف تھا جو ایک عمدہ سمجھ کے نوجوان شخص کی ہمت کو شکستہ 'دماغ کو مختل 'اور طبیعت کو حیران کر دیتی ہیں اور جو مدعیان فلسفہ کے جھوٹے دعووں اور جہالت کے چھپانے کی خاطر جو آپ کی مانند لوگوں کو یہ ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ وہ عقل و دانش میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں اور یہ کہ ان کی تاریک اور مشتبہ المفہوم جق جق، بق بق میں ایسے بہت سے دقائق ہیں جو بجز ان کے اور کسی کو معلوم نہیں، گھڑ لی گئی ہیں۔ اگر آپ مجھ کو وہ فلسفہ سکھاتے جس سے ذہن اس قابل ہو جاتا ہے کہ بغیر برہان اور دلیل صحیح کے کسی بات کو تسلیم نہیں کرتا یا آپ مجھ کو ایسا سبق پڑھاتے جس سے انسان کے نفس کو ایسا شرف اور علو حاصل ہو جاتا ہے کہ دنیا کے انقلابات سے متاثر نہیں ہوتا اور ترقی و تنزل کی حالت میں ایک ہی سا رہتا ہے۔ یا تم مجھے انسان کے لوازم فطرت اور مقتضیات طبعیت (نیچر) سے واقف کرتے یا مجھے ایسے طریق استدلال کا عادی بناتے کہ تصورات و تخیلات کو چھوڑ کر ہمیشہ اصول صادقہ بدیہہ کی طرف رجوع کیا کرتا اور عالم و مافیہا کے حقائقِ واقعہ اور اس کے کون و فساد کی ترتیب و نظام کے معارف یقینیہ سے مجھے مطلع کرتے۔ اور جو فلسفہ آپ نے مجھے تعلیم کیا ہے وہ ایسے مسائل پر مشتمل ہوتا تو میں اس سے بھی زیادہ آپ کا احسان مانتا جتنا کہ سکندر نے ارسطو کا مانا تھا! اور ارسطو سے بھی زیادہ آپ کو انعام عطا کرتا! ملاجی! ناقدر دانی کا جھوٹا الزام خواہ مخواہ مجھ پر نہ لگایئے۔ کیا تم یہ نہ جانتے تھے کہ شہزادوں کو اتنی بات تو ضرور ہی سکھانی چاہئے کہ ان کو رعایا سے اور رعایا کو ان کے ساتھ کس طرح برتاؤ کرنا لازم ہے اور کیا تم کو اول ہی یہ خیال کر لینا واجب نہ تھا کہ میں کسی وقت تخت و تاج کی خاطر بلکہ اپنی جان بچانے کے لئے تلوار پکڑ کر اپنے بھائیوں سے لڑنے پر مجبور ہوں گا۔ کیونکہ تم خوب جانتے ہو کہ سلاطین ہند کی اولاد کو ہمیشہ یہی معاملے پیش آتے رہے ہیں۔ پس تم نے کبھی لڑائی کا فن یا کسی شہر کا محاصرہ کرنا یا فوج کی صف آرائی کا طریقہ مجھے سکھایا تھا؟ مگر میری خوش طالعی تھی کہ میں نے ان معاملات میں ایسے لوگوں سے کچھ سیکھ لیا تھا جو تم سے زیادہ عقلمند تھے۔ پس اپنے گاؤں کو چلے جایئے اور اب سے بعد کوئی نہ جانے کہ تم کون ہو اور تمہارا کیا حال ہے۔

بادشاہی منجم کی ناگہانی موت اور علمِ نجوم کی نسبت لوگوں کی رائے اور خیالات کا ذِکر

انہی دنوں میں ایک ایسا امر وقوع میں آیا کہ نجومیوں کے حق میں بہت غیر مفید تھا۔ بات یہ ہے کہ ایشیائی لوگ اکثر احکام نجوم کے ایسے معتقد ہیں کہ ان کے نزدیک دنیا کا کوئی معاملہ ایسا نہیں ہے جو کواکب اور افلاک کی گردش پر منحصر نہ ہو اور اس لئے وہ ہر ایک کام میں نجومیوں سے مشورہ لیا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ عین لڑائی کے وقت جبکہ دونوں طرف صف بندی بھی ہو چکی ہو کوئی سپہ سالار اپنے منجم سے ساعت نکلوائے بدون لڑائی شروع نہیں کرتا۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی نامبارک لگن میں لڑائی شروع کر دی جائے بلکہ منجموں سے پوچھے بغیر کوئی شخص سپہ سالاری پر مامور بھی نہیں کیا جاتا۔ علی ہٰذا القیاس بدون ان کی اجازت کے نہ شادی بیاہ ہو سکتا ہے نہ کہیں کو سفر کیا جاتا ہے۔ بلکہ ذرا ذرا سی باتیں بھی ان سے پوچھے بغیر نہیں کی جاتیں۔ مثلاً کسی لونڈی غلام کا خریدنا یا نیا کپڑا پہننا۔ اور اس احمقانہ توہم نے خلائق کو عموماً ایسی دقت میں ڈال رکھا ہے اور اس سے ایسے اہم اور نامرغوب نتیجے پیدا ہوتے ہیں کہ مجھے سخت تعجب ہے کہ اس قدر مدت سے یہ اعتقاد کیونکر قائم چلا آتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک تجویز سے خواہ وہ کسی سرکاری کام کے متعلق ہو یا نجی کے، اور ہر ایک معاملہ سے خواہ وہ معمولی ہو یا غیر معمولی، نجومی کو واقف کرنا ضروریات سے ہے (۱۴۴)۔

وہ واقعہ جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ خاص بادشاہی منجم کسی اتفاق سے پانی میں گر پڑا اور ڈوب کر مر گیا۔ اس افسوس ناک واقعہ سے دربار میں بڑی حیرت پیدا ہوئی اور ان نجومیوں کی شہرت کو جو اسرارِ غیبی کے جاننے والے گنے جاتے ہیں، بڑا ضرر پہنچا۔ چونکہ یہ شخص ہمیشہ بادشاہ اور امرا کے لئے ساعتیں نکالا کرتا تھا اس لئے لوگوں کو اس کے اس طرح پر جان دینے سے بالطبع نہایت تعجب ہوا کیونکہ ایک ایسا مشاق نجومی جو برسوں تک اوروں کے لئے مبارک اور خوش آئندہ باتوں کی پیش گوئی کرتا رہا ہو، اس آفت سے جو خود اس پر آنے والی تھی واقف نہ ہو سکا اور لوگ یہ کہنے لگ گئے کہ یورپ میں جہاں علم کا بڑا چرچا ہے، نجومیوں کو وہاں کے لوگ مثل فریبیوں اور شعبدہ بازوں کے گنتے ہیں اور اس علم کو عمدہ اور صحیح اصول پر مبنی نہیں سمجھتے۔ بلکہ یہ جانتے ہیں کہ مکار لوگوں نے بڑے

آدمیوں کے درباروں میں رسائی پیدا کرنے اور ان کو اپنا محتاج الیہ ثابت کرنے کا ایک ذریعہ بنا رکھا ہے۔

الغرض لوگوں کے ان خیالات اور علی الخصوص مندرجہ ذیل واقعہ سے جس کا عموماً بڑا چرچا تھا، منجم بہت ناخوش ہوئے اور وہ یہ ہے کہ ایران کے نامور بادشاہ شاہ عباس نے کہیں اپنے محل میں پائیں باغ لگانے کا حکم دیا تھا اور اس کام کے لئے دن بھی مقرر ہو چکا تھا اور باغبان شاہی نے میوہ کے چند درختوں کے لئے ایک مناسب موقع بھی تجویز کر لیا تھا۔ مگر بادشاہی منجم نے ناک بھوں چڑھا کر کہہ دیا کہ اگر ساعت دریافت کئے بغیر درخت لگائے جائیں گے تو ہرگز سرسبز نہ ہوں گے! پس شاہ عباس نے جو اس کی بات مان کر ساعت تجویز کرنے کو کہا تو اس نے کچھ پانسا وانسا ڈال اور اپنی کتاب کے ورق الٹ پلٹ اور حساب لگا کر عرض کیا کہ ستاروں کے فلاں فلاں مقام پر ہونے کی وجہ سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دوسری گھڑی کے گزرنے سے پہلے پہلے درخت لگا دیئے جائیں! شاہی باغبان جو نجومیوں سے پوچھ گچھ کرنے کو ایک لاحاصل بات خیال کرتا تھا اس حکیمانہ تجویز کے وقت حاضر نہ تھا۔ پس بغیر اس کے کہ اس کے آنے کا انتظار کیا جائے گڑھے کھدوائے گئے اور بادشاہ نے خاص اپنے ہاتھ سے درختوں کو جا بجا لگا دیا تاکہ یادگار کے طور پر کہا جائے کہ وہ خود شاہ عباس کے لگائے ہوئے ہیں۔ مگر باغبان جب اپنے معمولی وقت پر سہ پہر کو آیا تو درختوں کو لگا ہوا دیکھ کر بہت متحیر ہوا اور یہ خیال کر کے کہ اس قرینہ سے نہیں لگائے گئے جو اس نے تجویز کر رکھا تھا، مثلاً سیب کی جگہ زرد آلو اور بادام کی جگہ ناشپاتی لگائے ہوئے تھے، تو ان کو اکھاڑ کر اور جڑوں پر کچھ مٹی ڈال کر رکھ دیا اور رات بھر اسی طرح پڑا رہنے دیا۔ منجم کو بھی فوراً کسی نے جا کہا اور اس نے بھی فوراً ہی شاہ عباس کے پاس جا کر باغبان کی اس حرکت کی سخت شکایت کی۔ پس یہ گنہگار باغبان اسی وقت طلب ہوا اور بادشاہ نے نہایت غضبناک ہو کر کہا کہ تو نے یہ کیا حرکت کی کہ جن درختوں کو ہم نے نیک ساعت نکلوا کر خود اپنے ہاتھ سے لگایا تھا ان کو اکھاڑ ڈالا اور اب کیا امید ہے کہ اس باغ کا کوئی درخت پھل لائے گا۔ کیونکہ جو ساعت نیک تھی وہ گزر گئی اور پھر کہاں آسکتی ہے۔ یہ صاف باطن اور سادہ لوح دہقانی جو اس وقت شیرازی شراب کا ایک قدح بھی چڑھائے ہوئے تھا، نجومی کی طرف ترچھی نظر سے دیکھ کر بولا" واللہ باللہ خوب ہی ساعت نکالی۔ ارے کم بخت بد شگنی ذرا خیال تو کر کہ بس یہی تیرا نجوم ہے! کہ جو درخت تیرے کہنے سے دوپہر کو لگائے

گئے وہ شام سے پہلے ہی اکھڑ گئے! شاہ عباس یہ بے ساختہ اور مزے دار لطیفہ سن کر بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور نجومی کی طرف پیٹھ پھیر کر وہاں سے چلا گیا۔

امرا کے مرنے کے بعد ان کی جائیداد کے ضبط سرکار ہو جانے کا ذِکر

اب دو قصے میں اور بیان کرتا ہوں جو اگرچہ شاہ جہاں کے زمانہ کے ہیں مگر ان کے بیان سے اس امر کا ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس ملک میں یہ کیسی ظالمانہ پرانی رسم چلی آتی ہے کہ جب کوئی شاہی ملازم مرتا ہے تو اس کی جائیداد حق سرکار متصور ہو کر ضبط ہو جاتی ہے۔ پس ان میں سے ایک قصہ تو یہ ہے کہ امرائے دربار میں نیک نام خاں نامی ایک نامور امیر تھا جس نے چالیس پچاس برس کے عرصہ میں بڑے بڑے عہدوں پر مامور رہ کر بہت مال و دولت جمع کی تھی۔ یہ شخص اس ظالمانہ اور مکروہ رسم کو ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ کیونکہ اس کے باعث سے بڑے بڑے امیروں کی بیگمیں یکایک ایسی محتاج اور فقیر ہو جاتی ہیں کہ بادشاہ سے ان کو اپنی تھوڑی سی معاش کے واسطے التجا کرنی پڑتی ہے اور ان کے بیٹے کسی امیر کے ماتحت عام سپاہیوں میں نوکری کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ پس اس کا اخیر وقت جب قریب آن پہنچا تو اس نے مخفی طور پر اپنا تمام خزانہ تو مصیبت زدہ بیواؤں اور ایسے غریب امیر زادوں کو جو بے چارے سواروں میں نوکری کر کے بسر اوقات کرتے تھے، تقسیم کر دیا اور خالی صندوقوں کو لوہے کے ٹکڑوں، ہڈیوں، پرانی جوتیوں اور پھٹے پرانے کپڑوں سے بھر کر خوب اچھی طرح سے مہریں لگوا دیں اور وصیت کی کہ ان میں جو مال و اسباب بند ہے وہ خاص اعلیٰ حضرت کے لئے ہے۔ میرے مرنے کے بعد باحتیاط تمام حضور میں پہنچا دیا جائے۔

پس نیک نام خاں کے انتقال کے بعد جب یہ صندوق سرکار میں آئے تو اتفاقاً بادشاہ دربار میں بیٹھا تھا۔ ان کو دیکھ کر اس کا دل ایسا للچایا کہ سر دربار ان کے کھولے جانے کا حکم دیا۔ مگر ان کے کھلتے ہی جو انفعال اور مایوسی اس کو ہوئی وہ محتاج بیان نہیں ہے اور اس قدر شرمندہ ہوا کہ فوراً دربار سے اٹھ کر چلا گیا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ نیک نام خاں کے مرنے کے چند سال بعد ایک دولتمند بنیا جو ہمیشہ سے بادشاہی ملازم تھا اور اپنے ملک کے دستور کے موافق بڑا بیاج خور اتھا، مر گیا تو اس کے بیٹے نے اپنی ماں سے کچھ روپیہ لینے کے واسطے لڑنا جھگڑنا شروع کیا۔ مگر اس نے اس

کی عیاشی اور فضول خرچی کی وجہ سے جو دینے سے انکار کیا تو اس احمق نے شاہ جہاں کے پاس جاکر کہہ دیا کہ اس کا باپ دو لاکھ "کرون" یعنی پانچ لاکھ روپیہ چھوڑ مرا ہے۔ اس پر بادشاہ نے فوراً اس بیوہ مہاجنی کو دربار میں بلاکر یہ حکم دیا کہ ایک لاکھ روپیہ تو خزانہ شاہی میں بھیج دے! اور باقی میں سے پچاس ہزار روپیہ اپنے بیٹے کو دے دے اور حکم قطعی دے کر چوبداروں سے کہا کہ اس بڑھیا کو دربار سے نکال دو۔ یہ سن کر اگرچہ یہ بے چاری بہت متحیر ہوئی اور اس کو اس بات کا بھی بڑا رنج ہوا کہ بلا سماعت اس کے عذر کے دربار سے نکالے جانے کا حکم ہوا۔ لیکن تاہم یہ باہمت بڑھیا گھبرائی نہیں اور چوبداروں کو جھڑک کر بولی کہ ہٹو! میں ابھی بادشاہ سے کچھ عرض کیا چاہتی ہوں! اس پر شاہ جہاں نے فرمایا اچھا جو کہنا چاہتی ہے کہنے دو۔ پس اس نے عرض کیا کہ حضرت! میرا بیٹا جو اپنے باپ کے مال کا دعویٰ کرتا ہے کچھ بے جا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ہمارا بیٹا اور ہمارا وارث ہے۔ مگر میں ہاتھ جوڑ کر عرض کرتی ہوں کہ سرکار کا میرے خاوند کے ساتھ کیا رشتہ ہے جو حضور ایک لاکھ روپیہ مانگتے ہیں! شاہ جہاں یہ مختصر اور بیساختہ سوال سن کر بہت خوش ہوا اور اس خیال سے کہ شہنشاہِ ہند ہو کر ایک بنئے کا رشتہ دار کہلائے اس کو بڑی ہنسی آئی اور کئی بار قہقہہ مارا اور حکم دیا کہ اچھا اسے جانے دو اور اس کے مال و دولت سے کوئی معترض نہ ہو۔

شہزادوں کی باہمی لڑائی تقریباً ۱۶۶۰ء میں جب ختم ہو چکی اس وقت سے لے کر کوئی چھ برس بعد تک جبکہ میں ہندوستان سے رخصت ہوا جو جو واقعات قابلِ غور پیش آتے رہے اب میں ان سب کو لکھنا نہیں چاہتا۔ اگرچہ کچھ شک نہیں ہے کہ ان میں سے بعض کے لکھ دینے سے میرا یہ مدعا کہ مغلوں اور ہندوستانیوں کے طور و طریق اور ذہن و ذکا کا حال ناظرینِ کتاب کو واضح ہو جائے، بہت کچھ پورا ہو جاتا۔ اسی فروگزاشت کی وجہ سے مجھے وہ واقعات تمام و کمال کہیں پھر لکھنے پڑیں گے۔ لیکن سردست میں صرف انہی خاص خاص لوگوں کے بعض اہم حالات بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جن کے نام سے ناظرین واقف ہو چکے ہیں اور اس بیان کو شاہ جہاں کے حال سے شروع کرتا ہوں۔

شاہ جہاں کے قید کے زمانہ میں اس کے ساتھ اورنگ زیب کے طرزِ سلوک کا بیان

اگرچہ اورنگ زیب نے شاہ جہاں کو قلعہ آگرہ میں بڑی احتیاط کے ساتھ قید کیا

ہوا تھا اور کسی ایسی بات میں مطلقاً غفلت نہیں کی جاتی تھی جس سے اس کے نکل بھاگنے کا اندیشہ ہو لیکن اور سب طرح پر ادب اور ملائمت سے سلوک کیا جاتا تھا اور ان شاہی محلوں میں رہنے سہنے کی بھی اجازت دے دی گئی تھی کہ جن میں وہ پہلے رہا کرتا تھا اور اس کی بیٹی معروف بیگم صاحب سے ملنے کی بھی اجازت تھی اور محل کی کل متعلقہ عورتیں مثلاً عملہ باورچی خانہ اور ناچنے گانے والیاں وغیرہ سب حاضر رہتی تھیں اور ایسے معاملات میں اس کی کوئی خواہش رد نہیں کی جاتی تھی اور اب جو یہ بڈھا عابد وزاہد بن گیا تھا بعض ملاؤں کو بھی اس کے پاس جاکر تلاوت قرآن کی پروانگی تھی اور خاصے گھوڑوں اور باز جُرے وغیرہ شکاری جانوروں کے منگا لینے اور ہرنوں اور مینڈھوں وغیرہ کی لڑائی کا تماشا دیکھنے کی بھی اجازت تھی۔ غرضیکہ اورنگ زیب کا برتاؤ شاہ جہاں کے ساتھ مہربانی اور ادب سے خالی نہ تھا اور حتی الامکان وہ اپنے بوڑھے باپ کی ہر طرح سے خاطر داری کرتا اور نہایت کثرت سے تحفے تحائف بھیجتا رہتا اور سلطنت کے بڑے بڑے معاملات میں اس کی رائے اور مشورہ کو مثل ایک پیرو مرشد کی ہدایت کے طلب کرتا تھا اور اس کے عریضوں سے جو اکثر لکھتا رہتا تھا ادب اور فرمانبرداری ظاہر ہوتی تھی۔ پس اس طرح سے شاہ جہاں کی گردن کشی اور اس کا غصہ آخر کار یہاں تک ٹھنڈا پڑ گیا کہ معاملاتِ سلطنت میں بیٹے کو لکھنے پڑھنے لگ گیا اور دارا شکوہ کی بیٹی کو بھی اس کے پاس بھیج دیا اور وہ بیش بہا جواہرات جن کے دینے سے پہلے انکار کر کے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر پھر مانگو گے تو کوٹ کر چورا کر ڈالوں گا مگر دوں گا نہیں ان میں سے بھی بعض جواہر اورنگ زیب کے پاس از خود بھیج دیئے بلکہ اپنے باغی فرزند کی سب ... خانہ حرکتیں معاف کر کے اس کے حق میں دعائے خیر بھی کر دی۔ حالانکہ اورنگ زیب بڑی لجاجت سے بارہا معافی مانگ چکا تھا اور شاہ جہاں اس بات کو قبول نہیں کرتا تھا۔ مگر میرے اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ شاہ جہاں کی ہر ایک بات بلا عذر تسلیم کر لی جاتی تھی۔ کیونکہ مجھے اورنگ زیب کے ایک عریضہ کی طرز تحریر سے معلوم ہوا کہ جب کبھی یہ بڈھا بادشاہ تحکم کے طور پر اس کو کچھ لکھتا تھا تو یہ اس کے جواب میں جرأت کے ساتھ اپنی ہی بات پر قائم رہنے کا اظہار کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے چند فقرے پڑھے ہیں جن کا مضمون یہ تھا: "کیا حضور یہ چاہتے ہیں کہ میں سختی کے ساتھ پرانی رسموں کا پابند رہوں اور جو کوئی ہمارا نوکر چاکر مر جائے اس کی جائیداد ضبط کر لوں؟ اگرچہ شاہان مغلیہ کا یہ دستور رہا ہے کہ اپنے کسی امیر یا کسی دولت مند مہاجن کے مرنے کے بعد بلکہ

بعض اوقات تو دم نکل جانے سے بھی پہلے ہی اس کے تمام مال واسباب کا تعلیقہ کراتے تھے اور جب تک اس کے نوکر چاکر جزو کل مال و دولت بلکہ ادنیٰ اونیٰ زیور بھی نہ بتادیں ان پر مار پیٹ اور قید وبند کا تشدد کیا جاتا تھا اور یہ دستور بے شک فائدہ مند بھی ہے۔ لیکن جو ناانصافی اور بے رحمی اس میں ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے اور اگر ہر ایک امیر نیک نام خاں کا سا معاملہ کرے یا کوئی عورت اس بیوہ مہاجنی کی طرح اپنے مال کو پوشیدہ کرلے تو اس کے حق جانب ہے یا نہیں؟ میں حضور کی خفگی سے بہت ڈرتا ہوں اور اس امر کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ حضور میرے طور وطریق کی نسبت غلط فہمی فرمائیں اور جیسا کہ حضور خیال فرماتے ہیں تخت نشین ہونے نے مجھے خودرائے اور مغرور نہیں بنا دیا۔ چالیس برس سے زیادہ کے تجربہ سے حضور خود ہی خیال فرماسکتے ہیں کہ تاج شاہی کس قدر گراں بار چیز ہے اور بادشاہ جب دربار سے اٹھتا ہے تو کس قدر افکار اس کے دل کو غمگین اور دردمند بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہمارے مشہور و معروف جد امجد جلال الدین محمد اکبر نے اسی غرض سے کہ ان کی اولاد دانائی اور نرمی اور تمیز کے ساتھ سلطنت کرے اپنے عہدِ سلطنت کی تاریخ میں امیر تیمور گورگان کا ایک ذکر بطورِ نمونہ لکھ کر اپنی اولاد کو اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ "جب بایزید یلدرم گرفتار ہو کر امیر تیمور کے حضور میں لایا گیا اور امیر نے بہت غور کے ساتھ اس مغرور قیدی کی طرف دیکھ کر ہنس دیا تو بایزید نے اس حرکت سے ناراض ہو کر امیر کو کہا کہ تم کو اپنی فتح مندی پر اس قدر اترانا نہ چاہیے۔ عزت و دولت منجانب اللہ ہے اور ممکن ہے کہ جس طرح تم آج فتح یاب ہوئے ہو کل میری طرح پکڑے جاؤ! امیر نے جواب دیا کہ میں دنیا اور اس کے جاہ و دولت کی بے ثباتی سے خوب واقف ہوں اور خدا نہ کرے کہ میں اپنے کسی مغلوب دشمن کا تمسخر کروں اور میری ہنسی کا سبب یہ نہ تھا کہ تمہارا دل دکھاؤں بلکہ مجھے تمہیں دیکھ کر اپنی اور تمہاری بدصورتی کے خیال نے بے اختیار ہنسادیا۔ کیونکہ تم تو کالے ہو اور میں لنگڑا ہوں! اور یہ بات میرے دل میں گزری کہ تاج سلطنت ایسی کیا چیز ہے جس کو پاکر بادشاہ اپنی ہستی کو بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ خداتعالیٰ اس کو اپنے ایسے بندوں کو عطا کرتا ہے جو کالے اور لنگڑے ہوں" (۱۴۵)۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضور یہ خیال فرماتے ہیں کہ میری مصروفیت بہ نسبت ان امور کے جن کو میں نظم و نسق ملک داری اور سلطنت کے اندرونی استحکام کے لئے نہایت ضروری جانتا ہوں نئی نئی فتوحات اور ملک گیری کی جانب زیادہ ہونی چاہیے۔ اس امر سے میں

ہر گز انکار نہیں کر سکتا کہ ایک بڑے شہنشاہ کا عہد و دولت نئی نئی فتوحات کی وجہ سے ممیز اور ممتاز ہونا لازم ہے اور اگر میں ایسا نہ کروں تو گویا اپنے نامور بزرگ امیر تیمور گورگان کی نسل کو دھبہ لگاؤں گا۔ مگر بہر حال یہ بات قرینِ انصاف نہیں ہے کہ مجھے کاہلی اور خاموش بیٹھے رہنے کا الزام دیا جائے۔ کیونکہ بنگالہ اور دکن میں میری فوجوں کی مصروفیت کو تو حضور بھی عبث خیال نہیں فرما سکتے اور میں حضور کو یہ بھی یاد دلاتا ہوں کہ بڑے سے بڑا ملک گیر بھی ہمیشہ سب سے بڑا بادشاہ نہیں ہوا۔ اور دیکھا جاتا ہے کہ کبھی کبھی دنیا کے اکثر حصے بالکل وحشی اور ناتربیت یافتہ قوموں نے فتح کر لئے ہیں اور نہایت وسیع سلطنتیں تھوڑے ہی عرصہ میں بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہیں۔ پس حقیقت میں سب سے بڑا بادشاہ وہی ہے جو رعایا پروری اور عدل و انصاف ہی کو اپنا حاصلِ عمر جانے"۔

اس عریضہ کے باقی حصہ کے پڑھنے کا مجھے موقع نہیں دیا گیا۔

میر جملہ کی لیاقتوں اور مہم آسام اور اس کی موت کا ذِکر

اب میں چند کلمے اس مشہور شخص کے باب میں کہنے چاہتا ہوں جس کو میر جملہ کہتے ہیں اور ان معاملات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے شہزادوں کی باہمی لڑائی کے بعد اس کا تعلق رہا اور یہ کہ اس نامور شخص کا خاتمہ کس طور پر ہوا۔

بنگالہ پر قبضہ حاصل کرنے میں اس نے سلطان شجاع کے ساتھ وہ بے رحمی اور بے ایمانی نہیں کی جو جیون خاں نے دارا شکوہ سے اور سری نگر کے راجہ نے سلیماں شکوہ سے کی تھی۔ بلکہ اس نے ایک ہنرمند سپہ سالار کی طرح ملک پر قبضہ حاصل کیا اور بغیر اس کے کہ کسی دغا اور فریب سے سلطان شجاع کو گرفتار کرے صرف اس پر قناعت کی کہ سلطنت کے چھوڑ دینے اور سمندر کی طرف بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ سلطان شجاع کی مہم کے خاتمہ کے بعد میر جملہ نے ایک خواجہ سرا کو عرضی دے کر اورنگ زیب کے حضور میں بھیجا اور التماس کیا کہ میرے اہل و عیال کو اس کے ساتھ بنگالہ کو چلے آنے کی اجازت بخشی جائے اور لکھا کہ "لڑائی بخیر و خوبی ختم ہو گئی اور چونکہ میں ضعیف اور بوڑھا ہو گیا ہوں حضور کی نوازش سے مجھے امید ہے کہ اس سے زیادہ اہل و عیال سے میری جدائی کو پسند نہ فرمایا جائے گا۔ لیکن اورنگ زیب اس چالاک مدبّر کے مطلب کو فوراً پا گیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس کے بیٹے محمد امین خان کو بنگالہ بھیج دیا جائے گا تو میر جملہ بالضرور بنگالہ کا خود سر بادشاہ بننے کا ارادہ

کرے گا اور شاید کہ یہ عجیب شخص اس پر بھی قناعت نہ کرے۔ کیونکہ میر جملہ بیدار مغز، اولوالعزم، شجاع اور دولت مند ہونے کے علاوہ اس وقت ایک فتحیاب فوج کا سپہ سالار تھا اور اس سے اہلِ سپاہ کو محبت بھی تھی اور اس کا رعب بھی مانتے تھے اور ہندوستان کا سب سے عمدہ صوبہ اس کے قبضہ میں تھا۔ اور گولکنڈے میں جو معاملات پیش آئے تھے ان سے ثابت ہو چکا تھا کہ میر جملہ کیسا ایک بے صبر اور بے باک طبیعت کا انسان ہے۔ پس ایسے شخص کی درخواست کو قطعاً رَد کر دینا بالضرور خطرناک نتائج کا باعث ہوتا۔ مگر اورنگ زیب اس موقع پر بھی اپنی معمولی احتیاط اور دانائی کو کام میں لایا۔ یعنی میر جملہ کی بیوی اور پوتے، پوتیوں کو بنگالہ کو روانہ کر دیا اور امیر الامراء (۱۴۶) کا خطاب عنایت کیا۔ جو ایسا خطاب ہے جس سے بڑھ کر شہنشاہِ ہند کوئی خطاب نہیں دے سکتا۔ اور اس کے بیٹے محمد امین خاں کو میر بخشی کا منصب عطا کیا جو سلطنت کے منصبوں میں دوسرے یا تیسرے درجہ کا منصب ہے۔ مگر اس منصب دار کو ہمیشہ دربار میں حاضر رہنا پڑتا ہے اور بادشاہ سے اس کا علیحدہ ہونا اگر ناممکن نہیں تو مشکل تو بے شک ہے۔ اس کے علاوہ میر جملہ کو بنگالہ کی مستقل صوبہ داری بھی عنایت فرمائی۔

میر جملہ جب اپنی مراد پر کامیاب نہ ہوا تو اس نے سوچا کہ اگر بیٹے کے بلانے کی مکرر درخواست کروں گا تو یہ امر بالضرور بادشاہ کے عتاب کا باعث ہوگا اس لئے اس نے بھی اسی کو بہتر جانا کہ ان انعاماتِ شاہی کا شکر بجالائے اور خاموش ہو رہے۔ ان معاملات پر جبکہ ایک سال کے قریب گزر چکا تو اورنگ زیب نے صحیح طور پر یہ خیال کر کے کہ ایک اولوالعزم سپاہی اب زیادہ عرصہ تک نچلا نہیں بیٹھ سکتا اور اگر اس کو کسی غیر ملک کے ساتھ لڑائی بھڑائی میں مشغول نہ رکھا جائے تو خود اپنی ہی سلطنت کے اندر کوئی بکھیڑا کھڑا کر دے گا، میر جملہ کو آسام کے راجہ پر فوج کشی کی تیاری کا حکم دیا جو ایک زبردست اور دولتمند راجہ ہے اور جس کا ملک ڈھاکہ کے شمال میں خلیج بنگالہ کے کنارے پر ہے۔

ادھر میر جملہ خود بھی اس مہم کی فکر میں تھا کیونکہ اس کو امید تھی کہ اس طرح پر سرحد چین تک ملک فتح کر کے ایک دائمی شہرت حاصل کروں گا۔ غرض کہ اورنگ زیب کے پیغام رساں نے میر جملہ کو اس مہم پر پہلے ہی سے آمادہ پایا اور فوراً ایک سپاہ جرار ڈھاکہ سے کشتیوں میں اس دریا کے راستہ روانہ ہوئی جو آسام سے نکلتا ہے اور گوشہ شمال و مشرق سے چل کر ایک قلعہ پر جس کو آزو کہتے ہیں اور جو ڈھاکہ سے قریب تین سو میل کے ہے اور جس

کو آسام کے راجہ نے بنگالہ کے ایک صوبہ دار سے سابق میں چھین لیا تھا، جا پہنچی اور دس بارہ دن کے محاصرہ میں قلعہ فتح ہو گیا اور میر جملہ چمدارا کی طرف جو آسام کا دروازہ سمجھا جاتا ہے بڑھا اور اٹھائیس دن کے لمبے سفر کے بعد وہاں جا پہنچا اور یہاں ایک لڑائی ہوئی اور راجہ شکست کھا کر کرگانو کی طرف جو آسام کی راج دھانی اور چمدارا سے ایک سو بیس میل کے فاصلہ پر ہے بھاگ گیا۔ لیکن میر جملہ کے پُر زور اور چست تعاقب نے وہاں بھی دم لینے نہ دیا اور بغیر اس کے کچھ مورچہ بندی وغیرہ کر سکے، مجبوراً پیچھے کو ہٹتا ہٹتا مملکت لاسا کے کوہستان میں جا گھسا اور چمدارا اور کرگانو لوٹ لئے گئے۔ خصوصاً کرگانو سے بہت مال و دولت فوج کے ہاتھ آیا (کرگانو ایک بڑا اور عمدہ شہر ہے اور تجارت کی بڑی منڈی ہے اور یہاں کی عورتوں کا حسن مشہور ہے) مگر کثرت بارش کی وجہ سے جو موسم سے ذرا پہلے شروع ہو گئی تھی سپاہ آگے نہ بڑھ سکی کیونکہ اس ملک میں اس قدر مینہ برستا ہے کہ بجز گاؤوں کی آبادیوں کے جو چھانٹ کر اونچی اونچی زمینوں پر بسائے جاتے ہیں سب جگہ پانی ہی پانی ہو جاتا ہے اور راجہ نے موقع پا کر لشکر کے آس پاس کے ملک کو مویشی اور ہر قسم کے مایحتاج سے خالی کر ڈالا اور اگرچہ فوج نے بہت سامال و دولت جمع کر لیا تھا مگر قبل اس کے کہ برسات ختم ہووے رسد کی طرف سے نہایت دقت اور تکلیف میں پڑ گئی۔ اب میر جملہ نہ آگے بڑھ سکتا تھا اور نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ کیونکہ سامنے جو پہاڑ تھے وہ نہایت ہی دشوار گزار تھے اور پیچھے ہٹنا اس لئے مشکل تھا کہ پانی اور دلدل کی کثرت کے علاوہ راجہ نے ہوشیاری کر کے وہ پشتہ بھی تڑوا ڈالا تھا جس پر سے چمدارا کا راستہ تھا۔ پس برسات بھر مجبوراً وہیں ٹھہرنا پڑتا۔ مگر خشک موسم کے آنے تک رات دن کی تکلیفوں اور رسد کے نہ ملنے سے فوج ایسی شکستہ خاطر ہو گئی کہ میر جملہ کو آسام کی فتح کا ارادہ مجبوراً ترک کرنا پڑا۔ اگر یہ فوج کسی اور کم لیاقت سردار کے ماتحت ہوتی تو بنگالہ کو واپس آنا مشکل تھا۔ کیونکہ رسد بہت مشکل سے بہم پہنچتی تھی اور راستہ میں دلدل اب بھی اس کثرت سے تھی کہ سپاہ جلد جلد کوچ نہیں کر سکتی تھی اور راجہ چستی کے ساتھ پیچھے لگا چلا آتا تھا۔ مگر میر جملہ اپنی معمولی ہوشیاری سے لشکر کو ایسے ڈھنگ سے ہٹا لایا کہ اس کے حسنِ تدبیر کی اور بھی دھوم پڑ گئی اور مال و دولت بھی خوب ساتھ لایا اور واپس آتے ہوئے قلعہ ازدو کو خوب مستحکم کر کے ایک ہزار سپاہ وہاں اس غرض سے چھوڑ آیا کہ اگلے برس کے شروع میں برسات سے پہلے پہلے پھر چڑھائی کی جائے۔ لیکن یہ نامی سردار مرض پیچش سے جو اس کے لشکر میں بنگالہ پہنچتے ہی پھیل گیا تھا،

مر گیا اور جیسا کہ ہونا چاہیے تھا اس کی وفات سے تمام ہندوستان میں تہلکہ پڑ گیا۔ مگر بہت سے عقلمند لوگوں کا قول یہ ہے کہ حقیقت میں اورنگ زیب بنگالہ کا بادشاہ ابھی ہوا ہے۔ اگرچہ اورنگ زیب میر جملہ کی خدمات کا معترف اور شکر گزار تھا لیکن شاید ایک ایسے نائب السلطنت کے مر جانے سے جس کا اقتدار اور دانشمندی اس کو ہمیشہ مشوش رکھتی تھی، غمگین نہیں ہوا۔ چنانچہ سر دربار محمد امین خاں سے کہا "افسوس ہے کہ تمہارا شفیق باپ اور ہمارا نہایت قوی اور نہایت خوفناک دوست چل بسا"۔ مگر بہر حال اورنگ زیب نہایت مہربانی اور فیاضی کے ساتھ محمد امین خاں سے پیش آیا۔ اور اس کو یقین دلایا کہ اپنے باپ کی جگہ اب ہم کو سمجھو اور بجائے اس کے کہ اس کی تنخواہ میں کچھ کمی کرے یا میر جملہ کے مال و دولت کو ضبط کرے، محمد امین خاں کو میر بخشی کے عہدہ پر مستقل کر دیا۔ بلکہ تنخواہ میں ایک ہزار روپیہ ماہوار کا اضافہ کر دیا اور اس کے باپ کے کل مال و دولت سے بھی کچھ تعرض نہیں کیا۔ (۱۴۷)

شائستہ خاں اور مہم اراکان اور پرتگیز قوم کے بحری قزاقوں اور ان کے ظلم و ستم کا ذکر

اب میں تھوڑا سا حال اورنگ زیب کے ماموں شائستہ خاں کا، جس کا کچھ ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے، اور جس کی مؤثر تقریریں اور جوڑ توڑ اس کے بھانجے کے لئے ایسے عظیم الشان مرتبہ پر پہنچنے کے باعث ہوئے، ناظرین کی خدمت میں ظاہر کرتا ہوں۔ تم پڑھ چلے ہو کہ کھجوہ کی لڑائی سے پہلے جبکہ اورنگ زیب دار الخلافت سے شجاع کے مقابلہ کو گیا تھا شائستہ خاں آگرہ کا صوبہ دار مقرر ہو چکا تھا۔ پس اس کے بعد وہ دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا اور وہاں کی سپہ سالاری بھی اسی کے متعلق کی گئی۔ اور اب میر جملہ کی وفات کے باعث بنگالہ کا صوبہ دار اور وہاں کی فوج کا سپہ سالار بھی مقرر ہوا اور امیر الامراء کا خطاب بھی اس کو دیا گیا۔ شائستہ خاں کی ناموری کے لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بنگالہ پہنچتے ہی جو مہم عظیم اس نے اپنے ذمہ لی تھی اس کا بیان کیا جائے اور جب یہ خیال کیا جائے کہ خدا جانے کس باعث سے اس کے نامور پیشرو (میر جملہ) نے اس کو اختیار نہیں کیا تھا تو یہ مہم اور بھی زیادہ توجہ کے قابل ہو جاتی ہے اور میرے اس بیان سے مملکت بنگالہ اور اراکان کی گزشتہ اور موجودہ حالت جو اب تک لوگوں کو چنداں معلوم نہیں ہے، منکشف ہو گی اور کچھ اور حالات بھی جو توجہ کے لائق ہیں ظاہر ہوں گے۔ مگر اس مہم کی کیفیت معلوم ہونے اور ان واقعات

کے بخوبی سمجھنے کے لئے جو خلیج بنگالہ میں واقع ہوئے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اراکان میں جسے مگھ لوگوں کا ملک بھی کہتے ہیں، برسوں سے بہت سے نو آباد پرتگیز اور عیسائی غلام اور دوغلے پرتگیز اور اور یورپی لوگ جو ادھر ادھر کے ملکوں سے آن کر جمع ہو گئے تھے، رہتے تھے۔ اور یہ ریاست ان بد چلن لوگوں کے لئے جائے پناہ تھی جو گوا، سیلون، کوچین، ملاکا اور ہندوستان کے اور مقامات سے جو قبل ازیں پرتگیزوں کے قبضہ میں تھے یہاں چلے آتے تھے اور جو بد معاش فقیر اپنی خانقاہوں کو چھوڑ آتے تھے یا جو بد اطوار لوگ دو تین عورتوں سے شادی کر کے یا کسی اور بڑے گناہ کے مرتکب ہو کر بھاگ آتے تھے، یہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ یہ صرف نام کے عیسائی تھے اور اراکان میں اُن کا طرزِ معاشرت نہایت قابل نفرت تھا۔ چنانچہ بے دھڑک ایک دوسرے کو قتل کرتے یا زہر دے دیتے تھے اور بعض اوقات اپنے واعظ پادریوں کو بھی، جو سچ پوچھو تو وہ بھی ان سے کچھ کم نہ تھے، مار ڈالتے تھے۔ اور اراکان کے راجہ نے جو ہمیشہ سلاطینِ مغلیہ سے خائف رہتا تھا اپنے ملک کی سرحد پر ان کے وجود کو بہ منزلہ ایک جنگی چوکی کے کار آمد سمجھ کر چاٹ گام کی بندرگاہ اور بہت سی زمینیں آبادی کے لئے ان کو دے رکھی تھیں اور چونکہ وہ ان لوگوں سے کسی طرح کی مزاحمت اور باز پرس نہیں کرتا تھا تو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان بد معاش اور بے لگان لوگوں کا پیشہ لوٹ کھسوٹ اور سمندری غارتگری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ یہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر چڑھ کر ادھر ادھر سمندر میں گشت لگاتے اور گنگا کی بے شمار شاخوں اور کھاڑیوں میں جا گھستے اور بنگالہ کے حصہ پائین کے جزیروں کو تباہ و برباد کرتے اور اکثر سو ڈیڑھ سو میل تک ملک کے اندر چلے آتے تھے اور جہاں کہیں بازار لگا ہوا ہوتا یا کوئی شادی بیاہ یا کوئی اور تقریب ہوتی، وہاں یکایک جا پڑتے اور تمام لوگوں کو پکڑ کر لے جاتے اور بد نصیب قیدیوں کو غلام بناتے اور جو چیز اٹھائی نہ جاتی اس کو جلا ڈالتے تھے اور یہ اس ہمیشہ کی لوٹ مار ہی کی وجہ سے تو ہے کہ ہم گنگا کے دہانہ پر ایسے عمدہ جزیروں کو جو کسی وقت خوب آباد اور معمور تھے ویران اور سنسان پڑا ہوا دیکھتے ہیں اور سوائے شیروں اور جنگلی جانوروں کے اب وہاں کوئی نہیں رہتا اور ان قیدیوں کے ساتھ وہ بڑی بے رحمی اور بد سلوکی سے پیش آتے تھے اور ان کو یہاں تک جرأت ہو گئی تھی کہ بڈھے آدمیوں کو نکمے اور بے کار جان کر انہی مقامات میں بیچنے کو لے جاتے تھے جہاں سے ان کو پکڑ کر لائے تھے اور اکثر دیکھا جاتا تھا کہ وہ جوان شخص جو کل اتفاقاً بھاگ کر ان کے ہاتھ سے بچ گئے تھے آج اپنے بڈھے باپ کو خرید کر ان

کے پنجہ سے چھڑانے میں کوشش کرتے تھے اور جوان قیدیوں کا یہ حال تھا کہ یا توان کو قزاقی سکھاتے تھے یہاں تک کہ وہ خود قتل وغارت کے شائق بن جاتے تھے یا ان کو گوا، سیلون اور سینٹ طامس (Saint Thomas) کے پرتگیزوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے۔ بلکہ خاص بنگالہ میں ہوگلی کے رہنے والے پرتگیز بھی ان بے چاروں کے خرید لینے میں کچھ تامل نہ کرتے تھے اور یہ ہولناک تجارت گالیس تک بھی ہوتی تھی جو راس ڈاس پال ماس (۱۴۸) کے قریب ایک جزیرہ ہے۔ ان قزاقوں نے یہ معمول باندھ رکھا تھا کہ فروخت مطلب غلاموں کی کشتیاں کی کشتیاں بھر کر مقررہ مقامات کو لے جا کر باہمی قرارداد کے موافق پرتگیزوں کے آنے کے منتظر رہتے تھے اور وہ ان سب کو نہایت ہی ارزاں قیمت پر خرید لے جاتے تھے اور نہایت افسوس ہے کہ پرتگیزوں کے زوال قوت کے بعد یورپ کی اور قوموں نے بھی چاٹگام کے ان قزاقوں کے ساتھ (جو یہ شیخی بگھارتے ہیں کہ ہم ایک سال کے اندر اس قدر ہندوؤں کو عیسائی بنا لیتے ہیں جو پادری لوگ تمام ہندوستان میں دس برس میں بھی نہیں بنا سکتے) اس مذموم تجارت کو جاری رکھا۔ سبحان اللہ! مذہب عیسائی کے پاک اوامر کو اس طرح سے متواتر توڑنا اور اس کے نواہی کی تحقیر کر کے علانیہ اس کے برخلاف عمل کرنا، کیا ہی عمدہ طریقہ ہمارے دینِ مقدس کے پھیلانے کا ان کم بختوں نے نکالا ہے!

جہانگیر کے وقت میں پرتگیزوں کے ہوگلی میں آباد ہونے اور شاہجہاں کے حکم سے ان کے سخت تباہ ہونے کا ذکر

یہ لوگ ہوگلی میں جہانگیر کی مہربانی سے آباد ہوئے تھے جو عیسائیوں سے بالکل تعصب نہ کرتا اور ان کی تجارت سے فوائدِ کثیر حاصل کرنے کی امید رکھتا تھا۔ علاوہ بریں ان لوگوں نے اس سے یہ عہد بھی کیا تھا کہ ہم خلیج بنگالہ کو بحری قزاقوں سے محفوظ رکھیں گے مگر شاہ جہاں نے جو باپ کی بہ نسبت مذہب اسلام کا زیادہ پابند تھا ان کو اس سبب سے سخت سزا دی کہ وہ نہ صرف اراکان کے قزاقوں کو جرأت دلاتے تھے بلکہ خود بھی بہت سے غلام جو بادشاہی رعیت تھے اپنے پاس رکھ کر ان کے آزاد کرنے سے انکار کرتے تھے۔ پس اس نے اول تو دھمکا کر اور پھسلا کر بہت سارو پیہ وصول کیا مگر اس کے علاوہ بادشاہ اخیر احکام کے موافق جن جن باتوں کی تعمیل ان کی طرف سے مطلوب تھی جب انہوں نے اس کو قبول نہ کیا تو آخر کار محاصرہ کر کے شہر پر قبضہ کر لیا گیا اور عموماً سب کو غلام بنا کر آگرہ بھیج دیا۔

زمانہ قریب کی تاریخوں میں ان لوگوں کی مصیبت کی کوئی مثال پائی نہیں جاتی۔ بلکہ وہ اس گروہ بنی اسرائیل کی مصیبت سے بہت کچھ مشابہ تھی جو بیت المقدس سے قید کئے جاکر سب کے سب بابل کو بھیج دیئے گئے تھے (۱۴۹) کیونکہ شاہ جہاں کے حکم کی تعمیل سے بھی نہ کوئی بچہ ہی مستثنیٰ رہا نہ کوئی واعظ اور نہ کوئی درویش! چنانچہ حسین اور خوبصورت عورتیں تو کیا بیاہی کیا کنواری لونڈیاں بناکر محلسرائے شاہی میں بھیج دی گئیں اور جو زیادہ عمر کی تھیں یا ان کی شکل اچھی نہ تھی امیروں کو تقسیم کی گئیں! اور کم سن لڑکے ختنہ کئے جاکر غلام بنائے گئے اور جو جوان تھے وہ بڑے بڑے وعدوں کی امید پر یا ہاتھی کے پاؤں سے کچلوائے جانے کی متواتر دھمکیوں سے مسلمان ہوگئے۔ البتہ چند درویش اپنے مذہب پر قائم رہے۔ اور فرقہ جیسویٹ کے عیسائیوں اور پادریوں کی مہربانی سے جنہوں نے اس آفت کے زمانہ میں بھی آگرہ کو رہنا ترک نہ کیا اور بہت سا روپیہ خرچ کرکے اور دوستوں سے سعی سفارش کراکر اپنے فیاضانہ ارادہ میں کامیاب ہوئے گوا اور اور مقاماتِ مقبوضہ اہلِ پرتگال کو بھیجے گئے۔ مگر ہوگلی کے حادثہ سے پہلے یہ پادری بھی شاہ جہاں کے عتاب سے نہ بچے تھے۔ چنانچہ اس نے آگرہ کا عالیشان اور خوبصورت گرجا جو جہانگیر کے عہد میں مع ایک اور گرجا کے جو لاہور میں بنایا گیا تھا، مسمار کرا دیا تھا۔ اس گرجا کے مینار پر ایک گھنٹہ لگا ہوا تھا جس کی آواز تمام شہر میں سنائی دیتی تھی (۱۵۰)۔

گوا کے وائسرائے کو اراکان پر مہم کرنے کیلئے پرتگیز بحری قزاقوں کا تحریک کرنا

ہوگلی کے چھن جانے سے پہلے جبکہ باستیان کان سالو اراکان کے قزاقوں کا سرغنہ تھا اور ایسا نامی اور زبردست شخص ہوگیا تھا کہ شاہِ اراکان کی بیٹی سے اس نے شادی کرلی تھی! ان قزاقوں نے گوا کے وائسرائے کی خدمت میں باقاعدہ طور پر یہ درخواست پیش کی تھی کہ اگر آپ چاہیں تو تمام ملک اراکان پر ہم آپ کا قبضہ کرا سکتے ہیں۔ اگرچہ بلحاظ پرتگیزوں کی اس وضع اور رویہ کے جو انہوں نے جاپان 'پیگو' تھوپیا اور اور ملکوں میں اختیار کیا تھا، اس کے قبول کرلینے میں کوئی نئی اور قابلِ تعجب بات نہ تھی۔ مگر کہتے ہیں وائسرائے گوا نے غرور اور حسد کے مارے اس کو منظور نہ کیا اور اس کو یہ امر نازیبا معلوم ہوا کہ شاہِ پرتگال ایک ایسے بڑے معاملہ میں ایک ایسے چھوٹے اور کم اصل شخص کا احسان

اٹھائے۔

پُرتگیزوں کی بداعمالی کا ذِکر

امر واقعی یہ ہے کہ ہندوستان میں پُرتگیزوں کے زوال طاقت کا باعث ان کی بداعمالی ہے اور جیسا کہ وہ خود بھی قبول کرتے ہیں اس کو غضب الٰہی کا ایک نشان سمجھنا چاہئے۔ اگلے زمانہ کے پُرتگیزوں کا ہندوستان میں بڑا نام تھا اور تمام ہندوستانی رؤسا ان کی دوستی کے خواہاں تھے اور وہ جرأت اور دین داری اور دولت مندی اور بڑی بڑی عظیم الشان مہموں کے کرنے میں مشہور تھے (۱۵۱) اور وہ ایسے نہ تھے جیسے کہ آج کل کے پُرتگیز ہیں، جو ہر ایک معیوب فعل کے عادی ہیں اور جن کا ہر ایک ذلیل اور پاجیانہ کام میں دل لگتا ہے۔

جزیرہ سوندیب اور فراجوان نامی ایک بدنام پُرتگیز درویش کا ذِکر

اسی زمانہ کے قریب جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، جزیرہ سوندیب (۱۵۲) کو ان دریائی قزاقوں نے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا جو گنگا کے دہانہ کے اکثر روکے رکھنے کو ان کے لئے ایک بہت کارآمد ناکہ تھا اور وہ نامی بدمعاش فراجوان جو اگستاین فرقہ کے درویشوں میں سے تھا نہ معلوم کن فن وفریب سے وہاں کے حاکم کو نکال کر ایک مدت تک اس جزیرہ کا ایک چھوٹا سا راجہ بنا رہا تھا اور یہ وہی قزاق تو تھے جن کا ذِکر میں نے پہلے کیا ہے کہ اپنی گیلی آس (۱۵۳) قسم کی کشتیوں میں بیٹھ کر سلطان شجاع کے پاس ڈھاکہ میں اس غرض سے آئے تھے کہ اس کو اراکان لے جائیں۔ اس موقع پر بھی ان بدمعاشوں نے ایک عجیب چالاکی کی تھی کہ کسی طرح اس کے اسباب کے صندوقوں میں سے بہت سے جواہرات نکال لئے تھے اور اراکان پہنچ کر جزوی قیمت پر خفیہ خفیہ بیچتے پھرتے تھے جن میں سے ڈچوں اور اور فرنگیوں نے اکثر ہیرے یہ دم (دھوکہ) دے کر کہ یہ کچے ہیں، ان بے وقوفوں سے تھوڑی سی قیمت پر اُڑا لئے تھے۔

شائستہ خاں کا ان پُرتگیز قزاقوں پر چڑھائی کرنا اور ان کے مطیع کرنے میں ڈچوں سے مدد لینا

میں خیال کرتا ہوں کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس امر کے اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے کہ سلاطین مغلیہ کو کس قدر تکلیف اور ایذا اور خرچ ان ظالم اور زبردست

لٹیروں کے سبب سے اٹھانا پڑتا تھا اور ان کے بنگالہ میں گھس آنے کے خوف سے ہمیشہ فوج اور گیلی آس قسم کی کشتیوں کے نواڑے ناکوں کے روکنے کے لئے تیار رکھنے پڑتے تھے اور اس پر بھی ان کے ہاتھ سے ملک ہمیشہ تباہ و برباد ہوتا رہتا تھا اور یہ قزاق اس قدر دلیر اور اپنے فن میں ایسے مشاق ہو گئے تھے کہ صرف چار پانچ گیلی آس کشتیوں میں بیٹھ کر چڑھ آتے تھے اور عموماً چودہ پندرہ گیلی قسم کی بادشاہی کشتیوں کو گرفتار کر لیتے یا تباہ کر ڈالتے تھے۔ اس لئے شائستہ خاں نے بنگالہ کا صوبہ دار مقرر ہو کر ان کی بیخ کنی کی تجویز کی اور اس میں اس کے دو مطلب تھے کہ بر دست توان بے رحم وحشی قزاقوں کے متواتر اور برباد کن حملوں سے اپنے صوبہ کا بچانا اور آخر کار اراکان کے راجہ پر چڑھائی کرنا اور اس بے رحمی کی سزا دینا جو اس نے سلطان شجاع اور اس کے اہل و عیال کی نسبت کی تھی۔ کیونکہ اورنگ زیب کا مستقل ارادہ تھا کہ ان عالی منزلت لوگوں کے خون کا انتقام لے اور اس مثال سے قرب و جوار کے تمام رئیسوں کو یہ سبق دے کہ خاندان شاہی کے لوگ خواہ کسی حالت میں کیوں نہ ہوں انسانیت اور ادب کے ساتھ سلوک کئے جانے کے مستحق ہیں۔ چنانچہ شائستہ خاں نے اپنی تجویز کے ابتدائی امور کو غایت درجہ کی ہوشیاری کے ساتھ پورا کیا اور چونکہ دریاؤں اور ندی نالوں کی وجہ سے جو راستہ میں پڑتے ہیں خشکی کی راہ سے اراکان میں فوج کا لے جانا بہت مشکل تھا اور بسبب اس فوقیت کے جو ان بحری قزاقوں کو جہازی لڑائی میں حاصل تھی سمندر کے راستہ سے فوج کشی کرنا اس سے بھی زیادہ دُشوار تھا اس لئے اس نے ڈچ لوگوں سے مدد لینا مناسب سمجھا اور جس طرح پر شاہ عباس بادشاہِ ایران نے انگریزوں کے اتفاق سے جزیرہ ہرمز (۱۵۴) پر قبضہ کر لیا تھا، اسی طرح اس نے بھی ڈچوں کی امداد سے اراکان پر قبضہ کر لینا چاہا اور بٹیویا کے گورنر کے پاس اپنے ایلچی کو چند خاص شرطوں کے ساتھ عہد و پیمان کرنے کو بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ آؤ ہم تم مل کر اراکان پر مشترکہ قبضہ کر لیں۔ بٹیویا کا گورنر اس تجویز کے قبول کر لینے پر اس وجہ سے آسانی کے ساتھ مائل ہو گیا کہ اس کے ذریعہ سے ان کو ہندوستان کے معاملات میں پرتگیزوں کی مداخلت کے کم کرنے کا {جس سے ڈچ کمپنی (۱۵۵) کا بہت فائدہ تھا} زیادہ تر موقع ہاتھ آتا تھا اور اس نے اپنے دو جنگی جہاز بنگالہ کو بھیج دیئے تاکہ شائستہ خاں کی فوج کو آسانی کے ساتھ چاٹ گام میں پہنچا دیں۔ چونکہ اس عرصہ میں شائستہ خاں نے بھی گیلی آس وغیرہ قسم کی بڑی بڑی کشتیاں جمع کر لی تھیں پس اس نے ان قزاقوں کو اس طرح پر دھمکایا کہ ”اگر فوراً اطاعت قبول نہ کرو گے تو نیست و

نابود کر دیئے جاؤ گے۔ کیونکہ اورنگ زیب نے اراکان کے راجہ کی سزا دہی کا ارادہ مصمم کر لیا ہے اور ڈچوں کے جنگی جہازوں کا ایک طاقت ور بیڑا بھی، جس کا تم مقابلہ نہ کر سکو گے، بہت جلد آنے والا ہے۔ پس اگر تم کو کچھ عقل ہے اور اپنی اور اپنے اہل و عیال کی خیریت چاہتے ہو تو راجہ کی نوکری چھوڑ کر شاہی ملازمت اختیار کر لو اور جس قدر تم کو ضرورت ہو بنگالہ میں زمین عطا کی جائے گی اور راجہ کے ہاں سے جتنی تنخواہ ملتی ہے اس سے دو چند دی جائے گی۔"

اتفاقاً انہی ایام کے قریب ان قزاقوں نے راجہ اراکان کے ایک بڑے عہدہ دار کو مار ڈالا تھا۔ اب اگرچہ یہ بات تو ٹھیک معلوم نہیں کہ راجہ کی سزا دہی کے اندیشہ نے انہیں ڈرایا یا شائستہ خاں کی دھمکیوں اور وعدہ وعیدوں نے اثر کیا۔ مگر یہ امر محقق ہے کہ ایک دن ان نالائق پرتگیزوں پر ایسا خوف طاری ہوا کہ یکلخت چالیس پچاس گالیاسوں میں بیٹھ کر بنگالہ کو چل پڑے اور ایسے اضطراب سے روانہ ہوئے کہ اس ہڑبڑاہٹ میں جورو بچے اور مال و اسباب بھی بمشکل ساتھ لا سکے۔ شائستہ خاں ان نئے ملاقاتیوں سے بڑے اخلاق کے ساتھ ملا اور بہت سا روپیہ ان کو دیا اور شہر ڈھاکہ میں ان کے اہل و عیال کے رہنے کے لئے عمدہ بندوبست کر دیا اور اس طرح پر ان کو اس کے حسنِ سلوک کا ایسا بھروسہ ہو گیا کہ از خود بادشاہی لشکر کے ساتھ مہم پر جانے کی خواہش ظاہر کی اور جزیرہ سوندیپ پر چڑھائی کرنے اور فتح کر لینے میں (جو کچھ دنوں سے راجہ اراکان کے قبضہ میں چلا گیا تھا) شریک ہوئے اور پھر یہاں سے بادشاہی فوج کے ساتھ چاٹ گام کو گئے۔ اب اگرچہ ڈچوں کے وہ دونوں جنگی جہاز بھی آپہنچے مگر شائستہ خاں نے ان کے سرداروں کی مہربانی کا شکریہ ادا کر کے یہ کہلا بھیجا کہ اب آپ کے تکلیف کرنے کی کچھ حاجت نہیں رہی۔

بنگالہ میں یہ جہاز میں نے بھی دیکھے تھے اور ان کے عہدہ داروں سے ملاقات بھی ہوئی تھی جو اس بات کے شاکی تھے کہ اس ہندوستانی سردار نے محض زبانی جمع خرچ اور خشک شکریہ پر ہی ان کو ٹالا اور شرائط مقررہ کا کچھ لحاظ نہ کیا۔

پرتگیزوں کے ساتھ شائستہ خاں کے طرزِ سلوک کا ذکر

شائستہ خاں کا برتاؤ ان پرتگیزوں کے ساتھ اگرچہ ویسا نہیں ہے جیسا کہ شاید بلحاظ ان کی خدمات کے ہونا چاہئے تھا مگر ہاں وہ ان سے اس سلوک سے پیش آتا ہے جس

کے کہ وہ واقع میں لائق ہیں۔ اس نے چاٹ گام سے توان کو اکھیڑ ہی دیا ہے اور وہ اب اپنے اہل و عیال سمیت اسی کے قابو میں ہیں اور ان کی امداد کی بھی کچھ حاجت نہیں رہی۔ اس لئے اس نے سمجھ لیا ہے کہ جو وعدے ان سے کئے گئے تھے ان میں سے اب کسی کے بھی ایفا کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ کئی کئی مہینے گزر جاتے ہیں کہ تنخواہ کی بابت پھوٹی کوڑی تک نہیں ملتی اور وہ علانیہ کہا کرتا ہے کہ یہ ایسے دغاباز اور نالائق ہیں کہ جس راجہ نے ان سے اس قدر سلوک کئے تھے یہ پاجی اسی کے ساتھ بے ایمانی سے پیش آئے اور اس لئے ان پر بھروسہ کرنا نادانی ہے اور اس طرح سے اس نے چاٹ گام میں ان پرتگیزوں کی طاقت کے چراغ کو بجھا دیا جنہوں نے بنگالہ کے نیچے کے حصہ میں اس قدر اندھیر مچا کر تمام ملک کو ویران اور بے چراغ کر دیا تھا اور یہ امر زمانہ کے گزرنے پر معلوم ہو گا کہ آیا شائستہ خاں کو ایسی ہی کامیابی اراکان کی مہم میں بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ (۱۵۶)

اورنگ زیب کے بیٹوں محمد سلطان اور محمد معظم کا ذکر

محمد سلطان تو اب تک قلعہ گوالیار میں قید ہے۔ لیکن کہتے ہیں کہ اس کو وہ پوستوں کا معمولی قدح اب نہیں پلایا جاتا اور محمد معظم بدستور اپنی ہوشیاری اور سلامت روی کی چال پر چلے جاتا ہے۔ لیکن ایک واقعہ سے ایسا پایا جاتا ہے کہ شاید بادشاہ اس سے کچھ ناراض تھا۔ اور اس ناراضی کا سبب یا تو یہ ہو گا کہ اپنے باپ کی شدتِ مرض کے زمانہ میں کوئی خفیہ کارروائی کی ہو گی یا کوئی اور نامعلوم سبب ہو گا۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر کسی مخفی رنجش کے صرف اس کی جرأت اور اطاعت کا امتحان ہی منظور ہو۔ مگر بہر حال اورنگ زیب نے ایک روز بھرے دربار میں اس کو یہ حکم دیا کہ "ایک شیر جو پہاڑ سے اتر آیا ہے اور گردونواح کے لوگوں کو تکلیف دیتا ہے اس کو جا کر مار آیئے" اور اگرچہ بادشاہی میر شکار نے ذرا جرأت کر کے عرض کیا کہ جہاں پناہ وہ بڑے بڑے جال بھی تو ساتھ جانے مناسب ہیں جو اس خطرناک شکار کے واسطے مخصوص ہیں، لیکن بادشاہ نے نہایت رُکھائی سے کہا کہ نہیں!! ان کی کچھ حاجت نہیں کیونکہ ایام شہزادگی میں ہم نے تو کبھی اس قسم کی احتیاطوں کا خیال بھی نہیں کیا اور یہ حکم ایسے قطعی طور پر دیا کہ شہزادہ کو بلاعذر جانا ہی پڑا اور اگرچہ اس معرکہ میں دو تین آدمی کام آئے اور کچھ گھوڑے بھی زخمی ہوئے اور شیر زخم کھا کر اور جست کر کے شہزادہ کے ہاتھی کے سر پر بھی آن پڑا، مگر مار لیا گیا اور جب سے یہ جرأت اور دلاوری

شہزادہ سے ظہور میں آئی ہے بادشاہ اس سے بڑی محبت سے پیش آتا ہے اور یہاں تک اس کو بڑھا دیا ہے کہ دکن کی صوبہ داری بھی دے دی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس کے اختیارات خصوصاً صرفِ زر کے باب میں ایسے محدود ہیں کہ اس سے کسی تکلیف کے پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔

مہابت خاں صوبہ دار کابل کا ذکر

(اور مختصر بیان اُن لڑائیوں کا جو ایران اور ہندوستان کے باہم قندھار پر ہوتی رہی ہیں)

اب میں مہابت خاں صوبہ دار کابل کا ذکر کرتا ہوں کہ اس نے بھی آخر کار کابل کی حکومت سے دستبردار ہو کر حاضر ہو جانا ہی مناسب سمجھا اور اورنگزیب نے بھی ازراہ عالی ہمتی اس کا قصور معاف کر دیا اور فرمایا کہ ایسے سپاہی کی جان بہت قیمتی ہے اور اپنے آقا (شاہجہاں) کے ساتھ اس کی وفاداری تعریف کے لائق ہے، بلکہ عفوِ قصور کے علاوہ راجہ جسونت سنگھ کی جگہ (جو شائستہ خاں کی مدد کو سیواجی مرہٹہ کی بیخ کنی کے لئے) دکن کو بھیجا گیا تھا، گجرات کا صوبہ دار بھی مقرر کر دیا۔ مگر ہاں اس جگہ یہ بات بھی جتا دینے کے قابل ہے کہ علاوہ ان تحائف کے جو اس نے روشن آرا بیگم کو دیئے تھے پندرہ سولہ ہزار اشرفیاں اور بہت سے ایرانی اونٹ اور گھوڑے خود بادشاہ کی نذر کئے تھے۔ پس تعجب نہیں ہے کہ ان تحفوں ہی نے بادشاہ کے دل کو نرم کر دیا ہو۔

مہابت خاں کے ساتھ چونکہ کابل کا ذکر آ گیا ہے تو اس وجہ سے اس کے ہمسایہ صوبہ قندھار کا خیال بھی خواہ مخواہ میرے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ اس کے بیان میں بھی دو ایک صفحہ لکھ ڈالوں۔ یہ صوبہ فی زمانہ سلطنتِ ایران کا باج گزار ہے۔ اس کے حالات اور خصوصاً اس پولیٹکل حسد اور مخالفت کے خیالات سے جو اس ملک کے باعث ایران اور ہندوستان کے بادشاہوں کے باہم پیدا ہوتے رہتے ہیں، لوگ بہت کم واقف ہیں۔

پس واضح ہو کہ یہ ملک اور اس کا دارالحکومت جو اس زرخیز اور خوشنما صوبہ کے اندر ایک مستحکم قلعہ ہے دونوں کو قندھار ہی کہتے ہیں اور اس پر قبضہ حاصل کرنے کی خاطر ایرانیوں اور سلاطینِ مغلیہ کے باہم ایک مدت سے برابر خونریز لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ شہنشاہ اکبر نے اس کو ایرانیوں سے چھین لیا تھا اور اس کے عہد تک برابر اس پر قبضہ رہا۔ مگر

شاہ عباس نے اس کے بیٹے جہانگیر سے پھر لے لیا۔ اور شاہ جہاں کے وقت میں علی مردان خان کی نمک حرامی سے جو یہاں کا حاکم تھا اور شاہجہاں سے سازش کر کے فوراً اپنے اس نئے آقا کی پناہ میں چلا آیا تھا پھر سلطنتِ مغلیہ کے قبضہ میں آ گیا اور باعث اس کا یہ ہوا تھا کہ دربار ایران میں علی مراد خاں کے بہت سے دشمن تھے اور وہ خوب جانتا تھا کہ اگر ان فرمانوں کی تعمیل کروں گا جو صوبہ کا حساب سمجھانے کے بارہ میں صادر ہوئے ہیں تو کیا نتیجہ ہو گا۔

اس کے بعد شاہ عباس کے بیٹے نے محاصرہ کر کے اس کو پھر فتح کر لیا اور اگرچہ شاہ جہاں نے دو دفعہ فوج بھیجی مگر دونوں دفعہ ناکامیاب ہی رہا۔ چنانچہ پہلی دفعہ کی ناکامیابی کا سبب تو ان ایرانی امرا کی نمک حرامی تھی جو شاہ جہاں کے دربار میں سب سے بڑھ کر ذی اقتدار تھے اور باطن میں اپنے ملک کو نہایت عزیز جانتے تھے۔ جنہوں نے اس محاصرہ میں نہایت قابلِ شرم پہلو تہی کی اور راجہ روپ سنگھ کو، جس نے اپنا نشان اس دیوار پر جا گاڑا تھا جو سب سے زیادہ پہاڑ کے قریب تھی، مدد نہ دی اور دوسری بار ناکامیاب رہنے کا باعث اورنگ زیب کا رشک و حسد تھا جس نے اس راستہ سے جو انگریزوں، پرتگیزوں، جرمنوں اور فرانسیسیوں کی توپوں نے دیوار قلعہ کو توڑ کر خاصہ گزرنے کے قابل بنا دیا تھا، حملہ کر کے داخل ہی ہونا نہ چاہا کیونکہ اس مہم کا آغاز دارا شکوہ نے کیا تھا جو اس وقت باپ کے ساتھ کابل میں تھا اور اورنگ زیب کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ اس قابلِ قدر ارادہ میں کامیاب ہونے کی ناموری دارا شکوہ کو حاصل ہو۔ اگرچہ شاہ جہاں نے شہزادوں کے باہمی جنگ سے چند سال پہلے تیسری دفعہ بھی قندھار کا محاصرہ کرنا چاہا تھا لیکن میر جملہ نے اس مہم سے روک دیا اور جیسے کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں اس کے عوض دکن پر فوج کشی کرنے کی صلاح دی اور علی مردان خان نے بڑے زور سے اس کے دلائل کی تائید کی بلکہ یہ عجیب لفظ کہے کہ :

"حضور قندھار کو کبھی فتح نہ کر سکیں گے جب تک کہ کوئی مجھ سا ہی نمک حرام اس کا پھاٹک نہ کھول دے یا حضور تمام ایرانیوں کو، جو سپاہ میں ہیں، فوج محاصر سے بالکل خارج نہ کر دیں اور اس مضمون کا اشتہار جاری نہ فرما دیں کہ بازاری لوگوں سے جو فوج کے لئے رسد لائیں کسی طرح کا محصول نہ لیا جائے گا۔"

چند سال ہوئے کہ اورنگ زیب نے بھی بہ تقلید اپنے بزرگوں کے یا تو اس نامہ سے جو شاہ ایران نے لکھا تھا یا اس کم التفاتی سے جو اس کے سفیر تربیت خاں کی تعظیم و تکریم کے باب میں دربار ایران کی طرف سے وقوع میں آئی تھی ناراض ہو کر قندھار پر مہم کی

تیاری کی تھی۔ لیکن شاہ ایران کے انتقال کی خبر سن کر ملتوی کر دی اور یہ بات بنائی کہ ہمارا دل گوارا نہیں کرتا کہ ایک لڑکے پر جو ابھی تخت نشین ہوا ہے چڑھائی کریں! حالانکہ میرے قیاس میں شاہ سلیمان کی عمر جو باپ کی جگہ تخت نشین ہوا ہے پچیس برس سے کم نہیں ہے۔

اورنگ زیب کے گہرے ہوا خواہوں کا ذِکر

اب میں اورنگ زیب کے سرگرم رفیقوں کا، جن میں سے اکثر کو بڑے بڑے منصب اور عہدے دیے گئے تھے، ذِکر کرتا ہوں:۔

واضح ہو کہ اورنگ زیب کا ماموں شائستہ خاں تو جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے دکن کا صوبہ دار بنایا گیا اور جو فوج وہاں کام دے رہی تھی اس کی سپہ سالاری بھی اسی کو دی گئی اور آخر کار بنگالہ کی صوبہ داری پر سرفراز ہوا اور امیر خاں کو کابل، خلیل اللہ خاں کو لاہور، میر بابا کو الہ آباد، لشکر خاں کو پٹنہ اور الہ وردی خاں کے بیٹے کو جس کے باپ کی صلاح سے سلطان شجاع نے کھجوہ کے مقام پر شکست کھائی تھی، سندھ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ فاضل خاں کو جس کی معقولیت اور دانشمندانہ صلاح مشوروں سے اورنگ زیب کو بہت بڑی مدد ملی تھی خانسامانی کا عہدہ ملا۔ دہلی کی صوبہ داری دانشمند خاں کو عنایت ہوئی اور اس رسم قدیم کے بجالانے سے کہ ہر ایک امیر کو صبح و شام تسلیمات کے واسطے دربار میں حاضر ہونا لازم ہے (اور اگر اس میں کبھی فروگزاشت ہو جائے تو جرمانہ بھرنا پڑتا ہے) خصوصیت کے ساتھ اس وجہ سے معاف کیا گیا کہ سیر کتب اور مطالعہ کا اس کو نہایت شوق ہے اور اس کے علاوہ صیغہ دولِ خارجہ کے متعلقہ کاموں میں بھی بہت وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ دیانت خاں کو کشمیر کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ جو اگرچہ دشوار گزار اور مختصر سا ملک ہے۔ مگر ایسا پُر فضا قطعہ ہے کہ ہندوستان کا بہشت گنا جاتا ہے اور جس کو اکبر نے ایک حیلہ سے فتح کر لیا تھا اور اس بات کا فخر اس کو حاصل ہے کہ اس کی صحیح تاریخ خود وہیں کی زبان میں موجود ہے جس میں شاہانِ سلف کے ایک طول طویل سلسلہ کا دلچسپ حال مندرج ہے جو کسی زمانہ میں ایسے طاقتور تھے کہ تمام ہندوستان کو لنکا تک فتح کر لیا تھا۔ ان تاریخوں کا ترجمہ خلاصہ کے طور پر جہانگیر نے فارسی زبان میں کرایا تھا جس کی ایک نقل میرے پاس بھی موجود ہے۔ اس موقع پر یہ امر بھی ذکر کے لائق ہے کہ اورنگ زیب نے نجابت خاں کو جس نے سموں گڑھ اور کھجوہ کے معرکوں میں بڑی شجاعت دکھلائی تھی اس کے منصب سے گرا دیا تھا۔ مگر معلوم

ہوتا ہے کہ یہ بے عزتی اس کو اس لئے نصیب ہوئی تھی کہ اس نے اپنی خدمتیں بار بار جتائی تھیں اور منجملہ ان دو بد ذاتوں یعنی جیون خاں اور نذیر کے، جیون خاں کے مقدر کی سرگزشت کہ جس کا وہ حقیقتاً مستحق تھا، میں پہلے ہی لکھ آیا ہوں اور یہ بات کچھ تحقیق نہیں کی گئی کہ نذیر کا انجام کیا ہوا۔

راجہ جسونت سنگھ اور جے سنگھ اور سیواجی مرہٹہ کا ذِکر

جسونت سنگھ اور جے سنگھ کی حالت اگرچہ کچھ مبہم سی ہے مگر میں اس کی توضیح میں کوشش کروں گا۔ واضح ہو کہ بیجاپور میں ایک ہندو نے بغاوت کر کے کئی بڑے بڑے قلعوں اور بندرگاہوں پر جو شاہ بیجاپور کے متعلق تھے قبضہ کر لیا تھا۔ اور اس قسمت آزمائی کرنے والے نڈر شخص کا نام سیواجی ہے جو ایک بڑا ہوشیار صاحبِ داعیہ اور ایسا متہور آدمی ہے کہ اپنے مرنے جینے کی اس کو پروا ہی نہیں ہے۔ چنانچہ جس زمانہ میں کہ شائستہ خاں دکن کا صوبہ دار تھا وہ اس کو شاہِ بیجاپور کی تمام سپاہ اور ان راجاؤں کی متفقہ قوت کی بہ نسبت جو کسی دشمن عام کے مقابلہ میں اس کے ساتھ شامل ہو جایا کرتے ہیں زیادہ خوفناک پاتا تھا۔

شائستہ خاں پر سیواجی کا حملہ

اس شخص کی جرأت و جسارت کو اسی پر قیاس کر لینا چاہیے کہ باوجودیکہ شائستہ خاں کی سپاہ گرداگرد اُتری ہوئی تھی اور شہر اورنگ آباد فصیل سے بھی محصور تھا مگر اس پر بھی ایک رات صرف چند سپاہیوں کے ساتھ شائستہ خاں کے مکان کے اندر اس ارادہ سے جا ہی گھسا کہ شائستہ خاں کو پکڑ کر اس کے تمام مال و دولت پر قابض ہو جائے اور اگر تھوڑی دیر اور خبر نہ ہوتی تو کچھ شک نہیں ہے کہ یہ اپنے منصوبہ میں ضرور کامیاب ہو جاتا۔ چنانچہ شائستہ خاں اس موقع پر سخت زخمی ہوا اور اس کا بیٹا میان سے تلوار نکالتے ہوئے مارا گیا۔

سیواجی کا بندرگاہ سورت کو لوٹنا اور جسونت سنگھ کی سازش کا شبہ

اس سے تھوڑے ہی دنوں بعد اس نے ایسا ہی ایک اور چھاپہ مارا جس میں زیادہ کامیابی ہوئی۔ یعنی چپکے سے دو تین ہزار چیدہ سپاہی ساتھ لے کر اپنی لشکر گاہ سے نکل کھڑا ہوا اور یہ مشہور کیا کہ ایک راجہ بادشاہ کے سلام کو دہلی جاتا ہے اور جب شہر سورت کے قریب

پہنچا اور وہاں کا حاکم اس کو ملا تو اسے یہ دم (دھوکہ) دے دیا کہ میرا قصد شہر میں جانے کا
نہیں ہے سیدھا باہر باہر جاؤں گا۔ (حالانکہ اس منصوبہ کا اصل مدعا اسی مشہور اور دولتمند
بندرگاہ کو لوٹنا تھا) اور آپ تلوار پکڑ کر شہر میں آن گھسا اور تین دن تک لوگوں کو سخت
تکلیفیں اور عذاب دے دے کر خوب نچوڑا اور بقدر کئی ملین (۱۵۷) روپیہ کے سونے
چاندی اور موتیوں اور ریشمی کپڑوں اور عمدہ ململوں اور تجارتی جنسوں سے لاد کر چلتا پھرتا
نظر آیا اور جو چیز اٹھا نہ سکا اس کو پھونک جلا کر خاک سیاہ کر گیا۔

چونکہ اس موقع پر کسی نے اس سے اتنا بھی نہ پوچھا کہ تیرے منہ میں کتنے دانت
ہیں اس وجہ سے یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ اس کے اور راجہ جسونت سنگھ کے باہم خفیہ سازش
ہے اور شائستہ خاں پر حملہ کرنا اور سورت کو لوٹنا سب اس کے علم واشارہ سے ہے۔ اس لئے
راجہ دکن سے واپس بلایا گیا مگر وہ دہلی آنے کی جگہ اپنی ریاست کو چلا گیا۔

لو! یہ کہنا تو میں بھول ہی گیا کہ سیواجی۔ نہیں نہیں دھرم آتما سیواجی صاحب!!
نے سورت کو لوٹتے وقت ریورینڈ فادر ایمبروز کے مکان کو جو فرقہ کپے پوشین (۱۵۸)
میں سے ایک مشنری تھے، ہاتھ تک نہیں لگایا اور کہا کہ یورپی لوگوں کے پادری نیک شخص
ہیں ان کو ستانا نہیں چاہئے! اسی طرح ایک ہندو کے مکان کو بھی (جو ڈچ سوداگروں کی دلالی
کا کام کرتا تھا) اس لئے نہ چھیڑا کہ وہ بہت سخی اور دھن وان مشہور تھا۔ انگریزوں اور ڈچوں کے
مکانات بھی بچے رہے لیکن اس کا سبب یہ نہ تھا کہ سیواجی ان کا کچھ لحاظ کرتا تھا بلکہ انہوں نے
اپنی ہمت اور دلیری سے اپنے آپ کو بچایا اور انگریزوں نے تو اپنے جہاز کے خلاصیوں وغیرہ کی
مدد سے کمال ہی کر دکھایا اور نہ صرف اپنے ہی مکانات بچائے بلکہ پڑوسیوں تک کے
مکانوں کو بھی آنچ نہ آنے دی۔ اس موقع پر ایک قسطنطنیہ کے رہنے والے یہودی نے عجیب
ہٹ دکھلائی جس سے لوگ حیران رہ گئے۔ سیواجی نے یہ سن کر کہ اس کے پاس نہایت قیمتی
یاقوت ہیں (جن کو وہ بیچنے کے لئے اورنگ زیب کے پاس لے جانا چاہتا ہے) اس کو تین
دفعہ گھٹنوں بٹھلا کر اور ننگی تلواریں تول تول کر ہر چند ڈرایا۔ مگر اس نے ہرگز نہ بتایا اور
یہودیوں کی اس عادت کو کہ روپیہ کو جان سے زیادہ عزیز جانتے ہیں، خوب ہی نباہا۔

راجہ جے سنگھ کا سپہ سالار دکن مقرر ہونا اور سیواجی کے ساتھ مصالحہ

سورت کے واقعہ کے بعد اورنگ زیب نے جے سنگھ کو فوج مامورہ دکن کی سپہ

سالاری قبول کرنے پر رضامند کیا اور سلطان محمد معظم کو بھی اس کے ساتھ بھیجا۔ مگر شہزادہ کو کسی قسم کا اختیار نہیں دیا۔ اب راجہ نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ سیواجی کے سب سے بڑے قلعہ پر زور و شور سے حملے کرنے شروع کردیئے۔ مگر اس کے ساتھ اپنے معمولی فن کے موافق جوڑ توڑ اور دیگر وعدہ وعید سے بھی کام لیتا رہا۔ جس کا حسب دلخواہ یہ نتیجہ ہوا کہ قبل اس سے کہ اہلِ قلعہ نہایت لاچار ہوکر مغلوب ہوتے، سیواجی نے قلعہ حوالہ کردیا اور یہ شرط بھی قبول کرلی کہ اگر بیجاپور پر فوج کشی کی جائے تو بادشاہی فوج کا ساتھ دوں گا اور اورنگ زیب نے بہ الطافِ شاہانہ اس کو راجہ کا خطاب عنایت کیا اور اس کے بیٹے کو امرا کی ذیل میں داخل کرکے مثل اور امیروں کے وظیفہ مقرر کردیا۔

سیواجی کے دہلی میں حاضر ہونے اور پھر خوف کھا کر بھاگ جانے کا ذکر

اس سے کچھ دنوں بعد جو ایران پر چڑھائی کا ارادہ ہوا تھا تو اورنگ زیب نے سیواجی کو نہایت عنایت آمیز اور خوش آئند الفاظ میں فرمان لکھا اور اس کی فہم و فراست اور سخاوت و شجاعت وغیرہ کی بہت تعریف کی اور راجہ جے سنگھ بھی جان اور آبرو کی حفاظت کا ضامن بنا۔ اس لئے سیواجی بھی مطمئن ہوکر دہلی میں حاضر ہوگیا تھا۔ مگر اتفاق وقت سے شائستہ خاں کی بیوی بھی اس وقت دہلی میں موجود تھی اور برابر اس امر پر مصر تھی کہ ایسا شخص جس نے میرے بیٹے کو قتل کیا، شوہر کو زخمی کیا اور بندر سورت کو لوٹا، ضرور گرفتار اور قید ہونا چاہیے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیواجی یہ دیکھ کر کہ تین چار امیر اس کے خیموں کو ہمیشہ تاک میں رکھتے ہیں ایک رات بھیس بدل کر بھاگ گیا اور اس وجہ سے کہ یہ شخص قابو سے نکل گیا شاہی محل میں بیگمات کو بہت رنج اور افسوس ہوا اور جے سنگھ کے بڑے بیٹے پر قوی شبہ ہوا کہ اس نے سیواجی کو مدد دے کر بھگا دیا ہے اور اس کو دربار میں حاضر ہونے سے ممانعت کی گئی۔

جے سنگھ کی وفات اور اورنگ زیب کا اس کے بیٹے کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا

چونکہ اورنگ زیب راجہ جے سنگھ اور اس کے بیٹے دونوں ہی سے خواہ بہ دل خواہ محض ظاہری طور پر ناراض معلوم ہوتا تھا اس سبب سے راجہ جے سنگھ کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ

کہیں اورنگ زیب اس حیلہ سے میری ریاست ہی ضبط نہ کرلے۔ پس نہایت عجلت کے ساتھ اپنے ملک کے بچانے کو دکن سے واپس آیا لیکن راستہ ہی میں برھان پور پہنچ کر مرگیا۔

یہ خبر سن کر جے سنگھ کے بیٹے کی نسبت اورنگ زیب نے جو اظہار عنایت کیا اور اس کی اس مصیبت پر اپنا دلی افسوس ظاہر فرمایا اور اس کے باپ کے منصب اور جاگیر وغیرہ پر اس کو بحال کردیا تو اس سے بہت لوگوں کی یہ رائے ہوگئی کہ سیواجی کا بھاگ جانا خود اورنگ زیب ہی کی چشم پوشی اور اغماض سے ہوا ہے اور وہ یہ گمان کرتے تھے کہ چونکہ بیگمات کو سیواجی سے نہایت ہی نفرت تھی اور ان کے رنج اور تلخی و تندی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا اور وہ یہ سمجھتی تھیں کہ وہ ایک ایسا خبیث ہے کہ جس نے ان کے عزیزوں اور قرابت داروں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں، اس لئے اورنگ زیب بھی دربار میں اس کی موجودگی سے دق ہو گیا ہو گا۔

ملک دکن میں سلطنت گولکنڈا اور بیجاپور کی اصل و بناء اور شاہانِ مغلیہ کے ساتھ ان کے تعلقات اور لڑائی جھگڑوں وغیرہ کا ذِکر

اب میں دکن کے واقعات پر ایک مجمل نظر ڈالنا چاہتا ہوں جو ایک ایسا ملک ہے کہ چالیس برس سے زیادہ عرصہ سے برابر لڑائیوں بھڑائیوں کا گھر رہا ہے اور جس کے واسطے سلاطینِ مغلیہ شاہان گولکنڈا اور بیجاپور اور ان سے کم درجہ کے رئیسوں کے ساتھ اکثر الجھے ہی رہتے ہیں تاوقتیکہ اس کے فرمانرواؤں کی حالت اور ان بڑے بڑے واقعات سے جو اس ملک میں ہوتے رہتے ہیں، بخوبی واقفیت نہ ہو، ان لڑائی جھگڑوں کی حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آنی ناممکن ہے۔

ملک دکن کی وسعت

واضح ہو کہ قریب دو سو برس سے ملک ہند کے اس قطعہ کی جو مغرب کی طرف خلیج کھمبایت سے شروع ہو کر مشرق کی جانب جگن ناتھ کے قریب خلیج بنگالہ تک اور جنوب میں راس کماری تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جو اہلِ یورپ کے جغرافیہ کی اصطلاح میں گریٹ انڈین پینن سلا کے نام سے معروف ہے یہ حالت تھی کہ شاید بہ استثنا چند

پہاڑی ضلعوں کے یہ تمام ملک ایک خود مختار خاندان کے زیر فرمان چلا آتا تھا۔ مگر راجہ رام راج کی نالیاقتی سے جو اسی خاندان میں سب سے اخیر راجہ تھا یہ بڑی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور یہی وجہ ہے کہ اب یہ ملک مختلف مذہب کے کئی فرمانرواؤں کے زیر حکومت نظر آتا ہے۔

گولکنڈا اور بیجا پور کے بادشاہوں کا راجہ رام راج کی غلامی سے بادشاہ بننا

بات یہ ہے کہ رام راج (۱۵۹) کے پاس گرجستان کے رہنے والے تین غلام تھے۔ جن کو اس نے ہر قسم کی عنایت سے ممتاز کر رکھا تھا یہاں تک کہ آخر کار ان کو تین بڑے بڑے صوبوں کا حاکم بنایا۔ چنانچہ ایک تو تقریبا ان تمام اضلاع کا جو بالفعل سلطنت مغلیہ کے قبضہ میں ہیں حاکم مقرر ہوا۔ اور یہ صوبہ شہر بیدر اور پریندا اور سورت سے لے کر دریائے نربدا تک پھیلتا تھا اور دولت آباد اس کا دارالحکومت تھا۔ دوسرا اس ملک کا حاکم بنایا گیا جو بالفعل سلطنت بیجا پور کے نام سے مشہور ہے۔ اور تیسرے کو وہ ملک سپرد ہوا جس کو گولکنڈا کی سلطنت کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ تینوں غلام نہایت ہی دولتمند اور طاقتور ہو گئے اور چونکہ ان تینوں نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا جو اہل ایران کا عام مذہب ہے اس لئے رام راج کے دربار کے ایرانی امراء سے ان کو بہت مدد ملتی تھی۔ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ ہندو کیوں نہ بن گئے اس لئے کہ ہندو نہیں چاہتے کہ کوئی غیر شخص ان کے مذہبی اسرار سے مستفید ہو۔ پس اگر وہ چاہتے تب بھی ہندو نہیں بن سکتے تھے۔ القصہ ان تینوں نے متفق ہو کر بغاوت کی جس کا انجام یہ ہوا کہ رام راج مارا گیا اور یہ اپنے اپنے صوبوں میں واپس آکر بادشاہ بن بیٹھے اور چونکہ رام راج کی اولاد میں کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جو ان کا مقابلہ کر سکتا اس لئے وہ صرف اس ملک میں چپ چاپ بیٹھے رہے جو کرناٹک کے نام سے مشہور ہے اور جس کو ہمارے جہازرانی کے مختصر نقشوں میں (جن کو چارٹ کہتے ہیں) "بس نگر" (۱۶۰) لکھا ہے اور جہاں اس کی اولاد اب تک راج کرتی ہے اور اس جزیرہ نما کے باقی قطعات اسی وقت سے ان تمام چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئے جو اب تک قائم ہیں اور جن کے رئیس راجہ یا نائیک کہلاتے ہیں۔ ان تینوں غاصبوں کی اولاد میں جب تک اتفاق رہا ان پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکا اور سلاطین مغلیہ کا خوب مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن جب سے باہمی رشک و حسد نے جگہ پائی اور انہوں نے یہ چاہا کہ ایک دوسرے کی مدد کے بغیر خود سر ہو کر

رہیں تب سے وہ نااتفاقی کے خوفناک خمیازے اٹھا رہے ہیں اور پینتیس یا چالیس برس ہوئے کہ شہنشاہ مغل نے یہ دیکھ کر کہ ان کے باہم اتفاق نہیں ہے نظام شاہ کی سلطنت پر جو بانی ریاست سے پانچویں یا چھٹی پشت میں تھا چڑھائی کر کے اس کو فتح کر لیا ہے اور دیر ہوئی کہ نظام شاہ اپنے سابقہ دارالحکومت دولت آباد ہی میں قید رہ کر قیدِ زندگی سے بھی چھوٹ چکا ہے۔

گولکنڈا کی ضعیف حالت اور سلطنتِ مغلیہ سے اس کے تعلقات کا ذِکر

البتہ شاہانِ گولکنڈا اب تک حملہ سے محفوظ رہے ہیں۔ لیکن ان کا یہ بچا رہنا ان کی زور و قوت کے سبب سے نہیں ہے بلکہ صرف اس وجہ سے ہے کہ شہنشاہ مغل کو اوّل اس کی دونوں ہم جنس اور ہمسایہ ریاستوں پر مہم کرنے اور ان کے مستحکم مقامات امبر پرینڈا اور بیدر کے لے لینے کی زیادہ ضرورت تھی تاکہ اس کے بعد گولکنڈا پر حملہ کرنا اور بھی آسان ہو جائے اور ان کی یہ دانائی اور حسنِ تدبیر بھی کچھ ان کے بچاؤ کا باعث تھی کہ اپنی بے شمار دولت میں سے مخفی طور پر شاہِ بیجاپور کو ہمیشہ مدد بھیجتے رہتے تھے۔ اور جب کبھی بیجا پور پر حملہ کا اندیشہ ہوتا تھا تو یہ اپنی فوج بھی سرحد پر بھیج دیا کرتے تھے تاکہ شہنشاہ مغل کو یہ بات جتلائی جائے کہ گولکنڈا نہ صرف اپنے بچاؤ کے لئے مستعد ہے بلکہ اگر بیجاپور پر سخت وقت آن پڑے گا تو ہم اس کے بھی آڑے آنے کو تیار ہیں۔ علاوہ بریں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مغل سپہ سالاروں کو بہت کچھ رشوتیں بھی دی جایا کرتی ہیں اور وہ اس وجہ سے گولکنڈا کے عوض بیجاپور پر مہم کرنے کی رائے کو ہمیشہ اس دلیل سے ترجیح دیتے رہتے ہیں کہ وہ دولت آباد سے زیادہ قریب ہے اور جب سے اورنگ زیب اور گولکنڈا کے بادشاہ حال کے باہم ایک عہدنامہ ہو چکا ہے تب سے تو اصل میں بھی اورنگ زیب کا چنداں میلانِ خاطر اس پر چڑھائی کرنے کی طرف معلوم نہیں ہوتا اور اس روز سے غالباً وہ اسے اپنا ہی سمجھتا ہے اور چونکہ وہ مدت سے باج گزار ہے اور بہت سا روپیہ اور وہاں کی بنی ہوئی نہایت عمدہ عمدہ چیزیں اور پیگو اور سراندیپ اور سیام کے ہاتھی سال بہ سال خراج کے طور پر بھیجتا رہتا ہے اور اب گول کنڈا اور دولت آباد کے مابین کوئی ایسا قلعہ بھی باقی نہیں رہا جو کسی مخالف کے قبضہ میں ہو اس لئے اورنگزیب کو یقین ہے کہ ایک ہی دفعہ کی چڑھائی اس ملک کی فتح کے لئے کافی ہو گی۔ لیکن میری رائے میں اورنگ زیب کو گول کنڈا کی فتح سے بجز

اس کے اور کسی بات نے نہیں روکا کہ مبادا شاہِ بیجاپور اپنے اس اندیشہ سے کہ کل کو یہی دن اس کے لئے بھی پیش آنے والا ہے کہیں خود صوبہ دکن ہی کی تاخت و تاراج شروع نہ کردے۔ بیان بالا سے امید ہے کہ ناظرین تصور کر سکیں گے کہ سلطنتِ مغلیہ اور گولکنڈا کے باہم کس قسم کے تعلقات ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ گولکنڈا کے قیام و بقا کی حالت بالکل غیر یقین ہے۔

اور جب سے کہ وہ مکروہ معاملہ پیش آچکا ہے جو میر جملہ کی تجویز کے موافق اورنگ زیب نے اس سے برتا تھا شاہ گول کنڈا کے قوائے دماغی میں بھی بالکل فتور آگیا ہے اور سلطنت کی باگ اس نے نہایت ڈھیلی چھوڑ دی ہے اور رسم ملک کے موافق نہ کبھی دربار میں آکر بیٹھتا ہے اور نہ انصاف وعدالت کرتا ہے بلکہ اتنی ہمت بھی نہیں رہی کہ کبھی قلعہ کی دیوار سے باہر نکلے۔ جس کا طبعی اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں ابتری اور بے انتظامی پھیل رہی ہے اور امرا و حکام جو نہ اب بادشاہ کا کچھ حکم ہی مانتے ہیں اور نہ اس سے کچھ محبت ہی رکھتے ہیں بے حد ظلم کرتے ہیں اور امید ہے کہ اگر کبھی موقع ہوا تو رعایا جو اس ظلم و بدعت سے تنگ آ رہی ہے بہت جلد اورنگ زیب کی اطاعت قبول کرلے گی جس کی حکومت گولکنڈا کی بہ نسبت بہتر اور منصفانہ ہے۔

اب میں چند باتیں وہ بیان کرتا ہوں کہ جن سے اس مبتذل حالت کا ثبوت ہوتا ہے جس کو یہ بدبخت بادشاہ پہنچ گیا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ۱۶۶۷ء میں جبکہ میں گول کنڈا میں تھا اورنگ زیب کی طرف سے ایک سفیر خاص یہ پیغام لے کر آیا کہ یا تو دس ہزار سوار بیجاپور کی مہم کے لئے حاضر کرو یا تم بھی مقابلہ کے لئے تیار رہو۔ پس اگرچہ اس نے فوج کا بھیجنا تو قبول نہ کیا لیکن اس قدر روپیہ جو دس ہزار سواروں کی تنخواہ کے لئے مکتفی ہو سکتا ہے اور جس سے اورنگ زیب اور بھی زیادہ خوش ہوا دے دیا اور سفیر کی بہت ہی آؤبھگت کی اور بہت سے گراں بہا تحائف خود اس کو دیئے اور ایک بڑا بھاری پیشکش اورنگ زیب کے لئے روانہ کیا۔

دوسری یہ کہ اورنگ زیب کا معمولی سفیر جو گول کنڈا میں متعین رہتا ہے احکام جاری کرتا ہے' راہداری کے پروانے دیتا ہے' اور لوگوں کو دھمکاتا اور بدسلوکی کرتا ہے! غرض کہ اس کی گفتار و رفتار ایسے مطلق العنان طور کی ہے کہ گویا بجائے خود ایک بادشاہ ہے۔

تیسری یہ کہ میر جملہ کا بیٹا محمد امین خاں جو زاید بریں نیست کہ اورنگ زیب کے دربار کا صرف ایک امیر ہے گول کنڈا میں اس کا اس قدر ادب کیا جاتا ہے کہ اس کا "تاپٹا" یعنی دلال یا گماشتہ جو مچھلی پٹن میں رہتا ہے بندرگاہ کے حاکم کا اختیار رکھتا ہے۔ تمام تجارتی جنسیں خرید تا ہے بیچتا ہے جہازوں پر مال چڑھاتا ہے اتارتا ہے، مگر محصول کی ایک کوڑی تک نہیں دیتا اور نہ اس کے کام میں کوئی دخل دے سکتا ہے۔ عجب بات ہے! کہ میر جملہ کا رُعب و ادب اس ملک میں اس درجہ تک تھا کہ اس کے مرنے کے بعد گویا وہ بھی وراثت میں محمد امین خاں کو مل گیا ہے۔

چوتھی یہ کہ کبھی کبھی ڈچ لوگ گول کنڈا کے سوداگروں کے تمام جہازوں کو مچھلی پٹن کی بندرگاہ میں روکے رکھتے ہیں اور جب تک یہ بادشاہ ان کی بات نہیں مان لیتا ان کو باہر نہیں جانے دیتے اور خود میں نے اس بادشاہ پر ان کو یہ بے ہودہ اعتراض کرتے دیکھا ہے کہ "مچھلی پٹن کے حاکم نے ہم کو انگریزوں کے ایک جہاز پر جبراً قبضہ کر لینے سے کیوں روکا! اور لوگوں کو ہمارے مقابلہ کے لئے ہتھیار دے کر ہمارے اس ارادہ میں کیوں مزاحم ہوا اور ہم کو یہ دھمکی کیوں دی کہ تمہاری کوٹھی کو جلا دوں گا اور تم پردیسی بدمعاشوں کو قتل کر ڈالوں گا"۔

پانچویں علامت اس سلطنت کے زوال کی یہ ہے کہ یہاں کا چلنی سکہ نہایت مبتذل حالت میں ہے اور اس لئے اس ملک کی تجارت کے حق میں نہایت مضر ہے۔

چھٹی یہ کہ یہاں تک تو نوبت پہنچی ہوئی ہے کہ پُرتگیز بھی باوجود اپنی شکستہ حالی اور افلاس اور حقیر حالت کے اس کو لڑائی کی دھمکی دینے میں تذبذب نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اگر مقام سینٹ طامس (جو چند سال ہوئے انہوں نے خود ہی شاہ گول کنڈا کو اس خیال سے دے دیا تھا کہ ڈچ جو اُن سے طاقت میں زیادہ ہیں ان کو اس کے حوالہ کر دینے کی ذلت اٹھانی نہ پڑے) ہم کو نہ دے دو گے تو ہم مچھلی پٹن اور دیگر مقامات پر قبضہ کر لیں گے اور لوٹ لیں گے مگر باوجود ان سب باتوں کے گول کنڈا ہی میں چند ذی فہم لوگ مجھ سے یوں بھی کہتے تھے کہ بادشاہ کی فہم و فراست میں کچھ بھی فرق نہیں اور اس نے ضعیف العقلی اور ناقائم مزاجی اور سلطنت کے معاملات سے بے پروائی کی یہ حالت صرف اپنے دشمنوں کے دھوکہ دینے کو بنا رکھی ہے اور اس کے ایک ایسا جری بیٹا بھی ہے جو نہایت تیز مزاج بلند خیال، گویا ایک پرکالۂ آتش شہزادہ ہے۔ جس کو مصلحتاً عوام کی نظروں سے چھپا

رکھا ہے اور کبھی موقع پا کر اس کو تخت پر بٹھلا دے گا اور جو عہد و پیمان اورنگ زیب سے کر رکھا ہے اس کو بالائے طاق رکھ دے گا۔

بیجاپور کی کیفیت

اب میں ان رایوں کی غلطی اور صحت کے فیصلہ کو آئندہ زمانہ پر چھوڑ کر چند الفاظ بیجاپور کی بابت کہنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ شہنشاہ مغل کی طرف سے اس سلطنت کے ساتھ اکثر لڑائی بھڑائی رہتی ہے مگر اب تک یہ خود سر اور آزاد کہلاتی ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جو سپہ سالار بیجاپور کی مہم پر مامور ہوتے ہیں ان سرداروں کی طرح جو ایسی ہی اور مہموں پر بھیجے جاتے ہیں سپہ سالار بنے رہنے کے شوق میں اس امر کو غنیمت جانتے ہیں کہ دربار سے دور رہ کر فوج پر شاہانہ طور سے حکومت کرتے رہیں اور اس لئے اپنے کام میں دیر و درنگ کرتے اور طرح طرح کے حیلوں اور بہانوں سے لڑائی کو جو ان کے اعزاز و اکرام کے علاوہ ان کی آمدنی کا بھی ذریعہ ہے خواہ مخواہ طول دیتے رہتے ہیں اور اس وجہ سے یہ بات ہندوستان میں ایک ضرب المثل ہو گئی ہے کہ ملک دکن تو ہندوستانی سپاہی کی روٹی اور گزارہ ہے۔

علاوہ بریں سلطنتِ بیجاپور میں پہاڑیوں کے اندر دشوار گزار مقاموں میں اس قدر قلعے اور گڑھیاں ہیں کہ جن کا فتح کرنا بہت ہی مشکل ہے اور جو ملک سلطنتِ مغلیہ سے ملتا ہوا ہے وہ خصوصیت کے ساتھ چارے اور پانی کے موجود نہ ہونے کے باعث دشوار گزار ہے۔ خصوصاً شہر پایۂ تخت ایک نہایت بے آب و علف زمین پر واقع ہونے کی وجہ سے نہایت ہی مستحکم مقام ہے۔ یہاں تک کہ پینے کے قابل پانی صرف شہر ہی کے اندر ملتا ہے۔ مگر بایں ہمہ اس سلطنت کو بھی چراغ سحری ہی سمجھنا چاہئے کیونکہ شہنشاہ مغل نے قلعہ پرینڈا پر جو اس ملک کا دروازہ سمجھنا چاہئے اور بیدر پر جو ایک مستحکم اور خوبصورت شہر ہے اور اور بڑے بڑے مقامات پر دخل کر لیا ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ امر ہے کہ بادشاہ لاولد مر گیا ہے اور اس کی بیگم نے جو شاہ گول کنڈا کی بہن ہے ایک لڑکے کو جو اپنا متبنیٰ بنا کر پرورش کیا تھا اس نے اس کا یہ اجر دیا ہے کہ ابھی چند روز ہوئے جو یہ شہزادی حج کر کے واپس آئی تو اس سے سرد مہری اور حقارت کے ساتھ پیش آیا اور یہ بہانہ بنایا کہ ڈچوں کے جہاز میں (جس پر وہ سوار ہو کر مخا کو گئی تھی) اس کا رویہ اس کے رتبہ اور

مستورات کی حالت کے مناسب نہ تھا۔ بلکہ یہاں تک کہا کہ دو تین جہازیوں سے (جو اپنے جہاز سے علیحدہ ہو کر مکہ تک اس کے ساتھ گئے تھے) ناجائز تعلق رکھتی تھی (۱۶۱)

سیوا جی کی خودسری اور اُس کی روزافزوں طاقت کا ایک مکرر ذِکر

سیواجی جس کا ذِکر پہلے کیا جاچکا ہے اس سلطنت کی یہ حالت دیکھ کر بہت سے قلعوں پر جو اکثر پہاڑوں کے اندر میں قابض ہو گیا ہے اور خود سر بادشاہ کی طرح جو چاہتا ہے سو کرتا ہے اور شہنشاہ مغل اور شاہِ بیجاپور جو کبھی اس کو دھمکاتے ہیں تو ان کی باتوں پر ہنس دیتا اور سورت سے لے کر گوا کے دروازے تک ملک کو تاخت و تاراج کرتا رہتا ہے اور اگرچہ وقتاً فوقتاً بیجاپور کی ریاستوں کو سیواجی بڑے بڑے صدمے پہنچاتا رہتا ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہ جری شخص عین وقت پر اس کے کام بھی آجاتا ہے کیونکہ اورنگ زیب کو ہمیشہ اسی کی تاخت و تاراج کا فکر رہتا ہے اور اس کی فوجیں ہمیشہ اس کے پیچھے لگی رہتی ہیں اور اس طرح پر بیجاپور کا پیچھا چھوٹا رہتا ہے اور سب سے مقدم کام یہی سمجھا جاتا ہے کہ سیواجی کی جڑ کس طرح اکھاڑی جائے۔ سیواجی کو سورت میں جو کامیابی ہوئی ناظرین اس کو پڑھ چکے ہیں۔ اس کے بعد اس نے جزیرہ بارڈیز پر جو گوا کے نزدیک پُرتگیزوں کی ایک بستی ہے، قبضہ کرلیا ہے (۱۶۲)۔

شاہ جہاں کی وفات کا ذِکر

میں ابھی گولکنڈا ہی میں تھا کہ شاہ جہاں کے انتقال کی خبر سنی گئی اور یہ بھی سننے میں آیا کہ اورنگ زیب نے باپ کے مرنے کا بڑا غم کیا اور سوگ کی وہ تمام علامتیں ظاہر کیں جو بیٹے کو باپ کے ماتم میں کرنی چاہئیں اور فوراً آگرہ کو کوچ کردیا اور وہاں پہنچنے پر بیگم صاحب نے بڑی دھوم سے اس کا استقبال کیا اور کم خواب کے تھان لٹکا کر بادشاہی مسجد سجائی گئی اور اسی طرح وہ مکان بھی سجایا گیا جہاں قلعہ میں داخل ہونے سے پہلے ٹھہرنے کا ارادہ تھا اور جب محل میں پہنچا تو شہزادی نے ایک بڑا سا سونے کا تھال جواہرات سے بھرا ہوا نذر کیا جن میں سے کچھ تو شاہ جہاں کے متروکہ تھے اور کچھ اس نے اپنے پاس سے پیش کش کیے تھے۔ بہن کی طرف سے یہ گرم جوشی اور محبت کا برتاؤ دیکھ کر اورنگ زیب کا بھی دل پسیج گیا اور اس نے اس کی گزشتہ باتوں سے درگزر کی اور اس وقت سے اس کے ساتھ مہربانی اور فیاضی سے پیش آتا ہے۔ (۱۶۳)

خاتمہ اور اورنگزیب کی نسبت مصنف کی رائے

اب میں اپنی تاریخ کو ختم کرتا ہوں۔ جن جن ذریعوں سے اورنگ زیب نے یہ عروج اور اقتدار حاصل کیا یقیناً ناظرین ان کو بہت ناپسند کریں گے کیونکہ وہ حقیقتاً بے رحمانہ اور نامنصفانہ تھے لیکن شاید یہ ناانصافی ہوگی کہ ہم ان کو اسی سخت نظر سے جانچیں جن سے اپنے ملک یورپ کے شہزادوں کے افعال کو جانچتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے ملک میں جانشینی کے لئے معقول قواعد مقرر ہیں اور بڑے بیٹے کے سوا کوئی جانشین نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہندوستان میں باپ کے بعد شہزادوں میں سلطنت کے لئے ہمیشہ جھگڑا ہوتا ہے اور ان دو بے رحمانہ باتوں میں سے ایک بات اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یا سلطنت کی خاطر خود قربان ہو جائیں یا بھائیوں کو قربانی بنائیں۔ تاہم ان لوگوں کو بھی جو ملک کے دستور اور رسم خاندان اور تعلیم و تربیت کے اثر کے عذر کو قبول نہیں کرتے یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ اورنگ زیب کو خدا نے مستثنیٰ طور کی عقل و فکر اور انتقالِ ذہن عطا کیا ہے اور یہ کہ وہ بڑا ہی مدبر اور عالی شان بادشاہ ہے۔ فقط

میر جُملہ کی فوج کشی کوچ بہار اور آسام کے راجاؤں پر

ان راجاؤں کی پیش قدمی مہم کا باعث ہوئی

یہ مہم (جیسا کہ ڈاکٹر برنیئر نے لکھا ہے) صرف آسام ہی پر نہیں ہوئی تھی بلکہ کوچ بہار اور آسام دونوں پر ایک ہی وقت میں فوج کشی کی گئی تھی اور اصلی سبب اس کا یہ ہوا تھا کہ ۱۰۶۷ھ کے اخیر میں جب شاہ جہاں کی بیماری نے طول پکڑا اور طرح طرح کی افواہیں اڑ کر حدودِ سلطنت میں فتور پیدا ہوئے اور چاروں شہزادوں نے اُدھم مچایا اور شجاع نے بنگالہ سے پٹنہ کو کوچ کر دیا تو کوچ بہار کے باج گذار راجہ (۱۶۴) پیم ناراین نے بھی یہ ہلچل دیکھ کر بادشاہی علاقہ یعنی گھوڑا گھاٹ کو آ لوٹا اور وہاں کی رعایا میں سے ایک جماعتِ کثیر کو جس میں اکثر مسلمان تھے، قید کر کے اپنے ملک کو لے گیا اور اس پر بھی بس نہ کر کے بھولا ناتھ اپنے وزیر کو ایک انبوہِ عظیم کے ساتھ کام روپ کے علاقہ پر تسلط کر لینے کے واسطے مامور کیا۔

آسام کے راجہ جے دھج سنگھ نے جو اس سے بدرجہا زبردست تھا، جب یہ طور دیکھا تو اس نے بھی ایک لشکر عظیم خشکی اور تری کی راہ سے علاقہ کام روپ پر روانہ کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کام روپ کا بادشاہی فوجدار اپنے میں کوچ بہار اور آسام کے لشکروں سے مقابلہ کی طاقت نہ دیکھ کر اور بنگالہ کے صوبہ دار (سلطان شجاع) سے کمک پہنچنے کی امید

منقطع سمجھ کر جہانگیر نگر (راج محل) کو بھاگ آیا اور چونکہ بھولا ناتھ بھی اپنے کو آسامیوں سے کمزور سمجھ کر پیچھے کو ہٹ گیا اس وجہ سے انہوں نے بے مقابلہ و مزاحمت بادشاہی ملک پر متسلط ہو کر خوب لوٹا اور اپنے دستور کے موافق بہت سی رعیت کو پکڑ کر قیدی بنالیا اور یہاں تک بڑھے کہ بے روک ٹوک جہانگیر نگر سے تقریباً پانچ منزل کے فاصلہ پر موضع مست سلا پرگنہ کری باڑی میں اپنا تھانہ بٹھا دیا۔

آسامیوں کے مغرور اور زبردست ہونے کی وجہ

یہ آسامی ایسے زبردست اور مغرور تھے کہ پہلے بھی کئی بار ایسی حرکتیں جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں کر چکے تھے۔ چنانچہ ایک بار سید ابو بکر کو جو جہانگیر کا ایک امیر تھا مع اس کی فوج کے جمدھرہ کے پاس سے اور دوسری دفعہ شیخ عبد السلام حاجو کے فوجدار کو شاہ جہاں کے زمانہ میں گوہاٹی سے پکڑ کر لے گئے تھے اور کبھی بھی کسی مسلمان بادشاہ سے مغلوب نہ ہوئے تھے کیونکہ ایک تو یہ لوگ وحشی خصال اور جنگجو تھے، علاوہ بریں ان کا ملک بسبب کوہستان اور کثرت ندی نالوں اور عمیق دریاؤں اور جنگلوں اور ناقابلِ گزر ہوں وغیرہ کے قدرتی طور پر محفوظ تھا۔ شاہ جہاں کے عہد میں مذکورہ بالا واقعہ کے باعث اگرچہ میر عبد السلام مخاطب بہ اسلام خاں صوبہ دار بنگالہ نے خاص اپنے بھائی کو سپہ سالار بنا کر آسام پر فوج کشی کی تھی مگر یہ حملہ آور سردار صوبہ بنگالہ اور آسام کی سرحد موضع کجلی سے ہنوز آگے نہیں بڑھا تھا کہ اتنے میں شاہ جہاں نے میر عبد السلام کو اپنا وزیر مقرر کر کے شجاع کو بنگالہ کی صوبہ داری پر مامور کر دیا اور جیسا کہ شخصی ارادے اکثر ادھورے رہ جایا کرتے ہیں، اس تغیر و تبدل میں یہ مہم ناتمام رہ گئی تھی۔

میر جُملہ کا راج محل پہنچنا، آسام سے مقدرت نامہ کا آنا اور قرار دادِ صلح

القصہ جب میر جُملہ عالمگیر کے تیسرے سالِ جلوس میں شجاع کو دباتا ہوا راج محل میں جا پہنچا تو آسام کا راجہ اس نامور مدبر کی لیاقت اور شجاعت کی شہرت سے اور یہ دیکھ کر کہ وہ شجاع کو کیسی کامیابی سے مغلوب کر چکا ہے، اپنی مذکورہ بالا پیش قدمی اور جسارت کا خیال کر کے خائف ہوا اور وکیل کے ہاتھ میر جُملہ کی خدمت میں ایک معذرت نامہ اس مضمون کا بھیجا کہ پیم نراین ہمارا دشمن ہے اور وہ چاہتا تھا کہ کام روپ کے علاقہ پر جو قدیم زمانہ میں آسام کے متعلق تھا متصرف ہو جائے۔ اس سبب سے میری فوج نے اس ملک

پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب جس کو حکم ہو سونپ دیا جائے۔

میر جُملہ نے مصلحتِ وقت سمجھ کر اس کی معذرت کو قبول کر لیا اور وکیل کو خلعت دیا اور رشید خاں کو مع اور چند سرداروں کے متعین کیا کہ آسامی جو اس قرار داد کے موافق علاقہ کام روپ کو خالی کر کے مناس ندی کے کنارہ تک ہٹ گئے تھے، جا کر قبضہ کر لیں۔

پیم نارائن کی معذرت اور اس کا قبول نہ ہونا

اگرچہ اس کے بعد پیم نارائن نے بھی وکیل بھیج کر معذرت کی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اس راجہ نے باوجود بادشاہی باج گذار ہونے کے، خلافِ طریقہ اطاعت یہ گستاخی کی تھی، اس لئے میر جُملہ نے عذر قبول نہ کر کے وکیل کو قید کر دیا اور راجہ سوجان سنگھ بندیلہ اور مرزا بیگ، اپنے ایک ذاتی ملازم، کو کچھ اپنی اور کچھ بادشاہی فوج دے کر واسطے پاداش اس کی گستاخی کے کوچ بہار کو روانہ کر دیا۔

چونکہ راجہ سجان سنگھ نے شہر کوچ بہار کے قریب پہنچ کر یہ اندازہ کیا کہ اپنی موجودہ جمعیت سے وہ اس کو فتح نہیں کر سکتا اس لئے ناچار مکھ دوار کے سامنے جو کوچ بہار میں داخل ہونے کے لئے صدر دروازہ تھا اور جس کا ذکر بہ تفصیل آگے آئے گا متوقف ہو گیا۔

آسامیوں کا انحراف قرار دادِ صلح سے

اور ادھر سرحد آسام پر یہ معاملہ پیش آیا کہ رشید خاں جو بلحاظِ قلتِ فوج ازراہ احتیاط کسی قدر جھجک جھجک کر آگے بڑھتا تھا اس باعث سے آسامیوں نے ان کو ضعیف سمجھ کر ایفا وعدہ کا خیال چھوڑ دیا اور لڑنے کو مستعد ہو گئے۔

کوچ بہار اور آسام پر میر جُملہ کا بذاتِ خود کوچ کرنا

آخر کار جب شجاع تباہ و برباد ہو کر بنگالہ سے اراکان کو چلا گیا اور میر جُملہ نے اس کے تعاقب سے فراغت پائی تو کوچ بہار اور آسام کے معاملات پر متوجہ ہوا اور ان دونوں پر بذاتِ خود فوج کشی کرنا مناسب سمجھ کر بادشاہ سے اجازت منگائی اور ان تمام سرداروں اور امیروں سمیت جو شجاع کی مہم میں اس کے ساتھ مامور تھے، خضر پور سے (جس کا نشان بنگالہ

کے نقشہ پر نہیں ملا) اٹھارہویں ربیع الاول ۱۰۷۲ھ (ایک ہزار بہتر ہجری) کو (مطابق سال چہارم جلوس عالمگیری) برسات کے بعد کشتیوں میں روانہ ہوا اور بمقام بری تلا جو بادشاہی ملک میں کوچ بہار کی سرحد پر تھا جا ٹھہرا۔

کوچ بہار کے راستوں کی ناواقفیت اور تلاش کے بعد آخر کس راستہ سے داخل ہوا

اس سرحدی ریاست کے راستوں وغیرہ کے حالات سے واقفیت نہ ہونے کی بنا پر ناچار متوقف ہو کر اس ملک میں داخل ہونے کے لئے راستہ تلاش کرنے لگا اور بعد تحقیقات یہ تین راستے دریافت ہوئے۔

ایک ولایت (۱۶۵) مورنگ کی طرف سے، دوسرا بادشاہی ملک کی سمت سے، جو لکھ دوار ہو کر جاتا تھا اور جدھر سے راجہ سجان سنگھ اور مرزا بیگ نے داخل ہونے کا قصد کیا تھا، تیسرا راستہ گھوڑا گھاٹ اور لنگا ماٹی کی جانب سے۔ سوائے ان تین مشہور راستوں کے بادشاہی ملک کی طرف سے ایک اور بھی غیر متعارف راستہ تھا۔ چنانچہ میر جملہ نے بوجہ خاص اسی کو اختیار کیا۔

شہر کوچ بہار کس محفوظ حالت میں واقع تھا

شہر کوچ بہار اس وقت اس طرح پر واقع تھا کہ اس کے گرداگرد مدتہائے دراز سے ایک نہایت عریض اور مرتفع بند جس کو اس ملک کی اصطلاح میں آل کہتے تھے چوبیس کوس کے دَور میں بطور حصار کے بنا ہوا تھا۔ جس کے اندر نہ صرف یہ شہر بلکہ کئی پرگنے بھی تھے اور اس بند کے گرداگرد ایک عمیق خندق کے علاوہ بانس اور بید اور اور درختوں کا ایسا گھنا جنگل تھا کہ جس میں سے جانور بھی بمشکل گزر سکے اور اس بند میں چند مستحکم دروازے تھے، جن پر بڑی بڑی توپوں اور لمبی لمبی بندوقوں اور زنبورک وغیرہ سامانِ جنگ کے ساتھ نگہبانی کے لئے راجہ کی فوج ہر وقت تعینات رہتی تھی اور ان سب میں سے بڑا دروازہ جو شہر کے محاذی واقع تھا، اس کو لکھ دوار کہتے تھے۔

میر جملہ نے جو راستہ اختیار کیا تھا اگرچہ اس طرف آل کا عرض اور ارتفاع کمتر تھا لیکن ندیاں نالے اور بانس کا گھنا جنگل اس شدت سے تھا کہ بیم نارائن کو اس طرف سے حملہ

ہونے کا ذرا بھی دغدغہ نہ تھا۔

میر جُملہ کی فتح یابی اور راجہ کا بھوٹنٹ کو بھاگنا

مگر میر جُملہ نہایت محنت کے ساتھ کوچ بکوچ ندی نالوں کو عبور کرتا اور جنگل کٹواتا ہوا غرہ جمادی الاول سنہ مذکور کو آل تک جا ہی پہنچا اور خفیف سے مقابلہ کے بعد اس سے پار ہو گیا۔

پیم نارائن جو اسی جنگل اور آل کے بھروسہ پر ساری شوخیاں اور سرکشیاں کرتا تھا شہر کو خالی چھوڑ کر اور اہل و عیال کو ساتھ لے کر بھوٹنٹ کے کوہستانِ بلند اور برفانی کے راجہ دھرم راج (۱۶۶) کے پاس جو ایک سو بیس برس کی عمر میں مردِ مرتاض 'تارکِ لذات اور صرف کیلا اور دودھ کی غذا پر جینے والا اور باوجود کبر سن کے تندرست اور صحیح القویٰ اور نہایت منصف اور رعیت پرور بدھ مت کا راجہ تھا، چلا گیا اور میر جُملہ ششم جمادی الاوّل ۱۰۷۲ھ (ایک ہزار بہتر ہجری) کو (شروع کوچ سے تخمیناً ڈیڑھ مہینے کے بعد) شہر کوچ بہار پر قابض ہو گیا۔

ملک کی قدرتی سرسبزی اور خوبی

عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ فتح مندوں نے اس ملک کو طرح طرح کے پھولوں اور میووں اور سیاہ مرچ اور اَور انواع و اقسام کے خوبصورت درختوں سے اگرچہ مثل ایک قدرتی باغ کے پایا اور نہایت ہی سرسبز و شاداب دیکھا۔

باشندے جنگلی اور بدصورت اور ان کے ہتھیار

مگر وہاں کے سیاہ فام اور قلماق صورت (یعنی گورکھہ نما) زن و مرد حسن و جمال اور صباحت و ملاحت کے پیرایہ سے عموماً معرا اور وحشی اور جنگلی خصلت تھے جن کا حربہ تلوار و بندوق کے علاوہ زیادہ تر زہر کے بجھے ہوئے تیر تھے۔

شہر کی آبادی، راجہ کی نفیس مزاجی اور اس کے مکانات کی عمدگی

لیکن راجہ کی نسبت لکھا ہے کہ اس کی طبیعت زینت و نفاست، عیش و عشرت اور صفائی و لطافت کی جانب نہایت مائل تھی اور اس کے مکانات "خلوت خانہ 'دیوانخانہ 'حرم سرا 'خواص پورہ 'حمام 'باغیچہ 'نہر 'فوارہ 'آبشار 'وغیرہ" بہت باقرینہ اور طرحدار زینت و تکلف

کے ساتھ بنے ہوئے تھے اور شہر بھی بہت اچھے قرینہ سے بسا ہوا تھا اور اکثر کوچوں اور بازاروں میں خیابان اور پھولوں کی کیاریاں تھیں اور ناگ کیسر اور کچنار کے خوبصورت درخت لگے ہوئے تھے اور یہ صفائی اور نفاست کی باتیں جو انہوں نے وہاں جا کر دیکھیں ایسے جنگلی لوگوں کے ملک میں ان کی توقع کے نہایت ہی خلاف تھیں۔

میر جُملہ نے کوچ بہار میں کیا کیا، کیا

القصہ جب سب طرح عمل و دخل ہو چکا تو دوسرے دن سید صادق صوبہ بنگالہ کے صدر (متولی اوقاف) نے میر جُملہ کے حکم سے بیم نارائن کے سب سے اونچے محل کی چھت پر چڑھ کر (گویا بطورِ علامت اہلِ اسلام کی فتح کے) اذان دی جو بقول صاحبِ عالمگیر نامہ اس ملک میں تحلیل و تکبیر کی یہ پہلی ہی صدا تھی اور بادشاہ کے نام کا سکہ و خطبہ جاری کیا اور کلھ دوار کے استحکام اور عمارت کو مسمار کرا دیا اور اس کے گردا گرد سو سو گز تک جنگل بھی کٹوا ڈالا۔ ایک سو چھ توپیں اور ڈیڑھ سو سے زیادہ زنبورک اور رام جنگی (جو اس زمانہ میں ایک قسم کی لمبی بندوق کو کہتے تھے) اور بہت سی معمولی بندوقیں اور سامانِ جنگ ضبط کر لیا گیا اور بھولا ناتھ وزیر جو کوچ بہار کے مغرب کی طرف بھاگ کر مورنگ کے دشوار گزار جنگلوں میں جا گھسا تھا، اس کو بھی بادشاہی فوج نے ڈھونڈ بھال کر جا پکڑا اور راجہ کا بڑا بیٹا بشن نارائن جس کو اس کا باپ اکثر نظر بند اور قید رکھتا تھا باپ سے جدا ہو کر میر جُملہ کے لشکر میں آ گیا اور اپنی خوشی سے مسلمان ہو گیا۔

بھوٹنٹ کے راجہ کا میر جُملہ کے پروانہ کی پروا نہ کرنا

اگرچہ کچھ سپاہ بیم نارائن کی گرفتاری کے لئے بھوٹنٹ کو بھی روانہ کی گئی تھی اور اس باب میں میر جُملہ نے ایک پروانہ بھی وہاں کے راجہ کے نام لکھا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ مغلیہ فوج جو اکثر سواروں کی ہوتی تھی اس لئے پہاڑ کے نیچے کے حصہ میں کچھ لاحاصل شور و غل مچا کر واپس چلی آئی اور اس کے پروانہ کی کسی نے پروا نہ کی۔ اور مصلحتاً یہ بھی چپ ہو رہا۔ غرض کہ میر جُملہ نے سولہ دن کوچ بہار میں ٹھہر کر نظم و نسق ملک کے لئے اپنے عہدہ دار مقرر کر دیئے اور خود تئیسویں جمادی الاوّل کو (شروع کوچ سے تقریباً دو مہینے کے بعد) گھوڑا گھاٹ کے راستہ آسام کو روانہ ہوا۔

آسام کے عام حالات عالمگیر نامہ سے

یہاں تک تو ناظرین میر جملہ کا ریاست کوچ بہار میں داخل ہونا اور عمل و دخل کے بعد بادشاہی سکہ و خطبہ وغیرہ کے جاری کر دینے کا حال معلوم کر چکے۔ مگر مہم آسام میں میر جملہ کی جنگی کارروائیاں کے لکھنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کی حدود اور حالات طبعی اور وہاں کے باشندوں کے عادات و خصائل اور رسم و رواج وغیرہ کو (جس طرح پر کہ اس وقت تھے اور جن کو صاحب عالمگیر نامہ نے اپنے طور پر بہت تفصیل سے لکھا ہے) توضیح مطلب کے لئے اول بیان کیا جائے۔ وھو ہٰذا۔

آسامیوں کا اعتقاد کہ راجہ کا مورث سوَرگ سے آیا تھا

یہاں کے لوگ اپنے راجہ کو سوَرگی راجا کہتے اور یہ عجیب اعتقاد رکھتے تھے کہ اس خاندان کے بزرگ سوَرگ کے راجہ تھے۔ ان میں سے ایک راجہ سونے کا زینہ لگا کر آسام میں اتر آیا۔ کچھ عرصہ تک رہتے رہتے یہی جگہ پسند آ گئی اور سوَرگ کو واپس نہ گیا۔

آسامی راجاؤں کا کسی بادشاہ سے مغلوب نہ ہونا

ان راجاؤں نے کبھی ہندوستان کے کسی بادشاہ کی اطاعت نہیں کی تھی اور جب کبھی فوج بھیجی گئی تو بجز ناکامی کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ اور یہ ملک جو طبعاً دشوار گزار ہے اکثر رسد کا راستہ روک کر، شب خون مار کر اور کسی ایسے ہی اور اینچ پیچ سے ہمیشہ آسامی ہی غالب آتے رہتے تھے اور اگر مقابلہ سے بھی عاجز آئے تو رعیت کو پہاڑوں میں بھگا کر اور اشیاء مایحتاج لشکر کو جلا پھونک کر ملک کو ویران اور سنسان کر ڈالتے تھے اور پھر برسات کے دنوں میں (جو وہاں بشدت ہوتی ہے) فوجِ غنیم کو دن رات کے حملوں سے تباہ و غارت کر دیتے تھے اور چونکہ اپنے ملک میں کسی باہر والے کو نہ اندر آنے دیتے اور نہ کسی کو باہر جانے دیتے تھے، اس سبب سے یہاں کے حالات غیروں سے اس قدر مخفی تھے کہ عموماً یہ مشہور تھا کہ اس ملک کے رہنے والے ساحر اور جادوگر ہیں اور جو کوئی وہاں جا پھنستا ہے، جادو کے زور سے پھر باہر نہیں آ سکتا۔

آسام کی حدود اور طول و عرض اور راجہ کا دارالحکومت کھڑ گاؤں

اس ملک کے حالاتِ طبعی کی نسبت مصنف موصوف یوں لکھتا ہے کہ ملک آسام

جو بنگالہ کے شمال و مشرق میں واقع ہے تقریباً دو سو کوس طول کا علاقہ ہے اور عرض میں جنوبی پہاڑوں سے لے کر شمالی تک تخمیناً آٹھ دن کا راستہ ہے اور دریائے برھما پتر جو ملک خطا کی طرف سے ان پہاڑوں میں سے آتا ہے جو مابین آسام اور ملک آوا کے ہیں طولاً اس ملک کے وسط میں سے گزرتا ہے۔ اس دریا کے شمالی کنارے کی طرف جو علاقے ہیں ان کو اتر کون اور جنوب کے علاقہ کو دکن کون کہتے ہیں۔ اتر کون کے علاقوں کا مبدا گوہاٹی سے ہے جو ممالک بادشاہی کی سرحد ہے اور منتہائے طول وہ پہاڑ ہیں کہ جن کے باشندوں کو مری اور مجمی (زمانہ حال میں مزے ما) کہتے ہیں اور دکن کون کے علاقے طولاً کوہستان سری نگر سے شروع ہو کر سدیا کے علاقہ پر ختم ہوتے ہیں۔

ناگ اور ڈفلے قوم کے وحشی

جنوبی طرف کے پہاڑوں سے مشہور پہاڑ نام روپ کے ہیں جو راجہ کے دارالریاست کھڑ گاؤں سے چار منزل اوپر ہیں اور ایک وہ پہاڑ بھی مشہور ہے کہ جس کے رہنے والوں کو ناگ کہتے ہیں۔ (جو بزمانہ حال میں ناگہ مشہور ہے) یہ لوگ ایسے وحشی ہیں کہ سر سے پاؤں تک ننگے رہتے اور کتا' بلی' سانپ' چوہا وغیرہ سب چٹ کر جاتے ہیں۔ اگرچہ راجہ کی تابعداری کرتے ہیں مگر مال گذاری نہیں دیتے اور وہ پہاڑی جن کو ڈفلے کہتے ہیں نام کو بھی تابعداری نہیں کرتے بلکہ اپنے پہاڑوں سے اتر کر کبھی کبھی راجہ کے ملک کو لوٹ لیتے ہیں۔

صاحب عالمگیر نامہ شہر کھڑ گاؤں کا موقع اس طرح بتلاتا ہے کہ گوہاٹی سے ستھر کوس ہے اور کھڑ گاؤں سے راجہ پیگو کا دارالحکومت شہر آوا پندرہ منزل ہے، جن میں کوہستان نام روپ سے اس طرف پانچ منزل تک تو جنگل اور دشوار گزار پہاڑ ہیں اور پھر آگے آوا تک زمین ہموار اور دشت ہے۔

دریائے دھنگ اور برہم پتر کے فیضان سے آسام کے دو قطعوں کی عجیب و غریب شادابی، پھولوں اور میووں وغیرہ کی فراوانی، بنوں، جنگلوں' اور ہاتھیوں کی کثرت

اس ملک کے مشہور تر دریا برہما پتر میں جو دریا شامل ہوتے ہیں ان سب میں بڑا

دریا دھنگ ہے جو آسام کے جنوبی پہاڑوں سے آ کر لکھو گڑھ کے مقام پر برہما پتر میں ملتا ہے اور ان دونوں دریاؤں کے درمیان پچاس کوس تک نہایت ہی آباد اور سرسبز و شاداب زمین ہے اور جس کا منتہا ایسے دشوار گزار بن پر ہوتا ہے جس میں ہاتھی بکثرت ہیں۔ آسام میں اس جنگل کے علاوہ چار پانچ بن ہاتھی پکڑنے کے اور بھی ہیں اور ان سب میں سے ہر برس پانچ سو چھ سو ہاتھی پکڑے جاتے ہیں مذکورہ بالا قطعہ کے سوا ایک اور علاقہ جو سملا گڑھ سے کھڑ گاؤں تک قریب پچاس کوس کے ہے، یہ بھی لہلہاتے کھیتوں اور سرسبز درختوں کی کثرت سے ایسا دلکش اور پربہار ہے کہ تمام سرزمین گویا ایک باغ ہے اور ان گنجان اور شاداب اور خوبصورت درختوں میں رعیت کے گھر بہت ہی خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ غرض کہ خود رَو درختوں اور باغات اور میوؤں اور پھولوں کا ان دونوں قطعوں میں کچھ شمار نہیں ہے۔

سملا گڑھ سے کھڑ گاؤں تک ایک عمدہ سڑک

اور چونکہ موسم برسات میں اکثر ان نشیب کی زمینوں پر پانی پھر جاتا ہے اس لئے سملا گڑھ سے کھڑ گاؤں تک ایک اچھی چوڑی اور اونچی آل (سڑک) بنی ہوئی تھی جس پر سایہ کے لئے موزونیت کے ساتھ بانس کے درخت لگے ہوئے تھے اور سوائے آل کے خالی اور غیر مزروع زمین نام کو بھی نہ تھی۔ میوے اور مصالحے کی اقسام سے آم' کیلا' ترنج' نارنج' لیمو' اناس' اور ک' پان' پونڈہ (سرخ و سیاہ سفید تینوں قسم کا نہایت نرم اور شیریں) اور ایک قسم کا نہایت عمدہ اور خوش ذائقہ آملہ' اور ناریل' سیاہ مرچ اور چھالیہ وغیرہ کے درخت کثرت سے تھے اور کھڑ گاؤں کے گردزرد آلو' اور خود رَو انار بھی بہت تھے اور غلات میں چاول اور ماش بکثرت' مسور کم' گیہوں بالکل نہیں۔

ابریشم

ملک میں ابریشم بھی بہت تھا جس سے مشجر اور مخمل اور اور اچھے اچھے ریشمی کپڑے بنتے تھے، مگر ملک کی اندرونی احتیاج سے زیادہ نہ بناتے تھے۔

نمک

نمک کمیاب تھا اور اس ولایت کا اصل نمک جو کیلا کے درخت سے بناتے تھے

نہایت ہی تلخ تھا۔

عود

قوم ناگ کے پہاڑوں میں عود (اگر) نہایت عمدہ اور کثرت سے تھا، جس کو وہ لوگ آسام میں لا کر نمک اور غلہ سے بدلتے تھے۔ عود' نام روپ' سدیا اور لکھو گڑھ کے پہاڑوں میں بھی تھا اور کستورے ہرن بھی۔

دکن کون سے اُتر کون کے ملک کا عمدہ اور خوش آب وہوا ہونا

صاحب عالمگیر نامہ لکھتا ہے کہ دکن کون کی طرف چونکہ بن اور اماکن دشوار گزار زیادہ ہیں اگرچہ اس لئے آسام کے راجاؤں نے پولیٹکل مصلحتوں سے اپنا دار الحکومت اسی طرف بنا رکھا ہے لیکن دریائے برہما پتر کی شمالی جانب کا ملک بلحاظ قدرتی خوبیوں اور کثرتِ آبادی کے نہایت پر رونق اور اس سے بدرجہا بہتر ہے اور اس طرف کے پہاڑ جو برہما پتر کے کنارہ سے کم از کم پندرہ کوس اور زیادہ سے زیادہ پینتالیس کوس کے فاصلہ پر ہیں سب ٹھنڈے اور برفانی ہیں۔ ان کے باشندے عموماً توانا' قوی ہیکل اور وجیہہ اور سڈول ہیں اور سرد ملکوں کے باشندوں کی طرح ان کا رنگ بھی سرخ وسفید ہے اور یہاں وہ سب میوے بھی پیدا ہوتے ہیں جو اور ٹھنڈے ملکوں میں ہوا کرتے ہیں اور اسی جانب قلعہ جمدھرہ اور گوہائی کی سمت میں جو علاقہ درانگ کا پہاڑ ہے، تمام باشندے یہاں کے عادات واطوار وگفتار میں باہم مماثلث رکھتے ہیں اور صرف اپنے پہاڑوں اور قبیلوں کے نام سے علیحدہ علیحدہ تمیز کئے جاتے ہیں۔

مشک چوریاں' گوٹ' ٹانگن اور ریگ شوئی سے سونا نکلنا

ادھر کے پہاڑوں میں مشک اور نرہ گائے کی چوریاں بھی ہوتی ہیں اور کچھ گوٹ اور ٹانگن بھی اور ریگ شوئی سے سونا بھی نکلتا ہے۔ بلکہ کل آسام کے دریاؤں کی ریگ شوئی سے سونا ملتا ہے۔ چنانچہ بارہ ہزار آدمیوں سے بیس ہزار تک یہی کام کیا کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک شخص بطور سالانہ محصول کے ایک تولہ سونا راجہ کو دیتا ہے۔

آسامیوں کی زبان، ان کا مذہب، کھانے پینے میں مطلقاً بے قیدی، گھی

کھانے سے نفرت

آسامی زبان بنگلہ سے بالکل الگ ہے اور مذہب کے باب میں بھی ان کا یہ حال ہے کہ خلاف اہلِ ہندوستان کے کھانے پینے وغیرہ کی قیود متعارفہ میں سے کسی بات کے مطلق پابند نہیں ہیں اور ہر کسی کے ہاتھ کا کھانا بے تکلف کھا لیتے ہیں اور یہاں تک بے قید ہیں کہ انسان کے گوشت کے سوائے کسی قسم کا گوشت نہیں چھوڑتے، بلکہ مردار بھی کھا لیتے ہیں۔ مگر تعجب یہ ہے کہ گھی بالکل نہیں کھاتے، اگر کسی کھانے میں اس کی بو بھی آجائے تو اس سے نفرت کرتے ہیں۔

ان کی عورتیں، ان کا تعدد و بدلنا، بیچ ڈالنا، داڑھی مونچھ کی صفائی، لباس کا جنگلی پن اور بعض بُری خصلتوں کا ذِکر

عورتوں کے پردہ کی مطلق رسم نہیں۔ حتیٰ کہ راجہ کی رانیاں بھی کھلے منہ ننگے سریوں ہی پھرا کرتی ہیں۔ آسامیوں کی اکثر چار پانچ عورتیں ہوتی ہیں، جن کو بیچ بھی ڈالتے اور بدل بھی لیتے ہیں۔ داڑھی مونچھ منڈاتے ہیں اور جو نہ منڈائے اس کو بہت برا سمجھتے ہیں پوشش جنگلیانہ ہے۔ پگڑی کی جگہ سر پر کچھ یوں ہی کپڑا سا لپیٹ لیتے ہیں۔ پاجامہ کے عوض تہبند باندھ کر اوپر سے ایک چادر اوڑھ لیتے ہیں اور جوتا بھی نہیں پہنتے۔ قوت و توانائی، جرأت و بے باکی، وحشت اور جنگلی پن ان کی صورت اور سیرت سے ظاہر ہے اور جسمانی محنت اور جفاکشی کے کاموں میں اکثر دنیا کے لوگوں سے زیادہ مضبوط ہیں اور سب کے سب سخت جان، جنگجو، کینہ خو، غدار و مکار ہیں۔ رحم و شفقت، انس والفت، سچائی، شرم و حیا اور عفت و وفا اور اہلیت و انسانیت کا ان کے وجود میں نام ہی نہیں۔

ان کے گھر اور عمارت

اینٹ پتھر کی عمارت سوائے گڑھ گاؤں کے دروازوں اور مندروں کے اور کہیں نہیں۔ امیر و غریب سب اپنے گھر لکڑی سے یا بانس اور گھاس پھونس سے بناتے ہیں۔

سنگھاسن اور ڈولے کی سواری

راجہ اور اس کے امرا سنگھاسن پر اور اور بڑے سردار اور رعیت کے دولت مند

لوگ ڈولے میں جو سنگھاسن سے چھوٹا ہوتا ہے، سوار ہوتے ہیں۔ گھوڑا' اونٹ' گدھا اس ملک میں ہوتا ہی نہیں۔

گدھے سے عجیب رغبت اور گھوڑے سے بے حد خوف

اگر کوئی شخص کسی دوسری جگہ سے کوئی گدھا لے آتا ہے تو اس کو دیکھ کر اور رکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور بڑی قیمت لگاتے ہیں اور اونٹ کو تو دیکھ کر نہایت ہی متعجب ہوتے ہیں۔ مگر گھوڑے سے بہت ڈرتے ہیں یہاں تک کہ فی المثل اگر ایک سوار سو آسامیوں پر حملہ کرے تو سب ہتھیار ڈال کر بھاگ جائیں یا مطیع ہو جائیں، حالانکہ اگر کسی پیادے دشمن سے مقابلہ ہوتا ہے تو خوب دلیری سے لڑتے ہیں۔

کلتانی سب کاموں میں مقدم ہیں اور آسامی سپاہ گری میں اور ان کے ہتھیار

اس ملک کے قدیمی باشندے دو قوم ہیں۔ ایک آسامی، دوسرے کلتانی۔ اگرچہ کلتانی سب باتوں میں مقدم ہیں لیکن سپہ گری اور لڑائی بھڑائی کے سخت کاموں میں آسامیوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ چنانچہ چھ سات ہزار آسامی راجہ کے مکان کے گرد ہمیشہ مسلح پہرہ دیا کرتے ہیں اور ایسے کاموں میں انہی پر اعتماد ہے اور راجہ کے جلاد اور میر غضب بھی یہی ہوتے ہیں۔ بندوق' تلوار' نیزہ کے علاوہ بانس کے تیر و کمان رکھتے ہیں مگر ان کے قلعہ اور نواڑہ میں توپیں اور لمبی بندوقیں بھی ہوتی ہیں اور ان کا چلانا خوب جانتے ہیں۔

میر جُملہ کا کوچ بہار سے کوچ اور گھوڑا گھاٹ اور رنگا ماٹی پہنچ کر

دریائے برہماپتر کے راستہ سے آسام میں داخل ہونا

القصہ اس ملک میں داخل ہونے کے لئے میر جُملہ نے حسبِ بیان ماسبق تیئسویں تاریخ جمادی الاوّل کو کوچ بہار سے گھوڑا گھاٹ کی طرف کوچ کیا۔ اٹھائیسویں کو دریائے برہماپتر کے کنارہ پہنچ کر رنگاماٹی میں جہاں یہ دریا پہاڑوں سے باہر نکلتا ہے جا اترا۔ چونکہ دونوں طرف کے پہاڑ بہت بلند اور لشکر کے لئے ناقابلِ گزر تھے اور باوجود اس کے کہ دریا کے دونوں کنارے بن اور جنگل اور دلدل اور پانی کثرت سے تھا مگر اس نے براہِ دور اندیشی دریا کا راستہ اختیار کیا اور دریا کے کنارے جنگل کو کاٹ کاٹ کر راستہ بناتا جاتا تھا۔

جوگی گپھا اور پنجرتن کے قلعے، ان کا استحکام اور تدابیر حفاظت، آسامیوں کا نامردی سے قتل اور قید ہونا اور بہت سا سامانِ جنگ ہاتھ آنا

یہاں تک کہ ششم جمادی الآخر کو مقام جوگی گپھا جو گوہاٹی سے چالیس کوس ہے اور وہاں سے راجہ کا دارالحکومت کھڑ گاؤں ایک مہینہ کا راستہ تھا، جا پہنچا۔ یہاں برہماپتر کے کنارے پر آسامیوں کا ایک بہت مضبوط قلعہ تھا۔ اس کی غربی دیوار جدھر سے حملہ آوروں کا راستہ تھا، پہاڑ کی چوٹی تک گھری ہوئی تھی اور سمت جنوبی دریائے برہماپتر سے محفوظ تھی اور مشرق کی طرف دریائے مناس قلعہ کی دیوار کے ساتھ گزرتا ہوا دریائے برہماپتر سے جاملتا تھا اور شمال کی طرف حفاظت کے لئے خندق کے علاوہ پہاڑ اور گھنا جنگل تھا اور علاوہ اس کے حملہ آوروں کی روک کے لئے بانسوں کو نیزوں کی طرح تراش کر جابجا دور تک گاڑا ہوا تھا جس کو ان کی زبان میں "پھانچا" کہتے تھے۔ پندرہ ہزار فوج مع توپخانہ کے قلعہ میں اور تین سو بیس جنگی کشتیاں مع ساز و سامان دریا میں موجود تھیں اور اس کے محاذی دریا کے پار کو پنجرتن پر ایک دوسرا قلعہ بہت مستحکم اور ایسے موقع کا بنا ہوا تھا کہ اگر پہلے قلعہ پر شکست ہو تو فوج نواڑہ میں بیٹھ کر بآسانی دوسرے قلعہ میں چلی جائے اور چونکہ اس تنگ مقام میں دریائے برہماپتر کے اس طرح دو شعبے ہو گئے تھے کہ بیچ میں کچھ زمین ٹاپو کے طور پر تھی اس لئے آسامیوں نے فوج کو یہاں پر اس ارادہ سے قائم کیا ہوا تھا کہ جس کنارہ سے دشمن کی سپاہ گزرے گی، اس پر آگ برسائیں گے۔ میر جملہ نے یہ تدبیر کی کہ ایک حصہ اپنی فوج کا دریا کے دوسرے پار اتارا اور کچھ سپاہ کو کوہ جوگی گپھا کے عقب میں دریائے مناس تک جنگل کاٹنے کے لئے اس مراد سے مامور کیا کہ اگر آسامی قلعہ چھوڑ کر جنگل کو بھاگنا چاہیں تو راستہ نہ پا سکیں۔ اور حصہ کثیر فوج کا کشتیوں میں چڑھا کر اس طرح سے روانہ کیا کہ دریا کنارہ کی فوج اور کشتیاں ایک دوسرے کی مدد کے لئے برابر چلتی تھیں۔

میر جملہ کی اس تدبیر کو دیکھ کر آسامیوں نے یہ خیال کیا کہ اگر حملہ آوروں نے قلعہ چھین لیا تو جنگل کی طرف بھاگنے کا راستہ مسدود ہو چکا ہے اس لئے خوف زدہ ہو کر نواڑہ میں بیٹھ کر لڑنے کو ترجیح دی۔ مگر ایسی نامردی کی کہ باوجود ایسے مضبوط قلعوں اور مقام قلب کے کہ جن کے ہاتھ آجانے کی حملہ آوروں کو ایسی آسانی سے توقع نہ تھی، خفیف سے مقابلہ کے بعد اس قدر بے سروپا ہو کر بھاگے کہ کچھ تو جنگل کو بھاگتے ہوئے مارے گئے اور

بہت سے غرق اور گرفتار ہو گئے۔ ایک سو اڑتالیس کشتیاں اور چھوٹی بڑی چونسٹھ توپیں اور بے شمار بندوقیں اور بہت سا سکہ و بارود وغیرہ سامان جنگ چھین لیا گیا۔

میر جُملہ کا سری گھاٹ، نانڈو اور کجلی کے قلعوں اور گوہاٹی پر قابض ہونا اور آسامیوں کا بھاگنا اور قتل ہونا وغیرہ

اس کامیابی کے بعد دونوں قلعوں پر قبضہ کر کے گوہاٹی پہنچنے کی تدبیریں کی گئیں۔ یہاں تک کہ اکیسویں جمادی الآخر کو میر جُملہ گوہاٹی کے نزدیک جا پہنچا۔ یہاں آسامیوں کے پھر دو مضبوط قلعے تھے۔ ایک بمقام سری گھات پہاڑ کی جڑ میں اور دوسرا اس کے محاذی دریائے برہماپتر کے اس پار کوہ نانڈو کی چوٹی پر۔ اور ایک لاکھ سے زیادہ آسامی ان دونوں قلعوں میں جمع تھے۔ میر جُملہ یہاں بھی وہی چال چلا اور اپنی فوج کے ایک سردار کو قلعہ کی سمت شمالی پر (جو آسامیوں کے بھاگنے کا راستہ تھا) مامور کیا۔ چنانچہ اس تدبیر کے نتیجہ سے وہ لوگ ایسے خائف ہوئے کہ رات کے وقت کشتیوں میں بیٹھ کر خود بخود بھاگ گئے اور کچھ خشکی کے راستہ سے فرار ہوئے اور کچھ فوج نے دریا کے اس پار حملہ کر کے قتل کر ڈالے اور موضع کجلی میں (۱۶۷) قلعہ نانڈو سے سات کوس آگے جو ایک اور بہت مضبوط قلعہ تھا، اس کو بھی خالی کر گئے اور میر جُملہ سری گھاٹ اور نانڈو اور موضع کجلی کے قلعوں اور گوہاٹی پر جو بادشاہی ملک کی قدیم سرحد تھی، بے کھٹکے قابض ہو گیا۔ یہ ایسے مستحکم اور باسامان قلعے تھے کہ اگر آسامی کچھ دلیری کر کے برسات کا موسم آجانے تک ثابت قدمی اختیار کرتے تو بے شک آسام کا فتح ہونا خود حملہ آوروں کی دانست میں غیر ممکن تھا۔

جمدھرہ سیملا گڑھ اور کلیابر کے قلعے اور ان کا دلیر خاں اور میر مرتضیٰ کی شجاعت سے فتح ہونا

مذکورہ بالا قلعوں اور گوہاٹی پر قبضہ کرنے کے بعد میر جُملہ نے پچیسویں جمادی الآخر کو جمدھرہ کے مشہور قلعہ کی طرف (جو دریائے برہماپتر کے شمالی کنارے پہاڑ تراش کر تین حصاروں کے اندر اور اس کے گرد دریائے برہماپتر کا پانی چھوڑ کر جزیرہ کے طور پر بنایا ہوا تھا) کوچ کیا۔ مگر چونکہ اس کی منزل مقصود (یعنی راجہ کا دارالحکومت کھڑ گاؤں) اس دریا کے جنوبی کنارے کی طرف تھی اور اسی سمت میں سیملا گڑھ اور کلیابر کا قلعہ کھڑ گاؤں

پہنچنے میں سدراہ تھا اس وجہ سے میر جملہ نے جمدھرہ کے محاصرہ وغیرہ میں کوشش کرنا بے فائدہ اور تضیع اوقات خیال کر کے سملا گڑھ اور کلیابر کا فتح کرنا حصول مدعا کے لئے مقدم سمجھا اور فوج کو جمدھرہ کی طرف سے اٹھا کر بذریعہ کشتیوں کے اس پار اتارنا شروع کیا۔ اگرچہ عین حالت عبور میں طوفان، ہوا اور اولوں کی شدت سے کچھ کچھ نقصان ہوئے مگر جس طرح بنا دو تین دن کے عرصہ میں کل لشکر کو پار اتار کر گیارہویں رجب کو سملا گڑھ کے قریب جا ڈیرہ کیا۔

دراصل سملا گڑھ اور کلیابر کو ایک ہی قلعہ کہنا چاہئے مگر حصار بیرونی کو سملا گڑھ کہتے تھے اور قلعہ اندرونی کا نام کلیابر تھا اور اگرچہ قلعہ کلیابر بھی بہت ہی مضبوط تھا مگر سملا گڑھ ایسا عظیم الشان اور عریض و طویل تھا کہ اس کی جنوبی دیوار دریا سے لے کر اس پہاڑ تک جو کلیابر کے عقب میں تھا چار کوس اور شمال کی طرف تین کوس کے طول میں تھی اور مناسب طور پر اس میں کئی بڑے بڑے برج بھی بہت عمدگی سے لڑائی کے ڈھب کے بنے ہوئے تھے، جن کے آگے حصار کے طور پر ایک اور کنگرہ دار دیوار بنی ہوئی تھی، جس کے اندر باہر دونوں طرف عمیق خندقیں تھیں جن میں کہیں پانی چھوڑا ہوا تھا اور جہاں پانی نہ تھا وہاں خوب باریک سرمہ سا مٹی بھری تھی اور یہ اندرونی اور بیرونی دونوں قلعے سامان جنگ سے نہایت مکمل اور مرتب تھے اور تین لاکھ آسامی (جو غالباً ملکیہ ہوں گے) اس وقت یہاں موجود تھے۔

میر جملہ نے اگرچہ دمدمے وغیرہ بنا کر سملا گڑھ پر گولے مارنے شروع کئے مگر اس کے استحکام کے باعث ان کے توپ گولہ کا اثر تک بھی محسوس نہیں ہوا اور چونکہ وہ لوگ اس کے لشکر پر فصیل سے برابر گولے برساتے تھے اور کبھی دن کو اور کبھی رات کو حملے بھی کرتے تھے اور قدرتی مشکلوں کے باعث بھی یہ جگہ ایسی پرخطر تھی کہ زمانہ سابق میں محمد شاہ تغلق اور حسین شاہ نامی بنگالہ کے ایک اور بادشاہ کے لشکر اسی مقام پر نیست و نابود ہو چکے تھے، اس لئے زیادہ توقف بعید از مصلحت سمجھ کر یہ صلاح ٹھہری کہ ایک تو خندق کے نیچے سے سرنگ لگا کر قلعہ میں پہنچنے کا راستہ بنانا چاہئے، دوسرے کسی مناسب موقع سے فصیل پر یورش کر کے قلعہ میں داخل ہونے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ جب سرنگ لگ چکی اور فرہاد خاں نامی ایک سردار نے چاروں طرف سے حصار کو دیکھ بھال کر میر جملہ کو یہ اطلاع دی کہ جنوبی فصیل کی طرف حملہ کے لئے کچھ گنجائش ہے تو پندرہویں رجب کو

اسمِ با مسمیٰ دلیر خاں آدھی رات کے وقت فوج کثیر ساتھ لے کر سوار ہوا اور اس طرح سے کارروائی شروع کی کہ میر مرتضٰی سردار توپخانہ کو دروازہ پر حملہ کرنے کے لئے مامور کیا تاکہ دشمن ادھر ہی الجھے رہیں اور دلیر خاں کی طرف جو فصیل پر حملہ کرنا چاہتا تھا، متوجہ نہ ہوں۔ چنانچہ میر مرتضٰی نے قلعہ کے دروازوں پر زور شور سے توپیں مارنی شروع کیں اور اگرچہ آسامیوں کی توپ وبندوق کی زد سے اس کی سپاہ کو کوئی جائے پناہ نہ تھی اور اس وجہ سے ان کو متواتر نقصان پہنچتا رہا مگر اس نے سرگرمی اور بہادری کے ساتھ لڑائی کو جاری رکھا۔ ادھر دلیر خاں کو یہ مشکل پیش آئی کہ اس کا آسامی رہنما ایک ایسا شخص تھا جو سالہاسال سے بادشاہی فوج میں ملازم تھا اور خود میر جملہ سے عرض کر کے اس نے یہ رہنمائی کی خدمت اختیار کی تھی۔ مگر دراصل بمقتضائے حُبِ قومی اور جنسیت کے اس نے اس فوج کے تباہ کرانے کے لئے یہ چال کی تھی کہ آسامیوں کو پہلے ہی خبردار کر رکھا تھا اور دلیر خاں کو تمام رات حیران کر کے صبح ہوتے کو ایک ایسی جگہ لے گیا جو سب سے زیادہ کذھب تھی اور دشمن لڑائی کے لئے بخوبی مستعد تھے۔ غرض کہ وہاں پہنچتے ہی ان پر اس شدت سے توپ بندوق کی آگ برسنے لگی کہ بہت سے سپاہی مجروح و مقتول ہو گئے مگر دلیر خاں کی غیرت اور دلیری نے پسپا ہونے کی ذلت کو کسی طرح گوارا نہ کیا اور باوجودیکہ آسامی اوپر سے توپ بندوق اور ''حقہ ہائے آتشیں'' یعنی گراپ برسا رہے تھے اور فصیل تک پہنچنے میں خندق عمیق اور پُرآب حائل تھی مگر اس دلاور سردار نے سب سے پہلے اپنا ہاتھی خندق میں ٹھیل دیا اور اگرچہ خود اس پر اور اس کے ہاتھی پر تیروں کی بھی سخت بوچھاڑ پڑی مگر یہ شیر مرد اپنے چند بہادر رفیقوں کو ساتھ لے کر فصیل پر جا ہی چڑھا اور پھر تو اس کی ہمت اور دلیری کو دیکھ کر اور سردار اور اہلِ سپاہ بھی آ پہنچے۔ اسی اثنا میں ادھر میر مرتضٰی نے بھی دروازہ توڑ ڈالا اور اس کی فوج بھی کچھ دروازہ کے راستہ اور کچھ سرنگ کی راہ سے داخل ہو گئی اور فریقین میں ایک سخت لڑائی ہو کر آخر آسامی مغلوب ہو گئے اور حصار کے ایک راستہ سے جو جنگل کی طرف تھا سملا گڑھ اور کلیابر دونوں کو خالی کر کے بھاگ گئے اور یہ قلعے مع بیشمار سامان کے حملہ آوروں کے قبضہ میں آ گئے اور تعاقب کی حالت میں بہت سے آسامی مارے اور پکڑے گئے اور اس واقعہ کی شہرت کا یہ اثر ہوا کہ قلعہ جمدھرہ بھی خود بخود خالی ہو گیا اور ملک کام روپ کے رہنے والے بہت سے ہندو مسلمان رعایائے بادشاہی نے جو مدتوں سے آسامیوں کی قید میں تھے رہائی پائی۔

میر جُملہ کا آگے بڑھنا اور آسامیوں کا ایک سخت دریائی لڑائی میں اتفاقیہ حکمتِ عملی سے دھوکا کھا کر مغلوب ہو جانا

چونکہ دریائے برہماپترا اس جگہ سے دو منزل تک پہاڑ کی جڑ کے ساتھ ملا ہوا چلتا ہے اور اس کے کناروں پر لشکر کے گزرنے کے لئے (جیسا کہ میر جُملہ اب تک کرتا آیا تھا) بالکل راستہ نہیں تھا۔ اس باعث سے کچھ فوج بذریعہ نواڑہ کے دریا میں سے اور باقی لشکر دریا کے متوازی پہاڑ کے پیچھے سے روانہ ہوا۔ منتشر شدہ آسامیوں نے بسبب اس کے کہ نواڑہ اور لشکر میں کئی کوس کا فاصلہ ہو گیا تھا، ادھر ادھر سے پھر جمع ہو کر اور آٹھ سو جنگی کشتیوں میں بیٹھ کر جو توپ بندوق سے خوب مسلح تھیں، نواڑہ پر رات کے وقت حملہ کیا اور پہر دن چڑھے تک بڑے جوش و خروش سے لڑتے رہے۔ قریب تھا کہ بادشاہی نواڑہ کو شکست ہو جائے مگر اتفاقاً محمد مومن نامی ایک سردار جورات کے وقت توپوں کی آواز سن کر میر جُملہ نے صدر لشکر سے روانہ کیا تھا اور پہاڑ کے سبب سے راستہ بھولا پھرتا تھا مع چند سواروں کے لڑائی کی جگہ آن نکلا اور دشمن کے دھمکانے کے لیے یہ ہوشیاری کی چال چلا کہ اپنے ساتھ کے "کرناچی" (ترچی) کو حکم دیا کہ کرنا بجائے، جس کے بجتے ہی آسامیوں کو یہ یقین ہو گیا کہ تازہ دم مغلیہ فوج دریا کے کنارہ سے بھی آپہنچی اور اس ناگہانی اندیشہ سے ان کے جی ایسے چھوٹے کہ غالب سے مغلوب ہو کر اکثر تو بھاگتے ہوئے پانی میں ڈوب گئے اور بہت سے مارے گئے اور چار سو کشتیاں جن میں سے ہر ایک پر بڑی بڑی توپ مع سامان کے تھی، چھین لی گئیں۔

راجہ کا دار الریاست سے بھاگنا اور اس کے سرداروں اور وزیروں کی عجز و نیاز کی عرضیاں اور ان کا جواب

ان متواتر فتوحات کا یہ نتیجہ ہوا کہ راجہ کے نخوت اور غرور کا نشہ کرکرا ہو گیا اور دار الریاست کو چھوڑ کر دشوار گزار پہاڑوں میں، جہاں مغلیہ فوج کے سواروں کے پہنچنے کا چنداں اندیشہ نہ تھا، بھاگ گیا اور راجہ کے سرداروں اور وزیروں نے جن کو ان کی اصطلاح میں پھوکن کہتے تھے میر جُملہ کے پاس اپنے وکیل اور عجز و نیاز کی عرضیاں بھیجنی شروع کیں جن کا جواب یہ دیا گیا کہ "شاہی سپاہ اور رعیت کا وہ سب مال اور وہ توپ خانہ جو تم لوگ

گوہاٹی سے لوٹ لائے تھے مع ان سب لوگوں رعایائے بادشاہی کے جن کو راجہ نے مدت سے قید کر رکھا ہے اور راجہ کی لڑکی کا ڈولہ اور ایک معقول پیش کش فوراً حاضر کرو اور آئندہ کو اگر راجہ ہر سال چند عمدہ ہاتھی بطور خراج کے بھیجتا رہے اور بادشاہی احکام کی اطاعت کرتا رہے تو البتہ ہم واپس ہو جائیں گے ورنہ بادشاہی فوج کو کھڑ گاؤں میں پہنچا سمجھو۔"

میر جُملہ کا اور آگے بڑھنا، لکھو گڑھ میں راجہ کی طرف سے بعض شخصوں کا کچھ نذرانہ لا کر شرائط صلح کا پیش کرنا اور قبول نہ ہونا وغیرہ وغیرہ

مگر اس خیال سے کہ یہ عجز و نیاز کا اظہار صرف دفع الوقتی اور مکاری کے طور پر ہے جواب کا منتظر نہ رہ کر میر جُملہ برابر بڑھتا گیا۔ چنانچہ ستائیسویں رجب کو لکھو گڑھ میں جہاں دریائے دھنگ کوہستان جنوبی سے آ کر مع اور بہت سی ندیوں اور نالوں کے برہما پتر میں ملتا ہے، جا پہنچا۔ اس جگہ ایک اور بھی زیادہ معتبر شخص نے جو راجہ کے مذہبی پیشواؤں میں سے تھا، عجز و نیاز کر کے صلح چاہی اور راجہ کے ایک رشتہ دار نے بھی آن کر ایک طلائی پاندان اور ایک سونے کا لوٹا اور دو چاندی کی گاگریں اور کچھ اشرفیاں مع ایک خط کے جس میں اظہارِ ندامت اور عذر و معذرت کے بعد فوج کی واپسی اور صلح کی درخواست اور پیشکش کی قبولیت درج تھی، پیش کیا۔ جس کا جواب (جیسا کہ غالب اور فتح مند اکثر دیا کرتے ہیں) یہ دیا گیا کہ "اب تو لشکر نے کھڑ گاؤں پہنچنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ وہاں پہنچ کر جو مناسب ہوگا کیا جائے گا۔"

چونکہ شہر کھڑ گاؤں دیکھو ندی کے کنارے آباد تھا اور اس میں اس قدر پانی نہیں تھا کہ بڑی کشتیاں چل سکیں اس لئے بھاری نواڑہ کو لکھو گڑھ میں چھوڑ دیا اور چھوٹی کشتیاں ساتھ لے کر غرہ شعبان ۱۰۷۲ھ کو لکھو گڑھ سے آگے ایک مقام میں کہ جہاں نواڑہ کا کارخانہ تھا، قریب ایک سو کے بڑی بڑی کشتیوں پر جو وہاں موجود تھیں قبضہ کیا اور پھر وہاں سے دیول گاؤں میں جہاں دریا کنارے راجہ کا کسی اپنے گرو کے لئے بنوایا ہوا نہایت عمدہ مندر اور باغ تھا ڈیرہ کیا۔

میر جُملہ کا کھڑ گاؤں پر قابض ہونا اور مالِ غنیمت

اس جگہ بعض مسلمانوں کے لکھنے سے جو رعایائے بادشاہی میں سے راجہ کے یہاں

مدتوں سے قید تھے اور جن کو اپنی رہائی کی توقع خواب وخیال میں بھی نہ تھی، یہ اطلاع پا کر کہ راجہ دکن کون (جنوب) کی طرف نام روپ کے دشوار گزار اور بد آب و ہوا پہاڑوں کو جہاں وہ اپنے معتوب قیدیوں کو بھیجا کرتا تھا بھاگ گیا ہے اور اس کی سپاہ اور سردار جنگلوں میں جا چھپے ہیں اور شہر بے وارث و والی خالی پڑا ہے، میر جملہ نے براہ احتیاط کچھ فوج اپنے پہنچنے سے پہلے وہاں بھیج دی اور بعد ازاں چھٹی شعبان کو اورنگ زیب کے جلوس کے چوتھے برس گویا گوہاٹی سے پچھتر کوس کے فاصلہ پر ساڑھے چار مہینے کے عرصہ میں کھڑگاؤں پہنچ کر بلامزاحمت قابض ہو گیا۔ اور راجہ نے جو اپنی توپیں اور رہکلے وغیرہ تالابوں اور ندیوں میں ڈبو دیئے تھے اور ہاتھی جنگلوں میں چھوڑ دیئے تھے، ڈھونڈ ڈھونڈ کر سب پر قبضہ کیا۔ چنانچہ ایک سو ہاتھی اور قریب تین لاکھ روپیہ کے سونا چاندی اور اور اسباب جس کو راجہ اپنے ساتھ لے جا نہ سکا تھا، ضبطی میں آیا۔

ایک عجیب لوٹ جس کا ذکر امرائے آسام کے طریقۂ دفنِ میت سے متعلق ہے

مگر سب سے زیادہ عجیب لوٹ یہ تھی کہ وہاں کا دستور تھا کہ جب کوئی راجہ یا بڑا آدمی مر جائے تو پارسیوں کے دخمہ کی طرح متوفی کی لاش کو دفنائے بدون یوں ہی کسی محفوظ جگہ میں رکھ دیتے تھے اور اس کے ساتھ سونے چاندی کے برتنوں اور فرش فروش، لباس پوشاک اور سامان خورش وغیرہ مایحتاج حالتِ زندگانی حتیٰ کہ اس کی عورتوں خواصوں کو بھی مردہ کے لئے کار آمد سمجھ کر اس کے پاس چھوڑ آتے اور ایک بہت بڑے چراغ کو تیل سے بھر کر اس جگہ کے دروازہ کو بڑے بڑے لکڑوں سے بند کر دیتے تھے۔ اہل لشکر نے ایسے چند مقاموں کو جا کھولا اور ان میں سے نوے ہزار کا سونا چاندی نکال لائے۔

کس قدر سامانِ جنگ اور کشتیاں ہاتھ آئیں

اور اس تمام مہم میں مذکورہ بالا ہاتھیوں کے علاوہ کل چھ سو پچھتر توپیں جن میں سے ایک اتنی بڑی تھی کہ اس میں تین من کے قریب گولہ پڑتا تھا اور دو ہزار تین سو سینتالیس زنبورک بارہ سو رام جنگی اور چھ ہزار پانچ سو ستاون معمولی بندوقیں پانچ ہزار من

بارود کے دوہزار صندوق' سات ہزار اٹھائیس ڈھالیں 'لوہا' سکہ 'گندھک بے حساب اور ایک ہزار سے زیادہ جنگی کشتیاں اور خاص راجہ کی سواری کی مکلّف کشتیاں ایک سو بیس ہاتھ آئیں۔

دھانوں کے ایک سو تہتر ڈھیر

اور سب سے زیادہ کار آمد چیز جو قبضہ میں آئی وہ دھانوں کے ایک سو تہتر ڈھیر تھے جن میں سے ہر ایک ڈھیر دس ہزار من کے قریب تھا اور ان کی نسبت براہِ دور اندیشی میر جُملہ نے فوراً یہ بندوبست کیا کہ لوٹ کر ضائع نہ کیے جائیں اور احتیاج سے زیادہ صرف نہ ہوں۔

تھانہ اور چوکیاں بٹھائی گئیں اور سکہ، خطبہ جاری کیا گیا

خلاصہ یہ کہ میر جُملہ نے کھڑ گاؤں پر قابض ہو کر جو انتظام مناسب وقت تھے وہ کرنے شروع کیے اور جہاں جہاں موقع دیکھا اپنی جنگی چوکیاں اور تھانے مقرر کر دیئے اگرچہ آسامی کچھ عرصہ تک جنگلوں اور پہاڑوں سے نکل نکل کر ان چوکیوں اور تھانوں پر حملے کرتے اور لڑتے رہے مگر آخر کار ایسے دبائے گئے کہ جا بجا چپ ہو کر بیٹھ رہے اور بادشاہ کے نام کا سکہ و خطبہ کھڑ گاؤں میں جاری ہو گیا۔

شہر کھڑ گاؤں کے حالات

اس وقت شہر کی آبادی (بقول مصنف عالمگیر نامہ) اس طور سے تھی کہ دیکھو ندی بیچ میں بہتی تھی اور اس کے دونوں طرف آبادی تھی جس کے گرداگرد شہر پناہ کے طور پر نہایت گھنے اور ناقابلِ گزر بانس لگائے ہوئے تھے اور اس میں اینٹ پتھر کی پختہ عمارت کے چار دروازے تھے اور ہر دروازہ راجہ کے مکان سے تین تین کوس کے فاصلہ پر تھا اور ایک اونچی اور چوڑی آل شہر کے اندر برسات میں آرام سے چلنے پھرنے کے لئے اس سرے سے اس سرے تک بنی ہوئی تھی اور یہ شہر کیا تھا گویا دیہات اور کھیتوں کا ایک مجموعہ تھا۔ کیونکہ ہر شخص کے گھر کے گردو پیش باغ اور کھیتیاں تھیں اور معمولی بازار جن سے شہروں کی رونق اور زیب و زینت ہوتی ہے، یہاں نہ تھے۔ شہر کے لوگ سال بھر کے واسطے غلہ وغیرہ سب قسم کے مایحتاج اپنے اپنے گھروں میں عموماً جمع رکھتے تھے اس سبب سے سوائے پنواڑیوں کی چند دکانوں کے بازار کی ضرورت ہی نہ تھی۔

راجہ کے مکان کی وضع اور اس کا چوبیں دیوان خانہ، سواری کے وقت "داند" اور ڈھول بجانے کی رسم

راجہ کا مکان جس کے چاروں طرف بطور حصار ایک آل بنی ہوئی تھی دیکھو ندی کے کنارہ تھا اور جیسا کہ فصیلوں اور حصاروں پر دشمن کی زد سے بچنے کے لئے سینہ پناہ کی دیوار ہوتی ہے، یہاں بجائے اس کے یہ انجوبہ ترکیب تھی کہ خوب مضبوط بانسوں کو برابر برابر آل کے گرداگرد اس طرح سے گاڑا ہوا تھا کہ سینہ پناہ کا کام دیتے تھے اور آل کے چاروں طرف خندق تھی جو ہمیشہ پانی سے بھری رہتی تھی، جس کا دور ایک کوس سے زائد تھا اور اس احاطہ کے اندر راجہ کے بڑے بڑے مکانات تھے مگر سب لکڑی کے یا پھوس اور بانس کے۔ جن میں سب سے عمدہ ڈیڑھ سو گز لمبا اور چالیس گز چوڑا ایک چوبیں دیوان خانہ تھا جس کے چھیاسٹھ ستون ایسی موٹی لکڑی کے تھے جن کا چار چار گز کا دور تھا اور اس مکان کے اطراف میں طرح طرح کی منبت کار لکڑی کی جالیاں لگی ہوئی تھیں اور پیتل کے پتر صیقل کر کے جالیوں کے اندر باہر اس طرح سے لگائے تھے کہ آفتاب کی شعاع پڑنے سے آئینوں کی طرح چمکتے تھے۔ تین ہزار بڑھئی اور بارہ ہزار مزدوروں نے دو سال تک برابر کام کر کے اس مکان کو بنایا تھا۔ جب راجہ اس دیوان خانہ میں آکر بیٹھتا یا سوار ہو کر کہیں جاتا تو بجائے نقارہ اور شہنائی کے ڈھول اور "داند" بجاتے تھے اور یہ "داند" ایک موٹی اور مدور پیتل کی تختی، گویا اس قسم کی ہوتی تھی جیسے کہ ہندو فقیروں کی جماعتوں کے ساتھ یا مُردوں کے بیانوں کے آگے گھڑیال بجا کرتے ہیں۔

برسات کی آمد کے خیال سے میر جُملہ کا متھرا پور میں ڈیرہ کرنا

چونکہ برسات کی آمد کے آثار شروع ہو گئے تھے جو آسام میں تمام ہندوستان سے پہلے اور اس شدت سے ہوتی ہے کہ ملک کے نشیبی حصوں میں سب جگہ پانی ہی پانی ہو جاتا ہے اس لئے میر جُملہ نے میر مرتضٰی سردار توپخانہ اور راجہ امر سنگھ باڑہ کو کھڑ گاؤں میں ٹھہرا کر خود متھرا پور میں جو یہاں سے تین چار کوس آگے بڑھ کر کچھ اونچی جگہ تھی جا ڈیرہ کیا اور جا بجا چوکیاں اور تھانے بٹھا دیئے۔

برسات کی شدت سے بادشاہی فوج کا مجبور ہو جانا اور آسامیوں کا پھر

سر اٹھانا اور اکثر مقامات پر قبضہ کر لینا

مگر چند ہی ہفتے بعد جب برسات کی معمولی شدت سے اس تمام نیچے کے ملک میں جہاں حملہ آوروں کا قبضہ تھا پانی ہی پانی ہو گیا اور اہلِ سپاہ کو ایک دوسرے سے ملنے اور کہیں آنے جانے میں بہت ہی دشواری ہو گئی، اس لئے آسامیوں نے جنگلوں اور پہاڑوں سے نکل کر میر جُملہ کی چوکیوں اور تھانوں پر حملے شروع کر دیئے اور لڑ بھڑ کر آخر کار شروع ماہ شوال میں اکثر مقامات پر پھر قابض ہو گئے خصوصاً اپنی قدیمی چال کے موافق رسد کی آمد روکنے کے لئے لکھو گڑھ اور گج پور کے مابین دریائے دھنگ کے کنارے جابجا مورچے بنا لئے اور رسد پہنچنے کا راستہ روک لیا۔

رسد کی آمد بند ہو گئی، رعیت بگڑ بیٹھی اور صدر لشکر گاہوں تک حملے ہونے لگے

جب میر جُملہ اس حال سے مطلع ہوا تو راستہ کے کھولنے کے لئے کچھ فوج دریا کے کنارے کنارے سرانداز خاں ازبک کے زیر حکم اور کچھ بذریعہ نواڑہ محمد مراد بیگ کے ماتحت کھڑ گاؤں سے روانہ کی تاکہ ایک دوسرے کی مدد اور اتفاق سے کام کریں مگر بدبختی سے تھوڑی ہی دور چل کر ان دونوں میں اتفاقاً ایسی ناچاقی ہو گئی کہ سرانداز خاں تو پیچھے رہ گیا اور محمد مراد بیگ براہِ نخوت اس کی مدد کی پروا نہ کر کے مع اپنی کشتیوں کے آگے بڑھ گیا اور آسامیوں نے موقع پا کر رات کے وقت جہاں یہ ٹھہرا ہوا تھا ایک ایسا چھاپہ مارا کہ سب کشتیاں مع ساز و سامان کے چھین لیں اور وہ ایسا سراسیمہ ہوا کہ مع اپنی سپاہ کے بغیر لڑے ترمہانی کو بھاگ گیا۔ اس کامیابی سے آسامی اور بھی مغرور ہو گئے اور لکھو گڑھ سے رسد اور خبر آنے کا راستہ بالکل مسدود ہو گیا اور جہاں کہیں بادشاہی فوجیں تھیں بجز اپنی حفاظت کے اودھر ادھر کہیں نہیں جا سکتی تھیں اور آسامی جو اس شدت طغیانی میں گویا ان ندی نالوں کی مچھلیاں ہی تھے، میدان اور پہاڑ سے آ کر بے تکلف اور متواتر حملے کرتے تھے، یہاں تک کہ خود کھڑ گاؤں کے صدر لشکر پر بھی حملے شروع کر دیئے۔ ان حالتوں کو دیکھ کر رعایا کے لوگ بھی اطاعت اور فرمانبرداری سے منحرف ہو کر بگڑ بیٹھے اور اسی اثنا میں اتفاق سے کوچ بہار میں یہ واقعہ پیش آیا کہ عمال بادشاہی نے جو بے وقوفی سے ممالک محروسہ شاہی کی

طرح کڑی جمعبندی کر کے سختی سے مطالبے شروع کر دیئے، اس لئے رعایا نے باغی ہو کر بھیم نارائن کو بھوٹنٹ سے واپس بلالیا اور فوجدار کو قتل کر کے (جیسا کہ ہم ایک حاشیہ میں قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں) بادشاہی عمل و دخل اٹھادیا اور تمام عہدہ دار مجبور ہو کر گھوڑا گھاٹ میں چلے آئے۔ اس خبر کے مشہور ہو جانے سے آسامیوں کے حوصلے اور بھی زیادہ بڑھ گئے اور بادشاہی فوج کی جرأت و ہمت پر بھی برا اثر پیدا ہوا۔

میر جُملہ کی کوشش اس حالت کی اصلاح کے لئے

میر جُملہ نے اس سیلاب بلا کے روکنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کیں اور چونکہ کھڑ گاؤں میں لکھو گڑھ سے رسد کا پہنچنا اور اس کے گردونواح کے مفسدوں کی تنبیہ و تادیب کر کے آمدورفت کا راستہ کھولنا سب سے زیادہ ضروری تھا، اس لئے اس نے ایک فوج باندازہ مناسب متھراپور سے زیر حکم فرہاد خاں بمعیت راجہ سجان سنگھ باڑہ و قراول خاں وغیرہ سرداروں کے اس مطلب کے پورا کرنے کے لئے روانہ کی۔ اگرچہ فرہاد خاں نے کھڑ گاؤں پہنچ کر کمال ہمت سے ایسی کوشش کی کہ راتوں رات اپنے لشکر کو دیکھو ندی سے، جو بڑی طغیانی پر آئی ہوئی تھی، پار اتارا۔ مگر آخر کچھ دور آگے جا کر کثرتِ بارش اور شدتِ سیلاب سے یہ حالت دیکھی کہ تمام ملک مثل ایک دریائے بیکراں کے تھا اور باوجود کوشش کے کہیں راستہ نہ ملتا تھا۔ اور چونکہ بارش شدت سے ہو رہی تھی اور سواروں اور پیادوں کو سوائے پانی میں کھڑے رہنے کے کوئی جگہ ہی نہ تھی اس نے ناچار واپس آنا چاہا اور جب اس پانی ہی پانی میں ترمہانی تک پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ آسامیوں نے وہاں سے لے کر دریائے دھنگ تک نہایت چوڑی اور عمیق نہریں کھود کر اور کنارہ پر مستحکم مورچے بنا کر اور توپ اور ہتھلے وغیرہ سامانِ حرب سے مضبوط کر کے واپس جانے کا راستہ بند کر رکھا ہے اور یہ سپاہ اس مقام پر پہنچی ہی تھی کہ بہت سے آسامیوں نے اپنے مورچوں اور جنگی کشتیوں پر سے گولے برسانے شروع کئے۔ اور بادشاہی فوج کو اب بڑی دقت پیش آئی کہ نہ ان کے پاس رسد اور چارہ تھا اور نہ کشتیاں کہ ان پر سوار ہو کر اور دشمنوں کو دفع کر کے ندی نالوں سے پار ہو جائیں اور نہ آگے جا سکتے تھے اور نہ کہیں پیچھے ہٹ سکتے تھے اور کسی طرح کی مدد بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ناچار ایک آل پر جو اس نواح میں تھی، جا چڑھے۔ میر جُملہ نے اس حادثہ کی خبر پا کر محمد مومن کو فوجِ کثیر کے ساتھ ان کی کمک کے لئے روانہ کیا

مگر وہ بھی ترمہانی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خلاصہ یہ کہ فرہاد خاں اور اس کی سپاہ اور تمام سردار آل پر گھرے ہوئے بھوک سے ناچار ہو کر لشکر کے بیلوں کا گوشت کھا کر مصیبت کے دن کاٹتے تھے اور اس عرصہ میں اگرچہ آسامی کشتیوں پر سے بھی گولے مارتے تھے اور دن اور رات میں کئی کئی بار آل تک پہنچ کر حملے بھی کرتے تھے مگر یہ لوگ ایک ہفتے تک باوجود ہر طرح کی تکلیف کے کمال جرأت اور بہادری سے ان کو پسپا ہی کرتے رہے۔

فرہاد خاں اور راجہ سجان سنگھ کی ماموری، ان کی مصیبت مگر عجیب استقلال سے اپنے گھرے ہوئے لشکر کو بچانا اور دشمنوں پر غالب آکر فوج کو صحیح و سلامت واپس لے جانا

اور آخر کار فرہاد خاں نے ایک روز یہ تدبیر کی کہ جب آسامی راجہ سجان سنگھ کے راجپوتوں پر حملہ کرنے کے لئے بڑھے چلے آتے تھے تو اس نے ان کو بطور حکمت عملی پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور جب راجپوت پیچھے ہٹے اور یہ مجہول آسامی مغرور ہو کر اس قدر آگے بڑھ آئے کہ ان کی کشتیوں سے جو دریائے دھنگ میں کھڑی تھیں، ان کو بہت فاصلہ ہو گیا تو خان مذکور نے موقع دیکھ کر یک لخت دھاوا کیا اور ایسی تلواریں ماریں کہ حملہ کرنے والوں کے ٹکڑے اڑا دیئے اور ان کی چند کشتیاں بھی چھین لیں۔ لیکن چونکہ اس کے پاس سپاہ کے کھانے کو کچھ نہیں تھا تو آخر یہی صلاح ٹھہری کہ جس طرح بنے اس مصیبت سے نکلنا چاہئے مگر نکلنے کے واسطے چونکہ کشتیاں کافی نہ تھیں اور وہی چند کشتیاں تھیں جو دشمنوں سے چھینی تھیں اس لئے کیلے اور بانس کاٹ کر اور چھال اور گھاس سے باندھ کر بیڑے بنائے اور ان پر چیدہ چیدہ بہادروں نے چڑھ کر طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے کہ جب آسامی بالکل بے فکر پڑے سو رہے تھے، یکایک حملہ کیا اور ان کو وہاں سے بھگا کر اکتالیس کشتیاں چھین لائے اور پھر ان کشتیوں پر اپنے لشکر کو ندی نالوں سے پار اتار کر تمام لشکر کو صحیح سلامت متھرا پور میں دوسری ذیقعد کو پہنچا دیا۔

میر جملہ کا مجبوراً کل سپاہ کو کھڑ گاؤں اور متھرا پور میں جمع کر لینا اور بجز لکھو گڑھ، کھڑ گاؤں اور متھرا پور کے سب جگہ سے عمل و دخل اٹھ جانا

مگر بعد اس کے جو بارش کی شدت اس سے بھی زیادہ ہوئی اور تھانوں اور چوکیوں

تک مدد کا پہنچنا بہت دشوار ہو گیا تو میر جملہ نے از راہِ دانائی کل سپاہ کو سب جگہ سے اٹھا کر کھڑ گاؤں اور متھرا پور میں جمع کر لیا۔ اس باعث سے تمام ملک پر پھر آسامی ہی قابض ہو گئے اور سوائے متھرا پور، کھڑ گاؤں اور لکھو گڑھ کے اور کوئی مقام بادشاہی لشکر کے تصرف میں باقی نہ رہا بلکہ آسامیوں کی جرأت اور جسارت یہاں تک بڑھی کہ متھرا پور اور کھڑ گاؤں کے مابین جو صرف چند میل کا فاصلہ تھا، یہاں بھی بغیر جمعیت فوج کے آمد و رفت نہیں ہو سکتی تھی۔

سرداروں اور اہلِ لشکر کی فکر مندی، رسد کی قلت اور آسام کے ایک بھوکن اور چارنگ کے راجہ کے حملے میر جُملہ کے لشکر پر

اب ظاہر ہے کہ اس حالت میں سرداروں اور اہلِ لشکر کے فکر و تردّد کا کیا ٹھکانا تھا اور قلتِ رسد اس پر اور بھی مستزاد تھی، علاوہ بریں راجہ نے میر جُملہ کے پاؤں اکھیڑنے کے لئے اپنے ایک بھوکن کو اپنا قائم مقام بنا کر اور بڑے بڑے اختیارات دے کر فوج کثیر کے ساتھ متھرا پور کو روانہ کیا اور خود بھی قلعہ سولہ کوڑی میں جو کھڑ گاؤں سے چار منزل اور آسام کے راجاؤں کا قدیمی دارالحکومت تھا، آ کر ٹھہر گیا۔ بھوکن مذکور ایک ندی کے کنارے، جو متھرا پور کے نزدیک گزر کر دریائے دھنگ میں گرتی اور برسات کے موسم میں دریائے عظیم ہو جاتی ہے، اترا اور بے شمار آسامیوں کو جمع کر کے (بقول صاحب عالمگیر نامہ) ایک دیوار عریض و مرتفع تیس کوس لمبی اور کمال مستحکم کہ جس کا ایک سرا پہاڑ سے اور دوسرا دریائے دھنگ سے ملا ہوا تھا، نہایت قلیل عرصہ میں اپنے لشکر کے آگے تیار کر لی۔ یہ شخص اکثر راتوں کو ندی سے پار اتر کر اگرچہ کتنی ہی دفعہ سخت سخت حملے کرتا رہا مگر ہمیشہ ناکامیاب ہی ہوتا رہا۔ لیکن آخر میں میر جُملہ نے ایک روز خود سوار ہو کر ان کو ایسا تیغ کیا کہ پھر اس کو حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور ایسا ہی چارانگ کے راجہ کو بھی جو آسام کا ایک بہت بڑا ذیلدار تھا اور جس نے متھرا پور کے نزدیک دوسری جانب سے مورچے آن لگائے تھے، راجہ سجان سنگھ نے ایک سخت لڑائی لڑ کر بھگا دیا۔

جب آسامی اس طرح سے متھرا پور پر متواتر حملے کر کے ہمیشہ پسپا ہی ہوتے رہے تو اس جگہ کا خیال چھوڑ کر اوائل ذیقعد سے کھڑ گاؤں پر حملے کرنے شروع کئے۔ چنانچہ اکثر راتوں کو ایسے سخت حملے ہوئے کہ مدد کے لئے میر جُملہ کو متھرا پور سے بعض سرداروں کو

بھیجنا پڑا۔ اگرچہ اس پر بھی ذی الحجہ کے مہینہ میں آسامیوں نے کئی بار رات کو ایسی شدت سے حملے کئے کہ اگر بادشاہی سردار اور فوج ذرا سی کوتاہی کرتے تو ضرور مغلوب ہو جاتے۔ مگر یہ سپاہ کمال استقلال اور مردانگی سے ان کے حملوں کو دفع ہی کرتی رہی۔

متھراپور اور کھڑ گاؤں میں ناکامیاب ہو کر آسامیوں کا مغلوبانہ طور پر منتشر ہو جانا اور خصوصاً لکھو گڑھ میں ابن حسین کی کوشش سے ان کا زیادہ مغلوب ہونا

آخر کار روزمرہ کی لڑائی بھڑائی سے دق ہو کر مغلیہ فوج نے خود ایسے سخت حملے کئے کہ ان کے مورچے چھین کر جلا ڈالے اور دشمنوں کو قتل اور غارت کر کے محصور و مغلوب سے پھر غالب ہو گئے اور اس دلیری اور ہمت کا یہ نتیجہ ہوا کہ دشمن منتشر ہو گئے اور فوج موجودہ کھڑ گاؤں کو روزمرہ کی لڑائیوں سے کسی قدر فرصت مل گئی۔ اسی طرح جو فوج مع نواڑہ وغیرہ لکھو گڑھ میں ابن حسین داروغہ نواڑہ کے زیرِ حکومت تھی (جو نام سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جہاز راں عرب تھا) باوجود آسامیوں کی کوشش اور بے حد حملوں کے جو نواڑہ کے علاوہ دریا کنارہ سے بھی آ آ کر دق کرتے تھے کسی طرح مغلوب نہ ہوئے بلکہ ابن حسین اور اس کے رفیق سرداروں نے خود حملے کر کے آسامیوں کی کئی کشتیاں چھین لیں اور کتنے ہی ان کے مورچے بھی تباہ کر ڈالے اور ابتدائے برسات میں دیول گاؤں وغیرہ سے جو تھانے اٹھ گئے تھے، پھر قائم کر دیئے۔ بلکہ ایسا عمدہ بندوبست کیا کہ ان کے کئی سردار بھی پکڑ لئے اور لکھو گڑھ سے گوہاٹی تک اپنے رعب ودبدبہ کو جیسا کہ چاہئے تھا قائم رکھا اور گوہاٹی سے رسد اور خبر کی آمدورفت کے سلسلہ کو منقطع ہونے نہیں دیا۔

آسامیوں کا پھر طالب صلح ہونا اور میر جملہ کا براہِ مصلحت پہلے سے زیادہ کڑی شرطیں پیش کرنا

خلاصہ یہ کہ جب مذکورہ بالا بھوکن اپنی تمام جرأت اور بہادری خرچ کر چکا اور بادشاہی فوج باوجود قلتِ تعداد کے غالب رہی تو اس نے راجہ کی مرضی سے میر جملہ کے پاس متھراپور میں وکیل بھیج کر پھر صلح کی درخواست کی لیکن میر جملہ نے ازراہِ مصلحت

پہلے سے بھی زیادہ یہ کڑی شرطیں پیش کیں کہ پانچ سو ہاتھی، تین لاکھ تولہ سونا مع اپنی بیٹی کے جو بادشاہی بیگمات کی خدمت گزاری کے لئے بھیجی جائے، بالفعل حاضر کرے اور آئندہ کے لئے پچاس ہاتھی ہر سال بطور پیش کش بھیجتا رہے اور جہاں تک ہماری فوج پہنچ چکی ہے، وہ تمام ملک ہمارے قبضہ میں رہے اور کوہستان نام روپ وغیرہ راجہ کے پاس مگر ان سخت شرطوں کے ساتھ۔ براہِ دانائی یہ نرمی بھی ظاہر کی کہ پورن مل نامی اپنے ایک ہندو سردار کو بھوکن کی تسلی کے لئے بھی بھیج دیا جس کی نہایت درجہ کی خاطر اور تواضع و تکریم بھوکن مذکور نے کر کے سب شرطوں کو قبول کر لیا بلکہ ایک دن تخلیہ میں یہاں تک کہہ دیا کہ اگر راجہ ان شرطوں کو منظور نہ کرے گا تو میں اس کا ساتھ چھوڑ کر خود میر جملہ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔

بیماری اور قحط کی تازہ مصیبت کا پیش آنا اور اس کے برے نتیجے

مگر یہ کام بنتے بنتے پھر اس طرح بگڑ گیا کہ اسی اثنا میں بد قسمتی سے یہ تازہ مصیبت پیش آ گئی کہ شدتِ بارش سے متھرا پور کے لشکر میں آب و ہوا خراب ہو کر تپ لرزہ اور دستوں کی بیماری ایسی پھیلی کہ اکثر لوگ مر گئے بلکہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ وبا تمام ملک اور خصوصاً راجہ کی سپاہ اور رعایا کے لوگوں میں، جو بھاگ کر پہاڑوں جنگلوں اور تنگ مقاموں میں جا گھسے تھے، یہاں تک پھیل گئی تھی کہ اس کے بعض ملازموں کے قول کے موافق دو لاکھ تیس ہزار آسامی ضائع ہوئے تھے!!! اس بیماری کے علاوہ میر جملہ کے لشکر میں رسد کا بھی ایسا قحط تھا کہ منجملہ ان ایک سو تہتر انبار چاولوں کے جو کچھ ڈھیر پانی کی طغیانی اور دشمنوں کی دست و برد سے بچے ہوئے تھے یا تو کسی قدر ان پر گزران تھی یا ان بیلوں کے گوشت پر جو لڑائیوں بھڑائیوں میں دشمنوں سے چھینے ہوئے تھے۔ بلکہ ایک مدت تک سوائے اس کے کہ بیل کا گوشت پانی میں جوش دے لیں یا اسی کی چربی میں بھون لیں یا لیموں اور نارنج کے ساتھ جو اس ملک میں کثرت سے تھے تبدیل ذائقہ کر لیں، بڑے بڑے امرائے خوش خور کو بھی کھانے کے لئے اور کچھ میسر نہ آتا تھا اور آخر کو یہ بھی نایاب تھا۔

بادشاہی لشکر کی اس مصیبت کا یہ نتیجہ ہوا کہ آسامی جو پہلے ذرا دب گئے تھے انہوں نے پھر سر اٹھایا اور وہی بھوکن جو عجز و نیاز اور اطاعت کے پیغام و سلامت بھیج رہا تھا پھر لڑنے کو تیار ہو گیا!!! اور چونکہ متھرا پور میں بیماری زیادہ تھی اور تقریباً تین مہینے سے

دن رات کی بارش اور لڑائی اور قحط کی مصیبت نے مجبور کر دیا تھا اور اس لئے میر جملہ بارہویں محرم کو وہاں سے ڈیرہ اٹھا کر کھڑ گاؤں میں چلا آیا تھا، آسامیوں نے اس امر کو اور بھی زیادہ ان کی کمزوری پر محمول کیا اور از سر نو دن رات حملے کرنے شروع کر دیئے، یہاں تک کہ یہ بھوکی اور بیمار فوج رات بھر سونے نہیں پاتی تھی۔

دلیر خاں اور اور سرداروں کی شجاعت اور استقلال اور برسات کے کم ہونے پر میر جُملہ کا پھر اپنی کارروائیاں شروع کرنا

لیکن ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ چاندنی رات میں آسامیوں نے جو دلیر خاں اور راجہ سجان سنگھ کے مورچوں پر نہایت جمعیت سے حملہ کیا، اگرچہ وہ شکست کھا کر پس پا ہو گئے تھے مگر دلیر خاں نے بہ مقتضائے اپنی شجاعت کے صرف ان کے معمولی پس پا ہونے پر اکتفا نہ کر کے چاندنی رات کے موقع کو غنیمت سمجھا اور دور تک تعاقب کر کے اس قدر تہ تیغ کیا کہ اس کے بعد پھر ان کو کھڑ گاؤں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

قصہ مختصر نصف ماہ صفر تک سب سرداروں اور سپاہیوں نے بیماری اور قحط کی مصیبت کو نہایت تحمل اور استقلال سے برداشت کیا اور چونکہ بارش میں بھی کچھ کمی ہونے لگی تھی اس لئے میر جملہ اور اس کے سرداروں نے پھر کارروائی شروع کی اور معلوم کیا کہ براہِ چارنگ دریائے دیکھو کے پار دیول گاؤں تک دامن کوہ کے قریب ایک ایسی آل بنی ہوئی ہے جو برساتی پانی میں نہیں ڈوبتی اور اس پر آمد و رفت کے لئے خشک راستہ موجود ہے۔ اس لئے میر جملہ نے اکیسویں صفر کو تھوڑی سی فوج اور ابوالحسن نامی اپنے ایک معتبر سردار کو جو اس کے ذاتی ملازموں میں سے تھا، واسطے تنبیہہ مفسدان اور اس راستہ کے جاری کرنے کے مامور کیا اور یہ بھی ہدایت کی کہ ابن حسین نواڑہ کے داروغہ کو خبر دیوے کہ رسد کی کشتیاں جس طرح ہو سکے دیول گاؤں میں بھیج دے۔ چنانچہ اس بندوبست کے موافق مخالفوں کی تنبیہہ و تادیب کے بعد یہ دیول گاؤں میں پہنچ گیا اور چونکہ دریا کنارے اب بھی آسامیوں کے مورچے اور نو تعمیر گڑھیاں تھیں اور رسد کی کشتیوں کے لئے اس وجہ سے اندیشہ تھا اس لئے کچھ رسد تو کشتیوں سے نکال کر بہ جمعیت مناسب چارنگ کے راستہ سے کھڑ گاؤں کو بھیج دی اور خود نواڑہ کے ساتھ ہو کر کھڑ گاؤں کو روانہ ہوا اور ان کی گڑھیاں جو دھنگ ندی کے کنارے تھیں، ان کو بھی چھین کر مسمار کر ڈالا اور چارنگ اور گج پور اور دیول گاؤں میں

راستہ کی حفاظت کا بخوبی بندوبست کر دیا۔

ان کی تدبیروں کا راست آنا، چھ مہینے کے بعد رسد کا راستہ کھل جانا اور آسامیوں کا پھر منتشر اور مغلوب ہونا

خلاصہ یہ کہ یہ تدبیریں راست آئیں اور اواخر ربیع الاول، چھ مہینے کے بعد خشکی اور تری دونوں راستوں سے کھڑگاؤں میں رسد پہنچ گئی۔ اور قحط کی مصیبت رفع ہوئی اور برسات کے اتار کے ساتھ آسامی بھاگ کر پھر جنگلوں ذروں اور اونچے اونچے پہاڑوں پر جا چڑھے اور راجہ بھی سولہ کوڑی سے پھر نام روپ کے پہاڑوں کو چلا گیا اور اگرچہ اس کا نامور سردار یعنی وہی مذکورہ بالا بھوکن بسبب اپنے مورچہ کی مضبوطی اور جمعیت فوج کے ابھی تک کھڑگاؤں کے قریب ایک ندی کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا مگر اس نے بھی عاجزی سے پھر صلح کی درخواست کرنی شروع کی جس کو قبول نہ کر کے میر جُملہ نے آٹھویں ربیع الثانی کو چند سرداروں اور فوج کو کشتیوں پر بٹھا کر اس کی سزا دہی کے لئے روانہ کیا اور ایک سخت لڑائی ہوئی جس میں بھوکن مذکور سے اس کا بانسوں کا قلعہ جو اس نے اپنے لشکر کے گرداگرد بنایا ہوا تھا چھین لیا گیا مگر چونکہ اس کے ساتھ جمعیتِ کثیر موجود تھی اور اس نے ایک دوسرے قلعہ میں جو ڈنڈکا ندی کے قریب تھا پاؤں جا جمائے تھے اور اب وہ اس حملہ آور فوج اور لشکر مقیم کے گاؤں کے بیچ میں آ گیا تھا، اس لئے چودھویں ربیع الثانی کو میر جُملہ بذاتِ خود کھڑگاؤں سے اس پر حملہ کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ مگر چونکہ وہ پہلی ہی شکست سے ہمت ہار چکا تھا اور اب میر جُملہ کے بذاتِ خود چڑھائی کرنے کا حال بھی اس کو معلوم ہوا تو خائف ہو کر اس مورچہ سے بھی جو بہت مضبوط تھا، بے لڑے بھاگ گیا۔ اس جگہ پر قابض ہو جانے کے بعد میر جُملہ کو خبر ملی کہ ابھی ایک اور مورچہ دریائے دھنگ کے اس پار باقی ہے اس لئے وہاں سے اٹھارہویں ربیع الثانی کو روانہ ہو کر وہ اس دریا کے کنارے پہنچا ہی تھا کہ آسامی اس کو بھی خالی کر گئے، حالانکہ دریا کے عرض و عمق کے باعث وہ حملہ سے محفوظ تھے۔

میر جُملہ کے مرض الموت کا آغاز اور اس پر بھی اس کا آگے کو بڑھ جانا

مگر اب قدرتِ ایزدی سے یہ عجیب اور منحوس واقعہ پیش آیا کہ مخالف تو اس کو

دریا کے پار ہی پہنچا ہوا دیکھ کر خود بخود بھاگے جاتے تھے مگر یہاں میر جملہ پر یہ حالت گزری کہ جس وقت اپنے گھوڑے پر سوار اس کنارہ سے آسامیوں کے مورچوں اور ان کے حال احوال کو حملہ کی تدبیر سوچنے کے لئے بہ نظر غور واحتیاط دیکھ بھال رہا تھا، یکایک اس پر ضعف کی سی کیفیت ایسی طاری ہوئی کہ گھوڑے سے اتر کر زمین پر لیٹ گیا اور تھوڑی دیر تک بالکل بے ہوشی اور غشی میں پڑا رہا اور اگرچہ تھوڑی دیر بعد ہوش آگیا مگر کئی روز تک اس کو یہیں مقام کرنا پڑا اور اب باوجودیکہ اس کے مقابلہ سے دشمن بالکل ہٹ گئے تھے، بلکہ ایسا اچھا اثر پیدا ہو گیا تھا کہ رعایا کے لوگ عموماً اطاعت کرنے لگ گئے تھے اور بدلی بھوکھن نامی جو آسام کے سرداروں میں راجہ کا ایک بہت بڑا رکن تھا اور بسبب کسی رنجش کے راجہ سے اس کی ان بن ہو گئی تھی، اپنے اہل و عیال کی بھی پروا نہ کر کے اور راجہ کی رفاقت چھوڑ کر میر جُملہ کے لشکر میں حاضر ہو گیا تھا۔ بلکہ میر جُملہ کی خواہش کے موافق راستوں وغیرہ کے بندوبست اور شاہی خدمات کے لئے کئی ہزار آسامیوں کی فوج بھی بھرتی کرا دی تھی اور اس باعث سے راجہ کو اپنے سب سرداروں کی طرف سے ایسی بدظنی پیدا ہو گئی تھی کہ اس بے چارہ وفادار مذکورہ بالا بھوکھن کو بھی جو نہایت بہادری کے ساتھ بادشاہی فوج کو کئی مہینے تک دق کرتا رہا تھا، خواہ مخواہ سستی اور کوتاہی کا الزام لگا کر ازراہِ وحشت عیال واطفال سمیت لوہے کی گرم سیخوں میں پرو پرو کر سخت عذابوں سے مروا ڈالا اور صورتِ معاملات ایک مدت تک خراب رہ کر اب سب طرح میر جُملہ کے حسبِ دل خواہ ہو چلی تھی اور باوجود مرض کے بھی اس کا یہ مستقل ارادہ تھا کہ جس طرح بنے راجہ سے آسام کا کل ملک چھین کر اس کو خارج کر دے اور اسی ارادہ سے پانچویں جمادی الاوّل کو کوہستان نام روپ کی طرف یہاں سے کوچ بھی کر دیا تھا، بلکہ ساتویں جمادی الاوّل کو قصبہ سولہ کوڑی میں پہنچ کر اور آٹھویں کو دریائے دھنگ کے پار ہو کر (جس کے کنارہ یہ قصبہ آباد تھا) اور آگے بڑھ کر جا اترا تھا۔

میر جُملہ کی بیماری کا سخت وشدید ہو جانا اور اس کی مرضی کے خلاف اور سرداروں کا یہ ارادہ کہ مہم کو ختم کرنا چاہئے

مگر اسی مقام پر اس کی بیماری بہت ہی سخت وشدید ہو گئی۔ سینہ اور معدہ میں درد ہو کر شدت سے تپ چڑھ گیا اور دو تین دن کے بعد مرض ذات الصدر میں بھی مبتلا

ہو گیا۔ اس سبب سے اہلِ لشکر اور سردار جو متواتر لڑائیوں کے علاوہ گزشتہ بارش اور قحط اور بیماری سے تنگ آئے ہوئے تھے، اب ان کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ مبادا سردار مرجائے یا مہم طول کھینچ کر دوبارہ برسات کا موسم آجائے اور لشکر تباہ ہو جائے، اس لئے اکثر سرداروں نے یہ ارادہ کرلیا کہ اگر میر جُملہ اس مہم کو زیادہ طول دینا چاہے تو خود سری اختیار کر کے بنگالہ کو چلے جائیں۔

شدتِ مرض اور سرداروں کی رائے سے مجبور ہو کر راجہ کے پیغام صلح کے منظور کر لینے پر میر جُملہ کا راضی ہو جانا

اگرچہ میر جُملہ کو عین شدتِ مرض میں سرداروں کے اس ارادہ سے نہایت ہی رنج ہوا مگر عالی ہمتی اور حسنِ تدبیر سے تاکہ دشمن دلیر نہ ہو جائے باوجود بیماری کے ایک منزل اور آگے بڑھ گیا۔ لیکن مذکورہ بالا وجوہات سے خلاف اپنی اصل آرزو کے، دل میں صلح کر لینے کا ارادہ کر لیا اور اس عرصہ میں جو راجہ کے بھیجے ہوئے سفیر اور وکیل امراء ہمراہی کے ذریعہ سے معافی اور صلح کی متواتر درخواستیں کرتے تھے اور قبول نہیں کی جاتی تھیں اور اب جو اس نے دلیر خاں کے ذریعہ سے درخواست کی تو میر جُملہ بھی بنا چارے موقع وقت دیکھ کر راضی ہو گیا۔

راجہ کے وکیلوں کا حاضر ہونا، شرائطِ صلح اور ان کی تعمیل

اور سترھویں ماہ مذکور کو اپنے لشکر گاہ سے آگے بڑھ کر موضع پتام میں جو نام روپ کے درّہ پر تھا جا اترا۔ یہ پتام کا علاقہ راجہ کے ایک رشتہ دار کی ریاست میں تھا جس کو اس کی طرف سے راجگی کا خطاب تھا اور اس جگہ جنگل اور درّہ کے سرے پر نہایت مضبوط مورچہ بنا ہوا تھا۔ غرض کہ اس جگہ راجہ کے وکیل حاضر ہوئے اور بعد بہت سی قیل و قال کے ان شرائط پر صلح ٹھہر گئی کہ راجہ ایک اپنی بیٹی اور ایک راجہ پتام کی لڑکی' بیس ہزار تولہ سونا' ایک لاکھ بیس ہزار تولہ چاندی' بیس ہاتھی بادشاہی پیشکش میں' پندرہ ہاتھی میر جُملہ کو اور پانچ ہاتھی دلیر خاں کو دے دے اور بعد ازیں بارہ مہینے کے اندر اندر تین لاکھ تولہ چاندی اور نوے ہاتھی سرکار میں داخل کرے اور بطور پیشکش سالانہ بیس ہاتھی بھیجتا رہے اور مذکورہ بالا شرائط کی تعمیل تک اپنے چار بڑے بڑے سرداروں کے بیٹوں

کواول کے طور پر بنگالہ میں حاضر رکھے۔ اور بدلی بھوکن کے اہل و عیال کو (جو حسب شرح صدر میر جُملہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا تھا) مع بعض اشخاص علاقہ کام روپ کے جو اب بھی نام روپ وغیرہ کے پہاڑوں میں قید تھے، بادشاہی لشکر میں بھیج دینا منظور کرلیا اور بابت ملک مفتوحہ کے اترکون کی طرف دریائے الی براری اور دکن کون کی طرف دریائے کلنگ راجہ اور بادشاہی ملک میں حد فاصل مقرر ہو گئی۔ اور ان امور کی نسبت آسامیوں کی طرف سے عہد نامہ اور میر جُملہ کی طرف سے قول نامہ تحریر ہو کر دیا اور لیا گیا اور پانچویں جمادی الآخر کو راجہ کے وکیلوں نے اس معاہدہ کی تعمیل میں دونوں لڑکیاں اور مقررہ سونا چاندی اور چاروں سرداروں کے لڑکے حاضر کر دیئے۔

میر جُملہ کی مراجعت اور حالتِ مراجعت میں نو مفتوحہ ملک کے بندوبست اور پیم نارائن کی سزادہی کے لئے انتظاماتِ مناسب کا عمل میں لانا

اور میر جُملہ نے دسویں جمادی الآخر کو اورنگ زیب کے جلوس کے پانچوں سال میں اس باعزت صلح کے بعد کوہستان نام روپ سے بنگالہ کو مراجعت کی۔ (اس حساب سے من ابتدائے شروع کوچ جو جمادی الاوّل کی تیرہویں تھی، دوسرے برس سے کچھ زائد ہوئے) اور چونکہ اس کو بیماری سے کسی قدر افاقہ ہو گیا تھا، منزل بمنزل جلد جلد کوچ کرتا ہوا بائیسویں ماہ مذکور کو لکھو گڑھ میں پہنچ گیا اور میر مرتضیٰ وغیرہ سرداروں اور ہمراہیوں کے انتظار میں جو کھڑ گاؤں سے مع اشیا و اموال بادشاہی اور مع ایک گروہِ کثیر ہندو مسلمان زن و مرد کے، جو قید سے رہائی پا کر اور اس ملک کو چھوڑ کر آتے تھے، توقف کیا اور چونکہ نو مفتوحہ علاقوں درانگ اور ڈومرویہ وغیرہ کا بندوبست کرنا اور گوہائی کے نظم و نسق کو جو آسامیوں کے ایامِ تصرف میں پُر اختلال ہو گیا تھا، پھر درست کرنا اور پیم نارائن کو بھی اس کی دوبارہ فساد انگریزی کے سبب سزا دینا ضروری تھا اور برسات کا موسم قریب آ گیا تھا، اس لئے میر جُملہ کچھ فوج اپنے ساتھ لے کر اور باقی فوج و لشکر دلیر خاں کے زیر کمان لکھو گڑھ میں چھوڑ کر اٹھائیسویں جمادی الآخر کو گوہائی کی طرف چل پڑا اور یہاں سے غرہ رجب کو آسام کی نئی سرحد کے ملاحظہ کیلئے دامنِ کوہ کے راستہ سے کوچ کیا۔ چونکہ جنگل بہت گھنا تھا تین چار منزل لشکر نے بڑی تکلیف اٹھائی۔ چہارم رجب کو دریائے کلنگ سے اتر کر قلعہ کجلی کے نیچے ڈیرہ کیا اور اس جگہ درانگ اور ڈومیرد کے راجاؤں کو، جنہوں نے اس مہم میں

اچھی خدمتیں کی تھیں، مناسبِ حال عنایتوں سے سرفراز کیا۔

میر جُملہ کے امراض کی ترقی، فرنگی ڈاکٹروں کا علاج اور اس کا انتقال

مگر ان ایام میں میر جُملہ کو بسبب استعمال بعض دواؤں کے جو "اطبائے فرنگی" یعنی یورپین ڈاکٹروں نے دی تھیں اور صاحبِ عالمگیر نامہ کے خیال میں وہ حار تھیں (جیسا کہ ہمارے زمانہ میں بھی انگریزی دواؤں کی نسبت اکثر ہندوستانیوں کا یہی اعجوبہ خیال ہے) پہلی بیماریوں کے علاوہ ضیق النفس اور خفقان و قرحہ شش اور استسقا کے آثار پیدا ہو گئے۔ غرض کہ اسی حال میں تیرہویں رجب کو بگلی سے کوچ کر کے دریا پار قصبہ گوہائی کے محاذی موضع ناندو میں اتر پڑا اور بادشاہ کے حکم کے موافق رشید خاں کو سرکار نام روپ کا فوجدار مقرر کیا اور ضروری امور کا بندوبست مناسب کر کے چھبیسویں کو موضع ناندو سے کشتی میں بیٹھ کر آخر تاریخ رجب کو بمقام بری تلا ریاست کوچ بہار کے راستے پر پہنچ کر باوجود شدت مرض کے پیم نرائن کی سزا دہی اور اس کا ملک چھیننے کے ارادہ سے اتر پڑا اور لشکر کے جمع ہو جانے کے انتظار میں جو پیچھے آتا تھا، اسی جگہ ٹھہرا رہا۔ مگر شدت امراض سے جب اس نے اپنے جاں بر ہونے کی امید نہ دیکھی تو ناچار عسکر خاں کو کوچ بہار کی تسخیر کے لئے مامور کر کے خضر پور کو کوچ کیا اور بدھ کے دن رمضان کی دوسری کو خضر پور سے دو کوس، اس دنیا ناپائیدار ہی سے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!!! اور جب یہ خبر بادشاہ کے پاس جبکہ وہ کشمیر کو جاتا تھا، لاہور میں پہنچی، اس کے بیٹے محمد امین خاں کو جو میر بخشی اور پانچ ہزاری، پانچ ہزار سوار کا امیر تھا، نہایت تسلی دے کر بہت سی شاہانہ عنایتوں سے سرفراز کیا۔ فقط

حاشیہ متعلق صفحہ نمبر ۱۹۷

پرتگیزوں کا ہندوستان میں آنا اور اُن کا عروج و زوال

صفحہ ۱۹۷ میں ہم لکھ آئے ہیں کہ اس کتاب کے مترجم انگریزی مسٹر اروِنگ براک نے پرتگیزوں کے ہندوستان میں آنے اور ممالکِ مشرقیہ میں ان کے عروج و زوال کا حال ایک دلچسپ حاشیہ میں تفصیل سے لکھا ہے جس کو خفیف تغیرو تبدل کے ساتھ ہم اس جلد کے خاتمہ میں لگائیں گے۔ چنانچہ وہ اس طرح پر ہے کہ:

"ہندوستان کی دولتمندی کی شہرت اور یہاں کے گرم مصالحوں کی افراط اور سوتی مہین کپڑوں کی عمدگی نے مدتہائے دراز سے یورپ کی اکثر قوموں کو اس ملک کے ساتھ اپنا کاروبار تجارت جاری کرنے کے لئے نہایت بے چین کر رکھا تھا لیکن خشکی کے راستہ کی مشکلات اور سمندر کی راہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے سب لاچار تھے مگر آخر کار جب پرتگال کے بادشاہ جان دوم نے، جو نہایت ذی ہوش شخص تھا، عملدرآمد سابق کے برخلاف اپنے پائے تخت لزبن کو جو دریائے ٹیگس کے کنارے آباد ہے ایک ایسی بندرگاہ قرار دیا کہ جس میں ہر طرف کے جہاز بغیر کسی طرح کی روک ٹوک کے آنے لگے اور اسی کی اعانت اور حسنِ توجہ سے بذریعہ علم ہیئت سمندر میں سفر کرنے کا نیا طریق جاری ہوا تو پرتگیزوں نے پہلے کیپ کا راستہ نکالا جو ممالکِ افریقہ کے انتہائے جنوب کی طرف واقع ہے۔ مگر یہ لوگ ان تکلیفوں کے باعث جو یہاں تک پہنچنے میں طوفان کی شدت سے ان کو اٹھانی پڑی تھیں، اس کو کیپ آف سٹارم یعنی راس الطوفان کہنے لگ گئے تھے اور آگے بڑھنے سے کسی قدر جھجکتے تھے۔ لیکن اس بادشاہ نے جس کے دوربین خیال میں یہ امر یقینی تھا کہ وہاں سے ہندوستان کا راستہ ضرور ملے گا، اس نا مبارک اور ہمت شکن نام کا بدل دینا مناسب سمجھ کر اس کا نام کیپ آف گڈ ہوپ یعنی راس نیک امید رکھ دیا اور اس کے بعد جب لمانوایل تخت نشین ہوا تو وہ بھی شاہ جان کی اسی تدبیر کی پیروی میں مصروف

رہا۔ چنانچہ آٹھویں جولائی ۱۴۹۷ء کو ایسے چھوٹے چار جہازوں کا بیڑا جن میں صرف ایک سو ساٹھ آدمی سوار تھے، زیر حکم واسکوڈی گاما ہندوستان کے راستہ کی تلاش کے لئے پھر روانہ کیا گیا۔ یہ باہمت سردار اول کیپ آف گڈ ہوپ پہنچا اور پھر اس سے آگے ایسے سمندروں کو طے کرتا ہوا جن کو پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا، دس مہینے نو دن کے ایک پُر صعوبت اور طولانی سفر کے بعد سترہویں مئی بروز جمعہ ۱۴۹۸ء کو ساحل ملابار پر آپہنچا اور جس کام کے لئے یہ اولوالعزم لوگ ساٹھ برس سے جانیں کھپا رہے تھے آخر کار ان کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔ اس وقت ہندوستان کا ملک دہلی کے علاوہ جنوب و مغرب کی طرف مختلف فرماں رواؤں میں منقسم تھا اور ان کے ماتحت اور چھوٹے چھوٹے راجا اور باجگذار رئیس حکمران تھے۔ ان میں سے کالی کٹ کا فرمانروا، جس کا لقب زیمورن (۱۶۸) (سامری) تھا ساحلوں اور بندرگاہوں پر سب سے زیادہ حکومت اور اقتدار رکھتا تھا اور ملابار کا تمام ملک اسی کے زیر فرمان تھا۔ جب واسکوڈی گامانے سنا کہ کالی کٹ ایک بڑا تجارتی بندر ہے تو وہ اسی دیس کا ایک جہازی رہنما بہم پہنچا کر کالی کٹ میں پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے یہاں تونس کا رہنے والا ایک مسلمان شخص ایسا مل گیا جو پرتگیزی زبان سے واقف اور ان سے میل جول اور انس و محبت کو پسند کرتا تھا۔ اس شخص کے ذریعہ سے واسکوڈی گامانے سامری کے دربار میں باریابی حاصل کر کے اپنے بادشاہ کی طرف سے دو متحد المضمون نامے جو ایک پرتگالی میں اور دوسرا عربی میں تھا، پیش کئے اور یہ درخواست کی کہ دوستی اور تجارت کا ایک عہد نامہ بادشاہ پرتگال اور سامری کے باہم ہو جائے۔

یہ عہد نامہ ہو جانے ہی کو تھا کہ وہاں کے مسلمان تاجروں نے جو پرتگیزوں کی اولوالعزمی اور مستعدی سے خائف تھے، سامری کے دل میں کچھ شکوک ڈال دیئے اور ان کی باتوں نے ایسی تاثیر کی کہ اس کے اور واسکوڈی گاما کے باہم سخت ان بن ہو گئی۔ یہاں تک کہ چند ہی روز پہلے جن لوگوں کی اس نے بہت کچھ خاطر اور عزت کی تھی انہی کے قتل کے درپے ہو گیا۔

واسکوڈی گاما یہاں کا نقشہ بگڑا ہوا اور ناقابل اصلاح دیکھ کر چل دیا اور جاتے ہوئے سامری کو یہ کہلا بھیجا کہ مسلمان سوداگروں کے بہکانے سے تم نے ہم کو چور اور بے عزت تو سمجھا ہے مگر یاد رکھو کہ عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ پرتگیز کون اور کیسے ہیں اور اس کی رعایا کے چند لوگوں کو بھی جو باہمی ان بن کی حالت میں پکڑ لئے تھے اپنے

بادشاہ اور اہلِ وطن کے دکھانے کے لئے ساتھ ہی لیتا گیا اور اگرچہ سامُری کے چند جہازوں نے کچھ دور تک اس کا تعاقب بھی کیا مگر بادِ مراد کی مدد سے وہ صحیح و سلامت نکل گیا اور دو برس دو مہینے کے بعد ایک سو ساٹھ ہمراہیوں میں سے صرف پچاس آدمیوں کو زندہ لے کر بماہ ستمبر ۱۴۹۹ء اپنے وطن میں واپس پہنچ گیا۔

جب یہ لوگ دارالسلطنت میں پہنچے تو اہلِ شہر نے یہ خیال کر کے کہ اب تمام دنیا کی نہایت پُر منفعت تجارت ہمارے قابو میں آنے والی ہے، بے حد خوشیاں منائیں اور واسکوڈی گاما کو اس کارگزاری کے صلہ میں بادشاہ نے ایک بھاری پنشن اور بڑے بڑے خطاب عنایت کئے۔

رومن کیتھلک فرقہ کے پیشوائے اعظم پوپ آف روم نے جو ہمیشہ اسی تاک میں رہا کرتے ہیں کہ عامہ خلائق کے دلوں میں اس خیال کو جمائے رکھیں کہ روئے زمین پر پوپ کی سی عظمت اور اقتدار کسی کا نہیں، بقول مشہور "آب از دریا بخشیدن"! پر عمل کر کے اپنی طرف سے بھی ان اپنے مریدوں کو یہ عطیہ مرحمت کیا کہ مشرقی ملکوں میں جتنے ساحل اور بندرگاہیں تم دریافت کرلو وہ سب ہم نے تمہی کو بخشیں!!

اس کامیابی سے امانوئیل ایسا مسرور ہوا کہ اپنے القابِ شاہی میں ایسے الفاظ اضافہ کئے کہ شاہ پرتگال' اتھوپیا' عرب' فارس اور ہند کے سواحل و جزائر کی فتوحات اور جہازرانی کا بھی مالک ہے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد تیرہ جہاز بارہ سو آدمیوں کی جمعیت سے زیرِ حکم ال ورلیس کابریل نویں مارچ ۱۵۰۰ء کو روانہ ہو کر پھر کالی کٹ میں آئے۔ اگرچہ ان کے آنے پر سامُری کی طرف سے بھی کچھ بد سلوکی نہ ہوئی اور کابریل نے بھی ان شخصوں کو، جنہیں واسکوڈی گاما پکڑ کر لے گیا تھا، واپس لاکر چھوڑ دیا اور ان قیدیوں نے اس حسن سلوک اور رعایتوں کی بھی جو پرتگیزوں نے اپنے وطن میں ان سے برتی تھیں، نہایت تعریف و توصیف کی' لیکن سامُری کے دل کے شبہات ایک مدتِ دراز کے بعد رفع ہوئے۔ مگر چونکہ وہی عرب (۱۲۹) یا افریقی تاجر جو سامُری اور واسکوڈی گاما کے باہم ان بن کا باعث ہوئے تھے، اس کے راج میں زیادہ اعتبار رکھتے تھے، ان کے بہکانے سے اب یہ ایک اور نئی حرکت ہوئی کہ شہر کے لوگوں نے پچاس پرتگیزوں کو مار ڈالا۔ اس کے انتقام میں کابریل نے عربوں کے کل جہازوں کو جو بندرگاہ میں موجود تھے، جلادیا اور شہر پر بھی خوب گولے مارے اور وہاں سے کوچین کو ہوتا ہوا کانانور کو چلا گیا اور ان دونوں شہروں

کے راجاؤں نے اس کو بہت سے گرم مصالحے اور روپیہ اشرفیاں نذر کیں اور سامری کے برخلاف جس کے وہ باجگذار تھے، اس سے دوستی اور اتفاق کا عہد و پیمان کرنا چاہا اور قرب و جوار کے اور کئی راجاؤں نے بھی یہی درخواست کی۔ ان سب کو یہ ہوس تھی کہ اس طرح سامری کی اطاعت سے آزاد ہو جائیں گے اور اپنے اپنے ملکوں کی حدود کو بڑھا لیں گے۔ چنانچہ ان کی اس دیوانگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ملک ملابار پر پرتگیزوں کو اس قدر اقتدار حاصل ہو گیا کہ جہاں وہ پہنچتے تھے وہاں کے فرمانروا ہو جاتے تھے اور کسی راجہ سے جب تک وہ ان تین باتوں کو قبول نہ کرے اتفاق باہمی کا عہد و پیمان نہ کرتے تھے۔

اول۔ یہ کہ ہم دربارِ لزبن کے تابعدار اور مطیع الحکم ہیں۔

دوسرے۔ یہ کہ پرتگیز اس کی ریاست گاہ میں ایک قلعہ بنالیں۔

تیسرے۔ یہ کہ پرتگیز جو اجناسِ تجارت خریدیں، اس کی قیمت کی تشخیص اور کسی ایسی تکرار و نزاع کا فیصلہ وہ اپنی ہی رائے سے کرلیں۔

اس کے علاوہ سب غیر ملکی تاجروں پر یہ امر لازم کیا گیا کہ جب تک پرتگیز خرید مال سے فارغ ہو کر اس کو اپنے جہازوں پر نہ چڑھالیں وہ سب لوگ مال کی خرید اور روانگی سے رکے رہیں اور ان کے اجازت نامہ اور سندِ راہداری کے بغیر کوئی شخص سمندر کے سفر کا مجاز نہ تھا۔ اگرچہ پرتگیزوں کو چندبار لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں لیکن اس سے ان کی تجارت میں چنداں خلل نہ پڑا بلکہ انہوں نے اپنے تھوڑے سے سپاہیوں کے ساتھ بڑی بڑی فوجوں کو شکستیں دیں اور چند ہی سال میں اس قدر اقتدار پالیا کہ ان کی مقبوضہ بندرگاہوں میں سامری یا اس کے باجگذار راجاؤں کے یا عرب وغیرہ سوداگروں کے جہاز بالکل نہیں جا سکتے تھے۔

اسی عرصہ میں جب القانسو البیوکرک شاہِ پرتگال کی طرف سے وائسرائے سے مقرر ہو کر آیا تو براہِ دوراندیشی اس کی یہ رائے ہوئی کہ ہندوستان میں ٹھہرنے کے لئے کوئی ایسی جگہ قرار دینی چاہئے جس کو دشمن کے حملہ سے بآسانی بچا سکیں اور وہ ایک اچھی بندرگاہ بھی ہو اور آب و ہوا بھی عمدہ ہو تاکہ نووارد پرتگیز دور دراز بحری سفروں کے بعد وہاں آرام لے سکیں۔ چنانچہ ان صفتوں کے باعث سے اس نے اپنے خیال میں جزیرہ گوا جو کنہڑ کی حدود میں واقع ہے، تاکا۔ اگرچہ اس وقت گوا ایسا نامی مقام نہ تھا جیسا کہ آج کل ہے، لیکن پھر بھی وہاں کی بندرگاہ ان اطراف میں ہر طرح سے مفید اور بہتر سمجھی جاتی

تھی۔ ان دنوں میں یہ مقام فرمانروائے دکن (یعنی خاندان بہمنیہ) کے راج میں تھا۔ لیکن یوسف عادل خاں جو اس کی طرف سے وہاں کا صوبہ دار تھا خود سر ہو کر ملابار تک اپنی حکومت پھیلانے میں کوشش کر رہا تھا اور جبکہ یہ غاصب ملک گیری کے منصوبوں میں کسی طرف مصروف تھا تو البیوکرک نے میدان خالی دیکھ کر ٹموجی نامی اپنے ایک دوست کے مشورہ سے جو کھنڈ کے علاقہ میں دریائے غارتگری کے ذریعہ سے بہت زبردست ہو گیا تھا، ۱۵۱۰ء میں گوا پر ناگہاں حملہ کیا اور شہر کو لے لیا۔ اس واقعہ کے باعث عادل خاں گوا کو واپس آیا اور پرتگیز جو ابھی مستحکم طور سے پاؤں نہ جما چکے تھے، ناچار شہر چھوڑ کر جہازوں پر جا چڑھے۔ لیکن اس سے تھوڑے عرصہ بعد جو عادل خاں کو وجے نگر کے راجہ سے لڑنے کو جانا پڑا تو البیوکرک نے اپنے اسی یار کی امداد سے پھر ایک چھاپا مارا اور گوا پر قابض ہو بیٹھا اور مورچہ بندی کر کے اور حصار وغیرہ بنا کر اس کو خوب مستحکم کر لیا اور کالی کٹ کا بندر جو کسی کام کا نہ تھا وہاں کی دولت مندی اور تجارت سب گوا میں سمٹ آئی۔ اور اسی دن سے پرتگیزوں کے مقبوضات واقعہ ہند کے لئے شہر گوا اب بہ منزلہ پائے تخت کے ہو گیا اور رفتہ رفتہ جب پرتگیزوں کی حکومت خلیج فارس اور بحر عرب اور ساحل ملابار میں بخوبی قائم ہو گئی تو انہوں نے ایشیا کے اور مشرقی ملکوں کی طرف رخ کیا اور اس مہم میں البیوکرک نے سب سے پہلے جزیرہ سراندیپ کو مسخر کیا۔ اگر پرتگیز دور بینی اور عاقبت اندیشی کو کام میں لاتے تو ان کے لئے یہ زیادہ مفید تھا کہ اپنی تمام قوت اور طاقت کو اسی جزیرہ میں قائم کر لیتے۔ کیونکہ اول تو یہاں کے بندر ہندوستان کی تمام بندرگاہوں سے بہتر تھے دوسرے یہ جزیرہ مشرقی ملکوں کے وسط میں تھا اور تمام دولتمند ملکوں کے راستے ادھر ہی سے تھے اور اس کی سب بندرگاہیں اس طور کی تھیں کہ وہاں سے جنگی جہاز ایشیا کے تمام ملکوں پر دباؤ ڈالنے اور خوف قائم رکھنے کو بآسانی بھیجے جا سکتے تھے اور خود اس کی بندرگاہوں کی حفاظت و حراست تھوڑی ہی فوج سے بخوبی ہو سکتی تھی۔ مگر نائب السلطنت مذکور نے ان فوائد کا کچھ خیال نہ کیا بلکہ ساحل کارومنڈل پر قابض ہو جانے میں بھی فروگزاشت ہی کی اور اگرچہ یہاں سے وہ عمدہ اور نہایت لطیف اور مہین سوتی کپڑے بہم پہنچ سکتے تھے جو دنیا بھر میں بے مثل گنے جاتے تھے اور بنگالہ اور اور ممالک کی تجارت کے لئے یہ مقام قدرتی طور پر نہایت مفید اور موقع کا تھا مگر باوجود اس کے بھی کوئی اچھی جگہ اس ساحل پر قائم نہ کی۔ حتیٰ کہ مقامات سنٹ تھامس اور ناگ پٹن بھی ایک مدت کے بعد قائم کئے۔ اس نے یہ خیال کر لیا

تھا کہ درحالیکہ ہم جزیرہ سراندیپ کے مالک ہو گئے ہیں (جن کی فتوحات کو وائسرائے سابق دی المیدا نے شروع کیا تھا) اگر ملک ملاکا بھی ہمارے قبضہ میں آجائے تو پھر ساحل کارومنڈل کی تمام تجارت خود ہی ہمارے قابو میں آجائے گی پس اس وجہ سے اس نے ملاکا ہی کو مقدم سمجھ کر اسی کی طرف عزیمت کی۔ یہ ملک جس کا دارالحکومت شہر ملاکا ہے، طول میں تین سو میل کے قریب اور عرض میں بہت تنگ سا ہے۔ اس کے شمال کی طرف خشکی میں تو سیام کا ملک ہے اور باقی تین طرف سمندر ہے۔ چونکہ ملاکا اپنے موقع کے لحاظ سے ہندوستان کے تمام تجارتی مقاموں میں سب سے بہتر منڈی ہے اور پُرتگیزوں کو اس بات کی بڑی آرزو تھی کہ مشرقی ملکوں کی سب طرح کی تجارت میں، جس طرح بنے، سہیم و شریک ہو جائیں، اس لئے یہ لوگ اس ملک میں پہلے پہل صرف تجارت ہی کے لباس میں نمودار ہوئے۔ چونکہ ان کی دست درازیوں نے، جو وہ ہندوستان میں کرتے آئے تھے، ان کی تدبیروں کو بہت شبہ خیز کر دیا تھا اس لئے اہلِ ملاکا ان کے آنے سے بہت ڈرے اور باہم تجویز کر کے بہت سے تو مار ڈالے اور باقی ماندہ قید کر لئے۔ اگرچہ البیوکرک کو ملاکا پر حملہ کرنے کے لئے پہلے بھی کسی حیلہ بہانہ کی حاجت نہ تھی مگر اب تو خود بخود ایک جائز سبیل نکل آئی۔ اس واقعہ کے باعث اہلِ ملاکا کو بھی یہی خیال تھا کہ کسی نہ کسی دن البیوکرک یکایک آن پڑے گا۔ اس لئے وہ بھی لڑائی کے لئے ہر طرح تیاری کئے بیٹھے تھے۔ چنانچہ اوائل 1511ء میں جو البیوکرک ملاکا کے سامنے نمودار ہوا تو ان کو مقابلے کے لئے مستعد اور تیار پایا۔ پُرتگیزوں نے شہر پر حملہ کیا اور کئی بار سخت اور خونریز لڑائیاں ہوئیں مگر آخر کار شہر چھین لیا گیا اور بے شمار مال و دولت اور سامانِ حرب و ضرب پُرتگیزوں کے ہاتھ آیا اور قبضہ قائم رکھنے کے لئے ایک قلعہ تعمیر کیا گیا لیکن البیوکرک نے زیادہ دست اندازی مناسب نہ جان کر صرف شہر ملاکا ہی پر اکتفا کیا۔ سیام اور پیگو کے بادشاہوں اور قرب و جوار کے رئیسوں نے پُرتگیزوں کی اس فتح سے جو ان کے استقلال اور آزادی کے لئے ازبس مضر تھی خائف ہو کر البیوکرک کی خدمت میں مبارک باد کے لئے سفیر بھیجے اور درخواست کی کہ ہمارے اور شاہِ پُرتگال کے باہم دوستی اور اتفاق کا عہد و پیمان ہو جائے اور یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ آپ ہمارے ملک میں کاروبارِ تجارت جاری کریں۔

جب شہر ملاکا میں پُرتگیز اپنے قدم جما چکے اور قرب و جوار کے رئیسوں پر بھی اپنا رعب داب بخوبی بٹھا لیا تو البیوکرک نے اپنے بیڑے میں سے چند جنگی جہاز جزائر متعلقہ

ملاکا کی تسخیر وغیرہ کے لئے روانہ کئے۔

یہ ٹاپو بطور ایک مجموعہ جزائر کے ہیں اور ان کے باشندے پشت ہا پشت سے ساگودانہ اور ناریل کے دودھ پر گزران کیا کرتے تھے۔ مگر اتفاقاً کسی طوفان وغیرہ کے حادثہ کے باعث سے جو ایک چینی جہاز وہاں آگیا تو پہلے پہل انہی کی بدولت لونگ اور جائپھل نے ،جو اِن جزائر میں بکثرت تھے، دنیا میں مشہور ہونا شروع کیا۔ چنانچہ اس سے تھوڑے ہی عرصہ بعد یہ مصالحے ہندوستان میں عموماً پسند اور مرغوب طبع ہو گئے اور پھر ہند سے ایران اور یورپ میں جا پہنچے۔ اہلِ عرب جو اس زمانہ میں تقریباً تمام دنیا کی تجارت پر قابض تھے ،بھلا اس پُر منفعت سوداگری پر ان کی آنکھ کیونکر نہ پڑتی، چنانچہ عربی تاجروں کے قافلے کے قافلے ان جزیروں میں جو پیداوار کی جہت سے مشہور ہیں آکر دخیل ہو گئے اور تب سے اب تک یہاں کے مصالحوں کی تجارت انہی کے ہاتھوں میں تھی کہ یکایک یہ پُرتگالی جو کسی جگہ ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے یہاں بھی آن پہنچے اور اس تجارت کو ان سے چھین لیا اور اس وقت سے شاہانِ پرتگال نے ان جزیروں کو اپنے متعلق سمجھنا شروع کیا اور حقیقتاً چند روز بعد انہی کے ہو بھی گئے۔

البیوکرک نے ۱۵۱۵ء میں بمقام گوا انتقال کیا اور لوپز سواریز اُس کا جانشین مقرر ہوا۔ یہ شخص بھی تدابیر ملک گیری اور حدودِ سلطنت کے بڑھانے میں اپنے جانشین سابق ہی کا مقلد تھا۔ مگر کچھ عرصہ تک اس کو اُن مزاحمتوں کی روک تھام کی تدبیروں میں مصروف رہنا پڑا جو ہندوستان میں پرتگیزوں کے مقابلہ کے لئے قریب الوقوع تھیں۔ لیکن ان تفکرات سے چھوٹتے ہی اس نے چین کا راستہ معلوم کرنے کا عزم مصمم کیا۔

ملاکا میں البیوکرک کے عمل و دخل کرنے سے پہلے ملک چین اور وہاں کے لوگوں کے حالات یورپ میں کسی کو معلوم نہ تھے کیونکہ یورپ سے اب تک صرف مارکوپولو نامی، شہر وینس واقع اٹلی کا رہنے والا ایک مشہور سیاح خشکی کے راستہ وہاں گیا تھا اور اس نے اس ملک کے کچھ کچھ حالات لکھے تھے جس کو لوگوں نے باور نہ کرکے محض واہیات اور افسانہ سمجھا ہوا تھا مگر جب البیوکرک ملاکا میں چین کے بعض جہازی سوداگروں سے ملا اور اس نے اس عظیم الشان سلطنت کی وسعت و فسحت وغیرہ کے حالات معلوم کئے اور ان کو قلمبند کر کے یورپ کو بھیجا تب البتہ مارکوپولو کے بیان سے مطابق پاکر یورپ کے لوگوں نے بھی اس سیاح کی روایتوں کی تصدیق کی۔ چنانچہ ۱۵۱۸ء میں پائے تخت لزبن سے تھامس

پیریز نامی ایک سفیر جس کے ساتھ چند جنگی جہاز تھے چین کو روانہ ہوا۔ جب یہ جہاز سفیر کو لے کر ان جزیروں کے قریب پہنچے جو کانٹن کے آس پاس ہیں تو ان کو چینی جہازوں نے آن گھیرا۔ فرڈی نینڈ اینڈراڈا نے جو پرتگالی جہازوں کا سردار تھا از راہ دانائی چینیوں کو اپنے جہازوں پر آنے کی اجازت دی اور اپنے آنے کا مدعا بیان کر کے طامس پیریز کو کنارہ پر اتار دیا اور چینی اس کو اپنے ملک کے پائے تخت شہر پیکن میں لے گئے۔ وہاں پہنچ کر پیریز کو معلوم ہوا کہ چین کے اہلِ دربار پرتگیزوں کے ساتھ رعایت اور خاطر داری سے پیش آنا چاہتے ہیں۔ جس کا سبب اول تو ان کی وہ ناموری تھی جو تمام مشرقی ملکوں میں پہلے ہی پھیل رہی تھی اور اس کے علاوہ فرڈی نینڈ اینڈراڈا کے معقول طریقہ کارروائی نے پرتگیزوں کو اہلِ چین کی نظروں میں اور بھی بڑھا دیا تھا۔ اس وجہ سے چین کی بندرگاہوں میں پرتگیزوں کو تجارت کرنے کی اجازت ملنے ہی والی تھی اور طامس پیریز کے ساتھ عہد نامہ ہونے ہی والا تھا کہ اتنے میں فرڈی نینڈ اینڈراڈا کا بھائی سائی من اینڈراڈا کچھ اور جنگی جہاز لے کر آ گیا اور اہلِ چین سے وہی ناملائم حرکتیں کرنے لگا جو یہ لوگ تمام اہلِ مشرق کے ساتھ کچھ مدت سے کیا کرتے تھے اور بلا اجازت دربارِ چین کی، ایک قلعہ جزیرہ ٹمن میں تعمیر کر لیا اور وہاں ہو کر جو جہاز چین کی بندرگاہوں کو آتے جاتے تھے ان کے ساتھ جبر و تعدی اور لوٹ کھسوٹ کا عمل کرنے لگا اور بہت سے چینیوں کو پکڑ کر غلام بنا لیا اور نہایت بے باکی کے ساتھ دریائی قزاقی اختیار کی۔

اہلِ چین ان حرکتوں کو دیکھ کر سخت غضبناک ہو گئے اور ایک بڑا بیڑا جنگی جہازوں کا پرتگیزوں کی تنبیہ کے لئے مامور کیا۔ لیکن پرتگیز بغیر مقابلہ کئے بھاگ گئے اور فغفورِ چین نے تھامس پیریز کو جو پائے تخت میں موجود تھا قید کر لیا۔ چنانچہ قید ہی میں مر گیا۔

اس واقعہ کے باعث اگرچہ چند سال کے لئے پرتگیز چین کی حدود سے بالکل خارج ہو گئے تھے مگر اس کے بعد چینیوں نے پرتگیزوں کو بندرگاہ جان سین میں تجارت کرنے کی اجازت دے دی اور بعد ازیں یہ اتفاق پیش آیا کہ ایک بحری قزاق جو اپنی متواتر کامیابیوں سے نہایت زبردست ہو گیا تھا جزیرہ مکاؤ پر قابض ہو گیا اور وہاں سے چین کی بندرگاہوں کے راستے بند کر دیئے اور یہاں تک بڑھا کہ شہر کانٹن کو جا گھیرا۔ اس کی ان حرکتوں سے شرفا و امرا اور حکامِ چین اس قدر تنگ ہوئے کہ پرتگیزوں سے مدد چاہی۔ یہ لوگ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر کانٹن کے بچانے کے لئے دوڑ پڑے اور اس قزاق کو شکست

دے کر محاصرہ اٹھادیا۔ اس کے صلہ میں فغفور چین نے خوش ہو کر جزیرہ مکاؤ انہی کو بخش دیا اور ان لوگوں نے اس جزیرہ میں ایک شہر بسا لیا جو تھوڑی سی مدت میں خوب رونق پکڑ گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں جاپان کے ساتھ بھی ان کی تجارت جاری ہو گئی۔ ۱۵۴۲ء میں پرتگیزوں کا ایک جہاز شدتِ طوفان سے بہ کر جزائر جاپان میں جا پہنچا تھا۔ جاپانیوں نے ان کی بہت خاطر داری کی اور واپس آنے کے لئے جس جس چیز کی ضرورت تھی خوشی مہیا کر دی۔ جب یہ لوگ گوا میں پہنچے تو جاپان کے حالات جو کچھ دیکھے تھے سب اپنے نائب السلطنت سے بیان کئے اور کہا کہ ہم ایک ایسا ملک دیکھ آئے ہیں جو نہایت آباد اور دولتمند ہے اور ہمارے تاجروں کو وہاں آنے جانے سے بہت فائدہ ہوگا۔ یہ سنتے ہی پرتگالی سوداگر اور پادری جہازوں پر چڑھ روانہ ہو پڑے اور جا کر دیکھا کہ حقیقت میں ایک بڑی مملکت ہے جو شاید چین کے سوا دنیا کی اور سلطنتوں سے زیادہ قدیم ہے۔

الغرض جب پرتگیز جاپان میں پہنچے تو ان کے آنے سے سب لوگ خوش ہوئے اور عموماً اپنی بندرگاہوں میں تجارت کی اجازت دے دی اور تمام چھوٹے چھوٹے فرمانروا رئیسوں نے اپنے اپنے علاقوں میں انہیں درخواست کر کر بلایا اور سب کو ایک ایسی ریس پیدا ہوئی کہ ہر ایک رئیس یہی چاہتا تھا کہ سب سے بڑھ کر ان کی خاطر و مدارات کرے اور ان کو فائدہ پہنچائے اور بڑے بڑے حقوق عطا کرنے میں دوسروں سے سبقت لے جائے۔ یہ دیکھ کر پرتگیزوں نے بھی تجارت کا بڑا ٹھاٹھ پھیلایا۔ چنانچہ ہندوستان کا مال جاپان کو لے جاتے تھے اور یورپی چیزیں ذخیرہ کے طور پر مکاؤ میں جمع کر کے بموقع مناسب ادھر ادھر بھیجتے رہتے تھے۔ چنانچہ انواع واقسام کی ایشیائی اور یورپی چیزیں فرمانروائے جاپان اور وہاں کے رؤسا اور شرفا اور عام خلائق کے صرف میں آنے لگیں۔ اور جاپان میں تو ایسی جنسیں کہاں تھی کہ اس کے معاوضہ میں پرتگیزوں کو دیتے کیونکہ جاپان اکثر کوہستانی اور سنگلاخ اور کم زراعت ملک ہے۔ اس میں کوئی چیز وساور کے لائق پیدا نہیں ہوتی اور اگر اس ملک میں سونے اور چاندی اور تانبے کی کانیں بھی نہ ہوتیں جو شاید تمام دنیا کی کانوں سے بہتر ہیں تو ملک کی آمدنی سے سلطنت کا خرچ بھی پورا نہ ہوتا۔ یہاں کی معدنی پیداوار میں سے یہ لوگ ہر سال بقدر چھ کروڑ روپیہ کے حاصل کر کے لے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس ملک کے اچھے اچھے گھرانوں میں شادیاں کر کے اس طرح پر وہاں کے امرا اور ذی اقتدار خاندانوں سے قرابتیں پیدا کر لی تھیں۔ پس بلحاظ ایسے ایسے فواید کے اگر پرتگیز لوگ ذرا

قناعت کا طریق اختیار کرتے تو مناسب تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں سواحل ملک نئی اور جزائر عرب اور خلیج فارس اور تمام سواحل ہند ہر طرح ان کے قابو میں تھے اور جزائر ملاکا اور سرانڈیپ اور سندا میں تو خاص ان کی حکومت ہی تھی اور جزیرہ مکاؤ میں ان کے قیام کے باعث سے تجارت چین اور جاپان بھی گویا انہی کے ہاتھوں میں تھی اور ان سب ممالک اور سواحل وسیعہ میں انہی کی مرضی اور منشا بمنزلہ قانون اور حکم ناطق کے تھا اور کسی قوم کو اتنی جرأت نہ تھی کہ بغیر ان کی اجازت کے بحری سفر کر سکے اور بہت سی اجناس تجارت جن کے ذریعہ سے اکثر قومیں نہایت دولتمند ہو گئی ہیں وہ بالکل انہی کے اختیار میں تھیں اور اس اختیار اور انحصار تجارت کے باعث سے یورپ کی مصنوعات اور ممالک ایشیا کی پیداواروں کا نرخ صرف انہی کی مرضی سے گھٹتا اور بڑھتا تھا۔ علاوہ بریں پرتگیزوں نے اس حصہ افریقہ کی حکومت کو بھی حاصل کئے بدون نہ چھوڑا تھا جو مابین کیپ آف گڈ ہوپ اور جزائر مصر کے ہے۔ ان اطراف میں ایک مدت سے اہل عرب قابض اور سلطنت پذیر ہو گئے تھے اور انہوں نے ساحل زنجبار پر چھوٹی چھوٹی چند خود سر ریاستیں قائم کر لی تھیں جن کی رونق اور تمول ان سونے اور چاندی کی کانوں کے سبب سے تھا جو ان ریاستوں میں موجود تھیں۔ چنانچہ اسی دولت کے لالچ سے پرتگیزوں نے ۱۵۰۹ء میں ان کو مغلوب اور تباہ کر کے اپنے لئے ایک نئی سلطنت جو سفالہ سے صیلندا تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کا وسط دارالحکومت جزیرہ موزمبیق کو مقرر کیا تھا قائم کر لی تھی۔ پس یہ کامیابیاں اور فتوحات اگر معقول اصلاحوں سے محفوظ رکھی جاتیں تو ممکن تھا کہ ایسی سلطنت بن جاتی جس کا زوال و انتقال مشکل ہوتا۔ لیکن پرتگیز سرداروں کی بداعمالی اور حماقت اور دولت و حکومت کی ناقدرشناسی کی وجہ سے ان لوگوں کی چال ڈھال شروع ہی سے ایسی بے قید تھی کہ واسکوڈی گاما، کابریل، ڈی المیڈا وغیرہ نے ایسی عجیب طرح کی بے رحمیاں کیں کہ جن کو شائستگی اور انسانیت کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ کہنا چاہئے۔ ہندو مسلمان وغیرہ ایشیائی لوگوں کے بے وجہ لوٹ لینے اور غلام بنانے میں کچھ بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ سفاکی، بے دردی اور دہشت یہاں تک ان کے خمیر میں تھی کہ بے گناہ قیدیوں، مظلوم عورتوں اور معصوم بچوں کو بھی ان کی تلوار اور آگ سے پناہ نہیں ملی۔ بے چاری ہندوستانی عورتوں سے سولی زینتن کے اس برتاؤ میں بھی دریغ نہ تھا کہ کرسچن بنا کر فوج میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ چنانچہ خود البوکرک جیسے نامور شخص کے عہد کی (جو حقیقتاً ان کے سرداروں میں سب سے بہتر تھا) کیا ہی لطیف روایت چلی آتی ہے

کہ گوا کی آبادی کی تدابیر کے منجملہ ایک دفعہ یہ تدبیر بھی کی گئی کہ بہت سی عورتیں اچھے برے خاندانوں کی جو ہندی میں آئی تھیں، ان کی نسبت پادری صاحب کو یہ خدمت سپرد ہوئی کہ کرسچین بنا کر پرتگیزوں سے ان کے جوڑے ملا دیں چونکہ پادری صاحب کو جوڑے ملاتے ملاتے رات ہوگئی اور حسن اتفاق سے روشنی بھی بجھ گئی تو ہجوم اجنبیت کے باعث سے یہ تمیز نہ رہی کہ کون سی عورت کس مرد کے نکاح میں آچلی ہے۔ پہلے تو پادری صاحب اس مسئلہ کے حل کرنے میں چکرائے مگر آخر کار یہ فیصلہ کر دیا کہ اس دردسر میں پڑنے کی کون سی ضرورت ہے جو عورت جس مرد کے ہاتھ لگ جائے وہ اس کی سمجھی جائے! اور چونکہ یہ لوگ مشرقی سمندروں کے بالکل مالک و مختار تھے ہر ایک ملک کے جہازوں سے جبراً خراج لیتے اور سواحل بحر پر غارت گری کرتے تھے اور امرا اور رئیسوں کو بے عزت کرتے تھے۔ آخر انہی کرتوتوں کے باعث تھوڑے ہی عرصہ میں تمام قوموں کی نظروں میں کھٹکنے اور دشمن شمار ہونے لگے اور جس وقت شاہ فلپ دوئم کے عہد میں اس قوم کی حکومت کا تنزل یورپ میں شروع ہوا تو جو پرتگیز ہندوستان میں تھے انہوں نے اپنے پرتگال جانے کا خیال چھوڑ دیا۔ چنانچہ بعض تو خود سر بن بیٹھے اور بعض نے دریائی غارت گری ایسی بے دھڑک اختیار کر لی کہ کسی قوم کے جہاز کا بھی لحاظ نہ کرتے تھے اور بہت سے پرتگیز ہندوستانی راجاؤں اور امیروں کے ملازم ہو گئے یہاں تک کہ اکثر سپہ سالاری اور وزارت تک پہنچ گئے کیونکہ اب تک بھی ان کی قابلیت اور لیاقتوں کا اثر لوگوں کے ذہنوں پر باقی تھا اور ہندوستان میں جو علاقے ان کے مقبوضہ تھے وہ ایسے علیحدہ علیحدہ حصوں میں منقسم ہو گئے کہ ایک کو دوسرا بالکل مدد نہ دیتا تھا بلکہ حسد اور عداوت کے مارے ایک دوسرے کی تدبیروں میں مزاحم اور معترض ہوتے تھے اور یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ ان کے سرداروں اور فوج میں آئین اور قاعدہ کی کوئی پابندی باقی نہ رہی تھی اور نہ اطاعت اور فرماں پذیری اور نہ شوق حفظ نام و ننگ۔ بلکہ بجائے ان باتوں کے اکثر عیش و عشرت اور فسق و فجور میں منہمک اور مستغرق رہ کر تضیع اوقات کرتے تھے اور اگلی شان و شوکت بالکل رخصت ہو چلی تھی کہ اتنے میں ڈچ لوگ جب ۱۶۰۲ء میں سپین کی حکومت سے آزاد ہوئے تو وہ بھی ہندوستان پہنچے اور پرتگیزوں سے اقتدار حکومت چھین لینے کے لئے جنگ و جدال اور معرکہ آرائیاں کرنے لگے۔ یہاں تک کہ جزیرہ لنکا بھی چھین لیا اور ہندوستان کی تجارت اور بندرگاہوں میں سب جگہ انہی کا زور اور غلبہ ہو گیا۔ فقط!

مصنف کا عریضہ موسیو کول برٹ وزیر فرانس کے نام جس میں مفصلہ ذیل امور کا دلچسپ بیان ہے(۱۷۰)

ہندوستان کی وسعت' سونے چاندی کا اس ملک میں پہنچ کر یہیں کھپ جانا' ملک کی دولتمندی' سپاہ' انتظام عدالت' ایشیائی سلطنتوں کے زوال کے اصلی سبب۔

خداوند من

ممالک ایشیا میں امرا اور حکام کی خدمت میں کوئی شخص خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ چنانچہ شہنشاہ مغل کے (۱۷۱) دامن قبا کو بوسہ دینے کا اعزاز جب مجھ کو حاصل ہوا تو میں نے بھی نذر کے طور پر، جو تعظیم کی ایک علامت ہے، آٹھ روپیہ پیش لئے تھے اور ایک نائف کیس ایک کانٹا اور کہربا کے دستہ کا ایک قلم تراش فاضل خاں کی نذر کیا تھا کیونکہ یہ نامور شخص وزرائے سلطنت میں سے تھا۔ بڑے بڑے کام اس کے متعلق تھے اور طبیبوں کی ذیل میں میری تنخواہ کا تجویز کرنا اسی کی رائے پر منحصر تھا۔ اگرچہ میری یہ مجال نہیں ہے کہ فرانس میں کسی نئی رسم کو جاری کروں لیکن جبکہ میں ہندوستان سے مدت کے بعد ابھی واپس آیا ہوں تو یہ امر خلاف توقع ہے کہ میں اس دستور کو جس کا ذکر ابھی کر چکا ہوں ایسی جلدی سے بھول جاؤں۔ پس اگر میں اپنے بادشاہ کے حضور میں جس کا ادب میرے دل میں بہ نسبت اورنگ زیب کی تعظیم کے اور ہی قسم کا ہے یا اس کے وزیر کی خدمت میں جو فاضل

خاں کی نسبت بہت زیادہ ادب کا مستحق ہے، خیر ایک حقیر پیشکش کے جو پیش کرنے والے
کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنی ندرت کے اعتبار سے قابل قدر و قیمت ہے حاضر ہونے میں تامل
کروں تو مجھے امید ہے کہ معاف کیا جاؤں گا۔

ہندوستان کا گزشتہ انقلاب جو عجیب و غریب حادثوں پر مشتمل ہے ہمارے عظیم
الشان (۱۷۲) بادشاہ کی توجہ کے لائق ہے اور یہ عریضہ جس میں ایسی بڑی بڑی باتیں
مندرج ہیں اس کا ملاحظہ فرمانا اس رتبہ کے شایان ہے جو آپ کو دربار شاہی میں حاصل ہے
اور بے شک اس کا ایسے ہی شخص کی خدمت میں پیش کیا جانا زیبا تھا جس کی خوش تدبیری
سے سلطنت کے بہت سے صیغوں کا جو میرے جانے کے وقت ناقابل علاج حالت میں پڑے
ہوئے معلوم ہوتے تھے نہایت عمدہ طور پر انتظام ہو گیا ہے اور جس نے اپنی کوشش اور محنت
سے ہمارے بادشاہ کی شان و عظمت کو تمام عالم میں پھیلا دیا اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ قوم فرنچ
ان باتوں کو کس قابلیت سے عمل میں لاتی ہے جو اس کے فوائد اور نام آوری کی خاطر تجویز کی
جائیں۔

خداوند من

میں ہندوستان سے بارہ برس کے بعد واپس آیا ہوں اور میں وہیں تھا کہ فرانس کی
خوشحالی اور اس نیک نامی کی شہرت بخوبی سن لی تھی جو آپ نے اپنی غیر منقطع توجہ اور نمایاں
قابلیتوں سے اس کو ترقی دینے میں حاصل کی ہے۔ اگرچہ فرانس کی خوشحالی اور آپ کی نیک
نامی کا دلچسپ مضمون میں بڑے شوق و رغبت سے لکھتا لیکن تمام عالم جن باتوں کا پہلے ہی
معترف اور مداح ہو وہ میرے بیان کی محتاج نہیں ہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ اپنے وعدے
موافق صرف وہی غیر معلوم اور نئی باتیں لکھ کر نذر کروں جن سے ہندوستان کی واقعی
حالت کا نقشہ کسی قدر آپ کے خیال عالی میں آسکے اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی زیادہ تر اس کو
پسند فرمائیں گے۔

ہندوستان کی وسعت کا بیان

ممالک ایشیا کے نقشوں سے ظاہر ہے کہ سلطنت مغلیہ جو سلطنت ہند کے نام سے
مشہور ہے کیسا لمبا چوڑا ملک ہے۔ اگرچہ میں نے قواعد مساحت کے موافق صحیح طور پر پیمائش
نہیں کی لیکن ایک معمولی منزل کی مسافت کا اندازہ کر کے اور یہ دیکھ کر کہ گولکنڈے کی

سرحد سے غزنی بلکہ اس سے بھی پرے قندھار کے قریب تک جو سلطنت ایران کا پہلا شہر ہے، تین مہینے کا سفر ہے۔ یہ حساب لگایا گیا ہے کہ ان دونوں مقاموں میں ڈیڑھ ہزار میل سے کم فاصلہ نہیں ہے۔ یعنی جس قدر پیرس اور لائینس میں فاصلہ ہے اس سے پانچ گنا سمجھنا چاہئے۔

ہندوستان کی قدرتی اور مصنوعی چیزیں

یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ اس ملک کا ایک بڑا حصہ نہایت زرخیز ہے۔ مثلاً ایک بنگالہ ہی ایسا ہے جو نہ صرف باعتبار گیہوں اور چاول وغیرہ اشیائے مایحتاج کی پیداوار کے مصر سے افضل ہے بلکہ بلحاظ ریشم، روئی اور نیل وغیرہ بے شمار تجارتی جنسوں کی پیدائش کے بھی جو مصر میں پیدا نہیں ہوتیں اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کے سوا ہندوستان کے اور حصے بھی خوب آباد ہیں اور زراعت بھی خاصی ہوتی ہے اور اگرچہ یہاں کے اہل حرفہ بالطبع کاہل ہیں مگر تاہم کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ مثلاً قالین، کمخواب، چکن، کارچوبی اور زردوزی وغیرہ کے کام اور اور قسم کی ریشمی اور سوتی چیزیں جو ملک کے اندر برتی جاتی یا باہر بھیجی جاتی ہیں بناتے رہتے ہیں۔

غیر ملکوں سے سونے چاندی کے ہندوستان میں آنے اور یہیں کھپ جانے کا سبب

یہ امر بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ سونا چاندی دنیا میں پھر پھرا کر جب ہندوستان میں پہنچتا ہے تو یہیں کھپ جاتا ہے۔ چنانچہ امریکہ سے جو روپیہ آکر یورپ کے ملکوں میں پھیلتا ہے اس میں سے کسی قدر تو ان چیزوں کے مبادلہ میں جو ٹرکی (روم) سے آتی ہیں مختلف ذریعوں سے ٹرکی میں چلا جاتا ہے اور کسی قدر بندرگاہ سمرنا کے راستے سے ایران میں پہنچ جاتا ہے جہاں سے ریشم یورپ میں آتا ہے۔ اب ٹرکی کا یہ حال ہے کہ وہاں کے لوگ قہوہ کے بغیر نہیں رہ سکتے جو یمن سے آتا ہے اور ٹرکی اور یمن اور ایران تینوں کو ہندوستان کی چیزوں کی احتیاج رہتی ہے۔ پس اس طرح بندر مخا میں جو بحر احمر کے کنارے باب المندب کے قریب ہے اور بصرہ میں جو خلیج فارس کے سرے پر ہے اور بندر عباس میں جو جزیرہ ہرمز کے نزدیک ہے ان ملکوں سے روپیہ آتا ہے اور یہاں سے ان جہازوں کے ذریعہ سے جو

ہر سال ہوائے موافق کے موسم میں ہندوستان کا مال لے کر ان مشہور بندرگاہوں میں آتے ہیں ہندوستان میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ہندوستانیوں ڈچوں انگریزوں اور پرتگیزوں کے تمام جہاز جو ہر سال ہندوستان کا مال پیگو تناسرم (دھناسری) سیام سیلون اچین مکاسر جزائر مالدیپ موزمبیق وغیرہ مقامات کو لے جاتے ہیں وہ بھی اس کے مبادلہ میں سونا چاندی ہی لاتے ہیں اور یہ بھی اس روپیہ کی طرح جو بندر مخا بصرہ اور بندر عباس سے آتا ہے یہیں رہ جاتا ہے اور جو سونا چاندی ڈچ لوگ جاپان کی کانوں سے نکالتے ہیں اس میں سے بھی تھوڑا بہت کسی نہ کسی وقت یہاں آ رہتا ہے اور جو روپیہ براہ راست فرانس اور پرتگال سے آتا ہے وہ بھی شاذ و نادر ہی یہاں سے پھر باہر جاتا ہے کیونکہ اس کے عوض بھی مال واسباب ہی دیا جاتا ہے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ ہندوستان کو تانبا لونگ جائفل دار چینی وغیرہ چیزوں اور ہاتھیوں کی ضرورت رہتی ہے کہ جن کو ڈچ یورپ جاپان ملاکا اور سیلون سے لاتے ہیں اور سیسہ بھی باہر ہی سے آتا ہے جس میں سے تھوڑا سا انگلستان سے انگریز بھیجتے ہیں اور فرانس سے بانات اور اور چیزیں آتی ہیں اور غیر ملک کے گھوڑوں کی بھی احتیاج رہتی ہے جو ہر سال ۲۵ پچیس ہزار سے زیادہ ملک ازبک (ترکستان) سے اور بہت سے قندھار کے راستے ایران سے اور بندر مخا اور بصرہ اور بندر عباس کی راہ سے ایتھوپیا (حبش) اور عرب اور فارس سے آتے ہیں۔ اسی طرح بہت سا تر و خشک میوہ سمرقند بلخ بخارا اور ایران سے آتا ہے مثلاً سردے سیب ناشپاتی اور انگور جو کثرت سے دہلی میں خرچ ہوتے ہیں اور جاڑے بھر بڑی قیمت پر بکتے رہتے ہیں اور بادام پستہ خندق زرد آلو خوبانی کشمش وغیرہ جو بارہ مہینے ملتے ہیں۔ اسی طرح کوڑیاں جزائرہ مالدیپ سے آتی ہیں جو بنگالہ اور اور مقامات میں بجائے پیسے دھیلے وغیرہ کم قیمت سکوں کے مستعمل ہیں اور عنبر جزائر مالدیپ اور موزمبیق سے آتا ہے اور گینڈے کے سینگ اور ہاتھی دانت اور غلام ایتھوپیا سے اور مشک اور چینی کے برتن چین سے اور موتی بحرین اور توتی کارن سے جو سیلون کے نزدیک ہے، آتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے ان چیزوں کے بدلے سونا چاندی نہیں جاتا کیونکہ جو سوداگر یہ جنسیں لاتے ہیں وہ اس میں زیادہ فائدہ سمجھتے ہیں کہ ان کے مبادلہ میں یہاں کی جنسیں ہی اپنے ملک کو لے جائیں۔ پس اگرچہ ہندوستان میں غیر ملکوں سے قدرتی یا مصنوعی چیزیں آتی ہیں مگر وہ دنیا بھر کے سونے یا چاندی کے ایک بڑے حصہ کی جو بہت سے ذریعوں سے یہاں آتا ہے یہیں رہ جانے کی مزاحم نہیں ہیں

اور پھر وہ مشکل ہی یہاں سے کہیں کو واپس جاتا ہے۔

شہنشاہ مغل کی دولت مندی کے ذریعوں اور اس کے مخالف امور کا ذکر

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جب کوئی امیر یا منصب دار چھوٹا یا بڑا مرتا ہے تو اس کی جائیداد سرکار بادشاہی میں ضبط ہو جاتی ہے اور اس سے بڑھ کر یہ امر ہے کہ ہندوستان کی تمام زمین، مکانات اور باغات کے سوا جن کے فروخت وغیرہ کی اجازت بعض اوقات رعایا و دے دی جاتی ہے، بادشاہ کی ملکیت ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس تمام بیان سے میں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگرچہ سونے چاندی کی کانیں یہاں نہیں ہیں مگر تاہم سونا چاندی یہاں کثرت سے ہے اور یہ کہ شہنشاہ مغل جو اس ملک کے ایک بڑے حصہ کا مالک ہے اس کا محاصل بے شمار اور وہ نہایت ہی دولت مند ہے۔ لیکن باوجود اس کے بہت سے ایسے اسباب مخالف بھی ہیں جو بالموازنہ اس کی دولت مندی کے نقصان کے باعث ہیں۔ مثلاً ملک کے بہت سے وسیع حصے جن سے ہندوستان کی شہنشاہی مرکب ہے، خشک پہاڑوں اور ریت کے بیابانوں سے کچھ ہی اچھے ہیں۔ طریق زراعت بھی خراب ہے اور آبادی بھی بہت ہی کم ہے اور قابل زراعت زمین کا ایک بڑا حصہ کاشتکاروں کی قلت کی وجہ سے جو اکثر حکام کی بدسلوکی سے تباہ اور برباد ہو جاتے ہیں، خالی پڑا رہتا ہے۔ چنانچہ یہ بے چارے غریب آدمی جب اپنے سخت گیر اور لالچی حاکموں کی خواہشوں کو پورا نہیں کر سکتے تو نہ صرف ان کے رزق کا ذریعہ ہی چھین لیا جاتا ہے بلکہ ان کے بال بچے بھی پکڑ کر لونڈی غلام بنا لئے جاتے ہیں اور یہ بے چارے اپنا گھر بار چھوڑ کر کسی قدر آرام سے دن کاٹنے کے لئے شہروں یا لشکر گاہوں میں چلے جاتے اور حمالی، سقائی یا سائیسی وغیرہ کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں اور بعضے کسی راجہ کے علاقہ میں جہاں یہ ظلم و ستم کسی قدر کم دکھائی دیتا ہے (۱۷۳) اور یہاں کی نسبت کچھ آرام ملتا ہے بھاگ جاتے ہیں اور اس سلطنت میں بہت سی قومیں ایسی بھی آباد ہیں جن پر بادشاہ کی کامل حکومت نہیں ہے اور اکثر ان میں سے ایسی ہیں جن کا رئیس خود انہی میں کا ایک شخص ہے اور صرف اس وقت خراج ادا کرتے ہیں جبکہ سلطنت کی طرف سے کچھ زور ڈالا جاتا ہے اور ان میں سے اکثر تو بہت تھوڑا خراج دیتے ہیں اور بعض کچھ بھی نہیں دیتے اور بعض ایسے ہیں کہ دینا تو کیا الٹا کچھ لیتے رہتے ہیں مثلاً وہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں جو سرحد ایران پر ہیں شاذ و نادر ہی ایران یا ہندوستان کو کچھ خراج دیتی ہیں۔ ایسا ہی حال بلوچستان اور پہاڑی

قوموں کا ہے جو شہنشاہ مغل کو بجز قدر قلیل کچھ نہیں دیتیں اور اپنے آپ کو قریب خود سر اور آزاد کے سمجھتی ہیں اور ان کی خود سری اور آزادی اس سے ثابت ہے کہ شہنشاہ مغل نے جب قندھار کے محاصرہ کی غرض سے کابل جانے کے لئے مقام اٹک سے کوچ کیا (جو دریائے سندھ کے کنارے آباد ہے) تو ان قوموں نے پہاڑوں سے پانی کا ان میدانوں میں پہنچنا بند کر دیا جو شاہراہ کے متصل تھے اور جب تک بادشاہ سے انعام حاصل نہ کر لیا جو خیرات کے نام سے عنایت کیا گیا تھا فوج کا آگے کو بڑھنا اس طرح پر بالکل روکے رکھا۔ پٹھان لوگ بھی بڑے سرکش ہیں اور یہ وہ مسلمان قوم ہے جو پہلے بنگالہ (۴۷۱) کی جانب گنگا کے کنارے آباد تھی اور مغلوں کے ہندوستان پر حملہ کرنے سے پہلے اکثر مقامات میں ان کو بہت قوت حاصل تھی اور بالتخصیص دہلی (۵۷۱) میں تو بہت ہی زور تھا اور اس کے قرب وجوار کے بہت سے راجہ ان کے خراج گزار تھے۔ اس قوم کے ادنیٰ شخص یہاں تک کہ ایسے لوگ بھی جو سقائی کر کے گزران کرتے ہیں دلیر اور سپاہی منش ہیں اور جب کسی بات کی صداقت پر زور دینا چاہتے ہیں تو ان کا یہ معمولی مقولہ ہے کہ "اگر میں جھوٹ کہتا ہوں تو دہلی کا تخت مجھے نصیب نہ ہو"۔ یہ ہندو اور مغل دونوں کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے پہلے رتبہ اور اقتدار کو یاد کر کے مغلوں سے (جنہوں نے ان کے بزرگوں کو ان کی بڑی بڑی ریاستوں سے بے دخل کر دیا اور دہلی اور آگرہ سے دور پہاڑوں کی جانب نکال دیا) سخت نفرت رکھتے ہیں اور ان میں سے اگرچہ بعض بعض پہاڑوں میں چھوٹے چھوٹے رئیس بن بیٹھے ہیں مگر کچھ زیادہ طاقتور نہیں ہیں۔

شاہ بیجاپور بھی کچھ خراج نہیں دیتا بلکہ اپنے ملک کے بچانے کے لئے شہنشاہ ہندوستان سے ہمیشہ لڑتا رہتا ہے۔ لیکن اس کے ملک کی حفاظت کا ذریعہ صرف اس کی فوج ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سی خاص حالتیں ہیں۔ مثلاً اس کا ملک آگرہ اور دہلی سے جو شہنشاہ مغل کے دارالسلطنت ہیں بہت فاصلہ پر ہے اور شہر بیجاپور بذات خود بھی ایک مستحکم مقام ہے اور قرب وجوار کے ملک میں گھاس اور پانی کی کمیابی اور خرابی کی وجہ سے حملہ آور فوج کو آسانی کے ساتھ وہاں تک پہنچنا دشوار ہے اور بہت سے راجہ خود اپنے بچاؤ کی خاطر غنیم کے حملہ کے وقت اپنی اپنی فوجیں لے کر اس کی مدد کو آجاتے ہیں۔ چنانچہ تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ سیواجی نامی ایک مشہور شخص نے خاص شاہی عملداری میں گھس کر بندر سورت کو جو دولت مندی کے لحاظ سے ایک مشہور جگہ ہے خوب لوٹا اور جلایا۔ اور یہ چال چل کر

بیجاپور کو عین ضرورت کے وقت بادشاہی فوجوں کے زور اور غلبہ سے بچالیا۔

ان باتوں کے علاوہ شاہ گولکنڈا بھی جو ایک دولتمند اور طاقتور بادشاہ ہے مخفی طور پر اس کو روپیہ پیسے سے مدد دیتا رہتا ہے اور سرحد پر ہمیشہ اس غرض سے فوج متعین رکھتا ہے کہ ایک تو اپنے ملک کی حفاظت کرے اور دوسرے اگر بیجاپور پر زیادہ زور پڑے تو اس کو بھی مدد دے سکے۔ الغرض جو لوگ شہنشاہ مغل کو کچھ خراج نہیں دیتے ان میں سو سے زیادہ اچھے طاقتور ہندو راجہ بھی شامل ہیں جن کی ریاستیں دہلی اور آگرہ سے کوئی دور کوئی نزدیک تمام سلطنت کے اندر جابجا پھیلی ہوئی ہیں اور ان میں سے پندرہ یا سولہ تو بہت ہی دولتمند اور زبردست ہیں۔ خصوصاً رانائے اودے پور (جو کسی وقت ان راجاؤں کا شہنشاہ خیال کیا جاتا تھا اور جس کو راجہ پورس (۱۷۶) کی نسل سے بتاتے ہیں) اور جے سنگھ اور جسونت سنگھ ایسے ہیں کہ اگر یہ تینوں اتفاق کرلیں تو شہنشاہ کے لئے بے شک خطرناک ثابت ہوں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک بیس ہزار سوار لڑائی کے لئے ہر وقت مہیا کر سکتا ہے اور وہ بھی ایسے عمدہ کہ ہندوستان میں کوئی ان کے مقابلہ کا نہیں ہے۔ یہ سوار راجپوت کہلاتے ہیں جس کے معنی ہیں راجاؤں کی اولاد۔ سپاہ گری ان کا آبائی پیشہ ہے اور اس شرط پر ان کو جاگیریں ملتی ہیں کہ ہمیشہ گھوڑے پر چڑھ کر راجہ کی رفاقت میں رہیں۔ یہ لوگ بڑے جفاکش ہیں اور اگر لڑائی کے فن کی تعلیم دی جائے تو نہایت ہی عمدہ سپاہی بن سکتے ہیں۔ یہ بات بھی جتلانی ضرور ہے کہ شہنشاہ مغل مسلمانوں کے "سنی" فرقہ میں سے ہے اور جیسے کہ ترک لوگ ہیں جو پیغمبر اسلام کا سچا خلیفہ عثمان کو جانتے اور عثمانی (۱۷۷) کہلاتے ہیں۔ مگر دربار کے امرا زیادہ تر ایرانی ہیں جن کا مذہب شیعہ ہے اور اس امر کے معتقد ہیں کہ برحق خلیفہ علی تھے۔ ان باتوں کے سوا شہنشاہ مغل اس ملک میں اجنبی ہے۔ کیونکہ وہ تیمور کی نسل سے ہے جو ان مغلوں کا سردار تھا جو ممالک تاتار سے آئے تھے اور جس نے ۱۴۰۱ء میں ہندوستان کو تاخت و تاراج اور فتح کیا تھا اور بدیں نظر وہ گویا دشمنوں کے ملک میں یا کم سے کم ایسے ملک میں جہاں ایک مغل بلکہ ایک مسلمان کے مقابلہ میں سینکڑوں ہندو موجود ہیں، سلطنت کرتا ہے۔ پس ایسی حالت میں کہ جہاں ایسے زبردست اور اندرونی دشمن موجود ہیں قوت قائم رکھنے اور سرحد پر ازبکوں اور ایرانیوں کے حملوں کے روکنے کو مستعد رہنے کے لئے اس کو صلح کے زمانہ میں بھی ایک بڑی فوج تیار رکھنی پڑتی ہے جس میں یا تو اس ملک کے باشندے بھرتی ہیں جیسے راجپوت اور پٹھان یا اصل مغل اور وہ لوگ جو اگرچہ مغل نہیں ہیں اور اسی

وجہ سے ان کی ویسی قدر بھی نہیں ہے۔ مگر پردیسی اور مسلمان اور گورے رنگ کے ہونے کی وجہ سے مغل ہی کہلاتے ہیں۔ لیکن زمانہ سابق کے موافق امراء دربار اب اکثر اصل مغل نہیں ہیں۔ یا تو ازبک (ترکستانی)' ایرانی' عرب' ترک (رومی) وغیرہ لوگوں کا مجموعہ ہیں یا ان سب قسم کے لوگوں کی ہندوستان زا اولاد میں سے ہیں۔ مگر ان سب اقسام کے لوگوں کو ایک عام لقب کے طور پر مغل ہی کہا جاتا ہے۔ مگر ہاں مجھے اس بات کا بیان کر دینا بھی مناسب ہے کہ مذکورہ بالا اقسام کے نووارد مسلمانوں کی اولاد کے لوگ جو تیسری چوتھی پشت میں گندمی رنگ اور ہندوستانیوں کے سے کاہل مزاج ہو جاتے ہیں ان کی قدر تازہ وارد لوگوں کی سی نہیں کی جاتی اور ان کو شاذ و نادر ہی کوئی عہدہ دیا جاتا ہے اور وہ اس کو اپنی خوش طالعی سمجھتے ہیں کہ کہیں سواروں یا پیدلوں میں نوکری مل جائے۔

شہنشاہ مغل کی فوجی قوت

خداوندِ من۔ اب اس بات کا موقع ہے کہ میں شہنشاہ مغل کی سپاہ کا خاص طور سے کچھ ذکر کروں تاکہ آپ بلحاظ ان اخراجاتِ کثیر کے جو اس کو فوج کی بابت کرنے پڑتے ہیں اپنی رائے قائم کر سکیں کہ آیا حقیقتاً اس کی فوج کس قدر ہے اور وہ کن لوگوں میں سے بھرتی کی جاتی ہے۔ پس پہلے میں اس دیسی فوج کا ذکر کرتا ہوں جس کی تنخواہ کا ادا کرتے رہنا بادشاہ پر واجبات سے ہے۔

واضح ہو کہ جے سنگھ' جسونت سنگھ اور دیگر راجہ جن کو بڑی بڑی رقمیں اس غرض سے ملتی ہیں کہ اپنے ہم قوم راجپوتوں کی ایک خاص تعداد شاہی خدمات کے لئے ہمیشہ تیار رکھیں' ان کی فوجیں اسی ذیل میں ہیں اور ان سے خواہ اس فوج میں کام لیا جائے جو ہمیشہ حاضر رکاب رہتی ہے خواہ کسی صوبہ میں مگر منصب مسلمان امرا کے برابر ہیں اور جن قاعدوں کی پابندی ان پر واجب ہے ان پر بھی واجب ہے۔ یہاں تک کہ اپنی جمعیت کے ساتھ معمولی چوکی دینے کو حاضر ہوتے ہیں۔ مگر اتنا فرق بے شک ہے کہ جب کبھی بادشاہ قلعہ میں ہوتا ہے تو یہ باہر اپنے خیموں ہی میں رہ کر نوکری بجالاتے ہیں اور چوبیس گھنٹے تک قلعہ کی دیواروں کے اندر محصور رہنے کو گوارا نہیں کر سکتے اور جب تک کہ ان کے جانباز راجپوت سپاہی ساتھ نہ ہوں کسی قلعہ کے اندر جانا قبول نہیں کرتے۔ راجپوتوں کی جانبازیوں کا امتحان ایسے موقعوں پر بخوبی ہو چکا ہے جبکہ کسی راجہ کی نسبت یہ ارادہ کیا گیا کہ

فریب سے قید کیا جائے۔

راجپوت راجاؤں کے فوج میں بھرتی کئے جانے کے سبب

بادشاہ جو ان راجاؤں کو اپنی ملازمت میں رکھتا ہے اس کے کئی سبب ہیں۔ اول یہ کہ راجپوت نہ صرف عمدہ سپاہی ہیں بلکہ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں بعض راجہ ایک روز میں بیس ہزار سپاہی لڑائی کے لئے حاضر کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جو راجہ بادشاہی ملازم نہیں ہیں اور خراج دینے یا ضرورت کے وقت جنگی خدمات کے بجالانے کے عوض خود مقابلہ کو تیار ہو جاتے ہیں ان کی مزاحمت اور تنبیہہ و تادیب کا کام ان سے لیا جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ شہنشاہ مغل کی یہ پالیسی ہے کہ ان راجاؤں کے باہم نااتفاقی اور حسد و رشک قائم رہے۔ چنانچہ جب چاہتا ہے کسی ایک کی نسبت اپنی مہربانی و التفات کا اظہار کر کے ان میں لڑائی کرا دیتا ہے۔ چوتھے یہ کہ راجپوت لوگ پٹھانوں یا کسی باغی امیر یا صوبہ دار کے دبانے کے لئے کار آمد ہوتے ہیں اور اس کام کے لئے ہمیشہ مستعد اور تیار ملتے ہیں۔ پانچویں یہ کہ جب کبھی گولکنڈے کا بادشاہ خراج ادا نہیں کرتا یا شاہ بیجاپور یا اپنے کسی اور ہمسایہ راجہ کی مدد کو، جس کو شہنشاہ مغل مطیع کرنا چاہتا ہے، تیار ہو جاتا ہے تو اس کے مقابلہ کے لئے ان راجاؤں کو اور امرا پر جو اکثر ایرانی اور بادشاہ گولکنڈہ کے ہم مذہب ہیں، ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ یہ راجہ اس وقت کام آتے ہیں جبکہ شاہ ایران سے لڑائی کا موقع آن پڑتا ہے اور امراء دربار جو ایران کے رہنے والے ہیں جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا اس خیال سے کانپتے ہیں کہ اپنے اصلی بادشاہ سے لڑیں۔ خصوصاً وہ اس کو اولاد علی (۱۷۸) اور اپنا امام اور خلیفہ ماننے کی وجہ سے اس کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھانے کو نہایت گناہ سمجھتے ہیں۔

پٹھانوں کو فوج کے ملازم رکھنے کا سبب

اور جن خیالات سے راجپوتوں کی فوج رکھی جاتی ہے اسی قسم کی وجوہات سے شہنشاہ مغل کو پٹھانوں کی بھی ایک فوج موجود رکھنی پڑتی ہے۔

ولایت زا، یا سپاہ مغلیہ کا بیان

اب ولایت زا سپاہ مغلیہ کا (جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں) تیار رکھنا بھی ایسا ہی ضروری

ہے اور چونکہ سلطنت کی اصل فوج یہی سپاہ ہے اور اس پر بڑا روپیہ صرف ہوتا ہے۔ پس امید ہے کہ آپ کے نزدیک بھی اس کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جانا بے موقع نہ ہوگا۔ اس فوج میں سوار بھی ہیں اور پیادے بھی اور اس کے دو حصے خیال کئے جا سکتے ہیں جن میں سے ایک تو ہمیشہ حاضر رکاب اور دوسرا مختلف صوبوں میں متعین رہتا ہے۔ فوج حاضر رکاب میں سے میں پہلے امرا پھر منصب دار پھر روزینہ دار اور سب سے اخیر میں معمولی سواروں کا ذکر کر کے اس کے بعد فوج پیادہ اور اس کے ضمن میں بندوقچیوں اور تمام پیدل سپاہیوں کا جو دونوں قسم کے توپخانوں میں کام دیتے ہیں بیان کرتا ہوں۔

دربار مغلیہ کے امیروں کے موروثی اور خاندانی امیر نہ ہونے کی وجہ

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ دربار مغلیہ کے امیر بھی امرائے فرانس کی طرح موروثی امیر ہیں۔ کیونکہ سلطنت کی تمام زمین بادشاہ کی ملکیت ہے اور اسی وجہ سے یہاں کوئی ایک خاندانی ریاست نہیں ہے جیسے کہ ہمارے کسی ڈیوک یا مارکوئیس کی ہوتی ہے اور نہ کوئی ایسا خاندان پایا جا سکتا ہے جو خود اپنی ملکیت کی زمین اور جائیداد جدی و خاندانی کی وجہ سے صاحب ثروت گنا جاتا ہو۔ اور اسی کی آمدنی سے اس کے اخراجات چلتے ہوں۔ بلکہ برعکس اس کے یہاں کے اہل دربار تو اکثر ایسے ہیں جن کے باپ تک بھی امیر نہ تھے اور چونکہ امرا کی کل جائیداد ان کے مرتے ہی ضبط سرکار ہو جاتی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ کسی خاندان کا اعزاز و امتیاز دیر تک کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ بلکہ اکثر تو امیر کے مرتے ہی سب کچھ نیست و نابود ہو جاتا ہے اور اس کے بیٹوں کی نہیں تو پوتوں کی حالت تو ضرور فقیروں کی سی ہو جاتی ہے اور عام لوگوں کی طرح کسی امیر کی فوج کے سواروں میں نوکری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مگر ہاں اتنی رعایت ضرور ہوتی ہے کہ جو امیر مر جاتا ہے جائیداد ضبط کر لینے کے بعد بادشاہ اس کی بیوہ کے لئے تو عموماً اور اہل خاندان کے لئے اکثر کسی قدر وظیفہ مقرر کر دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی امیر بڑی عمر پاتا ہے تو اپنے جیتے جی اپنی اولاد کے لئے بشرطیکہ بادشاہ کی مہربانی ہو کوئی منصب بھی حاصل کر سکتا ہے، خصوصاً اس حالت میں جبکہ وہ ڈیل ڈول اور چہرے مہرے کے اچھے اور رنگ کے بھی گورے چٹے ہوں، جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ وہ اصل مغل ہیں۔ لیکن اس شاہی عنایت کی صورت میں بھی بیٹا باپ کا جانشین نہیں ہو جاتا کیونکہ یہ معمولی قاعدہ ہے کہ چھوٹے اور قلیل تنخواہ کے منصب سے

بڑی ذمہ داری اور کثیر تنخواہ کے منصب تک رفتہ رفتہ اور بہت تدریج کے ساتھ ترقی ملتی ہے۔ اس لئے امرائے سلطنت ایسے مختلف الاقوام شخصوں کا مجموعہ ہیں جو ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی قسمت آزمائی کے لئے ممالک غیر سے یہاں آ جاتے ہیں اور اکثر کم نسلے بلکہ غلام اور بہ استثناء بعض خاص شخصوں کے عموماً علم سے بے بہرہ ہیں اور ان کا ادنیٰ سے اعلیٰ منصب پر پہنچا دینا یا بالکل ذلیل و خوار بنا دینا محض بادشاہ کی خوشی اور تلون طبع پر موقوف ہے۔

امرا کے مدارج اور تنخواہ وغیرہ کا ذکر

بعض امیروں کا منصب اور لقب ہزاری ہے یعنی ایک ہزار کا مالک اور بعض کا دو ہزاری اور بعض کا پانچ ہزاری اور بعض کا ہفت ہزاری۔ اور بعض کا دہ ہزاری اور کسی وقت کوئی امیر دوازدہ ہزاری بھی ہو جاتا ہے جیسا کہ شہنشاہ مغل کا بڑا بیٹا تھا۔ مگر ان کی تنخواہ کا اندازہ سواروں کے شمار پر نہیں ہے بلکہ بلحاظ گھوڑوں کی تعداد کے ہے اور عموماً ہر ایک سوار کو دو گھوڑے رکھنے کی اجازت ہے تاکہ نوکری میں حرج نہ ہو کیونکہ اس گرم ملک میں یہ ایک کہاوت ہے کہ ایک گھوڑے کا سوار لنگڑا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ امیروں کو فی الواقع دوازدہ ہزاری وغیرہ بڑے بڑے القابوں کے موافق اتنے ہی گھوڑے ضرور رکھنے پڑتے ہیں یا کہ یہ عظیم الشان لقب جو زودِ اعتقاد اور اجنبی لوگوں کے بہکانے اور دھوکا دینے کے لئے ایجاد کئے گئے ہیں۔ ٹھیک انہی کے موافق تنخواہ ملتی ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ بادشاہ خود مقرر کر دیتا ہے کہ ہر ایک امیر کو حقیقتاً کتنے گھوڑے رکھنے لازم ہیں اور کتنے رعایتاً معاف اور فرضی ہیں، جن کی تنخواہ اس کو ملتی رہے گی اور یہ فرضی سواروں کی تنخواہ ہی امیروں کی تنخواہ کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ مگر یہ لوگ ہر ایک سوار کی تنخواہ میں سے کچھ وضع کر کے اور ان گھوڑوں کی، جو حاضر رکھنے لازمی ہیں، جھوٹی فردیں پیش کر کے اپنی آمدنی اور بھی بڑھا لیتے ہیں جو اس طرح پر مل جل کر بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جبکہ خوش قسمتی سے تنخواہ کے عوض جاگیر مل جائے۔ چنانچہ میں ایک پانچ ہزاری امیر کے ماتحت ملازم تھا جس کے پاس جاگیر بھی نہ تھی اور صرف نقد تنخواہ خزانہ سے ملتی تھی۔ مگر اس پر بھی پانچ سو گھوڑوں کی تنخواہ وغیرہ کے ادا کرنے کے بعد جو اس کو حاضر رکھنے لازمی تھے پانچ ہزار کراون یعنی ساڑھے بارہ ہزار روپیہ ماہوار اس کی آمدنی تھی۔ مگر باوجود ان بڑی بڑی آمدنیوں کے میں نے یہ امیر دولت مند بہت کم دیکھے۔ بلکہ بہت مفلس اور نہایت

قرضدار ہیں اور یہ قرضداری اس وجہ سے نہیں ہے کہ اور ملکوں (۱۷۹) کے امیروں کی طرح کھانے کھلانے میں بہت کچھ خرچ کر دیتے ہیں بلکہ نہایت قیمتی پیشکش جو سالانہ جشنوں کے موقعوں پر بادشاہ کو دینے پڑتے ہیں اور ان کی عورتوں اور نوکر چاکروں کا ایک لشکر اور اونٹوں اور گھوڑوں کی کثرت اس کا باعث ہیں۔ (۱۸۰)

امرا کی تعداد اور ان کی سواری کے طریقہ کا ذکر

امرائے متعینہ صوبہ جات اور امرائے مامور با افواج اور امرائے حاضرین دربار بہت ہی ہیں مگر کچھ تعداد مقرر نہیں ہے اور میں معلوم نہیں کر سکا کہ سب کتنے ہیں۔ لیکن دربار میں پچیس یا تیس سے کم میں نے کبھی نہیں دیکھے۔ جو سب وہ بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اور جو گھوڑوں کی تعداد پر موقوف ہے جو ایک ہزار سے لے کر بارہ ہزار تک مقرر ہے انہی امرا کو افواج ماموره مہمات اور صوبہ جات اور دربار میں بڑے بڑے عہدے ملتے ہیں اور یہی لوگ ارکان سلطنت ہیں جیسے کہ وہ خود بھی کہتے ہیں اور دربار کی شان و شوکت انہی کے وجود سے قائم ہے اور یہ نہایت عمدہ پوشاک کے بغیر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتے اور کبھی ہاتھی اور کبھی گھوڑے پر اور اکثر پالکی میں سوار ہوتے ہیں جن کے ساتھ بہت سواروں کے علاوہ بہت سے نفر خدمتگار وغیرہ ہوتے ہیں جو سواری کے آگے آگے اور دونوں طرف پاپیادہ چلتے ہیں۔ جو نہ صرف راستہ میں سے لوگوں کو ہٹاتے ہیں بلکہ مور چھل ہلاتے اور گرد و غبار جھاڑتے اور خلال اور پیکدان اور پانی کی صراحی اور کبھی کبھی کوئی قصہ کہانی کی کتاب یا کاغذ لے کر ساتھ رہتے ہیں۔

امراء کے تسلیمات کے لئے حاضر ہونے اور چوکی دینے اور شاہی خاصہ میں سے کھانا عنایت ہونے کی کیفیت

ہر ایک امیر پر واجب ہے کہ ہر روز صبح کو دس گیارہ بجے جبکہ بادشاہ دربار میں عدالت کرنے کو بیٹھتا ہے اور پھر شام کو چھ بجے تسلیمات کے لئے حاضر ہو ورنہ سزا ملتی ہے اور ہر ایک کو اپنی اپنی باری پر قلعہ میں حاضر ہو کر ہفتہ وار ایک رات دن چوکی دینی پڑتی ہے۔ اس وقت یہ لوگ اپنا بستر اور قالین اور سامان ساتھ لاتے ہیں مگر کھانا شاہی خاصہ میں سے عنایت ہوتا ہے، جس کے لینے کے وقت ایک خاص رسم ادا کی جاتی ہے۔ یعنی کھڑے ہو کر

اور بادشاہ کے محل کی طرف رخ کر کے امیر تین دفعہ تسلیمات بجالاتا ہے یعنی اپنا ہاتھ اوّل زمین تک لے جاکر پھر ماتھے تک اٹھاتا ہے۔

بادشاہ کی سواری کے وقت امراء کے حاضر رکاب رہنے کا ذکر

جب کبھی بادشاہ پالکی یا ہاتھی یا تختِ رواں پر سوار ہو کر نکلتا ہے تو تمام امراء کو بجز ان کے جو بیمار یا ضعیف العمر یا کسی خاص کام کی وجہ سے معاف ہوں حاضر رکاب رہنا ضروری ہے۔ البتہ جب کبھی شہر کے قرب وجوار میں شکار کو یا کسی باغ کو یا نماز کے لئے مسجد کو جاتا ہے تو بعض اوقات جریدہ بھی چلا جاتا ہے۔ یعنی صرف وہی امراء ساتھ ہوتے ہیں جن کی اس روز چوکی ہوتی ہے اور دستور ہے کہ بادشاہ پر تو خواہ شکار میں ہو خواہ فوج کو ساتھ لے کر کسی مہم پر جائے، خواہ ایک شہر سے دوسرے شہر کو جاتا ہو، بخوبی سایہ ہوتا ہے۔ مگر امراء کو خواہ کیسی ہی دھوپ یا بارش کیوں نہ ہو اور گرد و غبار سے دم کیوں نہ گھٹا جائے عموماً گھوڑے پر چڑھ کر بغیر کسی طرح کے سایہ کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔

منصب داروں کی تنخواہ وغیرہ کا بیان

منصب دار ایک قسم کے سوار ہیں جو منصب کی تنخواہ پاتے ہیں اور وہ ایک خاص قسم کی بیش قرار اور عزت کی تنخواہ ہے اور اگرچہ امراء کی تنخواہ کے برابر نہیں ہے مگر معمولی سواروں سے بہت زیادہ ہے اور اسی وجہ سے یہ کم درجہ کے امراء میں شمار ہوتے ہیں اور انہی میں سے امراء منتخب کئے جاتے ہیں اور یہ بادشاہ کے سوا کسی کے ماتحت نہیں ہیں اور جو کام امراء سے لئے جاتے ہیں وہی ان سے لئے جاتے ہیں اور اگر ان کے پاس بھی کسی قدر سوار ہوں جیسا کہ پہلے دستور تھا تو یہ بھی امراء کے برابر ہو جائیں۔ مگر آج کل ان کے پاس صرف دو یا چار یا چھ گھوڑے ہوتے ہیں جن پر بادشاہی داغ لگا ہوا ہوتا ہے۔ ان کی تنخواہ بعض اوقات ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ ہوتی ہے اور سات سو روپیہ ماہوار سے زیادہ کبھی نہیں ہوتی۔ ان کی تعداد معین نہیں ہے لیکن امراء کی بہ نسبت بہت زیادہ ہیں اور ان کے سوا جو صوبوں میں یا افواج ماموره مہمات میں متعین ہیں میں نے دربار میں دو تین سو سے کم کبھی نہیں دیکھے (۱۸۱)۔

روزینہ داروں کی تنخواہ اور ان کی خدمات اور مندرس اسباب کا

حما بیچا جانا

روزینہ دار بھی ایک قسم کے سوار ہی ہیں جن کی تنخواہ روزمرہ مل جاتی ہے جیسا کہ خود لفظ روزینہ دار سے ظاہر ہے۔ مگر ان کی تنخواہ بیش قرار ہے اور بعض اوقات تو اکثر منصب داروں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ مگر یہ تنخواہ چونکہ خاص طور کی ہوتی ہے اس وجہ سے کچھ زیادہ عزت کی بات خیال نہیں کی جاتی اور منصب داروں کی طرح یہ لوگ "اجناس" یعنی ایسے قالین اور فرش فروش وغیرہ کے قیمتاً لینے پر بھی مجبور نہیں ہیں جو بادشاہی مکانوں میں استعمال میں آنے کے بعد مصبداروں کو حما لینے پڑتے ہیں اور بعض اوقات ایک غیر واجب قیمت اگادی جاتی ہے۔ ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور چھوٹے چھوٹے کام ان کے متعلق ہیں۔ چنانچہ ان میں سے بہت سے مُتصدی اور نائب مُتصدی ہیں اور بہت سے اس کام پر مامور ہیں کہ "برات" یعنی ان احکام پر جو روپیہ کے ادا کرنے کے باب میں صادر ہوتے ہیں سرکاری مہر اگائیں اور وہ ان احکام کے جلد جاری کردینے کی عوض بے دھڑک رشوتیں لیا کرتے ہیں۔

عام سواروں کی تنخواہ وغیرہ کا بیان

عام سوار امرا کے ماتحت کام دیتے ہیں اور دو قسم کے ہیں۔ ایک "دو اسپہ" جن کا بادشاہی خدمت کے واسطے حاضر رکھنا امراء پر لازم ہے اور جن کے گھوڑوں کی رانوں پر ان امیروں کے داغ لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ دوسرے "ایک اسپہ"۔ دو گھوڑوں والوں کی تنخواہ اور قدر بہ نسبت ایک گھوڑے والوں کے زیادہ ہے اور اگرچہ سرکار سے ایک اسپہ سوار کی بابت پچیس روپیہ ماہوار کے حساب سے تنخواہ ملتی ہے لیکن سواروں کو کم یا زیادہ دینا بہت کچھ امیر کی فیاضی پر موقوف ہے۔

پیدل سپاہیوں اور گولہ اندازوں کی تنخواہ وغیرہ کا ذکر

پیدل سپاہیوں کی تنخواہ سب قسم کے مذکورہ بالا تنخواہ داروں سے کم تر ہے اور منجملہ ان کے جو لوگ بندوقچی ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ تو اچھے خاصے آرام کے وقت میں بھی بہت ہی بد ہیئت معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً بندوق چلانے کو جب زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھتے ہیں اور اپنی بندوقوں کو لکڑی کے سہ پاؤں پر رکھ کر جو بندوق کے ساتھ لٹکتے رہتے ہیں!!

چلاتے ہیں تو ان کی یہ دھج دیکھنے کے قابل ہوتی ہے اور ماشاءاللہ اس احتیاط پر بھی یہ خوف لگا رہتا ہے کہ کہیں ہماری لمبی لمبی داڑھیاں اور آنکھیں نہ جل جائیں!!! یا کسی جن بھوت کے خلل سے ہماری بندوق نہ پھٹ جائے!!!

پیدل سپاہ میں کسی کی تنخواہ بیس روپیہ مہینہ ہے کسی کی پندرہ اور کسی کی دس۔ مگر گولہ اندازوں کی تنخواہ بہت زیادہ ہے۔ خصوصاً فرنگی گولہ اندازوں یعنی پرتگیزوں انگریزوں ڈچوں جرمنوں اور فرانسیسیوں کی جو گوا اور ڈچوں اور انگریزوں کی کمپنیوں کے کارخانوں میں سے بھاگ آتے ہیں۔ اول جب مغل توپ کے فن سے بہت کم واقف تھے تو اہل یورپ کی تنخواہ زیادہ تھی اور ان میں سے اب بھی کچھ لوگ باقی ہیں کہ جن کو دو سو روپیہ ماہوار ملتا ہے۔ مگر اب بادشاہ ان لوگوں کو مشکل سے نوکر رکھتا ہے اور تیس روپیہ سے زیادہ تنخواہ نہیں دیتا۔

توپ خانہ کا ذِکر

توپ خانہ دو قسم کا ہے۔ ایک بھاری، دوسرا ہلکا جس کو ہمرکاب توپخانہ کہتے ہیں۔ بھاری توپ خانہ کی بابت مجھے یاد ہے کہ جب بادشاہ بیماری کے بعد فوج سمیت لاہور کے راستہ سے گرمی کاٹنے کو کشمیر کو گیا تھا جس کو ہندوستان میں "کشمیر جنت نظیر" کہتے ہیں تو اس سفر میں زنبورکوں کے علاوہ جو دو تین سو چالاک اونٹوں پر اسی طور سے کسے ہوئے تھے جس طرح ہمارے چھوٹے جہازوں میں رہکلے بندھے رہتے ہیں اور جو وزن میں دو دو بندوقوں کے برابر تھے۔ ستر بھاری توپیں جو اکثر برنجی تھیں، ساتھ تھیں۔

بادشاہ کے سفر کشمیر کا حال میں کسی اور موقع پر بیان کروں گا اور یہ بھی لکھوں گا کہ اس لمبے سفر میں بادشاہ اکثر اپنا دل شکار میں کس کس طرح بہلاتا رہا یعنی کبھی شکاری پرندوں کو کلنگ وغیرہ جانوروں پر چھوڑا اور کبھی نیل گائے کا شکار کیا جو "ایلک" کی قسم کا جانور ہے اور کسی دن چیتوں سے ہرنوں کو پکڑوایا اور کبھی شیر کا شکار کھیلا جو بالتخصیص بادشاہی شکار ہے۔

ہمرکاب توپ خانہ جو لاہور اور کشمیر کے سفر میں ساتھ گیا تھا مجھ کو نہایت باقرینہ معلوم ہوتا تھا اور اس میں پچاس یا ساٹھ چھوٹی چھوٹی برنجی توپیں تھیں جو سب مضبوط اور خوبصورت رنگین تختوں پر چڑھی ہوئی تھیں جن کے ساتھ گولے بارود کے لئے

ایک آگے اور ایک پیچھے دو دو پیٹیاں تھیں اور ان پر سجاوٹ کے لئے مختلف وضع کی سرخ جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں دو دو عمدہ گھوڑے جتے تھے جن کو ایک ایک سوار ہانکتا تھا اور ایک تیسرا گھوڑا اور ایک اور سپاہی مدد کے واسطے ساتھ لئے رہتا تھا۔

بھاری توپ خانہ بادشاہ کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔ کیونکہ شکار کھیلنے یا پانی سے نزدیک رہنے کی غرض سے بادشاہ شاہراہ سے علیحدہ ہو کر چلتا تھا اور یہ توپیں ایسی بھاری تھیں کہ دشوار گزار راستوں یا کشتیوں کے پلوں پر سے جو شاہی لشکر کے عبور کے لئے بنائے گئے تھے گزر نہیں سکتی تھیں۔ لیکن ہلکا توپ خانہ ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ رہتا ہے اور اسی لئے اس کو ہمرکاب توپ خانہ کہتے ہیں اور جب بادشاہ علی الصباح کوچ کرتا ہے اور شکار گاہوں میں جو بادشاہ کے واسطے محفوظ رکھی ہوئی ہوتی ہیں اور جانوروں کے روکے رکھنے کے لئے جن کی ناکہ بندی بھی شکار کے وقت کی جاتی ہے، بندوق سے یا اور طرح شکار کھیلنا چاہتا ہے تو یہ توپ خانہ جس قدر جلد ممکن ہوتا ہے سیدھا اگلی منزل پر جہاں بادشاہ اور بڑے بڑے امراء کے خیمے پہلے سے لگے ہوئے ہوتے ہیں جا رہتا ہے اور خیام شاہی کے سامنے توپوں کی لائن لگا دی جاتی ہے اور جب بادشاہ خیمہ گاہ میں داخل ہوتا ہے تو اہل لشکر کی اطلاع کے لئے سلامی کی جاتی ہے۔

صوبوں کی فوج اور سواروں کی کل فوج کی تعداد کا ذکر

جو فوج صوبوں میں مامور رہتی ہے اس کی اور حاضر رکاب فوج کی حالت میں اس کے سوا اور کچھ فرق نہیں ہے کہ صوبوں کی فوج تعداد میں زیادہ ہے اور ہر ایک صوبہ میں امرا' منصبدار' روزینہ دار' معمولی سوار' پیادے اور توپخانہ موجود رہتا ہے۔ چنانچہ ایک صوبہ دکن ہی میں بیس پچیس اور بعض اوقات تیس ہزار سوار رہتے ہیں جو گولکنڈے کے طاقتور بادشاہ کے دھمکانے اور بادشاہ بیجاپور اور ان راجاؤں سے لڑنے کے لئے ضرورت سے کچھ زیادہ نہیں ہے جو باہمی بچاؤ کی خاطر اپنی اپنی فوجیں لے کر شاہ بیجاپور کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ صوبہ کابل میں جو فوج ہے اور جس کا، ایران' بلوچستان' افغانستان اور اور پہاڑی ملکوں کی مخالفانہ حرکات کی روک تھام کے لئے رہنا ضروری ہے، بارہ یا پندرہ ہزار سے کم نہیں ہو سکتی۔ صوبہ کشمیر میں چار ہزار سے زیادہ فوج ہے اور بنگالہ میں جہاں ہمیشہ لڑائی بھڑائی رہتی ہے بہت زیادہ فوج رہتی ہے اور چونکہ کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے کہ جس میں بلحاظ اس کی

وسعت اور خاص موقع کے کم یا زیادہ فوج کا رکھنا ضروری نہ ہو اس لئے کل فوج کی تعداد اس قدر ہے جس پر مشکل سے اعتبار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فوج پیادہ کو جو شمار میں کم ہے الگ رکھ کر اور گھوڑوں کی اس تعداد کو جو صرف نام کے لئے ہے اور جس کو سن کر ناواقف شخص دھوکہ کھا سکتا ہے چھوڑ کر میں اور دیگر واقف کار لوگ خیال کرتے ہیں کہ سوار جو بادشاہ کے ہمرکاب رہتے ہیں راجپوتوں اور پٹھانوں سمیت پینتیس یا چالیس ہزار ہوں گے۔ جو صوبوں کی فوج کے ساتھ مل کر دو لاکھ سے زیادہ ہوتے ہیں۔

پیدل فوج کی اصلی تعداد اور لوگوں کے غلط اندازہ کرنے کی وجہ

میں نے بیان کیا ہے کہ پیدل تھوڑے ہیں۔ چنانچہ میری دانست میں پیادہ فوج جو بادشاہ کے ہمرکاب رہتی ہے، بندوقچیوں اور توپ خانہ کے پیدل سپاہیوں اور دیگر لوگوں سے جو توپ خانہ سے متعلق ہیں، مل جل کر پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور اسی سے صوبوں کی فوج کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نہیں جانتا کہ بعض لوگ پیدل فوج کی تعداد کیوں بہت زیادہ بتاتے ہیں۔ شاید نفروں، خدمتگاروں، بھٹیاروں اور تمام اہل بازار کو جو ساتھ رہتے ہیں فوج ہی میں گن لیتے ہوں گے۔ اور واقعی اگر اس سب بھیڑ بھاڑ کو شامل کر لیا جائے تب تو صرف اسی لشکر کی تعداد جو بادشاہ کی ذات خاص کے ساتھ رہتا ہے خصوصاً جبکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ بادشاہ کا ارادہ کچھ مدت کے لئے تخت گاہ سے باہر رہنے کا ہے دو تین لاکھ پیادوں سے کم نہیں رہتی اور جب ان امور پر غور کیا جائے کہ کس قدر ڈیرے خیمے اور باورچی خانے اور اسباب اور ساز و سامان اور عورتیں عموماً لشکر کے ساتھ رہتی ہیں اور ان سب کے اٹھانے کے لئے کس قدر ہاتھی اونٹ بیل گھوڑے اور حمال ضروری ہیں تو اس تعداد میں جو میں نے خیال کی ہے مبالغہ نہیں معلوم ہو گا۔ (۱۸۲)

بادشاہ کے لشکر میں بھیڑ کی کثرت کا سبب

خداوند من۔ یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اس ملک کی طبعی حالت اور طرز حکمرانی کے لحاظ سے کہ (جہاں سلطنت کی زمین کا صرف بادشاہ ہی مالک ہے) اس ملک کے دارالحکومت شہر آگرہ یا دہلی کے باشندوں کی معاش کا بڑا دارومدار صرف فوج کی موجودگی پر ہے اور اس لئے وہ مجبور ہیں کہ جب کبھی بادشاہ کوئی لمبا سفر اختیار کرے تو وہ بھی ساتھ جائیں اور یہ شہر پیرس سے کچھ مشابہت نہیں رکھتے۔ بلکہ ان کی زیادہ صحیح تشبیہ ایک کیمپ

سے دی جا سکتی ہے اور صرف اتنا فرق ہے کہ بجائے خیموں کے ان میں مکان ہیں اور آسائش کے اور سامان بھی کیمپ کی نسبت کسی قدر اچھے ہیں۔

ٹھیک وقت پر تنخواہ نہ ملنے کے خراب نتیجوں کا ذکر

یہ امر بھی بیان کرنا واجب ہے کہ امراء سے لے کر سپاہیوں تک کی تنخواہ کا دو ماہہ وار تقسیم ہو جانا نہایت ضروری ہے کیونکہ تنخواہ کے سوا جو بادشاہی خزانہ سے ملتی ہے کوئی اور ذریعہ ان کی معاش کا نہیں ہے۔

فرانس میں اگر کسی وجہ خاص سے واجب الادا تنخواہ کے دینے میں گورنمنٹ کی طرف سے کچھ دیر ہو جاتی ہے تو سردار تو کیا سپاہی بھی اپنی کسی خاص آمدنی سے گزارہ کر سکتے ہیں لیکن ہندوستان میں اگر فوج کو تنخواہ کے ملنے میں کبھی غیر معمولی توقف ہوتا ہے تو یقینا نہایت خوفناک نتائج پیدا ہوتے ہیں! یعنی سپاہی اپنا خفیف سا اسباب جو ان کے پاس ہوتا ہے بیچ کھوچ کر چل دیتے اور بھوکے مرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ جس زمانہ میں کہ شہزادوں کا باہمی جنگ و جدال قریب ختم ہونے کے تھا، میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ سواروں کا میلان اس طرف بڑھتا جاتا تھا کہ اپنے گھوڑے بیچ ڈالیں اور کچھ شک نہیں ہے کہ اگر لڑائی کو طول ہوتا تو ضرور ایسا ہی کرتے۔ اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ شہنشاہ مغل کے لشکر میں کوئی ایسا سپاہی مشکل سے مل سکتا ہے جو جورو' بچے' نوکر چاکر اور لونڈی غلام نہ رکھتا ہو اور ان سب کی گزران اسی تنخواہ پر موقوف ہے جو اس کو سرکار بادشاہی سے ملتی ہے اور اسی وجہ سے میں نے ایسے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے جو اس حالت کو دیکھ کر سخت حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ خرچ کے لئے اتنا بے شمار روپیہ کہاں سے آتا ہے کہ جس سے لاکھوں بندگان خدا کی پرورش ہوتی ہے جن کا مدار معاش محض بادشاہی تنخواہ کے ذریعہ پر ہے۔

شہنشاہ مغل کے اخراجاتِ کثیر کا بیان

مگر یہ لوگ اس امر کا خیال نہیں کرتے کہ شہنشاہ ہند اس ملک میں کس طرز خاص سے حکومت کرتا ہے اور اس کی دولت مندی کے ذرائع کس قدر ہیں اور میں نے تو اس کے اخراجات کا گویا ابھی ذکر ہی نہیں کیا۔ مثلاً خیال فرمائیے کہ آگرہ اور دہلی کے اصطبل میں دو یا تین ہزار تو صرف عمدہ گھوڑے ہی ہیں جو اوقاتِ ضرورت کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں اور آٹھ یا نو سو ہاتھی اور بار برداری کے لئے بہت سے ٹٹو اور خچریں اور حمال جو ان

بے شمار اور بہت وسیع اور بڑے بڑے خیموں اور ان کے متعلقہ چھوٹے خیموں اور دشموں اور محل کی اور عورتوں اور ساز و سامان اور باورچی خانہ کے اسباب اور گنگا جل اور اور بہت سی چیزوں کے اٹھانے کے لئے جن کا بادشاہ کے ساتھ رہنا سفر اور حضر میں ضروری ہے اور جو یورپ میں کسی کے خیال میں بھی نہیں آتیں رکھنے پڑتے ہیں۔ اس کے سوا محلسرا کے بے شمار اخراجات ہیں۔ جس میں عمدہ ململیں اور زربفت اور ریشمی اور زری دار کپڑے اور موتی اور مشک اور عنبر اور عطر اس قدر صرف میں آتا ہے کہ خیال میں نہیں آسکتا۔ پس اگرچہ شہنشاہ مغل کے مداخل بے شمار ہیں مگر مخارج بھی اسی قدر ہیں اور اسی وجہ سے (جیسا کہ بہت سے لوگ غلطی سے خیال کرتے ہیں) بہت زیادہ روپیہ پس انداز نہیں ہوتا۔

ہندوستان اور ایران اور روم کے محاصل کا مقابلہ

میں مانتا ہوں کہ سلطان روم اور شاہ ایران دونوں کے محاصل کو اگر ملائیں تو شہنشاہ مغل کا محاصل غالباً اس سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن اگر میں اس کو دولت مند بادشاہ کہوں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ گویا وہ ایک ایسا خزانچی ہے جو ایک ہاتھ سے بے شمار روپیہ لیتا اور دوسرے ہاتھ سے دے دیتا ہے اور میرے نزدیک واقعی دولت مند اس بادشاہ کو کہنا چاہئے کہ جس کا محاصل اس قدر ہو کہ بغیر اس کے کہ ظلم اور زیادہ ستانی سے رعایا فقیر ہو جائے امرا اور اہل دربار کا ایک عظیم الشان مجمع قائم رکھنے اور مفید خلائق اور عالی شان عمارتیں بنانے اور فیاض و کریم الطبع ہونے اور ملک کی حفاظت کے لئے فوج کثیر تیار رکھنے کے علاوہ اس قدر روپیہ پس انداز رکھ سکتا ہو کہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ کسی اتفاقیہ لڑائی بھڑائی کے وقت جو خواہ کئی برس تک جاری رہے، کام میں لا سکے اور اگرچہ شہنشاہ ہند کو ان میں سے اکثر باتیں حاصل ہیں لیکن اس قدر نہیں جس قدر کہ لوگ خیال کرتے ہیں۔

شہنشاہ مغل کی دولتمندی کی مبالغہ آمیز شہرت اور خزانے اور جواہرات کا ذکر

شہنشاہ مغل کے اخراجات کثیر اور لازمی کی نسبت جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس سے اور ان دو باتوں سے جو مجھ کو بخوبی تحقیق ہو چکی ہیں غالباً آپ کی رائے بھی یہی قرار پائے گی کہ شہنشاہ مغل کی دولتمندی کی شہرت مبالغہ سے خالی نہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ گزشتہ لڑائی کے خاتمہ کے قریب اورنگ زیب کو نہایت فکر تھی کہ فوج کی تنخواہ کس طرح ادا کی جائے حالانکہ لڑائی صرف پانچ برس رہی تھی اور فوج کی تنخواہ بھی معمول سے

کم تھی اور بنگالہ کے سوا جہاں سلطان شجاع اب تک لڑتا تھا دیگر سب صوبوں میں بالکل امن و امان تھا اور باپ کے اکثر خزانے بھی اس کے قبضے میں آ چکے تھے۔

دوسری یہ کہ شاہ جہاں جو بڑا کفایت شعار تھا اور کسی جنگ عظیم میں پھنسنے اور الجھنے کے بغیر (۱۸۳) چالیس برس سے زیادہ عرصہ تک سلطنت کرتا رہا کبھی چھ کروڑ روپیہ سے زیادہ جمع نہیں کر سکا۔ لیکن اس رقم میں، میں ان کثیر التعداد سونے چاندی کی طرح طرح کی مرصع چیزوں کو، جن پر نہایت عمدہ عمدہ کام بنے ہوئے ہیں اور بڑے بڑے قیمتی موتیوں اور قسم قسم کے کثیر التعداد جواہرات کو، شامل نہیں کرتا اور مجھے شک ہے کہ اس سے زیادہ جواہرت شاید ہی دنیا کے کسی اور بادشاہ کے پاس ہوں۔ چنانچہ اس کا ایک تخت ہی (اگر میری یاد میں کچھ غلط نہ ہو) تین کروڑ (۱۸۴) روپیہ کی قیمت کا ہے۔ یہ سب جواہرات اور قیمتی چیزیں ہیں جو راجپوتوں کے قدیمی خاندانوں اور پٹھان بادشاہوں اور امراء سے لوٹی ہوئی اور ایک مدت دراز میں جمع کی ہوئی ہیں اور ہر ایک بادشاہ کے عہد میں امرائے سلطنت کے معمولی سالانہ پیشکشوں کے ذریعہ سے جو ان کو مجبوراً دینے پڑتے ہیں، ان کا شمار بڑھتا گیا ہے۔ اور یہ سب خزانہ تخت کا مال سمجھا جاتا ہے اور اس کو چھیڑنا ممنوع ہے۔ یہاں تک کہ خود بادشاہ بھی کیسی ہی ضرورت کیوں نہ ہو اس کی کفالت پر تھوڑا سا روپیہ بھی نہایت مشکل سے حاصل کر سکتا ہے۔ (۱۸۵)

ہندوستان میں سونے چاندی کے بظاہر کم دکھائی دینے اور لوگوں کے متمول معلوم نہ ہونے کا سبب

اپنے اس خط کے ختم کرنے سے پہلے میں یہ بات بیان کرنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ سونا اور چاندی اکثر ملکوں میں پھر پھرا کر آخر کار ہندوستان میں آجاتا ہے مگر اس پر بھی بہ نسبت اور ملکوں کے یہاں زیادہ محسوس نہیں ہوتا اور ہندوستانی لوگ اور ملکوں کے باشندوں کی طرح متمول معلوم نہیں ہوتے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ اول تو بہت سا مال بار بار گلائے جانے اور عورتوں کے ہاتھوں کی چوڑیوں اور پاؤں کے کڑوں اور توڑوں وغیرہ اور بالیوں اور نتھوں اور انگوٹھیوں کے بنانے میں کھپ جاتا ہے اور اس سے بھی زیادہ مقدار زردوزی اور کار چوبی کام کے کپڑوں اور الاچوں اور پگڑیوں کے طروں اور سنہری روپہلی کپڑوں اور اوڑھنیوں اور پٹکوں اور مندیلوں اور کمخوابوں کے بنانے میں خرچ ہو جاتی ہے۔ اور یہ چیزیں

اس قدر رسائی جاتی ہیں کہ سننے والے کو یقین نہیں آسکتا اور تمام فوجوں میں امراء سے لے کر سپاہیوں تک کچھ نہ کچھ ملمع اور طلاکاری کی چیزیں زیب و زینت کے لئے پہنتے ہیں اور ایک ادنیٰ سپاہی بھی (کنبہ خواہ بھوکوں کیوں نہ مر جائے جو ایک معمولی امر ہے) اپنی بیوی اور بچوں کو کچھ نہ کچھ زیور ضرور پہناتا ہے۔

مستاجروں اور جاگیرداروں کے ظلم و تعدی اور دادرسی کا کافی انتظام نہ ہونے کا ذکر

بادشاہ جو زمین کا مالک ہے اہل سپاہ کو کسی قدر زمینیں تنخواہ میں دے دیتا ہے کہ جس کو یہاں "جاگیر" اور سلطنت، ٹرکی میں "تیمار" کہتے ہیں اور جس کے معنی ہیں وہ جگہ کہ جہاں سے کچھ لیا جائے یا مقام وصول تنخواہ اور اسی قسم کی جاگیریں صوبہ داروں کو بھی ان کی اور ان کی فوج کی تنخواہ میں اس شرط پر دی جاتی ہیں کہ فاضل آمدنی میں سے ایک خاص رقم سال بہ سال خزانہ شاہی میں داخل کرتے ہیں اور جو زمینیں جاگیر میں نہیں دی جاتیں اور خاص بادشاہ اور اس کے اہل خاندان کے متعلق ہیں اور شاذ و نادر ہی کسی کو جاگیر میں دی جاتی ہیں، وہ مستاجروں کو دی جاتی ہیں جو سال بہ سال زر معینہ ادا کرتے رہتے ہیں اور اس طرح پر جو لوگ زمین پر قبضہ حاصل کرتے ہیں خواہ "تیمار دار" ہوں خواہ صوبہ دار یا مستاجر، کاشتکاروں پر ان کے اختیارات ایسے غیر محدود ہیں کہ گویا مطلق العنان ہی کہنا چاہئے اور کاشتکاروں ہی پر منحصر نہیں بلکہ اپنے علاقے کے گاؤں اور قصبوں کے اہل حرفہ اور سوداگروں پر بھی ویسا ہی اختیار ہے اور جن طریقوں میں یہ اپنے ان اختیارات کو عمل میں لاتے ہیں اس سے زیادہ کوئی بے رحمانہ اور تکلیف دہ امر خیال میں نہیں آسکتا اور ایسا کوئی شخص نہیں ہے کہ جس کے پاس یہ مظلوم کسان اور کاریگر اور سوداگر اپنا استغاثہ پیش کر سکیں۔ یعنی نہ تو فرانس کی طرح یہاں کوئی گریٹ لارڈ ہے اور نہ پارلیمنٹ اور پریسائڈل کورٹ کے جج جو ان بے رحم ظالموں کے ظلم کو روکیں۔ اور جو قاضی یہاں مقرر ہیں ان کو ان بدنصیب لوگوں کی داد رسی کا کافی اختیار نہیں ہے۔ مگر ان بلاقید اختیارات کی یہ بد استعمالی بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی اور آگرہ اور بندرگاہوں اور بڑے بڑے قصبوں کے قرب و جوار میں اس درجہ تک محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ایسے مقاموں میں کوئی بڑی ناانصافی کا کام دربار شاہی سے مخفی رہنا آسان نہیں ہے۔

غلامانہ حالت سے تجارت اور لوگوں کے اوضاع واطوار اور طریقِ معاشرت پر اثر کا ذکر

رعایا کی یہ غلامانہ حقیر حالت ترقی تجارت کی مانع اور لوگوں کے اوضاع واطوار اور طریق معاشرت کی خرابی کا باعث ہے اور تجارت کرنے کا کسی کو اس لئے حوصلہ نہیں ہوتا کہ منافع کی صورت میں بجائے اس کے کہ وہ اسے اپنے عیش و آرام میں صرف کرے اس کو دیکھ کر کسی ظالم اور ذی اختیار ہمسایہ کے منہ میں پانی بھر آتا ہے جس کا میلان طبع ہمیشہ اس طرف ہے کہ کسی شخص کو اس کی محنت کے ثمرہ سے محروم کردے اور اگر کسی کو دولت حاصل ہو بھی جاتی ہے (جیسا کہ بعض اوقات ہونا ضروری ہے) تو برخلاف اس کے کہ سابق کی نسبت آسودہ حالت میں رہے اور آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرے مفلسوں کی سی صورت بنائے رہتا ہے اور لباس اور مکان اور اسباب خانہ داری بہت ہی ذلیل رکھتا ہے اور سب سے زیادہ کھانے پینے میں خست دکھاتا ہے اور اس حالت میں اس کا روپیہ اور اشرفی زیر زمین کسی عمیق گڑھے میں گڑا رہتا ہے اور سب لوگوں میں خواہ کاشتکار ہوں، خواہ کاریگر یا اہل بازار، ہندو ہوں یا مسلمان، عموماً یہی طریقہ جاری ہے۔ علی الخصوص ہندوؤں میں جن کے ہاتھ میں ملک کی دولت اور تجارت ہے اور جن کا یہ عقیدہ ہے کہ جو دولت ہم اپنے ایام حیات میں چھپا کر رکھیں گے مرنے کے بعد ہمارے کام آئے گی (۱۸۶)۔ البتہ بعض اشخاص جو بادشاہ یا امرا کے ہاں نوکر ہیں یا جن کا کوئی بڑا وسیلہ ہے ان کو اپنی تنگ دستی دکھانے کی کچھ حاجت نہیں ہوتی اور عیش و آرام سے عمر بسر کرتے ہیں۔ اور مجھے کچھ شک نہیں ہے کہ سونے چاندی کو زیر زمین دفن رکھنے اور اس طرح پر اس کے ایک کے ہاتھ میں سے دوسرے کے ہاتھ میں جانے سے روکنے کی یہ عادت ہی اس ملک میں سونے چاندی کے بظاہر کم دکھائی دینے کا بڑا سبب ہے۔

ہندوستان میں رعایا کو حق ملکیتِ زمین حاصل نہ ہونے سے جو مضر نتیجے حکام اور رعایا کے لئے پیدا ہوتے ہیں ان کا مفصل بیان

اب جو کچھ میں بیان کر چکا ہوں اس سے طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بادشاہ زمین کی ملکیت بالکل چھوڑ دے اور یہ حق رعایا کو حاصل ہو جائے تو آیا یہ امر رعیت اور بادشاہ

دونوں کے حق میں مفید ہو گا؟ یا نہیں؟

اس کے جواب میں میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے یورپ کی حالت کا کہ جہاں حق ملکیت زمین رعایا کو حاصل ہے اور ان ملکوں کی حالت کا جہاں یہ حق ان کو حاصل نہیں ہے احتیاط کے ساتھ مقابلہ کیا ہے اور بعد غور میری رائے یوں قائم ہوئی ہے کہ یہ امر نہ صرف رعایا بلکہ خود بادشاہ کے فوائد کے لئے بھی بہت ہی مضر ہے۔ چنانچہ میں یہ امر بیان کر چکا ہوں کہ ہندوستان میں سونے چاندی کے کم دکھائی دینے کا کیا باعث ہے، یعنی جاگیرداروں صوبہ داروں اور مستاجروں کا ظلم کہ جس کا انسداد اگر بادشاہ بھی چاہے تو نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً ان صوبوں میں جو پایۂ تخت کے قریب نہیں ہیں اور یہ ظلم اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ کاشتکاروں اور اہل حرفہ کے پاس بسر اوقات کے لئے کچھ بھی نہیں رہنے دیتا اور وہ حالت افلاس اور تنگدستی میں پڑے مرتے ہیں اور اسی ظلم کے سبب سے اول تو ان بے چاروں کے کچھ اولاد ہی نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے تو فاقوں کے مارے بچپن ہی میں چل بستی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس ظلم و ستم کی وجہ سے کاشتکار اپنے کم بخت وطن کو چھوڑ کر کسی قدر آسائش ملنے کی امید پر کسی ہمسایہ ریاست کے علاقہ میں جا رہتے ہیں یا فوج میں جا کر کسی سوار کے پاس نوکری کر لیتے ہیں اور چونکہ زمین کا تردد شاذ و نادر ہی جبر کے بغیر ہوتا ہے اور کوئی شخص اس قابل پایا نہیں جاتا کہ اپنی خوشی سے ان نہروں اور نالیوں کی مرمت کرے جو آب پاشی کے لئے بنی ہوئی ہیں اس وجہ سے تردد بخوبی نہیں ہوتا اور خشکی کے سبب سے زمین کا ایک بڑا حصہ خالی پڑا رہتا ہے اور زمین ہی پر کیا موقوف ہے مکانات بھی اکثر ویرانی اور تباہی کی حالت میں رہتے ہیں اور بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو نئے مکان بناتے یا ان کی مرمت کرتے ہیں۔ اور ایک طرف تو کاشتکار اپنے دل میں ہمیشہ یہ خیال کرتے ہیں کہ کیا ہم اس لئے محنت کریں کہ کوئی ظالم آئے اور سب کچھ چھین لے جائے اور اگر چاہے تو ہماری بسر اوقات کے لئے بھی ہمارے پاس کچھ نہ چھوڑے اور دوسری طرف جاگیردار اور صوبہ دار اور مستاجر یہ سوچتے ہیں کہ ہم کیوں افتادہ اور ویران زمین کی فکر کریں اور اپنا روپیہ اور وقت اس کے بار آور بنانے میں لگائیں کیونکہ نہ معلوم کس وقت ہمارے ہاتھ سے نکل جائے اور ہماری کوششیں اور محنت کا ثمرہ نہ تو ہم کو ہی حاصل ہو اور نہ ہماری اولاد کو۔ پس زمین سے جو کچھ وصول ہو سکے کر لیں اور ہماری بلا سے! کاشتکار بھوکے مریں یا اجڑ جائیں! اور جب ہم کو اس کے چھوڑ دینے کا حکم ملے گا تو ویران اور غیر آباد چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ (۱۸۷)

شخصی حکومت سے جو نتیجے ہندوستان میں پیدا ہوئے وہی ایشیا کوچک اور مصر میں بھی ہوئے

پس جو حقائق میں نے بیان کئے ہیں وہ اس امر کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ ایشیائی سلطنتیں جلد جلد کس طرح زوال پذیر ہوتی ہیں اور حکومت کے اسی ناقص طریقہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ہندوستان کے بہت سے شہروں کے مکانات کچے یا گھاس پھوس وغیرہ سے بنے ہوئے ہیں اور یہاں کے شہر اور قصبے خواہ بالفعل خستہ حال اور ویران نہ ہوں مگر ایسا کوئی بھی نہیں کہ جس میں جلد تباہ اور خراب ہو جانے کی علامتیں نہ پائی جائیں اور ہندوستان ہی پر کیا منحصر ہے یہ تو ہم سے ایک بہت دور کی سلطنت ہے۔ ہم اپنے قریب ہی کے بعض ایشیائی ملکوں کی حالت کا مقابلہ کر کے شخصی حکومتوں کے بے رحمانہ برتاؤ کے نتیجوں کی نسبت اپنی رائے قائم کر سکتے ہیں۔ مثلاً دریائے دجلہ اور فرات کے دوآبے کو اور ایشیاء کوچک اور فلسطین اور انطاکیہ کے قرب وجوار کے عمدہ میدانوں اور بہت سے اضلاع کو دیکھ لیجئے کہ قدیم زمانہ میں کس کثرت سے زراعتیں ہوتی تھیں اور کیسے زرخیز اور آباد تھے اور اب ویران پڑے ہیں بلکہ ان کے بہت سے حصے دلدل ہو جانے اور آب وہوا کی خرابی سے انسان کی بودوباش کے بھی قابل نہیں رہے۔ یہی اندوہناک صورت مصر کی دکھائی دیتی ہے جہاں کی رعایا غلامانہ حالت میں ہے اور اسی برس کے عرصہ میں یہ بے نظیر ملک دسویں حصہ سے زیادہ ویران ہو گیا ہے کیونکہ اس مدت میں کسی نے دریائے نیل کی نہروں کی کچھ خبر نہیں لی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ دریا اپنے معمولی پاٹ کے اندر نہیں بہتا اور نیچی زمینیں بالکل غرقاب ہو جاتی ہیں اور ریت سے اس قدر اٹ گئی ہیں کہ بغیر بہت سے روپے اور محنت کے صاف نہیں ہو سکتیں۔ پس ایسی حالت میں کیا یہ کچھ تعجب کی بات ہے کہ ان ملکوں میں صنعت اور حرفت کو ویسی ترقی نہ ہو جیسی کہ ہمارے خوش نصیب فرانس اور ان ملکوں میں ہے جہاں کا طرز حکومت عمدہ ہے۔ کیونکہ کسی صناع سے ایسے لوگوں میں رہ کر اپنے پیشہ میں جی لگانے کی امید نہیں کی جا سکتی جو مفلس اور غریب ہوں یا اپنے تئیں مفلس ظاہر کرتے اور چیز کی خوبصورتی اور عمدگی کی جگہ صرف اس کے ارزاں ہونے کا خیال رکھتے ہوں اور بڑے آدمیوں کا یہ حال ہو کہ صرف اپنی مرضی سے چیز کی حیثیت سے بہت کم قیمت جو چاہتے ہوں، دے دیتے ہوں اور کسی کاریگر یا سوداگر کے اصرار کرنے کی حالت میں اس کو کوڑوں

سے پٹوانے میں بھی ان کو تامل نہ ہوتا ہو (کوڑا ایک لمبے اور دہشت ناک چابک کو کہتے ہیں جو ہر ایک امیر کے دروازہ پر لٹکتا رہتا ہے) اور کیا کسی صناع کا حوصلہ پست کر دینے کے لئے یہ امر کچھ کم ہے کہ اس کو کسی اعزاز کے پانے یا اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے کسی منصب سرکاری کے حاصل ہونے یا زمین کے خریدنے کی اجازت ملنے کی امید نہیں؟ اور اس خوف سے کہ کوئی دولتمندی کا شبہ نہ کرے نہ کبھی اچھی پوشاک پہن سکتا ہے اور نہ اچھا کھانا کھا سکتا ہے اور نہ یہ ظاہر کر سکتا ہے کہ اس کے پاس کچھ تھوڑا سا بھی روپیہ ہے۔ ہندوستان کی صنعت کی خوبصورتی اور لطافت مدت سے جاچکی ہوتی اگر بادشاہ اور بڑے بڑے امرا کے ہاں بہت سے کاریگر نوکر نہ ہوتے جو خود انہی کے گھروں پر اور سرکاری کارخانوں میں بیٹھ کر کام بناتے اور اپنے شاگردوں اور لڑکوں کو سکھایا کرتے ہیں اور انعام کی امید اور کوڑوں کا خوف ان کو محنت کے ساتھ اپنے کام میں لگائے رکھتا ہے۔ اور کچھ یہ بھی سبب ہے کہ بعض دولتمند تاجر اور سوداگر ایسے بھی ہیں کہ جن کو بڑے بڑے امرا کی سرکاروں سے تعلق اور توسل ہے اور وہ کاریگروں کو شرح مروّجہ سے کسی قدر زیادہ مزدوری دے کر کام بنوایا کرتے ہیں۔ میں نے "کسی قدر زیادہ مزدوری" اس لئے کہا ہے کہ یہ تو سمجھنا ہی نہ چاہئے کہ اچھی چیزیں بنانے سے کاریگر کی کچھ قدر کی جاتی ہے یا اس کو کچھ آزادی حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہ تو جو کچھ کرتا ہے صرف ضرورت یا کوڑوں کے خوف سے کرتا ہے اور چونکہ تمول اور آسودگی حاصل ہونے کی کبھی امید نہیں ہوتی اس لئے اگر روکھا سوکھا ٹکڑا کھانے کو اور موٹا جھوٹا کپڑا پہننے کو مل جائے تو اسی کو غنیمت سمجھتا ہے اور روپیہ حاصل بھی ہو جائے تو اس کو کیا!! کیونکہ وہ تو اس سوداگر کا مال ہے جو خود ہی اسی اندیشہ سے ہمیشہ مضطرب رہتا ہے اگر کوئی زبردست ظلم وزیادتی کرنا چاہے تو اس سے کس طرح بچے۔

ہندوستانیوں کی بے علمی اور جہالت کا ذکر

لوگوں کی اس حالت کا بالطبع یہ نتیجہ ہے کہ تمام ملک میں علی العموم بے حد جہالت پھیلی ہوئی ہے اور یہ یہاں ممکن ہی نہیں کہ ایسے دارالعلوم اور کالج قائم ہو سکیں کہ جن کے اخراجات کے لئے کافی سرمایہ بذریعہ وقف کے موجود ہو اور ایسے لوگ کہاں جو اس طرح پر مدرسے اور کالج قائم کریں اور بالفرض ایسے لوگ میسر بھی آجائیں تو طالب علم کہاں اور لوگوں میں اتنی استطاعت کہاں کہ اپنے بچوں کو کالج میں رکھ کر ان کے اخراجات کا سرانجام

کر سکیں۔ اور بالفرض ایسے ذی مقدور لوگ موجود بھی ہوں تو یہ جرأت کون کر سکتا ہے کہ اس طرح علانیہ اپنی دولتمندی ثابت کرے ؟اور شاید اگر کوئی شخص یہ احمقانہ حرکت کر بھی بیٹھے تو عمدہ تعلیم سے جن دنیاوی فوائد کی توقع ہوتی ہے وہ کہاں ؟ اور ایسے اعتماد اور اعزاز کے عہدے اور منصب کہاں جو نوجوان طالبعلموں کی امیدوں اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے شوق کو ابھارتے رہتے ہیں اور جن کے لئے علم اور قابلیت کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کی تجارت کی پست حالی کا ذِکر

جس ملک میں اس قسم کی حکومت ہو وہاں اس چستی اور کامیابی کے ساتھ تجارت بھی نہیں ہو سکتی جیسے کہ یورپ میں ہوتی ہے، کیونکہ ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں کہ جو اپنی خوشی سے محنت اور تکلیف اٹھانے اور کسی دوسرے شخص کے فائدہ کے لئے خطرے میں پڑنے کو گوارا کریں (دوسرے شخص سے میری مراد کوئی ایسا حاکم ہے جو لوگوں کی کمائی کو چھین لینے سے دریغ نہیں کرتا) اور خواہ کتنا ہی نفع کیوں نہ حاصل ہو کمانے والے کو مفلسانہ لباس پہننا اور اپنے غریب ہمسایوں سے بڑھ کر کھانے پینے میں تکلف نہ کرنا ضروریات سے ہے۔ مگر ہاں جب کبھی کسی فوجی سردار سے کسی سوداگر کو توسّل ہو جاتا ہے تو البتہ وہ بڑے بڑے تجارتی معاملے کرنے لگتا ہے۔ مگر اس حالت میں اس کو اپنے مربی کی غلامی میں رہنا ضروری ہے جو حفاظت کے بدلے جس قسم کی شرطیں اس سے چاہتا ہے کرا لیتا ہے۔

امرائے ہندوستان کا خاندانی اور عالی نسب نہ ہونا اور ان کی جہالت اور غرور کا ذِکر

شہنشاہ ہند کو یہ بات میسر نہیں ہے کہ ملازمت کے لئے اپنی رعایا میں سے ایسے لوگوں کو منتخب کر سکے جو قدیمی رئیس زادے اور خاندانی امیروں اور شریفوں کے لڑکے اور بڑے بڑے کارخانہ داروں اور متمول سوداگروں کے بیٹے پوتے ہوں اور جنھوں نے خوبی تعلیم پائی ہو اور اپنی عادات اور اطوار میں معقولیت اور سنجیدگی کا بدرجہ اعلیٰ خیال رکھتے ہوں اور جن کو اپنے بادشاہ سے محبت ہو اور دلیری و دلاوری کے کاموں سے اپنے خاندان کی ناموری اور شہرت بڑھانے کے لئے مستعد اور بوقتِ ضرورت اس قابل ہوں کہ اپنی گرہ

سے کھا کر دربار یا فوج میں خوشی کام دے سکیں اور کسی اچھے وقت کی امید پر صرف بادشاہ کے ہنس کر بول لینے اور شاباش کہہ دینے پر قانع ہوں۔ بلکہ بجائے اس قسم کے لوگوں کے شہنشاہ ہند کے اردگرد جاہل اور وحشی غلام یا وہ خوشامدی لوگ رہتے ہیں جنہوں نے بہت ہی ادنیٰ اور ذلیل حالت سے درجہ اعلیٰ پر ترقی پائی ہے اور جو وفاداری اور حب الوطنی اور معقولیت اور مردانگی اور عزت داری کے خیال سے بالکل خالی اور ناقابل برداشت غرور و تکبر سے بھرے ہوئے ہیں۔

دربار اور فوج کے اخراجاتِ کثیر کے باعث سے رعایا کی سخت تباہ حالی

ملک کا یہ حال ہے کہ بسبب اُس مصارف کثیر کے (جو دربار کی شان و شوکت قائم رکھنے اور اس بڑی فوج کی تنخواہ ادا کرنے کے لئے لابدی ہے جس کا ہونا رعایا کے قابو میں رکھنے کے واسطے ضروری ہے) تباہ و برباد ہے اور لوگ ایسی تکلیف اور مصیبت میں ہیں کہ خیال میں نہیں آسکتی اور صرف قمچیوں اور کوڑوں کے خوف سے غیروں کے فائدوں کے لیے کام میں لگے رہتے ہیں اور اگر فوج کا ڈر نہ ہو تو ایسی بے رحمانہ بدسلوکیوں سے مایوس ہو کر کہیں کو بھاگ جائیں یا فساد برپا کریں اور اس بد قسمت ملک کی مصیبت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جبکہ کسی صوبہ کی حکومت بہت سا روپیہ لے کر کسی کو دے دی جاتی ہے جو عموماً مروج ہے اور لڑائی اور ہنگامہ کے وقت خصوصیت کے ساتھ جس پر عمل کیا جاتا ہے اور جس کا بالطبع یہ نتیجہ ہے کہ جو شخص اس طرح پر حکومت حاصل کرتا ہے، اس کا مقدم کام یہ ہوتا ہے کہ جو روپیہ اس نے بہت بھاری سود پر قرض لے کر اپنی مطلب برآری کے لئے خرچ کیا تھا اس کو وصول کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی صوبہ کی حکومت خواہ نذرانہ دے کر لی گئی ہو یا یوں ہی مل گئی ہو ہر ایک صوبہ دار اور جاگیردار اور مستاجر کو کسی نہ کسی طرح ہر سال بڑے بڑے نذرانے کسی وزیر یا خواجہ سرا یا محل کی کسی معزز بیگم یا کسی اور شخص کی خدمت میں کہ جس کو دربار میں ذی اقتدار خیال کرتا ہو پیش کرنا اور مع ہذا بادشاہی خراج بھی معمولی وقت پر خزانہ شاہی میں پہنچاتے رہنا ضروری امر ہے اور اگرچہ یہ لوگ دراصل صرف ذلیل اور قرضدار غلام ہوتے ہیں اور کچھ بھی جائیداد نہیں رکھتے مگر حکومت ملتے ہی بڑے دانشمند اور متمول اور امیر بن جاتے ہیں۔ اور اس طرح پر تمام ملک میں ویرانی اور بربادی پھیلی ہوئی ہے اور جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں یہ تمام صوبہ دار اپنی اپنی

جگہ میں چھوٹے چھوٹے فرعونِ بے سامان ہیں جو نامحدود اختیارات رکھتے ہیں اور کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے کہ جس کے پاس مظلوم رعایا استغاثہ کر سکے اور خواہ کیسا ہی اور بار بار ظلم کیوں نہ ہوا ہو اس کو اپنی داد رسی کی کسی طرح امید نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بات درست ہے کہ بادشاہ تمام صوبوں میں "واقعہ نویس" مقرر کرتا ہے جن کا یہ کام ہے کہ جو امر وقوع میں آئے اس کی اطلاع دیتے رہیں لیکن ان نالائق واقعہ نویسوں اور صوبہ داروں کے باہم خود ہی سازش ہو جاتی ہے۔ پس وہ ظلم جور رعایا پر ہوتا ہے اُن کی موجودگی سے شاذ و نادر ہی رکتا ہے۔

حکام کے تقرر کے باب میں ٹرکی اور ایران اور ہندوستان کے عملدرآمد اور اصولِ حقیقتِ ملکیت کے ملحوظ نہ ہونے سے جو نتیجہ متوقع ہے اس کا ذکر

ہندوستان کے صوبہ داروں کی طرف سے جو بیش قیمت ہدیئے اور تحفے موقع بہ موقع دیئے جاتے ہیں اگرچہ تقریباً وہ ان کے عہدوں کی قیمت ہی کا کام دیتے ہیں مگر تاہم صوبوں کی حکومت جس قدر علانیہ اور جلد جلد سلطانِ روم کی سلطنت ٹرکی میں فروخت ہوتی ہے اس قدر علانیہ اور جلدی سے ہندوستان میں نہیں بکتی اور ہندوستان کے صوبہ دار روم کی بہ نسبت چونکہ اپنے عہدوں پر قائم بھی زیادہ عرصہ تک رہتے ہیں اس وجہ سے بہ نسبت اس وقت کے کہ جب پہلے پہل وہ افلاس اور لالچ کی حالت میں صوبہ دار مقرر ہو کر جاتے ہیں رفتہ رفتہ رعایا کی نسبت ان کا ظلم کم بھی ہو جاتا ہے اور ایک یہ وجہ بھی کم ظلم کرنے کی ہے کہ ان کو یہ خیال رہتا ہے کہ کہیں یہ لوگ ملک کو چھوڑ کر کسی راجہ کی عملداری میں نہ چلے جائیں جو فی الواقع اکثر ہوتا رہتا ہے اور روم کی طرح ایران میں بھی جلد جلد اور علانیہ طور پر حکام کی تبدیلی نہیں ہوتی کیونکہ وہاں اکثر باپ کی جگہ بیٹا ہی حاکم مقرر کیا جاتا ہے اور یہ عملدرآمد سلطنتِ روم کے دستور سے اچھا ہے۔ اس کا بدیہی نتیجہ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایران کی رعیت روم کی رعایا کی بہ نسبت خوشحال ہے اور ایرانی ادب اور شائستگی میں بھی روم کے ترکوں سے بہتر ہیں۔ بلکہ کسی قدر کتابوں کے مطالعہ اور پڑھنے لکھنے میں بھی مصروف رہتے ہیں۔ مگر ان تینوں ملکوں یعنی روم ایران اور ہندوستان میں "می ام اینڈ ٹوام" یعنی حقِ ملکیت کے اصول کو زمین اور دیگر ملکیت کی چیزوں کے باب میں کوئی نہیں جانتا اور اس اصول کے نہ ہونے سے جو درحقیقت تمام خوبیوں اور برکتوں کی جڑ ہے، یہ تینوں ملک

لازمی طور پر امور کلی میں باہم مشابہ ہیں اور ایک ہی قسم کی سخت غلطیوں میں پڑے ہوئے ہیں اور جلدی خواہ دیر میں بالضرور ظلم اور بربادی اور مصیبت جو ان غلطیوں کے طبعی نتیجے ہیں ان کو بھگتنے پڑیں گے۔

ممالک یورپ کی خوشحالی اور سرسبزی اور روز افزوں ترقی اور اس کا سبب

جناب من۔ ہم کو خدا کا نہایت شکر کرنا اور خوش ہونا چاہئے کہ ہمارے ممالک یورپ میں بادشاہ زمین کے مالک علی الاطلاق نہیں ہیں اور اگر ایسا ہوتا تو اس قدر آبادی اور زراعت کیونکر ہوتی اور ایسے عمدہ اور آسودہ شہر کہاں ہوتے اور شائستہ اور فارغ البال اور پھولی پھلی خلقت کس طرح دیکھنے میں آتی اور اگر یہ برباد کن علی الاطلاق حق بادشاہوں کو یہاں بھی حاصل ہوتا تو اب کی بہ نسبت ان کی دولت اور ہان کی رعایا کی وفاداری اور عقیدت مندی کی کچھ اور ہی کیفیت ہوتی اور وہ صرف بیابان اور سنسان ملکوں اور وحشیوں اور ٹکڑ گداؤں کے بادشاہ ہوتے۔

حقیقت یہ ہے کہ بادشاہان ایشیا شریعتِ الٰہی اور قانون قدرت سے بڑھ کر ناجائز خود مختاری حاصل کرنے کی حرص میں ایسے اندھے ہو جاتے ہیں کہ یہ ہر چیز کو اپنے ہی ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر کار ہر ایک چیز ان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے(۱۸۸) یا اگر ہمیشہ ہی ایسا نہ ہوتا ہو کہ سب کچھ ان کے ہاتھ سے نکل جائے مگر پھر بھی اتنا تو ضرور ہی ہوتا ہے کہ جس قدر مال و دولت کے جمع کرنے کی طمع ان کو دامن گیر رہا کرتی ہے خلاف اپنی اس آرزو کے اس کے حاصل کرنے سے ہمیشہ مایوس اور محروم ہی رہتے ہیں۔

میں پھر کہتا ہوں کہ اگر ہمارے ملک کا طرز حکومت بھی یہی ہوتا تو ایسے رؤسا' امراء' علمائے دین' متمول اہل شہر' ترقی کناں اہلِ تجارت' ذہین اہلِ حرفہ اور تیز فہم کارخانہ دار کہاں ہوتے اور ایسے شہر جیسے فرانس میں پیرس' لائینس' ٹولوز اور رائن اور انگلستان میں لندن یا اور بڑے بڑے شہر ہیں کہاں پائے جاتے اور اس قدر قصبات دیہات "کنٹری ہاؤس"(۱۸۹) خوش نما میدان پہاڑ اور وادیاں جن میں نہایت ہوشیاری اور ہنر مندی اور محنت سے زراعت کی جاتی ہے کس طرح دکھائی دیتے اور ہمارے محاصلِ کثیر کی جو اس محنت اور مشقت کا نتیجہ ہے اور جو بادشاہ اور رعایا دونوں کے لئے مفید ہے کیا حالت ہوتی؟ بلکہ سب

بچھ اس خوبصورت تصویر کے برعکس ہوتا اور ہمارے بڑے بڑے شہر ناموافق ہوا کی وجہ سے سکونت کے قابل نہ رہتے اور تباہ ہو کر کھنڈر ہو جاتے اور کسی کو ان کی مرمت کرنے اور زوال سے روکنے کی فکر نہ ہوتی اور زرخیز پہاڑوں کو لوگ چھوڑ کر چلے جاتے اور میدان اس سرے سے اس سرے تک جھاڑ جھنکار اور گھاس پھونس سے بھر جاتے اور مضر صحت اور وبائی امراض پیدا کرنے والی دلدلیں سطح زمین کو ڈھانپ لیتیں اور مسافروں کے آرام و آسائش کے ذریعے معدوم ہو جاتے۔ مثلاً وہ ان Inn (سرائے) جو پیرس اور لائینس کے راستہ میں بنے ہوئے ہیں اپنے رتبہ سے گر کر دس بارہ کارواں سرائیں رہ جاتیں اور مسافروں کو خانہ بدوشوں کی طرح ہر شے اپنے ساتھ لئے پھرنی پڑتی۔

ممالک ایشیا کی کارواں سراؤں کا ذکر

ممالکِ ایشیا کی کارواں سرائیں ایک بڑے بارن (Barn : غلہ خانہ) کے مشابہ ہوتی ہیں جن کے چاروں طرف ہمارے پونٹ نیوف (Pont nouf) کی طرح پختہ دیواریں بنی ہوئی اور پختہ فرش لگا ہوا ہوتا ہے۔ جن میں سینکڑوں انسان مع اپنے گھوڑوں خچروں اور اونٹوں کے نظر آتے ہیں اور گرمی کے موسم میں تو یہ مکانات ایسے گرم ہوتے ہیں کہ دم گھٹا جاتا ہے اور جاڑوں میں سردی کے مارے مرنے سے بچنے کا کوئی ذریعہ بجز ان بہت سے حیوانات کے سانس کے نہیں ہوتا۔ اس موقع پر امید ہے کہ بعض لوگ اعتراضاً یہ کہیں کہ ایسے کئی ملک ہیں۔ مثلاً سلطان روم کا ملک کہ جہاں "می ام اینڈ ٹوام" (Meum and Tuum) کے اصول کو کوئی بھی نہیں جانتا۔ مگر پھر بھی نہ صرف بحال خود قائم اور موجود ہیں بلکہ ان کی عظمت اور اقتدار یوماً فیوماً ترقی پر ہے۔ مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی وسیع اور بڑی سلطنت جیسی کہ سلطان روم کی سلطنت ہے اور جس میں بہت سے صوبوں کی زمین ایسی طاقتور اور زرخیز ہے کہ کامل تردد کے بغیر بھی بہت برسوں تک اس کا زور قائم رہتا ہے بالضرور دولت مند اور طاقتور ہونی چاہئے۔ مگر غور کرنا چاہئے کہ بمقابلہ اس کی وسعت اور قدرتی خوبیوں کے اس کی دولت اور طاقت کس قدر کم ہے اور اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ ایسی ہی آباد ہے اور اس میں ایسی ہی ہوشیاری سے کاشتکاری اور زراعت ہوتی ہے جیسی کہ حالت اصل ہونے حق ملکیت زمین کے رعایا کو ممکن ہے تو اس صورت میں بے شک یہ ہونا چاہئے کہ یہ سلطنت ایسی ہی بڑی اور عمدہ فوجیں نوکر رکھ سکتی ہے جیسی کہ قدیم زمانہ میں

تھیں۔ حالانکہ آج کل تو خاص قسطنطنیہ ہی میں یہ حال ہے کہ اگر پانچ چھ ہزار سپاہی بھرتی کرنے ہوں تو تین مہینے لگتے ہیں۔ چنانچہ میں قریباً اس تمام ملک میں پھرا ہوں اور میں نے اس کو نہایت ہی افسوسناک طور پر تباہ اور اُجڑا ہوا دیکھا ہے۔ البتہ عیسائی غلام جو اس سلطنت کے تمام حصوں سے یہاں آتے ہیں ان سے اس ملک کو کسی قدر مدد ملتی ہے۔ لیکن اگر اس سلطنت کا طرزِ حکمرانی آئندہ بہت برسوں تک ایسا ہی رہا تو بالضرور یہ اپنی ہی اندرونی کمزوری کی وجہ سے تباہ ہو جائے گی۔ اگرچہ بخوبی ظاہر ہے کہ بالفعل یہ کمزوری ہی اس کے قیام کا باعث ہے۔ کیونکہ کسی صوبہ کا کوئی فرمانروا یا کوئی اور شخص اتنی استطاعت نہیں رکھتا کہ کوئی چھوٹی سی بھی مہم کر سکے یا اس قدر سپاہی کہ جو اس کے لئے مکتفی ہوں، بہم پہنچا سکے۔ کیا عجیب بات ہے کہ جو امر اس سلطنت کے زوال کا باعث ہے وہی اس کے چندروزہ قیام کا موجب ہے۔

پیگو کے وزیر کی ایک عجیب اور مضحکہ آمیز تدبیر کا ذکر

حقیقت یہ ہے کہ ان صورتوں میں بغاوت اور فساد کے روکنے اور اس قسم کے خطرات کے انسداد کامل کی غرض سے وہی عجیب و غریب تدبیر اس ملک کے بھی مناسب حال معلوم ہوتی ہے جو ملک پیگو کے ایک برہمن (۱۹۰) نے اختیار کی تھی کہ بہت عرصہ تک زمین کا جوتنا بونا بند کر دیا۔ ملک کو جنگل اور بن بنا دیا اور سچ مچ آدھی رعیت بھوکوں مار ڈالی۔ مگر اس سے بھی کچھ نہ ہوا اور اس کی یہ عمدہ تدبیر یوں ہی گئی۔ کیونکہ ملک کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا اور تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ اس ملک کے دارالحکومت شہر ادا پر تھوڑے سے چینی جو بھاگ کر آئے تھے، قبضہ کرنے والے تھے۔

مگر بہر حال ہم کو تسلیم کرنا چاہئے کہ ہمارے جیتے جی غالباً سلطنت روم کے بالکل برباد ہو جانے کی کم امید ہے اور ہم خوش ہوں گے کہ اس سے زیادہ اس کی خراب حالت نہ دیکھیں کیونکہ اس کی ہمسایہ ریاستوں کا تو یہ حال ہے کہ اس پر حملہ آور ہونا تو کیا بیرونی امداد کے بغیر اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکتیں اور بیرونی امداد کی یہ کیفیت ہے کہ بعد مسافت اور حسد اور رقابت کی وجہ سے اس کے پہنچنے میں دیر ہوتی ہے اور اسی وجہ سے وہ امداد ناکافی بھی ہے اور ناقابلِ اعتماد بھی۔

اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ اس امر کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایشیا

کی سلطنتیں مفید قوانین سے کیوں مستفید نہیں ہو سکتیں اور صوبہ جات کے لوگ وزیر اعظم یا خود بادشاہ کے حضور میں استغاثہ کیوں نہیں کر سکتے تو میں قبول کرتا ہوں کہ البتہ وہاں بھی عمدہ قوانین ہیں اور بشرطِ ان پر کامل طور سے عمل ہو تو ایشیا بھی دنیا کے اور ملکوں کی طرح پسندیدہ بودوباش کے قابل ہو جائے۔ لیکن جبکہ ان پر عمل نہ ہو اور نہ اس امر کا امکان ہو کہ بزور ان پر عمل کرایا جاسکے تو ایسے قوانین سے کیا فائدہ اور جبکہ حکام صوبہ جات اسی وزیر یا خود بادشاہ کے مقرر کردہ ہیں جو ان کی نسبت نالش سننے کی طاقت رکھتا ہے اور جبکہ فی الواقع ایسے ہی ظالم لوگوں کے سوا احکام کا مقرر کرنا وزیر اور بادشاہ کی دسترس سے بھی خارج ہے یا وہ وزیر یا خود بادشاہ کے نذرانہ لے کر مقرر کئے ہوئے ہیں تو ان کی نالش کس کے پاس کی جائے اور بالفرض اگر وزیر یا بادشاہ کا میلان خاطر لوگوں کی سماعتِ نالش کی طرف ہو بھی تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک غریب کسان یا ستم رسیدہ کاریگر چار سو یا پانچ سو میل کے سفر کا خرچ کثیر اٹھا کر دار السلطنت تک پہنچ سکے۔ اور اس کے سوا ایک یہ آفت ہے کہ یہ زبردست ظالم جیسا کہ اکثر ہوا ہے مستغیث کو راستہ ہی میں قتل کرا دیتے ہیں یا پس و پیش اس کو اپنے قابو میں لا کر جو دل میں آتا ہے سو کرتے ہیں اور اگر کسی اتفاق سے کوئی مستغیث بادشاہ تک پہنچ بھی جاتا ہے تو صوبہ دار کے طرفدار لوگ اصل حقیقت کو چھپا کر کچھ اور کا اور ہی بادشاہ سے کہہ دیتے ہیں۔ غرض کہ صوبہ داروں کو ان کے صوبہ جات کا بالکل مالک اور خود مختار حاکم سمجھنا چاہئے۔ وہ خود ہی جج ہیں، خود ہی پارلیمنٹ، خود ہی پریسائڈل کورٹ (عدالتِ اعلیٰ)، خود ہی اسیسَر (تشخیص جرم کرنے والے) اور خود ہی محاصلِ شاہی کے وصول کرنے والے۔ چنانچہ ایک ایرانی نے ان ظالم اور لالچی صوبہ داروں اور جاگیرداروں اور مستاجروں کی نسبت کیا ہی خوب کہا ہے کہ ”اینہا کہ از ریگ روغن میکشند“ اور اصل بات تو یہ ہے کہ ان کی عورتوں اور بچوں اور غلاموں اور لٹیرے مصاحبوں کے اخراجات کے لئے تو کوئی بھی آمدنی مکتفی نہیں ہو سکتی۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ہمارے ملک فرانس کے بادشاہوں کی ملکیت خاص کی زمینیں ایسی ہی جوتی بوئی جاتی ہیں اور نہایت کثرت سے لوگ ان میں آباد ہیں جیسی کہ رعایا کی ملکیت کی زمینیں جوتی بوئی جاتی ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی سلطنت کا جہاں کا بادشاہ صرف چند قطعات کا مالک ہے، ایسی سلطنت کے ساتھ کہ جس کی کل زمین بادشاہ ہی کی ملکیت ہے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ فرانس میں آئین و قوانین ایسے معقول ہیں

کہ ان کی تعمیل سب سے اول بادشاہ پر واجب ہے اور جو زمینیں اس کے قبضہ میں ہیں ان میں جو حق کسی کاشتکار کو حاصل ہے وہ اس کو زائل نہیں کر سکتا اور اس کے کارندوں اور مستاجروں پر قانون کے موافق نالش ہو سکتی ہے اور مظلوم کسان یا کاریگر بے شک اپنے انصاف کو پہنچ سکتا ہے۔ لیکن ایشیا میں کمزور اور مظلوموں کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہے اور قانون جس سے تمام جھگڑے فیصلہ پاتے ہیں، صرف حاکم کا سونٹا یا اس کی بے ٹھکانے اور رنگارنگ رائے ہے۔ مجھے امید ہے کہ بعض لوگ یہ کہیں گے کہ بعض فوائد ایسے ہیں کہ درحقیقت حکومت شخصیہ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً وکلائے عدالت بہت کم ہوتے ہیں اور مقدمات بھی زیادہ دائر نہیں ہوتے اور جو دائر ہوتے ہیں وہ بہت جلد فیصل ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ مقدمات کے انفصال میں طوالت کا ہونا ہر ایک سلطنت کے لئے سخت عیب ہے اور بالضرور بادشاہ پر اس خرابی کی اصلاح واجب ہے۔ لیکن یہ لوگ خواہ کچھ ہی کہا کریں مگر ہم تو ایران کی اس پرانی مثل کی بہت بڑھ کر تعریف نہیں کر سکتے کہ "ناحق کوتاہ بہتر از حق دراز" کیونکہ یہ امر یقینی ہے کہ اس طوالت کے رفع کرنے کا اس سے زیادہ مؤثر علاج اور کچھ نہیں ہے کہ رعایا کا حق ملکیت مٹا دیا جائے اور جب یہ حق نہ رہے گا تو بے شمار قانونی کارروائیوں کی ضرورت خود ہی نہیں رہے گی۔ خصوصاً ان کارروائیوں کی جو اہم اور طول وطویل اور پیچیدہ مقدمات میں ہوتی ہیں اور نہ بہت سے مجسٹریٹوں اور ججوں کے رکھنے کی حاجت ہو گی اور نہ بڑے بڑے وکلا اور مختار کاروں کی جماعتِ کثیر کی' جن کی گزر اوقات صرف مقدمات ہی پر موقوف ہے احتیاج ہو گی۔ لیکن کچھ شک نہیں ہے کہ یہ علاج مرض سے بدرجہا بدتر ہو گا اور جو مصیبت اس سے ملک پر پڑے گی اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور بجائے مجسٹریٹوں اور ججوں کے جن کی دیانت اور امانت پر بادشاہ بھروسہ کر سکتا ہے، رعایا کے لوگ اسی قسم کے حکام جابر کے اختیار میں جا پڑیں گے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ممالکِ ایشیا میں اگر کبھی انصاف ملتا ہے تو صرف ان غریب اور کم درجہ کے لوگوں کو ملتا ہے جو قاضیوں کو رشوت دینے کا مقدور نہیں رکھتے یا کچھ دے کر جھوٹے گواہ نہیں بنا سکتے جو ہمیشہ بہت سستے اور کثرت سے مل سکتے ہیں اور جو کبھی سزا نہیں پاتے۔

میرا یہ بیان اپنے کئی برس کے تجربہ پر مبنی ہے اور مجھے مختلف ذریعوں سے ان امور سے واقفیت حاصل ہوئی ہے اور یہ اس تحقیق کا نتیجہ ہے جو ہندوستانی اور یورپین

سوداگروں سے جو عرصہ سے اس ملک میں کاروبار کرتے ہیں اور مختلف سلطنتوں کے سفیروں اور کانسلوں اور ترجمانوں سے نہایت کوشش کے ساتھ میں نے کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری یہ شہادت میرے اکثر ہم وطن سیاحوں کے بیان کے برخلاف ہے۔ شاید انہوں نے کسی شہر میں راستہ چلتے دو ذلیل شخصوں کو دیکھ لیا ہو گا کہ قاضی نے ان میں سے ایک کے یا دونوں کے تلوؤں (۱۹۱) پر سخت چوٹیں لگوا کر جلدی سے کچہری سے باہر نکلوا دیا ہو گا یا دونوں کو "مے بیل بابا" (معلوم نہیں کون سے الفاظ کی خرابی ہے) یا کچھ اور ایسے ہی ملائم الفاظ کہہ کر جو قاضی لوگ اس وقت کہہ دیا کرتے ہیں جب کہ ان کو فریقین میں سے کسی سے کچھ فتوح کی امید نہیں ہوتی، جلدی سے رخصت کر دیا ہو گا۔ اور کچھ شک نہیں ہے کہ کارروائی کا یہ مختصر طریقہ دیکھ کر ان کو بہت بڑا تعجب ہونا ہی تھا اور وہ اسی وجہ سے فرانس میں یہ کہتے ہوئے پہنچے کہ "واہ واہ کیا خوب اور کیسا جلدی انصاف ہوتا ہے اور اے! راستی شعار قاضیان ہندوستان! فرانس کے مجسٹریٹوں کو تمہارے نمونہ پر چلنا چاہئے"۔ اور ان بے چاروں کو اس کا خیال بھی نہیں ہوا کہ جھوٹے شخص کو اگر اس قدر استطاعت ہوتی کہ پانچ سات روپیوں سے قاضی یا اس کے محرروں کی مٹھی گرم کر دیتا یا دو چار روپیہ خرچ کر کے دو جھوٹے گواہ بہم پہنچا لیتا تو بے شک جیت جاتا یا مقدمہ کو جس قدر طول دینا چاہتا دے سکتا۔

جناب من۔ میں نہایت سچائی سے پھر عرض کرتا ہوں کہ اگر حق ملکیت جائیداد زائل کر دیا جائے تو ظلم' بے انصافی' افلاس اور وحشت اس کے لازمی نتیجے ہوں گے اور زمین کا تردد موقوف ہو کر ملک سنسان اور ویران ہو جائے گا۔ اور خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس سے بادشاہ اور قوم دونوں کی تباہی اور بربادی کا راستہ کھل جائے گا۔ کیونکہ دنیا میں انسان اسی امید پر محنت کرتا ہے کہ اس کا پھل اس کو اور اس کی اولاد کو ملے اور یہ امید ہی ہر ایک فائدہ مند اور عمدہ شے کی بنیاد ہے اور اگر ہم دنیا کی سلطنتوں کی حالت پر نظر ڈالیں تو ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی ترقی یا زوال صرف اسی اصول کے لحاظ یا عدم لحاظ پر موقوف ہے۔ مختصر یہ کہ اسی اصول کے عملدرآمد یا اس سے غفلت کرنے کا نتیجہ ہے جو ملکوں کی حالت پلٹتی اور بدلتی رہتی ہے۔

ڈاکٹر برنیرؔ کے چند خطوط متضمن حالاتِ ہندوستان

ہر کہ عاقل بود از خوبی عنواں داند   کہ دریں نامہ چہ اسرار نکو خواہد بود

مصنف کا پہلا خط بنام موسیو دی مرویلیس (۱۹۲) من مقام دہلی مورخہ دسمبر ۱۶۶۴ء متضمن حالاتِ سفر اورنگزیب بجانبِ کشمیر جنت نظیر

اورنگ زیب کا بیماری سے شفا پا کر بغرض تبدیلیٔ آب وہوا کشمیر کو جانا

صاحبِ من! جب سے اورنگ زیب کا مزاج مائل بصحت ہوا ہے اسی وقت سے یہ خبر برابر مشہور ہو رہی تھی کہ بادشاہ بغرض تبدیلی آب وہوا اور آئندہ گرمی سے بچنے کے لئے جس کے باعث عودِ مرض کا اندیشہ تھا، لاہور اور کشمیر کی سیر کا عزم رکھتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بہت سے عقیل آدمیوں کو اس بات کے یقین کرنے میں تامل تھا کہ جس

حالت میں کہ اس کا باپ آگرہ کے قلعہ میں مقید ہے وہ ایسا دور و دراز سفر کرنے کی جرأت کس طرح کرے گا!

اورنگ زیب کے سفر کشمیر کا زیادہ تر باعث روشن آرا بیگم کی تحریک تھی

لیکن بہر حال حفظ صحت کے خیالات مصالح سلطنت پر غالب آئے! اور زیادہ تر روشن آرا بیگم کی ترغیب و تحریص اس کا باعث ہوئی جو بہت دنوں سے اس امر کی آرزومند تھی کہ بہ نسبت اپنے محلات کی ہوا کے زیادہ صاف ہوا سے تفریح حاصل کرے اور اس اپنے اقتدار کے زمانہ میں شاہانہ کروفر سے فوج کے ساتھ جائے جیسے کہ اس کی بہن بیگم صاحب شاہجہاں کے عہد میں گئی تھی۔

اورنگ زیب کا چھٹی دسمبر ۱۶۶۴ء کو مہورت کے موافق دہلی سے لاہور کو کوچ کرنا

الغرض بادشاہ نے اس مہینے کی چھٹی تاریخ، تین بجے دن کے جو جوتشیوں نے اس لمبے سفر کے واسطے مبارک ساعت مہورت تجویز کی تھی، کوچ کیا اور شالامار باغ میں جو پائے تخت سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے، جا کر قیام فرمایا اور وہاں چھ روز کامل اس غرض سے توقف فرمایا کہ اس لمبے سفر کے سامان کے واسطے جو ڈیڑھ برس میں ختم ہونے والا ہے، لوگوں کو فرصت اور مہلت ملے اور آج ہم سنتے ہیں کہ بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ خیام شاہی لاہور کی سڑک پر لگائے جائیں اور یہ کہ دو مقام کرنے کے بعد پھر کوچ میں اور زیادہ توقف نہ ہوگا۔

اورنگ زیب کے سفر کشمیر میں جو فوج ساتھ تھی اس کی تعداد

اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ صرف وہی پینتیس ہزار سوار نہیں ہیں جو بطور قاعدہ مقررہ ہمیشہ اس کے ہمرکاب رہتے ہیں اور نہ صرف وہ معمولی پیادہ سپاہ جو دس ہزار سے زیادہ ساتھ رہا کرتی ہے، بلکہ بھاری توپخانہ اور ہمرکاب توپخانہ بھی ساتھ ہے۔

ہمرکاب توپ خانہ اور اس کی وجہ تسمیہ

اس توپ خانہ کو ہمرکاب توپخانہ اس واسطے کہتے ہیں کہ وہ بادشاہ کی ذاتِ خاص

سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بھاری توپ خانہ وقت بے وقت راہ کے نشیب و فراز وغیرہ کے باعث رکابِ شاہی سے علیحدہ ہو کر پیچھے سے سہولت کے ساتھ آیا کرتا ہے۔

بھاری توپخانہ

بھاری توپ خانہ میں ستر توپیں ہوتی ہیں، جن میں زیادہ پیتل کی ہیں اور اکثر ایسی بھاری ہیں کہ بیلوں کی بیس بیس جوڑیاں ان کے کھینچنے کے واسطے ضروری ہیں اور بعض تو ایسی بھاری ہیں کہ جب راہ ناہموار ہو یا کہ چڑھائی کا موقع ہو تو معمولی بیلوں کی مدد کے واسطے ہاتھی درکار ہوتے ہیں تاکہ توپ کے تخت اور پہیوں کو اپنے سر اور سونڈ سے دھکیلیں۔

ہمرکاب توپخانہ کا بیان

ہمرکاب توپخانہ میں پچاس یا ساٹھ میدانی چھوٹی توپیں ہوتی ہیں اور سب پیتل کی ہیں اور ہر ایک توپ ایک چھوٹے سے خوبصورت اور خوش رنگ تخت پر چڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ جس پر زینت کے واسطے چند سرخ جھنڈیاں لگاتے ہیں۔ چنانچہ اس کا ذکر میں نے کسی اور مقام پر بھی کیا ہے۔ ہر توپ کو دو خوبصورت گھوڑے کھینچتے ہیں جن کو ایک گولنداز ہانکتا ہے اور ہر ایک جوڑی کے ساتھ ایک تیسرا گھوڑا کوتل ہوتا ہے جس کو ایک اور سپاہی لے کر چلتا ہے۔ یہ میدانی توپیں بہت تیز ہانکی جاتی ہیں تاکہ بارگاہ شاہی کے سامنے قائم کی جائیں اور اتنی پہلے پہنچ جائیں کہ بادشاہ کے لشکر گاہ میں پہنچتے ہی سلامی اتار سکیں۔

فوج و لشکر کی کثرت سے لوگوں کا یہ شبہ کرنا کہ کشمیر کی جگہ ہم قندھار کی مہم پر جاتے ہیں

یہ بادشاہی لشکر اور ہمرکاب فوج ایسی بڑی اور کثیر التعداد ہے جس سے لوگوں کو یہ شبہ ہو گیا ہے کہ ہم کشمیر جانے کی جگہ قندھار کے محاصرہ کے واسطے جاتے ہیں جو حدود ایران اور ہندوستان اور ملک ازبک کے مابین ایک نہایت کار آمد مقام ہے۔ قندھار ایک خوش نما اور زرخیز ملک کا دارالحکومت اور بڑی آمدنی کی جگہ ہے اور اس وجہ سے اس پر قبضہ حاصل کرنے کو بادشاہان ایران اور ہندوستان کے باہم بڑے بڑے سخت معرکے اور محاربے ہمیشہ وقوع میں آتے رہے ہیں۔ اس عظیم الشان فوج کے کوچ کا اصل میں خواہ کچھ ہی منشا اور مقصد ہو مگر ہر ایک متنفس کو جو اس سے علاقہ رکھتا ہے اب دہلی سے روانہ ہونے میں جلدی

کرنا ضروریات سے ہے۔ اگرچہ اس کے ضروری امور کیسے ہی مقتضی اس بات کے ہوں کہ کچھ توقف کرے۔ پس اگر میں اپنے جانے میں دیر لگاؤں تو لشکر میں شامل ہونا مجھے مشکل ہو جائے گا۔

نواب دانشمند خاں کے علمی شوق کا ایک ضمنی ذِکر

علاوہ بریں ہمارا نواب دانشمند خاں میرا نہایت منتظر ہے کیونکہ ہمارا آقا جو وزیر معاملات متعلق ممالکِ غیر اور سواروں کی فوج کا میر بخشی ہے، اپنے منصب کے اہم کاموں سے اس کو صبح کے وقت تو فرصت نہیں ملتی۔ اس وجہ سے وہ اپنے سہ پہر کے وقت کو جو کتبِ حکمیہ کے مطالعہ کے لئے مختص کیا ہوا ہے ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اس کو علم ہیئت اور جغرافیہ اور تشریح کا خاص شوق ہے اور وہ گیسینڈی اور ڈس کارٹس کی تصانیف کو بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔

مصنف کی تنخواہ اور ان چیزوں کا بیان جو سفرِ کشمیر میں اس نے ضروری سمجھ کر ساتھ لیں

پس اپنے ذاتی امور کا بندوبست کر لینے کے بعد میں آج رات کو ہی روانہ ہوں گا اور چلنے سے پہلے مجھے اس قدر اسباب و سامان درست کر لینا چاہئے جس قدر کہ رسالہ کے ایک ذی عزت عہدہ دار کو درکار ہے یا کیونکہ میری تنخواہ تین سو روپیہ ماہوار ہے اور اس لئے ضرور ہے کہ دو اچھے ترکی گھوڑے مع ایک سائیس کے میرے پاس ہوں اور ایک مضبوط ایرانی اونٹ بھی مع ایک شتربان کے ساتھ ہونا چاہئے اور ایک باورچی اور ایک خدمتگار ہونا چاہئے جو ملک کے دستور کے موافق پانی کی صراحی لے کر گھوڑے کے آگے آگے چلتا ہے۔ میں نے ضروری اور آرام کی اور بھی سب چیزیں ساتھ کے لئے تیار کر لی ہیں مثلاً ایک درمیانہ خیمہ ایک قالین اور ایک ہلکی سفری چارپائی جو چار ہلکے اور مضبوط بانسوں سے بنتی ہے اور ایک تکیہ اور دو لحاف جن میں سے ایک کو دوہرا کر کے توشک کا کام لیا جاتا ہے اور ایک گول چرمی سفرہ کھانا کھانے کے واسطے اور چند رنگین رومال اور تین چھوٹے تھیلے باورچی خانہ کے ظروف اور گلی ظروف وغیرہ کے واسطے، جو یہ سب ایک بڑے تھیلے میں رکھے جاتے ہیں اور یہ بڑا تھیلا پھر ایک ٹاٹ کے بڑے سے شلیتہ میں جس کے دو حصے ہوتے

ہیں اور جس میں تسمے لگے ہوئے ہوتے ہیں باندھا جاتا ہے۔ علاوہ بریں شلیتہ میں آٹا دال وغیرہ کھانے کی چیزیں مع آقا اور ملازموں کے بستر اور کپڑوں وغیرہ کے رکھی جاتی ہیں۔ میں نے احتیاطاً پانچ چھ روز کے خرچ کے موافق کچھ عمدہ چاول اور کچھ میٹھے بسکٹ بھی جن کو چاشنی اور نیبو کے عرق سے خوش ذائقہ بنایا گیا ہے، رکھ لئے ہیں۔ اس کے سوا باریک کپڑے کی ایک تھیلی مع ایک آہنی قلابے کے جس میں لٹکا کر دہی کو چھانا جاتا ہے، میں نے یاد کرکے ساتھ رکھ لی ہے کیونکہ اس ملک میں نیبو کا شربت اور دہی نہایت مفرح چیز ہے۔ یہ سب چیزیں جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے ایک بڑے شلیتہ میں باندھ دی گئی ہیں جو حسب معمول اسباب ڈھنگا پھیلا ہوا ہے کہ اسے تین چار آدمی مشکل سے اونٹ پر لاد سکتے ہیں۔ حالانکہ اونٹ شلیتہ کے نہایت قریب بیٹھا ہوا ہوتا ہے اور لادنے والوں کو صرف اتنا ہی کرنا ہوتا ہے کہ شلیتہ کا ایک سرا زمین سے اٹھا کر اونٹ کی پیٹھ پر الٹ دیں۔ ایسے لمبے سفر میں اگر آرام چاہو تو مذکورہ بالا اشیاء میں سے ایک بھی فالتو نہیں ہے۔ کیونکہ ایسے ملک میں ہم کو فرانس کے سے "ان" یعنی مسافر خانوں اور آرام و آسائش کے سامان کی بہم رسی کی امید نہیں ہے اور ہماری مہماں سرا صرف ہمارا وہی ڈیرہ ہے جس کو عرب اور تاتاریوں کی طرح ہم کو ایک منزل سے اکھاڑ کر اور دوسری منزل پر لے جا کر روزمرہ اگانا چاہئے۔ اور ہم اپنی حاجت روائی لوٹ کھسوٹ سے بھی نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ ہندوستان میں ایک ایک بسوہ زمین خالصہ شریفہ سمجھی جاتی ہے اور رعیت پر دست درازی اور تعدی کرنا گویا بادشاہ کے مال میں دست اندازی کرنا ہے۔

شہر دہلی کی بازاری روٹی اور پانی کی خرابی اور اس سے ناروے کی بیماری کے پیدا ہونے کا ذِکر

اس طویل سفر کے اختیار کرنے میں میرے دل کو صرف اتنی ہی خوشی ہے کہ ایک تو ہم شمال کی طرف کوچ کرتے ہیں دوسرے یہ کہ معمولی برسات کی بارشیں ہو چکی ہیں اور موسم سرما کا آغاز ہے اور فی الحقیقت ہندوستان میں سفر کے واسطے یہی موسم مناسب ہے کیونکہ جاڑے کے شروع میں بارش بھی ہو چکتی ہے اور گرمی اور گرد بھی ایسی نہیں رہتی کہ جس کی برداشت نہ ہو سکے اور میں اس خیال سے بھی خوش ہوں کہ اب مجھ کو دہلی کے بازار کی روٹی کھانے کی آفت اٹھانی نہ پڑے گی جو اکثر خراب پکائی جاتی ہے اور گرد و غبار سے

صاف نہیں ہوتی اور اب یہ بھی امید ہے کہ پینے کا پانی بھی دہلی سے بہتر ملے گا جس کا میلا پن مجھ سے بیان نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انسان وحیوان بے دھڑک وہاں تک پہنچ سکتے ہیں اور پانی کو انواع واقسام کے میل کچیل کا مخزن بنائے رکھتے ہیں۔ اس پانی سے بہت عسیر العلاج تپیں پیدا ہوتی ہیں اور پنڈلی میں کیڑے یعنی نارو ے پیدا ہو جاتے ہیں جن میں بڑی سخت سوزش اور ورم ہوتا ہے اور آئندہ بڑے بڑے اندیشے ہوتے ہیں۔ اگر مریض دہلی سے کہیں چلا جائے تو یہ کیڑے جلد دفع ہو جاتے ہیں اگرچہ کبھی کبھی ایک برس اور کبھی اس سے بھی زیادہ عرصہ تک تکلیف دیتے ہیں۔ یہ کیڑے اکثر عرض وطول میں چکارے کے تارے تانت کے موافق ہوتے ہیں اور جن پر بے تکلف نس یا پٹھے کا دھوکا ہوتا ہے۔ ان کے نکالنے میں بڑی احتیاط کرنی چاہئے تاکہ ٹوٹ نہ جائیں اور ان کے نکالنے کی سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ ایک تنکے پر لپیٹ کر روزمرہ آہستہ آہستہ اور تھوڑا تھوڑا نکالا جائے۔

دربار دہلی کے امرا کا معمولی پانی کی جگہ گنگا جل استعمال کرنا

میرے لئے یہ بات نہایت اطمینان کی ہے کہ میں اس قسم کی بے آرامیوں اور خطروں سے محفوظ رہوں گا کیونکہ ہمارے نواب نے نہایت مہربانی سے حکم دیا ہے کہ ایک تازہ خانہ ساز روٹی اور گنگا کے پانی کی ایک صراحی ہر روز صبح کے وقت مجھے عنایت ہوا کرے کیونکہ اور امرائے دربار کی طرح ہمارے نواب نے بھی اپنے ساتھ کے لئے گنگا جل کے بہت سے اونٹ لدوائے ہیں۔

صراحی یا مٹی کے برتنوں میں پانی ٹھنڈا رکھنے کی ترکیب اور اس کی وجہ

پانی کی صراحی ایک ٹین (۱۹۳) کا برتن ہے جس پر سرخ کپڑا منڈھا ہوا ہوتا ہے اور اس کو ایک خدمتگار ہاتھ میں لے کر اپنے آقا کے گھوڑے کے آگے آگے چلتا ہے۔ اس میں عموماً ایک سیر پانی آتا ہے لیکن میں نے اپنی صراحی قصداً دو سیر کی بنوائی ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ تدبیر میرے لئے بہت مفید ہو گی۔ اس صراحی میں پانی خوب ٹھنڈا رہتا ہے بشرطیکہ وہ کپڑا جو اس پر منڈھا ہوا ہوتا ہے تر رہے اور صراحی بردار اسے ہلا ہلا کر ہوا دیتا رہے یا اسے ایک ہوادار جگہ میں جیسا کہ یہاں عموماً معمول ہے، زمین سے اونچی ایک تپائی پر رکھا جائے تاکہ زمین کی گرمی صراحی کو نہ لگے۔ پس کپڑے کی نمی اور ہوا میں ہلانا یا ہوا میں رکھنا پانی ٹھنڈا رہنے کے واسطے ازبس ضروری ہے۔ گویا کہ یہ نمی جس سے کپڑا تر ہے ان

چھوٹے چھوٹے آتشی اجزا (فائری پارٹی کلز) کو جو ہوا میں ہوتے ہیں اور جن سے پانی گرم ہو جاتا ہے صراحی کے اندر داخل ہونے سے روک لیتی ہے۔ مع ہذا ان شور یلے اجزا (نائٹرس پارٹی کلز) اور اور اجزا کو جو اس کپڑے اور ظرف کے اندر گھس کر پانی میں سکون کا اثر پیدا کر کے اس کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں، نہیں روکتی۔ جس طرح شیشے میں سے روشنی تو اندر آجاتی ہے مگر پانی نہیں آسکتا اور یہ امر شیشہ کی بناوٹ اور اس کے اجزا کی خاصیت اور اس فرق کی وجہ سے ہے جو پانی اور روشنی کی لطافت (۱۹۴) میں ہے۔

یہ صراحی کہیں باہر جانے کے وقت کام آتی ہے لیکن جب ہم لوگ مکان پر ہوتے ہیں تو پانی کو مٹی کے مٹکوں میں جو مسامدار مٹی سے بنائے جاتے ہیں، رکھتے ہیں اور ان پر تر کپڑا لپیٹے ہیں اور اگر یہ مٹکے ہوا میں رکھے جائیں تو ان کا پانی ان صراحیوں سے بھی زیادہ خنک ہوتا ہے۔

شورہ سے پانی ٹھنڈا کرنے کی ترکیب

بڑے امرا خواہ شہر میں ہوں خواہ لشکر میں، شورہ استعمال کرتے ہیں اور اس کی ترکیب یہ ہے کہ پانی یا جو چیز سرد کرنی منظور ہو جست کی صراحی میں، جس کی گردن لمبی اور پیٹ گول انگریزی بوتل کا سا ہوتا ہے، ڈال کر اس کو سات یا آٹھ منٹ تک اس پانی میں ہلاتے ہیں، جس میں تین چار مٹھی شورہ ڈالا ہوا ہوتا ہے اور صراحی کے اندر کی چیز نہایت سرد ہو جاتی ہے اور کسی طرح ناگوار یا مضر نہیں ہوتی، جیسا کہ مجھے پہلے خیال ہوا تھا۔ مگر ابتدا کبھی کبھی کچھ تلیین کا اثر کرتی ہے۔ لیکن معلوم نہیں بجائے ان خیالوں کے کہ شام سفر سر پر کھڑی ہے اور اس ملک کی جلتی بلتی دھوپ میں، جو کسی موسم میں بھی کامل ایذا سے خالی نہیں ہے، روزمرہ چلنا پڑے گا اور ہر روز اسباب کس طرح لادا اور اتارا جائے گا اور نوکروں کو ہمیشہ یہ وہ کرنے کو کہا جائے گا اور کبھی خیمہ لگانا اور کبھی اکھاڑنا ہوگا اور کبھی رات کو اور کبھی دن کو کوچ کرنا پڑے گا خصوصاً جبکہ ایسی بے ٹھکانے اور خانہ بدوشی کی گزران یقیناً ڈیڑھ برس تک، جس کی بابت حکم مل چکا ہے، کرنی پڑے گی میں یہ علمی جھگڑے کیوں لے بیٹھا۔

لو یار اب خدا حافظ! میں اپنا وعدہ پورا کروں گا اور آپ کو اپنے حالات کی وقتاً فوقتاً اطلاع دیتا رہوں گا اور چونکہ فوج اس موقع پر نرم نرم کوچ کرے گی کیونکہ کچھ اضطراب اور کسی دشمن کا فکر تو ہے ہی نہیں بلکہ ایک بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت

سے جیسا کہ بادشاہان ہند کا معمول ہے کوچ ہوں گے۔ اس لئے میں سب دلچسپ واقعات لکھتا رہوں گا تاکہ لاہور پہنچتے ہی آپ کی خدمت میں بھیجوں۔

مصنف کا دوسرا خط بنام موسیو دی مرویلیس مورخہ ۲۵ فروی ۱۶۶۵ء من مقام لاہور

دہلی اور لاہور کے فاصلے اور شکار کھیلنے کی غرض سے دریائے جمنا کے کنارے کنارے اورنگ زیب کے آہستہ آہستہ کوچ کرنے کا ذِکر

صاحبِ من! یہ کوچ فی الواقع آہستہ اور باشان و شوکت طور کا ہے، جسے ہم یہاں اعلیٰ حضرت کا سفر کہتے ہیں۔ لاہور دہلی سے قریب سوا سو لیگ (۱۹۵) یا پندرہ منزل کے ہے مگر ہم کو لاہور پہنچنے میں قریب دو مہینے کے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ نے فوج کا ایک بڑا حصہ ساتھ لے کر شارع عام سے علیحدہ راستہ اختیار کیا تھا تاکہ شکار کے عمدہ عمدہ موقعے ہاتھ آئیں اور دریائے جمنا کا پانی آسانی سے ملتا رہے۔ چنانچہ ہم ان دونوں باتوں کی خاطر معمولی شارع عام سے دائیں طرف کو روانہ ہوئے اور جس طرح بادشاہ نے بہ لحاظ آرام و آسائش مناسب خیال کیا آہستہ آہستہ دریائے جمنا کے کنارے کوچ ہوتا رہا اور ایسی لمبی لمبی گھاس میں جس میں سوار بھی نظر نہ آتے تھے بندوق کا اور سب قسم کے شکاری جانوروں کا شکار ہوتا رہا اور سب طرح کا شکار بکثرت ملا اور اب ہم ایک عمدہ شہر میں بڑے آرام سے ٹھہرے ہوئے ہیں اور مجھ کو اپنے صرفِ اوقات کے واسطے اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں ہے کہ وہ طرح طرح کے حالات جن کی طرف میرا دل دہلی چھوڑنے کے وقت سے متوجہ رہا ہے، قلمبند کروں۔ مجھے امید ہے کہ میں بہت جلد آپ کو کشمیر کی سیر کراؤں گا اور آپ کو ایک ایسا ملک دکھاؤں گا جو دنیا میں ایک نہایت خوشنما قطعہ (۱۹۶) ہے۔

بادشاہی پیش خانہ (پیش خیمہ) کے سازو سامان اور باربرداری وغیرہ کا ذِکر

جب کبھی بادشاہ بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ سفر کرتا ہے تو اس کے ذاتی آرام و

آسائش کے لئے دوہرا سامان خیموں ڈیروں وغیرہ کا ہمراہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک پورا سامان ہمیشہ ایک دن آگے جاتا ہے تاکہ بادشاہ کو منزل پر پہنچتے ہی سب طرح سے سجا سجایا اور تیار ملے اور اسی واسطے اس کو پیش خانہ (پیش خیمہ) کہتے ہیں۔ یہ دونوں پیش خانے قریبا ایک ہی سے ہیں اور ایک پیش خانے کے اٹھانے کے واسطے ساٹھ ستر ہاتھی، دو سو اونٹ، سو خچر اور سو حمال درکار ہوتے ہیں۔ بھاری اسباب تو ہاتھیوں پر لادا جاتا ہے جیسے بڑے بڑے ڈیرے اور ان کی بھاری بھاری چوبیں جو باعث درازی اور وزن کے تین ٹکڑوں کی ہوتی ہیں اور چھوٹے ڈیرے اونٹوں پر لادے جاتے ہیں اور باورچی خانہ کا سامان خچروں پر اور ہلکی اور زیادہ قیمتی چیزیں حمال لے جاتے ہیں جیسے چینی کے برتن جو بادشاہی دستر خوان پر لگائے جاتے ہیں اور روغنی یا ملمع کے پاؤں کے پلنگ اور وہ قیمتی خرگاہ جس کا ذکر ہم بعد ازیں کریں گے۔

خیام شاہی کے لئے جس احتیاط سے اور جس قدر جگہ تجویز کی جاتی ہے اور جس قرینے سے شاہی ڈیوڑھی اور خیمہ عام و خاص اور خلوت خانہ وغیرہ لگائے جاتے ہیں اس کا ذِکر

پیش خانے کے منزل پر پہنچتے ہی میر سامان ایک عمدہ موقع خیام شاہی کے واسطے تجویز اور انتخاب کرتا ہے اور کامل توجہ کے ساتھ حتی الامکان اس میں کوشش کرتا ہے کہ تمام لشکر گاہ نسبت اور قرینہ کے ساتھ ہو اور ایک مربع قطعہ جس کی چاروں طرفیں تین تین سو معمولی قدم کی تعداد سے زیادہ ہوتی ہیں، داغ بیل لگا کر محدود کر دیا جاتا ہے اور سو بیلدار فوراً اس کو صاف و ہموار کر کے اس کی سطح کو چبوترے کے طور پر ذرا بلند کر دیتے ہیں۔ پھر اس کے گرداگرد قناتیں جن کی بلندی سات یا آٹھ فرانسیسی فٹ کے برابر ہوتی ہے، گھیر دی جاتی ہیں' جن کے کھڑے کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ میخیں گاڑ کر ان کی رسیوں کو ان سے باندھ دیا جاتا ہے اور ہر دس قدم کے فاصلہ پر دو دو چوبیں جن کے نیچے کے سرے زمین پر جمے ہوئے ہوتے ہیں، تھامنے کے واسطے دونوں طرف اس طور پر کھڑی کی جاتی ہیں کہ ایک چوب دوسری کے سہارے ہوتی ہے۔ یہ قناتیں ایک مضبوط کپڑے کی بنائی جاتی ہیں اور اس پر ہندوستانی چھینٹ سے نقش و نگار اور پھول وغیرہ بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔

بادشاہی ڈیوڑھی جو اس مربع قطعہ کے ایک ضلع کے عین وسط میں رکھی جاتی

ہے، وسیع اور مکلف ہوتی ہے اور اس کی قناتوں کے اندر نقش و نگار بہ نسبت ان قناتوں کے جن سے اس قطع کی باقی طرفیں گھیری جاتی ہیں، زیادہ خوشنما اور خوبصورت اور قیمتی ہوتی ہیں۔

خیمہ معروف عام و خاص اور بادشاہ کے دونوں وقت دربار کرنے کا ذِکر

وہ پہلا اور سب سے بڑا ڈیرہ جو خیام شاہی میں لگایا جاتا ہے اس کو "عام و خاص" کہتے ہیں، جہاں بادشاہ اور امرا نو بجے صبح کے جمع ہو کر امورِ سلطنت پر غور اور انصاف و عدالت کیا کرتے ہیں۔ ہندوستان کے بادشاہ خواہ تخت گاہ میں ہوں خواہ سفر میں روزمرہ دو دفعہ دربار کرتے ہیں، جن میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا اور یہ دستور ایک فرض واجب اور منجملہ آئین سلطنت سمجھا جاتا ہے جس کی بجا آوری میں بہت ہی کم فروگزاشت ہوتی ہے۔

خیمہ معروف غسل خانہ کا ذِکر

دوسرا ڈیرہ جو ذرا چھوٹا اور اندر کی طرف کو کچھ بڑھا ہوا ہوتا ہے، اس کو غسل خانہ کہا جاتا ہے۔ یہاں سب امرا شام کے وقت مجرے کے لئے اسی قاعدہ سے جمع ہوتے ہیں جیسے کہ خاص دہلی میں۔

شام کے دربار کے لئے مشعلوں کے ساتھ امرا کے آنے جانے کا ذِکر اور مشعل بنانے کی ترکیب

اس شام کے دربار سے امرا کو بہت بے آرامی اور تکلیف ہوتی ہے لیکن جب وہ خیمہ گاہ شاہی کے طویل طویل سنٹروں میں سے مشعلیں ساتھ لئے ہوئے غسل خانہ کی طرف جاتے یا وہاں سے اپنے ڈیروں کو واپس آتے ہیں تو دور سے اندھیری رات میں یہ ایک بڑا دلچسپ تماشا دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ یہ مشعلیں ہمارے وطن فرانس کی طرح موم سے نہیں بنتیں لیکن بہت دیر تک جلتی ہیں اور صرف اس طرح سے تیار کی جاتی ہیں کہ ایک لکڑی پر لوہے کی ایک نلکی جڑی جاتی ہے اور اس کے اندر گودڑ کا ایک موٹا فتیلہ لگایا ہوا ہوتا ہے جو تیل میں تر ہوتا ہے اور جس پر تھوڑی دیر کے بعد تیل کی کپی سے جو مشعلچی کے ہاتھ میں رہتی ہے اور جس کا گلا تنگ اور لمبا لوہے یا پیتل کا بنا ہوا ہوتا ہے تیل ڈالتے اور بوقت ضرورت اس گودڑ کو بدلتے رہتے ہیں۔

خیمہ معروف خلوت خانہ کا ذِکر

ان دونوں سے چھوٹا اور زیادہ اندر کو بڑھ کر ایک تیسرا خیمہ ہوتا ہے جس کو خلوت خانہ کہتے ہیں۔ اس خیمہ میں سوائے بڑے بڑے امرا اور وزرا کے کوئی شخص دخل نہیں پاتا اور سلطنت کے امور اہم اور خاص کے سرانجام کے لئے یہی جگہ ہے۔

بادشاہ کے خاص الخاص خیموں کا ذِکر

خلوت خانہ سے اور آگے کو بادشاہ کے خاص الخاص خیمے ہوتے ہیں جن کے گردا گرد ذرا چھوٹی قناتیں جو قد آدم سے زیادہ نہیں ہوتیں، لگی رہتی ہیں۔ ان قناتوں میں سے بعض کے اندرونی جانب مچھلی پٹن کی عمدہ چھینٹ چڑھی ہوئی ہوتی ہے جس پر صدہا مختلف قسم کے پھول بنے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض ریشمی مشجر سے آراستہ اور باریک ریشمی جھالر ان پر لگی ہوئی ہوتی ہے۔

بیگمات اور محل سرا کی متعلقہ مستورات کے خیموں کا ذِکر

ان شاہی خیموں کے متصل بیگمات اور اور معزز خاتونوں اور محل کی بڑی بڑی نوکروں چاکروں کے ڈیرے لگتے ہیں۔ یہ ڈیرے بھی مکلّف قناتوں سے گھرے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے بیچ میں ادنیٰ درجہ کی عورتوں یعنی اصیلوں اور خانہ زادوں اور اور ملازم عورتوں اور متعلقات محلسرا کے ڈیرے ہوتے ہیں اور یہ ڈیرے ان عورتوں کے مراتب اور درجہ کے لحاظ سے قرینہ کے ساتھ لگائے جاتے ہیں۔

خیمہ معروف عام خاص کی اونچائی اور تکلفات وغیرہ کا بیان

عام و خاص اور پانچ چھ اور خیمے سب ڈیروں سے بلند ہوتے ہیں جس سے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ گرمی سے حفاظت ہو دوسرے یہ کہ دور سے پہچانے جا سکیں۔ ان کے باہر کی جانب کا کپڑا مضبوط اور سخت سرخ رنگ کا ہوتا ہے جس پر سجاوٹ کے لئے بڑی بڑی رنگا رنگ کی پٹیاں لگی ہوئی ہوتی ہیں (جس سے مصنف کی مراد غالباً پتا پٹی کا کام ہے) لیکن اندر کی جانب خوبصورت مچھلی پٹن کی چھینٹ ہوتی ہے جو مخصوص اسی کام کے واسطے بنائی جاتی ہے جس پر عمدہ اور بڑھیا رنگ رنگ کے ریشمی مشجر لگے ہوئے اور اس پر ریشم یا سرخ و سفید زری کا کار چوبی یا چلن کا کام مع نہایت نفیس اور باریک جھالر کے بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں

تین چار انچ موٹے روئی کے گدیلوں کا فرش ہوتا ہے اور ان پر مکلّف قالین اور زربفت کی مربع مسندیں آرام سے تکیہ لگا کر بیٹھنے کے لئے بچھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان خیموں کی چوبیں ملمع یا عمدہ روغن کاری کی ہوتی ہیں۔

اور ان دونوں ڈیروں میں، جن میں بادشاہ مع امرا و ارکان دولت رونق بخش ہو کر نظم و نسق امور مملکت کیا کرتا ہے، بادشاہ کے لئے ایک نہایت ہی مکلّف اور آراستہ مرتفع جگہ ہوتی ہے جس پر ایک مخملی یا ریشمی مشجر کے وسیع شامیانہ کے تلے بیٹھ کر بادشاہ لوگوں کا سلام مجرا لیتا اور عرضِ حال سنتا ہے۔

خرگاہ کا بیان

اور ڈیروں میں بھی ایسے ہی شامیانے ہوتے ہیں مگر ان میں خرگاہیں ہوتی ہیں جو مثل ایک چھوٹی سی کوٹھری کے ہیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے دروازوں میں چاندی کے قفل لگے رہتے ہیں۔ خرگاہ کا نقشہ سمجھنے کے لئے یہ تصور کر لینا چاہئے کہ گویا ہمارے ملک فرانس کا لیٹ جانے والا ایک مربع چھپر کھٹ (۱۹ ے) ہے جو بہ مقدار دو چھپر کھٹوں کے بلندی میں ہے مگر چھت اس کی چورس نہیں ہے بلکہ گنبد کی طرح کی ہے۔ لیکن خرگاہ اور چھپر کھٹ میں بڑا فرق یہ ہے کہ خرگاہ کے چاروں طرف پردوں کی جگہ بہت پتلے اور سبک باہر کی جانب ملمع یا روغن کئے ہوئے تختے لگے ہوئے ہوتے ہیں اور زیبائش کے واسطے گرداگرد ریشم اور زری کی جھالر لگی ہوئی اور اندر کی طرف قرمزی رنگ کا ریشمی مشجر یا زربفت منڈھا ہوا ہوتا ہے۔

ان حالات کے لکھنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ اس مربع قطعہ کے اندر جو جو امور قابلِ بیان و لحاظ تھے، میں نے ان میں سے کوئی نہیں چھوڑا۔

شاہی ڈیوڑھی کے دونوں طرف سجے سجائے کوتل گھوڑوں کے کھڑے رہنے اور ہمرکاب توپخانہ کی توپوں کا ذکر

اب اس مربع قطعہ کے باہر کی جانب کے منظر کا ذکر کرتے ہوئے پہلے میں ان دو خوبصورت ڈیروں کا ذکر کرتا ہوں جو شاہی ڈیوڑھی کے دونوں جانب ہوتے ہیں۔ یہاں پر چند عمدہ کوتل گھوڑے کسے کسائے اور نہایت مکلّف ساز و سامان سے سجے سجائے کھڑے

رہتے ہیں تاکہ کسی ناگہانی ضرورت کے وقت فوراً کام آسکیں لیکن بڑی غرض اس سے شان و شوکت اور تکلف دکھاتا ہے۔

اسی شاہی ڈیوڑھی کے دونوں طرف ہمرکاب توپخانہ کی پچاس ساٹھ توپیں جو چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں، ایک قاعدہ سے لگی رہتی ہیں اور جس وقت بادشاہ خیمہ میں داخل ہوتا ہے اطلاع اہلِ لشکر کے لئے انہی سے سلامی کی جاتی ہے۔

خیمہ معروف نقار خانہ کا ذِکر

بادشاہی ڈیوڑھی کے سامنے بقدر مناسب و ممکن ایک وسیع صحن جس میں کوئی خیمہ وغیرہ بالکل نہیں لگایا جاتا ہمیشہ چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس صحن کی انتہا پر ایک بڑا ڈیرہ کھڑا ہوتا ہے جس کو نقار خانہ کہتے ہیں۔ کیونکہ اس جگہ نقارے اور شہنائیں رہتی ہیں۔

امراء کے چوکی دینے کا ذِکر

اسی ڈیرہ کے قریب ایک اور بہت بڑا ڈیرہ لگتا ہے جس کو چوکی خانہ کہتے ہیں یہاں امرا نوبت بہ نوبت ہفتہ میں ایک بار چوبیس گھنٹے پہرہ دیتے ہیں۔ مگر اکثر امرا ایسا کرتے ہیں کہ خاص اپنے ہاں کا ایک ڈیرہ ٹھیک چوکی خانہ کے متصل زیادہ آسائش و خلوت کی غرض سے کھڑا کر لیتے ہیں۔

مختلف کارخانوں کے خیموں کا ذِکر

اس بڑے مربع قطعہ کی باقی ماندہ تینوں جانب کچھ تھوڑا سا فاصلہ دے کر بعض عہدہ داروں اور ایسے کارخانوں کے خیمے لگائے جاتے ہیں جن سے خاص خاص قسم کے شاہی امور متعلق ہیں اور اگر کوئی خاص وجہ مثل تنگی مقام وغیرہ مانع نہ ہو تو یہ خیمے ہمیشہ ایک ہی ترتیب اور قرینہ سے لگا کرتے ہیں۔ ان ڈیروں کے جدا جدا نام اور لقب ہیں لیکن ان ناموں کا تلفظ مشکل ہے اور چونکہ میرا یہ مدعا نہیں ہے کہ میں آپ کو ہندوستانی زبان کی تعلیم دوں ، بس یہ کافی ہے کہ ان الفاظ کا مطلب بیان کر دوں یعنی ان میں سے ایک ڈیرے میں تو بادشاہی ہتھیار رہتے ہیں اور دوسرے میں نہایت قیمتی زین اور جڑاؤ ساز وغیرہ اور تیسرے میں کمخواب اور زربفت کی قبائیں وغیرہ، جو بادشاہ کی طرف سے اکثر خلعت میں دی جاتی ہیں اور چار علیحدہ علیحدہ خیمے واسطے گنگا جل اور شورے کے جس سے پانی ٹھنڈا

کرتے ہیں اور قسم قسم کے میووں اور حلووں اور مٹھائیوں اور پان وغیرہ کے ہوتے ہیں۔
پان ایک قسم کا پتا ہے جو کچھ خاص مصالحے لگا کر تیار کیا جاتا ہے اور بطورِ علامت عنایات والطافِ شاہی کے عطا ہوا کرتا ہے، جس کے چبانے سے منہ سے خوشبو آتی ہے اور لب سرخ ہو جاتے ہیں۔ پندرہ سولہ ڈیرے اور ہوتے ہیں جو بارچی خانہ اور اس کے متعلقہ اشیاء کے کام آتے ہیں اور ان سب کے وسط میں بہت سے عہدہ داروں اور خواجہ سراؤں کے ڈیرے ہوتے ہیں۔

سب سے اخیر خاصے گھوڑوں کے واسطے چھ ڈیرے اور ہیں جو نہایت لمبے لمبے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے ڈیرے خاص بادشاہ کی سواری کے ہاتھیوں اور شکاری حیوانوں اور شکاری جانوروں کے لئے جو ہمیشہ بادشاہ کے ہمراہ رہا کرتے ہیں اور جن سے دونوں مطلب حاصل ہوتے ہیں یعنی شان و شوکت بھی اور سواری کے وقت شکار بھی اور شکاری کتوں اور چیتوں کے لئے جو ہرن اور نیل گائے کو پکڑتے ہیں اور شیروں اور گینڈوں کے لئے جو شوکت دکھانے کے لئے ہمراہ لائے جاتے ہیں اور بنگالی بھینسوں (۱۹۸) کے لئے جو شیر پر حملہ کرتے ہیں اور پلے ہوئے ہرنوں کے لئے جو اکثر بادشاہ کے سامنے لڑائے جاتے ہیں۔

خیامِ شاہی کے مفہوم میں وہ خیمے بھی داخل ہیں جو مختلف کارخانوں وغیرہ سے متعلق ہیں

لفظ خیمہ گاہ شاہی کے سمجھنے کے لئے یہ خیال نہ کر لینا چاہئے کہ جو خیمے اس مربع قطعہ کے اندر ہیں صرف انہی سے یہ لفظ متعلق ہے بلکہ وہ بہت سے خیمہ جات جن کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں، وہ بھی خیمہ گاہِ شاہی کے مفہوم میں داخل ہیں اور اس تمام شاہی خیمہ گاہ کے لئے یہ امر ضروریات سے ہے کہ حتی الامکان اس کا موقع ہمیشہ سپاہ کے وسط میں ہو۔

خیامِ شاہی کی شان و شوکت اور عجیب پُر شکوہ منظر کا بیان

اب آپ بآسانی سمجھ لیں گے یہ شاہی بارگاہ کس شان و شوکت اور کس کیفیت کی ہے اور جب یہ عظیم الشان سرخ خیموں کا مجموعہ ایک بڑی سپاہ کے بیچ میں قرب و جوار کی کسی بلندی سے دکھائی دیتا ہے تو دل پر اس کی شان و عظمت کا ایک عجیب اثر ہوتا ہے۔

خصوصاً جبکہ لشکر گاہ کا میدان بقدر کافی کشادہ اور اس قسم کا ہو کہ بلا روک ٹوک سپاہ کے سب دستے اپنی اپنی معمولی ترتیب اور قرینہ سے اس میں اتر سکیں۔

لشکر کے بازاروں اور ان کی شناخت کے ذریعوں کا ذکر

جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے سب سے اول میر سامان کو یہ فکر کرنی پڑتی ہے کہ پیش خانہ شاہی کے واسطے ایک معقول موقع انتخاب کرے اور سب خیموں سے خیمہ عام، خاص بلند موقع پر لگایا جائے۔ کیونکہ تمام لشکر کے اترنے کا انتظام اور ترتیب اسی کے باقرینہ نصب ہونے پر موقوف ہے۔ پھر وہ شاہی بازاروں کی جہاں سے تمام فوج کو رسد ملتی ہے داغ بیلیں لگواتا ہے۔ بڑا بازار ایک بڑی وسیع سڑک کی شکل پر کبھی عام و خاص کے دائیں اور کبھی بائیں اس طور سے لگایا جاتا ہے کہ کل لشکر کے اخیر سرے تک برابر چلا جاتا ہے اور جہاں تک ممکن ہے ہمیشہ اس طرف لگایا جاتا ہے کہ جس طرف سے اگلی منزل کے راستہ پر پڑے۔ دوسرے بادشاہی بازار جو عرض و طول میں ایسے نہیں ہوتے اور جن کے راستے اسی بڑے بازار میں سے ہوتے ہیں بارگاہ شاہی کے کوئی ایک طرف اور کوئی دوسری [illegible]ف ہوتا ہے اور ہر ایک بازار میں امتیاز اور شناخت کے واسطے ایک ایک نہایت بلند جھنڈا [illegible]ں میں سرخ پھریرا اور سرے پر سورہ گائے کی دم لگی ہوتی ہے، تین تین سو قدم کے فاصلہ پر نصب ہوتا ہے۔

امرا کے خیمہ گاہوں اور ان کے قرینوں وغیرہ کا ذکر

اس کے بعد میر سامان امرا کی خیمہ گاہوں کے لئے جگہ تقسیم کرتا ہے تاکہ ہمیشہ ایک ہی قرینہ اور ترتیب ملحوظ رہے اور ہر ایک امیر کی خیمہ گاہ بارگاہ شاہی سے اپنے اپنے معمولی فاصلہ پر ہو خواہ دائیں ہو خواہ بائیں اور کوئی شخص اپنی معمولی جگہ کو جو اس کے لئے مقرر ہے یا اس جگہ کو جو قبل از شروع سفر کسی شخص کی درخواست پر اس کے واسطے مخصوص ہو چکی ہو بدل نہ سکے۔

جو تعریف کہ میں نے اس بڑے مربع قطع کی کی ہے اکثر صورتوں میں وہی تعریف امرا اور راجگان کی خیام گاہ پر بھی صادق آتی ہے۔ یہ لوگ بھی عموماً اسی طرح دو پیش خانے رکھتے ہیں اور ان کی خیمہ گاہیں بھی اسی طور پر قناتوں سے جو ان کے اور ان کے زنانوں کے بڑے خیموں کے گرداگرد لگائی جاتی ہیں، گھر کر مربع شکل کی ہو جاتی ہیں اور ان

ی ان سرخ صورت کی خیمہ گاہوں کے باہر بدستور ان کے سرداروں اور سواروں کے ڈیرے کھڑے ہوتے ہیں اور اسی طرح ایک بازار بھی ہر امیر کی خیمہ گاہ کے متعلق ہوتا ہے جس میں ان کی فوج کے دُکاندار اور بیوپاری کے لوگ چھوٹی چھوٹی پالیں وغیرہ لگا کر گھاس دانہ چاول گھی وغیرہ اجناس بیچا کرتے ہیں اور اس طرح پر امرا کے لشکروں میں بادشاہی بازاروں سے، جن میں کل سامان اور اجناس اکثر مثل پائے تخت کے میسر آسکتی ہیں، کسی شے کی خریداری کی چنداں احتیاج نہیں پڑتی۔ ہر ایک بازار کے دونوں سروں پر ایک ایک جھنڈا مع علیحدہ علیحدہ رنگ کے پھریروں کے جو بلندی میں بادشاہی بازاروں کے جھنڈوں کے برابر ہوتے ہیں استادہ رہتا ہے تاکہ ہر ایک امیر کی خیمہ گاہ دور ہی سے جدا جدا معلوم ہو جائے۔

امرا کو بہت اونچے اور سرخ رنگ کے خیموں کے رکھنے اور خیامِ شاہی کی طرف پشت کر کے اپنے خیمے لگوانے کی ممانعت کا ذکر

اگرچہ بڑے امرا اور بڑے بڑے راجے اونچے اونچے ڈیرے رکھنا اپنا فخر جانتے ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ وہ اس قدر اونچے نہ ہوں کہ بادشاہ کی نظر ان پر پڑ جائے اور وہ ان کے گرا دینے کا حکم دے دے جیسا کہ اس نے ہمارے اسی سفر میں کیا تھا اور اسی وجہ سے یہ بھی ضرور ہے کہ ان کے خیموں کی بیرونی جانب بھی تمام سرخ نہ ہو کیونکہ یہ رنگ صرف بادشاہی ڈیروں کے واسطے مخصوص ہے اور شاہی تعظیم اور ادب کے خیال سے یہ بھی واجب ہے کہ امرا کے خیموں کے منہ عموماً عام و خاص اور خیامِ شاہی کی طرف کو رہیں۔ (یعنی پشت وغیرہ اس طرف نہ ہونے پائے)۔

چھوٹے درجہ کے امرا اور اہلِ لشکر کے خیموں وغیرہ کے قرینہ کا ذکر

باقی زمین جو مابین خیامِ شاہی اور امرا کی خیمے گاہوں اور بازار کے ہوتی ہے، اس میں چھوٹے درجہ کے امیروں اور منصب داروں اور اہلِ توپ خانہ اور ہر قسم کے تاجروں اور دکان داروں اور ملکی عہدہ داروں اور اشخاص کے خیمے نصب ہوتے ہیں جو اپنی اپنی اغراض اور مطالب مختلفہ کی وجہ سے لشکر کے ہمراہ رہتے ہیں اور اس سبب سے اس لشکر میں بے حد و شمار خیمے ہوتے ہیں اور زمین کا ایک بہت ہی بڑا سطح ان کے کھڑے ہونے کے لئے درکار ہوتا ہے۔

کل لشکر کے لئے جس قدر زمین درکار ہوتی ہے، اس کا بیان

اگرچہ کل اشخاص موجودہ لشکر کی تعداد اور وسعت زمین خیمہ گاہ کی نسبت بعض یورپی سیاحوں نے بہت مبالغے کیے ہیں مگر اصل یہ ہے کہ جب کبھی لشکر کا قیام کسی ایسے پڑاؤ میں بھی ہوتا ہے کہ جس میں ترتیب معینہ کے موافق کل خیمہ جات بخوبی فراغت سے نصب ہو سکیں تب بھی میرے قیاس میں لشکر کا کل دور چھ سات میل سے زیادہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ لشکر گاہ کے اندر زمین کے بعض قطعات اکثریوں ہی خالی اور بے مصرف پڑے ہوئے ہوتے ہیں البتہ مجھے اس جگہ یہ بات بھی ظاہر کر دینی واجب ہے کہ بھاری توپخانہ جس کو ہمیشہ بہت جگہ درکار ہوتی ہے، عموماً لشکر سے ایک دو منزل آگے چلا جایا کرتا ہے۔

بادشاہی لشکر کے عجیب انتشار اور شور غل کا ذکر

علیٰ ہٰذا القیاس جو عجیب انتشار اور شور و غل اس لشکر میں ہوا کرتا ہے اور جو کسی نووارد شخص کو حیرانی میں ڈالتا ہے، اس کے بیان میں بھی بہت مبالغہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ آپ کو اگر تھوڑی سی بھی واقفیت اس امر کی ہو کہ اس لشکر میں خیمے کس تفریق و ترتیب سے نصب ہوتے ہیں تو آپ ایک تھوڑی سی دقت کے ساتھ ہر جگہ، جہاں ضرورت ہو پہنچ سکیں گے۔

لشکر کے مختص الوضع جھنڈوں اور نشانوں کے رہنما ہونے کا ذکر

خیام شاہی اور ہر ایک امیر کے مختص الوضع خیمے اور نشان اور وہ سورہ گائے کی دم والے جھنڈے جو بادشاہی بازاروں میں لگتے ہیں اور جو سب بہت دور سے نظر آتے ہیں چند روز کے تجربہ کے بعد ایسے راہبر ہو جاتے ہیں کہ بھولنے نہیں دیتے۔

منزل پر پہنچنے کے وقت فرودگاہ کے پہچاننے اور اس تک پہنچنے میں جو کبھی کبھی دِقت پیش آتی ہے، اس کا ذِکر

مگر واقعی باوجود ان سب احتیاطوں اور علامات کے بھی کبھی کبھی ڈیرے کے پہچاننے اور ملنے میں ایک نہایت خلط ملط اور دقت ہوتی ہے۔ خصوصاً فجر کو جب فوج اپنی فرودگاہ پر آتی ہے اور ہر متنفس بڑی سرگرمی سے اپنی خیمہ گاہ کی تلاش اور ڈیرہ کرنے کے

بندوبست میں مشغول ہوتا ہے اور گرد و غبار کے مارے یہ سب نشاں اور علامتیں بالکل چھپ جاتے ہیں اور بارگاہِ شاہی اور مختلف بازاروں اور امرا کے خیموں کا پہچاننا اور امتیاز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں وہ خیمے جو نصب کئے جانے کے لئے پھیلائے ہوئے یا نیم استادہ ہوتے ہیں، اکثر راستہ ملنے میں حارج ہوتے ہیں اور نیز وہ طول طویل رسیاں جو کم درجہ امرا اور منصب دار جن کے پاس پیش خیمے نہیں ہوتے اپنی اپنی حدود کے گھیر لینے کو اور بغرض انسداد آمد و رفت عوام اور اس مراد سے (بصورتیکہ ان کے قبائل ساتھ ہوں) کہ ان کے قریب کوئی غیر شخص ڈیرہ نہ کر سکے بندھوا دیتے ہیں، بڑی سدِ راہ ہوتی ہیں کیونکہ ان کے نوکر چاکروں کی ایک فوج کی فوج ہاتھوں میں ڈنڈے لئے نگہبانی کے لئے کھڑی رہتی ہے جو ان رسیوں کو نہ تو سرکانے ہی دیتے ہیں اور نہ نیچا کرنے دیتے ہیں اور لا محالہ الٹے پاؤں پھرنا پڑتا ہے اور اس عرصہ میں جو اس طرف راستہ لینے میں بے فائدہ سعی ہوتی رہے، دوسری طرف کا راستہ بھی بند ہو جاتا ہے۔

اب اونٹ لدے کھڑے ہیں اور ان کے نکال لے جانے کی بجز اس کے کوئی سبیل نہیں ہے کہ ان نوکر چاکروں کو دھمکایئے بھی اور منت سماجت بھی کیجئے اور سمجھانے بوجھانے کے ساتھ کبھی ایسا غصہ دکھلایئے کہ گویا تم ان کو ابھی پیٹ ڈالو گے۔ مگر کسی کو ہاتھ تک لگانا نہیں چاہئے اور دونوں طرف کے نوکروں چاکروں کے باہم اول ایک سخت قال و مقال پیدا کر کے پھر ان کو یہ ڈراوا دینا چاہئے کہ اس حرکت کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا اور اس طرح پر ان کے باہم صلح کرا کر وقت کو غنیمت جانئے اور اپنے اونٹ نکال لے جایئے۔

شام کے وقت دھوئیں کی کثرت سے ادھر ادھر جانے میں جو دِقت پیش آتی ہے، اس کا ذِکر

شام کے وقت جب کسی کام کے لئے کچھ دور جانا پڑتا ہے تو حقیقت میں کمال دِقت ہوتی ہے کیونکہ اس وقت عوام الناس اپنا اپنا کھانا پکاتے ہیں اور اکثر اپلے اور اونٹوں کی مینگنیاں اور گیلی لکڑیاں جلاتے ہیں اور ان کے بے حد و شمار چولھوں کا دھواں، خصوصاً جبکہ ہوا کم ہو نہایت مکروہ اور ناگوار ہوتا ہے اور آسمان بالکل تیرہ و تار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں بھی تین چار بار اس دھوئیں کے سمندر میں پھنس گیا تھا اور ہر چند راستہ دریافت کرتا تھا مگر نہیں ملتا تھا اور اگرچہ ادھر ادھر بہت سا چکراتا پھرا مگر کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ کدھر جاتا ہوں

اور ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ دھوئیں کے موقوف ہونے اور چاند کے نکلنے تک ایک جگہ توقف کرنا پڑا اور پھر ایک دوسری مرتبہ بڑی مشکل سے اکاس دیئے تک پہنچا اور مع اپنے گھوڑے اور سائیس کے اسی کے نیچے رات بسر کی۔

اکاس دیا اور اس کے فوائد کا ذکر

یہ اکاس دیا جہاز کے ایک بڑے مستول کی مانند مگر نہایت نازک اور پتلا ہوتا ہے جس کے اتارتے وقت الگ الگ تین ٹکڑے ہو جاتے ہیں یہ بارگاہِ شاہی کی طرف نقار خانہ کے قریب لگایا جاتا ہے اور رات کے وقت اس کی چوٹی پر ایک قندیل لٹکتی رہتی ہے۔ یہ نہایت ہی مفید چیز ہے کیونکہ اس دھواں دھار تاریکی میں جب کچھ نظر نہیں آتا تو یہ دکھائی دیتا ہے اور جو لوگ راستہ بھول جاتے ہیں وہ یا تو اسی کے نیچے چوروں سے امن میں رات کاٹ لیتے ہیں یا وہاں پہنچ کر پھر اپنے ڈیرے کا ڈھونڈ ڈھانڈ کر پتہ لگا لیتے ہیں۔

لفظ اکاس دیا کا ترجمہ آسمانی روشنی کے لفظ کے ساتھ ہو سکتا ہے کیونکہ حقیقت میں یہ قندیل دور سے ستارہ سا چمکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

بادشاہی لشکر میں چوری کے انسداد کا جو انتظام ہے، اس کا ذِکر

انسداد دزدی کے واسطے ہر ایک امیر اپنے اپنے خیمہ پر چوکیدار رکھتا ہے جو رات کو برابر ڈیرے کے آس پاس گشت کرتے اور "خبردار خبردار" پکارتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام فوج کے گرداگرد پانچ سو قدم کے فاصلہ پر پہرہ والے ہوتے ہیں جو اپنے پاس آگ جلائے رکھتے اور "خبردار خبردار" پکارتے رہتے ہیں۔ اس احتیاط کے علاوہ کوتوال ہر ایک طرف اپنے برقنداز بھیجتا ہے جو خاص کر بازاروں کی زیادہ تر خبر گیری کرتے اور شور و غل کے علاوہ نرسنگا بھی بجاتے رہتے ہیں۔ مگر باوجود ان سب احتیاطوں اور خبرداریوں کے چوری اکثر ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے مقتضائے احتیاط یہ ہے کہ ہمیشہ بڑی خبرداری اور چستی سے رہنا چاہئے اور اپنے ملازموں کی حفاظت اور بیداری پر زیادہ بھروسہ نہ رکھنا چاہئے اور رات کو اوّل وقت کچھ آرام کر لینا چاہئے تاکہ باقی ماندہ رات کو حفاظت کے واسطے گنجائش ہو۔

بادشاہ کی سواری کے طریقہ کا بیان

اب میں شہنشاہ کے سفر کرنے کے وہ مختلف طریقے جو اس نے اس موقع پر اختیار

کئے تھے بیان کرتا ہوں۔

تختِ رواں کا ذِکر

اکثر اوقات بادشاہ تختِ رواں پر سوار ہوتا ہے جس کو کہار اٹھاتے ہیں۔ یہ تخت ایک قسم کا مکلّف چوبیں بنگلہ ہوتا ہے جس کے روغن کاری اور ملمع کے ستون اور آئینہ دار لڑکیاں ہوتی ہیں جو تیز ہوا اور بارش وغیرہ کے وقت بند کی جاتی ہیں۔ اس تخت کے چاروں ڈنڈے جو کہاروں کے کاندھے پر ہوتے ہیں تیز رنگ کی سرخ بانات یا کمخواب سے منڈھے ہوئے اور زری اور ریشم کی نہایت کامدار جھالر سے آراستہ اور سجے ہوئے ہوتے ہیں اور ہر ایک ڈنڈے کو دو مضبوط اور خوش پوشاک کہار لگے رہتے ہیں جن کی بدلی کے واسطے نوبت بہ نوبت اور آٹھ کہار موجود رہتے ہیں۔

کبھی بادشاہ گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ خصوصاً جب موسم موافق اور قابل شکار کے ہو اور کبھی ہاتھی پر میگھ ڈنبر یا ہودے میں بیٹھ کر سفر کرتا ہے جو نہایت ہی شان دار اور باشوکت سواری ہے۔ کیونکہ اس کی جھول ایسی عمدہ اور ساز و سامان اس قدر قیمتی اور مرصع اور زرق برق کا ہوتا ہے کہ اس کی زیبائش پر کوئی چیز فوق نہیں لے جاسکتی۔

ہاتھی کے میگھ ڈنبر اور ہودے کا بیان

میگھ ڈنبر روغن کاری اور ملمع کا ایک چھوٹا سا چوبی بنگلہ مربع شکل کا سمجھنا چاہیے اور ہودا بیضوی شکل کی ایک نشست ہے جس کے سنہری اور نہائت منقش ستونوں پر ایک نہایت مکلّف شامیانہ ہوتا ہے۔

کوچ کے وقت امرا اور راجے بادشاہ کے ساتھ جس طرح سے چلتے ہیں، اُس کا بیان

ہر ایک کوچ میں بادشاہ کے ہمراہ بہت سے امرا اور راجے ہوتے ہیں جو بہت قریب قریب اس کے پیچھے گھوڑوں پر چلتے ہیں اور بطور ایک بے ترتیب مجمع کے سب کے سب باہم اس طرح ملے جلے چلتے ہیں، جن میں چنداں لحاظ کسی قاعدہ کا نہیں ہوتا۔ کوچ کے روز علی الصباح سب امرا باستثناء ان کے جن کی عمر زیادہ ہو یا ان کا عہدہ ہی مقتضی اس

استثنا کا ہو، خیمہ عام وخاص میں جمع ہوتے ہیں اور اس کوچ سے امرا کو بہت کوفت اور ماندگی ہوتی ہے۔ خصوصاً شکار کے دن کیونکہ ان کو اس حالت میں اکثر اوقات سہ پہر یعنی تین بجے تک برابر دھوپ اور گرد میں عام سپاہیوں کی مانند حیران ہونا پڑتا ہے۔

امرا بادشاہ سے علیحدہ جس لطف سے منزل طے کرتے ہیں، اس کا بیان

مگر یہ آسائش پسند امرا جب بادشاہ کے ہمرکاب نہیں ہوتے تو اور ہی طرح سفر کرتے ہیں اور نہ تو ان کو دھوپ ہی ستاتی ہے اور نہ گرد ہی بلکہ حسب پسند طبع بند یا کھلی پالکی میں ایسے جاتے ہیں جیسے پلنگ پر لیٹے ہوں۔ اور بلا دقت آرام سے سوتے ہوئے اپنے خیمہ میں جا پہنچتے ہیں جہاں ان کو یقیناً عمدہ کھانا اور ہر ایک ضروری چیز تیار ملتی ہے کیونکہ یہ سب سامان رات کو کھانا کھانے کے بعد فوراً آگے کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔

سواری کے وقت جو گُرز بردار امرا اور بادشاہ کی سواری کے ساتھ رہتے ہیں، ان کا ذکر

سواری کی حالت میں ان امرا کے گرد و پیش بہت سے سوار جن کو گُرز بردار کہتے ہیں اور جن کے پاس چاندی کا گرز ہوتا ہے، سب طرح سے ساز و سامان سے درست موجود رہتے ہیں۔

بہت سے گُرز بردار بادشاہ کے بھی ہمرکاب ہوتے ہیں جو آگے، دائیں اور بائیں پیدلوں کے ایک بڑے جمگھٹ کے ساتھ چلتے ہیں۔ گُرز بردار چیدہ اور وجیہ جوان ہوتے ہیں اور احکام اور فرامینِ شاہی وغیرہ ان کے ہاتھ بھیجے جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے عصا ہوتے ہیں اور بادشاہ کی سواری کے آگے سے لوگوں کو ہٹاتے رہتے ہیں تاکہ راستہ صاف ملے۔

راجاؤں کی سواریوں کے بعد 'قور' جس طریقہ سے چلتا ہے، اُس کا بیان

راجاؤں کی سواریوں کے بعد قور (۱۹۹) چلتا ہے جس میں بہت سی شہنائیں اور نقارے بھی ملے ہوئے چلتے ہیں۔ اس قور میں جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے چاندی کی بنی ہوئی بہت سی مختلف الوضع چیزیں بھی جو ایک چاندی کی لمبی چوب پر نصب کی ہوئی ہوتی ہیں شامل ہو کر چلتی ہیں، جن میں سے بعض تو عجیب عجیب جانوروں کی صورت کی ہیں۔ بعض

ہاتھ ، پنبہ اور ترازو اور مچھلی وغیرہ اور بعض اور بعید الفہم اشیا کی شباہت کی۔

قور خانہ کے بعد منصب داروں کا جو غول آتا ہے، اس کا بیان

اس کے پیچھے ایک بڑا غول منصب داروں یعنی کم درجہ کے امرا کا آتا ہے جو ہتھیار سجائے عمدہ گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ان امراے جو بادشاہ سے پیچھے چلتے ہیں تعداد میں کہیں زیادہ ہیں کیونکہ ان منصب داروں کے علاوہ جن کو اپنے پہرہ کی وجہ سے علی الصباح بادشاہی خیمہ پر بادشاہ کی ہمرکابی کے لئے جمع ہونا ضرور ہے۔ اور بھی بہت سے منصب دار اس غرض سے شریک جلوسِ سواری ہو جاتے ہیں کہ بادشاہ کی زیرِ نظر رہ کر کچھ ترقی حاصل کریں۔

بیگمات کی سواری کی چیزوں اور ان کی زیب و زینت کا بیان

شہزادیاں اور محل کی بڑی بڑی بیگمیں بھی کئی قسم کی سواریوں میں چلتی ہیں جن میں سے کسی کو تو "چوڈول" پسند ہے جس کو کہار اٹھاتے ہیں اور تختِ رواں سا ہوتا ہے اور جس پر ملمع اور روغن کاری کا کام بنا ہوا ہوتا ہے اور رنگا رنگ کے ریشمین خوشنما گھٹاٹوپ پڑے ہوئے اور زری کی جھالریں اور خوبصورت پھندنے وغیرہ ٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض عمدہ عمدہ پالکیوں میں جو چوڈولوں کی طرح خوب سجی سجائی ہوتی ہیں، سوار ہوتی ہیں اور بعض شہزادیاں بڑے بڑے محملوں میں جو دو مضبوط اونٹوں یا دو چھوٹے ہاتھیوں کے بیچ میں معلق ہوتے ہیں، چلتی ہیں۔ چنانچہ میں نے کبھی کبھی روشن آرا بیگم کو محمل میں سوار دیکھا ہے اور کئی بار یہ بھی دیکھا ہے کہ محمل کے آگے کی جانب جو کھلی ہوئی تھی ایک نوجوان خوش لباس لونڈی بیٹھی ہوئی گرد اور مکھیوں کے دور کرنے کے لئے بیگم صاحبہ کو مور چھل کر رہی تھی۔ بیگمیں اکثر ہاتھیوں پر بھی سوار ہوتی ہیں جن کے بڑے بڑے چاندی کے گھنٹے پڑے ہوئے اور بڑے قیمتی ساز و سامان سے سجے ہوئے ہوتے ہیں اور جن کی جھولیں وغیرہ نہایت زرق برق اور بیش قیمت اور آرائشی چیزیں جو جھول وغیرہ میں لٹکائی جاتی ہیں، نہایت عمدہ زردوزی کام کی ہوتی ہیں۔ یہ حسین اور ممتاز بیگمیں اپنے میگھ ڈنبروں میں بیٹھی ہوئی یوں دکھائی دیتی ہیں گویا ہوا میں پریاں اڑی جاتی ہیں اور ہر ایک میگھ ڈنبر میں آٹھ عورتیں بیٹھ سکتی ہیں۔ چار ایک طرف چار دوسری طرف اور میگھ ڈنبر کے ہر ایک خانہ پر ریشمین جالی کا غلاف پڑا ہوا ہوتا ہے اور چوڈول اور تختِ رواں کی شان و شوکت اور زرق برق سے کسی طرح کم

نہیں ہوتا اور بیگمات کی سواریوں کا تجمل اس قدر دلچسپ ہے کہ اس سفر میں یہ تماشا میرے لئے بدرجۂ غایت کششِ دلی کا باعث رہا ہے اور اس کی یاد اور خیال سے اب بھی طبیعت کو ایک مسرت حاصل ہوتی ہے۔

روشن آرا بیگم کی سواری کے جلوس کا ذِکر

چنانچہ آپ اپنے خیال کو خواہ کیسی ہی وسعت اور طول دیجئے مگر روشن آرا بیگم کی سواری سے زیادہ کوئی دلچسپ اور اعلیٰ درجہ کا تماشا قیاس میں نہ آئے گا۔ یہ بیگم پیگو کے ایک نہایت عمدہ اور بڑے قد آور ہاتھی پر ایسے میگھ ڈنبر میں سوار ہوتی ہے جس کی سنہری اور لاجوردی رنگتوں کی چمک دمک قابلِ دید ہے۔ اس کے ہاتھی کے پیچھے پانچ چھ اور ہاتھی چلتے ہیں جن پر اس کے محل کی معزز عورتیں ہوتی ہیں اور ان کے میگھ ڈنبر بھی شان اور خوبصورتی میں روشن آرا بیگم کے میگھ ڈنبر جیسے بلکہ قریباً ویسے ہی ہوتے ہیں۔ شہزادی کے قریب بڑے بڑے اور خاص خاص خواجہ سرا بھاری بھاری پوشاکیں پہنے ہوئے نفیس گھوڑوں پر سوار، ہاتھوں میں چھڑیاں لئے ہوئے چلتے ہیں اور اس کے ہاتھی کے ارد گرد ایک رسالہ کشمیری اور تاتاری عورتوں کا ہوتا ہے جو بڑے بناؤ سنگار کئے ہوئے، خوبصورت اور بادپا گھوڑوں پر سوار ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے خواجہ سرا گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں جن کے ساتھ ایک بڑی بھیڑ پیدل ملازموں کی ہوتی ہے جو ہاتھوں میں بڑی بڑی چھڑیاں لئے ہوئے شہزادی کی سواری کے دائیں بائیں بہت دور آگے اس مراد سے چلتے ہیں کہ راستہ کو صاف اور کھلا رکھیں اور ہر ایک شخص کو جو سامنے آجائے ہٹاتے جائیں۔

بڑی بیگم اور اَور بیگموں کی سواریوں کا ذِکر

روشن آرا بیگم کی سواری کے ساتھ ہی محل کی بڑی بیگم کی سواری نمودار ہوتی ہے اور قریباً یہی سب تکلفات اس میں بھی ہوتے ہیں۔ غرض کہ اسی طرح پندرہ سولہ بڑی بڑی بیگمیں شان و شوکت اور دھوم دھام کے ساتھ جو اُن کے مرتبہ اور مشاہرہ اور منصب کی مناسبت سے کم زیادہ ہوتی ہے، گزرتی ہیں۔

بیگمات کی سواریوں کی شان و شوکت اور دلچسپی کا ذِکر

ان ساٹھ ستر ہاتھیوں کا وہ تول تول کر قدم رکھنا اور میگھ ڈنبروں کی وہ چمک دمک

اور نہایت خوش لباس اور بے شمار ہمراہیوں اور خدم و حشم کا انبوہِ کثیر واقع میں دیکھنے والے کے دل پر شاہی شان و شوکت کا ایک عجیب اثر ڈالتا ہے اور اگر میں ان سب دلفریب سامانوں کو فلسفیانہ بے اعتنائی کی نظر سے نہ دیکھتا تو بیشک میں بھی انہی، ہندوستانی کبیشروں کی مانند جو استعارے کے طور پر کہتے ہیں کہ یہ شہزادیاں نہیں بلکہ دیویاں ہیں جو ہاتھیوں پر میگھ ڈنبروں میں بیٹھی ہوئی خلائق کی نظروں سے پوشیدہ پوشیدہ جا رہی ہیں، اپنے خیالات کی بلند پروازی کا مغلوب ہو جاتا۔

جو سخت انتظام بیگموں کی سواری کے نزدیک نہ جانے کے باب میں ہے، اس کا اور ایک اپنے پر گزرے ہوئے معاملہ کا ذِکر

اور واقعی نہایت مشکل ہے کہ کوئی شخص ان بیگمات کے نزدیک جا سکے اور گویا محال ہے کہ وہ انسان کو نظر آسکیں۔ پس وائے بر حال اس سوار کے جو کسی اتفاق سے بیگمات کی سواری کے نزدیک جا نکلے کیونکہ یہ شخص خواہ کیسا ہی ذی رتبہ کیوں نہ ہو خواجہ سراؤں اور خواصوں وغیرہ کے ہاتھ سے پٹے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ لوگ ایسے موقع پر بڑے شوق سے اس کی خوب ہی گت بناتے ہیں۔ چنانچہ میں ایسی جلدی نہیں بھول سکتا کہ ایک بار میں بھی اس بلا میں پھنس گیا تھا اور بہ ہزار دقت و مشکل اس بے رحمانہ سلوک سے نجات پائی تھی جس میں بہت سے سوار پھنس چکے تھے۔ میں نے یہ ٹھان لی تھی کہ خواہ کچھ ہی ہو ایک خوب مقابلہ کئے بغیر میں ان سے مار نہیں کھانے کا۔ پس میں نے اپنی تلوار کھینچ لی اور خوش نصیبی سے میرا گھوڑا بھی مضبوط اور بہت جاندار تھا اور اس طرح پر اس قابل ہو گیا کہ تیغ بکف ان حملہ آوروں کی بھیڑ کو چیر کر نکل گیا اور ایک تیز رو ندی میں، جو سامنے تھی، گھوڑا ڈال کر پار اُتر گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام فوج میں یہ بات ایک مثل کی طرح مشہور ہے کہ تین موقعوں سے نہایت بچنا اور احتیاط کرنا واجب ہے۔ اول خاصے اور کوتل گھوڑوں میں جا گھسنے سے، جہاں دولتیاں اور پشتکیں بے حساب ہیں، دوئم شکار گاہ میں جا داخل ہونے سے، سوئم بیگمات شاہی کی سواری کے قریب جا رہنے سے۔ اور ایران میں تو یہ تیسری صورت سب سے بری ہے کیونکہ میں سنتا ہوں کہ اگر وہاں کوئی شخص خواجہ سراؤں کو اتنے فاصلہ پر بھی نظر پڑ جائے کہ جہاں سے بیگمات تک ایک میل کا فاصلہ ہو تو اس غریب کی جان نہیں بچ

سکتی اور یہ ضرور ہے کہ جس شہر اور گاؤں میں ہو کر بیگمات کی سواری نکلے۔ وہاں کے تمام مرد اپنے اپنے مقام و مسکن کو چھوڑ کر بہت فاصلہ پر بھاگ جائیں۔

بادشاہ کے شکار کھیلنے کے طریقہ کا ذکر

اب میں کچھ بادشاہ کے شکار کا بیان کرتا ہوں! میری سمجھ میں کبھی نہ آتا تھا کہ مغل شہنشاہ ایک لاکھ آدمی کے لشکر کے ساتھ کس طرح شکار کھیل سکتا ہے۔ لیکن بلاشک ایک خاص صورت ہے جس کے سبب سے دو لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ فوج کے ساتھ شکار کھیل سکتا ہے۔ چنانچہ وہ صورت یہ ہے کہ آگرہ اور دہلی کے نواح میں دریائے جمنا کے کنارے کنارے کوہستان تک اور اس شاہراہ کے دونوں جانب جو لاہور کو جاتا ہے زمین کا ایک بڑا حصہ بنجر پڑا ہوا ہے جو جنگلی درختوں اور جھاڑیوں اور مختلف الاقسام گھاس سے جو دو دو گز اونچی ہے، سے ڈھکا رہتا ہے اور ان سب زمینوں کی بڑی نگرانی سے محافظت کی جاتی ہے اور سوائے تیتر بٹیر اور خرگوش کے جن کو ہندوستانی لوگ جال سے پکڑتے ہیں کوئی شخص خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، شکار گاہ میں جاکر کسی قسم کے شکار کو جو احتیاط اور حفاظت کی وجہ سے بے شمار ہے، نہیں چھیڑ سکتا۔ جب کبھی بادشاہ شکار کو جاتا ہے تو وہ شکاری جس کے ضلع کے قریب ہو کر لشکر شاہی کا گزر ہو' حاضر ہو کر میر شکار شاہی کو اپنے علاقہ کے مختلف القسم شکاروں کے حالات اور اس جگہ کے احوال سے جہاں شکار بافراط موجود ہو مطلع کرتا ہے اور اس کے اطلاع دینے پر شکار گاہ کے ناکوں اور خاص خاص موقعوں پر پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ قطعے جو منتخب کئے گئے ہیں کامل طور پر محفوظ رہیں۔ یہ قطعات کبھی کبھی دس دس میل کی وسعت میں ہوتے ہیں اور اس شکار گاہ سے کہ جہاں بادشاہ شکار کھیلنا چاہتا ہے، اہل لشکر کوچ کے وقت دائیں یا بائیں کو اس طرح پرچ کر چلتے ہیں کہ بادشاہ بغیر کسی طرح کی دقت کے صرف اس قدر امرا اور لوگوں کے ساتھ جن کو اجازت دی گئی ہو شکار گاہ کے اندر بلاحرج مرج داخل ہو کر بخوبی و اطمینان تمام انواع و اقسام کے شکاروں سے جیسا جیسا کہ موقع اور حالت ہو، محظوظ و مسرور ہوتا ہے۔

چیتے وغیرہ کے شکار کا ذکر

اب میں اوّل یہ بیان کرتا ہوں کہ سدھائے ہوئے چیتوں سے ہرن کا شکار کس طرح کیا جاتا ہے۔ مجھ کو یاد ہے کہ میں نے کسی اور موقع پر آپ کو لکھا تھا کہ ہندوستان میں

سینگ والے ہرن بکثرت ہیں جو ہمارے ملک کے اس قسم کے ہرن سے جس کو فان کہتے ہیں بہت مشابہ ہیں اور ان کی ڈاریں ہوتی ہیں جن میں اکثر پانچ چھ ہرن سے زیادہ نہیں ہوتے اور ایک نر ہرن ڈار کے پیچھے چلتا ہے جو اپنے رنگ سے بآسانی پہچانا جاتا ہے۔

اب شکار کا طریقہ سنئے کہ ہرنوں کی ڈار کے نظر پڑتے ہی ایک چیتے کو جو ایک چھوٹی سی گاڑی پر زنجیر سے بندھا رہتا ہے، وہ ڈار دکھلا دیتے ہیں اور یہ سیانا اور مکار جانور فوراً اس کی طرف نہیں دوڑ پڑتا بلکہ ایک بڑی احتیاط سے ان کے ارد گرد چھپ چھپ کر اور دبک دبک کر چلتا ہے اور اس طریق سے بے معلوم ایسا نزدیک جا پہنچتا ہے کہ پانچ ہی چھ جستوں میں، جن کی بعید القیاس سرعت اس جانور میں مشہور ہے، ان کے پکڑ لینے کا قابو بخوبی حاصل کر لیتا ہے اور اگر اپنے حملہ میں کامیاب ہوتا ہے تو معاً شکار کے خون اور دل و جگر سے پیٹ بھر لیتا ہے اور اگر وار خالی جاتا ہے (چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے) تو پھر دوسرا حملہ نہیں کرتا بلکہ چپکا کھڑا ہو جاتا ہے۔ فی الواقع اس امر میں کوشش کرنا کہ سیدھی اور واجبی دوڑ میں چیتا ہرن کو پکڑے بے فائدہ ہے کیونکہ ہرن چیتے سے بہت تیز رو اور دور دم ہوتا ہے۔ چیتے بان کو اس کے پھر پکڑ کر گاڑی پر بٹھا دینے میں کچھ دقت نہیں اٹھانی پڑتی۔ چنانچہ آہستگی سے اس کے پاس جا کر چمکارتا اور دو ایک گوشت کے ٹکڑے آگے ڈال کر اور آنکھیں بند کر کے زنجیر سے باندھ دیتا ہے۔

اسی سفر میں ایک چیتے نے اتفاقاً ہم لوگوں کو ایک عجیب اور حیرت افزا تماشا دکھلایا یعنی ایک روز جو ہرنوں کی ایک ڈار فوج کے درمیان ہو کر نکل بھاگی جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے تو اتفاقاً دو چیتوں کے بہت ہی قریب ہو کر نکلی جو حسب معمول گاڑیوں پر زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک نے جس کی آنکھیں بند نہ تھیں ایک ایسی تیز جھپٹ کی کہ زنجیر توڑ کر ہرنوں کے پیچھے دوڑ پڑا لیکن کسی کو پکڑ نہ سکا۔ مگر لوگوں کی دوت دبک اور تعاقب سے مجبور ہو کر یہ ہرنوں کی ڈار جو پھر پیچھے کو ہٹی اور ایک ہرن اسی چیتے کے پھر قریب ہو کر نکلا تو اس نے باوجودیکہ بہت سے گھوڑے اور اونٹ بیچ میں حائل تھے، جھپٹ کر اس کو پکڑ لیا اور اس سے یہ عام مقولہ کہ "چیتا اپنے شکار پر جو اوّل دفعہ کی جھپٹ سے بچ جائے، پھر نہیں دوڑتا" غلط ثابت ہو گیا۔

نیل گائے کے شکار کرنے کا طریقہ بہت دلچسپ نہیں ہے۔ ان کو بڑے بڑے وسیع جالوں میں گھیر کو بتدریج ان کے دائرہ کو تنگ کرتے جاتے ہیں اور جس وقت اس کی

وسعت بہت کم رہ جاتی ہے تو بادشاہ امرا اور شکاریوں کو ساتھ لے کر اس میں داخل ہوتا ہے اور ان کو تیر اور برچھی اور تلوار اور قرابین سے مار لیتے ہیں اور کبھی کبھی یہ جانور اس قدر مارے جاتے ہیں کہ بادشاہ ان کا گوشت تحفہ کے طور پر سب امرا کے لئے بھیجتا ہے۔

کونجوں کے پکڑنے کا عجیب اور قابلِ دید طریقہ ہے اور ان کی اس جرأت کے دیکھنے سے جو وہ اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لئے شکاری پرندوں کے مقابلہ میں دکھاتی ہیں، بڑا لطف حاصل ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی وہ اپنے حریف کو مار بھی لیتی ہیں۔ لیکن سُست پروازی کی وجہ سے جو پھرتی کے ساتھ ادھر ادھر نہیں پھر سکتیں، دشمنوں سے جن کی تعداد دم بدم بڑھائی جاتی ہے، مغلوب ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان سب شکاروں میں شیر کا شکار صرف خطرناک ہی نہیں بلکہ خاص بادشاہی شکار ہے۔ کیونکہ بجز خاص اجازت کے جو کسی امیر کو دی جائے بادشاہ اور شہزادوں کے سوا اس شکار میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ اس کے شکار کے لئے سب سے پہلے یہ ترکیب کی جاتی ہے کہ شکاری لوگ جب یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ شیر فلاں جگہ آکر سوتا ہے تو وہاں ایک گدھا باندھ دیتے ہیں جس بدنصیب کو شیر پھاڑ کھاتا ہے اور چونکہ یہ اس کے پیٹ بھرنے کو کافی ہوتا ہے پھر وہ کسی اور شکار کی تلاش نہیں کرتا اور بغیر اس کے کہ کسی بیل یا بھیڑ بکری یا کسی چرواہے کو ستائے پانی کی تلاش میں جاتا اور پانی پی کر پھر اپنی اسی آرام گاہ پر آجاتا ہے اور اگلی فجر تک پڑا سویا کرتا ہے۔ چنانچہ شکاری لوگ چند روز تک یہی حکمت اس کے ایک ہی جگہ پر مائل رہنے کے لئے کرتے رہتے ہیں اور جب بادشاہ کے قریب پہنچنے کی اطلاع ملتی ہے تو وہ ایک اور گدھا جس کے حلق میں بہت سی افیون ٹھوس دی جاتی ہے، اسی موقع پر جہاں اس قدر گدھے قربانی ہو چکے تھے باندھ دیتے ہیں اور یہ آخری دعوت بے شک اس مراد سے ہوتی ہے کہ شیر کھا پی کر سکھ کی نیند سو جائے۔ اس کے بعد یہ تدبیر کی جاتی ہے کہ قرب وجوار کے گنواروں کو جمع کر کے بڑے بڑے وسیع جال جو خاص اسی کام کے واسطے بنائے ہوئے ہوتے ہیں تنوا دیئے جاتے ہیں اور جیسا کہ نیل گائے کے شکار میں کیا جاتا ہے ان کو بتدریج کھینچ کھینچ کر ان کے دائرہ کی وسعت کو تنگ کرتے جاتے ہیں اور جب سب سامان اس طرح تیار ہو جاتا ہے تو بادشاہ ایک ہاتھی پر، جس پر فولادی پاکھر پڑی ہوئی ہوتی ہے، مع میر شکار اور چند فیل نشین امیروں اور بہت سے گرز بردار سواروں اور پیدل شکاریوں کے، جن کے ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی برچھیاں ہوتی ہیں، جلدی سے جال کے باہر کی طرف ٹھہر کر شیر پر ایک بڑی بندوق

سے فیر کرتا ہے۔ اب شیر جو اپنی عادت معہودہ کے موافق زخم کھا کر ہاتھی پر جھپٹتا ہے تو جال میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور بادشاہ پیہم گولیاں مار کر اس کو مار لیتا ہے۔

اسی سفر کے ایک شکار میں ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ ایک بپھرا ہوا شیر جال پر سے کود کر ایک سوار پر جا پڑا اور اس کے گھوڑے کو مار ڈالا اور اس طرح پر کچھ دیر کے لئے جان بچا کر بھاگ گیا مگر شکاریوں نے تلاش اور پیروی کر کے ڈھونڈ ہی لیا اور پھر جال سے جا گھیرا۔ شیر کے بھاگ جانے کی اس واردات سے تمام فوج کو نہایت دقت اور پریشانی اٹھانی پڑی۔ یہاں تک کہ ہم تین چار روز تک برابر ایک ایسی سرزمین میں سرگرداں رہے جس میں پہاڑوں سے ندیاں اور نالے آ کر گرتے تھے اور تمام میدان جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس سے، جس میں اونٹ تک چھپ جائیں، ڈھکا ہوا تھا۔ کچھ بازاروں کا بندوبست بھی نہ ہوا تھا اور کوئی شہر اور بستی بھی نزدیک نہ تھی، پس وہ لوگ بڑے ہی خوش نصیب تھے جو اس پریشانی اور سرگردانی میں کسی طرح کچھ اپنے گرسنگی (بھوک) رفع کر سکے۔ کیا اب میں آپ کو اس نالائق مقام میں غیر ضرور توقف کا اصلی سبب بھی بتادوں؟ لو بتائے دیتا ہوں۔ آپ کو خوب جان لینا چاہئے کہ جب بادشاہ ایک شیر مارتا ہے تو یہاں اس کو بڑی مبارک فال سمجھا جاتا ہے اور اس کے برعکس اگر شیر بچ جائے تو بے حد و نہایت بدشگونی اور سلطنت کے واسطے بڑی بد فالی خیال کی جاتی ہے۔ اس لئے جب شیر کے شکار کا انجام حسبِ دلخواہ ہوتا ہے تو اس مبارک تقریب میں بڑے اہتمام اور تکلفات عمل میں لائے جاتے ہیں۔ چنانچہ بادشاہ ایک عام دربار کرتا ہے جس میں سب امرا حاضر ہوتے ہیں اور مارا ہوا شیر بادشاہ کے حضور میں لایا جاتا ہے اور جب اس کی لاش بڑی احتیاط سے ناپ لی جاتی ہے اور بڑی تفصیل اور باریک بینی سے اس کا امتحان اور ملاحظہ ختم ہو لیتا ہے تو بادشاہی دفتر میں لکھ کر رکھا جاتا ہے کہ فلاں بادشاہ نے فلاں تاریخ ایک شیر اس قدر لمبا اور اس طرح کے قد و قامت اور جلد و پوست کا، جس کے دانت اس قدر دراز تھے اور جس کے پنجوں کی مقدار ایسی اور ایسی تھی شکار کیا۔

شکار کی اس کیفیت کے ساتھ مجھ کو چند لفظ اس افیون کی بابت بھی جو گدھے کو کھلائی جاتی ہے اضافہ کرنے واجب ہیں۔ چنانچہ ایک ذی رتبہ میر شکار نے مجھ سے کہا کہ یہ تو صرف حمقا اور عوام کی بنائی ہوئی کہانی ہے۔ اصل یہ ہے کہ شیر جب خوب پیٹ بھر کر کھا لیتا ہے تو یہ شکم سیری ہی اس کی گہری نیند کا باعث ہو جاتی ہے۔

پنجاب کے دریاؤں اور کشتیوں کے پلوں کا ذکر

میں نے دیکھا کہ بڑے بڑے دریاؤں پر عموماً پل نہیں ہیں اور ان دریاؤں سے فوج نے بذریعہ دوہرے پلوں کے جو کشتیوں سے کسی قدر سمجھ بوجھ ہی کے ساتھ بنائے گئے تھے، عبور کیا۔ ان پلوں کے باہم دو تین سو قدم کا فاصلہ رکھا جاتا ہے اور ان کی سطح پر مٹی اور پھوس ملا کر ڈال دیا جاتا ہے تاکہ چوپایوں کے پاؤں نہ پھسلیں مگر ان دونوں کے سروں پر ایک بڑی گھبراہٹ اور پریشانی اور دھکا پیل کا موقع ہوتا ہے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ وہاں ایک سخت بھیڑ بھاڑ اور بڑے ہنگامے اور چپقلش کی جگہ ہوتی ہے بلکہ زیادہ تر اس باعث سے کہ ان کے دونوں سروں کی سلامی اور گزرگاہ چونکہ نرم اور گیلی پھسلنی مٹی سے بنائی جاتی ہے اس وجہ سے راستہ ایسا ٹوٹا پھوٹا ہوتا ہے اور اس میں اتنے گڑھے پڑے ہوئے ہوتے ہیں اور اہلِ لشکر کو انہی گرے پھنسے حیوانات کے اوپر سے کمال بے ترتیبی اور گھبراہٹ سے گزرنا پڑتا ہے اور اگر کل فوج کو ایک ہی دن میں پار اترنا پڑتا ہے تو یہ خرابی نہایت ہی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن بادشاہ یہ تدبیر کرتا ہے کہ دریا کے وار ایک میل کے فاصلہ پر اپنے ڈیرے کھڑے کروا کر ایک دو دن وہیں ٹھہرے رہنے کی تکلیف گوارا کرتا ہے اور پھر اسی طرح دریا کے پار جا کر دوسرے کنارے پر قیام کرتا ہے اور اس تین دن کے عرصہ میں سب اہل لشکر آہستہ آہستہ دریا سے عبور کر جاتے ہیں۔

بادشاہی لشکر کی تعداد اور رسد کے بہم پہنچانے کے طریقہ کا ذکر

لشکر کے لوگوں کی تعداد کی نسبت فوج اور بہیر سمیت ایک ٹھیک اور صحیح حد مقرر کرنی آسان نہیں ہے کیونکہ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ! مگر بہر حال میں بھروسہ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کشمیر کے اس سفر میں کم سے کم ایک لاکھ تو سوار ہوں گے اور ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ جانور یعنی گھوڑے خچر اور ہاتھی اور ان کے علاوہ اونٹ بھی پچاس ہزار سے کم نہ ہوں گے اور قریباً اسی قدر بیل اور ٹٹو جن پر غریب بازاری لوگ خانہ بدوشوں کی طرح اپنے اہل و عیال اور غلہ وغیرہ اجناس لادے ہوئے لشکر کے ساتھ رہتے ہیں۔

اب اہلِ فوج کے نوکر چاکر بھی ضرور ہے کہ بے شمار ہوں کیونکہ بغیر ان کی مدد کے کچھ کارروائی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً میرا درجہ صرف ایک دو اسپہ سوار کی مانند ہے اور اس پر بھی تین نوکروں سے کم میں میری گزر نہیں ہو سکتی۔ اکثر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ کل لشکر

کی تعداد تین اور چار لاکھ آدمی کے اندر ہوگی۔ بعض کا یہ قیاس ہے کہ یہ تخمینہ بہت کم ہے اور بعض لوگ اس تعداد کو مبالغہ سمجھتے ہیں! لیکن حقیقت یہ ہے کہ صحیح تعداد بغیر مردم شماری کے معلوم نہیں ہو سکتی۔ البتہ میں اتنا دعویٰ ضرور کر سکتا ہوں کہ فوج کا ہجوم اور انبوہ بے حد اور قیاس سے باہر ہے اور دہلی کی تمام خلقت حقیقتاً لشکر میں جمع ہے کیونکہ ان کے کام کاج اور گزران بادشاہ اور لشکر ہی پر منحصر ہے اور ان کے لئے اس کے سوا کچھ چارہ نہیں ہے کہ یا لشکر کے ساتھ جائیں یا دہلی میں پڑے بھوکے مرا کریں! کچھ شک نہیں ہے کہ آپ اس کیفیت کو پڑھ کر مجھ سے یہ سوال ضرور کرنا چاہیں گے کہ اس قدر انسانوں اور حیوانوں کے لئے کوچ کی حالت میں خوراک اور چارا کس طرح بہم پہنچتا ہوگا؟ اس کا مختصر اور سب سے بہتر جواب یہ ہے کہ ہندوستانیوں کی خوراک نہایت سیدھی سادی ہے۔ چنانچہ ایک لاکھ سواروں میں سے صرف دس ہزار بلکہ پانچ چھ ہزار ہی ایسے ہوں گے جو گوشت کھاتے ہوں ورنہ سب کے سب کھچڑی ہی پر قانع ہیں جو چاولوں کے ساتھ مونگ یا ماش وغیرہ ملا کر پکاتے ہیں اور تھوڑا سا گھی اس میں ڈال لیتے ہیں اور یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اونٹ یہاں تک سفر اور بھوک پیاس کی تکلیف اٹھا سکتے ہیں جس سے حیرت ہوتی ہے اور تھوڑے سے ہر قسم کے چارے پر قناعت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہر کوچ کے بعد جنگل میں چرنے کو چھوڑ دیئے جاتے ہیں اور ہر قسم کا گھاس پھوس اور جھاڑی وغیرہ ان کے چارے کا کام دیتی ہے۔

یہ امر بھی بالضرور لحاظ کے لائق ہے کہ وہ اہلِ بازار جو دہلی میں سب قسم کی اجناس وغیرہ بیچا کرتے ہیں وہی سفر میں بھی ان اشیا کی بہم رسانی کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور انہی کی دکانیں، خواہ دہلی میں ہوں خواہ سفر میں، رسد رسانی کے لئے برابر موجود رہتی ہیں۔ ان بے چاروں کو گھاس اور چارے کے بہم پہنچانے میں بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے اور وہ اس کام کے لئے گاؤں در گاؤں پھرتے ہیں مگر جو چیز لاتے ہیں اس کو فوج میں اچھے داموں بیچنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کا عموماً یہ معمول ہے کہ ایک خاص قسم کی گھاس جو تمام میدانوں اور جنگلوں میں جا بجا موجود ہے، زمین میں سے کھرپے سے کھود لاتے ہیں اور اس کو جھاڑ کر یا دھو کر لشکر میں کبھی تو بہت گراں اور کبھی بہت ارزاں فروخت کرتے ہیں۔

بادشاہ کے خیمہ گاہ میں داخل ہونے کے متعلق بعض خاص طور کی رسموں کا ذکر

بادشاہ کے حال کے متعلق ایک عجیب بات ابھی لکھنی باقی ہے۔ جس کا بیان کرنا

میں بھول ہی گیا تھا اور وہ یہ ہے کہ بادشاہ لشکر گاہ میں کبھی تو ایک طرف سے اور کبھی دوسری جانب سے داخل ہوتا ہے۔ یعنی ایک دن تو ایک جانب کے امرا کے خیموں کے قریب سے گزرتا ہے اور اگلے دن دوسری طرف کے امرا کے ڈیروں کے نزدیک سے۔

آپ یہ گمان نہ فرمائیں کہ یہ ایک اتفاقی امر ہے۔ نہیں، بلکہ اس غرض سے ہے کہ وہ امرا جن کو بادشاہ ان کے ڈیروں کے قریب ہو کر گزرنے کا افتخار بخشتا ہے، ان کو ضرور ہے کہ اپنے اپنے خیموں سے اشرفیوں کی ایک ایک تھیلی جن کی تعداد ان کے حوصلے اور مشاہرہ کے موافق بیس سے پچاس تک ہوتی ہے پیش کش کے واسطے ہاتھوں میں لئے ہوئے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ میں ان شہروں اور قصبوں کا جو دہلی اور لاہور کے راستہ میں پڑتے ہیں کچھ بیان نہیں کرنا چاہتا کیونکہ میں نے ان میں سے شاید ہی کسی کو دیکھا ہے۔ سبب یہ کہ ہمارے آقا کا ڈیرہ فوج کے وسط میں نہیں ہوتا تھا جہاں سے شارع عام اکثر مل سکتا ہے بلکہ دائیں جانب کے سامنے ہوتا تھا اور اس لئے ہم لوگوں کا یہ معمول تھا کہ رات کو کوچ کے وقت ستاروں کا خیال رکھ کر کھیتوں اور پگ ڈنڈیوں کے راستہ سے چل پڑتے تھے اور اس سبب سے اکثر راہ بھول جاتے تھے اور پو پھٹنے تک سیدھا راستہ ملنے میں بہت دشواریاں پیش آتی تھیں اور اس طرح پر بجائے دس بارہ میل کی مسافت کے جو دونوں پڑاؤں میں معمولاً ہوتی ہے، پندرہ یا اٹھارہ میل کی منزل روزمرہ طے کرنی پڑتی تھی۔

تیسرا خط بنام موسیو دی مرویلس جو اس وقت لاہور سے لکھا گیا جبکہ بادشاہ نے کشمیر کی طرف کوچ کیا

پنجاب کے دریاؤں اور شہر لاہور کا بیان

صاحب من! یہ امر بے وجہ نہیں ہے کہ وہ ملک جس کا پائے تخت لاہور ہے پنجاب کہلاتا ہے کیونکہ واقع میں پانچ دریا ان بڑے پہاڑوں سے جنہوں نے ولایت کشمیر کا

محاصرہ کیا ہوا ہے نکل کر اور اس صوبہ کے میدانوں میں بہہ کر دریائے اباسین میں گرتے ہیں جو ملک سندھ میں خلیج فارس کے دہانے کے قریب سمندر میں جاملتا ہے۔

میں یہ امر معین نہیں کر سکتا کہ لاہور وہی قدیم شہر ہے جس کو یونانی لوگ بوس فلا کہتے تھے (۲۰۰)۔ کیونکہ اگرچہ الیگزینڈر کا نام جس کو اس ملک میں سکندر ابن فیلقوس کہتے ہیں، بخوبی معروف و مشہور ہے مگر یہاں کے باشندے اس کے گھوڑے کی نسبت کچھ واقفیت نہیں رکھتے۔

لاہور کے قریب جو راوی دریا ہے، اس کا ذِکر

وہ دریا جس کے کنارے شہر لاہور آباد ہے، پنجاب کے پانچ دریاؤں میں سے ایک بڑا دریا ہے۔ جیسا فرانس میں دریائے لوائر ہے اور ویسے ہی بلند اور سنگین پشتہ کا محتاج ہے جیسا کہ لوائر کے کنارے پر بنا ہوا ہے کیونکہ اس دریا میں اکثر سیلاب آتے رہتے ہیں۔جس سے بڑا نقصان ہوتا ہے اور دریا اپنی جگہ کو اکثر بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ چند ہی سال کے اندر پورا نصف میل لاہور سے دور ہٹ گیا ہے۔ جس سے باشندوں کو کمال بے آرامی اور تکلیف ہوئی ہے۔

لاہور کی عمارات کا ذِکر

لاہور کی عمارتیں دہلی اور آگرہ کے برخلاف بہت اونچی اونچی ہیں اور چونکہ بیس برس سے زیادہ ہوئے کہ بادشاہ مع امراء دربار آگرہ یا دہلی میں رہتا ہے اس لئے لاہور کے اکثر مکانات حالت ویرانی میں ہیں۔ بلکہ واقع میں بہت سی عمارتیں بالکل منہدم ہوگئی ہیں اور پچھلے چند برسوں کی شدید بارشوں میں بہت سے باشندے بھی مکانات سے دب کر مر چکے ہیں مگر اب تک بھی چار پانچ بازار بہت بڑے بڑے ہیں جن میں سے دو تین تو طول میں دو میل سے بھی متجاوز ہیں۔ لیکن ان میں اکثر مکانات بالکل ڈھے پڑے ہیں اور چونکہ دریا کا رُخ تبدیل ہوتا جاتا ہے اس لئے بادشاہی محل دریا کے کنارے سے دور ہو گئے ہیں اور یہ شاہی مکانات بھی اگرچہ بہت عمدہ اور عالی شان بنے ہوئے ہیں لیکن محلات شاہی واقع دہلی اور آگرہ سے ہر ایک بات میں بہت کم ہیں۔

لاہور سے کشمیر کی جانب کوچ کا ذِکر

دو مہینے سے زیادہ ہوئے کہ بہ انتظار اس امر کے کہ کوہستان کشمیر کی برف پگھل

کر راستہ آسانی سے گزر کے لائق ہو جائے، ہم لاہور میں مقیم تھے مگر اب کل کو ہمارا کوچ ٹھہر چکا ہے اور بادشاہ کو تو لاہور چھوڑے دو روز ہو چکے ہیں (۲۰۱)۔ میں نے کل رات ایک خوبصورت چھوٹا سا کشمیر کے لائق خیمہ خرید لیا ہے کیونکہ میرے دوستوں نے یہ صلاح دی تھی کہ اپنے پہلے خیمے کو جو بڑا اور بھاری ہے اب آگے نہ لے جانا چاہئے۔ وہ کہتے ہیں کہ کشمیر کے پہاڑوں پر جہاں اونٹ نہیں جا سکتے ہمارے تمام خیموں کے واسطے جگہ ملنی بہت مشکل ہوگی اور چونکہ اس صورت میں مجھ کو اپنی باربرداری کے واسطے مزدور اور قلی درکار ہوں گے تو اپنے پہلے خیمے کے ساتھ لے جانے کی حالت میں بہت خرچ پڑتا۔ والسلام۔

چوتھا خط بنام موسیو دی مرویلیس جو لاہور سے کشمیر کو جاتے ہوئے چوتھی منزل پر لکھا گیا

راستہ کی سخت گرمی اور اس کے سبب کا بیان

صاحبِ من! مجھ کو یہ امید تھی کہ جیسی گرمی آبنائے باب المندب کے قریب بمقام مخا میں اٹھا چکا ہوں پھر آفتاب کی ایسی سوزاں شعاعیں روئے زمین پر کسی جگہ نہ پاؤں گا۔ لیکن چار روز ہوئے یعنی جب سے کہ فوج نے لاہور سے کوچ کیا ہے وہ میری امید بالکل رخصت ہو گئی ہے ہندوستانی لوگ جو اسی گرم ملک کے باشندے ہیں جبکہ وہ بھی لاہور سے چلتے وقت یہ اندیشہ اور تردّد ظاہر کرتے تھے کہ بھمبر تک پہنچنے میں (جو کوہستان کشمیر کا دروازہ اور گیارہ بارہ دن کا سفر ہے) بڑی ہی تکلیف اٹھانی پڑے گی، تو اس کے سننے سے مجھ کو ایک تعجب ہوتا تھا۔ مگر اب تو فی الواقع یہ میرا تعجب بالکل رفع ہو گیا اور میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ گرمی کی شدت سے نزع کی حالت کو پہنچ گیا ہوں اور کوئی باور نہ کرے گا کہ آج صبح کو جب میں اٹھا تو مجھے بہت ہی تھوڑی امید تھی کہ آج کی دھوپ مجھ کو زندہ چھوڑے گی۔

یہ عجیب گرمی کشمیر کے بلند پہاڑوں کے باعث سے ہے جو ہمارے راستے سے شمال کی طرف ہونے کی وجہ سے شمالی ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا کے ہم تک پہنچنے کے مانع اور

سد راہ ہیں اور مزید برآں انہی پہاڑوں کے سبب سے آفتاب کی سوزاں شعاعیں اس قطعہ ملک پر بر سبیل انعکاس پڑ کر تمام زمین کو خشک کر دیتی ہیں، جن سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ لیکن یہ شدید گرمی جو شاید کل تک مجھے زندہ بھی نہ چھوڑے، اس کی نسبت ایسی فلسفیانہ رائیں لکھنا کیا ضرور ہے۔

پانچواں خط بنام موسیو دی مر ویلیس جو لاہور سے کشمیر کو جاتے ہوئے چھٹی منزل سے لکھا گیا

دریائے چناب اور اس کے پانی کی عمدگی کا ذکر

صاحبِ من! کل میں ہندوستان کے ایک بڑے دریا سے جس کو "چناب" کہتے ہیں پار اترا۔ اس دریا کے لطیف اور عمدہ پانی سے جس کو بڑے بڑے امرا بجائے گنگا کے پانی کے، جو اب تک ان کے ساتھ تھا، اپنے اپنے خرچ کے لئے بھر رہے ہیں۔ مجھ کو یہ امید ہوتی ہے کہ اس دریا کا منبع، جدھر کو ہم جا رہے ہیں، ہمیں تحت الثریٰ کو نہیں لے جائے گا بلکہ فی الواقع کشمیر کی طرف رہبر ہوگا جس کی بابت سب لوگ مجھ کو تسلی دے رہے ہیں کہ وہاں کی برف اور یخ کی سیر و تماشے سے تم خوش ہو جاؤ گے۔

ہر روز روزِ گزشتہ سے زیادہ ناقابلِ برداشت پیش آتا ہے اور جتنے ہم آگے بڑھتے ہیں اتنی ہی گرمی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ بات درست ہے کہ میں نے ٹھیک دوپہر کی دھوپ میں جبکہ سب لوگ اپنے اپنے ڈیروں میں دن ڈھلنے کے انتظار میں آرام کر رہے تھے کشتی کے پل سے عبور کیا لیکن اگر میں اپنے ڈیرے میں گھسا بیٹھا رہتا تو غالباً مجھے اپنی تکالیف میں کچھ کمی ہو جانے کی توقع نہ تھی اور میں نے جس مراد سے یہ تدبیر اختیار کی تھی وہ مطلب حاصل ہو گیا۔ یعنی یہ کہ ہم بلا دقت و تشویش پل سے پار ہو گئے۔

جس پریشانی اور دقت سے اس دریا کا عبور کیا، اس کا ذکر

جب سے ہم دہلی سے روانہ ہوئے ہیں ایسی پریشانی اور چپقلش میں نے کسی دریا

کے گھاٹ پر نہیں دیکھی۔ مگر شاید میری ہوشیاری اور دور اندیشی ہی اس امر کا باعث ہوئی کہ میں اس دریا پر کسی تہلکہ میں پڑ جانے سے بچ گیا کیونکہ پل کے دونوں سروں کی سلامی چڑھنے اور اترنے کے لئے نہایت خراب اور خطرناک تھی۔ جس کا سبب یہ تھا کہ یہ سلامی جس پر چڑھنا اور اترنا امر ضروری ہے، نرم مٹی اور ریت سے بنائی گئی تھی جو بے شمار جانوروں کے پاؤں کے نیچے دریا کے زور کے مارے بہی جاتی تھی اور اسی وجہ سے بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے تھے جن میں بہت سے اونٹ بیل اور گھوڑے گرتے اور لوگوں کے پاؤں تلے کچلے جاتے تھے اور اس پر طرہ یہ تھا کہ ہر طرف برابر دھکم دھکا اور گھونسم گھانسا ہوتی تھی۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر عموماً یہ ہوتا ہے کہ عہدہ دار اور سوار جو امرا کے ہم رکاب ہوتے ہیں، اپنے آقا اور ان کے اسباب وغیرہ کے پہنچانے کی خاطر راستہ میں سے لوگوں کو ہٹانے کے لئے بڑی بے باکی سے ڈنڈے بازی کرتے ہیں۔ اس دریا پر ہمارے نواب کا بھی ایک اونٹ مع لوہے کے تنور کے جو اس پر لدا ہوا تھا ضائع ہو گیا ہے اور اب مجھ کو یہ فکر ہے کہ ہمیں بازار کی روٹی کھانی پڑے گی۔

چھٹا خط بنام موسیو دی مرویلیس جو لاہور سے کشمیر کو جاتے ہوئے آٹھویں منزل سے لکھا گیا

گرمی کی شدت کے مارے جو حالت تھی، اس کا بیان

مشفق من! ایک یورپین شخص کا ایسی سخت گرمی کے تحمل پر آمادہ ہو جانا اور ایسی ہولناک اور پر تعب منازل اور سفر کے مخاطروں میں پڑ جانا خود بخود اس سوال کا باعث ہوتا ہے کہ پھر کون سی چیز ہے کہ جس کے سبب سے کوئی شخص خواہی نخواہی ان مصیبتوں کی برداشت کے لئے تیار ہو جائے؟ افسوس کہ اس کا جواب بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ ہم لوگوں میں دنیا کے عجائبات کی دید کا شوق جو واجبی حد سے بڑھا ہوا ہے، وہی ان سب تکلیفوں کا باعث ہے۔ حالانکہ شوق کیا ہے ایک سخت حماقت اور ناعاقبت اندیشی ہے۔ چنانچہ اس سفر میں

میری جان ایک مسلسل اور غیر منقطع خطر کی حالت میں پڑی ہوئی ہے اور کچھ امید ہے تو صرف یہ ہے کہ شاید اس برائی میں کوئی بھلائی اور فائدہ بھی نکل آئے۔

جب میں لاہور میں تھا تو رات کو سایہ کیے بغیر صحن چبوترے پر سونے کے باعث شبنم اور سردی کے سبب سے ایک سخت زکام اور درد اعضا میں مبتلا ہو گیا تھا (حالانکہ دہلی میں اس طرح پر سونے سے کچھ اندیشہ نہیں ہوتا) اور میری صحت حالتِ خرابی میں تھی۔ لیکن جب سے سفر شروع ہوا ہے تو آٹھ نو روز سے بشدت پسینہ آنے کے سبب سے تمام فاسد رطوبتیں جسم سے خارج ہو گئی ہیں اور میرا بھنا اور مرجھایا ہوا جسم گویا پانی کی چھلنی بن گیا ہے اور سیر بھر پانی جو میں ایک ہی دم میں چڑھا جاتا ہوں، بدن کے روئیں روئیں بلکہ انگلیوں کے پوروں تک سے فوراً نکل پڑتا ہے۔ چنانچہ مجھے یقین ہے کہ آج دس گیارہ سیر سے کم پانی نہیں پیا۔ مگر ہماری سب آفتوں اور مصیبتوں میں یہ بڑی تسکین کی بات ہے کہ جس قدر جی چاہے ہم اسی قدر پانی، بشرطیکہ صاف اور شیریں ہو، بلااندیشہ پی سکتے ہیں۔

ساتواں خط بنام موسیو دی مرویلیس جو لاہور سے کشمیر کو جاتے ہوئے دسویں منزل سے صبح کے وقت لکھا گیا

گرمی کی شدت کے مارے اپنی زیست سے ناامید ہو جانا

صاحبِ من! آفتاب اب تک اچھی طرح نکلا بھی نہیں مگر اس پر بھی گرمی کا یہ عالم ہے کہ اٹھائی نہیں جاتی۔ بادل نام کو بھی نہیں اور ہوا کی یہ حالت ہے کہ پتا تک نہیں ہلتا۔ میرے گھوڑے بالکل تھک گئے ہیں۔ کیونکہ جس دن سے لاہور چھوڑا ہے، ان غریبوں نے ہری گھاس کا تنکا تک نہیں دیکھا۔ میرے ہندوستانی نوکروں کو بھی باوجود اپنے کالے اور خشک اور سخت بدن کے آگے قدم بڑھانے کا حوصلہ نہیں رہا۔ ہمارے چہرے اور پاؤں اور ہاتھوں کی جلد تمام پھٹ گئی ہے اور سارا بدن چھوٹے چھوٹے سرخ گرمی دانوں سے بھر گیا ہے جو سوئی کی طرح چبھتے ہیں۔ کل ہمارا ایک غریب سوار جس کے پاس ڈیرہ نہ تھا ایک

درخت کے نیچے جس کے سایہ میں وہ ٹھہرا ہوا تھا، مردہ ملا اور مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ گویا آج دن ہی دن میں تمام ہو جاؤں گا اور میری ساری امیدیں یا تو ان چار پانچ کاغذی شمبوؤں پر منحصر ہیں جو ابھی باقی ہیں یا تھوڑے خشک کیے ہوئے دہی پر، جس کو میں پانی اور قند ملا کر ابھی پینے والا ہوں۔

لو اچھا خدا حافظ! سیاہی قلم کی نوک پر خشک ہوئی جاتی ہے اور قلم ہاتھ سے گرا جاتا ہے۔

آٹھواں خط بنام موسیو دی مرویلیس جو مقام بھمبر سے، جہاں سے کشمیر کے پہاڑوں کی چڑھائی شروع ہوتی ہے، لکھا گیا

بھمبر کیسی جگہ ہے اور وہاں سے کشمیر کی جانب بادشاہ اور امرا کے نوبت بہ نوبت کوچ کرنے کا ذِکر

صاحبِ من! آخر کار ہم بھمبر میں آپہنچے جو ایک اونچے اور سیاہ اور جھلسے ہوئے پہاڑ کے دامن میں ہے اور ہمارا خیمہ ایک خشک پہاڑی ندی کے بہاؤ میں پتھریوں اور جلتی ہوئی ریت پر، جس کو ٹھیک آگ کی بھٹی کہنا چاہیے، لگا ہوا ہے۔ اور اگر آج اتفاق سے ایک خوب مینہ کا چھینٹا نہ پڑ جاتا اور عین وقت پر پہاڑ سے ایک معقول مقدار سے نیبو، دہی اور مرغ وغیرہ نہ پہنچ جاتے، تو معلوم نہیں کہ آپ کے اس بے چارے وقائع نگار کا کیا حال ہو جاتا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ بالفعل تو ہوا کسی قدر سرد ہو گئی ہے اور میری بھوک بھی کھل گئی ہے اور طاقت میں ترقی معلوم ہوتی ہے اور سب سے پہلے جو میں نے اپنی بازیافتہ صحت سے کوئی کام لیا ہے تو وہ اس خط ہی کا لکھنا ہے۔

اب آئندہ آپ نئی نئی منزلوں اور تکلیفوں کے حالات سے ضرور مطلع کیے جائیں گے۔

کل رات کو بادشاہ نے اس جگہ کو جہاں دم گھٹا جاتا ہے، چھوڑ دیا ہے اور اس کے ہمراہ روشن آرا بیگم اور محل کی اور بیگمیں اور راجہ رگھوناتھ (۲۰۲) جو وزیر کا کام کرتا ہے اور فاضل خاں میر سامان اعلیٰ گئے ہیں۔ اور شبِ گزشتہ کو بادشاہی میر شکار بھی مع کئی بڑے بڑے عہدہ داروں، متعلقہ کارخانہ جاتِ خاصہ شریفہ اور چند معزز خاتونوں کے روانہ ہو گیا ہے اور آج رات کو ہماری باری ہے اور ہمارے گروہ میں ہمارے نواب دانشمند خاں کے کنبے کے لوگوں کے سوا محمد امین خاں خلف مشہور میر جُملہ جس کا بہت کچھ ذکر لکھا جا چکا ہے اور میرا معزز دوست دیانت خاں اور اس کے دو بیٹے اور بہت سے اور امرا اور راجے اور منصب دار شامل ہیں۔ اور امرا بھی جنہیں کشمیر چلنے کا حکم ہے، اسی طرح نوبت بہ نوبت روانہ ہوں گے تاکہ اس پانچ دن کے مشکل اور کوہستانی راستہ میں جو بھمبر اور کشمیر کے مابین ہے، بے آرامی اور ابتری کم ہو جائے۔

بادشاہ کے واپس تشریف لانے تک بہت سے امرا کا حفاظت کے لئے بھمبر میں چھوڑے جانے کا ذِکر مع تذکرہ بعض اور انتظاموں کے

باقی اہلِ دربار، جیسے فدائی خاں میر آتش (افسر اعلیٰ توپ خانہ) اور تین چار بڑے بڑے راجے اور بہت سے امرا تین چار مہینے تک یعنی جب تک کہ گرمی کا موسم گزر جائے اور بادشاہ سلامت واپس تشریف لائیں، محافظت کے واسطے پہرہ کے طور پر اسی قصبہ یا اس کے قرب و جوار میں مقیم رہیں گے۔ جن میں سے بعض تو اپنے ڈیرے دریائے چناب کے کنارے اگالیں گے اور بعض قریب اور گردونواح کے شہروں اور دیہات کو چلے جائیں گے اور باقی کو اسی بھمبر کی جلتی ہوئی زمین پر ڈیرے ڈالے پڑے رہنا ہوگا۔

بادشاہ کے ہمرکاب بہت ہی کم اور خاص خاص لوگ جائیں گے تاکہ کشمیر کی چھوٹی سی ولایت میں رسد وغیرہ کی طرف سے دِقت عاید نہ ہو۔

بیگمات میں سے صرف وہ اعلیٰ درجہ کی خاتونیں جائیں گی جو روشن آرا بیگم کی ہمدم اور سہیلیاں ہیں یا وہ عورتیں جن کا ساتھ ہونا سرانجامِ خدمات کے لئے ضروری ہے۔ امرا اور فوج کے لوگ بھی، جہاں تک ممکن ہے، کم ہی ہوں گے اور جن امرا کو ہمراہی کی اجازت ملی ہے ان کے ساتھ ان کے سواروں میں سے فیصدی پچیس سوار سے زیادہ نہ ہوں گے۔ لیکن جو ضروری ضروری عہدہ دار ان کے ذاتی کارخانہ جات پر مقرر ہیں وہ بہر حال

ساتھ جائیں گے۔

ان قاعدوں کی بجا آوری میں کوئی بہانہ پیش نہیں چل سکتا کیونکہ ایک امیر پہاڑ کے درّے پر متعین کیا گیا ہے جو ایک ایک آدمی کو شمار کرتا ہے اور بموجب اپنے اختیارات کے، منصب داروں کی بھیڑ کو جو کشمیر کی ٹھنڈی اور لطیف ہوا کے مشتاق ہیں اور ان چھوٹے چھوٹے دکان داروں اور اہلِ بازار کو جو صرف کھانے کمانے کی خاطر آئے ہیں، درّے میں داخل ہونے سے روکتا رہتا ہے۔

چند منتخب ہاتھی بھی زنانی سواریوں اور بار برداری کے واسطے بادشاہ کے ساتھ ہیں۔ اگرچہ یہ جانور بہت بھاری اور بڑے قد و قامت کے ہیں لیکن نہایت ہی جانچ کر قدم رکھتے ہیں اور راستہ کے مشکل اور خطرناک ہونے کی حالت میں اس طرح ٹٹول ٹٹول کر چلتے ہیں کہ جب تک پہلا قدم بخوبی جم نہیں جاتا دوسرا قدم نہیں اٹھاتے۔ بادشاہ کے ہمراہ کچھ خچریں بھی ہیں۔ لیکن اونٹ جو بہت کارآمد ہیں نیچے چھوڑ دیے گئے ہیں۔ کیونکہ ان کی سخت اور لمبی لمبی ٹانگوں کے واسطے یہ پہاڑی راستے موزوں نہیں ہیں۔

اورنگ زیب کے کشمیر کے سفر میں جو قلی درکار تھے ان کی تعداد اور اجرت وغیرہ کا ذِکر

اور اس لئے ان کے عوض قلی اور مزدوروں سے کام لیا جاتا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے سنا ہے کہ صرف اکیلے بادشاہ کے واسطے چھ ہزار مزدور مطلوب ہیں۔ تو اس سے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ کس قدر مزدور درکار ہوں گے۔ چنانچہ مجھے اپنی ذات خاص کے واسطے تین مزدور بہم پہنچانے ضروریات سے ہیں، باوجودیکہ میں نے اپنا بڑا خیمہ اور بہت سا اسباب لاہور میں چھوڑ دیا ہے اور ہر شخص نے بلکہ بڑے بڑے امرا اور خود بادشاہ نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ پھر بھی حساب کیا گیا ہے کہ کم سے کم پندرہ ہزار مزدور بھمبر میں جمع ہو چکے ہیں جو کچھ تو کشمیر کے صوبہ دار اور قرب وجوار کے راجاؤں نے بھیجے ہیں اور کچھ اپنی مرضی سے مزدوری کرنے کو چلے آئے ہیں۔ اور بادشاہ کے حکم سے شرح اجرت یہ قرار پائی ہے کہ سو من یعنی پچاس سیر بوجھ کے واسطے پچیس روپے مزدوری دی جائے اور شمار کیا گیا ہے کہ کوئی تیس ہزار مزدور اس وقت مطلوب ہیں۔ اور جب کہ خیال کیا جائے کہ بادشاہ اور امرا اپنا اپنا اسباب اور سوداگر لوگ اپنی سب قسم کی رسد وغیرہ ایک مہینے پہلے سے برابر بھیجتے رہے ہیں

تو مزدوروں کی یہ تعداد نہایت ہی زیادہ ہے۔

مصنف کا نواں خط بنام موسیو دی مر ویلیس جو ہندوستان کے بہشت یعنی کشمیر جنت نظیر سے تین مہینے کے قیام کے بعد لکھا گیا

قدیم زمانہ میں کشمیر کے ایک جھیل ہونے کی روایت کی نسبت مصنف کی رائے

صاحبِ من! کشمیر کے قدیم راجاؤں کی تاریخ میں یوں مندرج ہے کہ یہ تمام ملک اگلے زمانہ میں ایک بڑی جھیل تھا۔ جس کے پانی کو ایک بڈھے رشی نے جس کا نام کاشب تھا اپنی کرامات سے بارہ مولا کے پہاڑ کو چیر کر نکال دیا۔

یہ حال اس کتاب میں مل سکتا ہے کہ جو جہانگیر کے حکم سے کشمیر کی قدیم تاریخوں کا خلاصہ کر کے فارسی زباں میں لکھی گئی تھی اور جس کا میں آج کل ترجمہ کر رہا ہوں۔ بے شک میرا دل بھی اس بات کے انکار کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتا کہ یہ طبقہ کسی وقت پانی میں ڈوبا ہوا نہیں تھا۔ چنانچہ تھسے لی (۲۰۳) اور اور ملکوں کی نسبت بھی ایسی ہی روایتیں چلی آتی ہیں۔ لیکن میں آسانی سے یہ امر باور نہیں کر سکتا کہ یہ شگاف کسی انسان کا کام ہے۔ کیونکہ یہ پہاڑ جس میں سے پانی کا گزر ہوا ہے، بہت ہی لمبا چوڑا اور نہایت بلند ہے۔ بلکہ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہاڑ کسی قدرتی خلا میں، جو سرنگ کی طرح پہاڑوں میں اکثر ہوتی ہیں، کسی سخت بھونچال کے صدمہ سے جو اس ملک میں بہت ہی آتے رہتے ہیں دھنس گیا ہے۔ اگر ہم اس نواح کے عربوں کے قول کا بھی اعتبار کر لیں تو ماننا پڑے گا کہ باب المندب بھی کسی زمانہ میں اسی طرح بنا تھا کہ تمام شہر اور پہاڑ ایک غار میں دھنس کر بڑے بڑے تالاب اور جھیلیں بن گئیں۔

ولایتِ کشمیر کے عرض وطول کا بیان

بہر حال اب تو کشمیر جھیل نہیں ہے بلکہ ایک خوشنما ملک ہے جس میں بہت سی متفرق پہاڑیاں اور پہاڑ ہیں اور جس کا طول قریب تمیں لیگ یعنی نوے میل انگریزی کے ہے اور عرض دس بارہ لیگ۔

کشمیر کے موقع اور حدود کا بیان

ولایت کشمیر لاہور سے شمال کی طرف ملک ہندوستان کے انتہا پر واقع ہے اور اس کی سرحد پر ایسے پہاڑوں کا سلسلہ ہے جو کوہ قاف سے نیچے چھوٹی اور بڑی تبت کے بادشاہوں اور راجہ گوماں کی عملداریوں میں ہیں۔

کشمیر کے پہاڑوں کی سرسبز اور عمدہ چراگاہوں سے مالامال ہونے کا ذکر

جو پہاڑ کشمیر کے گرداگرد اور بہت ہی نزدیک ہیں ان کی بلندی اعتدال کے ساتھ ہے اور سرسبز درختوں سے آراستہ اور چراگاہوں سے مالا مال ہیں، جن پر گائیں' بھیڑیں' بکریاں' گھوڑے اور سب قسم کے مویشی چرتے نظر آتے ہیں۔

کشمیر میں سب قسم کے مویشی اور سب طرح کے شکار اور شہد کی مہالوں کی افراط کا ذکر

اور سب قسم کے شکار مثلاً تیتر' خرگوش اور سینگوں والے (۲۰۴) ہرن اور کستورا ہرن بکثرت موجود ہیں اور شہد کی مہالیں بھی بافراط ہیں۔

کشمیر میں ہر قسم کے موذی جانوروں کے کمیاب ہونے کا ذکر

اور برخلاف ہندوستان کے یہ ایک عجیب اور نادر بات سمجھی جاسکتی ہے کہ یہاں موذی جانور مثلاً سانپ' ریچھ' شیر' چیتا وغیرہ کمیاب کیا بلکہ معدوم ہیں اور ان اوصاف کے باعث ان پہاڑوں کو صرف خوشنما اور بے ضرر اور بے خلش ہی نہیں کہنا چاہئے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ گویا ان میں دودھ اور شہد کی نہریں افراط کے ساتھ جاری ہیں۔ ان پہاڑوں سے پرلی طرف اور بڑے بڑے عظیم الشان پہاڑوں کی بلندیاں نظر آتی ہیں جن کی برف سے ڈھکی ہوئی سفید سفید چوٹیاں معمولی ابر اور بادلوں سے ہمیشہ زیادہ بلند اور اونچی اور کوہ اولیمپس

(۲۰۵) کی مانند روشن اور صاف معلوم ہوتی ہیں۔

کشمیر کے چشموں اور دریا کا بیان

ان سب پہاڑوں میں سے بے شمار چشمے اور گولیں بڑے زور شور سے جاری ہیں جو بعض عملی ذریعوں سے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر بھی، جو اس وادی میں ہیں، پہنچادی جاتی ہیں اور اس طرح سے لوگ اپنے دھانوں کے کھیت بخوبی سینچ سکتے ہیں۔ اور یہ سب پانی اس دلچسپ ملک میں ہزاروں چشمے اور آبشاریں بن کر آخر کار خوبصورت اور کشتیوں کے چلنے کے لائق ایک ایسا دریا بن جاتا ہے جیسا ہمارے ملک فرانس میں "دریائے سین" ہے۔ یہ دریا تدریج اور آہستگی کے ساتھ اس ملک کے گرداگرد پیچ کھاتا اور یہاں کے شہر پائے تخت میں سے ہو کر چپ چاپ بارہ مولا کی طرف خم کھاتا ہوا نکل گیا ہے جہاں اس کو دو عجیب چٹانوں کے مابین ایک مخرج ملتا ہے اور یہاں سے بہت سی چھوٹی چھوٹی ندیوں سمیت جو پہاڑوں سے نکلتی ہیں ایک بہت سیدھی ڈھال پر گر کر شہر اٹک کے نزدیک دریائے لباسین سے آملتا ہے۔

کشمیر کی سرسبزی اور کھیتیوں اور ترکاریوں اور میووں کا بیان

بے شمار نہریں اور آبشاریں جو پہاڑوں سے جاری ہیں وہ اس وادی اور یہاں کی پہاڑیوں کو نہایت سرسبز اور شاداب رکھتی ہیں اور تمام ملک سرسبز اور سیر حاصل اور ایک پھولا پھلا باغ معلوم ہوتا ہے اور اس خوشنما اور دلکش سرسبزی کے اندر کہیں تو گاؤں اور مزارعے دکھائی دیتے ہیں اور کہیں ہری بھری چراگاہیں اور انگور، دھان، گیہوں، سن، زعفران اور ترکاریوں کے کھیت جن میں کہیں تو چھوٹے چھوٹے تالاب ہیں اور کہیں نہریں اور گولیں اور کسی جگہ آبشاریں اور چشمے جو ایک عجیب اور دلفریب کیفیت دکھاتے ہیں۔ اور زمین کی تمام سطح یورپ کے پھولوں اور پودوں سے میناکار نظر آتی ہے۔ اور ہمارے ملک کے میووں سیب 'ناشپاتی 'الوچہ 'خوبانی اور اخروٹ کے درختوں سے جن میں بے شمار پھل لگے ہوئے ہیں، لدا ہوا ہے۔ خربوزہ، تربوز اور اور ہمارے دیس کی اکثر ترکاریاں مثل چقندر وغیرہ اور اور ساگ پات اور نباتات، جن سے ہم واقف بھی نہیں، یہاں کے عام کھیتوں اور باغیچوں میں بکثرت ہیں۔

کشمیر کے میووں کے یورپ کے میووں سے خوبی میں کم ہونے کی وجہ

یہاں کے پھل ہمارے ملک کے میووں سے خوبی میں بلاشک کم ہیں اور نہ اتنی قسم ہی کے ہیں۔ لیکن مجھے یقینِ کامل ہے کہ یہ یہاں کی زمین کا قصور نہیں ہے بلکہ اس کا باعث کاشتکاروں اور باغبانوں کی نادانی ہے جو اہلِ فرانس کی طرح فنِ زراعت اور درختوں کو پیوند وغیرہ کرنے کے ہنر سے ماہر نہیں ہیں۔ بہر حال میں نے اپنے قیام کشمیر کے زمانہ میں نہایت نفیس اور لطیف میوے بکثرت کھائے ہیں اور کچھ شک نہیں ہے کہ اگر یہاں کے لوگ درختوں کی حالت کو ترقی دیں اور ان میں غیر ملکوں کے درختوں کے پیوند لگانے کی نسبت ذرا توجہ کریں تو یہاں کے میوے یورپ کے میووں کی خوبی کو پہنچ سکتے ہیں۔

شہر کشمیر اور اس کی جھیل یعنی ڈل کا بیان

ملک کشمیر کے پائے تخت کا نام بھی کشمیر ہی ہے اور اس کے گرد کوئی شہر پناہ نہیں ہے۔ اس کا طول دو میل سے کچھ زیادہ ہے اور عرض ڈیڑھ میل۔ شہر کشمیر ایک میدان میں واقع ہے جس کا فاصلہ پہاڑوں سے قریب چھ میل کے ہے اور یہ پہاڑ بصورت نصف دائرہ کے نظر آتے ہیں۔ اور شہر ایک شیریں اور خوشگوار پانی کے "ڈل" کے کنارے جس کا محیط بارہ یا پندرہ میل سے کم نہ ہوگا، آباد ہے۔ یہ ڈل ان چشموں اور نالوں سے بن گیا ہے جو پہاڑوں سے آ کر گرتے ہیں! اور اس کا پانی بذریعہ ایک نہر کے جس میں کشتیاں بے تکلف چل سکتی ہیں اس دریا میں جا ملتا ہے جو شہر کے بیچ میں بہتا ہے۔ شہر میں اس دریا پر لکڑی کے دو پل بنے ہوئے ہیں اور شہر کے مکانات اگرچہ اکثر چوبی ہیں لیکن خوبصورت اور دو منزلے اور سہ منزلے ہیں۔

عمارات کے لئے اہلِ کشمیر کے لکڑی کو پتھر پر ترجیح دینے کا سبب

اگرچہ اس ملک میں ایک نہائت نفیس رنگ دار (۲۰۶) پتھر بافراط موجود ہے اور چند پرانی عمارتیں اور ہندوؤں کے بہت سے پرانے مندر جو یہاں کے کھنڈروں میں موجود ہیں پتھر ہی کے ہیں۔ لیکن یہاں کے لوگ لکڑی کو پتھر پر اس واسطے ترجیح دیتے ہیں کہ ایک تو ارزاں ہے دوسرے یہ کہ پہاڑوں سے بذریعہ ان بے شمار ندی نالوں کے بآسانی پہنچ جاتی ہے۔

دریا کے کنارے کے مکانات اور باغیچوں کا ذکر

اکثر مکانات میں جو دریا کے دونوں کنارے بنتے چلے گئے ہیں نہایت خوشنما چھوٹے چھوٹے باغیچے ہیں جو خصوصاً بہار اور گرمی کے موسم میں جبکہ عیش و نشاط کے بہت سے جلسے پانی پر کئے جاتے ہیں، عجب کیفیت دکھاتے ہیں۔

تفریحی کشتیوں کا ذکر

اس شہر کے اکثر مکانوں میں بھی باغ اور ایسی نہریں ہیں جن میں سیر و تفریح کے لئے کشتیاں پڑی رہتی ہیں اور مالک مکان جب چاہتے ہیں سوار ہو کر ڈل کی سیر کر آتے ہیں۔

ہری پربت اور اس کے مکانوں اور باغوں وغیرہ کی خوبصورتی اور خوشنمائی کا ذکر

شہر کے پرلے سرے پر ایک ایسا ٹیلہ نظر آتا ہے جو بالکل الگ ہے اور اس کی ڈھلانوں پر کئی خوبصورت مکان بنے ہوئے ہیں اور ہر ایک مکان کے ساتھ ایک ایک باغ ہے اور اس کی چوٹی کی طرف ایک نہایت اچھی مسجد ہے جس کے ساتھ عابدوں اور گوشہ نشینوں کے لئے عمدہ عمدہ حجرے بنے ہوئے ہیں اور پہاڑ کی چوٹی پر ایک جھنڈ بہت سے خوبصورت درختوں کا ہے اور ان سب چیزوں کا مجموعہ ایک نہایت ہی دلچسپ منظر ہے۔ اور ان سرسبز درختوں اور باغوں کی وجہ سے اس جگہ کا نام اس ملک کی زبان میں ہری پربت ہے یعنی سرسبز (۲۰۷) پہاڑ۔

پہاڑ معروف تخت سلیمان کا ذکر

اس پہاڑ کے مقابل ایک اور پہاڑ نظر آتا ہے اور اس پر بھی ایک چھوٹی سی مسجد مع باغ کے بنی ہوئی ہے اور ایک اور نہایت ہی قدیم عمارت موجود ہے جو ظاہری علامتوں سے ہندوؤں کا مندر معلوم ہوتی ہے اگرچہ اس کا نام تخت سلیمان ہے اور یہاں کے مسلمانوں کا یہ ادعا ہے حضرت سلیمان نے بموقع سیر کشمیر اس کو تعمیر کیا تھا لیکن مجھے شبہ ہے کہ اس مشہور بادشاہ (۲۰۸) نے اپنی تشریف آوری سے کبھی اس ملک کو مشرف کیا ہو اور میری رائے میں یہ لوگ اس کا کوئی ثبوت نہیں دے سکتے۔

کشمیر کے ڈل کے نہایت سرسبز ٹاپوؤں کا ذکر

کشمیر کے ڈل میں بہت سے چھوٹے چھوٹے خوش فضا ٹاپو ہیں جو پانی کے اندر بالکل سرسبز اور نہایت ہی خوبصورت اور میوہ دار درختوں سے لدے ہوئے نظر آتے ہیں اور جن میں نہایت خوش اسلوبی سے بہت سی روشیں بنائی ہوئی ہیں۔ جن پر عموماً دونوں جانب سے سفیدے کے درخت، جو دو دو قدم کے فاصلہ سے لگائے ہوئے ہیں اور جن کے پتے بڑے بڑے ہوتے ہیں، اپنا سایہ ڈالے ہوئے ہیں۔ ان درختوں کا موٹاپا اگرچہ اس قدر ہے کہ سب سے بڑا درخت آدمی کی کولی میں آسکتا ہے مگر اونچائی میں جہاز کے مستول کے برابر ہیں اور ان کی چوٹی پر کھجور کی طرح ڈالیوں اور پتوں کی چھتری ہے۔

ڈل سے پرلی طرف جو پہاڑ ہیں ان کے منظر کی خوشنمائی اور خوبیٔ آب وہوا کا ذکر

جو پہاڑ ڈل کے پرلی طرف ہیں ان کی ڈھلانوں پر بے شمار گنجان مکانات اور پھلواڑی کے باغیچے بنے ہوئے ہیں اور یہاں کی ہوا نہایت صحت بخش سمجھی جاتی ہے اور موقع نہایت خوشنما اور دلچسپ ہے اور جا بجا چشمے اور کولیں جاری ہیں اور یہاں سے ڈل اور اس کے ٹاپوؤں اور شہر کا نظارہ نہایت ہی دلچسپ ہے۔

شالامار باغ کا بیان

ان سب باغوں میں بادشاہی باغ کا نام شالامار (۲۰۹) ہے جو نہایت ہی خوبصورت ہے۔ اس میں داخل ہونے کا راستہ ڈل سے ایک بڑی وسیع نہر میں کو ہے، جس کے دونوں کناروں پر گھاس جمائی ہوئی ہے اور چنار کے درخت برابر دو رویہ نصب ہیں اور جس کا طول پانچ سو قدم کا ہے اور اسی میں سے ہو کر ایک ایسے مکان (۲۱۰) میں، جو بالتخصیص گرمی کے موسم کے لئے بنایا گیا ہے اور باغ کے عین وسط میں ہے، پہنچتے ہیں۔ اس نہر کے علاوہ ایک اور نہر جو اس سے بھی زیادہ نفیس ہے، ایک ایسے ہی دوسرے مکان میں جو باغ کے دوسرے سرے پر ہے، پہنچاتی ہے۔ اس دوسری نہر میں بڑے بڑے رنگے قسم کے پتھروں کا فرش ہے اور اس کے ڈھلواں کنارے بھی اسی پتھر سے بنے ہوئے ہیں۔ اس نہر کے وسط میں ایک

بڑی قطار فواروں کی ہے جن کے باہم پندرہ پندرہ قدم کا فاصلہ ہے اور ان کے علاوہ ادھر ادھر بڑے بڑے گول حوض ہیں جن میں مختلف شکل وصورت کے فوارے چھوٹتے ہیں۔ یہ مکان چونکہ مذکورہ بالا نہروں کے وسط میں واقع ہیں اس لئے ان کے ارد گرد پانی پھرتا رہتا ہے اور ان کے دونوں اطراف پر دو قطاریں چنار کے بڑے بڑے درختوں کی لگی ہوئی ہیں۔ یہ دونوں مکان گنبد کی شکل کے ہیں اور گرداگرد غلام گردش ہے اور ان کے دروازے جو چار چار ہیں ان میں سے ایک ایک دروازہ تو دونوں طرف نہر پر کھلتا ہے اور ایک ایک دونوں جانب کے ان پلوں کے رخ کو جن پر سے ہو کر ان میں سے کنارے کی زمین پر پہنچ سکتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے وسط میں ایک بڑا کمرہ اور چاروں کونوں پر چار چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں جن میں ان کی طرف سنہری اور رنگین اور منقش کام بنا ہوا ہے اور سب کمروں کی دیواروں پر کچھ کچھ فقرات وغیرہ نہایت خوش خط فارسی قلم میں لکھے ہوئے ہیں۔ ان کے چاروں دروازے نہایت ہی قیمتی ہیں یعنی پتھر کے عجیب اور نایاب بڑے بڑے قطعات سے بنے ہوئے ہیں اور ہر ایک دروازے کی محراب دو دو ستونوں پر جو ازبس خوشنما ہیں، قائم ہے۔ یہ محرابیں اور ستون ہندوؤں کے کسی مندر سے جس کو شاہ جہاں نے ڈھوا دیا تھا، آئے تھے اور اس وجہ سے ان کی قیمت کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ میں اس پتھر کی ذات اور قسم کی بابت کچھ بیان نہیں کر سکتا لیکن عقیق اور سب قسم کے سنگِ مرمر سے کہیں بڑھ کر ہے۔

کشمیر کی نسبت مصنف کی رائے

مجھے یقین ہے کہ آپ نے خود بخود پہلے ہی سمجھ لیا ہو گا کہ میں کشمیر پر فریفتہ ہو گیا ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی سیر سے پہلے اس کی خوبصورتی اور خوشنمائی کی نسبت جس قدر اعلیٰ سے اعلیٰ میرے تخیلات اور تصورات تھے، ان سب سے یہ سبقت اور فوقیت رکھتا ہے اور غالباً تمام دنیا میں بے نظیر ہے اور کوئی دوسرا ملک جس کا طول و عرض اتنا ہی ہو اس کی خوبیوں کو نہیں پہنچتا۔ اور حق یہ ہے کہ ہونا بھی ایسا ہی چاہئے کیونکہ اگلے زمانہ میں یہ اعجوبہ روزگار بڑے بڑے اولوالعزم راجاؤں کا تخت گاہ تھا۔ اور تمام گردونواح کے کوہستان بلکہ تاتار اور کل ہندوستان جزیرۂ سراندیپ تک اس کی حکومت میں داخل تھا اور یہ بات کچھ خلافِ قیاس نہیں ہے کہ سلاطینِ مغلیہ اس کو بہشتِ ہند (یعنی کشمیر جنت نظیر) کہتے ہیں اور محلِ تعجب نہیں ہے کہ شہنشاہ اکبر اپنی کوششوں میں اس ملک کی خاطر علی الاتصال ایسا

سرگرم رہا کہ اس نے یہ ملک وہاں کے فرماں رواؤں کے ہاتھ سے کسی نہ کسی طرح آخر چھین ہی لیا اور اس کا بیٹا جہانگیر تو اس چھوٹی سی مملکت پر ایسا لٹو ہو گیا تھا کہ اس نے کشمیر کو اپنی دل پسند آرام گاہ ہی مقرر کر لیا تھا اور اکثر کہا کرتا تھا کہ ہماری اس عظیم الشان سلطنت کا سارا ملک اگر ہاتھ سے نکل جائے تو اتنا رنج نہ ہو جتنا کہ کشمیر کا۔

ایک مشاعرہ کا ذِکر جو کشمیر کی تعریف و توصیف کے باب میں ہوا تھا

ایک مشاعرہ جو بڑے جوش و خروش کے ساتھ شعراء کشمیر اور بادشاہی شاعروں کے باہم ہوا تھا، میں نے بڑے شوق سے اسے دیکھا تھا۔ یعنی ہمارے کشمیر پہنچتے ہی اورنگ زیب کے حضور میں شعراء مذکور نے کشمیر کی تعریف و توصیف میں قصائد پیش کئے جن کو بادشاہ نے قبول فرما کر بہت مہربانی سے مناسب صلے عطا فرمائے۔ ان قصائد میں حد سے بڑھ کر غلو اور مبالغے کئے گئے تھے اور مجھ کو یاد ہے کہ ایک شاعر نے کشمیر کے گرداگرد کے پہاڑوں کی بابت یوں بیان کیا تھا کہ "ان کی عجیب بلندی ہی نے ان آسمانوں کو جو نظر آتے ہیں اس مفرنس شکل کا بنا دیا ہے"، اور یہ کہ "خالقِ کائنات اپنی تمام حکمت اور خوبیِ ایجاد و صنعت کو اس ملک کو پیدا کرنے پر ختم اور خرچ کر چکا اور خالقِ مطلق نے پہاڑوں کا یہ حصار بنا کر اس ملک کو دشمن کی فوج کے حملہ سے محفوظ اور مامون فرمایا اور چونکہ ولایتِ کشمیر تمام روئے زمین کے ملکوں کی ملکہ ہے اس لئے فی الواقع ایسا ہی مناسب تھا کہ وہ اپنی کامل امنیت اور چین چان کی حالت میں بغیر کسی کی اطاعت کے تمام عالم پر حکومت کر سکے"۔ شاعر آگے یوں کہتا ہے کہ "جو پہاڑ ذرا دور اور بہت اونچے ہیں ان کی چوٹیاں سفید اور چمکدار پوشاک سے آراستہ کی گئی ہیں اور جو چھوٹے چھوٹے ہیں وہ سرسبز اور چمکدار ہرے بھرے درختوں سے سجائے گئے ہیں اور یہ اس لئے ہے کہ دنیا کے تمام ملکوں کی ملکہ کے سر پر ایسا ہی تاج زیبا ہے جس کے کلغی کے ہیروں کی کرنیں زمرد میں نمودار ہوں"۔ جب ہمارے نواب صاحب نے اس شاعر کے ان نتائجِ طبع کو میری تفریحِ خاطر کے لئے مجھے دکھلایا تو میں نے کہا کہ "یہ شاعر اگر اپنے مضمون کو یہاں تک اور بڑھا دیتا کہ کوہستان اور ممالکِ قرب و جوار کو (جن سے چھوٹی تبت اور ریاست راجہ گوماں اور کاشغر اور سری نگر (۲۱۱) مراد ہے) سرحد کشمیر میں داخل کر دیتا (کیونکہ اکثر ادعا کیا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں یہ ملک کشمیر کے باج گزار تھے) اور اس سے بھی بڑھ کر اگر وہ یہ کہتا کہ دریائے گنگا اور سندھ اور چناب اور جمنا

(جو خوبی اور عظمت میں دریائے جیحوں وغیرہ سے جن کا کتابِ مقدس میں ذکر ہے کچھ کم نہیں ہیں) مملکتِ کشمیر ہی سے نکلتے ہیں تو کچھ مضائقہ نہ تھا اور اسی بنیاد پر وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ باغ عدن بھی کشمیر ہی میں لگایا گیا تھا نہ کہ آرمینیا میں جیسا کہ لوگوں کا عقیدہ ہے (۲۱۲)۔

کشمیریوں کے ذہن وذکا اور ہنر و فن کا ذِکر

کشمیری لوگ لطافت وظرافت میں مشہور ہیں اور بہ نسبت اور ہندوستانیوں کے زیادہ ہوشیار اور ذہین سمجھے جاتے ہیں اور شاعری اور فضائلِ علمیہ میں بھی ایرانیوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ یہ لوگ محنتی اور چست وچالاک بھی ہوتے ہیں اور ان کی کاریگری خوبصورت اشیا کے بنانے میں جیسے پالکی پلنگ کے پائے، صندوق، صندوقچے، قلمدان، چمچے وغیرہ فی الواقع قابلِ تعریف ہے اور وہاں کے کارخانوں کی بنی ہوئی چیزیں ہندوستان کے تمام اضلاع میں برتی جاتی ہیں۔ یہاں کے لوگ روغن کاری کے فن میں نہایت کامل ہیں اور نہایت باریک اور نفیس سنہری تاروں کو کسی چیز میں جما کر ہر ایک قسم کی لکڑی کے رگ وریشہ کی ایسی خوبصورت سے ہو بہو نقل اتارتے ہیں کہ میں نے کبھی کوئی ایسی نفیس اور بے عیب شے نہیں دیکھی۔

کشمیری شال کا ذِکر

لیکن جو شے کہ کشمیر سے مخصوص اور بڑی تجارت کی چیز ہے اور جس نے خاص کر وہاں کی سوداگری کو چمکا اور کشمیر کو دولت سے مالا مال کر رکھا ہے وہ شال ہے جس کو وہ اپنے کارخانوں میں بناتے ہیں۔ اور جن کی کثرت کے باعث ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں تک بھی بے شغل نہیں رہتے۔ ان شالوں کا طول قریب ڈیڑھ گز فرانسیسی کے ہوتا ہے اور عرض ایک گز۔ اس کے دونوں پلوں پر بہت نفیس نقش و نگار ہوتے ہیں جو ایک اڈے پر جس کا عرض قریب ایک فٹ فرانسیسی کے ہوتا ہے بنائے جاتے ہیں۔ مغل اور ہندوستانی مرد اور عورتیں سب ان شالوں کو جاڑوں میں بطور رضائی کے سر سے اوڑھ کر دائیں طرف سے بائیں طرف کو اپنے جسم پر ڈالے رہتے ہیں۔ شالیں یہاں دو قسم کی بنتی ہیں۔ ایک تو کشمیری اون کی جو ملک اسپین کی پشم سے زیادہ نفیس اور ملائم ہوتی ہے دوسری اس پشم کی جس کو توز (۲۱۳) کہا جاتا ہے اور جس کی ملائمت اور نفاست کو بیور یعنی سگ آبی کی پوستین بھی

نہیں پہنچتی اور بڑی تبت میں ایک قسم کی جنگلی بکریوں کی چھاتی پر سے اتاری جاتی ہے۔

کشمیری اون کے ریزے سے توز کی شالیں زیادہ تر عمدہ اور پسندیدہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ میں نے ان میں سے چند شالیں دیکھی ہیں جو امرا کے واسطے فرمائشی تیار ہوئی تھیں اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ لاگت آئی تھی اور کشمیری اون کی شال میں نے کبھی پچاس روپیہ سے زیادہ کو فروخت ہوتی نہیں سنی (۲۱۴)۔

شال کو اگر کئی مرتبہ کھول کر ہوا نہ دی جائے تو بہت جلد کیڑا لگ جاتا ہے۔ ہر چند پٹنہ آگرہ اور لاہور میں ایسی شالیں بنانے کے واسطے بڑی بڑی کوششیں عمل میں آئیں مگر باوجود ہر طرح کی ہوشیاری کے کشمیری شال کی ملائمت اور بافت کی خوبی نصیب نہ ہوئی اور شاید یہ اس ملک کے پانی ہی کا خاصہ ہے جس کے باعث کشمیری ریزے کو یہ بے نظیر نفاست حاصل ہے۔ چنانچہ مچھلی پٹن کی چھینٹوں وغیرہ کی اعلیٰ رنگت کو بھی جن کو ہاتھ سے چھاپتے ہیں اور جو ہر شوب میں عمدہ ہی نکلتی آتی ہیں وہاں کے پانی ہی کی خاصیت سے منسوب کرتے ہیں۔

اہلِ کشمیر کی شکل وصورت کا بیان

کشمیری لوگ خوبصورتی اور صباحت کے لئے اہلِ فرنگ کی طرح ضرب المثل ہیں اور نہ تو تاتاریوں کی طرح ان کی ناک چپٹی ہوتی ہیں اور نہ سور کی سی بدنما چھوٹی آنکھیں، جو اہلِ کاشغر اور اکثر بڑی تبت کے رہنے والوں کی علامت ہے۔ خصوصاً عورتیں بہت ہی حسین ہوتی ہیں اور قریباً ہر شخص جو اوّل ہی اوّل سلطنتِ مغلیہ میں آکر امراء دربار کی ذیل میں داخل ہوتا ہے، اسی ملک سے اپنے لئے بیوی یا حرم پسند کرتا ہے تاکہ اس کی اولاد بہ نسبت ہندوستانیوں کے زیادہ گوری ہو اور اصل مغلوں میں محسوب ہو سکے اور جبکہ بازار میں اور دکانوں پر ادنیٰ اور غریب لوگوں کی عورتیں حسین دیکھنے میں آتی ہیں تو میرے قیاس کی روسے اونچے گھرانوں کی عورتوں کے جمیل ہونے میں کچھ بھی شک نہیں۔

مصنف کا لاہور اور کشمیر میں ایک مکر سے حسین مستورات کو دیکھنا

قیامِ لاہور کے زمانہ میں حسین مستورات کے دیکھنے کی خاطر میں بھی اسی طور کا ذرا سا مکر عمل میں لایا تھا جیسے کہ مغل لوگ اکثر تاک جھانک کی غرض سے کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ بہ نسبت تمام ہندوستان کے اس شہر کی عورتیں زیادہ حسین ہوتی ہیں۔ رنگ گندمی

ہوتا ہے اور فی الواقع نزاکت اور لطافتِ اندام میں ان کی شہرت بجا ہے۔ چنانچہ میں بعض ہاتھیوں کے پیچھے پیچھے ہولیا، خصوصاً ایک ایسے ہاتھی کے پیچھے جس پر جھول اور سامان ازبس مکلّف پڑا ہوا تھا اور اس تدبیر سے مجھے یقین تھا کہ جس نظارے کا میں طالب ہوں وہ غالباً مجھے حاصل ہو جائے گا کیونکہ وہاں کی مستورات ان نقرئی گھنٹوں کی آواز سنتے ہی جو ہاتھی کے دونوں طرف لٹکائے جاتے ہیں اکثر کھڑکیوں سے سر باہر نکال نکال کر دیکھنے لگ جاتی ہیں۔

پھر ایک اور مکر اختیار کرنا

پہلے پہل کشمیر میں بھی میں اپنا دل اکثر اسی تدبیر سے بہلاتا رہا مگر آخر کار جب اس سے بھی زیادہ ایک اور عمدہ طریق ان کے دیکھنے کا اس شہر کے ایک مشہور بڈھے ملا نے، جس سے میں فارسی نظم کی کتاب پڑھا کرتا تھا، مجھے سکھلایا تو میں نے اپنے مدعا کے حصول کے لئے اس پر عمل کرنا شروع کیا۔ چنانچہ وہ طریق یہ تھا کہ بہت سی مٹھائی خرید کر میں اس کے ساتھ پندرہ سولہ گھروں میں جہاں وہ بغیر روک ٹوک کے جاسکتا تھا پھر گیا۔ ان سب گھروں میں مجھے اس نے اپنا رشتہ دار ظاہر کیا اور کہا کہ ابھی ایران سے آیا ہے اور بڑا متمول آدمی ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے اور جونہی ہم کسی گھر میں داخل ہوتے تھے وہ فوراً لڑکے بالوں کو شیرینی تقسیم کرنے لگ جاتا تھا اور اس حکمت سے اس گھر کی سب عورتیں، کیا بیاہی کیا کنواری، کیا بڈھی کیا جوان، نہ صرف مٹھائی لینے کی خاطر بلکہ اس مراد سے بھی کہ میں ان کو دیکھ لوں میرے گرد جمع ہو جاتی تھیں۔ اگرچہ اس شوق کو پورا کرنے میں میرا بہت سا روپیہ خرچ ہوا مگر اس تدبیر سے مجھے کچھ شک باقی نہ رہا کہ حقیقتاً کشمیر میں ویسا ہی حسن ہے جیسا کہ تمام یورپ میں۔

بھمبر سے کشمیر تک کوہستانی راستے اور عجائباتِ قدرت کا بیان

اب مجھ کو صرف اس سفر کی کیفیت لکھنی رہ گئی ہے جو بھمبر سے کشمیر تک کوہستان کے اندر مجھے کرنا پڑا اور مجھے اپنے اس خط کے شروع ہی میں لکھنا چاہئے تھا۔ اس کیفیت میں کچھ حقائق تو ایسے ہیں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لکھے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو کوہستان قرب و جوار کشمیر کی بابت لوگوں سے حتی الوسع تحقیق کر کے بہم پہنچائے ہیں۔ پس اب بھمبر سے راستہ کا حال سنئے کہ جوں ہی ہم اس ہولناک دیوار عالم کی دوسری جانب پہنچے جس سے میری مراد بھمبر کا وہ بلند اور سیدھا اور درختوں سے خالی سیاہ پہاڑ ہے تو ہم کو

ایک صاف اور ملائم اور تازگی بخش ہوا ملی اور میں پہلی ہی رات کو اپنے کو منطقہ حارہ سے منطقہ معتدلہ میں پاکر متعجب ہوا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہندوستان سے یورپ میں پہنچ گیا ہوں۔ جن پہاڑوں میں سے ہو کر ہمارا گزر ہوا وہ ہر قسم کے یورپی درختوں اور جھاڑیوں سے سبز ہو رہے تھے مگر ان میں زوفا زیرہ اور ضمیران (۲۱۵) اور روز میری قسم کا گلاب نہ تھا اور گویا میں اپنے تئیں آوزن (۲۱۶) کے پہاڑوں میں پاتا تھا جن میں صنوبر بلوط وغیرہ کے درخت کثرت سے ہیں اور اس سیر گاہ اور ہندوستان کے جلتے بلتے میدانوں میں، جن کو ہم ابھی چھوڑ کر آئے تھے اور جہاں کوئی شے بھی اس قسم کی نظر نہیں پڑتی تھی ،ایک نہایت بیّن فرق معلوم ہوتا تھا اور میری توجہ خصوصاً اس پہاڑ کی طرف تھی جو کوہ بھمبر سے دو دن کی مسافت پر تھا اور جس کی دونوں طرفیں مختلف طور کے درختوں سے لدی ہوئی تھیں۔ یعنی جو طرف جنوب رُو اور ہندوستان کی جانب ہے اس پر تو ہندوستانی اور یورپی دونوں قسم کے اشجار کھڑے ہیں اور دوسری طرف یعنی جانبِ شمال صرف یورپی درختوں اور نباتات سے بھری ہے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک طرف پر تو ہندوستان اور یورپ دونوں کی ہوا اور طبیعت برابر ملی جلی ہے اور دوسری جانب (باعتبار زیادہ اعتدال کے) صرف یورپ کی سی آب و ہوا ہے۔ راستہ میں مَیں اس حال کو دیکھ کر بھی نہایت متعجب ہوا کہ ادھر تو بے شمار درخت کھوہوں اور غاروں میں، جہاں انسان کو کبھی جانے کی بھی جرأت نہیں ہوتی، نیچے اوپر پڑے ہوئے سڑ گل کر خاک ہو رہے ہیں اور ادھر اسی طرح بے حد درخت اور نئے نئے پودے ان کی قائم مقامی اختیار کرنے کے لئے بڑی خوشنمائی سے سرسبزی اور شادابی کی حالت میں لہلہا رہے ہیں۔ میں نے بعض جگہ جلے ہوئے درخت بھی دیکھے مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان پر بجلی گری تھی یا ایک دوسرے کے ساتھ رگڑنے سے جل گئے تھے۔ کیونکہ تیز و تند ہوا کے چلنے سے درختوں میں یہ حالت اکثر واقع ہو جاتی ہے۔ یا یہاں کے لوگوں کے خیال کے موافق خشک اور پرانے ہو کر ان میں خود بخود آگ لگ اٹھی تھی۔

ایک عجیب آبشار جس کے قریب جہانگیر کی بنائی ہوئی ایک عالی شان عمارت ہے

خوشنما آبشاروں نے جو یہاں چٹانوں کے مابین اکثر بڑے زور و شور سے گرتی ہیں خوبی اور لطفِ سیر کو نہایت ہی بڑھا دیا ہے۔ خصوصاً ایک آبشار جو اپنی نظیر آپ ہی ہے

میں نے اس کو ایک اونچے پہاڑ پر کھڑے ہو کر کچھ فاصلہ سے دیکھا کہ پانی کا ایک سیلاب ایک لمبے اور تاریک راستہ سے جو برابر درختوں سے ڈھکا ہوا ہے آ کر بڑی تیزی کے ساتھ دفعتاً ایک بڑی سیدھی اور بلند چٹان پر سے گرتا ہے جس سے ایسا شور ہوتا ہے کہ کان سن ہو جاتے ہیں۔ بادشاہ جہاں گیر نے اس آبشار کے متصل ایک پہاڑ کو ہموار کرا کر اس پر ایک عالی شان عمارت تعمیر کرا دی ہے تاکہ اہلِ دربار اس حیرت افزا صنعِ قدرت کے تماشا کو وہاں سے بآرام بیٹھ کر ملاحظہ کر سکیں۔ اس آبشار اور ان درختوں سے جن کا ذکر اوپر ہوا، قدامت اور کہنگی کے آثار ایسے نمایاں ہیں کہ آفرینشِ عالم کے ہم سن کہنا شاید بے جا نہیں ہے۔

پیر پنجال کی چڑھائی میں بیگمات کی سواری کے ہاتھیوں کا گر جانا اور کئی عورتوں کی جان کا تلف ہونا

اس جگہ ایک ایسا سخت حادثہ پیش آیا جس سے ہمارے سیر و تماشے کا لطف بالکل منغص ہو گیا۔ بادشاہ اس وقت پیر پنجال پہاڑ کی چڑھائی پر تھا جو سب پہاڑوں سے اونچا ہے اور جہاں سے ملک کشمیر پہلے ہی پہل دکھائی دینے لگتا ہے اور بادشاہ کے پیچھے پیچھے ہاتھیوں کی ایک لمبی قطار چلی آتی تھی جن پر عماریوں' اور میگھ ڈنبروں میں بیگمیں سوار تھیں۔ اس قطار میں کا سب سے اگلا ہاتھی لوگوں کی دانست میں راستہ کی بلندی اور درازی سے خوف کھا کر پیچھے کو ہٹا اور اس ہاتھی پر آن گرا جو اس کے پیچھے آتا تھا اور اسی طرح پندرہ ہاتھیوں کے ایک دوسرے پر گر پڑنے کی نوبت پہنچ گئی اور اب نہ تو وہ گھوم ہی سکتے تھے اور نہ دائیں بائیں حرکت کر سکتے تھے کہ اس تنگ اور ڈھلواں راستے سے اپنے تئیں نکال لیں اور آخر بے خود ہو ہو کر نیچے جا گرے۔ مگر جس مقام پر یہ ہاتھی گرے تھے خوش قسمتی سے وہ جگہ چنداں بلند نہ تھی اس لئے صرف تین یا چار ہی عورتوں کی جان تلف ہوئی۔ لیکن ہاتھیوں میں سے کسی ایک کے بچانے کی بھی کوئی صورت نہ نکلی۔ یہ جانور جب کبھی بھاری بوجھ سے، جو اکثر اس پر لادتے ہیں، دب کر بیٹھ جاتا ہے تو پھر اچھے راستہ پر بھی نہیں اٹھ سکتا۔ پس ایسی خراب جگہ میں کس طرح اٹھتے۔ چنانچہ جب ہم دو روز بعد پھر اسی راستہ سے گزرے تو ہم نے دیکھا کہ بے چارے کئی ہاتھی اب تک پڑے ہوئے اپنی سونڈیں ہلا رہے تھے۔ اس فوج کو جو چار دن سے قطار باندھ کر ان پہاڑوں میں کوچ کر رہی تھی، اس حادثے کے باعث سخت تکلیف اٹھانی پڑی کیونکہ اس روز کا باقی ماندہ دن اور تمام اگلی رات

بیگمات کی جان بچانے اور اسباب سنبھالنے میں گزری اور اتنی دیر تک سپاہ کو بہ مجبوری اسی جگہ ٹھہرنا پڑا اور اس سبب سے ہر ایک شخص اپنی اپنی جگہ گویا بندھا کھڑا رہا۔ کیونکہ بہت سے مقامات ایسے تھے کہ وہاں سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا ناممکن تھا اور قلی لوگ جن کے پاس خیمے اور رسد تھی وہ پہنچ نہیں سکتے تھے۔ مگر میری معمولی خوش قسمتی میرے ساتھ تھی، میں راستہ سے الگ نکل کر ایک ایسی جگہ جا چڑھا کہ جہاں میں نے اور میرے گھوڑے نے بآرام وقت بسر کیا اور تھوڑی سی روٹی جو میرے نوکر کے پاس تھی، ہم دونوں نے بانٹ کھائی۔

ایک بچھو پکڑنے کی عجیب حکایت

مجھ کو یاد ہے کہ اسی جگہ پر پتھروں کے ہلانے جلانے سے ہم کو ایک بڑا سیاہ بچھو نظر پڑا جس کو ایک نوجوان مغل نے جو میرے جان پہچان والوں میں سے تھا اسے اٹھا کر اپنی مٹھی میں دبا لیا اور پھر میرے نوکر کے اور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ مگر اس نے ہم میں سے کسی کو بھی نہ کاٹا۔ اس نوجوان سوار نے اس کا باعث یہ بیان کیا کہ میں نے اس پر قرآن کی ایک آیت پڑھ کر پھونک دی ہے اور اکثر بچھوؤں پر میں اسی طرح پڑھ کر پھونک دیتا ہوں۔ مگر مجھے اس آیت کے سکھلانے سے انکار کرنے کی اس نے یہ وجہ بیان کی کہ اس کی تاثیر اس سے منتقل ہو کر میرے میں آجائے گی جیسا کہ بقول اس کے، اس کے استاد کا حال ہوا تھا۔ یعنی جب اس نے اس نوجوان کو یہ عمل سکھا لیا تو فوراً اس کی تاثیر استاد کے ہاتھ سے جاتی رہی۔

پیر پنجال پر مصنف کا تین عجیب باتیں معلوم کرنا

جب ہم پیر پنجال پر سے جا رہے تھے، میں نے اپنے فلسفیانہ خیالات کے ساتھ تین عجیب باتوں کا ملاحظہ کیا۔

(۱) گرمی و سردی کی دو متضاد کیفیتیں

ایک تو یہ کہ ایک ہی ساعت میں گرمی اور سردی کی دو متضاد کیفیتیں محسوس ہوئیں۔ یعنی چڑھائی کے وقت تو دھوپ بہت سخت معلوم ہوتی تھی اور ہم پسینے پسینے ہوئے جاتے تھے۔ لیکن چوٹی پر پہنچتے ہی ہم نے اپنے تئیں جمی ہوئی برف کے اندر پایا۔ جس کو کاٹ

کر لشکر کے گزر کے واسطے راستہ بنایا گیا تھا جہاں خفیف خفیف برفانی بارش بھی ہو رہی تھی اور ٹھنڈی ہوا ایسی تندی کے ساتھ چل رہی تھی کہ بے چارے ہندوستانی لوگ جن میں سے اکثر نے کبھی سردی کی شدت نہیں اٹھائی تھی، پہلے ہی پہل اس برف کو دیکھ کر بڑی تکلیف اور حیرت میں پڑ گئے اور بعض تو گھبرا کر بھاگ بھی گئے۔

(۲) صرف دو سو قدم کے فاصلہ میں دو مخالف سمتوں سے ہوا کا چلنا

دوسری یہ کہ صرف دو ہی سو قدم کی مسافت کے اندر دو مخالف سمتوں سے ہوا چلتی تھی۔ یعنی چڑھائی کے وقت تو سامنے کی ہوا تھی جو شمال کی جانب سے آتی تھی اور اترائی کے شروع ہوتے ہی ہماری پشت یعنی جنوب کی طرف سے چلنے لگ گئی۔ غور کرنے سے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا تھا کہ سب طرف سے بخارات اٹھ کر جب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے ہیں تو وہاں کی سردی سے کثیف ہو کر اس ہوا کی پیدائش کا باعث ہوتے ہیں جو وہاں چلتی رہتی ہے اور اترائی کی دونوں مخالف اطراف میں ہوا چلنے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ گرمی کے سبب سے جو نیچے زیادہ ہوتی ہے، نیچے کی ہوا جب ہلکی اور لطیف ہو جاتی ہے تو اوپر کی ثقیل ہوا اس کی جگہ لینے کو نیچے اتر آتی ہے اور یہ اتار چڑھاؤ ہوا کی حرکت کا باعث رہتا ہے۔

(۳) ایک عمر رسیدہ درویش کا یہ بتانا کہ پیر پنجال پر شور وغل مچانے سے طوفان آجاتا ہے

تیسری یہ کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک عمر رسیدہ درویش دیکھا جو جہانگیر کے وقت سے یہاں رہتا ہے۔ اس کے مذہب سے تو کسی کو کچھ واقفیت نہ تھی مگر لوگ یہ بیان کرتے تھے کہ اس سے خرقِ عادات اور کرامتیں ظاہر ہوتی ہیں جس سے بادلوں میں عجیب عجیب طرح کی گرج 'طوفان' برف 'اولے 'اور مینہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی سفید اور الجھی ہوئی داڑھی بہت گھن دار اور لمبی تھی اور چہرے سے کچھ وحشت اور بد مزاجی کے آثار بھی نمایاں تھے اور خیرات بھی ایک اکھڑ پن سے مانگتا تھا اور لوگوں کو ان مٹی کے پیالوں سے پانی پینے کی اجازت دیتا تھا جو ایک بڑے سے پتھر پر اس نے بطورِ قطار کے چنے ہوئے تھے اور ہاتھ سے اشارہ کرتا جاتا تھا کہ یہاں توقف نہ کرو جلد اتر جاؤ اور جو لوگ کچھ غل مچاتے تھے ان سے سخت ناراض ہوتا تھا مگر جب میں اس غار میں کہ جہاں وہ بیٹھا تھا پہنچا اور مؤدب طور پر

اس کے ہاتھ پر ایک اٹھنی رکھ کر اس کا مزاج ٹھنڈا کیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ یہاں شور وغل مچانے سے ہوا اور مینہ کا ایسا سخت طوفان پیدا ہو جاتا ہے جو انسان کے خیال میں بھی نہیں آسکتا اور کہا یہ اورنگ زیب کی دانائی ہے جو اس نے ہماری نصیحت مان کر سپاہ و لشکر کو چپ چاپ اور تعجیل کے ساتھ اتر جانے کا حکم دے دیا ہے اور اس کا باپ شاہ جہاں بھی ایسے ہی حزم و احتیاط کے ساتھ عمل کیا کرتا تھا۔ مگر جہاں گیر نے ایک دفعہ ہماری نصیحت کو ہنسی میں اڑا کر باوجود ہماری تاکیدی ممانعت کے نقارے اور نفیریاں بجانے کا حکم دے دیا تھا مگر وہ ایسے طوفان میں گھرا کہ ہلاک ہوتے ہوتے بچ گیا۔

کشمیر کے بعض چشموں وغیرہ کا دلچسپ بیان

اب میں آپ کی خدمت میں اس سیر و سیاحت کا حال بیان کرنا شروع کرتا ہوں جو میں نے اس ملک کے مختلف حصوں میں کی ہے۔ شہر کشمیر میں پہنچتے ہی ہمارے نواب دانشمند خاں نے مجھ کو اس ملک کی پرلی حد تک بھیجا جو دارالحکومت سے ہلکی سی تین منزل ہے تاکہ میں ان عجائبات کا ملاحظہ کروں جو ایک ابلتے چشمے سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ میرے ہمراہ ایک وہاں کا باشندہ اور محافظت کے واسطے نواب صاحب کا ایک سوار بھی تھا۔

چشمہ سوندھ براری کی وجہ تسمیہ اور اس کے جاری و بند ہونے کے تعجب انگیز اوقات اور اس کے سبب کی نسبت مصنف کا خیال

عجائبات یہ ہیں کہ ماہ مئی میں جس وقت برف پگھلنے لگتی ہے پندرہ روز تک یہ چشمہ فوارہ کی طرح برابر جاری رہتا ہے اور رات دن میں تین بار یعنی طلوعِ آفتاب کے وقت اور دوپہر اور رات کو بند ہو جاتا ہے۔ اکثر پون گھنٹہ تک اس سے متواتر پانی نکلتا رہتا ہے اور ایک ایسے مربع حوض کے بھر دینے کو جو دس بارہ فرانسیسی فٹ عمق اور اسی قدر طول و عرض رکھتا ہے، مکتفی سے بھی زیادہ ہے اور جب پندرہ روز گزر جاتے ہیں تو پانی کی آمد کسی قدر کم ہو کر اس کا بہاؤ معمولی اندازہ پر آجاتا ہے اور ایک مہینہ گزرنے کے بعد پانی کی آمد بالکل بند ہو جاتی ہے۔ مگر سخت اور متواتر بارشوں میں مثل اور چشموں کے بلا انقطاع اور بلا اندازہ جاری رہتا ہے۔ اس حوض کے کنارے پر ہندوؤں کا ایک مندر ہے جو برار

دیوتا کے نام سے منسوب ہے اور اسی وجہ سے یہاں کے لوگ اس کو سوندہ براری یعنی آب برار کہتے ہیں۔ چنانچہ یاتری لوگ دور دور سے آکر اس مندر پر جمع ہوتے ہیں تاکہ اس معجز نما اور پوتر پانی سے اشنان کریں۔ اس چشمہ کی اصلیت کی بابت لوگ بہت سی حکایتیں بیان کرتے ہیں جو لغو اور بے ہودہ ہونے کی وجہ سے ان کا بیان چنداں دلچسپ نہ ہوگا۔ پانچ چھ روز جو مجھ کو یہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تو میں اس عجوبگی کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ چنانچہ میں نے اس پہاڑ کو جس کے دامن میں یہ عجیب چشمہ نکلتا ہے بغور ملاحظہ کیا اور سخت محنت اور مشکل کے ساتھ اس کی چوٹی پر پہنچ کر قدم قدم پر تلاش کرنے اور دیکھنے میں کوئی حصہ اس کا دریافت سے باقی نہ چھوڑا۔ اس کا طول شمال سے جنوب کی جانب ہے اور اگرچہ اور پہاڑوں کے بہت قریب ہے مگر تاہم سب سے بالکل جدا ہے۔ اس کی ہیئت گدھے کی پیٹھ کے مشابہ ہے اور اگرچہ چوٹی کا طول بہت بڑا ہے مگر عرض غایت درجہ سو قدم بھی مشکل سے ہوگا۔ اس کی ایک طرف شمال رویہ ہے جس پر سبز گھاس کے سوا اور کچھ نہیں ہے، مگر صبح کے آٹھ بجے تک مقابل کے پہاڑوں کے حائل ہو جانے کی وجہ سے اس پر دھوپ نہیں آتی۔ اور غربی جانب درختوں اور نباتات سے پُر ہے۔ پس یہ حالات دیکھ کر میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ شاید حرارتِ آفتاب اس کے موقع کی خصوصیت اور اندرونی کیفیتوں سے مل کر اس عجوبگی کو پیدا کرتی ہے اور اس بناء پر میں نے اپنی یہ رائے قائم کی کہ جاڑے کے موسم میں جب کہ تمام زمین برف سے ڈھک جاتی ہے کچھ پانی اس پہاڑ کے اندرونی حصوں میں رِس کر اور منجمد ہو کر اسی طرح محفوظ پڑا رہتا ہے اور جب صبح کے وقت سامنے کی دھوپ سے پہاڑ کا وہ حصہ گرم ہو جاتا ہے جس پر سب سے پہلے دھوپ آتی ہے تو وہ پانی پگھل کر پہاڑ کی دراڑوں میں سے دوپہر کے وقت چشمہ کی جگہ پھوٹ نکلتا ہے اور جس وقت وہ مقام جو صبح کی دھوپ سے گرم ہوا تھا آفتاب کے بلند ہو جانے کے باعث سرد ہو جاتا ہے تو اس جگہ سے پانی کا آنا بند ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب دوپہر کے وقت آفتاب کی شعاع پہاڑ کی چوٹی پر اس کے سر کی طرف سے پڑنے لگتی ہے تو پہاڑ کے دوسرے حصہ کا پانی پگھلنا شروع ہوتا ہے اور بتدریج دوسرے راستوں سے انہی پہلے راستوں میں آجاتا ہے اور رات کو چشمہ سے بہنے لگتا ہے۔ پھر جب آفتاب کی دھوپ پہاڑ کی مغربی سمت پر پڑتی ہے تو وہی تاثیر اس طرف کے منجمد پانی پر ہوتی ہے جو صبح کے وقت پانی نکلنے کا باعث ہے۔ مگر اس دفعہ جو پانی چشمہ سے آہستگی کے ساتھ نکلتا ہے اس کا باعث یہ ہے کہ مغربی

سمت کے پانی کا ذخیرہ چشمہ کے منہ سے کسی قدر فاصلہ رکھتا ہے اور یہ بھی سبب ہے کہ کثرتِ اشجار کی وجہ سے تمازتِ آفتاب سے پہاڑ کی وہ طرف کم اثر پذیر ہوتی ہے یا فقط رات کی سردی اس کا سبب ہے کہ جس کے باعث پانی کا جریان کسی قدر سست ہو جاتا ہے۔

میرے ان دلائل کو اس بات پر غور کرنے سے تائید پہنچتی ہے کہ پہلے دنوں میں پانی کثرت سے نکلتا ہے اور پھر بتدریج گھٹ کر بالکل بند ہو جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو پانی پہاڑ کی دراڑوں میں جما ہوا پڑا تھا ابتدا میں زیادہ تھا اور اخیر میں کم ہوتا گیا۔ علاوہ بریں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس چشمہ سے پانی کے بہاؤ کی مقدار خواہ ابتدائی موسم ہی میں کیوں نہ ہو بالکل غیر معین طور کی ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض اوقات دوپہر کو رات یا صبح کی نسبت زیادہ ہو جاتی ہے اور کبھی صبح کو بہ نسبت دوپہر کے کثیر المقدار ہوتا ہے۔ جس کا سبب ظاہر ہے یعنی یہ کہ کسی دن گرمی زیادہ ہوتی ہے اور کسی دن کم اور بعض اوقات ابر کے سبب دھوپ کی حرارت میں کمی اور زیادتی کا ہو جانا پانی کے بہاؤ میں کمی اور زیادتی کا باعث ہوتا ہے۔

اَچھ بل نامی ایک جوشندہ چشمے اور وہاں کے باغ کا ذِکر

سوندہ براری سے واپسی کے وقت میں شاہراہ سے تھوڑا سا چکر کھا کر آیا تھا تاکہ اچھ بل کی بھی سیر کرتا چلوں۔ یہ جگہ شہر کشمیر کے توابع میں ایک بادشاہی باغ ہے جو سابق میں راجگان کشمیر سے متعلق تھا اور اب شاہان مغلیہ کی سیر گاہ ہے۔ جو چیز کہ بالتخصیص اس جگہ کی حسن و خوبی کا باعث ہے وہ ایک جوشندہ چشمہ ہے جس کا پانی سیکڑوں چھوٹی چھوٹی نہروں میں منقسم ہو کر اس مکان کے گرد اور کل باغ میں پھرتا ہے اور خالی از لطف نہیں۔ اس چشمہ سے پانی اس شدت سے اچھلتا ہے کہ گویا کسی کنویں کی تہ سے جوش مار رہا ہے اور اتنا زیادہ ہے کہ اس کو دریا کہنا چاہئے نہ کہ چشمہ اور نہایت لطیف اور برف کی مانند سرد ہے۔ یہ باغ بہت خوبصورت ہے۔ اس کی روشیں نہایت اسلوب سے بنی ہوئی ہیں۔ اور میوہ دار درختوں' مثل سیب' ناشپاتی' آلوچہ اور زرد آلو سے بھرا ہوا ہے۔ فوارے مختلف وضع اور شکل کے اور مچھلیوں کے رکھنے کے لئے حوض کثرت سے بنے ہوئے ہیں۔ اس جگہ ایک آبشار ایسی بلند ہے کہ گرتے وقت تیس یا چالیس قدم کے طول میں ایک سفید اور

خوبصورت چادر کی شکل بن جاتی ہے اور ایک ایسی عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے جو قیاس سے باہر ہے۔ خصوصاً رات کے وقت جب اس کے نیچے دیوار کے طاقوں میں جو اس غرض سے بنائے ہوئے ہیں صدہا چراغ روشن کر دیئے جاتے ہیں تو اور ہی سماں نظر آتا ہے۔

ایک اور بادشاہی باغ اور وہاں کے ایک حوض کی مچھلیوں کا ذِکر

اچھ بل سے چل کر میں ایک اور بادشاہی باغ میں پہنچا جو وہ بھی ایسا ہی آراستہ ہے اور اس باغ کے حوض کی مچھلیاں آدمیوں سے ایسی مانوس ہیں کہ بلانے یا روٹی کا ٹکڑا ڈالنے سے نزدیک آجاتی ہیں اور بڑی بڑی مچھلیوں کے جبڑوں میں سونے کے بالے پڑے ہوئے ہیں جن پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ بالے نور محل (نور جہاں بیگم) نے جو اورنگ زیب کے دادا جہانگیر کی بیگم تھی پہنائے تھے۔

بارہ مولا میں ایک پیر کے ایک مقبرہ پر بیماروں کے شفا پانے کی غلط شہرت اور ایک ایسے ہی اور بیہودہ اعتقاد کا ذِکر

جب میں نے واپس آکر سونده براری کے حالات دانشمند خاں سے بیان کئے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کو سن کر خوش ہوئے۔ پھر انہوں نے مجھ سے ایک اور طرف جانے کی فرمائش کی تاکہ میں بھی اس عجیب امر کی تصدیق کروں جس کو اور لوگوں کی طرح وہ بھی فی الحقیقت کرامت سمجھتے تھے اور ان کے گمان میں وہ ایسی کرامت تھی کہ میں اسے دیکھ کر مسلمان ہو جاؤں گا۔ انہوں نے فرمایا کہ "آپ ذرا بارہ مولا تک ہو آیئے جس کا فاصلہ سونده براری سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ وہاں ایک مقبرہ ہے جس میں ایک مشہور پیر کا مزار ہے جو اگرچہ اب زندہ نہیں ہیں مگر ان کی کرامت سے اب تک بیمار اور ناتوان لوگوں کو شفا ہوتی ہے اور مرض یا شفا کے فی الواقع ہونے کو شاید آپ نہ مانیں مگر اس بزرگ کی کرامت سے ایک اور کرشمہ ظہور میں آتا ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص کو تسلیم ہی کرنا پڑتا ہے۔ یعنی وہاں پتھر کی ایک بڑی مدور سل پڑی ہے جس کو نہایت طاقت ور آدمی بھی زمین سے نہیں اٹھا سکتا لیکن گیارہ آدمی اس ولی کے حق میں کچھ فاتحہ وغیرہ پڑھ کر اپنی انگلیوں کے سرے سے ایسی آسانی کے ساتھ اٹھالیتے ہیں کہ جیسے ایک گھاس کا تنکا اٹھالیا"۔ میں نے اس دوسرے سفر کی تکلیف کو بھی خوشی گوارا کرلیا اور اپنے دونوں پہلے رفیقوں کے ساتھ چل دیا۔

بارہ مولا کو میں نے ایک فرحت بخش جگہ پایا اور اگرچہ مقبرہ تو کچھ بہت بڑی لاگت کا مکان نہ تھا مگر اس پیر کی قبر البتہ تکلف سے آراستہ تھی اور اس کے چاروں طرف لوگ دعا وغیرہ میں مشغول تھے اور کہتے تھے کہ ہم بیمار ہیں۔ اس مقبرہ کے متصل ایک باورچی خانہ ہے جہاں مجھ کو بڑی بڑی دیگیں گوشت اور چاولوں سے بھری ہوئی نظر پڑیں جس سے میں نے فوراً تاڑ لیا کہ بس یہی بیماروں کے یہاں کھینچ لانے کے لئے مقناطیس کا کام دیتی ہیں اور یہی ان کی شفا کے لئے کرامات کا حکم رکھتی ہیں۔ مقبرہ کے دوسری جانب ایک باغ اور مجاور لوگوں کے حجرے ہیں جنہوں نے اپنے پیر کی مقدس کرامتوں کے اظہار کو اپنی گزران کے لئے ایک بے خلش حیلہ بنا رکھا ہے اور اس کی کرامتیں اور محامد اور مناقب بڑی سرگرمی کے ساتھ بیان کرتے رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ میں ایسے معاملات میں ہمیشہ سے بدقسمت ہوں، پس جب تک میں بارہ مولا میں رہا پیر صاحب نے کسی مریض پر اپنی کرامت کا اثر نہیں ڈالا اور میں اس کے مشاہدہ سے محروم ہی رہا۔

اب اس بھاری سل کا حال سنئے جو مجھے مسلمان بتاتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ مجاوروں میں سے گیارہ آدمیوں نے اس کے گرد حلقہ باندھ لیا مگر ان کی نیچی قباؤں اور مشق کی ہوئی بلافصل حلقہ بندی کی وجہ سے مجھے اس طریقہ کے دیکھنے میں جس سے وہ اس پتھر کو اٹھاتے تھے بڑی دقت پیش آئی۔ مگر غور کرنے سے مجھے ان کی سب مکاری اور ہتھ پھیری معلوم ہو گئی اور اگرچہ یہ لوگ بڑی شد و مد سے ادعا کرتے تھے کہ ہر شخص نے اپنی انگلی کی صرف ایک ہی پور لگائی ہے اور پتھر ایسا سبک محسوس ہوتا رہا ہے جیسا کہ ایک پر ہوتا ہے مگر مجھے صاف معلوم ہو گیا کہ سارا زور لگائے بدون وہ زمین سے نہیں اٹھایا گیا اور مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مجاوروں نے اس پتھر کے اٹھانے میں صرف اپنی انگلیاں ہی نہیں لگائیں بلکہ اپنے انگوٹھے بھی لگائے تھے۔ مگر بایں ہمہ میں بھی ان کے اور ان کے طرف داروں کے ساتھ جو "لفظ کرامت کرامت" پکار رہے تھے ہم آواز اور ہم آہنگ ہو گیا۔ پھر میں نے ان کو ایک روپیہ نذر کیا اور نہایت عقیدت مندانہ صورت بنا کر التجا کی کہ اگر ارشاد ہو تو میں بھی ایک دفعہ اس مقدس پتھر کے اٹھانے والوں کے حلقہ میں شریک ہونے کا شرف حاصل کر لوں۔ یہ لوگ پہلے تو متامل ہوئے مگر جب میں نے ایک روپیہ اور نذر کیا اور کرامت کی سچائی کی نسبت اپنا اعتقاد ظاہر کیا تو ان میں سے ایک نے مجھے اپنی جگہ دے دی۔ کیونکہ ان کو یقیناً یہ امید تھی کہ دس آدمی کچھ زیادہ زور لگا کر اس پتھر کو اٹھائیں گے، خواہ میں اپنی

انگلی کی صرف ایک پور لگانے کے سوا اس کے اٹھا دینے میں کچھ زیادہ مدد نہ دوں۔ اور ان کو یہ بھی توقع تھی کہ ایسی چالاکی کے ساتھ اس کے اٹھا لینے کا انتظام کرلیں گے کہ مجھ کو ان کا فریب معلوم نہ ہو سکے گا۔ مگر جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ پتھر جس کو میں بجز اپنی انگلی کی پور کے اور کچھ سہارا نہیں لگاتا تھا برابر میری طرف جھکا اور گرا جاتا ہے تو وہ سخت نادم ہوئے اور بالآخر میں نے عیاری کی راہ سے اس پتھر کو اپنی انگلی اور انگوٹھے کے ساتھ بزور تھامنا مناسب سمجھا اور ہم سب اس کو بڑی مشکل کے ساتھ اس کی معمولی بلندی تک لے آئے اور جب میں نے دیکھا کہ ہر شخص میری طرف بری نگاہ سے گھور رہا ہے اور خدا جانے میری نسبت کیا کیا خیال کر رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ یہ شخص پتھر کے اٹھانے کے مخاطرہ میں پڑنے کے باعث خود پتھر بن جانے کی سزا کے لائق ہے تو میں نے مناسب جان کر پھر "لفظ کرامت کرامت" پکارنے میں ان کا شریک ہو جانا پسند کیا اور ایک تیسرا روپیہ ان کی طرف اور ڈال کر اس اژدحام سے جھٹ پٹ آنکھ بچا کر نکل آیا اور اگرچہ صبح سے میں نے مطلق کچھ نہیں کھایا تھا مگر وہاں ٹھہرنا مناسب نہ جانا اور فوراً اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر پیر صاحب اور ان کی کرامت کو ابدالآباد تک وہیں چھوڑ آیا۔ اس جگہ کی آمد و رفت سے یہ فائدہ البتہ ہوا کہ ان مشہور چٹانوں کو دیکھ لیا جن کے بیچ میں سے گر کر تمام ملک کشمیر کی نہروں اور چشموں کا پانی ایک دریا بن کر نکلتا ہے اور جس کا اشارہ میں اس خط کے شروع میں کر چکا ہوں۔

ایک جھیل کے اندر ایک فقیر کے مکان کی نسبت لوگوں کے اس بے ہودہ اعتقاد کا ذِکر کہ وہ کرامت سے پانی پر تیرتا ہے

میں اپنے شوق کی وجہ سے شاہراہ سے علیحدہ ہو کر ایک بڑی جھیل کی طرف چلا گیا جو معمولی شاہراہ سے کچھ فاصلہ پر تھی۔ اس جھیل میں مچھلیوں اور خصوصاً مار ماہی کی بڑی کثرت ہے اور مرغابیاں اور راج ہنس اور بہت سے آبی پرندے بکثرت رہتے ہیں اور صوبہ دار کشمیر جاڑوں میں اس جگہ شکار کھیلنے اکثر آتا ہے اور اس وقت پرندوں کی اس جگہ نہایت کثرت ہوتی ہے۔ اس جھیل کے وسط میں ایک فقیر کا چھوٹا سا ایک باغیچہ اور حجرہ ہے جس کو لوگ سمجھتے ہیں کہ کرامت سے پانی پر تیرتا ہے اور جو فقیر یہاں رہتا ہے مدت العمر اس میں بسر کرتا ہے اور یہاں سے کبھی باہر نہیں جاتا ان ہزاروں مہمل اور بے ہودہ حکایات

سے جو اس حجرہ کی بابت مشہور ہیں بجز ایک معتبر روایت کے کہ کشمیر کے راجگان سلف میں سے کسی راجہ نے صرف تماشے کی غرض سے چند پُر کار اور مضبوط شہتیروں کو باہم جوڑ کر ان پر ایک حجرہ تعمیر کروایا تھا میں اپنے اس خط کو سیاہ کرنا نہیں چاہتا۔ وہ دریا جو بارہ مولا کو جاتا ہے اس جھیل کے وسط میں ہو کر گزرتا ہے۔

ایک چشمہ کا ذکر جو دم لے لے کر ابلتا ہے اور اس کے اس طرح پر ابلنے کے سبب کی نسبت مصنف کا خیال

اس جھیل سے چل کر میں ایک چشمہ کی تلاش میں گیا جس کو نہایت عجیب و غریب خیال کرتے تھے۔ یہ چشمہ بلبلے کی شکل میں آہستگی کے ساتھ ابلتا اور کسی قدر زور سے تھوڑا سا بلند ہو جاتا ہے۔ اس کے پانی میں کسی قدر صاف اور شفاف ریگ ملی ہوئی نظر آتی ہے جو کچھ زور سے پانی کے اوپر کو چڑھ کر پھر نیچے چلی جاتی ہے اور اس کے بعد دو ایک لمحہ تک پانی کا جوش کھانا اور ریگ کا اوپر کو چڑھنا تھم جاتا ہے اور پھر بدستور سابق پانی زور کرتا ہے اور ریگ اوپر کو چڑھ کر نیچے بیٹھ جاتی ہے اور اس چشمہ کا یہ حرکت اور سکون اسی طرح کے غیر معین نظام میں جاری رہتا ہے۔ سب سے زیادہ عجیب امر جو اس چشمہ کی نسبت بیان کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ بہت تھوڑا سا شور خواہ بولنے سے ہو، خواہ زمین پر پاؤں مارنے سے پانی میں حرکت پیدا کر دیتا ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا اس کے ابلنے اور بہنے کا باعث ہو جاتا ہے۔ مگر میں نے دریافت کر لیا کہ اس میں نہ تو بولنے سے حرکت پیدا ہوتی ہے نہ پاؤں مارنے سے بلکہ اس کی حرکت اور سکون کا حال خواہ آپ بولیں یا نہ بولیں ایک ہی سا رہتا ہے اور چونکہ میں نے اس کے اصل باعث کی نسبت غور نہیں کیا اس لئے آپ کی خدمت میں کوئی قابلِ اطمینان تشریح نہیں لکھ سکتا۔ مگر شاید یہ سبب ہو کہ ریت اپنے ثقل طبعی کے باعث اس کمزور چشمہ کے تنگ مجرا میں عود کر کے پانی کے اچھلنے میں روک پیدا کرتا ہے اور اس سبب سے پانی جب اندر زیادہ جمع ہو جاتا ہے تو ریت کے ہٹانے اور راستہ کے کھولنے کے لئے پھر زور کرتا ہے۔ یا ظنِ غالب شاید یہ ہو کہ جو ہوا اس کے مجرا میں بھری ہوئی ہوتی ہے، وہ لحظہ بہ لحظہ اوپر کو چڑھتی ہے جیسے کہ عموماً فواروں میں یہ کیفیت مشاہدہ ہوا کرتی ہے۔

ایک جھیل کا ذکر جس میں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے پڑے رہتے ہیں

جب ہم اس چشمہ کو اچھی طرح دیکھ چکے تو ایک اور وسیع جھیل کے دیکھنے کو پہاڑ پر چڑھے جس میں گرمی کے موسم میں بھی برف موجود رہتی ہے اور تند ہوا کے چلنے سے برف کے بہت بڑے بڑے ٹکڑے بحر منجمد کی طرح کبھی مجتمع اور کبھی منتشر ہوتے رہتے ہیں۔

مقام معروف سنگِ سفید کے قدرتی پھولوں کی بہار اور اس روایت کا ذکر کہ شور وغل کرنے سے وہاں سخت بارش ہونے لگتی ہے

اس کے بعد ہم اس مقام سے ہو کر گذرے جس کو سنگِ سفید بولتے ہیں۔ یہ جگہ دو باتوں کے لئے مشہور ہے۔

(۱) ایک یہ کہ موسم بہار میں یہاں ہر قسم کے ویسے ہی پھول پیدا ہوتے ہیں جیسے کسی بڑے عمدہ باغ میں۔

(۲) دوسرے یہ کہ یہاں قدیم سے ایک یہ روایت چلی آتی ہے کہ جب آدمیوں کا زیادہ اژدحام ہوتا ہے اور وہ شور وغل مچا کر ہوا میں حرکت پیدا کرتے ہیں تو ضرور شدت سے بارش ہونے لگتی ہے۔ ایسا اتفاق خواہ عموماً ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو مگر اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ چند سال گزرے جب شاہ جہاں بادشاہ یہاں آیا تھا تو گو اس نے غیر ضروری شور وغل کی ممانعت کے واسطے احکام بھی جاری کر دیئے تھے مگر پھر بھی غیر معمولی اور شدید بارش کے باعث اس کے تمام ہمراہی ہلاکت کے خطرہ میں پڑ گئے تھے۔ اس بیان کو سن کر آپ اُس بڈھے فقیر کی گفتگو یاد فرمائیں گے جو کوہِ پیر پنجال پر مجھ سے ہوئی تھی۔

میرا ارادہ تھا کہ اس پہاڑ کے ایک غار کو بھی دیکھتا چلوں جو سنگِ سفید سے دو دن کی راہ پر تھا اور اس میں عجیب عجیب طور کی منجمد چیزیں قابلِ مشاہدہ تھیں۔ مگر اتنے میں میرے پاس خبر پہنچی کہ ہمارے نواب صاحب میری بہت دنوں کی غیر حاضری سے فکر مند اور متردّد ہیں اس لئے مجھے اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا۔

کشمیر کے قرب و جوار کے پہاڑی ملکوں اور وہاں کی پیداوار وغیرہ اور

باشندوں کے مذہب اور سادہ لوحی کا بیان

جب سے میں یہاں آیا ہوں ہر چند میرے خیالات اسی مضمون کی طرف مائل رہتے ہیں مگر مجھے کوئی ہم شوق اور ہم خیال شخص بہم نہیں پہنچا۔ اور نہ کوئی ایسا آدمی ملا جس کو کاوش اور تلاش ہو اور ان امور سے واقفیت رکھتا ہو جن کو میں تحقیق کرنا چاہتا ہوں اور اس لئے مجھے افسوس ہے کہ کشمیر کے قرب وجوار کے کوہستان وغیرہ کی نسبت میں مختصر اور غیر مکمل ہی اطلاع دے سکتا ہوں۔ مگر بہر حال جو کچھ میں نے دریافت کیا ہے آپ کو لکھتا ہوں۔ وہ تاجر لوگ جو شال بنانے کی عمدہ پشم کے جمع کرنے کے لئے سال بسال پہاڑوں میں پھرتے رہتے ہیں، متفق اللفظ بیان کرتے ہیں کہ ان پہاڑوں کے اندر جو اب بھی کشمیر کے توابع میں شمار ہوتے ہیں زمین بہت زرخیز ہے اور ان میں سے ایک علاقہ تو ایسا ہے کہ جس کے سالانہ خراج میں صرف اون اور چمڑا دیا جاتا ہے اور عورتیں حسن وجمال اور پاک دامنی اور دستکاری میں ضرب المثل ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر ایک اور علاقہ جس کی وادیاں بہت خوشنما اور میدان سیر حاصل ہیں وہاں چاول اور کئی قسم کا غلہ اور سیب اور ناشپاتی اور زرد آلو اور نفیس خربوزہ اور انگور (جس سے عمدہ شراب بنتی ہے) کثرت سے ہوتا ہے اور اس کا خراج بھی چمڑے اور اون ہی سے دیا جاتا ہے اور بعض اوقات ایسا بھی اتفاق ہو جاتا ہے کہ اس کے باشندے اپنے ملک کی دشوار گزاری کے بھروسہ پر ادائے خراج سے انکار کر بیٹھے ہیں لیکن سرکاری فوج ہمیشہ جاکر پھر مطیع کر لیتی ہے۔ سوداگر لوگوں سے میں یہ بھی سنتا ہوں کہ دور دور کے پہاڑوں میں جو اب کشمیر کے باج گزار نہیں رہے اور بھی اچھے اچھے خوشنما علاقے ہیں جہاں کے لوگ سرخ وسفید اور خوش اندام ہوتے ہیں لیکن اپنے وطن سے ایسا انس رکھتے ہیں کہ کبھی شاذو نادر ہی باہر جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض علاقوں میں کوئی حاکم بھی نہیں ہوتا اور جہاں تک تحقیق ہو سکتا ہے کچھ مذہب بھی معلوم نہیں ہوتا۔ مگر ہاں بعض بعض اقوام مچھلی کو ناپاک سمجھ کر کھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔

اب میں وہ حال بیان کرتا ہوں جو چند روز ہوئے مجھ سے ایک بڈھے نیک مرد نے کہ جس نے کشمیر کے ایک قدیم راجہ کی نسل میں شادی کی تھی، بیان کیا تھا۔ جس زمانہ میں جہانگیر بادشاہ راجگان کشمیر کے خاندان کے لوگوں کی بڑی سرگرمی سے تلاش کر رہا تھا یہ بڈھا بچ کر اپنے تین متعلقوں کے ساتھ مذکورہ بالا کوہستان کی جانب نکل گیا تھا اور کچھ

نہیں جانتا تھا کہ کدھر جاتا ہوں۔ مگر پھرتے پھرتے آخر کار وہ ایک خوشنما چھوٹے سے ضلع میں جا نکلا جہاں اس کے شرف خاندان سے مطلع ہوتے ہی لوگ بڑے اخلاص اور عقیدت سے پیش آئے اور اس خوش نصیب شخص کے روبرو پیش کش اور نذرانوں کے انبار لگا دیئے اور شام کو اپنی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں اس التجا سے لے کر حاضر ہوئے کہ آپ ان میں سے کسی کو پسند فرمالیں تاکہ اس ملک کو آپ کی نسل سے فخر حاصل ہو۔

پھر یہ میرا دوست ایک اور ضلع میں جو اس ضلع کے قریب ہی تھا گیا اور وہاں بھی اس کی ویسی ہی آؤبھگت ہوئی، لیکن شام کے وقت کی تواضع میں ایک بات کا فرق ہوا یعنی وہاں کے لوگوں نے اپنی لڑکیاں حاضر کی تھیں اور یہاں والوں نے اپنے ہمسایوں کو بے وقوف سمجھ کر اور یہ مآل اندیشی کر کر کے لڑکیاں تو آخر کار اپنے خاوندوں کے ساتھ اپنی اپنی سسرال کو چلی جائیں گی اپنی جوروئیں پیش کیں۔

چھوٹی تبت کے فرمانروا کے پیشکش لے کر کشمیر میں حاضر ہونے اور اس کی زبانی ملک تبت کے جو حالات معلوم ہوئے، ان کا ذِکر

چھوٹی تبت جو کشمیر کی سرحد پر ہے اس کے فرمانروا خاندان کے لوگوں میں چند سال سے بڑے بڑے تنازع ہو رہے تھے جن میں سے آخر کار ایک شخص (۲۱۷) نے جو حکومت و ریاست کا دعویٰ دار تھا پوشیدہ صوبہ دار کشمیر سے مدد کی درخواست کی اور شاہ جہاں کے حضور سے حکم ہو گیا کہ جو مدد درکار ہو، دی جائے۔ چنانچہ صوبہ دار نے یورش کی اور بعض دعویدار تو قتل ہوئے اور بعض بھاگ گئے اور اس کو اس شرط کے ساتھ مسند پر بٹھا دیا گیا کہ سال بسال کسی قدر بلور، مشک اور شال بنانے کی اون بطور خراج دیا کرے اور یہی وجہ تھی کہ اس شخص کو یہ چیزیں بطور پیشکش لے کر بذاتِ خود اورنگ زیب کے حضور میں حاضر ہونا پڑا۔ مگر ایسے حقیر سامان کے ساتھ آیا ہے کہ میں تو کبھی اس کو عالی رتبہ شخص خیال نہیں کر سکتا! ہمارے نواب نے اس غرض سے اس کی دعوت کی کہ اس سے اس کے علاقہ کے کچھ حالات معلوم کر سکیں۔ چنانچہ اس نے ہم سے بیان کیا کہ بڑی تبت میری ریاست کی حد شرقی ہے اور اس کا عرض قریب نوے یا ایک سو بیس میل کے ہے اور کہا کہ گو ہمارے ہاں بلور، مشک اور پشم، یہ اشیاء بہم پہنچتی ہیں، مگر میں چنداں متمول نہیں ہوں اور لوگوں کا یہ عام گمان کہ میرے قبضہ میں سونے کی کانیں ہیں، بالکل غلط ہے۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ

اس کے ملک کے بعض اضلاع میں عمدہ عمدہ میوے پیدا ہوتے ہیں خصوصاً خربوزہ جو کئی قسم کا ہوتا ہے۔ مگر کثرتِ برف کے باعث جاڑا بڑی شدت سے پڑتا ہے اور رہاں کے باشندے پہلے بت پرست تھے مگر اب اکثر مسلمان ہو گئے ہیں۔ چنانچہ میں بھی مسلمان ہوں اور شیعہ ہوں۔ اس نے یہ بھی ذکر کیا کہ "سترہ اٹھارہ برس گزرے کہ شاہ جہاں نے بڑی تبت کو جس پر راجگان کشمیر کی اکثر تاخت رہتی تھی، تسخیر کرنے کا ارادہ کیا تھا اور سپاہ نے بعد سولہ دن کے ایک مشکل سفر کے جو کوہستان میں سے کرنا پڑا تھا ایک قلعہ کو محاصرہ کر کے لے بھی لیا تھا اور وہاں کے لوگوں میں ایسی ہل چل ڈال دی تھی کہ بے شک تمام ملک مسخر ہو جاتا اگر سپاہِ شاہی ایک مشہور اور تیز رو دریا سے، جو راستہ میں آتا ہے، اتر کر اسی وقت جرأت کر کے ریاست گاہ کو جا لیتی۔ مگر چونکہ موسم مخالف آن پہنچا تھا، صوبہ دار کشمیر جو اس فوج کا حاکم تھا اس اندیشہ سے واپس آ گیا کہ کہیں برف نہ آن دبائے اور اس مفتوحہ قلعہ میں کسی قدر سپاہیوں کو اس لئے چھوڑ آیا کہ فصل بہار کے شروع میں پھر یورش کروں گا۔ مگر فوج متعینہ قلعہ نے عجیب حرکت کی کہ قلعہ کو یا تو دشمن کے خوف سے یا قلتِ رسد کی وجہ سے ناگہاں اور خلاف توقع خالی کر دیا۔ اور اس طرح سے بڑی تبت کا ملک جس کی تسخیر آئندہ فصلِ بہار پر ملتوی رکھی گئی تھی، محکوم ہونے سے بچ رہا۔

بڑی تبت کے سفیر کے اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہونے کا اور جو تحائف وہ لایا تھا ان کا اور اس کی ذلیل حیثیت کا ذکر

چونکہ اس ملک کو اورنگ زیب کی فوج کشی کا خوف تھا، وہاں کے رئیس نے بادشاہ کی کشمیر میں تشریف آوری سن کر اپنے ایک سفیر کو اپنے ملک کے تحائف بلور، مشک، سنگ یشب اور سرہ گائے کی سفید اور عمدہ دُمیں دے کر جو بالتخصیص اسی ملک میں ہوتی ہیں اور زیبائش کی خاطر ہندوستان میں ہاتھیوں کے کانوں میں لٹکا دیتے ہیں، بھیجا ہے۔ سنگِ یشب جو اس دفعہ پیشکش میں آیا ہے خلاف معمول بہت بڑا قطعہ ہے اور اسی جہت سے بیش قیمت ہے۔ دربار مغلیہ میں یہ پتھر بڑی قیمت اور قدر پاتے ہیں۔ ان کا رنگ سبزی مائل ہوتا ہے اور اس میں سفید سفید دھاریاں ہوتی ہیں اور ایسا سخت ہوتا ہے کہ صرف الماس کے برادہ کے ساتھ تراشا جاتا ہے۔ پیالے پیالے اور پھولدان اسی پتھر کے بنتے ہیں۔ چنانچہ میرے پاس بھی اس پتھر کی چند عمدہ بنی ہوئی چیزیں ہیں جن میں سنہری تار اور جواہرات جڑے ہوئے

ہیں۔

ان جناب ایلچی صاحب کی جلو میں تین چار تو سوار تھے اور دس بارہ لمبے لمبے قد والے دبلے اور سوکھے ہوئے سڑیل پیادے۔ جن کے منہ پر چینیوں کی طرح داڑھی کا کوئی بال صرف نام ہی کو تھا اور ایک طرح کی غریبانی ٹوپیاں سرخ رنگ کی پہنے ہوئے تھے۔ جیسے کہ ہمارے فرانس کے ملاح پہنتے ہیں اور ان کے باقی لباس کی شان و شوکت بھی ان ٹوپیوں ہی سے خیال فرمالیجئے اور مجھے یاد ہے کہ ان میں سے صرف چار پانچ بزرگوار تو البتہ تلوار باندھے ہوئے تھے باقی کے پاس لاٹھی تک نہ تھی اور بالکل خالی ہاتھ ایلچی جی کے پیچھے پیچھے چلا کرتے تھے۔

سفیر تبت کا اپنے آقا کی طرف سے ادائے خراج اور تعمیر مسجد وغیرہ کے عہد و پیمان کرنا

الغرض اس شخص نے اپنے آقا کی طرف سے اورنگ زیب کے ساتھ عہد و پیمان کیا کہ دار الریاست تبت میں ایک مسجد تعمیر کرائی جائے گی جہاں اہلِ اسلام کے طور پر نماز ہوا کرے گی اور سکہ کے ایک طرف اورنگ زیب کا نام منقوش ہوگا اور ایک رقم سالانہ خراج کی بھیجی جایا کرے گی۔ مگر اس میں کسی شخص کو بھی شبہ نہیں ہے کہ اورنگ زیب کے کشمیر سے مراجعت کرتے ہی اس عہد و پیمان پر کچھ بھی عمل نہ کیا جائے گا اور رئیس تبت شرائط عہد و پیمان کو اس سے زیادہ بجا نہ لائے گا جیسے کہ اس عہد کے شرائط کو بجالایا تھا جو شاہ جہاں اور اس رئیس کے باہم ہوئے تھے۔ (۲۱۸)

سفیر تبت کے ایک ہمراہی طبیب سے مصنف کی ملاقات اور لاما گرو اور مسئلہ تناسخ کا ذِکر

اس ایلچی کے ہمراہیوں میں ایک طبیب تھا جس کو کہتے تھے کہ لاسا کا رہنے والا ہے اور فرقہ لاما میں سے ہے (۲۱۹)۔ "لاما" لاسا میں ہندوستان کے برہموں کی طرح مذہبی امور میں مقتدا اور رہنما سمجھے جاتے ہیں مگر برہموں کے طریقے کے برخلاف ان میں ایک گرو بھی ہوتا ہے، جس کی تعظیم و تکریم صرف ملک لاسا ہی میں نہیں بلکہ کل تاتار میں ہوتی ہے اور اس کا ایسا اعزاز و احترام کرتے ہیں جیسے کسی بڑے دیوتا کا۔ اس طبیب کے

پاس نسخوں کی ایک کتاب تھی اور میں نے ہر چند چاہا کہ وہ اس کو بیچ ڈالے مگر اس نے نہ دی۔ اس کتاب کا خط دور سے کچھ ہمارے خط کے مشابہ دکھلائی دیتا تھا۔ ہم نے اس سے اس خط کی ابجد لکھوائی مگر اس نے بڑی مشکل سے اور ایسی بد خطی سے لکھی کہ جس کے باعث ہم نے اس کو بے علم اور جاہل جان لیا۔

مسئلہ تناسخ پر اس شخص کو سخت اعتقاد تھا جس کی نسبت اس نے عجیب و غریب حکایتیں سنائیں۔ جن میں سے اس نے یہ بھی ذکر کیا کہ ایک بار جب بڑا لاما بہت بڈھا ہو گیا اور اس کی موت کا وقت آن پہنچا تو اس نے مجلس جمع کی اور ارشاد کیا کہ میری روح ایک نوزاد بچے کے قالب میں حلول کرے گی، چنانچہ اس بچے کو جس کی نسبت اس نے یہ خبر دی تھی بڑے غور اور پرداخت سے پالا گیا اور جب وہ چھ سات برس کا ہو گیا تو بہت سا مختلف قسم کا اسباب خانہ داری اور پوشاکیں وغیرہ امتحاناً اس کے رُوبرو رکھی گئیں اور اس نے ازراہِ فراست اپنے اور بیگانے اسباب میں فوراً امتیاز کر دیا۔ یہ حکایت اس طبیب کے لئے مسئلہ تناسخ اور نقل ارواح پر اعتقاد کرنے کو ایک نہایت قاطع دلیل تھی۔ پہلے تو ہم کو یہ گمان ہوا کہ یہ شخص ہنسی کے طور پر اس قسم کا بیان کر رہا ہے لیکن پھر معلوم ہو گیا کہ نہیں فی الواقع اس کو اس روایت کی صحت پر پکا اعتقاد ہے۔

ایک روز میں اس ایلچی کے مکان پر اس طبیب کی ملاقات کو گیا اور ایک کشمیری سوداگر کو ترجمانی کے لئے اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ تو میرا صرف بہانہ ہی تھا کہ مجھے کچھ پشمینہ جو اس کے پاس تھا خریدنا ہے۔ بلکہ اصل مطلب یہ تھا کہ اس سے ان ممالک کے حالات دریافت کروں جن کی کیفیت مجھے مکمل طور پر معلوم نہیں ہے۔ مگر کوئی نئی بات دریافت نہ ہوئی۔ اکثر وہ یہی کہتا رہا کہ بڑی تبت ہمارے ملک کے ساتھ ہمسری نہیں کر سکتی، ہمارے ہاں سال بھر میں پانچ مہینے سے زیادہ عرصہ تک برف پڑتی ہے اور اکثر تاتاریوں سے ہماری ہمیشہ لڑائی رہتی ہے۔ مگر وہ یہ نہیں بتا سکا کہ تاتاریوں سے اس کی مراد کون سے تاتاری تھے۔ آخر کار مجھے معلوم ہو گیا کہ جو وقت اس کی ملاقات میں صرف ہوا، ناحق ضائع ہوا کیونکہ میں نے اس کو اپنے اکثر سوالات میں سے کسی ایک کے جواب دینے پر بھی قادر نہ پایا۔

کشمیر سے تبت ہو کر چین کے راستوں اور اشیاء تجارت وغیرہ کا بیان

بیس برس سے پہلے کشمیر سے چین کو ہر سال کاروان جایا کرتے تھے اور ان کا راستہ

بڑی تبت کے کوہستان اور ملک تاتار میں سے تھا اور تقریباً تین مہینے کے عرصہ میں چین میں پہنچ جاتے تھے۔ یہ راستہ بہت دشوار گزار ہے اور ایسے تیز رو دریا اترنے پڑتے ہیں کہ جن پر سے گزرنا صرف ایسے لمبے لمبے رسوں کے ذریعہ سے ممکن ہے جو دریا کے وار پار بڑے بڑے پتھروں سے بندھے رہتے ہیں (۲۲۰) یہ قافلے چین سے مشک' چوب چینی' ریوند' اور مامیران' جو امراض چشم کے معالجہ کے باب میں ایک چھوٹی سی نہایت مشہور جڑ ہے' لاتے تھے۔ جب یہ لوگ واپسی کے وقت بڑی تبت میں ہو کر گزرتے تھے تو اس ملک کے تحائف بھی مثل مشک' بلور' سنگ یشب اور خاص کر بھیڑوں اور جنگلی بکریوں کی پشم کے، جس کو ان اطراف میں توز کہتے ہیں اور جو حسب بیان سابق ملائمت میں بیور کے مشابہ ہے، بھر لاتے تھے۔ مگر جب سے شاہ جہاں نے بڑی تبت پر حملہ کیا ہے وہاں کے راجہ نے نہ صرف کاروانوں کا آنا جانا بند کر دیا ہے بلکہ یہاں تک ممانعت کر دی ہے کہ کوئی کشمیر کا رہنے والا بھی ہماری قلمرو میں قدم نہ رکھنے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہندوستان کے کاروان شہر پٹنہ سے جو گنگا کے کنارے بستا ہے، چل کر سیدھے ملک لاسا میں جا پہنچتے ہیں اور بڑی تبت کو بائیں ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

ملک کاشغر کا بیان

اس ملک کی نسبت جو یہاں (یعنی ہندوستان میں) بنام کاشغر مشہور ہے اور اغلب غالب وہ وہی ہے جس کو ہمارے جغرافیہ کے نقشوں میں کاسکر لکھتے ہیں میں وہ سب حالات بیان کروں گا جو مجھ کو اس ملک کے رہنے والے سوداگروں سے معلوم ہوئے ہیں۔ یہ لوگ یہ سن کر کہ اورنگ زیب کشمیر کی سیر کو آیا چاہتا ہے بہت سے کم عمر غلام اور لونڈیاں بیچنے کو لائے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ کاشغر تھوڑا سا شمال کو جھکتا ہوا کشمیر کے شرق میں ہے اور ان دونوں ملکوں میں سیدھا اور نزدیک کا راستہ بڑی تبت میں کو ہے۔ مگر اس سبب سے کہ وہ اب بند ہے، ہم ضرور تا چھوٹی تبت ہو کر آئے ہیں۔ پہلا شہر جو ہم کو مراجعت کے وقت راستہ میں آتا ہے اس کا نام گورچی ہے جو توابع کشمیر میں سے عین سرحد پر واقع ہے اور کشمیر سے چار دن کا راستہ ہے گورچی سے چل کر ہم آٹھ روز میں اسکردو میں پہنچتے ہیں جو چھوٹی تبت کا دار الریاست ہے۔ اور وہاں سے دو دن میں قصبہ چیکر (۲۲۱) میں آتے ہیں جو چھوٹی تبت ہی کے علاقہ میں اس ندی کے کنارے آباد ہے جس کا پانی بمنزلہ دوا

کے مشہور ہے اور یہاں سے پندرہ روز کے عرصہ میں ایک بڑے بن میں جو چھوٹی تبت کی سرحد پر ہے، پہنچتے ہیں اور پھر پندرہ روز میں کاشغر پہنچ جاتے ہیں جو ایک چھوٹا سا شہر ہے اور جو اگلے زمانہ میں حاکم نشین مقام تھا۔ گو بالفعل کاشغر کا رئیس جورسندھ میں رہتا ہے جو ذرا زیادہ شمال کی طرف کاشغر سے دس منزل کے فاصلہ پر ہے۔

کاشغر سے چین کو کاروانوں کے آنے جانے اور وہاں کے راستوں کا بیان

ان سوداگروں نے یہ بھی بیان کیا کہ شہر کاشغر سے چین تک دو مہینے سے زیادہ کا سفر نہیں ہے اور کاشغر سے ہر سال کاروان چین کو جاتے ہیں اور وہاں سے وہ اجناس لے کر جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ملک اُزبک کے راستہ سے ایران کو چلے جاتے ہیں اور بعض کاروان ایسے بھی ہوتے ہیں جو چین ہو کر ہند میں آنے کے لئے پٹنہ کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ان تاجروں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ کاشغر سے چین کو ایک اور راستہ بھی ہے جو ایک ایسے قصبہ میں ہو کر گزرتا ہے جو ختن سے جو ملک کاشغر کی سرحد پر سب سے اخیر شہر ہے، آٹھ منزل ہے۔ انہوں نے کہا کہ کشمیر سے کاشغر تک راستہ نہایت ہی خراب ہے اور منجملہ اور مشکلات کے ایک جگہ ایسی بھی آتی ہے کہ جہاں ہر موسم میں مسافر کو آدھے میل تک برابر برف ہی برف پر جانا پڑتا ہے۔

ان اطلاعوں کے نامکمل ہونے کی بابت مصنف کا عذر

مشفقِ من۔ یہ کل واقعات ہیں جن کو میں ایسے لوگوں سے حاصل کر سکا ہوں جن کی نادانی اور جہل رحم کے قابل ہے۔ پس جو حالات اور کیفیات ایسے لوگوں سے حاصل ہوں بلاشک قلیل اور بے ترتیب ہی ہوں گے، جیسے کہ یہ ہیں۔ علاوہ بریں مجھے ایسے مترجموں سے بھی کام لینا پڑتا تھا جن کو خود میرے سوالات کے سمجھنے اور پھر بیان کرنے اور ان کا جوابِ شافی دینے میں دقتیں اور مشکلیں واقع ہوتی تھیں۔

مسٹر تھیوی نٹ صاحب کے پانچ سوال اور ان کے جواب

اس موقع پر میرا ارادہ تھا کہ اپنے اس خط کو جسے ایک کتاب کہنا چاہئے ختم

کر دوں اور دہلی میں واپس پہنچنے تک آپ سے بالکل رخصت ہو لوں لیکن میرا شوقِ تحریر ابھی خاموشی کی اجازت نہیں دیتا اور کچھ فرصت بھی ہے اس لئے میں مسٹر تھیوی نٹ صاحب کے پانچ سوالوں کا جواب لکھنا چاہتا ہوں کیونکہ صاحب موصوف نہایت ہی محقق اور جانکاہی کرنے والے شخص ہیں اور بہ نسبت ان لوگوں کے جو ملکوں ملکوں سیر کرتے پھرتے ہیں کتابوں کے مطالعہ ہی سے بڑے بڑے نئے انکشافات اور اہم معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔

پہلا سوال، یہودیوں کے کشمیر میں ہونے کی بابت

ان کا پہلا سوال یہ ہے کہ آیا یہ سچ ہے کہ یہودی ایک بہت لمبے عرصہ سے کشمیر میں بودوباش رکھتے ہیں اور آیا ان کے پاس کتابِ مقدس موجود ہے یا نہیں اور اگر ہے تو ان کی اور ہماری کتاب عہدِ عتیق میں کچھ اختلاف ہے یا نہیں۔

دوسرا سوال، ہندوستان کے موسمِ برسات کی بابت

دوسرا یہ کہ جو جو تجربے ہندوستان کے موسمِ برسات کی نسبت مجھے حاصل ہوئے ہیں، میں ان کی خدمت میں لکھ بھیجوں۔

تیسرا سوال، مشرقی سمندروں کی موسمی ہوا اور پانی کے بہاؤ کے باب میں

تیسرا یہ کہ مشرقی سمندروں میں جو ایک خاص طور کے انضباط اور نظامِ معینہ کے موافق ہواؤں کا اہتزاز اور پانی کی دھاروں کا بہاؤ رہتا ہے، ان کی نسبت میں اپنی رائے اور خیالات ظاہر کروں۔

چوتھا سوال، ملک بنگالہ کی زرخیزی اور دولتمندی اور خوشنمائی کے باب میں

چوتھا یہ کہ کیا ملک بنگالہ واقع میں ایسا ہی زرخیز اور دولتمند اور خوشنما ہے جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے۔

پانچواں سوال، دریائے نیل کی طغیانی کی بابت

پانچواں یہ کہ دریائے نیل کی طغیانی اور چڑھاؤ کے اسباب کی نسبت زمانہ قدیم سے جو ردّ و قدح چلی آتی ہے، میں اس کی نسبت ایک قطعی رائے پیش کروں۔

پہلے سوال کا جواب

اگر میں یہودیوں کو اس پہاڑی ملک میں دیکھ پاتا تو مجھ کو ویسی ہی خوشی ہوتی جیسی کہ تھی وی نٹ صاحب کو۔ میری مراد ان یہودیوں سے ہے جن کے پائے جانے کی صاحب موصوف خواہش رکھتے ہیں۔ یعنی وہ یہودی جو ان قبائل کی اولاد سے ہوں جن کو شال مینے سر (۲۲۲) نے جلاوطن کیا تھا۔ لیکن صاحب موصوف کو آپ یقین دلایئے کہ گو ظنِ غالب بعض وجوہ سے پایا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ پہلے اس ملک میں آباد تھے لیکن اب تو یہاں کے کل باشندے ہندو ہیں یا مسلمان' البتہ چین میں غالباً اس قوم کے لوگ موجود ہیں۔ کیونکہ میں نے اپنے پادری صاحب مقتدائے فرقہ جیسویٹ کے پاس، جو دہلی میں رہتے ہیں، اس فرقہ کے ایک پادری صاحب باشندۂ جرمنی مقیم شہر بیجنگ دارالسلنت چین کے خطوط دیکھے ہیں جن میں وہ لکھتے ہیں کہ "میری اس شہر یعنی بیجنگ میں یہودیوں سے گفتگو ہوئی ہے جو مذہب موسوی کے پابند ہیں اور توریت وغیرہ کتب عہدِ عتیق ان کے پاس موجود ہیں۔ ان کو حضرت عیسیٰ کی وفات کا حال مطلق معلوم نہیں اور انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ فرقہ جیسویٹ کے پادری صاحب کو ہم اپنا کاکان (۲۲۳) مقرر کر لیں گے بشر طیکہ پادری صاحب سور کے گوشت کے کھانے سے پرہیز کریں"۔ بہرحال کشمیر میں یہودیت کی بہت سی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ پیر پنجال سے گزر کر جب میں اس ملک میں داخل ہوا تو دیہات کے باشندوں کی صورتیں یہودیوں کی سی دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ ان کی صورتیں اور ان کے طور و طریق اور وہ ناقابلِ بیان خصوصیتیں جن سے ایک سیاح مختلف اقوام کے لوگوں کی خود بخود شناخت اور تمیز کر سکتا ہے، سب یہودیوں کی پرانی قوم کی سی معلوم ہوتی تھیں۔ میری بات کو آپ محض خیالی ہی تصور نہ فرمایئے گا۔ ان دیہاتیوں کے یہودی نما ہونے کی نسبت ہمارے پادری صاحب اور اور بہت سے یورپینوں نے بھی میرے کشمیر جانے سے بہت عرصہ پہلے ایسا ہی لکھا ہے (۲۲۴)

دوسری علامت یہ ہے کہ اس شہر کے باشندے باوجودیکہ تمام مسلمان ہیں مگر پھر بھی ان میں سے اکثر کا نام موسیٰ ہے۔

تیسرے یہاں یہ عام روایت ہے کہ حضرت سلیمان اس ملک میں آئے تھے اور بارہ مولا کے پہاڑ کو کاٹ کر انہی نے پانی کا راستہ کھول دیا تھا۔

چوتھے یہاں لوگوں کو یہ بھی گمان ہے کہ حضرت موسیٰ نے شہر کشمیر ہی میں وفات پائی تھی اور ان کا مزار شہر سے قریب تین میل کے ہے۔

پانچویں یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ یہاں عموماً سب لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ایک اونچے پہاڑ پر جو ایک مختصر اور نہایت ہی پرانا مکان نظر آتا ہے، اس کو حضرت سلیمان نے تعمیر کرایا تھا اور اسی سبب سے اس کو آج تک تختِ سلیمان کہتے ہیں۔(۲۲۵)

مشفق من او جوہِ مذکورہ کے باعث سے آپ دیکھو گے کہ میں اس بات سے انکار کرنا نہیں چاہتا کہ یہودی لوگ کشمیر میں آ کر نہ بسے ہوں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ پہلے تو ان کے مذہبی مسائل زمانہ پا کر بگڑ گئے ہوں گے اور آخر کار رفتہ رفتہ تنزل کرتے کرتے بت پرست بن گئے ہوں گے اور بعد ازاں مثل اور بہت سے بت پرستوں کے، مذہب اسلام اختیار کرنے کی طرف مائل ہو گئے ہوں گے۔ اور یہ بات تو تحقیق ہے کہ بہت سے یہودی ایران میں مقامات لار اور اصفہان آباد ہیں اور ہندوستان میں بھی جزیرہ گوا اور کوچین (۲۲۶) کے بعض مقامات میں بستے ہیں اور میں سنتا ہوں کہ ایتھوپیا (۲۲۷) میں تو یہودی بہت ہی زیادہ آباد ہیں جو اپنی شجاعت اور جنگی لیاقتوں کی وجہ سے مشہور ہیں اور اگر میں ان دو سفیروں کی بات کا یقین کروں جو حال ہی میں شاہ ایتھوپیا کی طرف سے اورنگ زیب کے دربار میں آئے ہوئے تھے تو پندرہ سولہ برس ہوئے وہاں ایک یہودی ایسا زبردست ہو گیا تھا کہ اس نے ایک دشوار گزار چھوٹے سے کوہستانی ضلع میں خود مختار ریاست قائم کر لینے کی کوشش کی تھی۔

دوسرے سوال کا جواب

ہندوستان میں سال بھر خصوصاً آٹھ مہینے تک گرمی اس سختی اور شدت سے پڑتی ہے کہ زمین جل کر بالکل ناقابلِ زراعت اور غیر آباد ہو جاتی ہے۔ مگر خداوند تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس کی اصلاح کے واسطے یہ معقول انتظام کر دیا ہے کہ جولائی میں جب گرمی نہایت ہی شدت سے پڑتی ہے تو مینہ برسنا شروع ہو جاتا ہے اور متواتر تین مہینے تک برستا رہتا ہے اور اس طرح پر ہوا میں اس قدر اعتدال آ جاتا ہے کہ برداشت کے لائق ہو جاتی ہے اور زمین بھی ناقابلِ زراعت نہیں رہتی۔ مگر یہ بارشیں ایسی باقاعدہ نہیں ہوتیں کہ ضرور اسی دن یا اسی ہفتہ میں ہوں چنانچہ مختلف مقامات خصوصاً دہلی میں جہاں میں دیر تک رہا

ہوں، میں نے دیکھا ہے کہ ایک سال کی بارش دوسرے سال سے کبھی مطابق اور یکساں حالت پر نہیں ہوتی۔ چنانچہ بعض اوقات بارشیں دو دو تین تین ہفتے آگے پیچھے شروع اور ختم ہوتی ہیں اور کسی سال میں پہلے سال کی نسبت زیادہ ہوتی ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ یہ بھی دیکھا ہے کہ دو برس کامل ایسا امساک رہا کہ ایک بوند بھی نہیں پڑی اور اس غیر معمولی خشک سالی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدھر دیکھئے بیماری اور قحط کی مصیبت نظر آ رہی تھی۔ اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس ملک کے مختلف حصوں میں برسات اسی قدر آگے یا پیچھے اور کمی یا زیادتی سے ہوتی ہے جس قدر کہ وہ ایک دوسرے سے قریب یا بعید ہیں۔ مثلاً بنگالہ میں اور ساحل کارومنڈل سے لے کر جزیرۂ سراندیپ تک ساحلِ مالابار کی نسبت برسات ایک مہینہ پہلے شروع اور ختم ہو جاتی ہے اور بنگالہ میں چار مہینے تک شدت سے بارش رہتی ہے اور اس عرصہ میں کبھی کبھی بڑے زور سے آٹھ آٹھ روز کی جھڑی لگی رہتی ہے اور تھوڑی دیر کے لئے بھی بارش بند نہیں ہوتی۔ مگر دہلی اور آگرہ میں نہ تو اس قدر بارش ہی ہوتی ہے اور نہ اس قدر مدت تک رہتی ہے اور اکثر یہ حال ہوتا ہے کہ دو تین روز یونہی خالی گزر جاتے ہیں یا یہ کہ صبح کو دن نکلنے کے بعد کوئی نو دس بجے تک اکثر خفیف سی بارش ہوا کرتی ہے اور بعض اوقات تو بالکل ہی نہیں ہوتی۔ میں خصوصاً اس بات کو دیکھ کر بہت متعجب ہوا کہ مختلف ممالک میں مختلف اطراف سے مینہ آتا ہے۔ مثلاً دہلی اور اس کے نواح میں مشرق یعنی بنگالہ کی طرف سے بارش آتی ہے۔ اور بنگالہ اور ساحل کارومنڈل پر جنوب کی جانب سے اور ساحلِ مالابار پر قریباً ہمیشہ مغرب کی طرف سے۔ میں نے ایک اور بات بھی دیکھی جس کی نسبت تمام ہندوستان میں بلا اختلاف ایک ہی رائے ہے یعنی یہ کہ جس قدر گرمی کی تپش پہلے یا پیچھے شروع ہوتی ہے اور کم یا زیادہ سختی سے گرمی پڑتی ہے اور تھوڑے دنوں یا دیر تک قائم رہتی ہے، اسی قدر برسات بھی پہلے یا پیچھے شروع ہوتی اور اسی نسبت سے کم یا زیادہ اور تھوڑے یا بہت عرصہ تک جاری رہتی ہے اور بلحاظ ان امور کے مجھے یقین ہے کہ زمین کی گرمی اور اس کے سبب سے ہوا میں جو خفت آجاتی ہے، وہی ہندوستان میں بارش کا سبب ہے اور یہی دونوں چیزیں بارش کو اس ملک میں کھینچ لاتی ہیں۔ یعنی آس پاس کے سمندروں کی ہوا چونکہ سرد اور بھاری اور کثیف ہوتی ہے، ان بخارات کو اپنے میں جذب کر کے پُر ہو جاتی ہے جو گرمی کی شدت سے پانی میں سے اٹھتے ہیں اور قرب وجوار کی ہوائیں جب اس کو دھکیلتی اور حرکت میں لاتی ہیں تو بادلوں کی صورت میں ہو کر اپنے تئیں طبعاً

اس زمین پر جہاں کی ہوا اس کی نسبت زیادہ گرم اور لطیف اور کم وزن اور کم مزاحم ہوتی ہے، ان بخارات سے خالی کردیتی ہے اور اس کا اپنے کو ان بخارات سے خالی کرنا اسی قدر کم یا زیادہ قلت و کثرت سے ہوتا ہے جس قدر کہ گرمی پہلے یا پیچھے شروع ہوتی اور کم یا زیادہ سختی سے پڑتی ہے۔ اس تقریر میں جو وجوہ بیان کئے گئے ہیں ان میں اس بات کا خیال کرنا بھی مناسب ہے کہ ساحل مالابار کی نسبت ساحل کارومنڈل پر برسات پہلے شروع ہونے کی یہی وجہ ہے کہ گرمی پہلے پڑنے لگتی ہے اور اس کے خاص باعث ہوں گے جن کا تحقیق کرنا غالباً اس ملک کے دیکھنے کی حالت میں شاید مشکل نہ ہوگا اور آپ جانتے ہیں کہ زمین کے مختلف حصوں میں بلحاظ سمندروں یا پہاڑوں کے اور یہ بہ مناسبت ان کے ریگستانی یا پہاڑی درختوں اور جنگل سے پُر ہونے کے گرمی جلدی یا دیر سے شروع ہوتی اور کم وبیش سختی سے پڑتی ہے اور یہ بات بھی کچھ تعجب کی نہیں ہے کہ بارش مختلف اطراف سے آتی ہے۔ مثلاً ساحل کارومنڈل پر جنوب کی طرف سے اور ساحل مالابار پر مغرب کی جانب سے، کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ جو سمندر پاس ہوگا اسی سے مینہ آئے گا۔ چنانچہ ساحل کارومنڈل کے پاس جو سمندر ہے وہ اس سے جنوب کی طرف ہے اور وہ سمندر جو ساحل مالابار کو سیراب کرتا ہے مغرب کی طرف باب المندب اور عرب اور خلیج فارس کی سمت کو پھیلا ہوا ہے۔ میں نے خوب غور کیا کہ اگرچہ بظاہر دہلی میں بادل مشرق کی طرف سے آتے ہیں مگر ان کی اصل انہی سمندروں سے ہوگی جو جنوب کی طرف ہیں اور ایسی زمینوں یا پہاڑوں کے حائل ہونے کی وجہ سے جن کی ہوا زیادہ سرد اور کثیر اور زیادہ مزاحم ہے اپنا راستہ بدل لیتے ہیں اور ایسے ملک میں جا برستے ہیں جہاں کی ہوا زیادہ ہلکی اور کم مزاحم ہو۔ میں ایک اور بات بیان کرنی بھول گیا جس کا مجھ کو دہلی میں تجربہ ہوا۔ یعنی یہ کہ کبھی اچھی بارش نہیں ہوتی تاوقتیکہ ی دن تک بہت سے بادل مغرب کی طرف نہ جالیں۔ گویا یہ بات ضروری ہے کہ دہلی کے پچھم میں ہوا کا طبقہ اوّل بادلوں سے بھر جائے اور پھر ان بادلوں کو کوئی چیز مثلاً کوئی ایسی ہوا جو کم گرم اور کم لطیف اور زیادہ بھاری اور قابلِ مزاحمت ہو روکے یا اور بادل اور مخالف ہوائیں مقابل ہو کر ان کو ایسا کثیف اور وزنی کردیں کہ پھوٹ کر برسنے لگیں، جس طرح پر کسی پہاڑ کی ہوا بادلوں کو جب پیچھے ہٹا دیتی ہے تو وہ برسنے لگتے ہیں۔

تیسرے سوال کا جواب

جب شروع اکتوبر میں عموماً بارش کا موسم ختم ہوجاتا ہے تو سمندر جنوب کی

طرف بہنا شروع ہوتا ہے اور ٹھنڈی شمالی ہوا چلنے لگتی ہے، جو چار پانچ مہینے تک برابر ایک ہی حالت پر بلا طوفان وغیرہ ایک ہی طرف کو چلتی رہتی ہے۔ البتہ اس عرصہ میں کبھی ایک آدھ روز اپنا رخ بدلتی یا ٹھہر جاتی ہے اور اس کے بعد کوئی دو مہینے تک بے قاعدہ ہوائیں چلتی ہیں، جس کو ہم لوگ وسطی موسم اور ڈچ لوگ غیر معین اور مختلف ہواؤں کا زمانہ کہتے ہیں اور جب یہ دو مہینے ختم ہو جاتے ہیں تو سمندر پھر اپنا رخ جنوب سے شمال کو کر لیتا ہے اور جنوبی ہوا چلنی شروع ہوتی ہے۔ اور چار پانچ مہینے تک اسی طرف سے چلتی رہتی ہے اور سمندر کا بہاؤ بھی اس تمام عرصہ میں بدستور شمال ہی کو رہتا ہے اور اس کے بعد پھر دو مہینے تک وہی وسطی موسم رہتا ہے اور ان وسطی موسموں میں جہاز رانی کرنا نہایت مشکل اور خطرناک ہوتا ہے۔ لیکن ان دونوں معمولی موسموں میں بجز جنوبی ہوا کے موسم کے اخیر حصہ کے جہاز رانی کرنا بہت آسان اور خوش آئند اور بلا اندیشہ ہوتا ہے۔ پس آپ کو اس بات سے متعجب ہونا نہیں چاہئے کہ ہندوستانی جو بہت ڈرپوک اور فن جہاز رانی سے محض ناآشنا ہیں، خاصے لمبے اور مفید بحری سفر اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً بنگالہ سے تناسرم (دھناسری) آچین' ملاکا' سیام اور میڈی گاسکر کو یا مچھلی پٹن' سراندیپ' جزائر مالدیپ' بندر مخا اور بندر عباس کو اپنے جہاز لے جاتے ہیں۔ اور بڑی احتیاط کے ساتھ جانے اور آنے کے موسم کی عمدگی کا لحاظ رکھتے ہیں۔ مگر اس پر بھی ایسا ہوتا ہے کہ مناسب وقت سے زیادہ کہیں اٹکے رہنے کی حالت میں باد مخالف سے مغلوب ہو کر تباہ ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہ صورت بعض وقت یورپیوں کو بھی پیش آجاتی ہے جو بہت دل چلے اور زیادہ تجربہ کار اور واقف ہیں اور جن کے جہازوں کی حالت اور ساز و سامان بہت بڑھ کر ہیں۔ دونوں وسطی موسموں میں سے وہ موسم جو جنوبی ہوا کے بعد آتا ہے، چونکہ اس میں طوفان اور ناگہانی جھوکے اکثر آتے ہیں، ایسا خطرناک ہے کہ اور کوئی موسم ایسا نہیں ہے اور یہ جنوبی ہوا اپنے عین موسم میں بھی شمالی ہوا کی نسبت زیادہ تند اور غیر مساوی ہوتی ہے۔ مجھے اس موقع پر یہ بات بھی بیان کر دینی چاہئے کہ جنوبی ہوا کہ موسم کے خاتمے اور برسات کے موسم میں گو سمندر میں کامل سکون کی حالت ہو مگر کناروں پر پچاس ساٹھ میل کے فاصلہ تک ہوا نہایت طوفانی ہوتی ہے۔ پس یورپی اور غیر یورپی جہازوں کے کپتانوں اور ناخداؤں کو اس امر کی بڑی احتیاط رکھنی چاہئے کہ ہندوستان کے کسی بندر مثلاً سورت یا مچھلی پٹن پر ٹھیک برسات کے ختم ہوتے ہی نہ

جا نکلیں ورنہ ان کے جہازوں کو زمین سے ٹکرائے جانے کے مخاطرہ میں پڑنا ہوگا۔ پس میں اپنے مختصر اور جزوی تجربہ کی رُو سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں موسموں کی ترتیب اس طرح پر ہے۔

شمالی اور جنوبی ہواؤں کے پیدا ہونے کے اسباب کا بیان

کاش مجھ کو ہر ایک نتیجے کے اصلی باعث کے معلوم کر لینے کی قدرت ہوتی۔ مگر پروردگار عالم کے تمام بھیدوں کا دریافت کر لینا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ لیکن اس مسئلہ میں اپنے غور و فکر سے جو رائے میں نے قائم کی ہے، اس کی بنیاد چند خیالات پر ہے۔ چنانچہ خیال اوّل تو یہ ہے کہ جو ہوا ہمارے کرہ کو گھیرے ہوئے ہے سمندر اور دریاؤں کے پانی کی طرح اس کو بھی ہمارے کرہ کا ایک جزو سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ دونوں چیزیں اس کی طرف جھکتی اور ایک ہی مرکز کی طرف میل کرتی ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ چیزیں ہمارے کرہ سے علیحدہ نہیں ہیں اور پھر اس سے یہ مطلب حاصل ہوتا ہے کہ یہ کرہ ہوا پانی اور مٹی، تین چیزوں سے بنا ہوا ہے۔ اس کے بعد دوسرا خیال یہ ہے کہ ہمارا یہ کرہ ایک ایسے خلا میں لٹکا ہوا اور تلا ہوا ہے کہ جس میں خالق نے اپنی مرضی سے اس کو ایسے طور سے رکھ دیا ہے کہ اگر یہ کسی اور نامعلوم جسم سے ٹکرا جائے تو اپنی جگہ سے بآسانی سرک سکتا ہے۔ پھر تیسرا خیال اس طرح پر ہے کہ جب آفتاب خطِ استوا سے گزر کر کسی قطب مثلاً قطب شمالی کی طرف حرکت کرتا اور اپنی شعاعیں اس طرف ڈالتا ہے تو قطب شمالی کو کسی قدر دبانے کے لئے کافی اثر پیدا کرتا ہے اور قطب شمالی اسی قدر دبتا جاتا ہے جس قدر کہ سورج اس کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ اسی طرح جس قدر کہ سورج خطِ استوا کی طرف واپس آتا ہے، اسی قدر قطب شمالی بتدریج ابھرنے لگتا ہے، یہاں تک کہ آفتاب کی کرنوں کی طاقت سے وہی اثر قطب جنوبی کی طرف پیدا ہو جاتا ہے۔ اب اگر ان خیالات کو صحیح فرض کر لیا جائے اور اس کے ساتھ زمین کی روزانہ حرکت پر غور کیا جائے تو ہندوستانیوں کا یہ قول بے وجہ نہیں ہے کہ سورج اپنے ساتھ سمندر اور ہوا کو کھینچتا اور چلاتا ہے کیونکہ اگر یہ بات سچ ہے کہ آفتاب خطِ استوا سے گزر کر کسی قطب کی طرف جاتے ہوئے زمین کے محور کی تبدیل حرکت اور اس قطب کے نیچے کو دب جانے کا باعث ہوتا ہے تو اس کا یہ لازمی نتیجہ ہونا چاہئے کہ دوسرا قطب اونچا ہو جائے اور سمندر اور ہوا جو دو سیال اور وزن دار جسم ہیں

نچان کی طرف بہنے لگیں۔ پس میرے نزدیک اس بات کا کہنا درست ہے کہ سورج کسی قطب کی طرف جاکر اس طرف کو سمندر اور ہوا کے بڑے اور باقاعدہ بہاؤ کا باعث ہوتا ہے اور ہوا کے اس بہاؤ سے موسمی ہوا پیدا ہوتی ہے۔ یعنی سورج کے کسی قطب کی طرف جانے اور واپس آنے کے وقت سمندر اور ہوا میں دو مختلف رفتاریں پیدا ہوتی ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس قیاس کی بنا پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ قطب شمالی اور جنوبی سے سمندر کے دو بڑے بالعکس بہاؤ ہیں اور اگر ایک قطب سے دوسرے قطب تک ایک ایسا سمندر ہوتا جو یورپ میں ہو کر گزرتا تو ہم وہاں بھی ہر حالت میں سمندر کی ایسی ہی دو باقاعدہ رفتاریں پاتے جیسے کہ ہندوستان میں ہیں اور اس قاعدہ کے عام نہ ہونے کی یہ وجہ ہے کہ قطعاتِ زمین کے حائل ہو جانے کے سبب سے سمندر کا بہاؤ رک کر دوسری جانب کو ہو جاتا ہے جیسے کہ بعض لوگوں کا قول ہے کہ معمولی جذرومد ان سمندروں میں، جو خیرہ شام کی طرح مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے ہیں، رک جاتا ہے اور اس خیال کے اعتبار سے میری رائے میں یہ بات بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہوا کی بھی دو بڑی اور بالعکس رفتاریں ہیں اور اگر زمین پورے اور عام طور پر صاف اور برابر اور ایک ہی سی ہوتی تو مذکورہ بالا خیال کے موافق شمالی اور جنوبی ہواؤں کی رفتاریں بھی عموماً اسی قاعدہ پر ہوا کرتیں۔

چوتھے سوال کا جواب

ہر زمانے میں ملک مصر کو دنیا میں سب سے عمدہ اور زرخیز بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ حال کے مؤرخ بھی یہی کہتے ہیں کہ کسی اور ملک میں ایسی خصوصیت کے ساتھ قدرتی سامان موجود نہیں ہیں۔

مصنف کا بنگالہ کو مصر پر ترجیح دینا

لیکن بنگالے میں دو مرتبہ جانے سے جو واقفیت مجھ کو اس ملک کی نسبت حاصل ہوئی ہے، اس سے مجھ کو یقین ہے کہ جو فضیلت ملک مصر سے منسوب کی گئی وہ زیادہ تر بنگالہ کا حق ہے۔

بنگالہ کے چاول اور اس کے نکاس کا بیان

بنگالے میں چاول اس کثرت سے پیدا ہوتا ہے کہ نہ صرف آس پاس کے بلکہ

دور دور کے ملکوں کو جاتا ہے۔ چنانچہ گنگا کے راستہ پٹنہ کو اور سمندر کی راہ سے مچھلی پٹن وغیرہ بنادر ساحل کارومنڈل اور خصوصاً جزیرہ سراندیپ اور جزائر مالدیپ کو بھیجا جاتا ہے۔

بنگالہ کی کھانڈ اور اس کے نکاس کا ذِکر

اسی طرح کھانڈ وغیرہ بھی کثرت سے ہوتی ہے جو گول کنڈا اور تمام کرناٹک کو جہاں یہ بہت کم پیدا ہوتی ہے اور مخا اور بصرہ کو ہو کر عرب اور عراق کو اور بندر عباس کے راستہ سے ایران کو جاتی ہے۔

بنگالہ میں جو مربے بنائے جاتے ہیں، ان کا ذِکر

بنگالے کے مربے بھی مشہور ہیں۔ خصوصاً ان مقامات کے جہاں پرتگیز لوگ آباد ہیں اور جو نہایت عمدہ مربے بناتے ہیں اور ایک بڑی تجارت کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ میووں میں سے ویسے ہی بڑے بڑے چکوتروں کا جیسے کہ یورپ میں ہوتے ہیں اور ایک خاص قسم کی روئیدگی کی جڑ کا جو عشبہ کی جڑ کی مانند ہوتی ہے اور آم کا اور اناس کا جو ہندوستان کے دو عام میوے ہیں اور آملہ اور شمبو اور ادرک کا مربہ بناتے ہیں۔

مصر کی نسبت بنگالہ میں گیہوں کے کم پیدا ہونے کا ذِکر

یہ سچ ہے کہ بنگالے میں مصر کے برابر گیہوں پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ یہاں کے باشندوں کا قصور ہے جو مصر والوں کی نسبت چاولوں پر زیادہ گزران کرتے ہیں اور روٹی کبھی ہی کھاتے ہیں مگر پھر بھی ملک کی ضرورت کے لحاظ سے گیہوں کچھ کم نہیں بویا جاتا۔ چنانچہ یورپی اہلِ جہاز مثلاً ڈچ انگریز اور پرتگیز وغیرہ سستے داموں گیہوں خریدتے اور سمندر کے سفر کے واسطے بسکٹ بناتے ہیں۔

ترکاری' اناج اور کھانے کے جانوروں کے بنگالہ میں کثرت سے ہونے کا ذِکر

اس ملک کے لوگوں کی غذا زیادہ تر تین چار قسم کی ترکاری اور چاول اور گھی ہے جو بہت ہی تھوڑی سی قیمت سے حاصل ہو سکتی ہے اور ایک روپیہ میں بیس سے زیادہ عمدہ مرغ مل سکتے ہیں اور بطخیں اور مرغابیاں بھی اسی قدر ارزاں ہیں۔ بھیڑ بکریوں کی بھی افراط ہے اور سور تو اتنے سستے ہیں کہ جو پرتگیز یہاں آباد ہیں وہ قریباً تمام سور ہی کا گوشت کھاتے ہیں اور

سستا جان کر انگریز اور ڈچ بھی اپنے جہازوں کے واسطے نمک لگا کر رکھ لیتے ہیں اور ہر قسم کی تازہ اور نمک سود مچھلی بھی اسی افراط سے ملتی ہے۔

ارزانی کی وجہ سے اہل یورپ کے بنگالہ میں آبسنے کا ذکر

غرض کہ بنگالے میں معیشت کی ہر ایک چیز افراط سے ہے اور اس افراط ہی کی طفیل ہے کہ بہت سے پرتگیز اور دوغلے یورپین اور اور عیسائیوں نے جن کو ڈچ لوگوں نے ان کی مختلف نوآبادیوں میں سے نکال دیا ہے، اس زرخیز ملک میں آکر پناہ لی ہے۔ چنانچہ فرقہ جیسوئٹ اور اگسٹین کے لوگوں نے، جن کی بڑی بڑی مذہبی جماعتیں ہیں اور جو اپنے اعمال مذہبی کو آزادانہ اور بلا دقت عمل میں لا سکتے ہیں، مجھے اس بات کا یقین دلایا کہ صرف ہوگلی میں آٹھ ہزار سے نو ہزار تک عیسائی بستے ہیں اور اس ملک کے اور حصوں میں تو ان کی تعداد پچیس ہزار سے بھی زیادہ ہے اور اس ملک کی زرخیزی اور عورتوں کے حسن اور سلیم الطبعی نے پرتگیز، ڈچ اور انگریز لوگوں میں یہ بات زبان زد کر دی ہے کہ "بنگالے میں داخل ہونے کے واسطے تو سو دروازے ہیں مگر نکلنے کے لئے ایک بھی نہیں"۔

بنگالہ میں روئی، ریشم اور سوتی اور ریشمی کپڑوں کی کثرت اور تجارت وغیرہ کا ذکر

بلحاظ ایسی عمدہ عمدہ لائق تجارت چیزوں کے، جن کے باعث سے غیر ملکوں کے سوداگر کسی ملک کی طرف متوجہ ہوا کرتے ہیں، میرے خیال میں بنگالے کے برابر کوئی ملک نہیں ہے اور علاوہ اس قند و شکر کے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اور جس کو قیمتی لائق تجارت اجناس کی فہرست میں درج کرنا چاہئے، اس ملک میں روئی اور ریشم بھی اس قدر ہوتا ہے کہ اس ملک کو نہ صرف ہندوستان بلکہ آس پاس کے ملکوں اور نیز یورپ کا گودام گھر کہنا زیبا ہے۔ میں بعض اوقات روئی کے ہر قسم کے باریک اور موٹے اور سفید اور رنگ دار کپڑوں کی افراط کو دیکھ کر حیران ہوتا تھا جن کو خصوصیت کے ساتھ ڈچ لوگ مختلف مقامات خصوصاً جاپان اور یورپ کو بھیجتے ہیں اور انگریز اور پرتگیز اور خاص یہاں کے سوداگر بھی ان چیزوں کی بہت سی تجارت کرتے ہیں اور یہی کیفیت ریشم اور ہر قسم کے ریشمی کپڑوں کی ہے۔ جس قدر روئی کا کپڑا تمام سلطنت مغلیہ میں لاہور اور کابل تک بلکہ عموماً تمام غیر ملکوں کو یہاں سے جاتا ہے اس کی مقدار معلوم کرنا ناممکن ہے۔

مصنف کا ایران اور شام کے ریشم کو بنگالہ کے ریشم پر ترجیح دینا

حقیقت میں یہاں کا ریشم ایسا عمدہ نہیں ہوتا جیسے کہ ایران' شام' صیدا اور بیروت (۲۲۸) کا۔ لیکن یہ سستا بہت ہے اور میں قطعی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر عمدہ چھانٹ لیا جائے اور احتیاط سے صاف کیا جائے تو اس سے نہایت ہی عمدہ کپڑا بن سکتا ہے۔

بنگالہ میں ریشم کے کارخانوں کا ہونا

ڈچ لوگوں کے قاسم بازار کے ریشم کے کارخانہ میں بعض اوقات سات آٹھ سو آدمی کام کرتے ہیں اور اسی قدر انگریزوں اور سوداگروں کے کارخانوں میں۔

بنگالہ کے شورہ کا ذکر

بنگالہ شورے کی بھی بڑی منڈی ہے اور گنگا کے راستہ سے بہت سا شورہ پٹنہ سے دساور کو جاتا ہے اور ڈچ اور انگریز شورے کی بہت سی کھیپیں ہندوستان کے مختلف مقامات اور یورپ کو بھیجتے ہیں۔

بنگالہ کے گوند' افیون' موم وغیرہ دواؤں اور گھی کا ذکر

اس زرخیز ملک سے گوند' افیون' موم مشک بلائی' مگھ پیپل اور بہت سی دوائیں حاصل ہوتی ہیں اور گھی جو آپ کو ایک ناچیز جنس معلوم ہو گی یہاں اس افراط سے ہوتا ہے کہ اگرچہ غیر ملکوں کو بھیجے جانے کے واسطے ایک بڑی جسامت کی چیز ہے مگر پھر بھی سمندر کی راہ سے بے شمار باہر کو جاتا ہے۔

اہل یورپ کو بنگالہ کی آب و ہوا کے موافق نہ آنے اور اس سے بچنے کی تدبیروں کا ذکر

لیکن یہ بات واجبی ہے کہ یہاں کی ہوا خصوصاً سمندر کے پاس کی اجنبی لوگوں کو شاذ ہی موافق ہوتی ہے۔ چنانچہ ڈچ اور انگریز لوگوں میں، جبکہ پہلے پہل یہاں آکر رہے، موت کثرت سے ہوئی اور بندرگاہ بلاسور میں میں نے دو خوبصورت انگریزی جہازوں کو، جو ڈچ لوگوں کے ساتھ لڑائی ہونے کی وجہ سے یہاں سال بھر تک ٹھہرے رہے تھے، دیکھا کہ بہت سے ملاحوں کے مر جانے کی وجہ سے اس قابل نہ تھے کہ کہیں کو جا سکیں۔ لیکن اب

یہ دونوں قومیں بہت احتیاط سے رہتی ہیں اور موت کم ہو گئی ہے۔ جہازوں کے مالک اس بات کی احتیاط رکھتے ہیں کہ ان کے آدمی شراب کو پنچ (۲۲۹) بنا کر نہ پئیں (جو قندی شراب اور لیمو کے عرق اور پانی اور جائیفل کو ملا کر بناتے تھے اور جس کا ذائقہ گو بہت اچھا تھا مگر نتیجے مہلک تھے) اور ہندوستانی عورتوں کے نزدیک نہ جائیں اور شراب اور تمباکو بیچنے والوں سے نہ ملیں۔ لیکن عمدہ قسم کی انگوری شراب اور شیرازی خام شرابیں، ان کو اگر اعتدال کے ساتھ استعمال کیا جائے، تو مخالف آب و ہوا کے اثر سے بچنے کے لئے بہت مفید ثابت ہوتی ہیں۔

بنگالہ میں راج محل سے لے کر گنگا کے کنارے سمندر تک جو ملک ہے اس کی خوشنمائی اور ریشم کے کیڑوں کی غذا کے لئے توت کے درختوں کی کثرت کا ذکر

اس ملک کی خوشنمائی کو بیان کرتے ہوئے اس بات کو بھی ظاہر کر دینا چاہئے کہ اس ملک میں جو دریائے گنگا کے دونوں طرف راج محل سے سمندر تک قریب تین سو میل کے ہے، بے شمار نہریں ہیں جو دریائے گنگا سے بڑی محنت کے ساتھ اس لئے کاٹی گئی ہیں کہ تجارتی مال کے لے جانے میں آسانی ہو اور گنگا کا پانی، جس کو ہندستانی تمام پانیوں سے اعلیٰ گنتے ہیں، مختلف مقامات میں پہنچ سکے۔ نہروں کے دونوں طرف قصبے اور گاؤں آباد ہیں جن میں ہندوؤں کی بہت گنجان آبادی ہے اور چاول اور ایکھ اور غلہ اور بہت قسم کے ساگ پات اور سرسوں اور تل کے بڑے بڑے کھیت موجود ہیں اور ریشم کے کیڑوں کی غذا کے واسطے کوئی دو تین فرانسیسی فٹ کے برابر چھوٹے چھوٹے شہتوت کے درخت ہیں۔

گنگا کے بے شمار ٹاپوؤں اور ان کی خوبصورتی وغیرہ کا ذکر

لیکن بنگالے کو ان بے شمار قطعوں نے جو بطور ٹاپوؤں کے دریا گنگا میں ہیں اور جن کی وسعت بعض جگہ چھ سات منزل کی مسافت کی ہے، عجیب خوبصورت بنا رکھا ہے۔ ان ٹاپوؤں کی وسعت کم و بیش ہے لیکن سب نہایت زرخیز اور جنگلوں سے بھرے ہوئے اور میوہ دار درختوں اور اناناس سے پُر اور سبزے سے بالکل ڈھکے ہوئے ہیں۔ ہزاروں نہریں اتنی دور تک کہ جہاں نظر کام نہیں کرتی، ان میں جاری ہیں اور ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ گویا لمبی لمبی

روشیں درختوں کی محرابوں کے نیچے بنی ہوئی ہیں۔

بنگالہ کے سمندر کے قریب کے غیر آباد جزیروں کا ذِکر

سمندر کے پاس کے بہت سے جزیروں کو، جن پر آراکان کے قزاق لوٹ مار کرتے رہتے تھے اور جن کا ذکر اور کسی مقام پر کیا گیا ہے، وہاں کے باشندوں نے چھوڑ دیا ہے اور اب وہ بالکل اجاڑ پڑے ہیں جہاں بجز ہرنوں اور جنگلی سوروں اور پرندوں اور شیروں کے جو بعض اوقات ایک جزیرے سے پیر کر دوسرے جزیرے میں چلے جاتے ہیں اور کوئی جاندار مخلوق نظر نہیں آتی۔ چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر دریائے گنگا کو عبور کرتے ہوئے (جو ان جزیروں میں جانے کا معمولی طریقہ ہے) اکثر مقامات میں خشکی پر اتر پڑنا پُر خطر ہے اور اس بات کی احتیاط رکھنی چاہئے کہ رات کو جو کشتی کو کسی درخت سے باندھ دیا جائے تو کنارے سے کچھ فاصلہ پر رکھنا چاہئے کیونکہ ہمیشہ ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی آدمی شیر کا شکار ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ خونخوار جانور جب لوگ سوئے پڑے ہوں کشتی میں آجاتے اور بقول اس ملک کے ملاحوں کے (بشرطیکہ سچ ہو) کسی ایسے آدمی کو پہچان کر اٹھا لے جاتے ہیں جو سب سے موٹا تازہ ہو۔

پیپلی سے ہوگلی تک دریا میں مصنف کے ایک سفر کرنے کا ذِکر

مجھے وہ نو دن کا دریائی سفر یاد ہے کہ جو میں نے پیپلی سے ہوگلی تک ان جزیروں اور نہروں میں سے کیا تھا جس کو میں بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اس سفر میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا جو کوئی نہ کوئی عجیب واقعہ پیش نہ آیا ہو۔

کارپ اور ڈالفن مچھلیوں کا ذِکر

ان جزیروں اور نہروں کی طرف جاتے ہوئے جب ہماری سات ڈانڈ والی کشتی دریائے پیپلی سے نکل کر دس پندرہ میل سمندر میں بڑھ گئی تو ہم نے سمندر کو مچھلیوں سے جو ظاہرا بڑی کارپ کی قسم کی معلوم ہوتی تھیں اور جن کے پیچھے تعاقب کے طور پر کثرت سے ڈالفن (۲۳۰) مچھلیاں لگی چلی آتی تھیں بھرا ہوا دیکھا۔ میں نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ کشتی کو ان کی طرف لے چلیں اور میں نے دیکھا کہ بہت سی مچھلیاں پہلو کے بل اس طرح پڑی ہوئی ہیں جیسے مردہ اور بعض کچھ کچھ حرکت کرتی تھیں اور بعض نزع کی حالت میں بے

ہوش پڑی لوٹتی تھیں۔ چنانچہ ہم لوگوں نے چوبیس مچھلیاں اپنے ہاتھوں سے پکڑلیں اور دیکھا کہ ہر ایک کے منہ سے ایک پھکنا باہر نکلا ہوا ہے جیسا کہ کارپ مچھلی کے ہوتا ہے اور اس میں ہوا بھری ہوئی ہے اور اس کا ایک سرا سرخی نما رنگ کا ہے۔ میں نے آسانی سے معلوم کر لیا کہ یہی پھکنا مچھلیوں کو ڈوبنے نہیں دیتا۔ مگر یہ بات بالکل میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ باہر کو کیوں لٹک رہا تھا۔ لیکن شاید یہ سب ہو کہ ڈالفن مچھلیوں نے دیر تک ان کا سخت تعاقب کیا تو ان بے چاریوں نے اپنے بچاؤ کی خاطر یہاں تک اپنا لہو پانی ایک کیا کہ ان کا پھکنا پھول کر سرخ ہو گیا اور منہ سے باہر نکل پڑا۔ میں نے اس امر کا ذکر سینکڑوں جہاز رانوں سے کیا مگر کسی نے یقین نہیں کیا۔ البتہ ایک ڈچ ملاح نے مجھ سے کہا کہ چین کے کنارے پر جبکہ میں ایک بڑی کشتی پر سفر کر رہا تھا تو میں نے بھی ایک ایسی ہی صورت دیکھی تھی اور کشتی سے باہر ہاتھ نکال کر بہت سی مچھلیوں کو پکڑ لیا تھا۔

مصنف کا ایک رات کو قمری قوس قزح دیکھنا

اگلے دن ہم کچھ دیر کر کے ان جزیروں میں پہنچے اور ایک ایسی جگہ پسند کر کے جہاں شیر کا خوف نہ تھا خشکی پر اتر پڑے اور آگ روشن کر لی اور میں نے اپنے نوکروں کو کہہ کر دو مرغ اور چھ مچھلیاں تیار کرالیں اور خوب مزے سے کھانا کھایا اور مچھلیاں فی الواقع لذیذ تھیں۔ میں نے پھر کوچ کیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ رات ہونے تک برابر چلے چلیں کیونکہ ان نہروں کے درمیان اندھیرے کے باعث راستہ بھول جانے کا خوف تھا اور ایک محفوظ کھاڑی تلاش کر کے ہم بڑی نہر میں سے اس میں چلے گئے اور کشتی کو کنارے سے معقول فاصلہ پر ایک درخت کے موٹے ٹہنے سے باندھ کر رات بسر کی اور جبکہ میں نگہبانی کے لئے جاگ رہا تھا تو میں نے آسمان میں ایک عجیب صورت دیکھی جیسے کہ دو مرتبہ دہلی میں بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یعنی ایک قمری قوس قزح (۲۳۱) دیکھی اور اپنے سب ساتھیوں کو جگا کر دکھایا جو دیکھ کر بہت متعجب ہوئے۔ خصوصاً دو پرتگیز جو کشتیوں اور جہازوں کے معلم یعنی رہنما تھے اور جن کو میں نے اپنے ایک دوست کے کہنے سے اپنے ساتھ چڑھا لیا تھا، انہوں نے کہا کہ ہم نے ایسی قوس نہ کبھی دیکھی نہ سنی۔ تیسرے دن ہم ان نہروں میں راستہ بھول گئے اور اگر ہم کو بعض پرتگیز جو ایک جزیرے میں نمک بنا رہے تھے نہ ملتے تو میں نہیں جانتا کہ ہم کو سیدھا راستہ کیونکر معلوم ہوتا۔ اس رات کو جب کہ

ہماری کشتی ایک چھوٹی سی محفوظ کھاڑی میں لگی ہوئی تھی، میرے پر تمیز رفیقوں نے جو شب گزشتہ کے عجیب مشاہدے کے خیال میں اپنی نظر ہر وقت آسمان کی طرف اگائے ہوئے تھے، مجھ کو نیند سے جگایا اور ویسی ہی قوس قزح پھر دکھائی جیسی کہ ہم نے کل رات دیکھی تھی۔ یہ آپ کو خیال نہ کرنا چاہئے کہ میں غلطی سے چاند کے ہالہ کو قوس سمجھتا ہوں۔ نہیں میں ہالے کو خوب جانتا ہوں کیونکہ بمقام دہلی برسات میں کوئی ایسا مہینہ نہیں ہوتا جس میں اکثر چاند کے گرد ہالہ نظر نہ آئے۔ لیکن ہالہ اسی وقت نظر آتا ہے جبکہ چاند افق سے بہت بلند ہو۔ چنانچہ میں تین چار رات تک متواتر دیکھتا رہا ہوں اور بعض اوقات دوہرا ہالہ بھی دیکھا ہے۔ مگر جس قوس کا میں ذکر کرتا ہوں وہ چاند کے گرد کوئی ہالہ نہ تھا بلکہ وہ چاند کے مقابل اسی طرح جیسے آفتاب کی قوس ہوتی ہے، تھی۔ چنانچہ جب کبھی میں نے قمری قوس کو دیکھا تو چاند کو مغرب میں پایا اور قوس کو مشرق میں اور چاند قریباً پورا تھا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرے نزدیک اس کی شعاع قوس پیدا کرنے کے قابل نہ ہوتی۔ یہ قوس ہالے کی طرح سفید نہ تھی اور اچھی طرح نمایاں تھی بلکہ طرح طرح کے رنگ بھی اس میں نمودار تھے۔ پس آپ دیکھتے ہیں کہ میں متقدمین کی نسبت زیادہ خوش نصیب ہوں، جنہوں نے ارسطو کے قول کے بموجب، اس کے زمانے سے پہلے قمری قوس قزح کا ہونا بیان نہیں کیا۔

مصنف کا اپنے اس سفر میں رات کو عجیب و غریب روشنیوں کا دیکھنا

چوتھے روز کی شام کو معمول کے موافق ہم بڑی نہر میں سے ایک محفوظ جگہ میں چلے آئے اور وہاں ہم نے ایسی رات کاٹی جو معمولی طور کی نہ تھی۔ ہوا نام کو بھی نہ تھی اور گرمی اور گھمس کا یہ عالم تھا کہ دم لینا مشکل تھا اور آس پاس کی جھاڑیوں میں جگنو اس کثرت سے چمکتے تھے گویا آگ لگی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور ہر لحظہ شعلوں کی طرح آگ نکل نکل کر ہمارے ملاحوں کو ڈراتی تھی، جن کو یقین تھا کہ یہ سب جن بھوت ہیں۔ ان نورانی صورتوں میں سے دو صورتیں بہت عجیب و غریب تھیں۔ یعنی ایک تو بڑا آتشیں گولا جو اس قدر عرصہ سے جو دعائے پیٹر ناسٹر (۲۳۲) کے پڑھنے میں گزرتا ہے، زیادہ دیر تک قائم رہا۔ دوسرا ایک چھوٹا سا درخت جو پاؤ گھنٹے سے زیادہ عرصہ تک رہا۔

پانچویں رات کا سخت طوفان اور بارش میں بسر ہونا

پانچویں دن کی رات بڑے ہی خوف و خطر میں گزری۔ ایسی سخت ہوا آئی کہ

گو ہم اپنے خیال کے موافق درختوں کے نیچے بڑی محفوظ جگہ میں تھے اور کشتی بھی احتیاط سے بندھی ہوئی تھی، مگر لنگر کا رسا ٹوٹ گیا اور اگر میں اور میرے وہ دونوں پرتگیز ساتھی دفعتاً اپنے بازو درختوں کے ٹہنوں میں ڈال کر ان کو دو گھنٹے تک یعنی جب تک کہ وہ طوفانی ہوا برابر شدت سے چلتی رہی بڑے زور سے نہ پکڑے رہتے، تو بالضرور ہم بڑی نہر میں جا گرتے اور آخر کار وہیں مر جاتے۔ کیونکہ ہندوستانی ملاحوں سے جن پر بالکل خوف چھا رہا تھا، کسی طرح کی امید نہ تھی۔ اس وقت ہماری حالت بڑی ہی دردناک تھی۔ مینہ اس شدت سے پڑ رہا تھا کہ کشتی میں گویا ڈول کے ڈول پانی کے گر رہے ہیں۔ اور بجلی کی چمک اور کڑک ہمارے سروں کے آس پاس اور اس قدر تھی کہ ہم اس ہولناک رات کو اپنی جانوں سے مایوس ہو چکے تھے مگر ہمارا باقی سفر ایسی عمدگی سے گزرا کہ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔

نویں روز ہم ہوگلی میں پہنچے اور اس خوشنما ملک کو دیکھ دیکھ کر جس میں سے ہمارا گزر ہوا، میری آنکھیں سیر نہیں ہوتی تھیں۔ مگر میرا صندوق اور تمام پہننے کے کپڑے بھیگ گئے تھے اور مرغیاں مر گئیں اور مچھلیاں تلف ہو چکی تھیں اور تمام بسکٹ مینہ سے تر ہو گئے تھے۔

پانچویں سوال کا جواب

میں نہیں جانتا کہ میرا اس پانچویں سوال کا حل قابلِ اطمینان ہوگا یا نہیں۔ لیکن جو رائیں میں پیش کروں گا وہ باعتبار اس کے ہیں کہ میں نے دریائے نیل (۲۴۳) کی طغیانی کو دو مرتبہ دیکھا ہے اور اپنا تمام غور و فکر اس مضمون پر صرف کیا ہے اور ہندوستان میں بھی بعض ایسی معلومات حاصل ہوئی ہیں، جن سے اس امر کی تحقیق میں مجھے کچھ آسانی ملی ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی آسانی بالضرور اس مشہور و معروف شخص (۲۴۴) کو حاصل نہ ہوئی ہوگی جس نے بغیر اس کے کہ ملک مصر میں سیاحت کی ہو، صرف اپنی ذہانت اور سیر کتب اور مطالعہ کے زور سے اس دلچسپ مسئلہ میں ایک عمدہ اور عالمانہ تحریر کی ہے۔

مصنف کا دہلی میں شاہ ایتھوپیا کے سفیروں سے دریائے نیل کے حالات کا دریافت کرنا

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ جب ایتھوپیا کے دو سفیر دہلی میں آئے تھے تو میرے

آقا دانشمند خاں، جن کو معلومات حاصل کرنے کا ہمیشہ شوق رہتا ہے، ان کو اکثر دعوت کی تقریب سے اپنے ہاں بلا لیتے تھے اور میں بھی ہمیشہ شریک مجلس ہوتا تھا اور اس سے نواب صاحب کی اصل غرض یہ ہوتی تھی کہ ان کے ملک کی حالت اور حکومت کی وضع سے واقفیت حاصل کریں۔

دریائے نیل کے منبع کی بابت ایتھوپیا کے سفیروں کا بیان

چنانچہ علاوہ اور باتوں کے ہم نے ان سے دریائے نیل کے منبع کی نسبت، جس کو وہ لابائیل کہتے ہیں، بہت گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ اس کے منبع کا حال تو ہر کسی کو خوب معلوم ہے اور اس کی نسبت کسی کو کچھ شک نہیں ہے۔ بلکہ ان سفیروں میں سے ایک نے مع ایک مغل کے جو انہی کے ساتھ ہندوستان کو واپس آیا تھا اس کو دیکھا بھی تھا۔ انہوں نے کہا کہ دریائے نیل کا منبع اگوس کے ملک میں ہے اور وہ دو بڑے جوشندہ چشمے ہیں جو ایک دوسرے کے قریب ہی زمین سے نکل کر اوّل تو کوئی تیس یا چالیس قدم لمبی ایک چھوٹی سی جھیل بن جاتے ہیں اور پھر اس میں سے نکل کر یہ دریا بہت پھیل جاتا ہے۔

دریائے نیل اپنے مخرج سے جدا ہو کر جس شکل سے اور جس جس ملک میں ہو کر مصر میں پہنچتا ہے، اس کا بیان

اس کے بعد راستہ میں اور بہت سے ندی نالے مل جاتے ہیں اور ایک دریائے ذخار بن جاتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ ایسے طور پر پیچ کھا کھا کر گیا ہے کہ جس سے زمین کا ایک وسیع حصہ جزیرہ نما کی صورت بن گیا ہے۔ اور پھر بہت اونچی اونچی چٹانوں پر سے اتر کر ایک بڑی جھیل میں، جو مملکت ڈیمبیا میں اس کے منبع سے صرف چار پانچ منزل اور گونڈار دارالحکومت ایتھوپیا سے تین ہلکی منزلوں کے فاصلہ پر ہے، جا گرتا ہے اور اس جھیل کو طے کر کے مع ان تمام پانیوں کے جو اس جھیل میں گرتے ہیں، آگے کو بڑھتا ہے اور ممالک فنجی یعنی بربرستان جو شاہ ایتھوپیا کے باج گزار ہیں، ان کے خاص شہر سینار میں سے گزرتا ہوا آبشاروں کی صورت میں ہو کر ملک مصر کے میدانوں میں آنکلتا ہے۔

ایتھوپیا کے سفیروں کے قول کے موافق نیل کا منبع خطِ استوا کے شمال

میں ہونا چاہئے

جب یہ سفیر دریائے نیل کے منبع اور اس کی کیفیت بیان کر چلے تو میں نے اس ملک کا موقع دریافت کرنا چاہا جہاں اس دریا کا یہ منبع ہے۔ پس میں نے پوچھا کہ ڈ-ببیا باب المندب سے کس طرف کو اور افریقہ کے کون سے حصہ میں واقع ہے۔ لیکن انہوں نے جز اس کے اور کچھ جواب نہ دیا کہ وہ مغرب کی طرف ہے۔ مجھ کو یہ تقریر سن کر حیرت ہوئی خصوصاً ایک مسلمان سفیر سے جس کو کسی عیسائی کی نسبت مقامات کی نسبتی حالتوں سے زیادہ واقف ہونا چاہئے تھا کیونکہ مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ اپنی پنجگانہ نماز پڑھتے وقت شہر مکہ کی طرف رُخ کریں۔ مگر بہر حال اس مسلمان سفیر نے یہ امر باصرار بیان کیا کہ ڈ-ببیا باب المندب کے مغرب میں ہے۔ پس ان سفیروں کے قول کے بموجب دریائے نیل کا منبع خط استوا کے شمال میں ہے نہ کہ جنوب میں جہاں بطلیموس (۲۳۵) نے قرار دیا ہے۔ اور ہمارے نقشوں میں بھی جنوب ہی میں درج ہے۔

ایتھوپیا کی بارش کی نسبت ان سفیروں کے جواب اور نیل کی طغیانی سے اس کے تعلق کا ذِکر

ہم نے ان صاحبوں سے یہ بھی دریافت کیا کہ ایتھوپیا میں بارش کب ہوتی ہے اور یہ کہ ہندوستان کی طرح مقررہ موسم میں ہوتی ہے یا اور طرح۔ انہوں نے جواب دیا کہ بحر احمر کے ساحل پر سواکن اور آرکیکو اور جزیرہ مصوع سے لے کر باب المندب تک اس سے زیادہ بارش نہیں ہوتی جیسی کہ مخا میں ہوتی ہے جو اس سمندر کے دوسرے کنارے پر ملک یمن میں ہے۔ مگر اس ملک کے اندر کی طرف مملکت ڈ-ببیا کے صوبہ اگوس میں اور آس پاس کے صوبوں میں گرمی کے ان دو مہینوں میں بہت بارش ہوتی ہے جن میں کہ ہندوستان میں بھی ہوتی ہے اور میرے قیاس کے بموجب یہ ٹھیک وہ وقت ہے جبکہ مصر میں دریائے نیل طغیانی پر آتا ہے۔ ان سفیروں نے کہا کہ ہم کو خوب معلوم ہے کہ دریائے نیل کی طغیانی اور اس سے ملک مصر کی سیرابی کا باعث اتھوپیا کی بارشیں ہیں اور ملک مصر کی زرخیزی کا باعث وہ چکنی مٹی ہے جس کو دریائے نیل بہا کر یہاں لا ڈالتا ہے انہوں نے کہا کہ انہی حالات کی وجہ سے شاہان ایتھوپیا کو ملک مصر سے خراج لینے کا استحقاق حاصل تھا اور جب

اس ملک پر مسلمان مسلط ہو گئے اور وہاں کی عیسائی رعایا ظلم رسیدہ اور ذلیل ہو گئی تو شاہ ایتھوپیا نے چاہا تھا کہ اس دریا کا رُخ بحر احمر کی طرف پھیر دیا جائے اور یہ ایک تدبیر تھی کہ مصر کی زرخیزی بالکل مفقود ہو کر یہ ملک برباد ہو جاتا۔ لیکن یہ منصوبہ اگرچہ غیر ممکن نہ تھا مگر ایسا عظیم الشان تھا کہ مطلق عمل میں نہ آیا۔ ان تمام باتوں سے میں مقام مخا پہلے ہی واقف ہو چکا تھا۔ کیونکہ گونڈار کے رہنے والے دس بارہ سوداگروں سے (جو بادشاہ ایتھوپیا کی طرف سے ہر سال اس شہر میں اس غرض سے آتے تھے کہ ہندوستان کے آئے ہوئے جہازوں کے ساتھ لین دین کریں) مجھ کو طرح طرح کی گفتگوؤں کا موقع ملا تھا اور جو معلومات مجھ کو ان سے حاصل ہوئی تھیں اگرچہ وہ بہت مفید ہیں کیونکہ ان سے بھی دریائے نیل کی طغیانی کا باعث صرف وہ بارشیں ہی ثابت ہوتی ہیں جو قریب اس کے منبع کے اور ملک مصر سے کچھ فاصلہ پر ہوتی ہیں لیکن تاہم میں اپنے ذاتی مشاہدوں کو جو اس دریا کی طغیانی کے وقت مجھ کو دو مختلف اوقات میں ہوئے تھے زیادہ معتبر سمجھتا ہوں اور ان سے آپ کو ظاہر ہو جائے گا کہ مصر کے عوام الناس کی جو رائیں اس بارہ میں ہیں وہ غلط ہیں۔ بلکہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ محض بے معنی قصے کہانیاں اور ایسے لوگوں کی گھڑتیں ہیں جو توہمات میں اس وجہ سے پھنسے ہوئے ہیں کہ ایسے موسم میں یعنی جب گرمی شدت سے ہوتی ہے ایسے ملک میں کہ جہاں بارش کو کوئی جانتا بھی نہیں دریا کی طغیانی کو دیکھ کر سخت متحیر ہو جاتے ہیں۔

نیل کی طغیانی کے متعلق عوام مصر کے بعض تخیلات اور اوہام کا ذکر اور ان کا ابطال

چنانچہ منجملہ ان توہمات اور تخیلات کے میری مراد اس جگہ بہ تخصیص ان کے مفصلہ ذیل غلط خیالات سے ہے یعنی ایک تو وہاں کے لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ دریائے نیل کی طغیانی شروع ہونے کا ایک خاص دن مقرر ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک خاص قسم کی شبنم جس کو گوٹ کہتے ہیں، طغیانی کے اوّل ہی دن پڑنی شروع ہوتی ہے اور اس کے شروع ہوتے ہی وباء طاعون فوراً جاتی رہتی ہے۔ تیسرے یہ کہ جب گوٹ گرنے لگ جاتی ہے تو پھر اس مرض میں اگر کوئی شخص مبتلا بھی ہو تو ہلاک نہیں ہوتا۔ چوتھے یہ کہ اس دریا کی طغیانی کے اسباب ایسے مخفی اور خاص طور کے ہیں کہ جو کسی کو معلوم نہیں ہیں۔ مگر میرے مشاہدات کا خلاصہ یہ ہے کہ مجھے بخوبی منکشف ہو گیا کہ یہ مشہور دریا بھی مثل اور دریاؤں کے صرف

بارشوں کی کثرت سے طغیانی پر آتا ہے۔ نہ یہ کہ اس کی طغیانی اس سبب سے وقوع میں آتی ہے کہ مصر کی زمین اپنی شوریت کی وجہ سے جوش کھا کر اس کی طغیانی کا باعث ہو جاتی ہے۔
چنانچہ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ طغیانی کے اس متخیلہ دن سے قریب ایک مہینہ پہلے ہی یہ دریا ایک فرانسیسی فٹ سے زیادہ چڑھا ہوا اور نہایت گدلے پن کی حالت میں بہہ رہا تھا اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جب یہ دریا طغیانی پر آتا ہے تو قبل اس کے کہ اس کی نہروں کے دہانے کھولے جائیں یہ پہلے تو چند روز تک ایک یا دو فٹ چڑھتا ہے اور بعد ازاں بتدریج اترنا شروع ہوتا ہے اور پھر چڑھنے لگتا ہے اور ٹھیک اسی اندازہ سے چڑھتا یا اترتا ہے جس قدر کہ اس کے منبع کے قریب بارش کی قلت یا کثرت ہوتی ہے اور اس کی یہ حالت بعینہ ہمارے دریائے لوائر کی سی ہے، جس کا چڑھاؤ اور اتار اسی نسبت سے ہوتا ہے جس قدر کہ بارشیں ان پہاڑوں پر ہوتی ہیں جہاں سے یہ نکلتا ہے۔

طغیانی کے متخیلہ دن اور شبنم کے پڑنے میں کچھ تعلق نہیں

اس دن سے قریب ایک مہینہ پہلے جبکہ گوٹ کا گرنا بیان کیا جاتا ہے ایک مرتبہ بیت المقدس سے واپس آتے ہوئے میں ڈمیٹا (یعنی دمیاط) سے شہر قاہرہ تک اس دریا کی بالائی جانب کو آیا تھا اور صبح کو ہمارے کپڑے شبنم کی وجہ سے، جو رات بھر پڑی تھی، تر ہو گئے تھے۔

شبنم کے گرنے اور وبائے طاعون میں جو تعلق خیال کیا جاتا ہے اس کا ابطال

گوٹ گرنے کے آٹھ دس روز بعد بمقام روسیٹا (یعنی رشید) مجھے اپنے وائس کونسل (یعنی نائب وکیل) موسیو دی برمن صاحب کے ساتھ شب کو کھانا کھانے کا اتفاق ہوا تھا اور جماعت حاضرین طعام میں سے تین شخص اسی رات کو طاعون کے مرض میں مبتلا ہوئے تھے، جن میں سے دو تو آٹھویں دن مر گئے اور تیسرا مریض بھی جو اتفاق سے خود دی برمن صاحب ہی تھے شاید اس بیماری سے جاں بر نہ ہوتا اگر میں جرأت کر کے یعنی اس شبنم کی متخیلہ تاثیر کے بھروسہ پر نہ رہ کر ان کا پھوڑا نہ چیر ڈالتا اور دوا تجویز نہ کرتا۔

خود مصنف کے مرض طاعون میں مبتلا ہونے کا ذکر

اس موقع پر خود مجھ کو بھی یہ متعدی بیماری لگ گئی تھی اور اگر میں فوراً بیٹر

آف انیٹی منی یعنی سرمہ کا جوہر استعمال نہ کرتا تو میں بھی مر جاتا۔ اور یہ بات ثابت ہو جاتی کہ گوٹ کے گر جانے کے بعد بھی آدمی وبا سے مر جاتے ہیں۔ اس قے لانے کی دوا نے جو میں نے بیماری کے آغاز ہی میں پی لی تھی، عجیب اثر کیا اور میں تین چار دن سے زیادہ بیمار نہ رہا۔ ایک میرا بدوی نوکر جو اس بیماری میں میری خدمت کرتا تھا، میری ڈھارس بندھانے کی خاطر وہ یخنی جو میرے پینے سے بچ جاتی تھی بے تامل پی جاتا تھا اور چونکہ وہ ایک متوکل شخص تھا طاعون سے ڈرنے والوں کے خیال پر ہنستا تھا۔

شبنم کے شروع ہونے کے بعد طاعون میں کمی ہونے کا طبعی سبب

میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ گوٹ کے گرنے کے بعد اس بیماری میں عموماً ہلاکت کا کم خوف ہوتا ہے۔ لیکن میری غرض یہ ہے کہ اس خوف کے کم ہونے کو گوٹ سے منسوب نہ کرنا چاہئے کیونکہ میری رائے میں بیماری کے کم ہو جانے کا سبب گرمی کی وہ شدت ہے جو ان دنوں میں بہ نسبت پہلے کے زیادہ ہو جاتی ہے، جس سے مسامات کھل کر وہ سب مضر اور وبائی رطوبتیں جو جسم میں بند تھیں خارج ہو جاتی ہیں۔

ملاحوں معروف "رے" کے قول کے موافق بھی بارش ہی نیل کی طغیانی کا سبب ہے

علاوہ بریں میں نے بہت احتیاط سے اکثر ملاحوں سے بھی، جن کو "ریز" کہتے ہیں اور جو دریائے نیل پر مصر کے میدانوں کی حدِ اخیر یعنی چٹانوں اور آبشاروں تک سفر کر آئے تھے، دریافت کیا تو انہوں نے بھی مجھے یہی بتایا کہ جب یہ دریا مصر کے میدانوں اور اس زمین میں جو شور اور پر جوش بیان کی جاتی ہے طغیانی پر آتا ہے تو آبشاروں اور پہاڑوں میں بھی بہت چڑھتا ہے اور ان آبشاروں کو عجیب طور سے طغیانی پر لاتا ہے حالانکہ ان پہاڑوں کی زمین ظاہرا شور نہیں ہے۔

سینار کے حبشیوں کے بیان سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے

میں نے ہوشیاری کے ساتھ سینار کے حبشیوں سے بھی، جو نوکری کے واسطے قاہرہ کو جاتے ہیں اور جن کا ملک دریائے نیل کے کنارے پر ان کوہستانی قطعات میں واقع ہے جو مصر کے جنوب کی طرف ہیں اور شاہِ ایتھوپیا کا باج گزار ہے، تحقیق کیا تو انہوں نے

بھی متفق اللفظ یہی بیان کیا کہ جس وقت دریائے نیل مصر کے میدانوں میں چڑھتا ہے تو یہ ہمارے ملک میں بھی چڑھتا اور زور پر آتا ہے اور اس کا باعث وہ بارشیں ہیں کہ جو نہ صرف ہمارے پہاڑوں میں ہوتی ہیں بلکہ ہمارے ملک سے اوپر کی طرف ایتھوپیا میں بھی ہوتی ہیں۔

ہندوستان کے دریا گنگا وغیرہ بھی بارش ہی سے طغیانی پر آتے ہیں

ہندوستان کی موسمی بارشوں اور دریائے نیل کے مصر میں ایک ہی وقت میں طغیانی پر آنے سے جو جو خیالات میرے دل میں گزرے ان سے یہ مضمون بہت صاف ہو جاتا ہے اور آپ خیال کر سکتے ہیں کہ دریائے سندھ اور گنگا اور اس ملک کے اور دریا گویا دریائے نیل، اور ان کے آس پاس کی زمینیں گویا مصر کی زمینیں ہیں۔

دریائے نیل اور گنگا اور مصر اور بنگالہ میں جو مشابہت ہے، اس کا ذکر

یہ خیالات میرے دل میں اس وقت گزرے تھے جبکہ میں بنگالے میں تھا اور مندرجہ ذیل عبارت وہ عبارت ہے جو میں نے اس وقت اس بحث کے متعلق لکھی تھی۔

"خلیج بنگالہ میں دریائے گنگا کے دہانے پر وہ متعدد جزیرے جو زمانہ پا کر آپس میں مل گئے اور آخر کار براعظم سے شامل ہو گئے ہیں، مجھ کو دریائے نیل کے دہانوں کی یاد دلاتے ہیں۔ جب میں مصر میں تھا تو صانع قدرت کو دیکھ کر مجھے خیال آتا تھا کہ ارسطو کا یہ قول کہ "ملک مصر دریائے نیل کی صنعت ہے" بنگالے پر بھی صادق آتا ہے جو دریائے گنگا کا بنایا ہوا ہے۔ ان دونوں دریاؤں میں صرف اتنا فرق ہے کہ دریائے گنگا نیل کی نسبت بہت بڑا ہے اور اسی وجہ سے نیل سے زیادہ مٹی اپنے ساتھ سمندر میں بہالے جاتا ہے جس کے سبب سے اس کے جزیرے نیل کے جزیروں کی نسبت بڑے ہیں اور یہ فرق بھی ہے کہ دریائے نیل کے جزیرے درختوں سے خالی ہیں بخلاف گنگا کے جزیروں کے جو بسبب ان چار مہینوں کی متواتر اور کثیر بارشوں کے جو گرمی کے موسم میں ہوتی ہیں درختوں سے لدے ہوئے ہیں۔

مصر میں جو نہریں آب پاشی کی خاطر نیل سے کاٹی جاتی ہیں بنگالے میں موسمی بارشوں کی بدولت ان کی حاجت نہیں ہے اگرچہ وہ بھی بآسانی تیار ہو سکتی ہیں کیونکہ دریائے گنگا اور اور دریا گرمی کے موسم میں ان بارشوں کے سبب سے جو اس موسم میں ہمیشہ ہوتی ہیں، اسی طرح چڑھتے ہیں جس طرح نیل چڑھتا ہے۔ دونوں ملکوں میں یہ تفاوت ہے

کہ مصر میں سمندر کے کنارے کے سوا جہاں کبھی کبھی خفیف سی بارش ہو جاتی ہے، خواہ کوئی موسم ہو بارش کو کوئی جانتا بھی نہیں اور صرف ایتھوپیا میں دریائے نیل کے منبع کے قریب بارش ہوتی ہے۔ بخلاف ہندوستان کے جہاں بارش ان ملکوں میں ہمیشہ مقررہ موسم میں ہوتی ہے، جن میں دریا بہتے ہیں۔

ملک سندھ اور مصر کی مشابہت کا ذِکر

مگر معلوم رہے کہ یہ حالت عموماً نہیں ہے۔ چنانچہ دریائے سندھ کے دہانے پر ملک سندھ میں جو خلیج فارس کی طرف واقع ہے، برسوں ایک بوند بھی نہیں پڑتی خواہ اس دریا میں کیسی ہی طغیانی کیوں نہ ہو اور یہ ملک اس وقت مصر کی طرح صرف نہروں سے سیراب کیا جاتا ہے۔

تھیوی نٹ صاحب نے جو یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ جو جو تجربے اور مشاہدے مجھ کو بحر قلزم اور سوئز اور طور اور کوہِ سینا اور جدہ میں، جو مکہ سے آدھے دن کے راستہ پر پاک مانا ہوا ایک مقام ہے، اور جزیرہ کامیرن اور لوہیا میں ہوئے ہیں ان کا مفصل حال آپ کے پاس لکھ بھیجوں۔ اس لیے میرا ارادہ ہے کہ جب مجھے اپنی قلمی یادداشتوں کے کھولنے کی فرصت ملے ان کی تمنا کو پورا کروں اور میں امید کرتا ہوں کہ جو واقفیت مجھ کو بمقام مخا ملک اتھوپیا اور وہاں جانے کے لئے عمدہ راستہ کی نسبت حاصل ہوئی ہے اس کو بھی لکھوں۔

مصنف کا خط بنام مسٹر چیپ لین (۲۳۶)

مؤرّخہ دس جون ۱۶۶۸ء من مقام شیراز واقع ایران

ہندوؤں کے عقائد اور توہمات اور بعض انوکھی رسموں اور مذہب وغیرہ کے بیان میں

سورج گہن

سورج گہن کے ایک موقع پر فرانس میں لوگوں کے توہمات کا بیان

صاحبِ من! سورج گہن کے دو واقعے میں نے ایسے دیکھے ہیں کہ جن کو میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ پہلا واقعہ تو میں نے اپنے ہی ملک میں ۱۶۵۴ء میں دیکھا تھا اور دوسرا ۱۶۶۶ء میں بمقام دہلی۔ پہلا گہن مجھے اس سبب سے یاد ہے کہ اس سے اہلِ فرانس کی طفلانہ زوداعتقادی اور ان کے بے بنیاد خوف و ہراس کے عجیب عجیب تماشے دیکھنے میں آئے تھے۔ چنانچہ ان کے یہ بے وقوفانہ وساوس اس حد کو پہنچ گئے تھے کہ بعض لوگوں نے تو ٹونے ٹوٹکے کر کے بچ جانے کے لئے قسم قسم کی جڑی بوٹیاں اور دوائیں مول لیں اور بعض نے محفوظ مکانوں اور تہ خانوں میں نہایت احتیاط سے اپنے تئیں بند کر لیا تاکہ اس منحوس وقت کے آفتاب کی شعاع ان تک نہ پہنچے اور ہزاروں آدمی گرجاؤں میں دعا مانگنے گئے۔ بعض یہ سمجھتے تھے کہ اب کوئی ناگہانی آفت آنے والی ہے اور بعض کی یہ رائے تھی کہ قیامت کا دن یہی ہے اور یہ جہان آج ہی ملیامیٹ ہو جائے گا اور اگرچہ "گے سینڈی" (۲۲۷) اور رابرول (۲۲۸) وغیرہ اہلِ ہیئت اور حکماءِ یورپ نے پہلے ہی خوب تکرار سے لکھ دیا تھا کہ اس گہن میں اگرچہ دھوپ بالکل نہ رہے گی مگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اور جس طرح پر ہمیشہ ہوتے رہے ہیں یہ بھی بالکل بے خطر ہے۔ نجومیوں اور رمالوں کے سے بے ہودہ توہمات نہ کرنے چاہئیں۔ مگر اس پر بھی ہمارے ہم وطنوں کو ایسے ایسے وساوس اور توہمات تھے۔

دہلی میں ایک سورج گہن کے دیکھنے کا ذکر

جو گہن بمقام دہلی ۱۶۶۶ء میں ہوا، وہ ہندوؤں کے توہمات اور عجیب و غریب حرکات کی وجہ سے مجھے یاد رہے گا۔ جب گہن کا وقت آیا تو میں اپنی حویلی کی چھت پر جو جمنا کے کنارے تھی اور جہاں سے دریا کے دونوں کنارے نظر آتے تھے، جن میں تخمیناً ایک "لیگ" یعنی تین میل کا فاصلہ ہے، جا کھڑا ہوا۔ ہزاروں لاکھوں ہندو کمر کمر پانی میں سورج کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑے دیکھ رہے تھے تاکہ گہن کے شروع ہوتے ہی غوطہ لگائیں۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں اور لڑکے بالکل ننگے تھے۔ مرد صرف دھوتیاں باندھے ہوئے تھے۔

بیاہی ہوئی عورتیں اور چھ چھ سات سات برس کی لڑکیاں صرف ایک چادر یا ساڑھی اوڑھے ہوئے تھیں۔ ذی مقدور شخصوں اور بڑے بڑے آدمیوں یعنی راجاؤں اور متمول اور صاحبِ امتیاز لوگوں نے جو دربار شاہی میں معزز ہیں اور صرافوں، مہاجنوں، جوہریوں اور بیوپاریوں وغیرہ نے یہ بندوبست کیا تھا کہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ دریا کے اس کنارے سے اُس کنارے آ کر پانی میں ڈیرے اور قناتیں کھڑی کرالیں اور اس طرح پر پردہ میں اشنان وغیرہ کیا۔ ہندوؤں کے اس مجمع نے جونہی گہن لگتے دیکھا ایک عجیب نعرہ مارا اور چند بار متواتر غوطے لگائے۔ پھر پانی میں کھڑے ہوئے اور اپنے ہاتھ اور آنکھیں سورج کی طرف اٹھائے ہوئے بڑے حضور قلب سے عبادت اور پوجا کرتے ہوئے معلوم ہوئے اور چند بار دونوں ہاتھوں میں پانی لے کر سورج کو چڑھایا اور بہت ادب سے سر جھکا جھکا کر کبھی دائیں کبھی بائیں پانی دیتے تھے اور گہن کے ختم ہونے تک یہ بے چارے غلطی میں پڑے ہوئے لوگ ایسی ہی حرکتیں کرتے رہے اور جب جانے لگے تو جمنا میں دور سے روپے اور دوانیاں چوانیاں وغیرہ پھینکیں اور برہمنوں کو جو بھلا ایسی تقریب پر وہاں آنے سے کیوں چوکنے لگے تھے، بہت کچھ پن دان دیا۔ میں نے دیکھا کہ ہر ایک شخص نے جب پانی سے نکلا، نئی پوشاک جو دریا کے کنارے ریت پر پہننے کو رکھی ہوئی تھی، پہنی۔ بلکہ بہت سے لوگوں نے جو زیادہ دھرم آتما تھے اپنی پرانی پوشاکیں برہمنوں کو پن کر دیں۔

اس طرح سے میں نے اس عظیم الشان سورج گہن کی پوجا کا تماشا اپنے مکان کی چھت پر سے دیکھا اور جیسا کہ یہاں ہوا ویسا ہی دریائے سندھ اور گنگا اور ہندوستان کے اَور دریاؤں بلکہ عام تالابوں پر بھی ہوا۔ کہتے ہیں کہ تھانیسر (۲۳۹) میں قریب ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کے ہندوستان کے ہر ایک حصہ سے اشنان کے واسطے آن کر جمع ہوئے تھے کیونکہ اس ندی کا پانی جو وہاں بہتی ہے، گہن کے دن اَور دریاؤں اور ندیوں کی نسبت زیادہ متبرک اور پاک سمجھا جاتا ہے۔

۞

سورج گہن کے اشنان وغیرہ رسوم کے باب میں ہندوؤں کے ساتھ سلاطینِ مغلیہ کا برتاؤ

سلاطینِ مغلیہ اگرچہ مسلمان ہیں لیکن ان پرانی رسموں کے آزاد طور پر بجالانے کو یا تو اس خیال سے منع نہیں کرتے کہ ہندوؤں کے مذہبی معاملات میں دست اندازی کرنا

چاہتے ہی نہیں یا دست اندازی کی جرأت نہیں رکھتے۔ مگر ہاں اتنی بات بیشک ہے کہ تھانیسر کے میلہ سے پہلے چند برہمن اپنی قوم (ہندوؤں) کی طرف سے بطور وکیل حاضر ہو کر ایک لاکھ روپیہ پیش کش کر کے پوجا وغیرہ کی اجازت حاصل کرتے ہیں اور اس کے عوض کچھ خلعت اور ایک کم قیمت ضعیف ہاتھی ان کو عطا ہوتا ہے۔(۲۴۰)

گہن کے موقع پر پوجا پاٹھ اور پُن دان کرنے کی وجہ

اب میں اس گہن کی پوجا کی وجہ اور منشا اور یہ کہ یہ رسمیں کیوں جاری ہیں، بیان کرتا ہوں۔ ہندو کہتے ہیں کہ ہمارے چار وید یعنی (کتابِ آسمانی) جو خدا نے ہم کو برہما کی وساطت سے دیئے ہیں، یہ بتلاتے ہیں کہ ایک دیوتا جس نے راچھس کا اوتار لیا ہے اور جو نہایت مفسد اور شریر اور نہایت کالا کلوٹا اور ازبس نجس اور میلا کچیلا ہے، سورج کو پکڑ کر بشدت میلا اور کالا بنا دیتا ہے۔ سورج بھی اگرچہ ایک دیوتا ہے مگر چونکہ نہایت رحم دل اور نیک نہاد ہے، اس شریر کالی بلا کے پنجہ میں پھنس کر سخت تکلیف اور ایذا پاتا ہے۔ پس ہر ایک شخص کو یہ لازم اور واجب ہے کہ سورج بھگوان کو اس حالت سے نجات اور رہائی دینے میں کوشش کرے اور اس کی صرف یہی سبیل ہے کہ اشنان اور پوجا پاٹھ اور پُن دان کیا جائے۔ کیونکہ یہ دھرم کرم گہن کی حالت میں نہایت ہی مہاتم اور گن رکھتے ہیں اور جو پُن دان اس وقت کیا جائے وہ بہ نسبت معمولی پُن دان کے سو گنا پھلتا ہے۔ پس ہندو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بھلا کون ایسا شخص ہوگا کہ جس کام میں سو گنا فائدہ ہو اس کو نہ کرے۔ صاحب من! یہی وہ دونوں سورج گہن ہیں کہ جن کی نسبت میں نے آپ سے کہا ہے کہ ان کو ہرگز نہ بھولوں گا۔

جگن ناتھ کی رتھ یاترا کا بیان

سورج گہن کی رسموں وغیرہ کے ذکر سے مجھ کو طبعاً اور خواہی نہ خواہی یہ تحریک ہوتی ہے کہ کچھ اور حال بھی ان لوگوں کی بعض وحشیانہ طور کی رسموں کا آپ کو سناؤں جن کو سن کر آپ کی رائے میں جیسا مناسب معلوم ہو نتیجہ نکال لیں۔

رتھ یاترا کے موقع پر یاتری نہایت کثرت سے جمع ہوتے ہیں

خلیج بنگالہ میں جگن ناتھ نامی ایک شہر ہے اور وہاں ایک مشہور مندر ہے جس میں

جگن ناتھ کی مورت نصب کی ہوئی ہے اور اگر میری یاد میں غلطی نہ ہو، وہاں ہر سال ایک میلہ ہوتا ہے جو آٹھ نو روز تک رہتا ہے اور اس موقع پر لوگوں کا بڑا بھاری مجمع ہوتا ہے، جیسا کہ اگلے زمانہ میں یمن (۲۴۱) کے مندر پر ہوتا تھا یا ہمارے وقت میں مکہ میں ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ قریب دو لاکھ کے یاتری جمع ہو جاتے ہیں۔

جگن ناتھ کے رتھ اور مورت کا بیان

لکڑی کا ایک نہایت عجیب و غریب رتھ بنا ہوا ہے (جس کا نقشہ ہندوستان کے بعض مقامات میں میں نے دیکھا بھی ہے) جس پر بے شمار مورتیں بنی ہوئی ہیں، جن میں سے کسی کے تو اُن جنوں کی تصویروں کی طرح جو ہمارے ملک میں ہوتی ہیں، دو سر ہیں، یعنی آدھا جسم انسان کا ہے اور آدھا حیوان کا اور کسی کے نہایت مہیب بندر اور دیو وغیرہ کا سا ایک سر ہے۔ یہ رتھ پندرہ سولہ پہیوں کا ہے اور پچاس ساٹھ آدمیوں کے زور سے چلتا ہے اور اس کے عین وسط میں جگن ناتھ کی مورت کو نہایت مکلف اور زرق برق پوشاک پہنا کر رکھتے اور عظم وشان کے ساتھ ایک مندر سے دوسرے مندر کو لے جاتے ہیں۔

مورت کے درشن کے وقت لوگ کثرتِ اژدحام سے کچل جاتے ہیں

پہلے روز جس وقت اس مورت کے درشن کرائے جاتے ہیں اس قدر اژدحام ہوتا ہے کہ بہت سے یاتری، جو کالے کوسوں چل کر نہایت ضعف اور کمزوری کی حالت میں یہاں پہنچتے ہیں، لوگوں کے دھکم دھکا سے کچل جاتے ہیں اور ان کے ارد گرد کے لوگ یہ تعریف و توصیف کرتے ہیں کہ بڑے ہی خوش نصیب تھے جو اتنی دور سے ایسی متبرک جگہ آن کر مرے !!!

جگن ناتھ کے رتھ کے نیچے کچل کر مر جانا بڑا اہتمام سمجھا جاتا ہے

یہ رتھ جس کے ساتھ ایک قیامت کا شور و غوغا ہوتا ہے، جب احتشام کے ساتھ چلتا ہے تو میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ لوگ ایسے نادان خوش عقیدہ ہیں کہ اپنے تئیں اس کے پہیوں کے نیچے ڈال دیتے ہیں، جو ان کو بالکل کچل دیتے ہیں اور دیکھنے والے اس امر سے ذرا بھی تعجب اور نفرت نہیں کرتے اور ان کے خیال میں کوئی کرم (عمل) ایسا بہادرانہ اور اس سے زیادہ راحت بخش نہیں ہے۔ اور جان دینے والا یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جگن ناتھ

اس کو بجائے اپنے بچہ کے سمجھیں گے اور اگلے جنم میں بہت آرام اور عزت اور عیش کی زندگانی بخشیں گے!!! برہمن لوگوں کو ان توہمات اور ان بھاری غلطیوں کے ارتکاب کی اور بھی ترغیب دیتے رہتے ہیں جس کے وسیلہ سے ان کو دولت اور بڑائی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ لوگوں کا ان کی نسبت یہ اعتقاد ہے کہ یہ غیب کے بھیدوں سے واقف ہیں اور اس لئے ان کی بہت تعظیم وتکریم کرتے ہیں اور وہ مَن دان لے کر مالدار ہو جاتے ہیں۔

ایک کنواری لڑکی جگن ناتھ کی دلہن بنائی جاتی ہے

برہموں کا دغا اور فریب یہاں تک ہے کہ تاوقتیکہ میں نے قطعی دلیلوں سے بخوبی تحقیق نہ کر لیا، مجھ کو اس بات پر یقین نہ آتا تھا کہ یہ ایک خوبصورت لڑکی کو جگن ناتھ کی شادی کے واسطے انتخاب کرتے ہیں جو بڑی دھوم دھام سے مورت کے ساتھ مندر کو جاتی اور تمام رات وہاں رہتی ہے اور یہ برہمن اس کو یہ دم دیتے ہیں کہ خود جگن ناتھ جی رات کو تیرے ساتھ آکر رہیں گے اور تو دیوتا سے پوچھو کہ اب کی دفعہ سماں کیسا ہو گا اور آپ کی اس کرپا کے عوض کس قسم کی پوجا اور چڑھاوا اور رتھ کی روانگی کا جلوس آپ کو پسند ہوگا اور رات کے وقت ایک شہوت پرست برہمن ایک چھوٹی سی چور کھڑکی کی راہ سے مندر میں پہنچ جاتا اور اس بے چاری کنواری لڑکی سے، جو اس کو جگن ناتھ سمجھی ہوئی ہوتی ہے، ہم بستر ہوتا ہے اور جس بات کی برہموں کو ضرورت ہو اس کو یقین کرا جاتا ہے اور جب صبح کو ویسی ہی دھوم دھام سے اس کو دوسرے مندر میں لے جاتے ہیں تو برہمن اس سے کہتے ہیں کہ جو کچھ تم نے دیوتا کی زبان سے سنا ہے وہ اعلانیہ لوگوں کو سنا دو۔

کسبیاں جگن ناتھ کی مورت کے سامنے ناچتی ہوئی بہت بے حیائی کی حرکتیں کرتی ہیں

اب ہم ایک اور بے وقوفی کا ذکر کرتے ہیں یعنی جگن ناتھ کے رتھ کے سامنے بلکہ خاص مندر میں بھی میلہ کے دنوں میں ناچ کے وقت کسبیاں اپنے بدن سے مختلف اوضاع کے ساتھ نہایت بے شرمی اور بے حیائی کی حرکتیں کرتی ہیں (۲۴۲) اور برہمن ان لغویتوں کو بالکل اپنے ملک کے مذہب کے مطابق خیال کرتے ہیں۔

یہ کسبیاں برہموں اور ہندو فقیروں کے سوا کسی کے پاس نہیں جاتیں

میں کئی ایک خوبصورت کسبیوں کو جانتا پہچانتا ہوں جو باوجود اس پیشہ کے نہایت

محتاط ہیں یعنی ہر کسی کے پاس نہیں چلی جاتیں۔ چنانچہ ان عورتوں کو کئی اہل اسلام اور عیسائی اور بعض پردیسی قوم کے بت پرستوں نے بہت کچھ دولت اور روپیہ دینا چاہا لیکن انہوں نے بایں عذر قبول نہ کیا کہ ہم نے اپنے تئیں دیوتاؤں اور برہموں اور ان سادھوؤں پر جو ننگے دھونی رمائے اور جٹادھارن کئے مندر کے چاروں طرف بیٹھے ہیں (جن کی وضع کا بیان میں جلد کروں گا) وقف کیا ہوا ہے۔

ستی کا بیان

ستی کی رسم(۲۴۵) اور اس کے باب میں حکام مغلیہ کی پالیسی کا بیان

ہندوستان کی عورتوں کے ستی ہونے کی نسبت جو روایتیں یورپ میں مشہور ہیں اگرچہ پہلے بھی ان کی تصدیق بہت سے سیاحوں اور مسافروں کے بیانات سے ہو چکی ہے مگر امید ہے کہ میرے ہم وطن اس پُر اندوہ کیفیت کو سن کر اب تو شبہ کرنا بالکل چھوڑ دیں گے۔

جو بیانات ستی کی بابت لکھے گئے ہیں ان میں بلاشک مبالغہ کیا گیا ہے اور آج کل پہلے کی نسبت ستی کی تعداد کم ہو گئی ہے کیونکہ مسلمان جو اس ملک کے فرماں روا ہیں اس وحشیانہ رسم کے نیست و نابود کرنے میں حتی المقدور کوشش کرتے ہیں اور اگرچہ اس کے امتناع کے واسطے کوئی قانون مقرر کیا ہوا نہیں ہے کیونکہ ان کی پالیسی (تدبیر مملکت) کا یہ ایک جزو ہے کہ ہندوؤں کی خصوصیات میں جن کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے دست اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کی مذہبی رسوم کے بجا لانے میں ان کو آزادی دیتے ہیں لیکن تاہم ستی کی رسم کو بعض اچ پیچ کے طریقوں سے روکتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی عورت بغیر اجازت اپنے صوبہ کے حاکم کے ستی نہیں ہو سکتی اور صوبہ دار ہرگز اجازت نہیں دیتا جب تک کہ قطعی طور پر اس امر کا یقین نہیں ہو جاتا کہ وہ اپنے ارادہ سے ہرگز باز نہ آئے گی۔ صوبہ دار بیوہ کو بحث مباحثہ سے سمجھاتا ہے اور بہت سے وعدے وعید کرتا ہے اور اگر اس کی فہمائش اور تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو کبھی ایسا بھی کرتا ہے کہ اپنی محل سرا میں بھیج دیتا ہے تاکہ بیگمات بھی اس کو اپنے طور پر سمجھائیں مگر باوجود ان سب

امور کے ستی کی تعداد اب بھی بہت ہے۔ خصوصاً ان راجاؤں کے علاقوں اور عمل داریوں میں جہاں کوئی مسلمان صوبہ دار متعین نہیں ہے۔ لیکن ہر ایک عورت کے واقعات کے بیان سے جن کو میں نے بچشم خود ستی ہوتے دیکھا ہے، میں آپ کی تصدیع افزائی اور سمع خراشی نہ کروں گا۔ بلکہ منجملہ ان کے صرف دو تین صدموں ہی کا بیان کروں گا اور ان میں بھی مفصل حالات صرف ایک ہی عورت کے لکھوں گا جس کو ستی ہونے کے مستقل اور خوفناک ارادہ سے روکنے کے واسطے میں بھیجا گیا تھا۔

ایک عورت کا ذِکر جس کو مصنف نے سمجھا بجھا کر ستی ہونے سے روکا

بندی داس نامی میرا ایک دوست تھا جو دانشمند خاں کا میر منشی تھا۔ وہ تپ دق کی بیماری سے جس کا معالجہ میں نے دو برس سے کچھ زیادہ عرصہ تک کیا تھا مر گیا اور اسی وقت اس کی زوجہ نے اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہونے کا ارادہ کر لیا۔ اس کے رشتہ دار میرے آقا کے نوکر تھے اور ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس کو اس دیوانگی کی حرکت سے باز رکھیں۔ چنانچہ انہوں نے اسے سمجھایا کہ اگرچہ تمہارا یہ قصد پسندیدہ اور باعثِ عزت اور خوشنودی خاندان اور سراسر لائقِ تحسین اور ہمت کا کام ہے لیکن تم کو یہ خیال کرنا چاہئے کہ تمہارے بچے کم عمر ہیں اور ان کو چھوڑنا نہایت بے رحمی ہے اور تم کو اپنے فرزندوں کی بہبودی کا فکر، اس محبت سے جو تم اپنے متوفی شوہر کی نسبت رکھتی ہو، بہت زیادہ ہونا چاہئے۔ اس بے وقوف اور دیوانی عورت نے جب ان کی فہمائش کو کسی طرح نہ مانا تو انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ چل کر سمجھائیں۔ چونکہ ہمارے آقا کی بھی یہی مرضی تھی اور اس خاندان سے میری دیر سے دوستی تھی اس لئے میں اس کے پاس گیا۔ جب مکان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سات آٹھ بد صورت بوڑھی عورتیں اور چار پانچ مسن اور ضعیف العقل برہمن لاش کے ارد گرد جمع ہیں اور یہ سب عورتیں باری باری بڑے شور و فغاں اور آہ و زاری سے روتی اور بڑے زور سے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیٹتی ہیں۔ یہ عورت لاش کے پائینتی بیٹھی تھی اور بال کھلے ہوئے تھے اور چہرہ زرد ہو رہا تھا مگر آنکھوں میں آنسو نہ تھا۔ لیکن جب حاضرینِ مجلس کی طرح وہ بھی بہت زور سے چلا کر رونے لگی تو آنکھیں لال انگارا ہو گئیں۔ اور باتفاق اس خوفناک گروہ کے اپنی باری پر وہ بھی پیٹتی رہی۔ جب یہ رونا پیٹنا فرو ہوا تو میں اس کم بخت گروہ کے قریب گیا اور آہستگی اور نرمی کے ساتھ اس بیوہ سے کہا کہ

میں دانشمند خاں کے حکم سے تمہیں اطلاع دینے آیا ہوں کہ نواب تمہارے دونوں بیٹوں کے واسطے دو دو کراؤن یعنی پانچ پانچ روپے ماہواری کا وظیفہ جاری رکھے گا بشرطیکہ تم اپنی جان تلف نہ کرو۔ کیونکہ تمہارا جیتا رہنا تمہارے بچوں کی خبر گیری اور تربیت کے واسطے از بس ضرور ہے اور تم کو خوب معلوم ہے کہ ہم بہت طرح سے تمہارا چتا پر بیٹھنا اور ستی ہونا روک سکتے ہیں اور ان لوگوں کو جو تمہیں اس نامعقول بات کی جرأت دلاتے ہیں، سزا دے سکتے ہیں۔ تمہارے سب عزیز واقارب تمہاری اولاد کی زندگی کی خاطر تمہارا زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اس حالت میں تم پر کم ہمتی کا الزام اور وہ بدنامی بھی عاید نہ ہوگی جو ایک ایسی عورت کی نسبت عاید ہو سکتی ہے جو باوجود اولاد نہ ہونے کے اپنے مالک کے ساتھ ستی ہونے کی جرأت نہ کرے۔ اور میں نے کئی بار اس تقریر کو دوہرایا لیکن اس نے مطلق جواب نہ دیا۔ آخر کار بڑے استقلال سے آنکھ ملا کر یوں بولی کہ "خیر اگر میں ستی ہونے نہ پاؤں گی تو دیوار سے سر پھوڑ کر مر جاؤں گی" یہ سن کر میں نے اپنے دل میں ذرا سوچا اور پھر نہایت غصہ سے پکار کر کہا کہ کیا تیرے سر پر کوئی بھوت چڑھا ہے! بہت اچھا ستی ہو جا! لیکن اے بدبخت بے رحم پہلے اپنے بچوں کے گلے کاٹ کر ان کو اسی چتا پر جلا دے کیونکہ ہم کو یہ ہرگز گوارا نہیں ہے کہ تو تو ستی ہو کر اس دنیا سے چل دے اور ان کو بھوکا مرنے کو پیچھے چھوڑ جائے اور میں ابھی دانشمند خاں کے پاس جاتا ہوں اور تیرے لڑکوں کا وظیفہ منسوخ کراتا ہوں۔ میرے اس مستقل طور پر بلند آواز سے کہنے کا یہ اثر ہوا کہ وہ چپ ہو گئی اور فوراً سر جھکا کر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ پھر تو وہ بوڑھی عورتیں اور برہمن بھی دروازے کی طرف کھسک گئے اور یہ دیکھ کر مجھے مناسب معلوم ہوا کہ اب اس کو اس کے رشتہ داروں کے سپرد کر کے جو میرے ساتھ آئے تھے، وہاں سے چل دوں۔ چنانچہ میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے گھر کو چلا آیا۔ شام کے وقت جب کہ میں دانشمند خاں کے پاس اس حال کی اطلاع کرنے کو جاتا تھا، راستہ میں اس کا ایک رشتہ دار ملا اور بعد ادائے شکر بولا کہ اس کے شوہر کی لاش بغیر اس کے جلائی گئی اور اس نے اپنی جان نہیں گنوائی۔

مصنف کا ایک بی بی اور اس کی پانچ لونڈیوں کو اکٹھے ستی ہوتے دیکھنا

اب ان عورتوں کا حال سنئے جو فی الواقع جل مرتی ہیں۔ میں نے یہ اندوہناک واقعے اتنی مرتبہ دیکھے ہیں کہ آئندہ ستی کے کسی اور واقعہ کے دیکھنے کا حوصلہ نہیں رہا اور نہ اس کا

اعادہ عبرت اور نفرت سے خالی ہے۔ بہر حال جو کچھ میری آنکھوں کے سامنے گزرا ہے حتی الامکان اس کا بیان کرتا ہوں (۲۴۶)۔ لیکن مجھ کو یہ توقع نہیں ہے کہ ان ستی ہونے والی دیوانی عورتوں کی جرأت اور بے دھڑک جان کھونے کا بیان ٹھیک کر سکوں۔ جو جو کچھ اس پُر اندوہ اور خوفناک اور بد انجام رسم میں ہوتا ہے، غالب ہے کہ بے دیکھے کوئی بھی اس کو سچ نہ جانے گا۔ جب میں احمد آباد سے راجستان ہو کر آگرہ کو جاتا تھا اور ہمارا قافلہ دو پہر کاٹنے کو ایک قصبہ میں سایہ تلے ٹھہرا ہوا تھا، میں نے سنا کہ ابھی ایک عورت اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہوا چاہتی ہے۔ پس میں فوراً دوڑا ہوا وہاں گیا اور دیکھا کہ ایک بڑے تالاب میں جو بجز تھوڑی جگہ کے زیادہ تر خشک پڑا تھا ایک بڑا گڑھا لکڑیوں سے بھرا ہوا ہے اور اس پر مردے کی لاش رکھی ہوئی ہے اور اسی پر ایک عورت بیٹھی ہے اور چار پانچ برہمن اس کو ہر طرف سے آگ لگا رہے ہیں اور پانچ ادھیڑ عورتیں کسی قدر اچھی پوشاکیں پہنے ایک دوسری کا ہاتھ پکڑے چتا کے گرداگرد ناچتی گاتی ہیں اور بہت سے زن و مرد یہ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ چتا جس پر بہت سا گھی اور تیل ڈالا گیا تھا، جلد بھڑک اٹھی اور عورت کے کپڑوں کو جن پر عطر اور زعفران وغیرہ چھڑکا ہوا تھا، آگ لگ گئی۔ مگر میں نے کوئی علامت دکھ درد یا گھبراہٹ کی اس میں نہ دیکھی اور کہتے ہیں کہ اس نے بڑے یقینی طور پر پانچ اور دو کا لفظ کہا جس کا یہ مطلب تھا کہ یہ پانچویں دفعہ ہے کہ میں اپنے اسی خاوند کے ساتھ ستی ہوئی ہوں اور اب صرف دو دفعہ اور ستی ہونا باقی ہے۔ پھر میں تناسخ (اواگون) کے مسئلہ کے موافق ”مکتی“ کو پہنچ جاؤں گی یعنی پیدا ہونے اور مرنے سے چھوٹ جاؤں گی اور یہ لفظ اس نے اس طرح سے کہے کہ گویا اس کے اس اخیر وقت میں کسی اوتار یا رشی کی روح نے اس میں حلول کیا ہے۔ لیکن ابھی اس دوزخیانہ طور پر جان کھونے کی واردات کی ابتدا ہی تھی اور میں نے یہ سمجھ رکھا کہ وہ پانچ گانے والی عورتیں بجز ایک امر رسمی کے کسی خاص مطلب کے لئے نہ ہوں گی۔ مگر جب میں نے یہ دیکھا کہ ان میں سے بھی جب ایک عورت کے کپڑوں تک آگ پہنچ گئی تو اس نے بھی اپنے تئیں سر کے بل اس آتشیں گڑھے میں گرا دیا اور اسی طرح جب ایک دوسری کے کپڑے جلنے لگے اس نے بھی اس دہشت ناک حرکت کی تقلید کی اور اسی طرح باری باری وہ تینوں عورتیں بھی جو ایک دوسری کا ہاتھ پکڑے کمال بے فکری اور آرام سے ناچ رہی تھیں، میرے دیکھتے ہی دیکھتے آگ میں کود کر جل مریں۔ تب تو مجھ پر سخت حیرت طاری ہوئی۔ مگر اب مجھ کو ایک شخص کے ساتھ کئی عورتوں کے

ستی ہونے کا مطلب بھی جلد معلوم ہو گیا یعنی یہ کہ یہ پانچوں عورتیں لونڈیاں تھیں اور جب ان کی بی بی کا مالک مرض الموت میں مبتلا تھا انہوں نے اس بی بی کی جانب سے اپنے شوہر کی نسبت کامل محبت دیکھی تھی جس نے اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ تمہارے بعد میں بھی زندہ نہ رہوں گی۔ پس یہ لونڈیاں بھی جو الفت سے اس قدر مغلوب ہوئیں کہ انہوں نے بھی اپنا مرنا ٹھان لیا اور اسی آگ میں جل مریں جس میں ان کی پیاری بی بی ستی ہوئی تھی۔

ستی ہونا محبت کے سبب سے نہیں بلکہ ایک خاص طور کی تعلیم و تلقین کا نتیجہ ہے

بہت سے لوگ جن سے میں نے اس وقت ستی ہونے کی نسبت گفتگو کی، مجھ کو اس بات پر یقین لانے کی جانب مائل کرتے رہے کہ ہندوستان کی عورتوں کے ستی ہونے کا سبب اپنے خاوندوں کے ساتھ شدتِ محبت ہے۔ لیکن مجھے جلد معلوم ہو گیا کہ اس مکروہ رسم کا باعث صرف ایک قسم کے تعصب اور توہم کا اثر ہے جو لڑکپن ہی سے لڑکیوں کے دلوں میں جمایا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ ایک عمیق جڑ پکڑ گیا ہے۔ کیونکہ ہر ایک لڑکی کو اس کی ماں یہ تعلیم کرتی رہتی ہے کہ عورت کی پارسائی اور تعریف اسی میں ہے کہ اپنے پتی کے ساتھ ستی ہو جائے اور پتی برتا عورتوں کا یہ ہی طریق ہے کہ اس مقررہ رسم سے ہرگز منہ نہ موڑیں۔ علاوہ بریں مرد بھی عورتوں کو یہی عقیدے ہمیشہ تعلیم کرتے رہتے ہیں تاکہ عورتوں کی توجہ اپنے مالکوں کی اطاعت اور تیمارداری میں مشغول رہنے کے واسطے بآسانی حاصل ہو اور اس طرح پر عورتوں کی طرح سے مالکوں کو زہر وغیرہ دے دینے کا ڈر بھی نہیں رہتا۔

بدکاری کی وجہ سے ایک عورت کا اوّل اپنے خاوند کو ہلاک کرنا اور پھر ایک عجیب طور سے ستی ہونا

اب میں ایک نہایت عجیب اور زیادہ تر ہولناک واقعہ کا بیان کرتا ہوں۔ اگرچہ واقعی یہ حادثہ میرا چشم دیدہ نہیں ہے۔ مگر اس نظر سے انتخاب کیا گیا ہے کہ جس قدر ستی کے واقعات میں نے دیکھے ہیں یہ واقعہ بلحاظ اپنی خصوصیات کے ان سب سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اگرچہ ایسے بہت سے معاملات ہیں کہ باوجودیکہ میں نے خود دیکھے ہیں مگر میں ان پر

اعتماد اور یقین نہیں کرتا لیکن آپ کو یا مجھے یہ نہیں چاہئے کہ اس حکایت کو صرف اس وجہ سے نامعتبر تصور کرلیں کہ اس میں ایک خاص طور کا انوکھا پن ہے۔ ہندوستان میں یہ قصہ ہزاروں آدمیوں کی زبان پر ہے اور عموماً صحیح خیال کیا جاتا ہے اور شاید کہ اب تک یورپ میں بھی پہنچ گیا ہو۔ چنانچہ وہ قصہ یہ ہے کہ ایک عورت کچھ مدت سے ایک نوجوان مسلمان درزی کے ساتھ جو اس کا ہمسایہ تھا اور طنبورہ بجایا کرتا تھا ناجائز لگاؤ رکھتی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو زہر دے دیا اور اس سے جاکر کہا کہ اب اپنے وعدہ کے موافق مجھ سے نکاح کرلو اور جھٹ پٹ کہیں کو نکل چلو۔ کیونکہ اگر ذرا بھی دیر ہوگی تو مجھے بسبب دنیا کی لاج کے مجبوراً اپنے خصم کے ساتھ ستی ہونا پڑے گا' مگر جب اس جوان نے اس امر کو مشکل اور خطرناک سمجھ کر انکار کردیا تو یہ عورت بغیر کسی طرح کے اضطراب اور تردّد کے فوراً اپنے خویش واقارب کے پاس گئی اور ان سے کہا کہ میرا خاوند ناگہانی موت سے مر گیا ہے اور میرا مصمم ارادہ ستی ہونے کا ہے۔ وہ لوگ اس کے اس بلند ہمت ارادہ سے جو باعثِ افتخارِ خاندان تھا، بہت خوش ہوئے اور چتا تیار کر کے لاش کو اس پر رکھ دیا اور آگ لگا دی۔ جب سب تیاری ہوچکی تو وہ چتا کے گرد اس غرض سے پھرنے لگی کہ گلے مل کر اپنے خویش واقربا اور ... ایوں وغیرہ سے رخصت ہو۔ اتفاقاً ان لوگوں میں وہ مسلمان طنبورہ نواز بھی کھڑا تھا جو اور سازندوں کے ساتھ جو ملک کی رسم کے موافق ستی کے سامنے باجے بجاتے ہیں، بلایا ہوا آیا تھا۔ پس جونہی یہ عورت اس کے قریب پہنچی تو غصہ سے آگ بھبوکا ہو کر آخری رخصت کے بہانہ سے اس کا گریبان اس شدت اور زور سے پکڑا کہ کسی طرح چھڑا نہ سکا اور کھینچ کر اپنے ساتھ چتا میں لے گری اور اس طرح پر اس جھوٹے عاشق سے اپنا بدلہ لے لیا۔ (۲۴۷)

مصنف کا شہر سورت میں ایک عورت کو عجیب استقلال سے ستی ہوتے دیکھنا

سورت سے ایران کو آتے ہوئے میں نے ایک اور بیوہ کے ستی ہونے کی کیفیت دیکھی۔ اس وقت کئی یورپین بھی یعنی انگریز اور ڈچ اور شہر پیرس کے رہنے والے چارڈن صاحب بھی موجود تھے۔ یہ عورت عمر کی ادھیڑ اور اچھی خاصی صورت دار تھی۔ مگر میری زبان میں یہ طاقت کہاں جو اس کی وہ حیوانوں کی سی جرأت اور دلیری اور وہ وحشیانہ چاؤ جو اس وقت اس کے چہرہ سے عیاں تھا اور اس کا وہ بے دھڑک چتا کی طرف آنا اور بڑے استقلال

اور دل جمعی کے ساتھ لوگوں سے بات چیت کرنا اور اپنے تئیں اشنان کرانے کی اجازت دینا اور بڑے اطمینان اور نہایت بے پروائی سے ہماری طرف دیکھنا اور ہر قسم کے رنج و فکر سے آزاد اور آرام کی حالت میں ہونا اور اس کا وہ بلند ہمتی کا طور و طریق اور بغیر کسی قسم کی گھبراہٹ اور پریشانی کے اپنی "گپھا" کو جو گھانس پھونس اور پتلی پتلی لکڑیوں کو اوپر نیچے چن کر چتا پر بنا لی گئی تھی دیکھ بھال کرنا اور پھر شوہر کا سر گود میں لے کر اس میں بیٹھنا اور ایک مشعل لے کر خود اپنے ہاتھ سے اس میں اندر کی طرف سے آگ لگانا اور پھر نہ معلوم کتنے برہموں کا باہر کی طرف سے اس کو جلانا ٹھیک بیان کر سکوں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو اپنے بیان سے اس دردناک واقعہ کی کیفیتوں کا کامل خاکہ ہی آپ کے سامنے کھینچ سکتا ہوں اور نہ اس حالت ہی کا کچھ بیان کر سکتا ہوں جو اس حادثہ کو دیکھتے وقت میرے دل پر گزری اور یہ ہیبت ناک واقعہ اب تک مجھے ایسا یاد ہے کہ گویا میری آنکھوں کے آگے ہے۔ اور شدت اندوہ سے اگرچہ چاہتا ہوں کہ خواب و خیال کی طرح اسے بھلا دوں مگر ہرگز نہیں بھولتا۔

ستی کے چند واقعات کا بیان جن میں عورتوں کو جبراً جلایا گیا

میں نے چند ایسی بدنصیب بیواؤں کی مصیبت بھی دیکھی ہے جو چتا کی شکل دیکھتے ہی بھاگنے لگی تھیں اور اس حالت کو دیکھ کر میرے دل کو بالکل یقین تھا کہ اگر یہ بے درد برہمن ستی ہونے سے انکار کر دینے کی اجازت دیں تو وہ خوشی تمام اس سے رُک جائیں۔ مگر یہ کم بخت ان خوف زدہ اور اجل گرفتہ عورتوں کو ستی ہو جانے کی خاطر صرف ترغیبیں اور بڑھاوے ہی نہیں دیتے بلکہ ان کو زبردستی آگ میں ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ میرے سامنے ایک غریب جوان عورت اسی طرح زبردستی آگ میں ڈال دی گئی تھی۔ اسی طرح میں نے ایک اور بے چاری بدنصیب عورت کو دیکھا کہ اس کے اردگرد جب آگ بھڑکنے لگی تو اس نے نکل بھاگنا چاہا۔ مگر ان دیو سیرت جلادوں کے لمبے لمبے بانسوں کے مارے نکل نہ سکی۔

جو عورتیں چتا میں سے بھاگ نکلتی ہیں وہ پھر ہندوؤں میں شامل نہیں ہو سکتیں اور خاکروبوں کے ساتھ رہ کر زندگی بسر کرتی ہیں

لیکن یہ عورتیں ان خونی برہموں کی آنکھ سے کبھی بچ کر نکل بھی جاتی ہیں۔ چنانچہ

میری ایک حسین عورت کے پاس اکثر آمد و رفت رہتی تھی جس نے خاکروبوں کی مدد سے اپنی جان بچائی تھی۔ یہ لوگ جب سنتے ہیں کہ ستی ہونے والی جوان اور حسین عورت ہے اور اس کے گھر والے چنداں نامی اور ذی مقدور نہیں ہیں اور صرف گنتی کے آدمی اڑوسی پڑوسی اس کے ساتھ ہوں گے تو وہاں بکثرت جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو عورت مرگ کا یہ سامان دیکھ کر اس طرح پر ہمت ہار دیتی ہے اور ان لوگوں کی مدد سے اس بن آئی موت سے بچ نکلتی ہے تو یہ امید وہ ہرگز نہیں کر سکتی کہ اپنی زندگی کے باقی دن فارغ البالی سے کاٹے گی یا ہندو لوگ اس کے ساتھ عزت اور محبت سے برتاؤ کریں گے۔ بلکہ وہ پھر کبھی ان میں نہیں مل سکتی اور کوئی ہندو کسی وقت اور کسی حالت میں بھی اس عورت سے جس نے اپنے تئیں اس طرح بے عزت کر ڈالا ہو، ہرگز میل جول نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ پرلے سرے کی بدنام اور مطعون ہو جاتی ہے اور عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی اس حرکت نے ہندو دھرم کو کلنک لگا دیا۔ اس لئے وہ ہمیشہ انہی اپنے ذلیل اور کمینے نئے محافظوں کی بدسلوکیاں سہتی اور زندگی کے دن پورے کرتی ہیں۔

جو عورت ستی ہونا نہ چاہے مغل اس کو پناہ نہیں دیتے مگر پرتگیز پناہ دیتے ہیں

جب کوئی ستی چتا پر جا پہنچے تو کسی مغل کو یہ جرأت نہیں ہوتی کہ اس کی جان بچائے یا کہ جب وہ برہمنوں کے پنجے میں سے بھاگ نکلی ہو اس کو پناہ دینے کا جوکھم اٹھائے۔ کیونکہ ایسا کام کرتے ہوئے یہ لوگ ڈرتے ہیں۔ البتہ پرتگیزوں نے بندرگاہوں میں، جہاں ان کا زور زیادہ تھا، بہت سی بیواؤں کو بچا لیا ہے۔

مصنف کا ایک کم سن لڑکی کو زبردستی جلائے جاتے دیکھنا

میں کچھ بیان نہیں کر سکتا کہ ان حرکات کو دیکھ کر غصہ کے مارے میری طبیعت کا کیا حال ہوتا تھا اور میں کس جوش سے چاہتا تھا کہ کوئی قابو ان کمبخت برہمنوں کے استیصال کا ہاتھ لگے۔ چنانچہ لاہور میں میں نے ایک نہایت خوبصورت کم سن بیوہ کو ستی ہوتے دیکھا۔ جس کی عمر بارہ برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ یہ بد نصیب لڑکی جب چتا کے پاس آئی تو خوف کے مارے اس پر مردنی چھا گئی اور میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کس طرح کانپتی اور بلک بلک کر روتی تھی۔ لیکن تین برہمنوں اور ایک بڑھیا نے جس نے اسے گود میں لے رکھا تھا، زبردستی اسے چتا پر بٹھا ہی دیا اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے تاکہ بھاگنے نہ پائے اور اس طرح

پر اس بے چاری معصوم کو جلا کر خاک کر دیا۔ اس وقت کچھ نہ پوچھئے کہ غصہ کے مارے میرا کیا حال تھا اور میں نے کس طرح سے اپنے تئیں تھاما۔ لیکن چونکہ کچھ بس نہ تھا ، ناچار دل ہی دل میں کڑھتا تھا کہ ہائے غضب یہ لوگ کیسے قابلِ نفرت توہمات میں گرفتار ہیں اور میں نے شاعر کے یہ اشعار جو اس نے ایگے مم نن کی بیٹی افجینیا (۲۴۸) کے باب میں کہے تھے ، جس کو اس کے باپ نے ڈاینا پر قربانی چڑھایا تھا ، ان کے حسبِ حال پائے۔

خلاصہ معنی اشعار لاطینی

"ایسی چیزوں کے نیست و نابود کر دینے میں بھی جو خوبصورت اور اچھی تھیں بعض اوقات مذہب نے بڑے بڑے بد کام کئے ہیں۔ چنانچہ بے چاری نوجوان اف یانا سا (یعنی افجینیا) کو کس بے دردی سے ڈاینا کی قربان گاہ پر قربانی کرنے کو بٹھا دیا تھا۔ افسوس! یہ مذہب انسان سے کیسے بد کام کرا دیتا ہے"۔

زندہ جلا دینے کے عوض کبھی زندہ زمین میں گاڑ دیتے ہیں

میں نے ابھی پورا ذِکر ان کی وحشت اور سنگدلی کا نہیں کیا۔ کیونکہ ہندوستان کے بعض حصوں میں تو یہ غضب ڈھاتے ہیں کہ جلا کر ستی کر دینے کے عوض عورت کو اول رفتہ رفتہ گردن تک زمین میں گاڑ دیتے ہیں اور پھر دو تین برہمن یکایک آ کر اس کی منڈیا مروڑ ڈالتے ہیں اور جب دم نکل جاتا ہے تو مٹی کی ٹوکریاں ڈال کر پاؤں سے دبا دیتے ہیں۔

ہندو اپنے مردوں سے کیا سلوک کرتے ہیں

داغ دے کر لاش کو دریا میں بہا دینے کی رسم کا ذِکر

اکثر تو یہی دستور ہے کہ ہندو اپنے مردوں کو جلاتے ہیں۔ مگر بعض ایسا بھی کرتے ہیں کہ دریا کے کنارے مردے کے کسی عضو کو گھاس پھوس سے جھلس کر ایک اونچے اور سیدھے کنارہ سے پانی میں دھکیل دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اس داغ دے کر بہا دینے کی رسم کو گنگا کے کنارے کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ لاش کے ادھر ادھر چیلوں اور کووں کی ٹکڑیاں

کی ٹکڑیاں منڈلاتی رہتی ہیں اور یہ پرندے اور دریا کی مچھلیاں اور مگرمچھ ان سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔

قریب المرگ بیمار کو بتدریج دریا میں ڈبو دینے کی رسم کا بیان

بعض ایسا بھی کرتے ہیں کہ قریب المرگ بیمار کو دریا کے کنارے لے آتے ہیں اور اس کے پاؤں پانی میں رکھ کر بتدریج اس کو گردن تک ڈبوتے ہیں اور جب سمجھ لیتے ہیں کہ اب مرنے ہی کو ہے تو سارا بدن ڈبو دیتے ہیں اور اس کو وہیں چھوڑ کر اور رو پیٹ کر چلے آتے ہیں۔ اس رسم کا، جس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، یہ مدعا ہے کہ اس طرح پر تمام گناہ، جن سے مردہ کی روح اپنے جسمانی تعلق کے وقت ناپاک ہو رہی تھی، دھوئے جاتے ہیں۔ یہ بے معنی خیال عام لوگوں ہی پر منحصر نہیں بلکہ میں نے بڑے بڑے مشہور پڑھے لکھے شخصوں کو بڑے زور شور سے اس کی تائید کرتے سنا ہے۔

ہندو فقیروں کا حال

گرو یا مہنت کا ہونا ضروری ہے

ہندوستان کے فقیروں اور درویشوں میں، جو بے شمار اور طرح طرح کے ہیں اور ہندوؤں کے مذہبی فرقوں میں بہت سے ڈیرے اور اکھاڑے ہوتے ہیں جن میں ایک ایک گرو یا مہنت ہوتا ہے جس کے سامنے اس کے چیلوں سے یہ عہد و پیمان لئے جاتے ہیں کہ پارسائی اور ترکِ دنیا اور عاجزی سے گرو کی اطاعت میں رہ کر زندگی بسر کریں۔

ہندو فقیر خصوصاً جوگی خوفناک اور غیر طبعی طور سے زندگی بسر کرتے ہیں

یہ لوگ ایسے عجیب طور پر عمر بسر کرتے ہیں کہ اگر میں اس کو بیان کروں مجھے شک ہے کہ آیا اس پر کوئی اعتبار بھی کرے گا۔ خصوصاً میرا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو جوگی کہلاتے ہیں اور جس کے معنی ہیں خدا سے ملا ہوا۔ بہت سے جوگی بالکل ننگے رات دن اکثر تو تالابوں کے پاس بڑے بڑے درختوں کے نیچے یا مندروں کے اردگرد کے مکانوں میں راکھ کا بستر کئے بیٹھے یا پڑے رہتے ہیں۔ بعض کی جٹیں پنڈلیوں تک لٹکتی ہیں اور الجھ کر ان میں اس طرح گرہیں پڑ جاتی ہیں جس طرح پر کہ ہمارے ملک کے پشمی کتوں کے بالوں

میں۔ خصوصاً جن کو وہ آزار ہو جس کو پولش ڈزیز کہتے ہیں، پڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ بہت سے جوگی ایک یا دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے رکھتے ہیں، ناخنوں کو اس قدر بڑھاتے ہیں کہ بڑھ کر مڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص کے ناخن میری چھنگلیا کے نصف سے، جس سے میں نے ان کو ناپا تھا، زیادہ تھے۔ ان کے بازو ایسی سخت اور غیر طبعی ریاضت کی حالت میں کافی غذا نہ پہنچنے کے سبب ان لوگوں کی طرح جو مزمن بیماریوں میں مبتلا رہ کر مر جاتے ہیں، سوکھ کر نہایت دبلے پتلے ہو جاتے ہیں اور رگوں اور پٹھوں کے خشک اور سخت ہو جانے کے باعث اس قابل نہیں رہتے کہ جھکا کر ان سے کچھ منہ میں ڈال سکیں۔ ان فقیروں کے پاس ان کے چیلے حاضر رہتے ہیں جو ان کو نہایت ہی مہاتما سمجھ کر ان کا بڑا ادب کرتے ہیں۔ جوگیوں کا ننگا اور کالا جسم لمبے لمبے بال دبلی اور پتلی پتلی باہیں اور بل کھائے ہوئے ناخن اور وہ ڈراؤنی وضع جو میں نے بیان کی ہے، اس عالم سفلی میں اس سے زیادہ مقہور شکل خیال میں نہیں آ سکتی۔

ننگے فقیروں اور ان کی نسبت لوگوں کی خوش اعتقادی کا ذِکر

میں نے عموماً بعض بعض راجاؤں کے راج میں ان ننگے فقیروں کی اکثر ٹولیاں کی ٹولیاں دیکھی ہیں جن کے دیکھنے سے ڈر لگتا ہے۔ بعض کے تو ہاتھ (جیسے کہ اوپر بیان ہو چکا ہے) اوپر کو اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں، بعض کے دہشت ناک بال یا تو کھلے لٹکتے ہیں یا سر کے گرد بندھے ہوئے اور بل دیئے ہوئے ہوتے ہیں، بعض کے پاس ایک بڑا بھاری سونٹا ہوتا ہے اور بعض کے کاندھے پر شیر کی خشک اور ناملائم کھال ڈالی ہوئی ہوتی ہے۔ اور اس دھج سے میں نے ان کو سخت بے حیائی کی حالت میں بالکل ننگے بڑے بڑے شہروں میں پھرتے دیکھا ہے۔

اور جیسے ہمارے فرانس کے گلی کوچوں میں کسی راہب کو پھرتے دیکھ کر کوئی خیال بھی نہیں کرتا ویسے ہی یہاں مرد عورتیں اور لڑکیاں ان کو کچھ تعجب کی نگاہ سے نہیں دیکھتیں بلکہ عورتیں بڑے اعتقاد سے ان کو خیرات لا کر دیتی ہیں اور ان کو یہ یقین ہے کہ یہ لوگ بڑے ہی مقدس اور سب سے زیادہ پارسا اور نفس کو قابو میں رکھنے والے ہیں۔

مشہور و معروف سرمد کا ذِکر

میں دیر تک سرمد نام ایک مشہور فقیر سے جو دہلی کے بازاروں اور گلی کوچوں میں

ننگا مادر زاد پھرا کرتا تھا، نفرت کرتا رہا۔ اس نے نہ تو اورنگ زیب کی دھمکیوں ہی کو مانا اور نہ اس کے وعدوں ہی کو اور آخر اسی وجہ سے کہ اس نے کپڑے پہننے سے بڑی ضد کے ساتھ بالکل انکار ہی رکھا اس کا سر اتارا گیا۔ (۲۴۹)

ہندو فقیروں کی عبادت اور ریاضت کے بعض سخت اور غیر طبعی طریقوں کا ذِکر اور اس کی نسبت مصنف کے ابتدائی خیالات

بہت سے فقیر لمبی لمبی تیر تھ یاترا کرتے ہیں اور اس موقع پر وہ صرف ننگے ہی نہیں ہوتے بلکہ بڑی بڑی لوہے کی زنجیروں سے، جیسی کہ ہاتھیوں کے پاؤں میں پڑی ہوئی ہوتی ہیں، لدے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں نے بہت سے فقیروں کو دیکھا ہے کہ جو کسی خاص تپسیا کی خاطر سات آٹھ روز تک بغیر اس کے کہ کبھی بیٹھ جائیں یا پڑ جائیں سیدھے کھڑے رہتے ہیں اور بجز اس کے کہ رات کے وقت چند گھنٹے ایک طناب کے سہارے آگے کو جھک جائیں اور کوئی سہارا نہیں لیتے اور اس عرصہ میں ان کی پنڈلیاں سوج کر رانوں کے برابر ہو جاتی ہیں۔ بعض کو میں نے دیکھا کہ گھنٹوں ہاتھوں کے بل سر نیچے اور پاؤں اوپر بڑے استقلال سے کھڑے رہتے ہیں!

میں ایسی ہی اور بہت سی حالتوں کے نام لے سکتا ہوں جن میں کہ یہ بے نصیب لوگ اپنے جسم کو بے فائدہ دکھ دیتے ہیں۔ ان میں سے بہت سی صورتیں تو ایسی سخت اور مشکل ہیں کہ ہمارے ملک کے نٹ بھی ان کی تقلید نہیں کر سکتے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تمام باتیں تقویٰ اور دین داری کے ایک مفروضہ خیال سے کی جاتی ہیں۔ حالانکہ ہندوستان کے کسی حصہ میں بھی تقویٰ اور دینداری نے اپنا سایہ تک نہیں ڈالا۔

جب میں پہلے پہل ہندوستان میں آیا تو ان لوگوں کے یہ بے حد توہمات دیکھ کر حیران رہ گیا اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان کی نسبت کیا رائے قائم کروں۔ بعض اوقات تو میں اس خیال کی طرف مائل ہوتا تھا کہ یہ فقیر اگر حکمائے قدیم یونان کے اس پرانے اور بدنام فرقہ کے، جن کا نام "سے نکس" (۲۵۰) (یعنی کلبیئین) تھا، بانی نہیں ہیں تو ان کا بقیہ تو ضرور ہیں۔ بشرطیکہ ان میں حیوانیت اور جہالت کے سوا اور کوئی بات دیکھ پاتا۔ یا اگر مجھے ان میں آدمی کی ظاہری شکل صورت کے سوا کوئی بات انسانیت کی بھی دکھائی دیتی۔ کبھی مجھے یہ خیال گزرتا تھا کہ اگرچہ یہ گمراہ ہیں مگر ہیں سچے فقیر۔ لیکن آخر کار معلوم ہو گیا کہ حقیقت

میں یہ لوگ تقویٰ اور تقدس سے، جہاں تک خیال کیا جائے، بالکل معرا ہیں۔ میں نے پھر یہ خیال کیا کہ آوارہ گردی اور سستی اور مطلق العنانی کی زندگی ان پر قوی اثر رکھتی ہے اور ان کو بھلی معلوم ہوتی ہے یا یہ کہ خود پسندی جو انسان کے ہر کام میں ملی ہوئی ہے اور جو دیو جانس (۲۵۱) کی پھٹی پرانی گدڑی میں ایسی ہی صاف معلوم ہوتی تھی جیسے کہ افلاطون (۲۵۲) کے خوشنما لباس میں ان تمام اعجوبہ کاریوں کی پوشیدہ باعث ہوگی۔

ہندو فقیروں کا نہایت سخت ریاضتیں کرنا اس عقیدہ پر مبنی ہے کہ دوسرے جنم میں اس کا نہایت عمدہ ثمر ملے گا

میں نے سنا ہے کہ یہ فقیر بڑی بڑی سخت تپسیا اس امید پر کرتے ہیں کہ ہم اگلے جنم میں راجہ ہو جائیں گے اور اگر راجہ نہ بھی ہوئے تو ہماری حالت زندگی ایسی تو ضرور ہوگی کہ ہم کو ان سے بھی زیادہ آرام و عیش حاصل ہو۔ لیکن جیسے کہ اکثر ان سے میرا قول تھا یہ کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے کہ اگلی زندگی کی خاطر اس زندگی کو مصیبت سے کاٹا جائے حالانکہ وہ زندگی بھی بالضرور ایسی ہی مختصر اور بے تحقیق ہوگی جیسی کہ یہ زندگی ہے اور جس میں زیادہ آرام اور خوشی ملنے کی امید نہیں کی جا سکتی خواہ کوئی شخص اودے پور کے رانا ہی کے رتبہ کو کیوں نہ پہنچ جائے اور خواہ اس کی حالت ہندوستان کے دو طاقتور راجاؤں جے سنگھ اور جسونت سنگھ ہی کے مشابہ کیوں نہ ہو جائے۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں تو ایسی جلدی تمہارے فریب میں آتا نہیں کیونکہ یا تو تم سخت احمق ہو یا تم کو خراب ارادوں کی تحریک ہے، جن کو تم ہوشیاری کے ساتھ دنیا سے چھپاتے ہو۔

بعض خدا رسیدہ اور کامل جوگیوں کے طرز بود و باش اور مراقبہ اور حالتِ محویت کا بیان اور اس کی نسبت مصنف کی رائے

بعض فقیروں کی نسبت مشہور ہے کہ وہ بڑے روشن ضمیر سنت اور کامل جوگی اور حقیقت میں خدا رسیدہ ہیں اور ان کی نسبت بالکل تارک الدنیا ہونے کا گمان ہے۔ یہ فقیر ہمارے راہبوں کی طرح آبادی سے دور کسی باغ میں تنہا زندگی بسر کرتے ہیں اور شہر میں کبھی نہیں آتے۔ کوئی ان کو بھوجن لا کر دے دے تو لے لیتے ہیں اور اگر نہ لائے تو لوگوں کو یہ خیال ہے کہ بغیر بھوجن کے بھی یہ مہاتما سادھو زندہ رہ سکتے ہیں اور اپنی پہلی فاقہ کشیوں

اور نفس کشیوں کی بدولت یہ خدا کے بھروسہ پر جیتے ہیں۔

یہ مقدس جوگی اکثر مراقبہ میں محو رہتے ہیں۔ ان کا یہ ادعا ہے اور ایک فقیر نے جسے لوگ بہت ہی مانتے تھے خود مجھ سے کہا کہ ہماری روحیں گھنٹوں بے خودی اور استغراق کی حالت میں رہتی ہیں، ہمارے حواس ظاہری معطل ہو جاتے ہیں اور جوگیوں کو خدا کا دیدار حاصل ہوتا ہے جو ایک ناقابل البیان سفید اور چمک دار نور کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے اور ہم کو دنیا کے اُلجھیڑوں سے ایسی نفرت ہو جاتی ہے اور سرور خاص کی حالت میں ہم ایسے محو ہو جاتے ہیں جو قابلِ بیان نہیں اور میرے ان مقدس سنت صاحب نے جو مجھے یہ کیفیت بتا رہے تھے کہا کہ میں جب چاہتا ہوں گھنٹوں ایسی محویت کی حالت میں ہو جاتا ہوں۔

جو لوگ جوگیوں کے پاس آتے جاتے ہیں ان میں سے کسی کو ان لاف و گزاف کے استغراقات کے سچ ہونے میں کلام نہیں۔ مگر میرے خیال میں یہ امر ممکن ہے کہ انسان کا دل ہمیشہ کی تنہائی اور فاقہ کشیوں کی وجہ سے کمزور ہو کر اس قسم کے تخیلات میں پڑ جاتا ہوگا یا ان فقیروں کے یہ استغراقات ان طبعی بے خودیوں کے مشابہ ہوں گے جن کی نسبت کارڈن (۲۵۳) کا قول ہے کہ وہ جب چاہتا تھا اس حالت میں ہو جاتا تھا۔

جوگیوں کے تصور اور دھیان جمانے کے طریقہ کا بیان

یہ خیال اس وجہ سے بالتخصیص قریب القیاس ہے کہ یہ لوگ اپنے ان اشغال میں کسی نہ کسی کرتب کو دخل دیتے ہیں۔ چنانچہ حواس کو بتدریج روکنے کی غرض سے وہ اپنے لئے خاص خاص قاعدے مقرر کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا بیان ہے کہ بہت سے دنوں تک کھانا پینا ترک کرنے کے بعد کسی تخلیہ کی جگہ میں تنہا بیٹھنا اور بڑے استقلال سے نظر کو آسمان کی طرف جمانا چاہئے اور جب کچھ عرصہ تک اس کے عامل ہو جائیں تو پھر دونوں آنکھوں کو بتدریج نیچے کو کریں اور اس طرح پر دھیان جمائیں کہ ایک ہی وقت میں ناک کی پھننگ اور ناک کے دونوں اطراف برابر دکھلائی دینے لگیں اور یہ تصور کا طریق علی الاتصال اس وقت تک جاری رکھنا چاہئے جب تک کہ نور عرفان صاف جلوہ گر ہو جائے۔

یہ تصور اور مراقبہ اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ ہندو جوگیوں اور مسلمان صوفیوں میں ایک بڑی بھاری راز کی بات ہے اور میں اس کو راز اس لئے کہتا ہوں کہ وہ ان باتوں کو

آپس ہی میں پوشیدہ رکھتے ہیں اور ایک ہندو پنڈت کی مدد کے بغیر، جس کو دانشمند خان نے نوکر رکھ لیا تھا اور جو اپنے آقا سے کوئی بات چھپا نہ سکتا تھا، مجھ کو یہ معلومات ہرگز حاصل نہ ہوتیں اور ایک یہ بھی وجہ ہے کہ میرا آقا صوفیوں کے مسائل سے پہلے ہی سے واقف تھا۔

جوگیوں کے درویش صورت دکھائی دینے کی وجہ

ان فقیروں کی صورتیں جو بظاہر درویشانہ نظر آتی ہیں، اس کا بڑا سبب میرے گمان میں یہ ہے کہ ریاضتِ شاقہ اور مدتوں کے برت اور فاقہ کشیاں اور سخت حالتِ افلاس ان کو دیکھنے میں ایسا بنا دیتی ہیں۔

ہندو فقیروں اور ایشیا کے بعض عیسائی فرقوں اور یورپ کے راہبوں کے طریقِ ریاضت کا مقابلہ

ہمارے یورپ کے درویشوں اور راہبوں کو ہرگز یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ ان باتوں میں ہندو جوگیوں یا ممالکِ ایشیا کے اور مذہبی فرقوں سے وہ کبھی فوقیت لے جاسکتے ہیں۔ مثلاً اگر طریقِ عبادت و ریاضت اور روزہ داری وغیرہ میں ارمنی، قبطی، یونانی، نسطوری، جے کوبٹ یعنی یعقوبی اور مے رونٹ عیسائیوں کو بہ نظرِ مقابلہ دیکھا جائے تو ہمارے یورپین زاہد بالکل مبتدی معلوم ہوں گے۔ مگر ہاں اس تجربہ کی رُو سے جو مجھے ہندوستان میں ہوا ہے یہ بات ضرور قابلِ تسلیم ہے کہ جس قدر تکلیف فاقہ اور روزہ رکھنے سے یورپ کے سرد ملکوں میں ہوتی ہے، ہندوستان وغیرہ میں اتنی نہیں معلوم ہوتی۔

مہوس اور شعبدہ باز اور ضمیر بتلانے والے رمتے جوگیوں کا ذکر

اب میں ایسے فقیروں کا ذکر کرتا ہوں جو ان فقیروں سے جن کا بیان اوپر ہو چکا ہے بالکل مختلف ہیں۔ مگر ہیں یہ بھی عجیب لوگ! یہ ہمیشہ تمام ملک میں برابر پھرتے رہتے ہیں اور ہر چیز کو فضول بتلاتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گویا ان کی زندگی کیسی بے فکر بسر ہوتی ہے اور بڑے رازداں ہونے کا ادّعا کرتے ہیں۔ عموماً لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ مقبول شخص سونا بنانا جانتے ہیں اور پارہ کو ایسے عمدہ طور سے تیار کر سکتے ہیں کہ ہر صبح کو ایک دو چاول کے برابر کھانے سے بیمار آدمی تندرست اور توانا ہو جاتا ہے اور معدہ اتنا قوی ہو جاتا

ہے کہ شوق سے جتنا چاہے کھائے اور آسانی سے ہضم ہو جائے اور صرف یہی نہیں ہے بلکہ اس قسم کے دو جوگی جب کہیں آپس میں مل بیٹھتے ہیں اور ان میں تقابل کا جوش پیدا ہوتا ہے تو اپنے فن کی ایسی عجیب عجیب طاقتیں ظاہر کرتے ہیں کہ مجھے شک ہے کہ آیا" سے من میگس" (۲۵۴) بھی باوجود اپنی تمام شعبدہ بازیوں کے، ایسے عجیب کام کر سکتا تھا یا نہیں۔ وہ کسی شخص کے دل کا بھید بتلا دیتے اور گھنٹہ بھر میں درخت کی ایک شاخ کو زمین میں گاڑ کر اس میں پتے اور پھول پھل اگا دیتے ہیں اور پاؤ گھنٹہ سے کم عرصہ میں انڈے کو بغل میں لے کر جو جانور کوئی چاہے وہی پیدا کر دیتے ہیں جو کمرے میں ادھر ادھر اڑنے لگتا ہے اور بہت سے اور ایسے ہی تماشے کرتے ہیں جن کے بیان کی ضرورت نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ لوگ جو کچھ ان شعبدہ بازوں کی نسبت بیان کرتے ہیں میں اس کے سچ ہونے کے باب میں اپنی شہادت نہیں دے سکتا۔ میرے آقا نے ان میں سے ایک کو بلایا اور وعدہ کیا کہ اگر تو کل کو میرے دل کی بات بتلادے گا تو میں تین سو روپے تجھے دوں گا اور اس خیال سے کہ میری طرف سے بے ایمانی کا گمان نہ ہو میں اس بات کو ابھی تیرے روبرو کاغذ پر لکھ دوں گا۔ اسی وقت میں نے بھی یہ کہا کہ اگر تو میرے دل کی بات بتلادے گا پچیس روپے میں بھی نذر کروں گا۔ مگر وہ غیب گو پھر ہمارے مکان کے پاس بھی نہ پھٹکا۔ ایک مرتبہ پھر میں نے ایک شعبدہ باز کو کسی بات پر بیس روپے دینے کا وعدہ کیا مگر میں پھر بھی محروم و مایوس ہی رہا۔ اگرچہ میں ان کی ہر بات کی کنہ کو پہنچنا چاہتا تھا لیکن یہ میری بد قسمتی تھی کہ میں نے کبھی کوئی ایسا عجیب تماشا نہ دیکھا جو سمجھ میں نہ آسکے اور جب میں کسی ایسے تماشے کے ہوتے جا نکلتا تھا، جس کو دیکھ کر لوگ متحیر تھے تو یہ عموماً میری بد قسمتی تھی کہ میں ان سے بہت سے سوال کیا کرتا اور ان کا امتحان کئے جاتا تاوقتیکہ مجھے یقین نہ ہو جاتا کہ اس میں کیا فریب ہے یا کیا ہتھ پھیری ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ایک شخص کا فریب پکڑ لیا تھا، جس نے دعویٰ کیا تھا کہ کٹورا دوڑانے سے میں اس شخص کو بتلا دوں گا جس نے میرے آقا کا روپیہ چرا لیا تھا۔

جین مت کے سادھوؤں اور ان کی ناپارسائی اور غلط فہمی کا ذِکر کہ اپنے فرقہ کے لئے ہم بھی بمنزلہ پادریوں کے ہیں

لیکن بہر حال ایسے فقیر بھی ہیں جو ان فقیروں سے جن کا ہم ذکر کرتے آئے ہیں

بہت چپ چاپ اور شائستہ صورت معلوم ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کا طرز اور طریق عبادت بھی اتنا فضول نہیں ہے۔ یہ ایک دھوتی باندھے ہوئے جوان کے گھٹنوں تک ہوا کرتی ہے اور ایک سفید چادر اوڑھے ہوئے جو دائیں بغل کے نیچے سے ہو کر بائیں کاندھے پر جا گرتی ہے، سر دپا برہنہ گلیوں اور بازاروں میں پھرا کرتے ہیں اور اس کے سوا اور کوئی کپڑا ان کے بدن پر نہیں ہوتا مگر ان کے جسم ہمیشہ دھلے (۲۵۵) ہوئے ہوتے ہیں اور وہ بہر صورت صاف معلوم ہوتے ہیں۔ عموماً وہ بڑے اعتدال کے طریق کے ساتھ دو دو ہو کر پھرتے ہیں اور ہاتھ میں ایک چھوٹا سا خوبصورت مٹی کا پیالہ ہوتا ہے (۲۵۶) جس کے تین پائے اور دو دستے ہوتے ہیں۔ یہ اور فقیروں کی طرح دکان دکان مانگتے نہیں پھرتے بلکہ بے تکلف ہندوؤں کے گھروں میں چلے جاتے ہیں، جہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے اور ان کا آنا گھر والوں کے واسطے موجبِ برکت گنا جاتا ہے۔

ان پاک فقیروں اور گھر کی عورتوں میں جو کچھ حال گزرتا ہے اگرچہ اس کو سب لوگ جانتے ہیں مگر جو کوئی ایسا الزام ان کو لگا دے تو اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ مگر اس بات کو اس ملک کی رسم خیال کیا جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کے تقدس میں کچھ فرق نہیں آتا۔ گھروں کی عورتوں کے ساتھ ان فقیروں کے جو معاملات گزرتے ہیں ان کے بیان پر میں چنداں زور دینا نہیں چاہتا۔ کیونکہ ہم اور آپ سب جانتے ہیں کہ ایسی حرکتیں صرف مغل شہنشاہ ہی کی سلطنت میں نہیں ہوتیں۔ لیکن بڑی ہنسی کی بات حقیقت میں یہ ہے کہ یہ بے ادب ہمارے پادریوں مقیم ہندوستان کے ساتھ اپنا مقابلہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات میں ان کی خود پسندی اور ضعیف العقلی سے خوب اپنا جی بہلا لیا کرتا تھا اور ان سے بڑے خلق اور مدارات سے بولتا۔ اور بظاہر بڑا ادب کرتا تھا۔ چنانچہ فوراً آپس میں ایک دوسرے کی طرف اشارہ کر کے وہ یوں کہنے لگتے تھے "یہ فرنگی جانتا ہے کہ ہم کون ہیں، یہ کئی سال ہندوستان میں رہ چکا ہے اور خوب جانتا ہے کہ ہم ہندوؤں کے پادری ہیں"۔

ہندوؤں کے قوانینِ مذہبی اور علوم و فنون وغیرہ

میں ان فقیروں کا بہت کچھ ذکر کر چکا اور اب مجھے ان کے دھرم شاستر اور اور

علوم کی پوتھیوں کا ذکر کرنا چاہیے۔ اگرچہ میں زبان سنسکرت سے جو اب ہندوستان کے خاص پنڈتوں اور غالباً قدیم زمانہ کے کل بوہموں کی عام زبان تھی، ناآشنا ہوں اور باوجود اس کے سنسکرت کی پوتھیوں کا ذکر کرتا ہوں تو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ میرے آقا دانشمند خاں نے کچھ تو میری درخواست سے اور کچھ اپنے شوق کی خاطر ہندوستان کے ایک مشہور پنڈت کو نوکر رکھ لیا تھا جو پہلے شاہ جہاں کے بڑے بیٹے داراشکوہ کی سرکار سے متعلق تھا اور تین سال کے عرصہ میں صرف یہی شخص میرا ہمیشہ کا ہم صحبت نہ تھا بلکہ اس نے اور کئی بڑے بدیاوان پنڈتوں سے میری ملاقات کرادی تھی۔ جن کو وہ اپنے ساتھ لے آیا کرتا تھا۔ جب میں اپنے آقا کو پیکٹ (۲۵۷) اور ہاروے (۲۵۸) کے علم تشریح کے معلومات جدیدہ کا حال سناتے تھک جاتا اور گیسینڈی اور ڈسکارٹس (۲۵۹) کے فلسفہ پر (جس کا میں نے اپنے آقا کو فارسی میں ترجمہ کردیا تھا اور پانچ چھ سال تک بالتخصیص میرا یہی شغل تھا) گفتگو کرتے کرتے تنگ ہوجاتا تھا تو اس وقت ہم اپنے پنڈت کی طرف مخاطب ہو کر کہتے تھے کہ ہاں پنڈت جی! اب آپ کی باری ہے۔ اپنے طور پر بحث کیجئے اور اپنے افسانے سنائیے! چنانچہ وہ نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ، یہاں تک کہ اثنائے گفتگو میں کبھی تبسم تک نہ کرتا تھا اپنی باتیں سناتا تھا۔ لیکن آخر کار ہم اس کی کہانیوں اور لڑکوں کی سی دلیلوں سے ناخوش ہوگئے۔

ہندوؤں کے چار وید اور ان کے نام

ہندوؤں کا یہ ادعا ہے کہ خدا نے، جس کو وہ اچر (۲۶۰) (یعنی غیر متحرک) کہتے ہیں، ہمارے واسطے چار وید (۲۶۱) بھیجے ہیں (وید ایک لفظ ہے جس کے معنی علم کے ہیں) چنانچہ ان کا قول ہے کہ وید میں سب علوم ہیں۔ اول وید کا نام اتھربن وید ہے۔ دوسرے کا یجر وید، تیسرے کا رگ وید، چوتھے کا سام وید۔

ہندوؤں کے چار برنوں اور ان کے باہم شادی کے ممنوع ہونے کا ذکر

وید کا قول ہے کہ تمام لوگ، جیسے کہ وہ حال میں ہیں، چار قوموں پر تقسیم ہوں گے۔ اول برہمن یعنی حاملان شریعت، دوسرے چھتری یعنی جنگجو، تیسرے بیش یعنی سوداگر اور دکاندار جن کو عرف عام میں بنیا بولتے ہیں، چوتھے شودر یعنی دستکار اور مزدور اور ان مختلف قوموں کو آپس میں شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یعنی برہمن کی چھتری

کے ہاں شادی نہیں ہو سکتی۔ علیٰ ہذا اور قوموں کی نسبت بھی یہی حکم ہے۔

تناسخ ارواح اور جیو ہتیا یعنی قتلِ حیوانات کی ممانعت اور گائے بیل کے ادب کا بیان اور اس کی نسبت مصنف کی رائے

ہندو لوگ تناسخِ ارواح یعنی جانداروں کے مارنے اور کھانے کو حرام سمجھتے ہیں مگر چھتری اس سے مستثنیٰ ہیں۔ بشرطیکہ وہ گائے اور مور کا گوشت نہ کھائیں کیونکہ ہندو ان دو جانوروں کا بڑا ادب کرتے ہیں۔ خصوصاً گائے کا اس خیال سے کہ اس کی دم پکڑ کر اس دریا (یعنی بے ترنی) سے پار ہونا ہے جو دنیا اور آخرت کے مابین حائل ہے۔ ممکن ہے جن لوگوں نے پرانے وقتوں میں ایسے قانون بنائے تھے انہوں نے مصر کے چرواہوں کو اسی طرح بائیں ہاتھ سے بھینس یا گائے کی دُم پکڑے ہوئے اور ان کے ہانکنے کے لئے دائیں ہاتھ میں لاٹھیاں لئے ہوئے دریائے نیل سے پار ہوتے دیکھا ہوگا، یا گائے کا ایسا بڑا لحاظ غالباً اس وجہ سے ہوگا کہ وہ ایک نہایت ہی فائدہ بخش جانور ہے اور دودھ اور گھی جو ان کی بڑی غذا ہے، اس سے حاصل ہوتا ہے اور یہ کہ بیل زراعت کا بڑا بھاری ذریعہ ہے اور اس وجہ سے گویا کہ گائے بیل ان کی زندگی کے محافظ ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ بیان ہے کہ چراگاہوں کی قلت کی وجہ سے ہندوستان میں بہت سے مویشیوں کا پالنا بھی مشکل ہے۔ کیونکہ سال میں آٹھ مہینے گرمی ایسی سخت پڑتی ہے اور زمین ایسی خشک رہتی ہے کہ مویشی بھوک کے مارے سوروں کی طرح تمام قسم کے خس و خاشاک، نجاستیں چر جاتے ہیں۔ پس اگر ہندوستان میں فرانس اور انگلستان کی طرح گوشت کھایا جائے تو تمام جانور فوراً نابود ہو جائیں اور ملک بالکل بے زراعت رہ جائے۔

گاؤکشی کی ممانعت کے باب میں جہانگیر کے ایک حکم کا ذکر

چنانچہ قلت مویشی ہی کی وجہ سے جہانگیر نے برہموں کی درخواست پر چند سال کے لئے گاؤکشی کی ممانعت کر دی تھی اور تھوڑا ہی عرصہ گزرا کہ انہوں نے ایک ایسی ہی عرضی اورنگ زیب کو بھی دی تھی اور اس کی منظوری کی خاطر بہت سا نذرانہ دینا چاہتے تھے اور ظاہر کیا تھا کہ پچھلے پچاس ساٹھ سال میں جو ملک کے بہت سے حصے ویران اور بے تردد رہے، اس کی وجہ یہی تھی کہ بیل کم اور گراں قیمت تھے۔ شاید ہندوستان کے قدیم

اچارجوں کو، جنھوں نے ایسے قوانین بنائے تھے، یہ امید ہوگی کہ گوشت کھانے کی ممانعت کر دینے سے لوگوں کی عادات میں ایک مفید اثر پیدا ہوگا اور جب ان کو قطعاً یہ حکم دیا جائے گا کہ وہ جانوروں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئیں تو وہ آپس میں بے رحمی کے مرتکب نہ ہوں گے۔ تناسخ کا مسئلہ بھی جانوروں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے کا باعث ہوا کیونکہ ان کو یہ یقین ہے کہ کسی جانور کو مار ڈالنا یا کھا لینا بغیر کسی اپنے باپ دادا کے مار ڈالنے کے ممکن نہیں ہے اور اس سے بڑھ کر اور کوئی گناہ کیا ہو سکتا ہے اور ممکن ہے کہ برہموں کو یہ خیال بھی ہوا ہو کہ ہمارے ملک میں بجز تھوڑی مدت جاڑے کے موسم کے گائے بیل کا گوشت لذیذ اور صحت بخش بھی نہیں ہوتا۔

ترکال سندھیا اور روزمرہ کے اشنان کے فرض ہونے کا ذکر اور مصنف کے خیال کے موافق اشنان کے فرض ہونے کی وجہ

وید کے بموجب ہر ہندو کو فرض ہے کہ رات دن میں تین مرتبہ، صبح، دوپہر اور شام کو مشرق کی طرف منہ کر کے پوجا اور تین ہی مرتبہ اشنان کرے اور کم سے کم کھانے سے پہلے تو ضرور ہی نہانا چاہئے اور ٹھہرے ہوئے پانی کی نسبت بہتے پانی میں نہانا اور پوجا کرنا زیادہ ثواب کی بات ہے۔ یہاں غالباً پھر اسی بات کا لحاظ کیا گیا ہوگا جس کا ہندوستان جیسے گرم ملک میں کیا جانا صرف مناسب ہی نہیں بلکہ ازبس فائدہ مند اور ضروری تھا۔ مگر جو لوگ سرد ملک میں رہتے ہیں، یہ قانون ان کے مناسب حال نہیں ہے اور میں نے اپنے سفر کی حالت میں اکثر لوگوں کو اس قانون کی پابندی کے باعث دریاؤں اور تالابوں میں کودتے اور غوطے لگاتے اور اگر یہ میسر نہ ہوں تو سر پر پانی کے بڑے بڑے ڈول ڈالتے اور اس وجہ سے جان کے اندیشہ میں پڑتے دیکھا ہے۔ بعض اوقات میں نے ان کے مذہب پر یہ اعتراض کیا کہ اس میں یہ ایک ایسا قانون ہے جس کا سردی کے موسم میں سرد ممالک میں عمل میں لانا ناممکن ہے۔ بلکہ اسی سبب سے میرے جی میں صاف یہ بات آئی ہوئی تھی کہ یہ کچھ خدا کا حکم نہیں ہے اور صرف ایک انسانی ایجاد ہے۔ انہوں نے یہ ہنسی کا جواب دیا کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمارا قانون ہر جگہ برتا جا سکتا ہے بلکہ خدا نے یہ محض ہمارے ہی واسطے بنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم غیر شخص کو اپنے مذہب میں نہیں ملا سکتے اور ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ تمہارا مذہب جھوٹا ہے۔ یہ تمہاری حالتوں اور حاجتوں کے مناسب ہوگا کیونکہ خدا نے جنت

میں جانے کے مختلف طریقے مقرر کر دیئے ہیں۔ میں نے ان کو اس بات کا یقین دلانا ناممکن سمجھا کہ تمام روئے زمین کے واسطے عیسائی مذہب ہی بنا ہے اور تمہارا مذہب محض ایک قصہ اور بے ہودہ بناوٹ ہے۔

برہما، بشن، مہیش کی پیدائش اور صفات کا بیان

وید قول ہے کہ جب خدا نے چاہا کہ دنیا کو پیدا کرے تو اپنے اس ارادہ کے پورا کرنے سے پہلے اس نے یہ تین دیوتا پیدا کئے۔ برہما، بشن اور مہادیو۔ برہما کے معنی تمام موجودات میں رچے ہوئے کے ہیں۔ بشن کے معنی تمام چیزوں میں موجود رہنے والے کے ہیں۔ مہادیو کے معنی بڑا دیوتا۔ برہما کے ذریعہ سے اس نے دنیا کو پیدا کیا۔ بشن کے وسیلہ سے وہ اس کو قائم رکھتا ہے اور مہادیو کے ہاتھوں وہ اس کو نیست و نابود کرے گا اور خدا کے حکم سے برہما نے چار ویدوں کو رچا۔ چنانچہ اسی وجہ سے بعض مندروں میں برہما کی مورت چومکھی ہوتی ہے۔

وید میں تثلیث کے مسئلہ کے موجود ہونے کا گمان

یورپین پادریوں سے میری گفتگو ہوئی ہے جن کو گمان تھا کہ ہندو بھی اس اسرار کا جو تثلیث کے مسئلہ میں ہے، کچھ نہ کچھ خیال رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وید میں صاف لکھا ہوا ہے کہ یہ تین وجود اگرچہ بظاہر تین ہیں مگر وہ دراصل ایک ہی خدا ہے۔

برہما، بشن، مہیش کی جو حقیقت پنڈتوں نے بیان کی اس کے فہم سے مصنف کے قاصر رہنے کا ذکر

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کی نسبت میں نے پنڈتوں کو نہایت طولانی بحث کرتے سنا ہے۔ لیکن ان کا بیان ایسا الجھا ہوا ہوتا ہے کہ ان کی رائے صاف طور پر میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ بعض ان میں سے یہ کہتے ہیں کہ تین وجود جن کا ذکر ہے، حقیقت میں تین مستقل وجود ہیں، جن کو وہ دیوتا کہتے ہیں۔ مگر وہ یہ صاف صاف نہیں بیان کر سکتے کہ لفظ دیوتا سے ان کی اس جگہ کیا مراد ہے اور جیسے کہ ہمارے قدیم بت پرست جینائی اور نیو مینا وہ نام لیا کرتے تھے اور میری رائے میں واضح طور پر وہ کبھی نہیں بیان کر سکتے تھے کہ ان کی مراد ان الفاظ سے کیا ہے، ایسے ہی ہندوستانیوں کے یہ دیوتا منزلہ اسی جینائی

اور نیومینا کے ہوں گے۔ بعض نہایت ذی علم پنڈتوں نے گفتگو آنے پر یہ بیان کیا کہ خدا ایک ہی ہے اور یہ تین وجود ایک ہی خدا سے مراد ہے جو تین مختلف صفتوں سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا، پالنے والا اور نابود کرنے والا۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں کہا کہ خدا بلحاظ ان تین علیحدہ علیحدہ صفتوں کے کسی قسم کے جدا جدا وجودوں کا اپنے وجودِ واحد میں جامع ہے۔

برہما، بشن، مہیش اور ان کے اوتاروں کی بابت فادر روآ نامی، ایک مشنری مقیم آگرہ کا بیان

فادر روآ نے جو آگرہ میں ایک جرمن جیسویٹ مشنری تھے اور سنسکرت خوب جانتے تھے، مجھ سے کہا کہ ہندوؤں کی پوتھیوں میں صرف یہی نہیں لکھا کہ تین دیوتا مل کر ایک خدا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ دوسرے دیوتا یعنی بشن نے نو مرتبہ اوتار لیا ہے۔ یعنی مجسم ہو کر دنیا میں ظہور کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جب میں شہر روم کو واپس جاتا ہوا شیراز میں ٹھہرا وہاں کارمیلائٹ فرقہ کے ایک پادری نے عمدہ طور سے اس بات کو تحقیق کر دیا کہ ہندوؤں کے مندرجہ ذیل مسائل ہیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ ان کی تثلیث کے دوسرے دیوتا یعنی بشن نے نو مرتبہ دنیا میں اس وجہ سے اوتار لیا ہے کہ جو جو پاپ دنیا میں پھیلے ہوئے تھے ان سے لوگوں کو چھڑایا، جس میں سے آٹھویں دفعہ کا اوتار لینا بہت مشہور ہے کیونکہ ہندو کہتے ہیں کہ جب دنیا دیتوں کی طاقت سے مغلوب ہو گئی تو بشن نے آدھی رات کے وقت کنواری لڑکی کے پیٹ سے پیدا ہو کر اوتار لیا اور دنیا کو نجات دی اور اس تمام رات کو آسمان سے پھولوں کی بارش ہوتی رہی اور فرشتے گاتے رہے۔ یہ بات کسی قدر عیسائی مذاق کے موافق ہے مگر آگے بڑھ کر یہ کہانی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس اوتار نے ایک دئیت کو مارنا شروع کیا جو آسمان کی طرف اڑ گیا اور وہ ایسا قوی ہیکل تھا کہ اس نے آفتاب کو ڈھانک لیا اور جب نیچے گرا تو تمام زمین کانپنے لگی اور وہ اپنے ہی بوجھ سے اس قدر زمین میں دھنس گیا کہ فوراً جہنم میں جا گرا۔ اس قوی الجثہ دئیت کے ساتھ لڑتے لڑتے بشن جی خود بھی پہلو میں زخم کھا کر گر گئے لیکن ان کے گرنے سے تمام دشمن بھاگ گئے اور وہ پھر اٹھے اور دنیا کو اس بلا سے چھڑا کر آسمان پر چلے گئے اور چونکہ ان کے پہلو میں زخم آ گیا تھا اس لئے وہ عموماً زخمی پہلو والے (۲۶۲) کے نام سے مشہور ہیں۔

ہندو یہ بھی کہتے ہیں مگر وید سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ لوگوں کو مسلمانوں کے ظلم سے بچانے کے واسطے دسواں اوتار اور ہوگا اور ہم عیسائی لوگوں کے اندازہ کے بموجب یہ اس وقت ہوگا جبکہ دجال ظہور کرے گا۔ ہندو کہتے ہیں کہ مہادیو بھی دنیا میں آئے ہیں اور ان کی نسبت یہ روایت ہے کہ کسی راجہ کی لڑکی جب سن بلوغت کو پہنچی تو اس کے باپ نے پوچھا کہ تو کس سے شادی کرنا چاہتی ہے اور جب اس نے یہ جواب دیا کہ میں بجز کسی دیوتا کے اور سے شادی کرنا نہیں چاہتی تو مہادیو آگ کا روپ دھار کر راجہ کے سامنے آئے اور راجہ نے بیٹی کو اس پر مسرت واقعہ کا حال کہلا بھیجا اور وہ بلا تأمل شادی کرنے پر راضی ہو گئی اور مہادیو اس آگ ہی کی شکل میں راجہ کے دربار میں بلائے گئے اور جب انہوں نے دیکھا کہ راجہ کے وزیروں کی رائے شادی کی نسبت نہیں ہے تو انہوں نے اوّل ان کی داڑھیاں جلا ڈالیں اور پھر ان سب کو مع راجا کے خاندان کے جلا کر بھسم کر دیا اور اس کے بعد راج کنیا سے شادی کر لی۔ بشن جی کی نسبت ہندوؤں کا یہ بیان ہے کہ ان کا پہلا اوتار شیر کا، دوسرا سؤر کا، تیسرا کچھوے کا، چوتھا سانپ کا پانچواں صرف ایک ہاتھ بھر کی بونی برہمنی کا، چھٹا شیر کی شکل کے آدمی کا، ساتواں مچھ کا، آٹھواں جو اوپر بیان ہو چکا ہے، نواں بغیر دُم کے بندر کا، اور دسواں اوتار ایک بڑے بہادر کا ہوگا (۲۶۳)۔ مجھے اس میں کچھ شک نہیں کہ فادر روآ کو ہندوؤں کے مسائل کی واقفیت ویدوں سے حاصل ہوئی تھی اور انہوں نے جو کچھ مجھ سے بیان کیا بیشک ہندوؤں کے مذہب کی یہی بنیاد ہے۔

مصنف کے ایک رسالے اور فادر کرکر کی ایک کتاب کاذِکر

کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے مذہب ہنود کی نسبت ایک رسالہ لکھا تھا اور ہندوؤں کے مندروں کے بتوں کی بہت سی مورتوں کی تصویریں مع سنسکرت کے حرفوں کے اپنی اس کتاب میں لگائی تھیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ میری کتاب کا جولبِ لباب تھا وہ فادر کرکر کی کتاب مسمیٰ بہ "چائنا ایلسٹریٹا" میں موجود ہے اور فادر کرکر کو فادر روآ سے جب وہ روم میں تھے، معلومات کا ایک معتد بہ حصہ حاصل ہوا تھا۔ اس لئے میں آپ کو فادر موصوف کی کتاب کے مطالعہ کی صلاح دیتا ہوں۔ مگر ہاں اس جگہ مجھے یہ ضرور کہنا چاہئے کہ لفظ انکار نیشن (یعنی ظہور ربانی بحیثیت اوتار) جس کو اس محترم فادر نے استعمال کیا ہے، مجھ کو نیا معلوم ہوا کیونکہ پہلے میں نے اس لفظ کو ٹھیک ان معنوں میں بولے جاتے کبھی نہیں سنا

تھا۔

لفظ اوتار اور دیوتا سے ہندوؤں کی کیا مراد ہے

بعض پنڈتوں نے مجھ سے اپنا مسئلہ اس طرح بیان کیا کہ جن مختلف صورتوں کا اوپر ذکر ہوا ہے، اگلے زمانہ میں ان میں خدا ظہور فرماتا رہا ہے اور مندرجہ بالا عجائبات اس نے انہی صورتوں میں پورے کئے ہیں۔

ہندوؤں کے نزدیک بعض بہادر اور سورما بھی دیوتا ہو گئے ہیں

بعض پنڈتوں کا یہ قول تھا کہ بڑے بڑے نامور سورما اور بہادروں کی روحیں جن کو ہم یورپ والے ہیرو کہتے ہیں، ان مختلف جسموں میں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، آتی رہی ہیں اور وہی دیوتا ہو گئے ہیں یا اگر قدیم بت پرستوں کی ان اصطلاحوں میں جن سے ہم واقف ہیں کہا جائے تو وہ طاقتور دیوتا نیومینیا' جینائی' ڈیمن خواہ یہ کہو کہ سپرٹ اور فیری بن گئے کیونکہ ہندوستانی لفظ دیوتا کے معنی بجز الفاظ مذکورہ بالا میں بیان نہیں کر سکتا۔

ہندوؤں کے نزدیک آتما یعنی روح انسانی پرم آتما یعنی ذاتِ الٰہی کا ایک جز ہے

لیکن جب یہ خیال کیا جائے کہ ہندوؤں کا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری روحیں ذاتِ الٰہی کی جزو ہیں تو یہ دوسرے معنی بھی قریباً پہلے ہی معنی بن جاتے ہیں۔

بعض ہندوؤں کے نزدیک اوتار اور راچھس کے لفظ سے خدا کی مختلف صفتیں مراد ہیں

بعض پنڈتوں نے یہ عمدہ تشریح کی کہ جن اوتاروں یا راچھسوں کا ہماری پوتھیوں میں ذکر ہے، ان کے معنی پوشیدہ ہیں اور ان سے یہ غرض ہے کہ خدا کی مختلف صفات ظاہر ہوں، نہ یہ کہ ان کے لفظی معنی لئے جاویں۔

بعض پنڈتوں کے نزدیک اوتاروں کے قصے محض مذہبی افسانے ہیں

بعض نہایت فاضل پنڈتوں نے آزادانہ صاف طور پر یہ کہا کہ ان اوتاروں کے قصہ سے زیادہ لغو اور کوئی قصہ نہیں ہے اور ان اچارجوں نے، جنہوں نے قوانینِ مذہبی کی کتابیں بنائی تھیں، ان کو صرف اس غرض سے ایجاد کر لیا تھا کہ لوگ کسی نہ کسی قسم کے

مذہب کے پابند رہیں۔

آتما اور پرم آتما کے ایک ہونے پر مصنف کا اعتراض

ہندوؤں کا عموماً یہ عقیدہ ہے کہ ہماری روحیں ذاتِ باری کے جزو ہیں اور باوجود اس کے اس منطقی برہان کو نہیں سمجھتے ہیں کہ درحالیکہ وہ خود خدا ہیں، پھر اپنے اوپر کس لئے کسی پوجا پاٹ اور مذہبی پرستش کو قائم کرتے اور اگنت اور نرکھ اور سورگ کو مانتے ہیں اور تعجب ہے کہ باوجود ایسے قوی اعتراض کے بھی پنڈت لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس سے اوتاروں کے وجود اور اصلیت میں ہرگز کسی طرح کی قباحت لازم نہیں آتی۔ بلکہ ان کی حقیقت کو بطور ایک مذہبی اسرار کے ماننا ضروریات سے ہے۔

ہنری لار صاحب اور ابراہام راجر صاحب کی عمدہ کتابوں کا ذکر جو ہندوؤں کے علوم وفنون کے باب میں ہیں

ہنری لار صاحب اور ابراہام راجر صاحب کا اتنا ہی ممنون ہوں جتنا کہ فادر کر کر اور فادر روآ کا، کیونکہ اگرچہ میں نے ہندوؤں کی نسبت بہت سے حقائق جمع کئے تھے مگر بعد ازاں ان صاحبوں کی لکھی ہوئی کتابوں میں دیکھا کہ انہوں نے حقائق وحالات مذکورہ کو ایک نہایت نظم وترتیب سے لکھا ہے۔ جن کو بغیر بڑی مشقت اور جانکاہی کے میں اس خوبی سے نہیں لکھ سکتا۔ اس لئے میں ہندوؤں کے علوم وفنون کی نسبت بلا لحاظ نظم وترتیب ایک سیدھے اور عام طور پر مختصراً لکھتا ہوں۔

شہر بنارس ہندوؤں کا دارالعلم ہے

شہر بنارس (۲۶۴) جو دریائے گنگا کے کنارے ایک خوبصورت موقع پر اور ایک بڑے خوشنما اور نہایت ہی زرخیز ملک میں واقع ہے، ہندوؤں کا دارالعلم خیال کرنا چاہئے اور یہ ہندوستان میں اسی مرتبہ کی جگہ ہے جیسا کہ یونانیوں کے لئے شہر ایتھنز تھا۔

بنارس میں پنڈتوں کے طرزِ بود وباش اور تعلیم وتعلّم کا بیان

یہاں برہمن اور پنڈت ہر ملک سے آتے رہتے ہیں اور صرف یہی لوگ ہیں جو اپنے اوقات تحصیلِ علوم اور مطالعہ میں صرف کرتے ہیں۔ اس شہر میں ہماری یونیورسٹیوں

کی طرح کوئی کالج یا باقاعدہ جماعتیں نہیں ہیں بلکہ قدیم زمانہ کے مکتبوں کی سی حالت ہے۔ استاد یعنی پنڈت شہر کے مختلف حصوں میں اپنے اپنے گھروں اور خصوصاً شہر کے باہر باغوں میں، جہاں رہنے کی بڑے بڑے ساہوکاروں نے ان کو اجازت دے رکھی ہے، رہتے ہیں۔ بعض کے پاس چار شاگرد ہوتے ہیں، بعض کے پاس چھ سات اور جو بڑا ہی فاضل پنڈت ہو، اس کے پاس بارہ یا پندرہ۔ مگر اس سے بڑھ کر تعداد نہیں ہوتی۔ یہ ایک معمولی بات ہے کہ یہ شاگرد دس بارہ سال تک اپنے اپنے استادوں کے زیر تعلیم رہتے ہیں مگر اس عرصہ میں ان کی تعلیم بہت آہستہ آہستہ ہوتی ہے کیونکہ عموماً ہندوستانیوں کی طبیعت زیادہ تر ان کی غذا اور ملک کی گرمی کی وجہ سے کاہل ہوتی ہے اور چونکہ ان میں نہ تو مسابقت کا جوش وغیرہ ہی ہوتا ہے اور نہ یہ امید ہوتی ہے کہ اگر معمولی اندازہ سے کچھ زیادہ کمال حاصل کریں گے تو کوئی بار آور پیشہ اور اعزاز یعنی خطاب فضیلت حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ معمولی اور سست طور پر اپنی تحصیل کو جاری رکھتے ہیں اور ایام طالب علمی میں انہیں کھانے کو صرف کھچڑی ملتی ہے جو بعض دولتمند ساہوکاروں کی طرف سے ان کے لئے تیار ہوا کرتی ہے۔

زبان سنسکرت اور اس کی قدامت کا بیان

سب سے اوّل سنسکرت سکھلائی جاتی ہے جو ایک ایسی زبان ہے جس کو صرف پنڈت ہی جانتے ہیں اور اس بولی سے جو آج کل ہندوستان میں بولی جاتی ہے، بالکل مختلف ہے۔ فادر کرکرنے جو ایک الف، بے، تے چھپوا کر مشتہر کی ہے، وہ سنسکرت ہی کے حروف ہیں اور ان کو یہ حروف فادر روآ سے حاصل ہوئے تھے۔ لفظ سنسکرت کے معنی خالص یا منجھی ہوئی زبان کے ہیں۔ اور چونکہ ہندوؤں کا یہ اعتقاد ہے کہ خدا نے چار وید برہما کے ذریعہ سے سنسکرت ہی میں بھیجے تھے، اس لئے وہ اس کو دیو بھاشا یعنی زبان مقدس یا زبان الٰہی کہتے ہیں۔ ان کا قول ہے مگر میں نہیں جانتا کہ کس دلیل سے ہے، کہ یہ زبان ایسی ہی قدیم ہے جیسے کہ خود برہما اور برہما کی عمر کا شمار لاکھوں برس سے کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی مذہبی کتابیں جو حقیقت میں نہایت پرانی ہیں، اسی زبان میں ہیں، اس لئے اس کے غایت درجہ قدیم ہونے کو نہ ماننا ناممکن ہے۔ سنسکرت میں فلسفہ اور طب کی کتابیں نظم میں ہیں اور ان کے سوا بہت سی اور طرح کی کتابیں بھی ہیں کہ جن سے بنارس میں ایک بہت بڑا کمرہ بالکل

بھرا ہوا ہے۔

پورانوں کی تعلیم اور ویدوں کی ضخامت اور کمیابی وغیرہ کا ذِکر

جب طالب علم اس قدیم اور مشکل زبان کی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں اور میں اسے مشکل اس وجہ سے کہتا ہوں کہ اس کی صرف و نحو اچھی نہیں ہے، تو عموماً پرانوں کو پڑھتے ہیں جو ویدوں کی تشریح یا اختصار ہوتا ہے۔ یہ کتابیں جو مجھے بنارس میں دکھلائی گئی تھیں، اگر وہ وید ہی تھے تو بڑی ضخامت کی ہوتی ہیں اور یہ ایسی نایاب ہیں کہ میرے آقا کو باوجود بڑی تلاش اور شوقِ خریداری کے ایک کتاب بھی نہیں ملی۔ ہندو ان کو بڑی ہوشیاری سے چھپائے رکھتے ہیں کہ مبادا مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائیں اور جیسا کہ اکثر ہوا ہے' جلا دی جائیں۔ (۲۶۵)

فلسفہ کی تعلیم کا ذِکر

پرانوں کے بعد بعض طالب علم تحصیل علم فلسفہ پر اپنا جی لگاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ' وہ اس میں' ترقی بہت کم کرتے ہیں اور یہ تو میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ ہندوستانیوں کی طبیعتیں سست اور کاہل ہوا کرتی ہیں اور جیسا کہ یورپ کی یونیورسٹیوں میں کسی معزز پیشہ میں ترقی کرنے کی خاطر لوگوں کو شوق ہوا کرتا ہے، وہ ان کو مطلقاً نہیں ہوتا۔

کہٹ شاستر اور ان کے پیرووں کا بیان

ہندوستان میں جو بڑے بڑے اچارج (حکیم) ہوئے ہیں ان میں چھ شخص بہت نامور ہیں جو ہندووں کے علیحدہ علیحدہ چھ فرقوں (۲۶۶) کے بانی ہیں اور اختلافِ عقائد کے باعث ان کے پیرووں کے باہم از بس رشک اور بحث مباحثے رہا کرتے ہیں۔ کیونکہ ہر فرقہ کے پنڈت یہی اِدّعا کرتے ہیں کہ ہمارے ہی مسائل سب سے زیادہ صحیح اور وید کے موافق ہیں۔

بدھ مت اور اس کے پیرووں کا ذِکر

اور ساتواں فرقہ بدھ کے پیرووں کا ایک اور ہو گیا ہے جس کی بارہ شاخیں ہیں لیکن اس فرقہ کے لوگ شمار میں اس قدر کثرت سے نہیں ہیں جیسے اور فرقوں کے ہیں اور ان کو حقارتاً لامذہب اور دہریہ کہا جاتا ہے اور قابلِ نفرت اور حقیر شمار کئے جاتے ہیں اور یہ

لوگ ایک ایسے طریق سے زندگی بسر کرتے ہیں جو انہی سے مخصوص ہے۔

پیدائشِ موجودات کے باب میں ہندوؤں کے مختلف مذاہب کا ذِکر

ہندوؤں کی تمام پوتھیوں میں فرسٹ پرنسپلز یعنی اصول و مبادی اشیاء کا ذکر ہے لیکن طرزِ بیان میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

بعضے اجزائے لایتجزیٰ کو کائنات کی اصل مانتے ہیں

چنانچہ بعضے تو یہ کہتے ہیں کہ ہر چیز چھوٹے چھوٹے ناقابل التقسیم اجسام سے مرکب ہے اور یہ ناقابلیت انقسام اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ سخت یا غیر متخلخل اور ٹھوس وغیرہ ہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ بدرجہ غایت چھوٹے ہیں اور اس خیال پر وہ اپنے اور بہت سے تصورات کی بنیاد قائم کرتے ہیں جو کسی قدر ڈی ماک ری ٹس {دی مقراطیس (۱۰)} اور اپی کیورس کے خیالات سے مشابہ ہیں۔ لیکن وہ اپنے خیالات کو ایسے غیر منضبط اور نا تحقیق طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا مطلب سمجھنا مشکل ہے اور خواہ کیسے ہی بڑے فاضل مشہور ہیں لیکن اگر ان کی بے حد نافہمی پر غور کیا جائے تو اس میں محل شبہ ہے کہ آیا یہ بے ہودگی ان کتابوں کے اصل مصنفوں سے منسوب ہونی چاہئے یا کہ ان کے ان مترجموں اور شارحوں سے زیادہ تر منسوب ہو سکتی ہے۔

بعض مادہ اور صورت کو اصل قرار دیتے ہیں

بعض کا قول ہے کہ ہر چیز میٹر اور فارم یعنی مادہ اور صورت سے مرکب ہے۔ لیکن کوئی پنڈت مادہ اور صورت کو صاف صاف بیان نہیں کر سکتا اور مادہ کی بابت تو کچھ بیان بھی کرتے ہیں مگر صورت کی نسبت بہت ہی کم تشریح کر سکتے ہیں۔ بہر حال ان کا بیان صرف اسی قدر قابلِ فہم ہے کہ اس سے مجھے ظاہر ہو گیا کہ یہ لوگ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اتنا بھی نہیں سمجھتے جتنا کہ یہی لفظ ہمارے مدارس میں، جبکہ قوتِ مادّیہ میں سے صورتِ نوعیہ کے ظہور کا مسئلہ بیان کیا جاتا ہے، طالب علموں کو ایک معمولی طور پر سمجھا دیئے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہمیشہ مصنوعی چیزوں کی مثالیں دیتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ ملائم مٹی بطور مادہ کے ہے اور کمہار اس کو پھرا پھرا کر جو طرح طرح کی شکلیں بنالیتا ہے یہ صورت ہے۔

بعضے عناصرِ اربعہ اور اکاش کو موجودات کی اصل جانتے ہیں

بعض کی یہ رائے ہے کہ ہر چیز عناصر اربعہ اور "نھنگ" یعنی اکاش سے مرکب ہے

لیکن وہ عناصر کے استحالہ یا آپس میں مل جانے کے نسبت کچھ نہیں کہتے۔

لفظ اکاش کا لفظ پرائی ویشن کے قریب المعنی ہونا

اور تھسنگ یعنی اکاش کی جو ہمارے لفظ پرائی ویشن یعنی عدم مطلق کے قریب المعنی ہے کئی قسمیں بتلاتے ہیں، جن کو میں خیال کرتا ہوں کہ نہ تو وہ خود سمجھتے ہیں نہ دوسرے کو سمجھا سکتے ہیں۔

بعض کے نزدیک نور و ظلمت اصل اوّل ہے

بعض نور اور ظلمت ہی کو اصل اوّل مانتے ہیں اور اس رائے کی تائید میں وہ ایسے بے معنی دلائل پیش کرتے ہیں جو صحیح فلسفہ کے خلاف محض ہیں اور ایسی ایسی طول طویل قیل و قال کرتے ہیں کہ جس کو صرف عامی اور ناخواندہ لوگوں ہی کے کان سن سکتے ہیں۔

بعض کے نزدیک ایک یا چند پرائی ویشن ہی اصل اصول ہیں

بعض ایک یا چند پرائی ویشنوں ہی کو اصل اصول تسلیم کرتے ہیں۔ جن کو وہ ''تھسنگ'' سے جدا سمجھتے ہیں اور جن کی تعداد کی نسبت ایک ایسا غیر حکیمانہ طول طویل اندازہ کرتے ہیں کہ مجھے یقین نہیں ہے کہ ایسی جزوی باتوں کی خاطر ان کے مصنفوں نے قلم اٹھا کر کچھ لکھا ہو اور اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی کتابوں میں یہ بے ہودہ باتیں موجود ہوں۔

بعضے سمبندھ ہی کو اصل سمجھتے ہیں

بعض قائل ہیں کہ ہر چیز اتفاق کا نتیجہ ہے یعنی جس کو پنڈت لوگ سمبندھ کہتے ہیں اور اس کی نسبت بھی وہ ایسی لمبی چوڑی عجیب تقریریں کرتے ہیں جو جاہل لوگوں ہی کے لائق ہوتی ہیں۔

ہندوؤں کے نزدیک اصول و مبادی اشیا ازلی و ابدی ہیں

ان تمام اصولوں کی نسبت پنڈتوں کا اتفاق ہے کہ یہ ازلی و ابدی ہیں۔ اکاش سے کائنات کے پیدا ہونے کی نسبت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف اتنا ہی سمجھے ہوئے ہیں جتنا

کہ بہت سے قدیم حکما کے دلوں میں خیال تھا، مگر البتہ وہ کہتے ہیں کہ ایک اچارج نے اس مسئلہ کی نسبت کچھ لکھا ہے (یعنی اس بحث کو کسی قدر شرح اور بسط سے تحریر کیا ہے)۔

ہندوؤں کی طب کی کتابوں کا ذکر

علم طب میں ہندوؤں کے پاس بہت سی چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں۔ لیکن بجائے اس کے کہ کوئی باترتیب کتاب ہو، ان کو صرف نسخوں کے مجموعے کہنا چاہئے اور ان میں سب سے پرانی اور بڑھ کی کتابیں نظم میں لکھی ہوئی ہیں۔

ہندوؤں کے طریقِ معالجہ کے اہلِ یورپ سے مختلف ہونے کا ذکر اور اس کی مثالیں اور اس کی نسبت مصنف کی رائے

میں اس طرز کو بیان کرتا ہوں جس میں کہ ان کا طریقِ علاج ہمارے طریقہ سے بالکل مختلف ہے اور وہ اختلاف مندرجہ ذیل مسلمہ اصول پر مبنی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تپ کے بیمار کو غذا کی کچھ بڑی ضرورت نہیں اور فاقہ سب سے بڑا علاج ہے اور اس مرض میں شوربے یا یخنی سے زیادہ مضر اور کوئی چیز نہیں کیونکہ یہ دو چیزیں تپ والے شخص کے معدہ میں فوراً خراب ہو جاتی ہیں اور ان کے نزدیک بجز خاص خاص اور نہایت ضروری موقعوں کے مثلاً یا توجب سرسام کا اندیشہ ہو یا جب کبھی گردہ یا جگر یا سینہ میں ورم پیدا ہو جاوے، فصد نہ لینی چاہئے۔ اس بات کا فیصلہ میں اپنے فاضل طبیبوں پر چھوڑتا ہوں کہ آیا یہ معالجہ کے طریقے درست ہیں یا نہیں مگر ہاں صرف اتنا میں بھی کہتا ہوں کہ ہندوستان میں یہ طریقے کارگر ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمان طبیب بھی بعض معالجات ہندوؤں کی طرح کرتے ہیں

اور مغل اور مسلمان طبیب جو بوعلی سینا اور ایوروس {یعنی ابنِ رُشد (۲۶۸)} کے پیرو ہیں۔ وہ بھی ہندوؤں کی طرح ان طریقوں، خصوصاً یخنی یا شوربے سے پرہیز کرنے کے طریقہ پر عمل کرتے ہیں۔

مسلمان طبیب فصد زیادہ لیتے ہیں

مگر ہندوؤں کی نسبت مغلوں میں فصد لینے کا عمل زیادہ ہے۔ کیونکہ جہاں ان کو

مندرجہ بالا اورام کا اندیشہ ہوتا ہے عموماً ایک دو مرتبہ خون نکلوا ڈالتے ہیں اور یہ عمل وہ گو آ اور پیرس کے زمانہ حال کے اطبا کی طرح جزوی طور پر نہیں کرتے بلکہ قدمائے اطبا کی طرح اٹھارہ یا بیس اونس یعنی دس گیارہ چھٹانک تک خون نکلوا ڈالتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات غش کی نوبت ہو جاتی ہے۔ پس وہ گیلین {جالینوس (۲۶۹)} کی ہدایت کے موافق اور جیسے کہ میں نے اکثر دیکھا ہے، بیماری کو ابتدا ہی میں مغلوب کر لیتے ہیں۔

فنِ تشریح سے ہندوؤں کی ناواقفیت

یہ بات کچھ قابلِ تعجب نہیں کہ ہندو و مسلم تشریح کو بالکل نہیں سمجھتے۔ کیونکہ وہ کبھی کسی انسان یا حیوان کے جسم کو نہیں چیرتے اور جب کبھی میں کسی زندہ بھیڑ یا بکری کو اس غرض سے چیرتا تھا کہ اپنے آقا کو دوران خون کا طرز اور وہ رگ دکھلاؤں جن کو پیکٹ نے دریافت کیا تھا اور جن میں ہو کر کیلوس کا خلاصہ قلب کے دائیں خانہ میں پہنچتا ہے تو ہندو ہمارے گھر سے حیران اور خوف زدہ ہو کر بھاگ جاتے تھے۔ مگر باوجود اس کے کہ ہندو اس فن سے محض ناآشنا ہیں، کہتے ہیں کہ انسان کے جسم میں پانچ ہزار رگیں ہیں اور اس سے کم ہیں نہ زیادہ، گویا کہ بڑی صحت اور غور سے انہوں نے ان کا شمار کیا ہوا ہے۔

ہندوؤں کے علمِ ہیئت کا ذِکر

علم ہیئت کا یہ حال ہے کہ ہندو اپنے پتروں کی رو سے خسوف اور کسوف کا حال پہلے ہی بتا دیتے ہیں اگرچہ ان کے بیان میں یورپی اہلِ ہیئت کی سی باریکی کے ساتھ صحت نہیں ہوتی۔ مگر پھر بھی وہ اکثر صحیح ہوتا ہے۔

چاند گہن کے سبب کی نسبت ہندوؤں کا عقیدہ

لیکن خسوف کی نسبت بھی ان کا وہی بے معنی اعتقاد ہے جو کسوف کی نسبت ہے یعنی یہ کہ ایک کالا اور ناپاک اور شریر راچھس جس کا نام راہو ہے، چاند کو پکڑ لیتا اور اس کو اپنے اثر سے تاریک کر دیتا ہے۔

ہندو چاند کو بالذات نورانی جانتے ہیں

اور زیادہ تر اسی دلیل سے ہندو یہ بھی کہتے ہیں کہ چاند چار لاکھ کوس کے فاصلہ پر

ہے یعنی سورج سے ڈیڑھ لاکھ میل اونچا ہے اور وہ ایک بالذات نورانی جسم ہے اور اس سے انسانوں کے دماغ میں امرت پہنچتا ہے، جو دماغ سے اتر کر آگے اور اعضا میں سرائیت کرتا ہے۔ چنانچہ پھر تمام اعضا اپنے اپنے عمل میں مصروفیت کے لائق ہو جاتے ہیں۔

ہندوؤں کے نزدیک چاند اور سورج بھی دیوتا ہیں

ان کو یہ بھی یقین ہے کہ چاند سورج اور ستارے یہ سب دیوتا ہیں۔

خیالی پہاڑ سمیر کا ذکر

اور جب سورج سمیر کے پیچھے چلا جاتا ہے اس وقت رات ہو جاتی ہے۔ سمیر ایک خیالی پہاڑ ہے جس کو فرض کر لیا گیا ہے کہ وسط زمین میں مصری کے الٹے کوزے کی طرح واقع ہے اور معلوم نہیں کتنے ہزار کوس بلند ہے۔ پس جب تک سورج اس پہاڑ کے پیچھے سے ہٹ کر نہیں آتا اس وقت تک دن نہیں نکلتا۔

علم جغرافیہ سے ہندوؤں کی ناواقفی کا ذکر

علم جغرافیہ سے بھی ہندو ایسے ہی ناواقف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا چپٹی اور مثلث شکل کی ہے اور اس میں سات ملک ہیں جو باعتبار اپنے باشندوں اور اپنی خوبصورتی اور ہر ایک طرح کی تکمیل کے ایک دوسرے مختلف ہیں اور ہر ملک اپنے خاص سمندر سے گھرا ہوا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ ایک سمندر دودھ کا ہے، دوسرا شہد کا، تیسرا گھی کا، چوتھا شراب کا اور آگے اسی طرح تری اور خشکی یکے بعد دیگرے چلے آتی ہے، یہاں تک کہ ساتواں ملک دامن کوہ سمیر میں ہے جو وسط میں واقع ہے۔ پہلا ملک جو سمیر کے نہایت قریب ہے اول درجہ کے دیوتاؤں سے آباد ہے اور دوسرے میں ان سے کم درجہ کے دیوتا ہیں اور اسی طرح باقی ممالک ہیں جن کے باشندے ہر ایک پہلے ملک سے رتبہ میں کم ہیں اور سب سے آخر ساتویں ملک ہے جس میں ہم انسان آباد ہیں جو ہر ملک کے دیوتاؤں سے بہت ہی کم درجہ کے ہیں۔ ہندو یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا بہت سے ہاتھیوں (۷۰ ۲) کے سروں پر اٹھائی ہوئی ہے، جن کی اتفاقیہ حرکت سے بھونچال آجاتا ہے۔

ہندوؤں کے علوم کی نسبت مصنف کی رائے

اگر قدیم برہموں کے علوم میں، جن کی اس قدر شہرت ہے، یہی تمام بے معنی

باتیں بھری ہوئی ہیں جن کو میں نے بالتفصیل لکھا ہے تو لوگوں نے بڑا دھوکا کھایا کہ ان کے علم و عقل کی نسبت دیر سے ایک ایسی تعریف اور مدح سرائی کرتے چلے آئے ہیں اور بالضرور مجھے اپنے تئیں اس امر پر مائل کرنے میں وقت پیش آتی کہ فی الواقع حقیقت حال یہی تھی بشرطیکہ میں ان باتوں پر غور نہ کرتا کہ اوّل تو ہندوؤں کا مذہب ایک ایسے زمانہ سے چلا آتا ہے۔ جس کا حال کچھ معلوم نہیں اور پھر ان کی مذہبی اور علمی کتابیں سب سنسکرت زبان میں ہیں جو مدت ہائے دراز سے ایک ایسی زبان ہو گئی ہے۔ جس کو کوئی نہیں بولتا اور اب صرف پڑھے لکھے لوگ ہی اس کو سمجھتے ہیں اور اس کی اصل نامعلوم ہے۔ غرض کہ ان تمام باتوں سے بہت ہی قدامت اور کہنگی ثابت ہوتی ہے (۷۱ ۲)۔

مصنف کا بنارس کے ایک بڑے پنڈت کے ساتھ چند اور پنڈتوں سے ملنا اور بت پرستی کی نسبت ان کے جوابات

جب میں دریائے گنگا سے نیچے کے ملک کی طرف جاتا تھا تو میں بنارس میں ہو کر گزرا اور ایک سب سے بڑے پنڈت سے، جو اس مشہور دارالعلم میں رہتا ہے، ملا۔ وہ ایک فقیر ہے جو اپنے علم و فضل کی وجہ سے ایسا مشہور ہے کہ شاہ جہاں نے کچھ تو اس کی فضیلت کے لحاظ سے اور کچھ راجاؤں کی خاطر سے اس کے واسطے دو ہزار روپیہ سال کی پنشن مقرر کر دی تھی۔ وہ ایک موٹا تازہ اور خوبصورت آدمی ہے اور اس کی پوشاک یہ ہے کہ ایک سفید ریشمی ساڑھی باندھے رہتا ہے جو پنڈلیوں تک لٹکتی رہتی ہے اور ایک کسی قدر بڑی سی سرخ ریشمی چادر کاندھوں پر ڈالی ہوئی ہوتی ہے۔ میں نے دہلی میں اس شخص کو بادشاہ اور امرا کے رُوبرو بھی اکثر یہی مختصر لباس پہنے دیکھا ہے اور دہلی کے بازاروں میں وہ مجھے یا تو پیدل یا پالکی میں سوار جاتا ملا ہے۔ ایک سال تک وہ ہمیشہ میرے آقا کے پاس اس امید پر آتا رہا کہ وہ اورنگ زیب سے سفارش کر کے اس کی پنشن بحال کرا دے جو اورنگ زیب نے جس کو اپنی دینداری دکھانے کا بڑا شوق تھا، تعصبِ مذہبی کی وجہ سے تخت پر بیٹھتے ہی بند کر دی تھی۔ میں نے اس مشہور فقیر سے بڑی ملاقات پیدا کر لی تھی اور میری اس سے اکثر دیر تک باتیں ہوا کرتی تھیں اور جب میں اس سے بنارس میں ملا تو وہ نہایت خلق اور مدارات سے پیش آیا اور مجھے وہاں کا کتب خانہ دکھانے لے گیا جہاں اس نے اور بھی بڑے بڑے چھ پنڈتوں کو بلا لیا تھا۔ جب میں نے اپنے تئیں ایسی عمدہ صحبت میں پایا تو میرا ارادہ ہوا کہ

اس بات کی تحقیق کروں کہ ان کی رائے بت پرستی کی نسبت کیا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ہندستان کو اب چھوڑنے والا ہوں جو ایک ایسی پرستش سے بدنام ہے جو معمولی سمجھ والے انسان کے نزدیک بھی خلافِ عقل ہے اور آپ جیسے اچارجوں کی شایان نہیں ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے مندروں میں بے شک مختلف مورتیں مثلاً برہما، مہادیو، گنیش اور گورمی کی ہیں جو ہمارے سب سے بڑے دیوتا ہیں اور ان کی مورتوں اور علاوہ بریں اور بہت سے دیوتاؤں کی مورتوں کا، جو ان سے درجہ میں کم ہیں، ہم بڑا ادب کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے آگے ڈنڈوت کرتے ہیں اور بڑی عقیدت سے پھول، چاول، گھی، زعفران خوشبوئیں اور ایسی ہی چیزیں ان پر چڑھاتے ہیں مگر باوجود اس کے ہمارا یہ اعتقاد نہیں کہ یہ مورتیں خود برہما یا بشن ہیں۔ بلکہ یہ قریب قریب ان کی اصلی مورتوں یا شبیہوں کے ہیں اور ہم ان کا ادب صرف اس دیوتا کی وجہ سے کرتے ہیں جن کی یہ مورتیں ہیں اور جو پوجا ہم کرتے ہیں وہ دیوتا کے واسطے ہے نہ کہ مورت کے لئے۔ ہمارے مندروں میں مورتیں اس لئے رکھی جاتی ہیں کہ دل کو قائم رکھنے کے واسطے جب تک نظر کو کسی خاص چیز پر نہ جمایا جائے تب تک پوجا عمدہ طور سے نہیں ہو سکتی۔ لیکن حقیقت میں اعتقاد ہمارا یہی ہے کہ خدا صرف وہی ایک ذات مطلق ہے اور صرف وہی سب کا مالک اور سب سے بڑھ کر ہے۔ پنڈتوں نے جو جواب مجھے دیا میں نے اس کو کم زیادہ کر کے نہیں لکھا۔ لیکن مجھے شک ہے کہ انہوں نے اس مدعا کو عمداً ایسے قالب میں ڈھال کر بیان کیا تھا کہ جو رومن کیتھلک (۲۷۲) فرقہ والوں کے خیالات کے مشابہ ہو جائے کیونکہ اور برہموں کے خیالات اس سے بالکل مختلف تھے۔

عمرِ دنیا کی نسبت ان پنڈتوں کا بیان

پھر میں نے دنیا کی عمر کی نسبت گفتگو کی اور میرے ہم صحبت پنڈتوں نے ہمارے معتقدات سے بھی بڑھ کر اس کی قدامت ظاہر کی۔ یہ تو نہیں کہا کہ دنیا کی کچھ ابتدا ہی نہیں، مگر جو عمر انہوں نے بتلائی اس سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ گویا وہ اس کو قدیم سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ بیان تھا کہ دنیا کی عمر چار جگوں سے شمار کی جاتی ہے اور ان کا جگ ہمارے قرنوں کی طرح سو برس کا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ جگوں کا شمار کروڑ برس سے کرتے ہیں۔ جو جو عمر انہوں نے ہر جگ کی علیحدہ علیحدہ طور پر بتلائی وہ مجھے ٹھیک یاد نہیں رہی لیکن

ایسا یاد پڑتا ہے کہ پہلا جگ یعنی ست جگ پچیس لاکھ برس تک رہا۔ پھر بارہ لاکھ سے زیادہ سال تک ترتیا جگ رہا۔ پھر (اگر میری کچھ غلطی نہ ہو تو) آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار برس تک دوآپر جگ رہا اور یہ میں بھول گیا کہ چوتھا یعنی کلجگ جو اب ہے کتنے لاکھ برس تک رہے گا۔ پنڈتوں نے کہا کہ پہلے تین جگ اور بہت سا حصہ چوتھے جگ یعنی کل جگ کا گزر چکا ہے اور جس طرح کہ ان جگوں کے خاتمہ پر دنیا قائم رہتی رہی ہے، چوتھے جگ کے ختم ہونے پر ایسا نہ ہوگا بلکہ دنیا "مہاپر نے" ہو کر نابود ہو جائے گی اور تمام چیزیں اپنے اپنے مبداء کی طرف عود کر جائیں گی۔ جب میں نے پنڈتوں کو اس بات کے لئے مجبور کیا کہ وہ دنیا کی عمر مجھے ٹھیک ٹھیک بتلائیں تو انہوں نے کئی مرتبہ حساب لگایا مگر جب میں نے دیکھا کہ وہ بے چارے اس میں بالکل الجھے ہوئے ہیں اور صرف لاکھوں کی تعداد کی نسبت ان کا اختلاف ہے تو میں نے اپنے تیئں اسی عام واقفیت پر مطمئن کر لیا کہ یہ دنیا نہایت ہی قدیم اور اس کی عمر کا حساب بڑا ہی تعجب انگیز ہے۔ جب کوئی شخص کسی پنڈت سے وہ وجوہات پوچھتا ہے جن سے کہ دنیا کے بے حد پرانا ہونے پر وہ اپنا اعتقاد رکھتے ہیں تو وہ ایک قسم کے بے فائدہ افسانے سنانے لگتا ہے اور آخر یہ کہہ دیتا ہے کہ وید میں ایسا ہی لکھا ہے (۲۷۳)۔

دیوتاؤں کی حقیقت کی نسبت ان پنڈتوں کا بیان

پھر میں نے ان کے دیوتاؤں کی حقیقت کی نسبت ان سے دریافت کیا مگر ان کا بیان نہایت منتشر پایا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے دیوتا تین قسم کے ہیں۔ نیک بد اور نہ نیک نہ بد۔ بعض کا اعتقاد ہے کہ دیوتا آگ سے بنے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ نور سے اور بہتوں کی یہ رائے ہے کہ وہ بیاپک ہیں (اور لفظ بیاپک کے معنی میں بجز اس کے کچھ نہیں سمجھا کہ خدا بیاپک ہے ہماری روح بیاپک ہے اور جو چیز بیاپک (۲۷۴) ہے وہ لازوال ہے) اور زمان و مکان سے مبرا و منزہ ہیں۔ اس فاضل فقیر اور اس کے ساتھی پنڈتوں نے کہا کہ بعض پنڈت دیوتاؤں کو اجزا ذات الٰہی کہتے ہیں اور بعض کی یہ رائے ہے کہ دیوتاؤں کی مختلف اقسام ہیں جو زمین پر پھیلے ہوئے ہیں۔

لنگ شریر کا مسئلہ جو شاستروں میں ہے، اس کی نسبت ان پنڈتوں کا بیان

مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے ان سے لنگ شریر کے مسئلہ کی نسبت بھی سوال کیا تھا جس کو ان کے بعض مصنف مانتے ہیں۔ مگر جو واقفیت مجھے اپنے پنڈت سے حاصل ہو چکی

تھی اس سے کچھ زیادہ حال معلوم نہیں ہوا یعنی یہ کہ چھوٹے چھوٹے نباتات اور درختوں اور حیوانات کے بیج نئے پیدا نہیں ہوتے بلکہ ابتدائے آفرینش سے ان کا وجود چلا آتا ہے اور وہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے اور دوسرے مادوں میں ملے جلے پڑے رہتے ہیں اور نہ صرف احتمالاً بلکہ حقیقتاً وہ بیج بالکل ویسے ہی کامل ہیں جیسے کہ خود وہ نبات یا درخت یا حیوان جس کے وہ بیج ہیں۔ لیکن وہ اپنی اس حالت میں ایسے چھوٹے اور باریک ہیں کہ ان کے جدا جدا اجزا اسی وقت صاف طور پر نظر آسکتے ہیں جبکہ وہ اپنی مناسب جگہ پر لائے جائیں اور وہاں پرورش کے مادہ کے پہنچنے سے بخوبی نمایاں ہوں اور ترقی پائیں۔ پس ہر ایک سیب یا ناشپاتی کے درخت کا بیج لنگ شریر یعنی سیب یا ناشپاتی کا ایک چھوٹا درخت ہے جو اپنے تمام ضروری اجزا میں کامل ہے۔ علیٰ ہٰذالقیاس ایک گھوڑے یا ہاتھی یا آدمی کا بیج لنگ شریر یعنی ایک چھوٹا گھوڑا یا ہاتھی یا آدمی ہے جس کے واسطے صرف جان اور پرورش کے ماده کی ضرورت ہے تاکہ وہ صاف طور پر اپنی صورت مرئیہ عرفیہ کو حاصل کر سکے۔

وحدت وجود کے مسئلہ کی بحث کا ذکر

اب میں آپ کو ایک اور مسئلہ کی نسبت ایک بحث کا حال سناتا ہوں۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا کہ اس مسئلہ کی بابت ہندوستان میں بڑا شوروغل تھا۔ یہاں تک کہ بعض پنڈتوں نے اس کو شاہجہاں کے بیٹوں داراشکوہ اور سلطان شجاع کے بھی ذہن نشین کر دیا تھا۔ آپ اس بات کو یقیناً جانتے ہیں کہ اکثر قدیم حکما لائف گوئنگ پرنسپل (Life giving principle) یعنی وحدت وجود کے مشہور و معروف مسئلہ کے قائل ہیں اور ان کا قول ہے کہ ہم تم جتنی جاندار مخلوقات ہیں سب ایک ہی وجود واحد کے اجزا ہیں۔ چنانچہ اگر ہم غور سے ارسطو اور افلاطون کی تصانیف کو دیکھیں تو غالباً ہم پر یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ وہ بھی اسی رائے کی طرف مائل تھے اور یہی عقیدہ ہندوستان کے قریباً تمام پنڈتوں کا ہے اور یہ وہی مسئلہ ہے جس کی نسبت صوفیوں اور اکثر علماء ایران کے باہم لڑائی جھگڑے رہا کرتے ہیں اور جس کو گلشن راز میں (۲۷۵) جو ایک فارسی نظم کی کتاب ہے، بڑے زور شور سے بیان کیا گیا ہے (۲۷۶) فلڈ کی بھی یہی رائے تھی جس کو ہمارے نامور گیسینڈی نے نہایت قابلیت کے ساتھ رد کیا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ ہمارے ہاں کے مہوس لوگ اکثر اس کے سبب سے خراب و برباد ہوئے ہیں۔ ہندو پنڈت اس مسئلہ کو تمام حکما سے زیادہ طول

دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا یا اس اعلیٰ وجود نے جس کو وہ اپنی زبان میں ایشور کہتے ہیں صرف یہی نہیں کہ اپنی ذات سے روح پیدا کی ہے بلکہ عموماً دنیا کی ہر ایک مادی اور جسمانی چیز کو بھی اسی طرح اپنی ذات سے پیدا کیا ہے اور اس مسئلہ خلق عالم کو وہ اس طرح پر خیال نہیں کرتے کہ علتِ تامہ کا وجود معاً مستلزم وجودِ معلولات کا ہوتا ہے۔ بلکہ اس طرح پر تصور کرتے ہیں جیسے مکڑی جب چاہتی ہے اپنے ہی اندر سے جالا تن دیتی ہے اور جب چاہتی ہے اس کو سمیٹ لیتی ہے۔ پس ان خیال بند فلسفیوں یعنی پنڈتوں کا قول ہے کہ پیدائش صرف اس کا نام ہے کہ خدا نے اپنی ہی ذات کو پھیلا دیا ہے یا یہ کہ ایک مکڑی کا تار ہے جو اس نے اپنے اندر سے نکال دیا ہے اور فنا یہ ہے کہ خدا پھر اپنی ذات یا اس تار کو اپنے ہی میں کھینچ لے۔ چنانچہ قیامت کے دن جس کو وہ پرلے یا مہاپرلے کہتے ہیں اور جس کی نسبت ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اس وقت تمام چیزیں نابود ہو جائیں گی، خدا اپنے تمام ان تاروں کو جو اس نے اپنے اندر سے نکال کر پھیلا دیئے تھے، بالکلیہ اپنے اندر کھینچ لے گا۔ اس لئے ان کی رائے ہے کہ جو کچھ ہم دیکھتے یا سنتے یا سونگھتے یا چکھتے یا چھوتے ہیں، ان میں کوئی چیز واقعی نہیں بلکہ تمام دنیا صرف ایک خواب و خیال ہے پس جو طرح طرح کی چیزیں بذریعہ حواسِ ظاہری محسوس ہوتی ہیں وہ سب کی سب ایک ہی چیز ہیں یعنی وہ سب حقیقتاً خدا ہیں، جیسے کہ اکائی کے عدد کو بار بار دوہرانے سے دس بیس سو اور ہزار کے اعداد بن جاتے ہیں اور دراصل وہ ایک ہی عدد ہے۔ لیکن اگر تم ان سے اس بات کی کوئی دلیل پوچھو یا ذاتِ الٰہی کے پھیل جانے اور پھر سمٹ جانے کی کچھ تشریح کراؤ اور طرح طرح کی صورتیں معلوم ہونے کی وجہ دریافت کرو یا یہ پوچھو کہ خدا جو غیر جسمانی اور بقول تمہارے بیاپک اور غیر متغیر ہے تو پھر کس طرح اس قدر اجسام متعددہ اور ارواح مختلفہ میں تقسیم ہو گیا ہے تو وہ اس کی عجیب مثالیں بیان کریں گے۔ مثلاً یہ کہ خدا بمنزلہ ا[illegible]ے سمندر کے ہے جس میں بہت سے بلبلے تیرتے رہتے ہیں خواہ یہ بلبلے کہیں چلے جائیں مگر وہ ہمیشہ اسی سمندر اور اسی پانی میں رہتے ہیں اور اگر وہ بیٹھ جائیں تو جس پانی سے وہ بنے تھے وہ اسی سمندر میں حل ہو جائے گا (۲۷۷)۔ یا یوں کہیں گے کہ خدا ایک ایسی روشنی کی مانند ہے جو بیشمار شیشوں پر پڑ رہی ہے۔ پس اگرچہ ہر جگہ اس ایک ہی روشنی کا جلوہ اور ظہور ہے مگر جن چیزوں پر وہ پڑتی ہے ان کی مختلف رنگتیں اس وجہ سے ہو جاتی ہیں کہ وہ مختلف صورتوں میں سے ہو کر ان چیزوں پر پڑتی ہے۔ غرض کہ وہ تمہیں ایسی ایسی ناقابلِ تشفی تشبیہیں دے کر

جن کو خدا سے کچھ بھی نسبت نہیں اور جو صرف جاہلوں کے فریفتہ کرنے کے لائق ہوتی ہیں ،ٹال دیں گے اور تمہارا جوابِ شافی کی امید کرنا بے فائدہ ہے۔ اگر کوئی ان کو یہ جواب دے کہ مثلاً جو حباب ایک پانی پر ہیں اگرچہ ویسے ہی دوسرے پانی پر بھی ہو سکتے ہیں لیکن حقیقت میں کئی پانی ایک نہیں ہے اور اسی طرح تمام دنیا پر آفتاب کی روشنی گو ایک سی ہے لیکن جگہ وہی نہیں ہے اور علیٰ ہٰذاالقیاس تمہارے ان تمام تصورات پر اور بھی بڑے بڑے اعتراض ہو سکتے ہیں تو وہ پھر اسی طرح تشبیہوں اور استعاروں کو لے بیٹھیں گے جیسے کہ صوفی اپنی کتاب گلشنِ راز کے عمدہ اشعار کی طرف رجوع کیا کرتے ہیں۔

مصنف کے خط کا خاتمہ

اب میں بلحاظ اس تمام بے وقوفی اور اس طفلانہ خوف وہراس کے ، جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اور بلحاظ اس متوہمانہ اتقا اور ہمدردی کے خیالات کے جو سورج کو اس بد طینت اور کالی بلا سے نجات دلانے کی غرض سے سورج کی نسبت ظاہر کئے جاتے ہیں اور بلحاظ اس دکھاوے کی پاٹھ پوجا اور اشنان اور ہُن دان اور خیراتوں کے ، جو برہموں کو دی جاتی یا دریاؤں میں پھینکی جاتی ہیں ، اور بلحاظ عورتوں کی اس مجنونانہ جرأت کے کہ اپنے ایسے خاوندوں کی لاشوں کے ساتھ بھی جل کر مر جاتی ہیں کہ جن سے ان کی حیات میں وہ اکثر نفرت کرتی رہتی تھیں اور بلحاظ فقیروں کے ان طرح طرح کے مجنونانہ اعمال واشغال کے اور سب سے اخیر میں بلحاظ ویدوں اور ہندوؤں کی پوتھیوں کی اس تمام خرافات کے ، آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگرچہ زمانۂ حال کے نکتہ چین اشخاص سفر کے مصائب اور تکالیف اٹھائے بغیر گھر بیٹھے ہی اپنی تحریروں کے ایسے ایسے سرنامے وغیرہ گھڑنا اور بیان کرنا مجھ سے بہتر جانتے ہیں ، مگر میرا یہ خط جو میرے ان دور دراز سفروں اور اس قدر تحقیقات اور فکر کا ایک بے سود مآل ہے ، اگر مندرجہ ذیل الفاظ کو میں اس کا عنوان قرار دوں تو کیا میں ایسا کرنے کی نسبت کوئی وجہ نہیں رکھتا؟ اور وہ الفاظ یہ ہیں کہ "کیسے ہی فضول اور بے معنی خیال کیوں نہ ہوں پھر بھی انسان کے دل میں جگہ پا ہی جاتے ہیں"۔

آپ کی بڑی عنایت ہوگی اگر آپ چپل صاحب کے نام کا ملفوفہ خط (۸ ـ ۰) ان کے حوالہ کر دیں گے ۔ یہ چپل صاحب ہی تھے جنھوں نے پہلے پہل آپ کے نامور دلی دوست کیمبنڈی صاحب سے میری ملاقات کرائی تھی ، جو میرے حق میں بہت ہی مفید

ہوئی ہے۔ ان کی اس عنایت کا میں اتنا ممنون ہوں کہ جہاں میری تقدیر مجھ کو لے جائے گی مجھے محبت کے ساتھ وہ ہر جگہ یاد رہیں گے۔ میں آپ کا بھی بڑا ممنون ہوں اور نہ صرف اس وجہ سے کہ آپ میرے حال پر نظرِ عنایت مبذول فرماتے رہے، میں عمر بھر آپ کا ادب کرتا رہوں گا بلکہ اس سبب سے بھی کہ آپ اپنے متواتر خطوط میں اکثر مجھے فائدہ مند صلاحیں دیتے رہے ہیں جن سے میرے سفر میں مجھے بہت مدد ملی اور میں اس باعث سے بھی آپ کا بڑا احسان مند ہوں کہ آپ نے بے غرضانہ اور محض اپنی عنایت سے دنیا کے اس بعید حصہ میں جہاں میرا شوق مجھ کو لے آیا ہے، میرے لئے عمدہ عمدہ کتابیں بھیج دی ہیں۔ حالانکہ جن لوگوں سے میں نے کتب مذکورہ کے لئے درخواست کی تھی اور جن کو ان کی قیمت کا روپیہ مقام مارسیلز میں میرے زرِ امانتی سے مل سکتا تھا اور جن پر بلحاظ اہلیت اور انسانیت کے یہ بات فرض تھی کہ کتب مطلوبہ میرے پاس بھیج دیتے، وہ مجھے بالکل ہی بھول گئے اور میرے خطوط کو دیکھ کر ہنسا کئے گویا کہ انہوں نے مجھے ایسا گیا گزرا سمجھ لیا جس کا پھر کبھی منہ ہی نہیں دیکھنا۔

مصنف کا خط بنام موسیو ڈی لا ماتھی لی وے ار

جس میں شہر دہلی اور آگرہ اور شہنشاہ مغل کے دربار اور ہندوستانی لوگوں کے ذہن وذکا اور رسم ورواج کا بیان ہے

مؤرخہ یکم جولائی ۱۶۶۳ء بمقام دہلی

صاحبِ من۔ میں خوب جانتا ہوں کہ جس وقت میں فرانس کو واپس آؤں گا تو سب سے پہلے آپ مجھ سے یہ پوچھیں گے کہ بمقابلہ پیرس اس ملک کے دارالسلطنت، شہروں آگرہ اور دہلی کی وسعت اور آبادی اور خوبصورتی کا کیا حال ہے؟ پس آپ کے شوق کی وجہ سے میں اوّل انہی امور کا بیان کرتا ہوں اور ان کے ضمن میں بعض اور حالات بھی گزارش کروں گا، جن کی نسبت میں خیال کرتا ہوں کہ آپ غالباً ان کو بھی دلچسپ تصور کریں گے۔

یورپ اور ہندوستان کی عمارتوں کے مختلف الوضع ہونے کا سبب

ان دونوں شہروں کی خوبصورتی کی نسبت کچھ کہنے سے پہلے مجھے یہ بیان کرنا لازم ہے کہ اہل یورپ مقیم ہند کو حقارت کے ساتھ یہ کہتے دیکھ کر کہ ان دونوں اور نیز ہندوستان کے اور شہروں کی عمارتیں یورپ کی سی خوش وضع نہیں ہیں، مجھے حیرت ہوئی۔ لیکن وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ عمارات کی قطع اور وضع ہر ملک کی آب و ہوا کے لحاظ سے ہوتی ہے، مثلاً جس وضع کی عمارت پیرس اور لندن یا ایمسٹرڈم میں فائدے اور آرام کے اعتبار سے وہاں کے لائق ہے، دہلی اور آگرہ میں بالکل ناکارآمد ہے۔ چنانچہ بفرض امکان اس امر کے کہ یہ شہر ہندوستان میں آجائیں اور یہاں کے شہر وہاں جا رہیں، تو ان کی عمارات کو توڑ پھوڑ کر بالکل ایک نئی قطع پر بنانا ضرور ہوگا۔ بے شبہ یورپ کے شہر بہت خوبصورت اور اس ملک کی سرد آب و ہوا کے موافق ہیں۔ لیکن دہلی بھی اپنی وضع پر اس گرم ملک کی آب و ہوا کے لحاظ سے خوش وضعی سے خالی نہیں۔ ہندوستان کی گرمی اس قدر شدید ہے کہ کوئی اور تو کیا خود بادشاہ بھی پاؤں کی حفاظت کے لئے پاتابے نہیں پہنتا اور صرف ہلکے سلیپر کی طرح کی ایک چیز پہنتا ہے جسے "پاپوش" کہتے ہیں اور سر کی محافظت کے لئے نہایت نفیس اور نازک قسم کے کپڑے کی ایک چھوٹی سی پگڑی ہوتی ہے اور اور لباس بھی ایسا ہی ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ گرمی کے موسم میں مکان کی دیوار یا سرہانے کے تکیہ پر مشکل سے ہاتھ یا سر رکھا جاتا ہے اور چھ مہینے سے زیادہ ہر ایک متنفس مکان کے باہر بغیر کسی قسم کے سایہ کے سوتا ہے۔ عوام کا یہ حال ہے کہ گلیوں اور کوچوں ہی میں پڑ رہتے ہیں اور بڑے بڑے تاجر اور اور آسودہ حال لوگ کبھی گھر کے صحن یا باغ میں اور کبھی مکان کے چبوترے پر، جس کو پہلے سے پانی چھڑک کر ٹھنڈا کر رکھتے ہیں، آرام کرتے ہیں۔ اب اس حالت میں اگر بالفرض پیرس کے مشہور محلے سینٹ جیکس یا سینٹ ڈینس مع اپنے بند وضع اور بے شمار منزلوں کے مکانات کے دہلی میں آجائیں تو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا ان میں یہاں کوئی رہ سکے گا۔ یا رات کو جبکہ ہوا کے حبس سے گرمی کے مارے دم گھٹنے لگتا ہے، کوئی سو سکے گا؟ فرض کیجئے کہ ایک شخص گھوڑے پر پھر پھرا کر گھر میں آیا ہے اور گرمی اور گرد کے مارے ادھ موا ہو رہا ہے اور حسب معمول پسینہ میں تربتر ہے تو کیا ہی لطف ہو اگر اس کو تنگ و تاریک زینہ سے چڑھ کر چوتھی منزل پر جانا اور پھر وہاں ایسے کمرہ میں ٹھہرنا پڑے کہ جہاں مارے

گرمی کے دم ہی گھٹ جائے۔ ہندوستان میں اس قسم کی تکلیف کے سامان نہیں ہیں۔ یہاں تو سواری سے آکر فوراً تھوڑا سا تازہ ٹھنڈا پانی یا شمبو کا شربت پی لینا اور کپڑے اتار کر اور منہ ہاتھ دھو کر سایہ میں پلنگ پر لیٹ جانا اور ایک دو خدمتگاروں کو یہ کہنا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے پنکھے لے کر جھلنا شروع کریں۔

شہر دہلی کا ذکر

اب میں آپ کو دہلی کی ٹھیک ٹھیک کیفیت سناتا ہوں۔ پھر آپ خود غور کر سکیں گے کہ یہ شہر خوبصورت ہے یا نہیں۔ قریب چالیس برس کے گزرے کہ شہنشاہ حال کے والد شاہ جہاں نے اپنی دائمی یادگار کے لئے پرانی دلی کے پاس ایک نیا شہر آباد کیا اور اس کا نام اپنے نام پر شاہ جہاں آباد (۲۷۹) یا اختصار کے لئے "جہان آباد" رکھا اور اس کے دارالسلطنت بنانے کے لئے یہ وجہ ظاہر کی کہ گرمی کی شدت کے سبب سے آگرہ بادشاہ کے قیام کے لائق نہیں ہے۔ لیکن اس سبب سے کہ اس کی تعمیر کے لئے اکثر مصالحہ پرانی دلی کے آس پاس کے کھنڈروں سے بہم پہنچایا گیا تھا، پردیسی آدمی پرانے اور نئے شہر میں تمیز نہیں کرتے اور دونوں کو دہلی ہی کہتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں اکثر یہ نیا شہر اپنے بانی ہی کے نام سے بولا جاتا ہے۔ بہر حال آسانی کے لئے میں نے بھی اہلِ یورپ ہی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

شہر دہلی ایک ہموار زمین پر جمنا کے کنارے پر جو لوائر کے برابر ایک دریا ہے، ہلالی صورت میں آباد ہے اور اس طرف کے سوا جدھر دریا کے سبب سے (جس پر کشتیوں کا پل بندھا ہوا ہے) محفوظ ہے، حفاظت کے لئے سب طرف پختہ شہر پناہ بنی ہوئی ہے اور اگر ان برجوں سے، جو سو سو قدم کے فاصلہ پر شہر پناہ کے کنارے بنے ہوئے ہیں اور اس کچے پشتے سے جو قریب چار یا پانچ فرانسیسی فٹ کے اونچا ہے، قطع نظر کی جائے تو یہ بہت نامکمل ہے۔ کیونکہ نہ تو اس کے گرد خندق ہے اور نہ کوئی اور بچاؤ کا سامان ہے۔

یہ حصار اگرچہ شہر اور قلعہ دونوں پر محیط ہے لیکن اس کی وسعت اس قدر نہیں کہ جتنی لوگ خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ میں تین گھنٹہ کے عرصہ میں اس کے گرداگرد پھر گیا ہوں۔ حالانکہ میں خیال کرتا ہوں کہ میرے گھوڑے کی چال فی گھنٹہ ایک لیگ فرانسیسی یعنی تین میل سے زیادہ نہ تھی (۲۸۰)۔ میں اس تخمینہ میں شہر کے گردونواح کی آبادیوں کو جو

بہت سی ہیں اور بہت دور تک لاہوری دروازہ کی جانب بستی چلی گئی ہیں، اس میں شامل نہیں کرتا اور نہ پرانی دلی (۲۸۱) کے اس بے شمار بقیہ کو اور نہ ان تین چار چھوٹی چھوٹی بستیوں کو جو شہر کے نواح میں ہیں۔ کیونکہ ان کو شامل کر لینے سے شہر کی وسعت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اگر بیچوں بیچ ایک سیدھا خط کھینچا جائے تو ساڑھے چار میل سے زیادہ ہو اور اگرچہ باغات وغیرہ کے بیچ میں آجانے کی وجہ سے میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا کہ شہر کا کل دور کس قدر ہے لیکن کچھ شک نہیں کہ بہت ہی زیادہ ہے۔

قلعہ (۲۸۲) جس میں شاہی محل سرا اور اور بادشاہی مکانات ہیں اور جن کا ذکر میں آئندہ کروں گا، قریباً نصف دائرہ کی شکل کا ہے اور سامنے دریائے جمنا بہتا ہے اور قلعہ کی دیوار اور پانی کے مابین ایک ریتلا وسیع میدان ہے جس میں ہاتھیوں کی لڑائی دکھائی جاتی ہے اور امیروں اور سرداروں اور ہندو راجاؤں کی فوجیں بادشاہ کے ملاحظہ کے واسطے کھڑی کی جاتی ہیں، جن کو بادشاہ محل کے جھروکوں میں سے دیکھا کرتا ہے۔

قلعہ کی دیوار اپنی پرانی وضع کے گول برجوں کے لحاظ سے شہر پناہ کے مشابہ ہے۔ لیکن چونکہ یہ کچھ اینٹ کی اور کچھ لال پتھر کی بنی ہوئی ہے، جو سنگ مرمر کے مشابہ ہے، اس سبب سے شہر پناہ کی بہ نسبت زیادہ خوبصورت ہے اور شہر پناہ سے اونچا اور مضبوطی اور چکلان میں بھی زیادہ ہے اور شہر کے رخ چھوٹی چھوٹی توپیں چڑھی ہوئی ہیں اور دریا کی جانب کے سوا قلعہ کے سب طرف پختہ اور عمیق خندق بنی ہوئی ہے۔ جس کی روکار کے پتھر صاف اور گھڑے ہوئے ہیں اور جو پانی سے بھری رہتی ہے، جس میں کثرت سے مچھلیاں ہیں۔ یہ عمارت اگرچہ بظاہر مضبوط نظر آتی ہے لیکن اصل میں کچھ مستحکم نہیں ہے اور میری دانست میں ایک متوسط طاقت کا توپخانہ اس کو فوراً زمین کے برابر کر دے سکتا ہے۔ اس خندق کے قریب ہی ایک بڑا باغ ہے جو پھولوں اور پودوں سے ہمیشہ ہرا بھرا رہتا اور قلعہ کی عظیم الشان اور سرخ رنگ کی فصیل کے سامنے ہونے کی وجہ سے بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے اور اس باغ کے متصل ایک بادشاہی چوک ہے جس کے ایک طرف تو قلعہ کا دروازہ ہے اور دوسری جانب شہر کے دو بڑے بازار آن کر ختم ہوئے ہیں۔ جو ملازم راجہ حسب معمول ہفتہ وار چوکی دینے آتے ہیں، ان کے خیمے اس چوکور میدان میں لگائے جاتے ہیں کیونکہ یہ لوگ جو ایک قسم کے چھوٹے چھوٹے بادشاہ ہیں قلعہ میں رہنے سے سخت عذر کرتے ہیں۔ اور اسی لئے قلعہ کے اندر کا پہرہ امرا اور منصب داروں کا ہوتا ہے اور اس

جگہ صبح کے وقت بادشاہی گھوڑے جو اس کے قریب ہی ایک بڑے اصطبل میں رہتے ہیں، پھرائے جاتے ہیں۔ اور یہیں سواروں کی فوج کا میر بخشی نو ملازم سواروں کے گھوڑوں کو دیکھتا بھالتا ہے اور اگر وہ ترکی کی نسل کے اور اچھے مضبوط اور پیمانہ کے پورے ہوں تو ان کی ران پر بادشاہی اور اس امیر کا داغ دلوا دیتا ہے جس کی فوج میں وہ بھرتی ہوں اور اس سے یہ فائدہ ہے کہ انہی گھوڑوں کو دوسرے نو ملازم سوار مستعار لے کر موجودات کے وقت پیش نہیں کرسکتے۔ اسی جگہ انواع و اقسام کی بیشمار چیزوں کی خرید و فروخت کے لئے گزری لگتی ہے جو پیرس کے پونٹ نی آف (۲۸۳) کی طرح ہر قسم کے کنگالوں اور بھان متیوں اور ہندو اور مسلمان نجومیوں اور زر تالوں کا مرجع ہے اور یہ فاضل نجومی دھوپ میں ایک میلا سا قالین کا ٹکڑا بچھائے بیٹھے رہتے ہیں جن کے پاس علم ریاضی کے کچھ پرانے آلات ہوتے ہیں اور سامنے ایک بڑی سی کتاب کھلی رہتی ہے جس میں بارہ برجوں کی شکلیں بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور اس طور سے وہ راہ چلتے لوگوں کو پھسلاتے اور فریب دیتے ہیں اور عوام الناس غیب داں سمجھ کر ان سے رجوع کرتے ہیں اور یہ ایک پیسہ لے کر بے چارے حمقا کو بتاتے ہیں کہ ان کی قسمت میں آئندہ کیا ہونا ہے اور ان کے ہاتھ اور چہرہ کو خوب دیکھ بھال کر اور کتاب کے ورق الٹ پلٹ کر یقین دلاتے ہیں کہ گویا واقعی کچھ حساب لگا رہے ہیں۔ اور یہ لوگ جس کام کی بابت ان سے سوال کرتے ہیں اس کے لئے وقت اور "ساعت" یعنی مہورت بتاتے ہیں اور نادان عورتیں سر سے پاؤں تک ایک سفید چادر اوڑھ کر ان کے پاس جمع ہوتی ہیں۔ اور اپنی تمام عمر کے امور کی نسبت ان سے پوچھ گچھ کرتی اور اپنے تمام دلی بھید ان سے کہہ دیتی ہیں، جس طرح فرانس میں ایک وسواسن عورت اپنے پادری کے پاس جاکر توبہ کے قصد سے اپنے تمام گناہ ظاہر کردیتی ہے۔ اور یہ بے وقوف اور جاہل یقین رکھتے ہیں کہ ستاروں کی تاثیر کا بدل دینا ان لوگوں کے اختیار میں ہے۔ ان نجومیوں میں سب سے زیادہ ہنسی کے لائق ایک دوغلہ پرتگیز تھا جو گوا سے بھاگ آیا تھا۔ یہ مسخرہ بھی اپنا قالین بچھائے بڑی تمکنت سے بیٹھا رہتا تھا اور اس کے پاس بھی بہت سے سائل آتے تھے حالانکہ وہ کچھ لکھ پڑھ بھی نہ سکتا تھا اور اس کے پاس آلات نجوم کے عوض صرف ایک پرانا جہازی قطب نما تھا اور کتابوں کی جگہ رومن کیتھلک فرقہ کی نماز کی پرتگیزی زبان میں دو پرانی باتصویر کتابیں تھیں جن کی تصویروں کو کہتا تھا کہ یورپ میں برجوں کی صورتیں اسی طرح کی بناتے ہیں۔ ایک دن فرقہ جیسویٹ کے پیشوا فادر

ئوزی صاحب نے اس کو اس کام میں مشغول دیکھ کر پوچھا کہ تو یہ کیا کرتا ہے تو اس نے شرمندہ ہونے کی جگہ یہ جواب دیا کہ "ایسے بے وقوفوں کا نجومی ایسا ہی چاہئے"۔ یہ ذکر میں ان غریب نجومیوں کا کرتا ہوں جو بازاروں میں دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ منجم جو امیروں کے پاس آتے جاتے ہیں وہ ان کو بڑا علامہ سمجھتے ہیں اور اس طرح پر یہ دولتمند ہو جاتے ہیں۔ تمام ایشیا میں یہ بے اصل وہم پھیلا ہوا ہے اور خود بادشاہ اور بڑے بڑے امیر ان فریبی غیب گویوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیتے ہیں اور بغیر ان کی صلاح کے کوئی ادنی کام بھی شروع نہیں کرتے۔ یہ نجومی گویا آسمان میں لکھی ہوئی باتیں جانتے اور ہر ایک کام کے کرنے کے لئے مبارک گھڑی تجویز کرتے اور ہر ایک شبہ کو قران سے فال نکال کر حل کرتے ہیں۔

وہ دو بڑے بازار جن کا ابھی ذکر ہوا اور جو اس چوکور میدان میں آکر ملتے ہیں ان کا عرض قریب پچیس یا تیس قدم کے ہوگا اور جہاں تک کہ نظر پہنچتی ہے وہ سیدھے چلے جاتے ہیں اور ان میں سے جو بازار لاہوری دروازہ کو جاتا ہے وہ بہت لمبا ہے۔ بلحاظ وضع عمارت یہ دونوں بازار ایک ہی سے ہیں اور جیسا کہ پیرس کا بازار معروف پلیس رائل ہے اسی طرح ان کے بھی دونوں جانب کی دکانیں محراب دار ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ ایک تو ان کی عمارت خشتی ہے دوسرے یہ کہ یہ ایک منزلی ہیں اور ان کی چھتیں بطور ایک مسطح چبوترے کے کام دیتی ہیں اور یہ بھی تفاوت ہے کہ پلیس رائل کی دکانوں کے برانڈے اس قطع کے ہیں کہ ان میں داخل ہو کر انسان بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاسکتا ہے اور ان کی دکانوں کے برانڈے علیحدہ علیحدہ ہیں جن کے بیچ میں دیواریں حائل ہیں، جن میں بیٹھ کر دن کے وقت اہلِ حرفہ اور صراف اپنا اپنا کام کرتے اور بیوپاری اپنا مال خریداروں کو دکھاتے ہیں۔ ان محرابی برانڈوں کے پیچھے اسباب رکھنے کے لئے کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں جن میں رات کے وقت سب اسباب رکھ دیا جاتا ہے اور اوپر بیوپاریوں کے رہنے کے لئے بالاخانے بنے ہوئے ہیں جو بازار کی طرف سے خوبصورت نظر آتے ہیں اور ہوادار اور آرام کے قابل اور گرد و غبار سے محفوظ ہیں اور ان کے آگے برانڈے کی چھت جو صحن کے طور پر ہے، جو لوگ ان میں رہتے ہیں وہ رات کو اس پر سوتے ہیں مگر ایسے بالاخانے سب دکانوں پر نہیں ہیں اور اگرچہ شہر کی بعض بعض اور اطراف میں بھی اسی طرح کسی کسی دکان پر اچھے بالاخانے بنے ہوئے ہیں مگر ان اطراف میں کوٹھڑیوں کے اوپر جو بالاخانے ہیں اکثر ایسے پست بنے ہوئے ہیں کہ بازار میں سے خوبی دکھائی نہیں دیتے۔ مگر

متمول بیوپاری دکانوں پر نہیں سوتے بلکہ کام کاج کے بعد اپنے اپنے مکانوں کو جو شہر میں ہیں چلے جاتے ہیں۔

ان کے سوا پانچ بازار اور ہیں اور اگرچہ ان کی قطع اور وضع بھی انہی کے قریب قریب ہے۔ لیکن ایسے لمبے اور سیدھے نہیں ہیں اور ان کے علاوہ گلیوں اور کوچوں میں جو بے شمار بازار ہیں اور جو ایک دوسرے کو تقاطع کرتے ہیں ان میں سے اگرچہ اکثر کے سامنے کی عمارت محرابی طور کی ہے مگر چونکہ وہ ایسے لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں جن کو عمارت کے تناسب کا کچھ خیال نہ تھا اس لئے ان میں بہت کم ایسے خوش قطع اور سیدھے اور عریض ہیں جیسے کہ وہ بازار ہیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

شہر کے گلی کوچوں میں جو منصب داروں اور حکام عدالت اور دولتمند تاجروں اور اور لوگوں کے مکانات ہیں ان میں بھی بہت سے اچھے خاصے خوبصورت ہیں۔ مگر اینٹ یا پتھر کے بنے ہوئے مکان بہت تھوڑے اور کچے اور خس پوش زیادہ ہیں لیکن باوجود اس کے عموماً ہوادار اور خوشنما ہیں اور اکثروں میں چوک اور باغیچے ہیں اور بہت آرام کے اور ہر قسم کے سامان سے آراستہ ہیں اور جو مکان خس پوش ہیں وہ بھی اچھے لمبے اور مضبوط بانس کے چھپروں سے چھائے ہوئے اور کھگل اور سفیدی کئے ہوئے ہیں اور یہ بے شمار خس پوش اور چھوٹے چھوٹے مکانات، جو بڑے بڑے مکانات کے ساتھ خلط ملط ہیں، ان میں معمولی فوجی، سوار اور ان گنت نفر خدمت گار اور نان بائی وغیرہ جو بادشاہ اور لشکر کے ساتھ جایا کرتے ہیں رہتے ہیں اور ان کے سبب سے شہر میں اکثر آگ لگ جاتی ہے۔ چنانچہ پچھلے برس تین بار ایسی آگ لگی کہ تیز ہوا کے سبب سے جو گرمی کے موسم میں چلا کرتی ہے قریباً ساٹھ ہزار چھپروں پر پانی پھر گیا اور چند اونٹ اور گھوڑے اور بہت سی پردہ دار عورتیں بھی جل بھن گئیں کیونکہ یہ بے چاریاں ایسی شرماؤ اور اپاہج ہوتی ہیں کہ نامحرم لوگوں سے منہ چھپانے کے سوا ان سے کچھ بن ہی نہیں آتا۔ چنانچہ جو عورتیں اس صدمہ سے ہلاک ہوئیں وہ اتنی ہمت نہ رکھتی تھیں کہ بھاگ کر بچ جائیں۔ ان کچے اور خس پوش مکانوں کے باعث سے میں ہمیشہ یہ خیال کیا کرتا ہوں کہ سوائے اتنے فرق کے کہ آرام کے بعض سامان اس میں زیادہ ہیں، دہلی گویا چند دیہات کا مجموعہ یا فوج کی چھاؤنی ہے۔

امرا کے مکانات اگرچہ اکثر دریا کے کنارے اور شہر کے باہر ہیں لیکن اور مقامات میں بھی ہیں اور اس گرم ملک میں اسی مکان کو عمدہ سمجھتے ہیں جس میں سب طرح کا آرام ہو

اور سب طرف کی اور خاص کر شمال کے جانب کی ہوا آتی ہو۔ چنانچہ وہ مکانات عمدہ سمجھے جاتے ہیں جن میں ایک اچھا صحن اور باغیچہ اور درخت اور حوض اور دالان کے اندر یا دروازہ میں چھوٹے چھوٹے فوارے لگے ہوں اور خوبصوت تہ خانے ہوں جن میں بڑے بڑے پنکھے لگے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنی خنکی کی وجہ سے گرمی کے دنوں میں دوپہر سے چار یا پانچ بجے تک جب کہ ہوا ایسی گرم ہوتی ہے کہ سانس نہیں لیا جا سکتا، بہت آرام کی جگہ ہوتے ہیں مگر تہ خانوں کی بہ نسبت اکثر لوگ خس خانوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو چھوٹے چھوٹے پاکیزہ کمرے ہوتے ہیں جو ایک قسم کی گھاس کی خوشبودار جڑوں سے بنائے جاتے اور چمن کے اندر اس غرض سے حوض کے قریب لگائے جاتے ہیں کہ خدمتگار لوگ چمڑے کی ڈولچیوں سے ان کو باہر کی طرف سے آسانی کے ساتھ چھڑک سکیں اور اس قطع کا مکان سب سے عمدہ خیال کیا جاتا ہے جس کے چاروں طرف قد آدم اونچے دالان ہوں جن میں چاروں طرف کی ہوا آتی ہو اور ایک بڑے چمن (۲۸۴) کے اندر بنا ہوا ہو اور فی الواقع کوئی عمدہ مکان ایسا نہیں ہے جس میں گھر والوں کے سونے کے لئے صحن چبوترہ نہ ہو جہاں سے بارش یا آندھی کے وقت یا جب صبح کو سرد ہوا چلنے یا شبنم پڑنے لگتی ہے، پلنگ کو سرکا کر اندر کر لیا جاتا ہے۔ یہ شبنم اگرچہ زیادہ نہیں ہوتی مگر بدن میں سرائت کر جاتی ہے جس سے اکثر ہاتھ پاؤں اکڑ جاتے ہیں۔

اچھے گھروں میں نشست کا یہ طریقہ ہے کہ فرش کے اوپر روئی کا ایک بھاری اور قریب چار انگل کے موٹا گدیلا بچھا رہتا ہے جس پر گرمی کے دنوں میں عمدہ سفید کپڑا (چاندنی) اور جاڑوں میں ریشمین قالین بچھاتے ہیں اور دالان کے صدر میں ایک یا دو گدیلے بچھے رہتے ہیں جن پر ریشم کے ہلکے کام کی سوزنی جس پر سنہری اور روپہلی زری کی دھاریاں بنی ہوئی ہوتی ہیں، پڑی رہتی ہیں اور صاحب خانہ اور معزز اور ممتاز لوگ جو ملاقات کو آتے ہیں اس پر بیٹھتے ہیں اور ہر ایک گدیلے پر کمخاب کا ایک گاؤ تکیہ بھی لگا رہتا ہے اور اس کے علاوہ اہل مجلس کے آرام کے لئے دالان کے گرداگرد کمخاب اور مخمل اور پھولدار ریشمین کپڑے کے غلافوں کے چند اور تکیے بھی لگے رہتے ہیں اور دالان کے چاروں طرف جو زمین سے قریب دو یا ڈیڑھ گز اونچے بہت معقول اور باقرینہ مختلف شکل کے طاق بنے ہوئے ہوتے ہیں ان میں عمدہ عمدہ چینی کے برتن اور گلدان رکھے جاتے ہیں اور دالان کی چھت منقش اور ملمع کاری کی ہوتی ہے مگر انسان یا کسی اور جاندار شے کی تصویر اس پر نہیں ہوتی کیونکہ مذہب

اسلام میں ممنوع ہے۔

یہ ہندوستان کے ایک عمدہ مکان کا قریباً صحیح بیان ہے اور دہلی میں ایسے مکانات بہت سے موجود ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ بغیر یورپ کے مکانوں کی ہجو کے بلااندیشہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کے دارالسلطنت کی عمارتیں اگرچہ یورپین عمارتوں سے کسی طرح کی بھی مشابہت نہیں رکھتیں مگر تاہم خوبصورتی سے خالی نہیں۔ مگر جو چیز کہ یورپ کے شہروں کی زیب وزینت کا باعث ہے وہ خوشنما اور شاندار دُکانیں ہیں جو دہلی میں نہیں ہیں اور اگرچہ یہ شہر ایک عالیشان اور طاقتور بادشاہ کے دربار کا مقام ہے جہاں لازمی طور پر ہر قسم کی بیش قیمت اشیا کا جمع ہو جانا ایک ضروری امر ہے تاہم کوئی ایسا بازار یہاں نہیں ہے جیسا ہمارا اسینٹ ڈینس ہے جس کا مقابل اور ہمسر غالباً تمام ایشیا میں نہ ہوگا۔

یہاں بیش قیمت مال اکثر مال خانوں میں دھرا رہتا ہے اور یورپ کی طرح دکانیں بھڑک دار اور بیش قیمت اسباب سے شاذونادر ہی آراستہ نظر آتی ہیں اور اگر ایک دکان میں پشمینہ کمخاب اور زری کار مندیلیں اور ریشمین کپڑے وغیرہ ہیں تو پاس ہی کوئی پچیس ڈکانوں میں گھی، تیل، دال، چاول، گیہوں، جو وغیرہ بے شمار قسم کے اناج جو نہ صرف ہندوؤں کی معمولی غذا ہے جو کبھی گوشت نہیں کھاتے بلکہ غریب مسلمان اور بہت سے سپاہی بھی یہی کھاتے ہیں، ٹوکروں میں بھرے ہوئے دھرے نظر آتے ہیں۔ البتہ ایک بازار ایسا ہے جس میں میوہ کھلا رکھا رہتا ہے اور اس میں بہت سی دکانیں ہیں جو گرمی کے موسم میں ایران، بلخ بخارا اور سمرقند کے خشک میوؤں بادام، پستہ، فندق، کشمش، بیر اور زرد آلو اور جاڑوں میں سیاہ اور سفید نہایت عمدہ تازے انگوروں سے جو روئی کی تہ میں لگائے ہوئے ان ملکوں سے آتے ہیں اور ناشپاتی اور تین چار قسم کے سیب اور نہایت عمدہ سردوں سے جو جاڑے بھر بکتے رہتے ہیں، بھری رہتی ہیں۔ مگر یہ میوے بہت مہنگے بکتے ہیں۔ چنانچہ ایک سردہ پونے چار روپیہ کو آتا ہے لیکن بایں ہمہ اہلِ دہلی کو سب میوؤں سے زیادہ مرغوب اور پسند ہے۔ امرا کے ہاں میوہ کثرت سے خریدا جاتا ہے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ میرے ''آقا'' کے ہاں اکثر صبح کے کھانے کے موقع پر کوئی پچاس روپیہ کا میوہ صرف میں آتا تھا۔

گرمی کے موسم میں دیسی خربوزہ بہت سستا ہوتا ہے لیکن زیادہ لذیذ نہیں ہوتا اور بجز اس کے کہ ایران سے بیج منگوا کر ایک اچھی اور کمائی ہوئی زمین میں بویا جائے، جیسا کہ امرا اکثر کرتے ہیں، عمدہ میسر نہیں آتا مگر اس پر بھی اچھا اور عمدہ خربوزہ کمیاب ہے کیونکہ

یہاں کی زمین موافق نہیں ہے اور ایک سال کے بعد یہ تخم بھی بگڑ جاتا ہے۔

گرمی کے موسم میں آم دو مہینے تک رہتے ہیں اور بہت کثرت سے اور سستے ملتے ہیں۔ لیکن دہلی میں جو آم پیدا ہوتا ہے وہ نہ تو کچھ اچھا ہے اور نہ کچھ برا اور سب سے عمدہ آم بنگالہ، گول کنڈا اور گوا سے آتا ہے جو فی الواقع نہایت عمدہ ہوتا ہے اور کوئی مٹھائی اس کی شیرینی اور خوشبو کو نہیں پہنچتی۔ تربوز سال بھر رہتا ہے لیکن دہلی میں جو پیدا ہوتا ہے وہ نرم اور بے مزہ ہے اور رنگت بھی اچھی نہیں ہوتی البتہ کبھی کبھی امرا کے ہاں اچھا کھانے میں آتا ہے جو باہر سے بیج منگوا کر بڑی احتیاط اور خرچ سے بوالتے ہیں۔

شہر میں حلوائیوں کی دکانیں کثرت سے ہیں لیکن مٹھائی اچھی نہیں بنتی اور گرد اور مکھیوں سے بھری رہتی ہیں۔ نان بائی بھی بے شمار ہیں مگر ان کے تنور ہمارے ہاں کے تنوروں سے مختلف وضع کے ہیں اور بہت برے ہیں اور اس سبب سے روٹی نہ تو عمدہ ہی ہوتی ہے اور نہ خوب سکی ہوئی البتہ جو روٹی قلعہ میں بکتی ہے وہ کسی قدر اچھی ہوتی ہے اور امرا تو اپنے گھر پر ہی تیار کرا لیتے ہیں اور اس وجہ سے نہایت عمدہ ہوتی ہے اور اس میں دودھ مکھن اور انڈا خوب ڈالا جاتا ہے اور اگرچہ خوب پھول جاتی ہے مگر مزا جلی ہوئی کا سا ہوتا ہے اور زیادہ تر کیک جیسی ہوتی ہے اور پیرس کی "گانس" اور اور روٹیوں کو ہرگز نہیں پہنچتی۔ اگرچہ بازار میں کئی قسم کے کباب اور قلیہ وغیرہ بکتا ہے لیکن اس کا کچھ اعتبار نہیں کہ کس جانور کا گوشت ہے کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ کبھی کبھی اونٹ یا گھوڑے یا قریب المرگ بیل کا گوشت بھی ہوتا ہے۔ غرض کوئی کھانا جو گھر میں تیار نہ ہوا ہو، معین صحت نہیں ہے۔ دہلی کے ہر گلی کوچے میں گوشت بکتا ہے لیکن بکری کے گوشت کی جگہ دھوکے سے بھیڑ کا گوشت بھی دے دیتے ہیں، پس اس فریب سے بچنے کے لئے ہوشیار رہنا چاہئے کیونکہ بیل کا گوشت اور خاص کر بھیڑ کا اگرچہ مزہ میں برا نہیں ہوتا لیکن گرم ذرا زیادہ ہوتا ہے اور نفاخ اور دیر ہضم بھی ہے۔ حلوان کا گوشت سب سے عمدہ ہوتا ہے مگر چونکہ بازار میں شاذ و نادر ہی ملتا ہے اس لئے زندہ جانور خریدنا پڑتا ہے لیکن اس میں یہ بڑی دقت ہے کہ اس ملک میں صبح کا گوشت شام تک نہیں ٹھہرتا۔ دوسرے یہ کہ جانور دبلے ملتے ہیں اور اس وجہ سے گوشت بے مزہ ہوتا ہے اور قصائی کی دکانوں میں ڈبلی بکریوں کا گوشت ملتا ہے جو اکثر سخت ہوتا ہے مگر خاص مجھ کو اس امر کی شکایت نازیبا ہے کیونکہ جب سے کہ میں ان لوگوں کے رویہ سے واقف ہو گیا ہوں، ایسا کم اتفاق ہوا ہے کہ مجھ کو روٹی یا گوشت اچھا نہ ملا ہو۔ چنانچہ میں خاص

بادشاہی باورچی خانہ کے داروغہ کے پاس قلعہ میں اپنا نوکر بھیج دیتا ہوں اور وہ خوشی سے عمدہ کھانا دے دیتے ہیں جس پر ان کی لاگت اگرچہ کم لگی ہوتی ہے مگر میں برضامندی ایک اچھی قیمت دے دیتا ہوں۔ چنانچہ میرا "آقا" مجھ سے یہ سن کر بہت ہنسا کہ میں برسوں سے چوری اور چالاکی سے اپنا گزارہ کرتا ہوں ورنہ پونے چار سو روپیہ میں جو مجھے آپ کی سرکار سے ملتے ہیں، فاقوں کے مارے مر جاتا حالانکہ فرانس میں صرف آٹھ آنہ روز میں ایک بادشاہ کا سا کھانا کھا سکتا ہوں۔

خصی مرغ دہلی میں بالکل نہیں دکھائی دیتا کیونکہ اس ملک کے لوگ جانوروں پر عموماً رحم کرتے ہیں اگرچہ انسانوں پر رحم نہیں کرتے جن کو محلسرا کے کام کے لئے خوجہ بناتے ہیں۔ لیکن پرند جانور کثرت سے بازار میں بکتے ہیں اور اچھے اور سستے بھی ہیں۔ چنانچہ ایک چھوٹی قسم کی مرغی جس کا چمڑہ سیاہ ہوتا ہے اور جس کا نام میں نے "حبشی" رکھا ہے وہ بھی بکتی ہے۔ کبوتر بھی ملتے ہیں مگر بچے نہیں ملتے۔ کیونکہ ہندوستان کے لوگ بچوں کا مار ڈالنا بے رحمی کا کام سمجھتے ہیں۔ تیتر بھی ملتے ہیں مگر ہمارے ملک کے تیتر سے چھوٹے ہوتے ہیں اور اس سبب سے کہ جال سے پکڑ کر دور سے زندہ لاتے ہیں ایسے اچھے نہیں ہوتے جیسے کہ اور پرندے ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت مرغابیوں اور خرگوشوں کی ہے جو زندہ پکڑے جاکر پنجرے کے پنجرے بھرے ہوئے شہر میں آتے ہیں۔ دہلی کے نواح کے ماہی گیر اپنے پیشہ میں ہوشیار نہیں ہیں لیکن بعض اوقات اچھی مچھلی بھی بکتی ہے، خصوصاً "سنگھاڑا" اور "راہو" جو اپنے ہاں کی پالک اور کارپ کی شکل کی ہوتی ہیں۔ مگر جاڑوں میں ماہی گیر مچھلی کم پکڑتے ہیں کیونکہ اس ملک کے لوگ سردی سے اس سے بھی زیادہ ڈرتے ہیں جتنا کہ اہل یورپ گرمی سے خوف کرتے ہیں اور اس موسم میں اگر اتفاق سے کوئی مچھلی آجاتی ہے تو خواجہ سرا اس کو فوراً خرید لیتے ہیں کیونکہ بالتخصیص اس کے شائق ہیں اور مجھے معلوم نہیں کہ اس کا سبب کیا ہے۔ مگر امرا کوڑے کے زور سے جو ہمیشہ ان کے دروازہ پر لٹکتا رہتا ہے ان کو ہر ایک موسم میں مچھلی پکڑنے کو بھیجتے ہیں۔

اب میرا یہ بیان سن کر آپ غور فرماسکتے ہیں کہ کیا کوئی خوش خور شخص پیرس کو چھوڑ کر دہلی کی سیر کو خوشی سے آئے گا؟ بے شک امیروں اور دولتمند لوگوں کو ہر ایک شے میسر ہے لیکن یہ صرف ان کے ملازموں کی کثرت اور کوڑے اور روپیہ کے باعث سے ہے۔ دہلی میں متوسط الحال شخص کوئی نہیں ہے اور یا تو بڑے بڑے عالی رتبہ لوگ ہیں یا ایسے ہیں

جن کی زندگی مصیبت سے بسر ہوتی ہے۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ میری تنخواہ بھی معقول ہے اور میں خرچ بھی کرتا ہوں لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حسب دلخواہ کھانا نہیں ملتا۔ وجہ یہ کہ بازار میں اچھی چیز نہیں ملتی اور اکثر وہی چیزیں ملتی ہیں جن کو امرا نے ناپسند کر کے چھوڑ دیا ہو۔ شراب جو یورپ میں کھانے کا بڑا جزو سمجھی جاتی ہے دہلی کی کسی دکان میں نہیں ملتی اور اگرچہ دیسی انگور کی بن سکتی ہے لیکن شرع اسلام اور شاستر کی رو سے برابر ممنوع ہے چنانچہ احمد آباد اور گول کنڈہ میں بعض ڈچ اور انگریزوں کے گھروں میں مَیں نے پی ہے جو بدمزہ نہ تھی اور سلطنت مغلیہ میں اگر کبھی عمدہ شراب ملتی ہے تو وہ شیراز یا جزائر کناری (۲۸۵) کی ہوتی ہے۔ چنانچہ شراب شیرازی تو ایران سے خشکی کی راہ سے بندر عباس میں پہنچ کر بذریعہ جہاز سورت میں آتی ہے جہاں سے چھیالیس دن کے عرصہ میں دہلی میں پہنچ جاتی ہے اور جزائر کناری سے ڈچ لوگ سورت میں لاتے ہیں لیکن یہ دونوں قسم کی شرابیں اس قدر گراں قیمت ہیں کہ بقول اس ملک کے لوگوں کے ان کی قیمت ان کے مزہ کو بے لطف کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایک بڑا شیشہ جو تین انگریزی بوتلوں کے برابر ہوتا ہے، پندرہ یا سولہ روپیہ سے کم کو ہرگز نہیں آتا۔ اور جو شراب خاص اس ملک میں بنتی ہے اور جس کو یہاں "عرق" کہتے ہیں ایک قسم کی تیز اور تند شراب ہے جو گڑ سے بھپکے میں کھینچ کر بناتے ہیں مگر اس کے بکنے کی بھی سخت ممانعت ہے اور سوائے عیسائی مذہب کے لوگوں کے علانیہ کوئی شخص نہیں پی سکتا۔ مگر یہ عرق ویسا ہی تند و تیز ہے جیسا کہ پولینڈ کے ملک میں اناج سے بناتے ہیں اور اگر اس کا تھوڑا سا بھی زیادہ استعمال کیا جائے تو لاعلاج اعصابی امراض اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ پس عقل مند آدمی یہاں یا تو صرف خالص پانی پینے کی عادت رکھے گا یا نہایت عمدہ نیبو کے شربت کی جو تھوڑی سی قیمت میں میسر آجاتا ہے اور کچھ ضرر نہیں کرتا۔ اصل یہ ہے کہ اس گرم ملک میں بہت ہی کم لوگوں کو شراب کی زیادہ خواہش ہوتی ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ یہ اپنی شراب نہ پینے کی عادت اور پسینہ کے بکثرت آتے رہنے کی وجہ سے بہت سی بیماریوں مثلاً نقرس، سنگِ مثانہ اور امراض گردہ اور زکام نزلہ اور چھوت کے تپ کو جانتے بھی نہیں اور جو لوگ ان امراض کے شاکی یہاں آتے ہیں جیسا کہ خود میرا حال تھا وہ بہت جلد بالکل اچھے ہو جاتے ہیں اور اعضائے تناسل کی بیماریاں بھی جو اس ملک میں بکثرت ہیں اور ملکوں کی سی نہ تو سخت ہی ہوتی ہیں اور نہ ویسے برے نتیجے ہی پیدا کرتی ہیں۔ البتہ اس ملک کے لوگ اگرچہ اکثر تندرست رہتے ہیں لیکن تاہم ویسی ہمت اور جرأت نہیں رکھتے جیسا کہ ہمارے سرد

ملک کے لوگوں میں ہے اور جسم اور طبیعت کی کمزوری اور کاہلی جو ملک کی نہایت درجہ کی گرمی کا نتیجہ ہے ایک ایسی بیماری سمجھنی چاہئے جس میں ہر ایک شخص مبتلا ہے اور یورپ کے لوگوں پر جو گرمی کی برداشت کے عادی نہیں ہیں خصوصیت کے ساتھ اثر کرتی ہے۔

دہلی میں ہنر مند کاریگروں کے کارخانے بالکل نہیں ہیں مگر اس کا سبب یہ نہیں کہ ہندوستانی لوگ صناعی اور کاریگری کی لیاقت نہیں رکھتے کیونکہ ہندوستان کے ہر ایک حصہ میں بہت سے ہوشیار اور ذہین لوگ پائے جاتے ہیں اور بے شمار خوبصورت چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں جن کو لوگ بغیر کلوں کے بناتے ہیں اور جنہوں نے شاید کسی استاد سے بھی تعلیم نہیں پائی ہوتی اور بعض اوقات تو یہ لوگ یورپ کی چیزوں کی ایسے کامل طور سے تقلید کرتے ہیں کہ اصل اور نقل میں فرق کرنا دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ منجملہ اس قسم کی اور اشیاء کے نہایت عمدہ دستکاری اور جنگی بندوقیں بناتے ہیں اور سونے کے زیور تو ایسے عمدہ بناتے ہیں کہ کوئی یورپین سنار ان سے بڑھ کر شاید ہی بنا سکے۔

مصوری اور نقاشی کا بھی ایسا نازک اور باریک کام تیار کرتے ہیں کہ جسے دیکھ کر میں اکثر حیرت میں آ گیا ہوں جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کی بڑی بڑی مہموں کی ایک شبیہ جو ایک مشہور اور نامی مصور نے ایک ڈھال پر سات برس کے عرصہ میں تیار کی تھی اس نے تو بالتخصیص مجھ کو حیران کر دیا اور میں نے اس کو ایک عجیب کام خیال کیا۔ مگر ہندوستانی مصور اکثر تصویر میں تناسب اعضا اور ان حالتوں کے ظاہر کرنے میں جو مختلف اوقات میں انسان کے چہرہ پر نمایاں ہوا کرتی ہیں، کچے ہیں۔ لیکن اگر ان کو ایک اچھا استاد اس فن کے اصول کی تعلیم دے تو یہ عیوب جلد رفع ہو سکتے ہیں اور اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے اس دار السلطنت شہر میں دستکاری اور ہنر مندی کے اعلیٰ قسم کے نمونوں کا پایا نہ جانا لوگوں کی کند ذہنی اور نا قابلیت کی وجہ سے نہیں ہے اور اگر کاریگروں اور کارخانہ داروں کو کچھ ہمت دلائی جائے تو بے شک مفید اور عمدہ صنعتوں اور حرفوں کو ترقی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان بے چاروں کو واجبی اجرت بھی نہیں ملتی بلکہ ان کے ساتھ سختی برتی جاتی ہے اور دولتمند لوگ ہر ایک چیز ارزاں قیمت پر لینی چاہتے ہیں اور جب کبھی کسی امیر یا منصب دار کو کسی کاریگر کی ضرورت ہوتی ہے تو بازار سے بلوا لیتا ہے اور بشرط ضرورت بے چارے سے جبراً کام لیتا ہے اور چیز کے تیار ہو جانے پر اس کی خوبی کے لحاظ سے نہیں بلکہ صرف اپنی اٹکل سے جو قیمت چاہتا ہے دے دیتا ہے اور کاریگر کوڑوں کی مار سے بچ جانے ہی کو غنیمت سمجھتا ہے۔ پس اس

حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ کاریگر اور کارخانہ دار لوگ ایک دوسرے سے بڑھ کر ہنر دکھانے میں سعی کریں بلکہ ان کو تو شہرت اور ناموری پیدا کرنے کے لئے کوشش کرنے کی جگہ صرف یہ فکر رہتی ہے کہ کہیں جلدی پیچھا چھوٹ جائے اور اس قدر مزدوری مل جائے جس میں اوقات بسر ہو جائے اس سبب سے صرف وہ ہی کاریگر اپنے فن میں کسی قدر کمال پیدا کرتے ہیں جو بادشاہ یا کسی صاحب اقتدار امیر کے نوکر ہیں اور صرف اپنے آقا کے لئے کام تیار کرتے ہیں۔

قلعہ کے اندر کے مکانات کا ذکر

قلعہ میں محل سرائے شاہی اور اور محل ہیں لیکن آپ کو یہ خیال کرنا چاہئے کہ وہ ویسے ہی ہیں جیسے کہ لوائیر یا اسکیوریل (۲۸۶) ہیں۔ بلکہ ان کی کوئی چیز بھی یورپ کی عمارت کے مشابہ نہیں ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے مشابہ ہونا چاہئے بھی نہیں کیونکہ ان کے لئے اس ملک کی آب وہوا کے موافق عمدہ اور شاندار ہونا ہی کافی ہے۔

دروازۂ قلعہ معروف ہتھیا پول کا ذکر

قلعہ کے دروازہ کی عمارت میں کوئی قابل الذکر چیز نہیں ہے بجز اس کے کہ پتھر کے دو بڑے ہاتھی بنا کر دونوں جانب کھڑے کئے ہوئے ہیں جن میں سے ایک پر چتوڑ کے مشہور و معروف راجہ جے مل کی مورت ہے اور دوسرے پر اس کے بھائی فتا کی جو دونوں بڑے بہادر اور شجاع شخص تھے اور جن کی ماں ان سے بھی زیادہ دل چلی تھی اور جو شہنشاہ اکبر سے ایسے لڑے تھے کہ ابدالآباد تک ان کا نام رہے گا۔ اس عظیم الشان بادشاہ نے جب ان کے شہر کو آن کر گھیر لیا تو یہ بڑے ہی استقلال کے ساتھ اس سے مقابل ہوئے اور بجائے اس کے کہ اپنے دشمن کی، جس کو اپنے زور اور قوت پر بڑا گھمنڈ تھا، اطاعت قبول کریں اپنی اور اپنی ماں کی جان اپنے ملک پر قربان کر ڈالی اور یہ ان کی اس بے مثل جانبازی ہی کی وجہ سے تو ہے کہ ان کے دشمنوں نے بھی یادگار کے طور پر ان کی مورتوں کا قائم رکھنا مناسب خیال کیا۔ یہ ہاتھی جن پر یہ دونوں بہادر سوار ہیں بڑے شان و شکوہ کے ہیں اور ان کو دیکھ کر رعب اور ادب کا ایک ایسا خیال مجھ پر چھا گیا جس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ (۲۸۷)

اس دروازہ سے قلعہ میں داخل ہو کر ایک لمبا اور وسیع راستہ ملتا ہے جس کے بیچوں بیچ پانی کی ایک نہر جاری ہے اور دونوں جانب پانچ یا چھ فرانسیسی فٹ اونچا اور

چار فٹ چوڑا اس طرح کا چبوترہ بنا ہوا ہے جیسا کہ پیرس کا پونٹ لی آف ہے جس کو چھوڑ کر دونوں طرف اخیر تک برابر برابر محراب دار دالان بنتے چلے گئے ہیں جن میں مختلف کارخانوں کے داروغے اور کم درجے کے عہدہ دار بغیر اس کے کہ گھوڑے اور آدمی جو نیچے آتے جاتے ہیں ان سے ان کو کچھ تکلیف پہنچے بیٹھے ہوئے اپنا اپنا کام کیا کرتے ہیں۔ اور منصب دار جورات کو چوکی دینے آتے ہیں وہ بھی اسی چبوترہ پر ٹھہرتے ہیں۔

اس نہر کا پانی اول محلسرا میں جاتا ہے اور پھر وہاں سے موقع بموقع سب مکانوں میں پہنچتا ہے اور اس کے بعد قلعہ کی خندق میں جاگرتا ہے اور یہ دہلی سے پندرہ یا اٹھارہ میل کے فاصلہ پر جمنا میں سے کاٹی جاکر بڑی محنت سے میدان اور پہاڑی سخت زمین پر سے لائی گئی ہے(۲۸۸)۔

قلعہ کے دوسرے دروازہ کا ذکر

قلعہ کے دوسرے دروازہ کے بھی اندر کی طرف ایک لمبی اور خاصی چوڑی سڑک ہے اور اس کے بھی دونوں جانب ویسے ہی چبوترے ہیں۔ لیکن محراب دار دالانوں کے عوض دکانیں بنی ہوئی ہیں اور سچ پوچھئے تو یہ ایک بازار ہے جو لداؤ کی چھت کی وجہ سے جس میں اوپر کی طرف روشنی اور ہوا کے لئے بڑے بڑے گول روشندان بنے ہوئے ہیں گرمی اور برسات میں بہت آرام کا ہے۔ ان دونوں سڑکوں کے سوا دائیں بائیں اور بھی چھوٹی چھوٹی سڑکیں ہیں جو ان مکانات کی طرف جاتی ہیں جہاں معمول کے موافق امرا باری باری ہفتہ میں ایک رات دن چوکی دیا کرتے ہیں۔ یہ مکانات جہاں امرا چوکی دیتے ہیں اچھے عمدہ ہیں کیونکہ یہ لوگ ان کو اپنے خرچ سے آراستہ رکھتے ہیں اور یہ سب بڑے بڑے دیوان خانے ہیں اور ان کے سامنے باغیچے ہیں جن میں چھوٹی چھوٹی نہریں اور حوض اور فوارے بنے ہوئے ہیں۔ جس امیر کی نوکری ہوتی ہے اس کے لئے کھانا بادشاہی خاصے میں سے آتا ہے جس کے آنے کے وقت امیر کو ادائے شکر کے لئے بادشاہی محل کی طرف رخ کر کے تین دفعہ تسلیمات بجالانا یعنی زمین تک ہاتھ لے جاکر ماتھے تک لانا ہوتا ہے۔ ان کے سوا مختلف مقامات میں سرکاری دفتروں کے لئے بہت سے دیوان خانے بنے ہوئے اور خیمے لگے ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے جن بڑے دالانوں میں کاریگر بیٹھتے ہیں وہ مختلف کارخانوں کے نام سے موسوم ہیں جن میں ایک استاد کار کے ماتحت کسی میں کار چوب اور چکن دوز اور زردوز وغیرہ

کام کرتے ہیں اور کسی میں سنار اور کسی میں مصور اور نقاش اور کسی میں روغن ساز اور کسی میں بڑھئی اور خرادی اور کسی میں درزی اور موچی اور کسی میں دارائی اور چوڑیا اور کم خاب اور باریک ململ بننے والے جولاہے جو پگڑیاں بنتے اور کمر باندھنے کے پھول دار زری کار پٹکے اور زنانے پاجاموں کے لئے ایسا نازک اور باریک کپڑا بناتے ہیں جو صرف ایک رات کے استعمال میں بے کار ہو جاتا ہے۔ یہ کپڑا جو صرف چند گھنٹے کام دیتا ہے پچیس یا تیس روپیہ کی قیمت کا اور کبھی اس سے بھی زیادہ کا جبکہ اس پر سوئی سے نہایت خوبصورت زری کا کام کیا گیا ہوتا ہے۔ یہ تمام کاریگر علی الصباح اپنے اپنے کارخانوں میں حاضر ہو کر دن بھر کام کرتے اور شام کو اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں اور انہی دھندوں میں ان کی زندگی بسر ہوئی چلی جاتی ہے اور جس حالت میں کوئی پیدا ہوا ہے اس سے ترقی کرنے کے لئے کوئی بھی کوشش نہیں کرتا۔ مثلاً کارچوب اور چکن دوز اور سوزن کار اپنے بیٹے کو اپنا ہی پیشہ سکھاتا ہے اور سنار کا بیٹا سنار ہی ہوتا ہے اور شہر کا طبیب اپنے فرزند کو علم طب ہی کی تعلیم کرتا ہے یہاں تک کہ کوئی شخص اپنے پیشہ کے سوا دوسرے پیشہ والے کے ہاں شادی نہیں کرتا اور اس رسم کی پابندی مسلمان بھی ایسی ہی سختی سے کرتے ہیں جیسے کہ ہندو جن کا شاستر یہی حکم دیتا ہے۔ اور اس کے باعث سے بہت سی خوبصورت لڑکیاں کنواری بیٹھی رہتی ہیں حالانکہ اگر ان کے والدین پیشہ اور ذات کا خیال چھوڑ دیں تو ان کی شادی اچھی جگہ ہو سکتی ہے۔

مکان عام و خاص اور نقار خانہ کا ذکر

اب ضرور ہے کہ میں عام و خاص کا ذکر کروں جو ان مکانات میں سے گزرنے کے بعد ملتا ہے اور فی الواقع بہت عمدہ اور عالی شان عمارت ہے۔ یہ ایک بڑا وسیع مربع مکان ہے جس کے چاروں طرف محرابیں ہیں اور پلیس رائل سے مشابہ ہے اور صرف اس قدر فرق ہے کہ اس کے اوپر کچھ عمارت نہیں ہے۔ اس کی محرابیں اس طور پر بنی ہوئی ہیں کہ ایک محراب میں سے دوسری محراب میں جا سکتے ہیں اور ایک بڑا دروازہ جو اس کے سامنے ہے اس پر ایک بڑا بالا خانہ بنا ہوا ہے جس کے دروازے اس کی طرف کو ہیں اور اس وجہ سے کہ اس میں نفیریاں اور شہنائیں اور نقارے وغیرہ رکھے رہتے ہیں اس کو نقار خانہ کہتے ہیں، جو دن کو اور رات کو اوقاتِ معینہ پر اکٹھے بجائے جاتے اور نو وارد اہل یورپ کے کانوں کو نہایت ہی کریہہ معلوم ہوتے ہیں کیونکہ دس بارہ نفیریاں اور اسی قدر نقارے ایک ہی دفعہ بجنے لگتے ہیں۔ ان

میں سے بڑی نفیری جس کو "قرنا" کہتے ہیں، ۹ فٹ لمبی ہے جس کا نیچے کا منہ ایک فرانسیسی فٹ سے کم نہیں ہے اور لوہے یا پیتل کا سب سے چھوٹا نقارہ کم سے کم چھ فٹ قطر کا ہے۔ پس اسی سے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ اس نقار خانے سے کس قدر شور و غل پیدا ہوتا ہوگا۔ چنانچہ جب میں اول ہی اول یہاں آیا تو شور کے مارے میرے کان بہرے ہو گئے۔ لیکن عادت ایسی زبردست چیز ہے کہ اب رغبت سے سنتا ہوں، خصوصاً رات کے وقت مکان کی چھت پر لیٹے ہوئے جب دور سے اس کی آواز سنائی دیتی ہے تو نہایت بھلی اور سریلی (۲۸۹) معلوم ہوتی ہے اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کیونکہ ان کے بجانے والے بچپن ہی سے موسیقی کی تعلیم پاتے ہیں اور ان باجوں کی آواز کے اونچا نیچا کرنے اور سریلی اور لے دار بنانے میں ایسے مشاق ہیں کہ فاصلہ سے سنی جائے تو نہایت پیاری لگتی ہے۔ نقار خانہ ہمیشہ ایک اونچے موقع پر اور بادشاہی محل سے دور رکھا جاتا ہے تاکہ بادشاہ کو اس کی آواز سے تکلیف نہ ہو۔ اس دروازہ کے مقابل جس پر نقار خانہ ہے صحن سے گزر کر ایک بڑا دالان ہے جس کے ستون اور چھت سنہری کام کے ہیں اور بہت اونچی کرسی کا اور بہت ہوادار اور تین طرف سے کھلا ہوا ہے اور اس دیوار کے وسط میں جو محل سرا سے اس کو جدا کرتی ہے قد آدم سے کچھ اونچا ایک وسیع شہ نشین (۲۹۰) بنا ہوا ہے جہاں ہر روز بادشاہ دوپہر کے قریب آن کر تخت پر بیٹھتا ہے اور دائیں بائیں شہزادے کھڑے ہوتے اور خواجہ سرا مور چھل ہلاتے یا بڑے بڑے پنکھے جھلتے یا ادائے خدمات کے لئے نہایت ادب کے ساتھ دست بستہ کھڑے رہتے ہیں اور تخت کے نیچے کے مقام میں چاندی کا جنگلہ لگا ہوا ہے جس میں تمام امرا اور راجہ اور غیر ملکوں کے سفیر آنکھیں نیچی کئے ہوئے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں اور تخت سے کسی قدر فاصلہ پر اسی طور سے منصب دار یعنی چھوٹے امرا کھڑے رہتے ہیں اور ان سے جو جگہ خالی رہتی ہے وہ اور بلکہ تمام صحن سب قسم کے لوگوں، اعلیٰ اور ادنیٰ، مفلس و غنی، سے بھرا رہتا ہے کیونکہ یہی مقام ہے جہاں رعایا کا ہر ایک متنفس اپنے عرض حال کے لئے باریاب ہو سکتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو عام و خاص (۲۹۱) کہتے ہیں اور ڈیڑھ یا دو گھنٹے تک لوگوں کا مجرا اور سلام ہوتا رہتا ہے اور اس عرصہ میں کسی قدر خاصے گھوڑے سامنے کئے جاتے ہیں تاکہ بادشاہ خود ملاحظہ کر سکے کہ وہ کیسے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ اور ان کے بعد ہاتھی آتے ہیں جن کی میلی کھال خوب نہلا دھلا کر سیاہی سے رنگ دی جاتی ہے اور دو لال خط سر سے سونڈ کے اخیر تک، جہاں دونوں آکر مل جاتے ہیں، کھینچ دیئے جاتے ہیں اور زربفت کی جھول ڈال کر

چاندی کے دو گھنٹے جو ایک نقرئی زنجیر میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں پیٹھ پر سے دونوں طرف لٹکا دیئے جاتے ہیں اور سفید سُرہ گائے کی دُمیں جو بڑی تبت سے آتی اور بیش قیمت ہوتی ہیں ،لٹکادی جاتی ہیں جو بڑی بڑی مونچھیں سی معلوم ہوتی ہیں اور دو چھوٹے ہاتھی جو وہ بھی خوب سجائے ہوئے ہوتے ہیں، خدمتگاروں کی طرح ان بڑے ہاتھیوں کے ساتھ رہتے اور یہ ہاتھی جھوم جھوم کر اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا اپنے زرق برق کے سازو سامان اور اپنی آن بان پر نازاں ہیں اور جب تخت کے سامنے پہنچتے ہیں تو مہاوت جو گردن پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے ،لوہے کی ایک نوکدار چیز چبھو کر ان کو بڑھاوا دیتا اور زبان سے کچھ کہتا ہے اور اس وقت یہ جانور گھٹنا ٹیک کر اور سونڈ اوپر کو اٹھا کر چنگھاڑتا ہے جس کو لوگ اس کی تسلیمات خیال کرتے ہیں اور اس کے بعد اور جانور پیش ہوتے ہیں۔ مثلاً سدھائے ہوئے ہرن جو لڑائے جاتے ہیں اور نیل گائیں اور گینڈے اور بنگالہ کے بڑے بڑے بھینسے جن کے سینگ ایسے بڑے ہوتے ہیں کہ ان سے وہ شیر کے ساتھ لڑ سکتے ہیں اور چیتے جن سے ہرن کا شکار کھیلا جاتا ہے اور ہر قسم کے خوبصورت شکاری کتے جو ملک ازبک (بخارا وغیرہ) سے آتے ہیں اور جن پر سرخ رنگ کی جھولیں پڑی ہوئی ہوتی ہیں، پیش ہوتے ہیں اور اخیر میں ہر قسم کے شکاری پرند جو تیتر' کلنگ' اور خرگوش کو پکڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہرن پر بھی چھوڑے جاتے ہیں جن پر یہ نہایت تیزی کے ساتھ جھپٹتے اور پنجے اور کندی مار مار کر ان کو اندھا کر دیتے ہیں۔ ان جانوروں کے پیش ہونے کے علاوہ اکثر اوقات ایک دو امیروں کے سوار بھی ملاحظہ کرائے جاتے ہیں جن کی پوشاک اس وقت روز مرہ کے لباس کی بہ نسبت ذرا مکلف ہوتی ہے اور گھوڑوں پر پاکھریں پڑی ہوئی اور انواع واقسام کے زیور مثلاً ہیکل، جھبے وغیرہ سے سجائے ہوئے ہوتے ہیں اور بادشاہ اس تماشے سے بھی اپنا دل خوش کرتا ہے کہ مردہ بھیڑیں جن کا پیٹ صاف کر کے پھر سی دیا جاتا ہے نوجوان امرا، منصب دار، گرز بردار' اور اعصابردار ان پر تلوار سے اپنے کرتب دکھاتے اور ایک ہی ہاتھ میں چورنگ کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ تمام امور دربار کے شروع میں ہوا کرتے ہیں اور ان کے بعد زیادہ اہم معاملات پیش ہوتے ہیں اور بادشاہ نہایت توجہ کے ساتھ سواروں کو صرف دیکھتا ہی نہیں بلکہ جب سے لڑائی بند ہوئی ہے کوئی سوار یا پیدل ایسا نہیں جس کو بادشاہ نے بچشم خود نہ دیکھا ہو اور اس سے اپنی ذاتی واقفیت حاصل نہ کی ہو۔ چنانچہ اس نے کسی کی تنخواہ بڑھا دی اور کسی کی کم کر دی اور کسی کو بالکل ہی موقوف کر دیا ہے۔

اس موقع پر مستغیث جو عرضیاں پیش کرتے ہیں وہ تمام و کمال بادشاہ کے ملاحظہ اور سماعت میں آتی ہیں اور بادشاہ بذاتِ خود مستغیثوں سے دریافت حال کرتا اور اکثر ستم رسیدہ لوگوں کی فوراً داد دیتا ہے۔ اور ہفتہ میں ایک دن خلوت میں کامل دو گھنٹے تک ایسے دس غربا کی عرضیاں سنتا ہے جو مستغیثوں میں سے چن لئے جاتے ہیں اور جن کے پیش کرنے کا کام ایک نیک اور دولتمند اور مسن شخص کو سپرد ہے اور ایک دن عدل و انصاف کے کمرے میں جس کو "عدالت خانہ" کہتے ہیں دو بڑے قاضیوں کے ساتھ بیٹھ کر داد رسانی کرتا اور اس میں کبھی ناغہ نہیں ہونے دیتا اور اس سے بخوبی عیاں ہے کہ ایشیائی بادشاہ جن کو ہم اہلِ یورپ جاہل اور ناتراشیدہ خیال کرتے ہیں وہ ہمیشہ ہی اپنی رعایا کی داد دہی اور انصاف رسانی سے جو ان پر واجب ہے غفلت نہیں کرتے۔

جو حالات اس دربار عام و خاص میں گزرتے ہیں اور جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اگرچہ وہ سب معقول اور قابلِ احترام معلوم ہوتے ہیں لیکن جو کمینہ اور مکروہ خوشامد گری اور لجاجت ہمیشہ یہاں دیکھنے میں آتی ہے وہ بھی مجھے آپ پر ظاہر کردینی واجب ہے۔ چنانچہ جب کوئی اچھا لفظ بادشاہ کے منہ سے نکل جاتا ہے تو خواہ وہ کیسے ہی خفیف امر کی نسبت کیوں نہ ہو تمام دربار اور بڑے بڑے امرا آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر جس طرح کوئی خدا کی رحمت کو لیتا ہے اس لفظ کو لے کر اور "کرامات کرامات" کہہ کر عرض کرتے ہیں کہ سبحان اللہ کیا ہی خوب ارشاد ہوا ہے اور حقیقتاً مغلوں میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے کہ جس کو یہ بیت یاد نہ ہو اور وہ اس کو فخریہ طور پر نہ پڑھتا ہو:

"اگر شہ روز را گوید شب ست ایں بباید گفت اینک ماہ پرویں"

یعنی اگر بادشاہ رات کو دن بتائے تو کہہ دینا چاہئے کہ دیکھئے وہ چاند اور ستارے نظر آ رہے ہیں اور یہ خوشامد گری کا عیب کیا ادنیٰ کیا اعلیٰ سب میں موجود ہے مثلاً اگر کسی مغل کو مجھ سے معالجہ کی ضرورت پڑتی ہے تو اپنے معمول کے موافق تمام باتوں سے پہلے مجھ کو یہ کہتا ہے کہ آپ تو اپنے وقت کے ارسطو اور بقراط اور بو علی سینا ہیں۔ چنانچہ اوّل اوّل تو میں نے اس حرکت کو روکنا چاہا اور کہا کہ جس قدر آپ میری یہ تعریف کرتے ہیں میں ہرگز اس کے لائق نہیں ہوں اور مجھ کو ان بزرگوں سے کچھ نسبت نہیں۔ لیکن جب دیکھا کہ میرا انکسار ان کو اور زیادہ مبالغہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے تو مجبوراً اپنے کانوں کو ان کی خوشامدی باتیں سننے کا ویسا ہی عادی بنالیا جیسا کہ ان کے موسیقی باجوں کے سننے کا۔ اس موقع پر میں ایک

لطیفہ آپ کو سناتا ہوں اس سے آپ کو یہاں کے لوگوں کا خاصہ طبعی معلوم ہو جائے گا۔ ایک پنڈت جس کی اپنے آقا سے میں نے ہی ملاقات کرائی تھی ایک روز اس نے اپنے ایک اشلوک میں اوّل تو اُن کو اُن بڑے بڑے فتح مندوں سے جو دنیا میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوئے ہیں زیادہ بتایا اور پھر سینکڑوں مہملات اور واہیات بک کر اپنے کلام کے اخیر میں بڑی سنجیدگی سے یہ کہا کہ "جب آپ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی سپاہ کے آگے آگے چلتے ہیں تو آپ کے قدموں کے نیچے زمین کانپنے لگتی ہے کیونکہ وہ آٹھ ہاتھی جو اس کو اپنے سر پر اٹھائے ہوئے ہیں اس غیر معمولی بوجھ کے اٹھانے کی تاب نہیں لا سکتے" جس کو سن کر میں بے اختیار ہنس پڑا اور اپنے "آقا" سے جو میری طرح ان کو بھی ہنسی آ گئی تھی شوخی کے ساتھ بہت سنجیدہ شکل بنا کر کہا کہ آپ ذرا سمجھ کر گھوڑے پر سوار ہوا کریں ایسا نہ ہو کہ بھونچال آ کر دنیا درہم برہم ہو جائے جس کے جواب میں انہوں نے فوراً یہ کہا کہ اسی وجہ سے تو میں پالکی میں سوار ہونا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

عام و خاص کے بڑے دالان کی بغل میں ایک خلوت خانہ ہے جسے غسل خانہ (۲۹۲) کہتے ہیں۔ یہاں صرف چند ہی شخصوں کو حاضر ہونے کی اجازت ہے اور یہ وسعت میں اگرچہ عام و خاص کے برابر نہیں ہے مگر نہایت خوبصورت اور وسیع اور روغنی اور سنہری کام کیا ہے اور ایک بڑے شہ نشیں کی طرح چار یا پانچ فرانسیسی فٹ کا اونچا ہے جہاں بادشاہ کرسی پر بیٹھ کر وزرا سے جو ادھر ادھر کھڑے ہوتے ہیں تخلیہ میں امرا اور صوبہ داروں کی عرائض سنتا اور سلطنت کے اہم معاملات پر غور کرتا ہے اور جس طرح صبح کو عام و خاص کے دربار میں حاضر نہ ہونے کے باعث امرا پر جرمانہ کیا جاتا ہے یہاں شام کو حاضر نہ ہونے پر سزا ملتی ہے البتہ صرف میرے "آقا" دانشمند خاں ایک ایسے امیر ہیں جن کو ان کے علم و فضل اور شوقِ مطالعہ اور سرانجام امور ممالکِ غیر کی وجہ سے معافی حاصل ہے۔ لیکن چہار شنبہ کو جو ان کی چوکی کا دن ہے، ان کو بھی اور امرا کی طرح حاضر ہونا پڑتا ہے۔ یہ دو وقتہ حاضری کی رسم نہایت پرانی ہے اور کوئی امیر بھی اس پابندی کی معقول طور پر شکایت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ خود بادشاہ سوائے کسی کار ضروری یا سخت بیماری کی حالت کے، دونوں وقت دربار میں آنا اپنا فرض جانتا ہے۔ چنانچہ اورنگ زیب کی پچھلی خطرناک بیماری کی حالت میں بھی دربار کے دونوں مقاموں میں نہیں تو ایک میں تو ضرور لوگ اس کو اٹھا کر لے آتے تھے کیونکہ اس نے اوّل درجہ رات دن میں ایک بار لوگوں کو اپنا دیدار دکھا دینا

واجب سمجھا تھا۔ اس لئے کہ ایسا شدید بیمار تھا کہ اس کا صرف ایک دن کا دربار میں نہ آنا ہی تمام سلطنت میں فتنہ وفساد کے پھیل جانے اور شہر میں ہڑتال ہو جانے کا باعث ہو سکتا تھا۔

اگرچہ غسل خانہ کے دربار کے موقع پر بادشاہ ان امور میں مصروف رہتا ہے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے لیکن دربار عام وخاص کے دستور کے موافق یہاں بھی زیادہ تر وہی جانور وغیرہ کا ملاحظہ ومشاہدہ ہوتا رہتا ہے مگر چونکہ کچھ دن باقی نہیں رہتا اور سامنے کا صحن بھی مختصر ہے اس لئے امرا کے رسالوں کا ملاحظہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس وقت کے دربار کی یہ خاص رسم ہے کہ جن منصب داروں کی چوکی دینے کی باری ہوتی ہے وہ بادشاہ کو نہایت ادب وتعظیم کے ساتھ سلام کرتے ہوئے بڑے قرینے اور ترتیب سے سامنے سے گزر جاتے ہیں جن کے آگے آگے لوگ ''قور'' ہاتھوں میں لئے ہوئے چلتے ہیں جو چند خوبصورت نقرئی چیزیں ہیں جو چاندی سے منڈھی ہوئی چھڑیوں کے سروں پر لگائی ہوئی ہوتی ہیں جن میں سے دو بڑی مچھلی کی شکل کی ہیں اور دو ایک مہیب اور خیالی جانور کی صورت کی جس کو ''اژدہا'' کہتے ہیں اور کچھ شیر کی شکل کی اور بعض ہاتھ کے پنجہ اور بعض ترازو کی صورت کی اور بہت سی اور بیشمار وضع کی جن کے ایک طرح کے بعد الفہم معنی بتاتے ہیں۔ ان لوگوں میں بہت سے گرز بردار بھی ہوتے ہیں جو قد آور اور وجیہہ دیکھ کر بھرتی کئے جاتے ہیں اور جن کا یہ کام ہے کہ دربار میں بے ترتیبی نہ ہونے دیں اور بادشاہی فرمان اور احکام پہنچائیں اور جو حکم ملے نہایت جلد اس کی تعمیل کریں۔

شاہی محل سرا کا بیان

اب میں نہایت خوشی سے آپ کو بادشاہی محل سرا کی سیر کراتا ہوں جیسا کہ قلعہ کی اور عمارات کی کرائی ہے۔ لیکن کسی سیاح کو وہاں کی کیفیت چشم دیدہ بیان کرنی ناممکن ہے کیونکہ بادشاہ کے دہلی میں موجود نہ ہونے کے وقت اگرچہ مجھے کئی دفعہ وہاں جانے کا موقع ملا اور میں خیال کرتا ہوں کہ ایک دفعہ ایک بڑی بیگم کے علاج کی ضرورت سے جو شدت مرض کی وجہ سے معمول کے موافق باہر کے دروازہ تک نہیں لائی جا سکتی تھی بہت دور تک اندر جانے کا اتفاق ہوا مگر میرے سر پر ایک کشمیری شال اس طور سے اوڑھا دی گئی تھی کہ ایک لمبے سکارف (اوڑھنی) کی طرح پاؤں تک لٹکتی تھی اور ایک خواجہ سرا ہاتھ پکڑے مجھے اس طرح لے گیا تھا جیسے کوئی اندھے کو لئے جاتا ہے۔ اس لئے آپ کو صرف اسی پر

قناعت کرنی چاہئے جو بعض خواجہ سراؤں سے سن کر میں نے لکھا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ محل سرا میں بیگمات کے مدارج اور حیثیت اور ان کی معاش کی مناسبت سے علیحدہ علیحدہ بہت خوبصورت اور بڑے بڑے محل بنے ہوئے ہیں جن کے دروازوں کے سامنے حوض اور سب طرف باغیچے اور دلچسپ روشیں اور سایہ دار آرام گاہیں اور نہریں اور فوارے اور دن کی گرمی کے بچاؤ کی خاطر عمیق تہ خانے اور رات کو خنکی میں آرام کرنے کے لئے اونچے اونچے صحنے اور صحن چبوترے بنے ہوئے ہیں اور ایسے دلکش مکانات ہیں کہ ان میں اس ملک کی تکلیف دہ گرمی کو مطلقاً دخل نہیں ہے اور یہ لوگ ایک چھوٹے سے برج کی جو دریا کی طرف ہے حد سے زیادہ تعریف کرتے ہیں جس میں آگرہ کے دونوں برجوں کی طرح سونے کے ورق چڑھے ہوئے اور لاجوری کام کیا ہوا اور نہایت عمدہ نقش و نگار بنے ہوئے اور بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے ہیں (۲۹۳)۔

دربار اور تخت طاؤس کا بیان

اب قبل اس کے کہ میں قلعہ کا بیان ختم کروں آپ کو دوبارہ عام و خاص کی طرف متوجہ کرنا اور ان سالانہ جشنوں اور درباروں کی کیفیت سنانی چاہتا ہوں جو میں نے اس میں ہوتے دیکھے ہیں۔ خصوصاً وہ بڑا جشن جو لڑائی کے اختتام کے بعد ہوا تھا اور جس سے بڑھ کر کوئی تماشا میں نے عمر بھر میں کبھی نہیں دیکھا۔ اس روز بادشاہ نہایت ہی عمدہ لباس پہنے دیوان عام و خاص کے صدر میں مرصع تخت پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس کی پوشاک نہایت نازک اور پھول دار ریشمی کپڑے کی تھی جس پر بہت ہی عمدہ زری کا کام کڑھا ہوا تھا اور زری کار مندیل سر پر تھی اور بڑے بڑے اور نہایت قیمتی ہیروں کا طرہ لگا ہوا تھا جس میں ایک پکھراج ایسا تھا جو لاثانی کہا جاسکتا ہے اور آفتاب کی طرح چمکتا تھا اور بڑے بڑے موتیوں کا کنٹھا گلے میں تھا جو ہندوؤں کی مالا کی طرح پیٹ تک لٹکتا تھا۔

یہ تخت چھ طلائی پایوں کا ہے جن کو کہتے ہیں کہ بالکل ٹھوس ہیں جن میں یاقوت اور زمرد اور ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ مگر میں ان کی تعداد اور قیمت بیان نہیں کر سکتا کیونکہ کسی کو اس قدر نزدیک جانے کی اجازت نہیں کہ ان کا شمار اور آب و تاب کا اندازہ کر سکے۔ لیکن یقین کیجئے کہ ہیرے اور جواہرات بہت ہی ہیں اور مجھے خوب یاد ہے کہ اس کی قیمت چار کروڑ روپئے جانچی گئی تھی اور اس کو اورنگ زیب کے باپ شاہ جہاں نے اس لئے

ہوا تھا کہ بیشمار جواہرات جو خزانہ میں قدیم راجاؤں اور پٹھان بادشاہوں کی لوٹ اور ان پیشکشوں کے ذریعہ سے جو ہر سال سب امرا کو خاص خاص موقعوں پر نذر گزراننے لازم ہیں وقتاً فوقتاً جمع ہو گئے تھے، لوگ ان کو دیکھیں۔ مگر اس کی ساخت اور کاریگری ان جواہرات کے ہم پایہ نہیں ہے البتہ دو مور جو موتیوں اور جواہرات سے بالکل ڈھکے ہوئے ہیں بہت ہی خوب اور نہایت عمدہ نقشے پر مبنی ہیں اور ان کو ایک صناع نے جس کی کاریگری اور ہنر مندی حیرت کے لائق تھی اور جو اصل میں فرانس کا رہنے والا تھا اور جس نے یورپ کے بہت سے رئیسوں کو جھوٹے جواہرات دے دے کر، جن کو وہ ایک خاص حکمت سے تیار کرتا تھا، خوب لوٹا تھا اور پھر بھاگ کر شہنشاہ مغل کے ہاں پناہ آن لی تھی اور یہاں بھی خوب دولت کمائی تھی' بنایا تھا۔ (۲۹۴)

تخت کے نیچے کے چبوترے پر جس کے گرد چاندی کا کٹہرا لگا ہوا اور اوپر زری کی جھالر کا ایک پُرزر وسیع شامیانہ تنا ہوا تھا، امرا نہایت مکلّف پوشاکیں پہنے کھڑے تھے اور مکان کے ستون زربفت سے منڈھے ہوئے اور ریشمی مشجر کے شامیانے جن میں ریشم اور زری کے پھندنے لگے ہوئے تھے، تنے ہوئے اور نہایت عمدہ ریشمی قالین بچھے ہوئے تھے اور باہر ایک خیمہ جسے "اسپک" (۲۹۵) کہتے ہیں اور جو اس مکان سے بھی بڑا ہے اس کی چھت کے ساتھ ملا کر لگایا ہوا تھا جو صحن کے نصف تک پھیلا ہوا اور چاروں طرف سے چاندی کی پتیوں سے منڈھے ہوئے کٹہرے سے گھرا ہوا تھا اور چوبیں بھی چاندی سے منڈھی ہوئی تھیں جن میں سے تین ایسی بلند تھیں جیسے جہاز کا مستول اور باقی چھوٹی تھیں۔ اس عالیشان خیمہ کے باہر کی طرف سرخ رنگ کا کپڑا تھا اور اندر کی جانب مچھلی پٹن کی نہایت عمدہ چھینٹ تھی جو اسی غرض سے بنائی گئی تھی اور جس کے بیل بوٹے ایسے قدرتی طور کے اور رنگ ایسے تیز اور شاداب تھے کہ ایک تختہ گلزار معلوم ہوتا تھا اور چونکہ سب امرا کو حکم دیا گیا تھا کہ عام وخاص کی غلام گردش کی ایک ایک محراب کی زیبائش و آرائش وہ اپنے اپنے خرچ سے کریں اس لئے بادشاہ کی زیادہ تر رضامندی حاصل کرنے کے خیال سے ہر ایک نے دوسرے سے بڑھ کر ان کی زیب وزینت میں کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام در و دیوار سر سے پاؤں تک کم خاب اور زربفت میں غرق اور فرش نہایت بیش قیمت قالینوں سے آراستہ و پیراستہ ہو گیا۔

جشن کے تیسرے دن اوّل بادشاہ اور اس کے بعد اکثر امرا بڑے تکلف کے

ساتھ بڑی بڑی ترازوؤں میں جن کے پلڑے اور باٹ سونے کے تھے تولے گئے اور مجھے یاد ہے کہ یہ دیکھ کر کہ اورنگ زیب کا وزن سال گزشتہ کی بہ نسبت ایک سیر زیادہ ہے تمام دربار نے نہایت ہی مسرت ظاہر کی۔ اس قسم کے جشن ہر سال ہوا کرتے ہیں لیکن اس شان و شوکت کا جشن کبھی نہیں ہوا اور نہ اس قدر کبھی خرچ ہوا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ بادشاہ کا اس کروفر کے ساتھ جشن کرنے سے یہ مقصود تھا کہ سوداگروں کو جن کا کم خاب وغیرہ لڑائی کی وجہ سے پانچ سال کے عرصہ سے بکنے میں نہیں آیا تھا، کچھ فائدہ ہو جائے۔ اس جشن میں امرا کو بہت خرچ پڑا اور آخر کار اس کا ایک حصہ فوج کے بے چارے سواروں کے سر تھوپا گیا جن کو اپنے اپنے امیر کے حکم سے مجبوراً قباؤں کے واسطے کم خاب خریدنا پڑا۔

ان سالانہ جشنوں کے موقع پر ایک قدیم دستور ہے جس کو امرا بالکل پسند نہیں کرتے یعنی ان کو ایک عمدہ پیشکش نذر کرنا پڑتا ہے جس کی قیمت بہ مناسبت ان کی تنخواہوں کے کم یا زیادہ ہوتی ہے اور بعض امرا نہایت ہی عمدہ عمدہ چیزیں پیش کرتے ہیں اور یہ کبھی بغرض نمائش اور کبھی اس مطلب سے کہ بادشاہ اس دست برد کی تحقیق و تفتیش کے حکم دینے سے جو انہوں نے اپنے برسر عہدہ ہونے یا صوبہ داری کے زمانہ میں کی تھی، باز رہے اور بعض اوقات اس کے خوش کرنے اور اس طرح پر اپنی تنخواہ بڑھوا لینے کے لئے ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض تو عمدہ موتی اور ہیرے اور زمرد اور یاقوت پیش کرتے ہیں اور بعض سونے کے مرصع برتن اور بعض بہت سی اشرفیاں جو بارہ بارہ روپیہ کی قیمت کی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک ایسے ہی جشن کے موقع پر جو اورنگ زیب نہ بلحاظ جعفر خاں کے وزیر ہونے کے بلکہ رشتہ داری کی وجہ سے اس کی نو تعمیر حویلی کے دیکھنے کے حیلہ سے اس کے ہاں گیا تو اس نے اڑھائی لاکھ روپیہ کی اشرفیاں اور کچھ عمدہ موتی اور ایک لعل جس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ جانچی گئی تھی نذر کیا۔ مگر شاہ جہاں نے جو جوہرات کے پرکھنے میں سب لوگوں سے زیادہ مہارت رکھتا تھا اس کی قیمت صرف ساڑھے بارہ سو روپیہ سے بھی کم تجویز کی جس کو سن کر بڑے بڑے جوہری جنہوں نے اس کے جانچنے میں بالکل دھوکا کھایا تھا حیران رہ گئے۔

مینا بازار کا ذکر

کبھی کبھی ان جشنوں کے وقت محل سرا میں ایک فرضی بازار بھی لگا کرتا ہے جس میں امرا اور بڑے بڑے منصب داروں کی خوبصورت اور دلربا بیبیاں دکانیں لگا کر بیٹھتی اور

عمدہ کم خاب اور نئی نئی وضع اور عمدہ زردوزی کام کی چیزیں اور زری کار مند یلیں اور سفید باریک کپڑے جو امیر زادیوں کے استعمال میں آتے ہیں اور اور بیش قیمت چیزیں فروخت کرنے کو رکھتی ہیں اور بادشاہ اور اس کی بیگمیں اور شہزادیاں اور عالی رتبہ خاتونیں خریدار بنتی ہیں اور اگر کسی امیر کی بیٹی خوبصورت اور حسین ہوتی ہے تو اس کی ماں اس کو ضرور اپنے ساتھ لے جاتی ہے تاکہ بادشاہ کی نظر پڑ جائے اور بیگمات سے بھی تعارف ہو جائے۔ اس میلہ کا بڑا لطف یہ ہے کہ ہنسی اور مذاق کے طور پر خود بادشاہ ایک ایک پیسہ کے لئے جھگڑتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بیگم صاحب بہت گراں فروش ہیں۔ دوسری جگہ سے اس سے اچھی اور سستی چیز مل سکتی ہے، ہم ایک کوڑی بھی زیادہ نہ دیں گے۔ ادھر وہ کوشش کرتی ہے کہ اپنا مال زیادہ قیمت کو بیچے اور جب دیکھتی ہے کہ بادشاہ زیادہ قیمت نہیں لگاتا تو گفتگو میں اکثر ایسی بڑھ جاتی ہے کہ یہ کہہ اٹھتی ہے کہ آپ اپنے برف بیچنے کی خبر لیں ان چیزوں کی قیمت آپ کیا جانیں اور یہ آپ کے لائق نہیں ہیں، بہتر ہے کہ کسی اور جگہ تلاش کریں اور بیگمیں بادشاہ سے بھی زیادہ ارزاں خریدنا چاہتی ہیں۔ غرض کہ دونوں طرف سے ایسی گفتگو بڑھ جاتی ہے کہ ایک جھگڑے کا سوانگ سا معلوم ہوتا ہے مگر آخر کار سودا طے ہو جاتا ہے اور بادشاہ اور بادشاہ زادیاں اور بیگمیں جو چیزیں ادھر ادھر سے خریدتی ہیں ان کی قیمت فوراً دے دیتی ہیں اور روپیوں کی جگہ اشرفیاں اس طور سے ہاتھ سے ڈال دیتی ہیں کہ گویا دکاندار یا اس کی بیٹی کے حسن و جمال نے ان کو ایسا محو کر دیا ہے کہ روپیوں اور اشرفیوں کی تمیز ہی نہیں رہی اور ویسی ہی بے پروائی سے دکاندار ان کو اٹھا لیتی ہے اور اسی طرح سے یہ جلسہ دل لگی اور چوہل میں ختم ہو جاتا ہے۔

شاہ جہاں عورتوں کی طرف ذرا زیادہ مائل تھا اور اگرچہ بعض امرا کو ناگوار گزرتا مگر وہ ہر ایک جشن کے موقع پر یہ سوانگ کرایا ہی کرتا اور فی الواقع یہاں تک اعتدال سے گزر جاتا تھا کہ اس موقع پر ان عورتوں کو بھی محل میں بلا لیتا اور رات بھر وہیں رکھتا تھا جن کو "کنچنی" کہتے ہیں (جس کے معنی ہیں سونے سے ملمع کی ہوئی اور پھول کی طرح کھلی ہوئی) گو یہ عورتیں بازاری نہ تھیں بلکہ ایک خاص طور کی اور باعزت ہوتی تھیں جو بیاہ شادی کے موقع پر امرا اور منصب داروں کے ہاں صرف ناچنے گانے کے لئے جاتی تھیں۔ ان کنچنیوں میں اگرچہ اکثر صاحب حسن و جمال ہیں اور لباس و پوشاک بھی عمدہ رکھتی ہیں اور گانے میں بھی ان کو کمال ہے اور ناچنے میں تو اپنے اعضا کو اس خوبی سے لچکاتی اور اس سرعت اور تیزی سے

ناچتی ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور تال و سم میں بھی درست رہتی ہیں مگر پھر کسبی ہیں۔

شاہ جہاں اسی پر قناعت نہ کرتا تھا کہ یہ عورتیں اس میلہ میں آئیں بلکہ بدھ کے روز جو معمول کے موافق دربار میں سلام کو آتی تھیں تو اکثر رات بھر کے لئے ٹھہرا لیتا اور ان کے ناچنے گانے سے حظ اٹھاتا تھا۔ لیکن اورنگ زیب باپ سے زیادہ سنجیدہ ہے اور اس نے ان کا محل میں آنا بالکل بند کر دیا ہے۔ مگر معمول کے موافق چہار شنبہ کو دربار میں حاضر ہونے سے منع نہیں کیا اور صرف دور سے سلام کر کے رخصت ہو جاتی ہیں۔

اب چونکہ میں جشن اور مینا بازار اور کنچنیوں کا ذکر کر رہا ہوں تو ایک واقعہ کے بیان کرنے سے باز نہیں رہ سکتا جو برنارڈ نامی ہمارے ایک ہم وطن سے تعلق رکھتا ہے اور چونکہ میرے نزدیک بھی پلوٹارک (۲۹۶) کا یہ قول صحیح ہے کہ "جزوی اور خفیف باتوں کو پوشیدہ رکھنا نہیں چاہئے کیونکہ اکثر اوقات ان سے ایک قوم کے رسوم و عادات اور ذہن و ذکا کے باب میں صحت کے ساتھ رائے قائم کرنے میں بڑی بڑی باتوں کی بہ نسبت زیادہ مدد ملتی ہے" اس لئے اگرچہ یہ ایک ہنسی کا قصہ ہے مگر تاہم سننے کے لائق ہے۔

برنارڈ، جہانگیر کے اخیر زمانہ میں ایک نامی اور فی الواقع ایک نہایت کامل طبیب اور جراح تھا اور بادشاہ اس پر بہت مہربانی کرتا تھا۔ چنانچہ اکثر اوقات بادشاہ کے ساتھ کھانے پینے میں بھی شریک ہو جاتا تھا اور دونوں حد سے زیادہ شراب پی لیتے تھے اور بادشاہ اور طبیب دونوں ایک ہی طرح کے مزاج کے تھے اور بادشاہ کا یہ حال تھا کہ شب و روز عیش و نشاط میں مشغول رہتا تھا اور سلطنت کا کام کاج اپنی مشہور و معروف بیگم نور جہاں کو سونپ رکھا تھا جس کی نسبت اس کا یہ قول تھا کہ "اس کی عقل و دانائی سلطنت کے انتظام کے لئے کافی ہے، مجھے دخل دینے کی حاجت نہیں"۔ برنارڈ کی معمولی تنخواہ اگرچہ پچیس روپیہ روز تھی مگر شاہی محل سراہیں اور امرا کے ہاں معالجہ کے لئے جانے کے باعث اور نیز اس سبب سے کہ لوگ نہ صرف اس کے طبیب ہونے کی وجہ سے بلکہ بادشاہ کے مزاج میں دخل کے سبب سے ایک دوسرے سے بڑھ کر اس کی تواضع کرتے تھے اس کو بہت کچھ حاصل ہو رہتا تھا۔ مگر وہ روپیہ کی کچھ بھی قدر نہ کرتا تھا اور ایک ہاتھ سے لیتا اور دوسرے ہاتھ سے دے دیتا تھا اور اس لئے سب لوگ اس کو عزیز جانتے تھے خصوصاً "کنچن" جن کو اس نے بہت کچھ کھلایا تھا۔ پس اس کے ہاں جو ہمیشہ رات کو ان عورتوں کا جمگھٹ ہوتا تھا یہ ان میں سے ایک نوخیز عورت پر جو نہایت حسین اور ناچنے میں مشہور تھی، فریفتہ ہو گیا اور ہر چند طرح طرح کی

کوششیں کیں لیکن اس عورت کی ماں اس خیال سے کہ کم عمری کی وجہ سے اس کے حسن و جمال اور تندرستی میں فرق نہ آجائے ایک لحظہ اس کو اپنی نظر سے علیحدہ نہ ہونے دیتی تھی۔ اسی حالت میں جبکہ برنارڈ معشوق کے وصال سے مایوس ہو رہا تھا ایک دن جہانگیر نے جو سر دربار اس کے ایک بے نظیر علاج کے صلہ میں اس کو انعام دینا چاہا تو اس نے عرض کیا امیدوار ہوں کہ حضورِ معلیٰ اس انعام سے معاف رکھیں اور بجائے اس کے میری یہ التجا منظور فرمائیں کہ یہ نوجوان کنچنی جو ارباب نشاط کے ساتھ سلام کو حاضر ہوئی ہے مجھے عنایت ہو تمام دربار اس کے اس عذر اور ایسی درخواست کے کرنے سے جو اس کے عیسائی اور اس کنچنی کے مسلمان ہونے کی وجہ سے شاید ہی قابلِ قبول معلوم ہوتی تھی مسکرایا لیکن جہانگیر نے جس کو دین اور مذہب کا کچھ بھی خیال نہ تھا ایک بڑا قہقہہ مارا اور حکم دیا کہ اس کنچنی کو اس کے کاندھے پر بٹھادو اور کہو کہ لے جائے۔ چنانچہ فوراً بھرے دربار میں یہ اس کے کاندھے پر بٹھا دی گئی اور وہ اس انعام کو لے کر خوشی خوشی گھر کو چلتا ہوا۔

ہاتھیوں کی لڑائی کے تماشے کا ذکر

جشن کا اختتام ہمیشہ ایک ایسے تماشے پر ہوتا ہے جس سے یورپ میں کوئی بھی واقف نہیں یعنی ہاتھیوں کی لڑائی پر جو عام خلقت کے سامنے جمنا کی ریتی میں لڑائے جاتے ہیں اور بادشاہ اور بیگمات اور تمام امرا قلعہ کے جھروکوں میں سے یہ تماشا دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک خام دیوار تین یا چار فٹ چوڑی اور پانچ یا چھ فٹ اونچی بنائی جاتی ہے اور اس کے دونوں جانب سے دو قوی ہیکل ہاتھی جن پر دو دو آدمی سوار ہوتے ہیں مقابل کئے جاتے ہیں۔ دوسرا آدمی اس لئے ہوتا ہے کہ اگر ہاتھی کی گردن پر سے ایک گر پڑے تو دوسرا آنکس سے اس کو چلائے اور یہ لوگ کبھی تو ان کو بڑھاوے دے کر اور کبھی برا بھلا کہہ کر اور پاؤں سے ہول کر آگے بڑھاتے ہیں یہاں تک کہ یہ بیچارے جانور دیوار کے پاس پہنچ کر ایک دوسرے پر حملہ کرتے اور ایسی ٹکر لگاتے ہیں کہ دیکھ کر خوف آتا اور سر اور سونڈ اور دانتوں کے زخموں سے ان کا زندہ رہنا تعجب معلوم ہوتا ہے۔ یہ لڑائی اکثر رہ رہ کر ہوتی اور مٹی کی دیوار آخر کار گر جاتی ہے اور زبردست اور دلیر ہاتھی اس کو پھاند کر حریف پر حملہ کرتا اور اس کو بھگا دیتا ہے اور ایسا پچھاڑتا ہے کہ آتشبازی کی "چرخیوں" کے بغیر جو ان کے بیچ میں چھوڑ دی جاتی ہیں حریف سے الگ نہیں ہوتا کیونکہ یہ جانور بالطبع ڈرپوک ہے اور خصوصاً آگ سے

بہت ڈرتا ہے اور یہی سبب ہے کہ جب سے آتشی ہتھیار لڑائی میں برتے جانے لگے ہیں ہاتھی لڑائی میں بہت کم کار آمد رہ گئے ہیں اور اگرچہ سراندیپ کے ہاتھی سب سے زیادہ دلیر ہوتے ہیں مگر خواہ کہیں کے ہوں میدان جنگ میں لے جانے سے پہلے برسوں تک ڈر کھونے کے لئے ان کے کانوں کے پاس بندقیں اور ٹانگوں میں پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں۔

ان عظیم الشان جانوروں کی لڑائی کا خاتمہ بڑی بے دردی پر ہوتا ہے یعنی اکثر یہ ہوتا ہے کہ ہاتھی اپنے حریف کے مہاوت کو اپنے سونڈ سے پکڑ کر نیچے گرالیتا اور فوراً پاؤں سے کچل ڈالتا ہے اور مہاوتوں کا کام ایسا خطرناک ہے کہ یہ بدنصیب آدمی اپنے جورو بچوں سے اس طرح پر رخصت ہوتے ہیں کہ گویا مرنے کو جاتے ہیں۔ لیکن ان کے دل کو اس خیال سے کسی قدر تسلی رہتی ہے کہ اگر زندہ بچے اور بادشاہ ان کی کارگزاری سے راضی ہوا تو نہ صرف ان کی تنخواہ بڑھ جائے گی بلکہ ہاتھی سے اترتے ہی پچیس روپے کے پیسوں کی ایک تھیلی مل جائے گی اور اگر کام آ گئے تو ان کی تنخواہ ان کی بیوی کو ملتی رہے گی اور بیٹا ان کی جگہ نوکر ہو جائے گا۔ اس تماشے میں مہاوتوں ہی کی جان نہیں جاتی بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان غصے میں بھرے ہوئے جانوروں سے بچنے کے لئے ایسی سخت بھاگڑ پڑتی ہے اور پیدل اور سوار اس طرح پر بھاگتے ہیں کہ بعض آدمی گر کر لوگوں یا خود ہاتھیوں کے پاؤں سے کچل جاتے ہیں۔ چنانچہ جب دوسری بار مجھ کو اس تماشے کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو صرف اپنے گھوڑے کی خوبی اور دو خدمتگاروں کی کوشش کی بدولت بچا تھا۔

جامع مسجد کا ذکر

اب موقع ہے کہ میں قلعہ کا ذکر چھوڑوں اور پھر شہر کی طرف رجوع کروں جس کی دو عمارتوں کا ذکر کرنا اب تک باقی ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک تو بڑی مسجد (۲۹ ے) ہے جو وسط شہر میں ایک مرتفع پہاڑی پر واقع ہونے کے سبب سے بہت دور سے نظر آتی ہے۔ اس کی بنیاد رکھنے سے پہلے پہاڑی کی سطح کو خوب ہموار کر دیا گیا اور چاروں طرف چوکور میدان کھول دیا گیا تھا جہاں مسجد کی چاروں سمتوں سے چار بڑے بازار آن کر ملتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک تو صدر دروازہ کے سامنے ہے اور دوسرا عقب میں اور دو دونوں بغلی دروازوں کے محاذی۔ اور اندر جانے کے لئے تینوں ضلعوں میں کوئی پچیس پچیس یا تیس تیس پتھر کی خوبصورت سیڑھیاں بنتی چلی گئی ہیں اور پشت کی جانب پہاڑی کی اونچائی تک پتھر گھڑ

کر اور خوب صاف کر کر لگائے گئے ہیں جن سے پہاڑی کی ناہمواری چھپ کر عمارت خوبصورت ہو گئی ہے۔ اس کے تینوں دروازے سنگِ سرخ سے بنے ہیں اور نہایت عالیشان ہیں اور ان کے کواڑوں پر تانبے یا پیتل کی پتیاں جڑی ہوئی ہیں مگر صدر دروازہ جس پر سفید سنگِ مرمر کی چھوٹی چھوٹی بُرجیاں بنی ہوئی ہیں اور بہت خوشنما معلوم ہوتی ہیں، زیادہ شان دار ہے۔ مسجد کے پیچھے کے حصے میں تین بڑے بڑے گنبد ہیں جن کے اندر اور باہر سفید سنگِ مرمر لگا ہوا ہے اور بیچ کا گنبد دوسروں کی بہ نسبت بہت بڑا اور اونچا ہے اور مسجد کا صرف یہی حصہ مسقّف ہے باقی گنبدوں سے لے کر صدر دروازہ تک بالکل کھلا ہوا ہے جو گرمی کی وجہ سے کھلا رکھنا ضروری ہے اور مسجد کے اندرونی حصہ میں سفید سنگِ مرمر کا (جس پر سنگِ موسیٰ کی تحریر سے مصلی بنے ہوئے ہیں) اور بیرونی میں سنگِ سرخ کی سلوں کا فرش ہے۔

میں قبول کرتا ہوں کہ یہ عمارت بموجب ان اصول کے جن کو ہم لوگ پسند کرتے ہیں نہیں بنی لیکن میں اس میں کچھ عیب بھی نہیں پاتا۔ اس کے ہر ایک حصہ کی تقسیم عمدہ طور پر ہے اور تعمیر بھی عمدہ ہے اور تناسب کا بخوبی لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ مجھے امید ہے کہ اگر پیرس میں کوئی گرجا اس کے نقشے پر بنایا جائے تو اپنی نرالی اور عجیب وضع کے لحاظ سے سب لوگوں کو پسند آئے۔ تینوں گنبدوں اور چھوٹی بُرجیوں کے سوا جو سنگِ مرمر کی ہیں باقی عمارت سنگِ سرخ سے بنی ہے جو سنگِ مرمر کی بہ نسبت ذرا نرم ہے اور زمانہ پا کر اس میں سے ورق سے جھڑنے لگ جاتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگوں کا یہ قول ہے کہ جس کان سے یہ پتھر نکلتا ہے کچھ مدت بعد اس میں پھر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو نہایت عجیب ہے اور غلط یا صحیح اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ برسات کے دنوں میں کان میں پانی بھر جاتا ہے مگر میں اس امر کی نسبت کوئی قطعی رائے نہیں دے سکتا۔

بادشاہ ہر جمعہ کو جو مسلمان ملکوں میں ہمارے اتوار کی طرح مقدس سمجھا جاتا ہے اس مسجد میں نماز پڑھنے کو جاتا ہے اور جس راستہ سے اس کا گزر ہوتا ہے اس میں پہلے سے گرمی اور گرد و غبار کے فرو ہو جانے کے لئے چھڑکاؤ کر دیا جاتا ہے اور قلعہ کے دروازہ سے لے کر مسجد تک تین یا چار سو سپاہی دو رویہ صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں جن کے پاس چھوٹی چھوٹی مگر بہت خوبصورت بندوقیں ہوتی ہیں جن پر سرخ بانات کا غلاف ہوتا ہے اور اس کے سرے پر ایک چھوٹا سا پھریرا۔ اور پانچ یا چھ عمدہ سوار قلعہ کے دروازہ پر اس

غرض سے موجود رہتے ہیں کہ سواری کے وقت راستہ کھلا اور صاف رکھیں اور وہ اتنے فاصلہ سے آگے آگے چلتے ہیں کہ ان کی گرد سے بادشاہ کو تکلیف نہ پہنچے اور جب یہ سب تیاری ہو جاتی ہے تو بادشاہ قلعہ سے کبھی تو ہاتھی پر جو خوب سجایا ہوا اور جس پر سنہری اور منقش کام کی عماری کسی ہوئی ہوتی ہے، سوار ہو کر نکلتا ہے اور کبھی سنہری اور لاجوردی کام کے تخت رواں پر جو کمخاب یا ارغوانی رنگ کی مخمل وغیرہ سے منڈھے ہوئے ڈنڈوں پر بندھا ہوا ہوتا ہے اور جس کو آٹھ چیدہ اور بھاری بھاری وردیوں والے کہار کاندھے پر اٹھاتے ہیں سوار ہوتا ہے اور پیچھے پیچھے بہت سے امرا ہوتے ہیں جو بعض تو گھوڑوں پر اور بعضے پالکیوں میں سوار ہوتے ہیں اور انہی میں ملے جلے بہت سے منصب دار اور چاندی کی چھڑیوں والے چوبدار وغیرہ ہوتے ہیں۔ میں اس سواری کو سلطان روم کی باشان و شوکت سواری سے تشبیہ نہیں دے سکتا اور نہ بادشاہان یورپ کے جنگی طور کے جلوس سے کیونکہ اس کا تجمل اور عظم و شان اور ہی طرح کا ہے مگر کچھ کم شاہانہ نہیں ہے۔

کاروان سرا کا ذکر

دوسری قابل الذکر عمارت وہ کارواں سرا ہے جو شاہ جہاں کی بڑی بیٹی معروف بیگم صاحب نے جس کا میں نے گزشتہ لڑائی کی تاریخ میں بہت کچھ ذکر کیا ہے بنوائی تھی اور نہ صرف اس شہزادی ہی نے بلکہ اور امرا نے بھی بڈھے بادشاہ کے خوش کرنے کو شہر کی رونق بڑھانے میں بہت روپیہ صرف کیا ہے۔ یہ ہمارے پیلس رائل کی طرح ایک بڑی اور محراب دار مربع عمارت ہے جس میں برابر برابر کوٹھڑیاں اور ان کے آگے علیحدہ علیحدہ برانڈے ہیں اور یہ دو منزلی ہے اور جیسے علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیاں اور برآمدے نیچے ہیں ویسے ہی اوپر کی منزل میں بھی ہیں اور ایرانی اور تورانی اور پردیسی دولتمند تاجر حفاظت کی جگہ سمجھ کر اس میں آن کر ٹھہرتے ہیں کیونکہ رات کو اس کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ کاش پیرس میں بھی دس بیس جگہ ایسی عمارتیں ہوتیں تاکہ پردیسی آدمیوں کو وہاں پہنچتے ہی محفوظ اور معقول مکان کے حاصل کرنے میں اس قدر حیرانی نہ ہوتی جس قدر کہ اب ہوتی ہے اور تاوقتیکہ دوست آشناؤں سے مل کر زیادہ آرام کا مکان بہم پہنچائیں ان میں ٹھہرتے۔ اس کے علاوہ یہ ہر قسم کے مال تجارت کے ٹھہرنے اور پردیسی سوداگروں کے اترنے کے لئے ایک عمدہ اور آسائش کے مقام ہوتے۔

پیرس اور دہلی کی آبادی اور لوگوں کی خوش حالی اور مفلسی کا مقابلہ

اب چونکہ میں خیال کرتا ہوں کہ آپ مجھ سے یہ ضرور دریافت کریں گے کہ اس شہر کی عام آبادی کی تعداد اور آسودہ حال لوگوں کا شمار پیرس کے مقابلہ میں کیا ہے۔ پس دہلی کا ذکر ختم کرنے سے پہلے میں اسی کو بیان کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ پیرس کے تمام مکانات کے سہ منزلہ اور چہار منزلہ ہونے اور قریباً ان سب کے لوگوں سے معمور اور بھرے ہوئے ہونے اور اس طرح پر اس کے تین یا چار شہروں کے برابر ہونے اور سڑکوں اور گلی کوچوں کے عورت و مرد اور پیدلوں اور سواروں اور انواع و اقسام کی گاڑیوں سے بھرے رہنے اور بڑے بڑے چوکوں اور باغوں اور میدانوں کے اس میں بہت کم ہونے پر خیال کر کے پیرس مجھ کو آدمیوں کے ایک بن کی مانند معلوم ہوتا ہے اور اس وجہ سے میں یقین نہیں کر سکتا کہ جتنے آدمی اس میں ہیں اتنے ہی دہلی میں بھی ہوں گے۔ مگر جب ہندوستان کے اس دارالسلطنت کی وسعت اور بے شمار دکانوں اور اس امر پر خیال کرتا ہوں کہ امرا کے علاوہ پینتیس ہزار سوار سے اس میں کبھی کم نہیں رہتے جو قریباً سب کے سب عیال دار اور صاحبِ اولاد اور سب کے پاس بہت سے نوکر چاکر ہیں جو اپنے آقاؤں کی طرح علیحدہ علیحدہ مکانوں میں رہتے ہیں اور کوئی ایسا گھر نہیں جس میں عورتیں اور لڑکے بالے موجود نہ ہوں اور شام کو جب ذرا گرمی کم ہو جاتی ہے اور لوگ باہر نکلتے ہیں تو تمام سڑکیں اور گلی کوچے باوجود اپنی وسعت کے خلقت سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور پہیہ دار سواریاں (جن سے جگہ رک جاتی ہے) بہت ہی کم دکھائی دیتی ہیں تو ٹھیک نہیں کہہ سکتا کہ دہلی اور پیرس کی آبادی میں کیا نسبت ہے۔ لیکن میرے قیاس میں اگر پیرس کے برابر یہاں آدمی نہ ہوں تو کچھ بہت کم بھی نہ ہوں گے۔ البتہ اگر آسودہ حال لوگوں پر نظر کی جائے تو بیشک پیرس میں اور اس میں ایک نمایاں تفاوت معلوم ہوتا ہے کیونکہ پیرس میں دس میں سے سات یا آٹھ آدمی کپڑے لتے سے درست اور معقول صورت نظر آتے ہیں لیکن دہلی میں صرف دو یا تین آدمی ایسے دکھائی دیتے ہیں اور باقی غریب اور پھٹے پرانے کپڑوں کے ساتھ دیکھنے میں آتے ہیں جو بے چارے فوج کی وجہ سے یہاں چلے آتے ہیں۔ لیکن میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مجھے اکثر ایسے لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوتا ہے جو اچھے وجیہہ اور عمدہ اور ستھرا لباس پہنے اور عمدہ گھوڑوں پر چڑھے ہوئے اور نفر خدمتگار ساتھ لئے ہوئے

ہوتے ہیں۔

امرا کی سواری کے طریقہ کا ذکر

جس وقت امرا اور راجہ اور منصب دار لوگ چوکی دینے یا دربار میں حاضر ہونے کو آتے ہیں تو اس چوک سے جو قلعہ کے سامنے ہے کوئی زیادہ بارونق مقام نظر نہیں آتا۔ چنانچہ چاروں طرف سے بہت سے منصب دار ساز و سامان سے درست اور عمدہ گھوڑوں پر چڑھے ہوئے اور چار خوش پوشاک خدمتگار ساتھ لئے ہوئے جن میں سے دو پیچھے اور دو راستہ کھلا رکھنے کے لئے آگے آگے رہتے ہیں آتے ہیں اور امرا اور راجہ بعضے تو گھوڑوں پر اور بعضے عمدہ ہاتھیوں پر اور اکثر مکلّف پالکیوں میں جن کو چھ چھ کہار لگے ہوئے ہوتے زربفت کا تکیہ لگائے پان چباتے آتے ہیں جس سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ منہ خوشبودار اور ہونٹ سرخ ہو جائیں اور پالکی کے ایک طرف تو ایک خدمتگار دانت خلال اور چاندی یا چینی کا اگالدان جس کا حقہ کے ساتھ ہونا ضروری ہے، لئے ہوئے ہوتا ہے اور دوسری جانب دو خدمتگار ہوتے ہیں جو اپنے آسائش پسند مالک کو پنکھا جھلتے یا گرد و غبار اور مکھیاں اڑانے کو مور چھل ہلاتے ہیں اور تین چار پیادے راستہ کھلا رکھنے کے لئے آگے آگے دوڑتے اور کچھ منتخب اور وجیہہ خوش لباس جوان گھوڑوں پر چڑھے ہوئے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔

دہلی کے نواح کے بعض مکانات وغیرہ کا ذکر

دہلی کے نواح کی زمین نہایت زرخیز ہے اور اس میں اکھ 'گیہوں 'جو 'نیل 'دھان ' باجرہ 'جوار 'مونگ 'ماش اور موٹھ وغیرہ جو عام لوگوں کی خوراک ہے بافراط پیدا ہوتے ہیں۔ دہلی سے چھ میل آگرہ کے راستہ پر ایک مقام ہے جس کو مسلمان "قطب الدین" کہتے ہیں اور یہاں ایک بہت قدیم عمارت (۲۹۸) ہے جو کبھی ہندوؤں کا دہرا تھا اور اس پر ایسے حروف میں کچھ کھدا ہوا ہے جو ہندوستان کی مروّجہ زبانوں کے حروف میں سے کسی سے بھی نہیں ملتے اور نہ کوئی شخص ان کو پڑھ سکتا ہے اور دوسری جانب شہر کے ایک بادشاہی باغ ہے جس کو "شالا مار (۲۹۹)" کہتے ہیں اور جو ایک بہت خوبصورت اور عالیشان عمارت ہے لیکن "فون ٹن بلو" اور "سینٹ جرمین" اور "ورسیلس" کے مقابلہ کا نہیں۔ یقین کیجئے کہ دہلی کی نواح میں ایسے محل اور عالیشان مکانات نہیں ہیں جیسے کہ سینٹ کلوڈ 'چینت لی 'میوڈان ' لانیکور 'وا 'یا رو دیل ہیں اور نہ ویسے مختصر باغات ہیں جن کے مالک غیر ملازم شرفا اور اہلِ شہر اور سوداگر

ہوں لیکن یہ کچھ جائے تعجب نہیں کیونکہ یہاں کی رعایا میں سے کسی کو بھی حق ملکیت زمین حاصل نہیں ہے۔

دہلی اور آگرہ کے درمیانی راستہ کا ذِکر

دہلی اور آگرہ کے مابین جو ڈیڑھ سو یا ایک سو اسی میل کا فیصلہ ہے اس میں نہ تو کوئی عمدہ شہر ہے (حالانکہ فرانس میں مسافر کو اس قدر مسافت کے اندر کئی شہر دکھائی دیتے ہیں) اور نہ کوئی اور دلچسپ مقام ہے البتہ متھرا جہاں ہندوؤں کا ایک قدیم اور عالیشان مندر دیکھنے کے لئے اب بھی موجود ہے اور چند خوبصورت کاروان سرائیں جو ایک ایک منزل کے فاصلہ پر بنی ہوئی ہیں، قابل الذِکر مقام ہیں اور اس راستہ کے دونوں طرف سایہ کے لئے دوہری قطار میں درخت لگے ہوئے اور ایک ایک کوس کے فاصلہ پر رہنمائی کی خاطر پختہ منارے اور مسافروں کے پانی پینے اور درختوں کے پودوں کی سیرابی کے لئے پختہ کنوئیں بنے ہوئے ہیں (۳۰۰)۔

شہر آگرہ عرف اکبر آباد کا ذِکر

میں نے دہلی کی جو کیفیت بیان کی ہے اسی پر آگرہ کو قیاس کر لیجئے یعنی وہ اور وہاں کا قلعہ اور اور عمارتیں بھی جمنا ہی کے کنارے پر ہیں لیکن اس وجہ سے کہ اکبر کے زمانہ سے {جس نے اس کو آباد کر کے اپنے نام پر اس کا اکبر آباد (۳۰۱) نام رکھا تھا} بادشاہان ہندوستان اکثر وہیں رہتے رہے ہیں۔ اس کو وسعت اور کثرتِ عمارت میں جن کو امرا اور راجاؤں اور غیر ملازم شرفا نے عمدہ پتھر یا اینٹ سے تعمیر کرایا ہے، دہلی پر فوقیت حاصل ہے اور کارواں سرائیں بھی اس میں وہاں کی بہ نسبت زیادہ ہیں اور دو مقبرے ایسے عمدہ اور مشہور و معروف یہاں ہیں کہ جن پر یہ ناز کر سکتا ہے اور جن کا بیان میں آئندہ کروں گا۔ لیکن اس کی شہر پناہ نہیں ہے اور بعض اور امور میں بھی دہلی سے گھٹا ہوا ہے اور چونکہ پہلے سے کوئی نقشہ تجویز ہو کر نہیں بنایا گیا اس لئے دہلی کی سی متحد الوضع اور سیدھے اور وسیع بازار جن سے اس کو امتیاز حاصل ہے اس میں نہیں ہیں۔ البتہ چار یا پانچ بازار بہت طولانی ہیں اور ان کی عمارت بھی اچھی ہے مگر ان میں بیوپاری ہی زیادہ بیٹھتے ہیں اور ان کے سوا سب چھوٹے چھوٹے اور تنگ اور بے قاعدہ ہیں جن میں بہت سے گوشے اور پیچ و خم ہیں اور اس سبب سے جب بادشاہ کا قیام یہاں ہوتا ہے تو ان میں عجیب کشمکش اور دھکا پیل رہتی ہے۔ میں

خیال کرتا ہوں کہ ان دونوں شہروں میں جو بڑی بڑی ما بہ الامتیاز باتیں ہیں وہ میں نے سب بیان کر دی ہیں مگر ان پر ایک یہ بات اور اضافہ کرتا ہوں کہ آگرہ کو اگر کسی بلند مقام سے کھڑے ہو کر دیکھیں تو گاؤں کی شکل کا معلوم ہوتا ہے اور اس کا منظر گاؤں کا سا طرح طرح کا اور خوشنما ہے کیونکہ امرا کا معمول ہے کہ اپنے مکانوں کے صحنوں اور باغوں میں سایہ کے لئے بڑے بڑے درخت لگواتے ہیں اور امرا اور راجہ اور دولتمند لوگوں کے بڑے بڑے مکانوں کے مانند ایک دوسرے سے فصل کے لئے نہایت فرحت بخش پھول پھلواری اور درخت اور بیل بوٹے لگے ہوئے ہیں اور ان میں ہندو مہاجنوں کی اونچی اونچی پتھر کی حویلیاں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے کسی جنگل کے اندر کوئی پرانی گڑھی۔

ایک گرمی سے جلے بھنے ملک میں کہ جہاں تازگی اور آرام حاصل کرنے کو آنکھیں خود بخود سبزے کی متلاشی ہوتی ہیں اگرچہ ایک ایسا منظر بے شبہ دل کو ایک خاص طور کی فرحت دیتا ہے مگر یہ خیال کر کے کہ دنیا کا ایک نہایت عمدہ اور خوشنما نظارہ دیکھنے میں آئے گا آپ کو پیرس کے چھوڑنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ تو یقیناً آپ کو پوائنٹ ٹی آف پر بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اگر آپ ذرا دن کو اس پر جا کر بیٹھیں اور دیکھیں کہ خلقت اور گاڑیوں کا کیا عجیب و غریب جمگھٹ اور طرح طرح کی چیزیں اور بھیڑ بھاڑ نظر سے گزرتی ہے اور پھر رات کو بیٹھ کر ملاحظہ کریں تو بے شک میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ فرمایئے اس سے زیادہ دلچسپ نظارہ اور کہاں دکھائی دے سکتا ہے اور اس پر سے مکانات کی بے شمار کھڑکیوں میں سے جو صاف اور دھیمی دھیمی روشنی نظر آتی ہے ذرا دیکھئے تو وہ کیا لطف دکھاتی ہے اور جو بھیڑ بھاڑ اور گاڑیوں اور لوگوں کا ہجوم دن کو رہتا ہے وہی آدھی رات کو بھی نظر آتا ہے اور ممالکِ ایشیا کے بر خلاف جہاں ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں بادیانت اہلِ شہر کی بیبیاں اور بیٹیاں بغیر چور اچکوں کے خوف اور کیچڑ وغیرہ کی تکلیف کے بے تکلف بازاروں اور گلی کوچوں میں چلتی پھرتی اور جہاں تک نظر جا سکتی ہے خواہ کوئی اور کیسا ہی موسم کیوں نہ ہو چاروں طرف لال ٹینوں کی قطاریں روشن اور جگمگاتی نظر آتی ہیں۔

مشفقِ من! پیرس میں پوائنٹ ٹی آف پر کھڑے ہو کر بے شک آپ میری ذمہ داری پر دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں انسان کا بنایا ہوا اس سے زیادہ خوشنما کوئی منظر نہیں ہے لیکن چین اور جاپان کی میں نہیں کہتا کیونکہ میں نے ان کو نہیں دیکھا اور اس کی خوبی اب وقت اور بھی بڑھ جائے گی جبکہ لوائر کی تعمیر ختم ہو جائے گی اور لوگوں کے قول کے

برخلاف جو اس کے نقشہ کو دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ صرف کاغذ ہی کاغذ پر دکھائی دیتا رہے گا۔ حقیقتاً وجود میں آجائے گا۔ انسان کے بنائے ہوئے منظر کی قید میں نے اس لئے لگائی ہے کہ دنیا کے عمدہ مناظر کے ذکر کے موقع پر اس لفظ کے عام معنوں کے لحاظ سے قسطنطنیہ کے اس قدرتی منظر کو جو سمندر کی بڑی کھاڑی میں سے اس طرح نظر آتا ہے کہ ایک طرف تو قسطنطنیہ ہے اور دوسری جانب پوائنٹ ڈیو سرٹیل ہے 'مستثنیٰ کر دینا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب پہلے پہل میں نے قسطنطنیہ کے اس لمبے چوڑے منظر کو دیکھا تو میری طبیعت پر ایسی خوشی غالب ہوئی جو کبھی نہیں بھول سکتی اور میں نے اس کو ایک جادو کا بنا ہوا ا سٹمٹی تھیٹر (۳۰۲) خیال کیا۔ لیکن اگرچہ اس منظر میں جو خوبی کی باتیں ہیں وہ سب قدرت کی مصنوعات ہیں اور پیرس میں جو کچھ ہے وہ تمام یا قریب تمام کے انسان کی صنعت ہے۔ مگر میری رائے میں پہلے کی بہ نسبت پچھلا زیادہ دلچسپ ہے کیونکہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ شہر ایک بڑی سلطنت کا دارالحکومت اور ایک ذی قدرت بادشاہ کا جائے قیام ہے اور دہلی اور آگرہ اور قسطنطنیہ کی سب طرح کی خوبیوں کو تسلیم کر کے پھر بھی میں انصافاً یہ کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کے شہروں میں پیرس سب سے زیادہ متمول اور خوبصورت اور ہر ایک طرح سے مقدم ہے۔

جیسویٹ فرقہ کے عیسائیوں کے ایک گرجا اور کالج کا ذکر

آگرہ میں ایک گرجا بھی ہے جس کو جیسویٹ فرقہ کے لوگوں نے بنایا تھا اور ایک اور مکان ہے جس کو وہ کالج کہتے ہیں جس میں پچیس یا تیس عیسائی گھرانوں کے بچوں کو عقائدِ مذہبی کی تعلیم دی جاتی ہے مگر مجھے معلوم نہیں کہ یہ عیسائی خاندان یہاں کس طرح جمع ہو گئے ہیں۔ شاید ان جیسویٹ پادریوں کے فیاضانہ اور مہربانہ سلوک نے ان کو یہاں سکونت اختیار کر لینے پر مائل کیا ہے جس زمانہ میں پرتگیزوں کا ہندوستان میں بڑا زور تھا ان جیسویٹ لوگوں کو جو ایک مذہبی گروہ ہے شہنشاہ اکبر نے بلا کر یہاں آباد کر لیا تھا اور گزر اوقات کے لئے کچھ سالیانہ مقرر کر دینے کے علاوہ لاہور اور آگرہ میں گرجا تعمیر کر لینے کی بھی اجازت دے دی تھی اور جہانگیر تو اپنے باپ سے بھی بڑھ کر ان کا مربی تھا مگر شاہ جہاں کے عہد میں ان کو بہت تکلیف پہنچی۔ اس نے ان کا سالیانہ بند کر دیا اور لاہور کا گرجا تو بالکل ہی مسمار کرا دیا اور آگرہ کے گرجا کا بھی بہت سا حصہ مع اس منارے کے جس پر گھنٹہ لگا ہوا تھا

اور جس کی آواز تمام شہر میں جاتی تھی گروا دیا۔ جہانگیر کے زمانہ میں ان لوگوں کو امید تھی کہ ہمارا مذہب کچھ نہ کچھ یہاں پھیل جائے گا کیونکہ جہانگیر حقیقت میں قرآن کے مسائل کو نہایت ناپسند کرتا تھا اور ہمارے مذہب کے مسئلے اس کو ایسے بھائے تھے کہ ان پر اپنا تعجب ظاہر کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے دو (نیفیوز) بھانجوں یا بھتیجوں اور مرزا ذوالکرمین (ذوالقرنین) کو جس کا ختنہ بھی ہو چکا تھا اور شاہی محل سراہی میں پرورش پائی تھی، عیسائی ہو جانے کی اجازت دے دی تھی اور بہانہ یہ کیا تھا کہ اس کے ماں باپ عیسائی تھے (کیونکہ اس کی ماں جو ایک دولتمند ارمنی کی بیوی تھی جہانگیر کی خواہش کے موافق محل میں داخل ہو گئی تھی) اور یہ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جہانگیر کے عیسائی ہو جانے کا قصد اس درجہ کو پہنچ گیا تھا کہ اس نے تمام دربار کو یورپی لباس پہنانے کا دلیرانہ ارادہ کیا اور ایک دن خلوت میں یہ لباس پہن کر اپنے ایک بڑے امیر کو بلایا اور اس کی اس باب میں رائے دریافت کی مگر اس نے ایسا اندیشہ ناک جواب دیا کہ جہانگیر نے ڈر کر یہ ارادہ چھوڑ دیا اور اس تمام قصہ کو ہنسی کے پیرایہ میں اڑا دیا۔ یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جہانگیر نے انتقال کے وقت عیسائی ہو کر مرجانا چاہا تھا اور ہم کو بلانے کا حکم دیا تھا مگر لوگوں نے یہ پیغام ہم تک مطلق نہ پہنچایا۔ لیکن اور لوگ اس امر سے بالکل انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جیسا وہ زندگی میں کسی مذہب وملت کا پابند نہ تھا ویسا ہی اخیر وقت میں بھی نہ تھا اور باپ کی طرح اس کا بھی ارادہ تھا کہ اپنے کو پیغمبر بنا کر ایک نیا مذہب جاری کرے۔ میں نے ایک مسلمان شخص کی زبانی جس کا باپ جہانگیر کا ملازم اور اس کے امورِ خانگی سے تعلق رکھتا تھا سنا ہے کہ ایک دفعہ بادشاہ نے شراب کی ترنگ میں کئی بڑے بڑے ملاؤں اور ایک پادری متوطن فلورنس (۳۰۳) کو جس کی تند خوئی کی وجہ سے جہانگیر نے اس کا نام "پادری آتش" رکھ چھوڑا تھا بلوایا اور جب اس نے آکر بادشاہ کے حکم کے موافق بڑے زور سے دینِ اسلام کے بطلان اور اپنے مذہب کی تائید میں گفتگو کی تو بادشاہ نے کہا کہ مسلمان عالموں اور جیسویٹ پادریوں میں جو نزاع ہے اس کے تصفیہ کے لئے یہ عمدہ موقع ہے اور حکم دیا کہ ایک گڑھا کھود کر اس میں آگ جلائی جائے اور پادری اپنی انجیل اور ایک ملا اپنا قرآن بغل میں لے کر اس میں کود پڑیں دونوں میں سے جو بچ جائے گا میں اس کا مذہب قبول کر لوں گا۔ چنانچہ پادری آتش نے اس امتحان کو قبول کر لیا لیکن ملا لوگ ڈر گئے اور بادشاہ دونوں پر رحم کر کے اس آزمائش سے باز آیا۔ یہ قصہ جھوٹ ہو یا سچ مگر اس میں شک نہیں کہ جہانگیر کے دربار میں جیسویٹ لوگوں کی

بڑی عزت و حرمت تھی اور اس وجہ سے ان کو دینِ عیسوی کے یہاں پھیل جانے کی قوی امید تھی مگر اس زمانہ کے بعد باستشنا اس ربط وضبط کے جو وار اشکوہ اور فادر بوزی کے باہم تھا اس قسم کی امید کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔

اب چونکہ اس جگہ بغیر قصد کے مشنری لوگوں کا ذکر آ گیا ہے تو میں اجازت چاہتا ہوں کہ ایک بڑے خط کے لکھنے سے پہلے جو آپ کو لکھنے کا ارادہ ہے اس اہم معاملہ میں مقدمہ کے طور پر چند باتیں بیان کروں۔ میری دانست میں ان لوگوں کا مقصد پسندیدہ ہے اور اس کام کے لئے جو یہ ایسے بعید ملک میں آئے ہیں بیشک تعریف کے لائق ہیں خصوصاً کپوشین اور جیسویٹ فرقوں کے لوگ جو اپنے عقائدِ مذہبی کو ہر قسم کے لوگوں پر نہایت غرمت سے ظاہر کرتے ہیں اور بے تمیزی اور تعصب کو دخل نہیں دیتے اور عیسائی مذہب کے ہر ایک شخص سے خواہ وہ کیتھولک فرقہ کا ہو یا یونان یا ارمینیا کے چرچ کا مقلد ہو اور نورین ہو یا جیسکوبٹ محبت اور فیاضی سے پیش آتے ہیں اور پردیسی اور مفلوک الحال عیسائیوں کی جائے پناہ اور باعثِ تسلی ہیں اور اپنے علم و فضل اور قابلِ تقلید نیک اوقاتی سے غیر مذہب کے بے ایمان اور عیاش لوگوں کے لئے شرم کا باعث ہیں مگر بدقسمتی سے بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے نہایت مذموم افعال سے مذہب کو بدنام کرتے ہیں جن کا بجائے مشن کے مقدس کام کے اپنے اپنے کانونٹوں (خانقاہوں) ہی میں بند رہنا خوب ہے کیونکہ ان کا دین ومذہب صرف ایک دکھاوا ہے اور بجائے اس کہ لوگوں کو ان سے ہدایت ہو الٹے ان کی گمراہی کا باعث ہیں۔ لیکن سب ایسے نہیں اور نہ اصل مدعا کے لئے مضر ہیں اور اس کام کے لئے اگر ایسے لوگ تجویز ہوا کریں جو علم و عمل میں ممتاز ہوں تو میں بالکل پسند کرتا ہوں اور میرے نزدیک یہ لوگ نہایت ضروری اور عیسائیوں کے لئے باعثِ فخر ہیں اور عیسائیوں پر واجب ہے کہ تمام عالم میں اپنے دین کی تعلیم و تلقین کے لئے ایسے لوگ بہم پہنچائیں جو اپنے نیک ارادوں اور عمدہ افعال واطوار میں حواریوں کا نمونہ ہوں۔ مگر کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں اس معاملہ کے شوق میں اس قدر محو ہو گیا ہوں کہ میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جس قدر حواریوں کے ایک دفعہ کے وعظ سے ایک اثرِ عظیم مترتب ہوتا تھا اتنا ہی اس زمانہ کے مشنری لوگوں کے وعظ سے بھی ممکن ہے کیونکہ بت پرست اور کافر لوگوں کے ساتھ ملتے جلتے رہنے کے باعث ان کے دلوں کی تاریکی سے مجھے اس قدر واقفیت ہو گئی ہے کہ ہرگز یقین نہیں کہ دو یا تین ہزار آدمی ایک دن میں ایمان لے آئیں۔ خصوصاً مسلمان

بادشاہوں اور ان کی مسلمان رعایا سے تو کسی طرح بھی تبدیل مذہب کی امید نہیں۔ اور چونکہ ممالکِ ایشیا کے وہ سب مقامات میرے دیکھے ہوئے ہیں جہاں مشنری لوگ مقیم ہیں اس لئے میں اپنے تجربہ کی رُو سے کہہ سکتا ہوں کہ ان لوگوں کی خیرات اور تلقین کا اثر مشرکوں ہی پر ہونا ممکن ہے اور یقین نہیں کہ دس برس میں بھی ایک مسلمان عیسائی ہو جائے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان انجیل کو مانتے ہیں اور مسیح علیہ السلام کا ذکر بغیر نہایت ادب و تعظیم کے نہیں کرتے اور بلا لفظ "حضرت" صرف "عیسیٰ" کبھی نہیں کہتے اور ہماری طرح اس کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ معجزانہ طور پر کنواری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے اور یہ کہ وہ "کلمۃ اللہ" اور "روح اللہ" تھے لیکن یہ امید کرنا عبث ہے کہ وہ اپنا وہ دین جس میں پیدا ہوئے ہیں چھوڑ دیں اور اپنے پیغمبر کے برحق نہ ہونے کو مان لیں مگر باوجود ان سب باتوں کے پھر بھی یورپ کے عیسائیوں کو چاہئے کہ مشنری لوگوں کی ہر ایک طرح سے مدد کریں اور ان کی دعا اور ان کی طاقت اور دولت اپنے نجات دہندہ (عیسیٰ علیہ السلام) کے جلال کے بڑھانے میں صرف ہونی چاہئے۔ مگر اس خرچ کا متحمل اہلِ یورپ ہی کو ہونا چاہئے کیونکہ مشنری لوگوں پر اس کا بوجھ ڈالنا مناسب نہیں اور اس بات کی نہایت احتیاط رہنی چاہئے کہ یہ لوگ احتیاج کی وجہ سے کسی ذلیل اور حقیر کام کے کر بیٹھنے پر مجبور نہ ہوں اور صرف ان کی فارغ البالی ہی مطلوب نہیں بلکہ وہ ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو مستعد اور ہوشیار اور نیک کردار اور ہمیشہ اثباتِ حق کے لئے ساعی اور نیکی کرنے کے موقعوں کی متلاشی اور جہاں کہیں موقع پائے اپنے خدا کے باغ (دنیا) میں کمال مستعدی اور شوق سے محنت کرنے کی خواہش مند ہو۔ اور اگرچہ یہ کام ہر ایک عیسائی ملک پر واجب ہے مگر کسی طرح کی لغو اور بے بنیاد باتوں پر یقین کر کے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ تبدیل مذہب کا معاملہ ایک آسان کام ہے۔ مشنری لوگوں کو اپنے کام کی ترقی کے لئے ایک اور پر افسوس سدِ راہ سے مقابلہ کی ضرورت ہے اور وہ خود عیسائیوں کا وہ خلافِ ادب طریقہ ہے جو باوجود اس اعتقاد رکھنے کے کہ خدا تعالیٰ ہماری قربان گاہ پر بطورِ خاص موجود ہے اپنے گرجاؤں میں برتتے ہیں، بخلاف مسلمانوں کے جو نماز کے وقت مسجدوں میں باہم گفتگو کرنا تو کیسا سر تک نہیں ہلاتے اور خدا کا خوف اور ادب ان کے دل پر چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ڈچ لوگوں کی تجارت کا ذِکر

آگرہ میں ڈچ لوگوں کی جو کے غلہ کی ایک تجارتی کوٹھی بھی ہے جس میں ان کے

چار یا پانچ آدمی رہتے ہیں۔ یہ پہلے بانات اور چھوٹے بڑے آئینوں اور سادہ اور سنہری اور روپہلی لیس اور آہنی چیزوں اور نیل کی تجارت کرتے تھے جو آگرہ کے قرب وجوار میں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ خصوصاً بیانہ میں جو آگرہ سے دو منزل ہے اور جہاں ان کی ایک اور کوٹھی ہے اور سال بھر میں ایک دفعہ وہاں جایا کرتے ہیں اور اب نہ صرف جلالپور بلکہ لکھنؤ سے بھی جو آگرہ سے سات یا آٹھ منزل ہے اور وہاں بھی ان کی ایک کوٹھی ہے اور سب موسموں میں ان کے گماشتے وہاں جاتے ہیں بہت سا کپڑا خریدتے رہتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اب زمانہ سابق کا سا فائدہ نہیں رہتا اور غالباً اس کے دو سبب ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے مقابلہ میں ارمنی لوگوں کی تجارت بہت بڑھ گئی ہے، دوسرا یہ کہ آگرہ سورت سے (جو ان کی اصل قیام گاہ ہے) بہت دور ہے۔ اس کے علاوہ ان کے کاروانوں کو جو خراب راہ اور پہاڑوں سے بچنے کے لئے جو راستہ میں پڑتے ہیں گوالیار اور برہانپور کی سیدھی سڑک چھوڑ کر احمد آباد کے راستہ مختلف راجاؤں کی عملداریوں میں سے ہو کر آتے ہیں، اکثر اوقات حادثوں کا سامنا ہوتا ہے۔ لیکن باوجود ان دقتوں کے میری دانست میں انگریزوں کی طرح آگرہ سے یہ اپنی کوٹھی کبھی نہیں اٹھائیں گے کیونکہ ان کو اب بھی گرم مصالحوں کی قسم کی جنسوں میں بہت منفعت رہتی ہے اور ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ ان کے اعتباری آدمی دربارِ شاہی کے قرب میں رہتے ہیں اور اگر بنگالہ' پٹنہ' سورت یا احمد آباد میں جہاں ان کی کوٹھیاں ہیں صوبہ دار یا کوئی اور عہدہ دار کسی طرح کا ظلم یا ناانصافی ان کے ساتھ کرتا ہے تو فوراً اس کی شکایت دربار میں کرسکتے ہیں۔

مقبرہ معروف تاج گنج کا ذِکر

اب میں اپنے اس خط کو دو عجیب و غریب مقبروں کے ذِکر پر جن کی وجہ سے آگرہ کو دہلی پر فوقیت حاصل ہے، ختم کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک مقبرہ تو اکبر کا ہے جس کو اس کے بیٹے جہانگیر نے تعمیر کرایا تھا اور دوسرا شاہ جہاں کی بیگم "تاج محل" کا جو حسن و جمال میں لاثانی تھی اور بادشاہ اس پر ایسا فریفتہ تھا کہ کبھی اس کو اپنے سے جدا نہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی وفات کے وقت شدتِ غم سے قریب تھا کہ اس کے ساتھ خود بھی چل بسے۔ میں اکبر کے مقبرہ کا زیادہ ذِکر کرنا نہیں چاہتا کیونکہ اس میں جو خوبیاں ہیں وہ تاج

محل کے مقبرہ میں جس کا میں ابھی ذِکر کرنے والا ہوں کامل طور پر موجود ہیں۔ آگرہ سے نکل کر مشرق کی طرف آپ اگر جائیں تو ایک لمبا چوڑا راستہ دیکھیں گے جس پر فرش لگا ہوا ہے اور تھوڑا تھوڑا بلند ہوتا گیا ہے، جس کے ایک طرف تو ایک چوکور باغ کے ایک ضلع کی جو وسعت میں ہمارے پیلس رائل سے بہت زیادہ ہے ایک لمبی اور اونچی دیوار ہے اور دوسری جانب نو تعمیر مکانات کی ایک قطار بنتی چلی گئی ہے جو ان محراب دار برآمدوں سے مشابہ ہیں جو دہلی کے بڑے بازاروں کی دکانوں کے آگے بنے ہوئے ہیں اور جن کا میں پہلے ذِکر کر چکا ہوں اور جب آپ اس دیوار کے نصف میں پہنچیں گے تو دائیں کو یعنی ان مکانات کی جانب آپ کو ایک بڑا دروازہ ملے گا جو اچھا خاصہ بنا ہوا ہے اور جو ایک کاروان سرا کا دروازہ ہے اور اس کے مقابل یعنی دیوار کی طرف باغ کے دروازہ کی مربع اور وسیع عمارت ہے جس میں سے ہو کر باغ میں جاتے ہیں اور جس کے دونوں طرف پتھر کے دو بڑے حوض بنے ہوئے ہیں۔ یہ مستطیل شکل کی عمارت ہے اور ایک ایسے پتھر سے بنی ہوئی ہے جو سرخ سنگِ مر مر (۲۰۴) کے مشابہ ہے لیکن ویسا سخت نہیں ہے۔ اس عمارت کا پیش سینٹ لوئیس کی عمارت کے پیش کی بہ نسبت جو سینٹ اینٹونی کے کوچہ میں ہے۔ میری دانست میں زیادہ لمبا اور اپنی وضع میں زیادہ عالیشان ہے مگر بلندی میں اسی قدر ہے۔ اس کے ستون اور مرغول اور کارنسیں اگرچہ فی الواقع ان اوضاعِ خمسہ عمارت کے مطابق نہیں ہیں جو ہمارے فرانس کی عمارتوں میں احتیاط کے ساتھ ملحوظ رکھی جاتی ہیں کیونکہ یہ عمارت ایک خاص اور نرالی ہی وضع کی ہے لیکن تاہم دلچسپی سے خالی نہیں اور میری رائے میں یہ بالضرور اس قابل ہے کہ ہماری فن عمارت کی کتابوں میں جگہ پائے۔ اگرچہ قریباً یہ تمام عمارت صدہا قسم کے مختلف الوضع دالانوں اور محرابوں اور غلام گردشوں پر مشتمل ہے جو نیچے اوپر بنی ہوئی ہیں مگر باوجود اس کے بہت عظیم الشان ہے اور اس کا نقشہ اور تعمیر دونوں بہت دلچسپ ہیں اور کوئی جگہ اس میں ایسی نہیں جو بدنما ہو بلکہ ہر ایک مقام نہایت خوشنما اور ایسا ہے کہ آنکھیں دیکھنے سے سیر نہیں ہوتیں۔ چنانچہ سب سے اخیر دفعہ جو میں نے اس کو جا کر دیکھا تو میرے ساتھ ایک فرانسیسی سوداگر بھی تھا اور میری طرح اس کی بھی یہی رائے تھی کہ یہ ایک ایسی عمارت ہے کہ جس کی کامل طور پر تعریف نہیں ہو سکتی مگر میں کچھ نہ بولا کیونکہ مجھے خوف تھا کہ شاید ہندوستان میں مدت سے رہنے کے سبب میرا مذاق بگڑ گیا ہو لیکن میرا رفیق جو تازہ وارد تھا جب اس نے یہ کہا کہ تمام یورپ میں ایسا حیرت افزا اور عظیم و شان کا مکان میں نے کوئی

نہیں دیکھا تو میری نہایت تسلی ہوئی۔

دروازہ کی عمارت میں اگر آپ داخل ہوں تو اپنے کو ایک بہت اونچے گنبد کے نیچے پائیں گے جس کے سب طرف غلام گردش اور نیچے دونوں جانب دو دالان ہیں جو آٹھ یا دس فرانسیسی فٹ اونچے ہیں اور جیسی محراب میں سے آپ داخل ہوں گے ویسی ہی دوسری جانب پائیں گے جس میں سے گزر کر ایک ایسی روش پر پہنچتے ہیں جو آخر تک تمام باغ کو برابر دو حصوں میں تقسیم کرتی چلی گئی ہے۔ یہ روش جو آٹھ فرانسیسی فٹ کے قریب اونچی ہے اس قدر چکلی ہے کہ چھ گاڑیاں برابر برابر چل سکتی ہیں اور سرے سے لے کر اخیر تک بڑی بڑی چوکور سخت پتھر کی سلوں کا فرش لگا ہوا ہے اور بیچوں بیچ نہر بنی ہوئی ہے جس کی رُوکار کے پتھر تمام گھڑے ہوئے اور زیبائش کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر فوارے لگے ہوئے ہیں اور کوئی بیس یا پچیس قدم چل کر اور پشت کی طرف منہ پھرا کر اس پر سے دروازہ کی عمارت کو دیکھنا خالی از کیفیت نہیں۔ کیونکہ دروازہ کی عمارت کی یہ طرف بھی اگرچہ باہر کی جانب کی سی نہیں لیکن نہایت ہی بلند اور اسی وضع کی ہے۔ دروازہ کی عمارت کے دونوں جانب باغ کی دیوار کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی کرسی دے کر لمبی اور چوڑی غلام گردشیں بنتی چلی گئی ہیں جن کے محرابی دروازے چھوٹے چھوٹے ستونوں پر قائم ہیں اور برسات کے موسم میں غریب اور مساکین خیرات کے لینے کو جو ہمیشہ کے لئے شاہ جہاں کی مقرر کی ہوئی ہے ہفتہ میں تین بار ان میں آکر جمع ہوتے ہیں۔ اب آپ پھر اسی بڑی روش پر آئیں یہاں سے آپ کو ٹھیک سامنے وہ بڑا گنبد نظر آئے گا جس میں بیگم کی قبر ہے اور جس کے دائیں بائیں چبوترے سے ذرا نیچے باغ کی روشیں درختوں سے ڈھکی ہوئی اور چمن پھولوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس گنبد کے دونوں جانب سنگِ سرخ سے ویسی ہی دو بڑی عمارتیں بنی ہوئی ہیں جیسی دروازہ کی عمارت ہے اور یہ دونوں پشت کی طرف باغ کی دیوار سے ملی ہوئی ہیں اور ان میں جانے کے لئے تین تین محراب دار دروازے ہیں۔ ان کے بعض حصے بالاخانوں کی طرح ایک دوسرے پر واقع ہیں جن میں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ گویا بڑی بڑی اونچی غلام گردشیں ہیں۔ ان عمارتوں کے اندر کے فرش اور چھت اور دیواروں میں آرائشی کام بنے ہوئے ہیں اور چونکہ وہ قریباً ویسے ہی ہیں جیسے کہ خود مقبرہ کے اندر کے زیبائشی کام ہیں اس لئے میں ان کا بیان کرنا غیر ضروری جانتا ہوں اس بڑی روش اور روضہ کے مابین ایک اچھا وسیع صحن ہے جس کو میں تشبیہاً "واٹر پارٹیر" (۳۰۵) کہتا ہوں کیونکہ پتھر جو اس کے

فرش میں لگے ہوئے ہیں وہ تراش کر اور طرح طرح کی شکلوں کے بنا کر اس طرح سے اگائے گئے ہیں گویا اپنی سے بھری ہوئی کیاریوں کے گرد "باکس" لگا ہوا ہے۔ یہ عمارت سفید سنگِ مرمر کا ایک بڑا گنبد ہے اور قریباً اسی قدر اونچا ہے جس قدر کہ والدی گریس (۳۰۶) ہے اور اس کے گرداگرد سنگِ مرمر کی چھوٹی چھوٹی بُرجیاں ہیں جو علی الترتیب نیچے اور اوپر بنتی چلی گئی ہیں۔ یہ کل عمارت چار بڑی محرابوں پر قائم ہے جن میں سے تین بالکل کھلی ہیں اور چوتھی ایک مکان کی دیوار سے جس میں ایک غلام گردش بنی ہوئی ہے، بند کر دی گئی ہے جس میں کئی "ملا" تاج محل کو ثواب پہنچانے کی خاطر ظاہر اولی ارادت کے ساتھ بیٹھے ہوئے قرآن پڑھا کرتے ہیں جو اسی غرض سے یہاں مقرر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک محراب اس طرح پر سجائی گئی ہے کہ سفید سنگِ مرمر میں سیاہ سنگِ مرمر (سنگِ موسیٰ) کے بڑے بڑے عربی حروف بنا کر جمائے ہوئے ہیں جو نہایت خوشنما ہیں اور گنبد کا کانسہ اور اوپر سے نیچے تک تمام دیواروں کی رُوکار سنگِ مرمر کی ہے اور کوئی جگہ ایسی نہیں جو صنعت اور ہنر مندی سے خالی اور ایک خاص اور ذاتی حسن نہ رکھتی ہو اور مقبرہ کی تمام دیوار کی رُوکار میں جو سنگِ مرمر کی ہے زبرجد اور یشب اور عقیق اور اَور قسم کے بیش قیمت اور کمیاب پتھروں اور اس قسم کے پتھروں سے جیسے کہ فلورنس میں گرانڈ ڈیوک کے گرجا میں بے شمار وضع کی اور نہایت خوبصورت اور پُر نزاکت پچی کاری جس سے بڑھ کر انسان کے ذہن میں نہیں آسکتی، کی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ فرش میں بھی جو سنگِ مرمر اور سنگِ موسیٰ کی چوکور سلوں کا ہے یہ پتھر جڑے ہوئے ہیں اور گنبد کے اندر ایک چھوٹا سا حجرہ ہے جس میں تاج محل کی قبر ہے جو سال بھر میں صرف ایک بار بڑے تکلفات سے کھولا جاتا ہے اور چونکہ اس کے تقدس کی وجہ سے کوئی عیسائی شخص اندر جانے نہیں پاتا اس لئے میں بھی دیکھ نہیں سکا۔ لیکن سنا ہے کہ اس کی زیب وزینت اور آرائش و پیرائش بہت ہی اعلیٰ قسم کی ہے۔ اب آپ سے صرف اس چبوترہ کا ذکر کرنا باقی ہے جو گنبد سے لے کر باغ کی حد تک بنا ہوا ہے جو کوئی پچیس قدم چوڑا اور اس سے کسی قدر زیادہ اونچا ہے۔ اس چبوترہ پر سے دریائے جمنا نیچے بہتا ہوا اور بے شمار سرسبز باغ جو دور تک لگتے چلے گئے ہیں اور شہر آگرہ کا ایک حصہ اور قلعہ اور امرا کے خوبصورت مکانات جو دوسرے کنارہ پر بنے ہوئے ہیں تمام نظر آتے ہیں اور جبکہ یہ چبوترہ اس باغ کا ایک ضلع ہے تو اس کا تصفیہ میں آپ ہی پر چھوڑتا ہوں کہ میں جو یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ مقبرہ ایک حیرت افزا عمارت ہے، کیا یہ سچ نہیں ہے؟ یہ ممکن ہے کہ میری طبیعت نے

ہندوستانی مذاق پیدا کر لیا ہو لیکن مین یہ یقینی طور پر کہتا ہوں کہ یہ مکان اہرام مصر کی بہ نسبت جو اَن گھڑ پتھروں کے ڈھیر ہیں اور مکرر دیکھنے پر بھی مجھے کچھ پسند نہیں آئے اور جو باہر کی طرف سے بجز اس کے کہ زینہ کی طرح نیچے اوپر رکھ کر پتھروں کا ڈھیر لگا دیا ہے کچھ نہیں ہیں اور جن کے اندر بھی کوئی ایسی بات نہیں جس سے انسان کی کچھ ہنر مندی اور ایجاد ثابت ہو دنیا کے عجائبات میں شمار کیے جانے کا زیادہ تر مستحق ہے۔(۳۰۷)

حاشیہ جات

(۱) اس شہر کو ۳۵۸ ہجری مطابق ۹۶۹ء میں المعز الدین اللہ خلیفہ فاطمی مغربی کے سپہ سالار جوھر نے (جن کی سلطنت پہلے پہل افریقہ کے شہر قیروان میں قائم ہوئی تھی اور جو اپنے خاندان میں تیسرا خلیفہ تھا) آباد کیا تھا اور مصر کو قہر و غلبہ سے فتح کرنے کی وجہ سے قاہرہ نام رکھا تھا۔ (س م ح)

(۲) اصل کتاب میں بے آف دی ریڈ سی Bay of Redsea ہے۔ (س م ح)

(۳) جیسویٹ کے معنی ہیں منسوب بہ جی زس یا جی سس جو یورپی زبانوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام ہے۔ یہ ایک شاخ فرقہ رومن کیتھلک کی ہے جس کو ۱۵۳۴ء میں ہسپانیہ کے رہنے والے اگناتیوس لائلا نامی ایک مشہور شخص نے جو ۱۴۹۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۶۶ء میں مرا تھا قائم کیا تھا۔ (س م ح)

(۴) گوا ہندوستان کے ساحل مالابار پر بمبئی سے جنوب کے رُخ تقریباً دو سو میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے (س م ح)

(۵) یعنی شہاب الدین محمد شاہ جہاں صاحبقران ثانی کا باپ نور الدین محمد جہانگیر اس کا جلال الدین محمد اکبر اس کا نصیر الدین محمد ہمایوں اس کا ظہیر الدین محمد بابر اس کا عمر شیخ میرزا اس کا سلطان ابو سعید میرزا اس کا سلطان محمد میرزا اس کا جلال الدین میران شاہ میرزا اس کا امیر تیمور گورگان صاحبقران اوّل جو تیمور اور تمر اور تمر لنگ مشہور ہے۔ اور جس کی وجہ کتاب عجائب المقدور فی احوال التیمور میں جو اس کی ایک سخت ہجو آمیز تاریخ ہے یہ لکھی ہے کہ ابتدائے حال میں کسی شخص کی بکری کی چوری کرتے ہوئے اس کے تیر کے زخم سے اس کی ایک ٹانگ لنگڑی ہو گئی تھی اور چونکہ اس نے ترکوں کے اکثر خاندانوں میں اپنی شادیاں کرلی تھیں اس لئے اس کے ہم قوم اس کو گورگان کہنے لگ گئے تھے جو ترکی میں داماد کو کہتے ہیں

اور تمر کے معنی ہیں لوہا اور صاحبقراں کہلانے کی یہ وجہ تھی کہ اس کے بادشاہ ہو جانے کے بعد خوشامدیوں نے اس کا زائچہ طالع بنا کر اس میں یہ لکھ دیا تھا کہ زہرہ و مشتری جو نجومیوں کے عقیدہ میں دو بڑے سعد ستارے ہیں قران کی حالت میں طالع میں پڑے ہیں۔ (س م ح)

(۶) کتاب ظفر نامہ میں تیمور کی ایک نہایت خوشامد آمیز تاریخ ہے۔ اس کے عروج کا حال یوں لکھا ہے کہ ۷۳۲ھ میں یسور اغلن کا بیٹا قران سلطان جو چغتائی خاں کی اولاد سے تھا ترکستان اور ماوراء النہر میں ایک ایسا جابر اور خونریز بادشاہ تھا کہ سردار لوگ دربار میں جاتے ہوئے کنبہ والوں کو وصیتیں کر کے رخصت ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ آخر کار امیر قزغن نے جو اس کے سرداروں میں ایک نہایت قابل اور دانا شخص تھا تنگ آکر الوس یعنی قبیلہ چغتائی کے امیروں وغیرہ سے اتفاق کر کے بغاوت کی اور ۷۴۷ھ ہجری میں فتح یاب ہو کر اسے مار ڈالا۔ مگر سلطنت کی یہ صورت رہی کہ اگرچہ حقیقتاً حکومت امیر قزغن اور اس کی اولاد کے قبضہ میں تھی لیکن تاہم بادشاہی خاندان میں سے برائے نام کسی کو خان یعنی بادشاہ بنائے رکھتے تھے۔ مگر جب قزغن کے بیٹے عبداللہ نے اپنے ایک صرف نام کے بادشاہ کو بے گناہ قتل کر ڈالا اور اسی علت میں خود بھی تباہ و برباد ہوا تو ملک میں کچھ عرصہ طوائف الملوکی کی صورت رہی۔ مگر امیر قزغن کا پوتا امیر حسین جو امیر مسلا کا بیٹا تھا پھر ایک ذی اقتدار فرمانروا ہو گیا۔ اور اپنے دار الحکومت شہر بلخ کے پاس ایک پرانے قلعہ کو جو قلعہ ہندواں کے نام سے مشہور تھا از سر نو تعمیر کر کے اس میں رہنا شروع کیا۔ اور چونکہ اس کی بہن کی شادی تیمور سے ہوئی تھی ابتدائے حال میں اس کا اور تیمور کا نہایت اتحاد تھا مگر رشک و حسد کے باعث آخر کار عداوت ہو گئی۔ اور چونکہ امیر حسین کی بہن بھی مر چکی تھی تیمور نے اپنی جائے قیام کش معروف بہ شہر سبز سے جو سمرقند کے قریب ہے قلعہ ہندواں پر فوج کشی کی اور امیر حسین ۷۷۱ھ ہجری میں گرفتار ہو کر مع اپنے دو بیٹوں کے قتل ہوا۔ اور باقی دو بیٹے ہندوستان کو بھاگ آئے اور تیمور نے اس کی زوجہ سرائی ملک خانم دختر قران سلطان اور تین اور بیگموں کو غالباً ذی وقعت قبائل ترک کی بیٹیاں سمجھ کر مصلحتاً گھر میں ڈال لیا اور اس کی بڑی بیگم کو مع اس کی بیٹیوں اور بیگموں کے اپنے بڑے بڑے سرداروں میں تقسیم کر دیا اور قلعہ ہندواں اور اس کے محلات وغیرہ جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیئے اور اس طرح پر امیر حسین کا نام و نشان مٹا کر خود بادشاہ بن گیا اور آخر کار ایک ایسا شخص ہو گیا کہ آج تک اس کا نام عموماً مشہور ہے۔ فقط

معلوم ہوتا ہے کہ برنیئر نے اپنی تحریر میں غالباً اسی سرائے ملک خانم زوجہ سابق امیر حسین کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیونکہ اس کو کتاب حبیب السیر میں خان زادہ یعنی شہزادی اور دختر قران سلطان لکھا ہے ورنہ تیمور کے اٹھارہ بیویوں اور بائیس حرموں کی تفصیل میں جو بہت سے ترک اور مغل سرداروں کی بیٹیاں تھیں خانزادہ کا لفظ اور کسی کی نسبت نہیں لکھا۔ مگر برنیئر کی تحریر سے جو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ تیمور کی اس بیگم کا باپ تمام تاتاریوں کا بادشاہ تھا جن کو مغل کہتے تھے اس وقت کی تاریخوں سے غلط معلوم ہوتا ہے کیوں کہ جس زمانہ میں بلخ اور بخارا وغیرہ میں قران سلطان خاں فرماں روا تھا اسی زمانہ میں تغلق تیمور خاں ترکوں اور مغلوں کی قوم جتہ میں علیحدہ بادشاہی کر رہا تھا۔ اور ایران میں سلطان ابو سعید بہادر خاں جو مغلوں کے ابو الآبا چنگیز خاں کی اولاد سے تھا بہت بڑا بادشاہ تھا اور یہ اشارہ بھی غلط پایا جاتا ہے کہ تیمور لنگ اس مذکورہ بالا رشتہ کے سبب سے مغلوں کی قوم میں داخل ہو گیا تھا کیونکہ وہ الوس چغتائی کی شاخ برلاس سے تھا جو اپنے تئیں سلسلہ نسب میں مغلوں سے علیحدہ نہیں سمجھتے۔ (س م ح)

(۷) اصل انگریزی میں لفظ براؤن ہے یعنی بھورا۔ (س م ح)

(۸) شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے عہد کی فارسی کتابوں میں دانشمند خان کا نام ان صاحب کمال لوگوں کی فہرست میں لکھا ہوا ہے جو اس وقت اس سلطنت میں علم و فضل کے لئے مشہور تھے۔ یہ ایرانی عالم شہر یزد کا رہنے والا تھا اور کمال علمی کے باعث ملا شفیعائی یزدی کے نام سے مشہور تھا اور ہندوستان میں تجارت کی تقریب سے آیا تھا۔ لکھا ہے کہ جب یہ اپنے وطن کو واپس جانے لگا تو شاہ جہاں نے اس کے علم و فضل کا چرچا سن کر از راہ قدردانی بندر سورت سے واپس بلا کر امرائے دربار میں داخل کر لیا اور تا عہد سلطنت اورنگ زیب بہت معزز و مکرم رہا اور ۱۰۸۰ ہجری میں مر گیا۔ یہ شخص فلسفہ، ہیئت اور ہندسہ میں بہ تخصیص مشہور تھا اور ایسا عالم تھا کہ نعمت خان عالی سا شخص اس کا شاگرد تھا۔ (س م ح)

(۹) عہد شاہ جہاں کے مؤرخوں نے اس کا نام جہاں آرا بیگم بتایا ہے اور لکھا ہے کہ بیگم صاحب لقب تھا۔ (س م ح)

(۱۰) یہ نام نہ تھا بلکہ خطاب تھا جس کو مصنف نے عوام کے محاورہ کے موافق ممتاز محل کی جگہ تاج محل لکھ دیا ہے اور نام حمیدہ بانو بیگم تھا۔ (س م ح)

(۱۱) مصر کے مخروطی نما چوپہل مینار اہرام کہلاتے ہیں۔ ان پر جو کتبے ہیں وہ ایسے

حروف میں ہیں جن کو اس زمانہ میں ہر شخص نہیں پڑھ سکتا اور مصر کے قدیمی باشندے ان کو اپنی مقدس چیزوں میں استعمال کرتے ہیں یا اسرار الٰہی سمجھ کر چھپاتے تھے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ اہلِ عرب ان میناروں کو بلحاظ ان کے نہایت دیرینہ سال اور پرانا ہونے کے اہرام کہتے ہیں جو ہرم سے مشتق ہے اور جس کے معنی بڑھاپے کے ہیں مگر محیط المحیط میں (جو لغت عربی کی ایک نو تالیف مستند کتاب ہے) لکھا ہے کہ اہرام ہرم کی جمع ہے جو اصطلاح اہل مساحت و ہندسہ میں کسی ایسی مخروطی شکل کی عمارت کو کہتے ہیں جس کا قاعدہ مربع یا مثلث یا کثیر الاضلاع ہو۔ ان میں سے تین مینار بہت مشہور ہیں جن میں ایک چھوٹا اور دو بڑے ہیں۔ دونوں بڑے مینار جن کو عرب بہ صیغہ تثنیہ "الہرمان" کہتے ہیں چی آپس اور کیفرینس کے نام پر مشہور ہیں۔ اور چی آپس والا مینار تو ایسا عمدہ ہے کہ دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ یہ عمارت ایک چوکھونٹے چبوترے پر بنی ہوئی ہے۔ جس کا ہر ایک ضلع سات سو تریسٹھ فٹ لمبا اور چار فٹ آٹھ انچ اونچا ہے اور اس کے اوپر کچھ گھٹا کر ایک اور چبوترہ ہے۔ اور اسی طرح دو سو تین چبوترے اوپر تلے بنے ہوئے ہیں۔ یہ مینار ساڑھے سولہ بیگھہ زمین میں ہے اور اس کی بلندی چار سو چھپن فٹ اور چوٹی دس گز مربع کا چبوترہ ہے۔ مشہور یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس جو سنہ عیسوی سے چار سو برس پیشتر مصر کی سیر کو آیا تھا لکھتا ہے کہ یہ مینار چی آپس بادشاہ کے عہد میں بیس برس کے عرصہ میں تیار ہوا تھا اور اس پر ایک لاکھ آدمی کی مدد ہمیشہ لگی رہتی تھی اور اس پر مصری حروف میں لکھا ہوا ہے کہ کاریگروں کی صرف لہسن پیاز کی چٹنی میں اڑھائی لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ اصل میں یہ مینار مصری بادشاہوں کے مقبرے ہیں جن میں ان کی لاشیں اب تک پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ خلیفہ مامون عباسی جب ۸۲۰ء عیسوی میں مصر میں آیا تو اس کو چی آپس والے مینار کے اندر کی عمارت کے دیکھنے کا بڑا شوق ہوا اور اس نے فولادی ٹانکیاں بنوا کر پتھر کو کھدوایا اور ایک راہ پائی اور جب اس میں گئے تو ایک چوکھونٹی باؤلی ملی جس کے چاروں طرف کی دیواروں میں کمروں کے دروازے تھے اور ایک کمرہ میں بہت سی لاشیں کتاں میں خوشبوؤں سے لپٹی ہوئی جسے مومیا کہتے ہیں رکھی ہوئی تھیں۔ پھر اور ایک کمرہ میں اس کے اوپر پتھر کے صندوق میں آدمی کی ایک مورت ملی جس کے سینہ پر جواہر سے جڑا ہوا سونے کا سینہ بند رکھا تھا اور سونے کے پترے پر ایسے حروف کندہ تھے جن کو کوئی نہ پڑھ سکا۔ بعض محققوں نے اس بڑے مینار کی پیمائش کے وقت یہ بھی دریافت کیا ہے کہ اس مینار کے چاروں پہل بنانے

والوں نے دنیا کی چاروں سمتوں کے ٹھیک مقابل بنائے ہیں جس سے وہاں کا نصف النہار نہایت صحیح طور پر معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا مینار جو کیفرینس والا کہلاتا ہے اس کے نیچے کے چبوترے کا ہر ایک ضلع چھ سو چوراسی فٹ لمبا اور بلندی چوٹی تک چار سو چھبیس فٹ ہے۔ اس مینار پر چڑھ کر دیکھنے سے دکھن کی طرف دریائے نیل اور اُتر کی جانب پہاڑ اور ریگستان اور پچھم کے رخ لیفوں کا جنگل اور پورب کی سمت مقام جبزہ اور فسطاط کے برج اور شہر قاہرہ کا مینار اور سلطان صلاح الدین کا قلعہ، سب عجیب لطف سے دکھائی دیتے ہیں۔ پرانے زمانے کے مؤرخوں نے اوّل الذکر مینار کے بانی کے نام اپنے اپنے لہجہ کے موافق مختلف لکھے ہیں جن میں سے ایک نام یہاں لکھ دیا گیا ہے اور یہ بادشاہ دو ہزار تین سو باون برس قبل مسیح علیہ السلام کے تھا۔ اور نہایت ہی خونریزی اور سفاکی کے ساتھ پچاس برس تک حکمران رہا تھا اور اسی طرح دوسرے مینار کے بانی کے نام بھی کئی طور پر لکھے ہیں اور اس کو بعض مؤرخوں نے پہلے مینار کے بانی کا بیٹا اور بعض نے بھائی اور جانشین بتایا ہے اور یہ بھی ویسا ہی ظالم اور خوں ریز تھا اور چھپن برس تک بادشاہ رہا تھا۔ فقط۔ ماخوذ از ترجمہ تاریخ اقوامِ قدیم، مصنفہ ڈاکٹر رالن مطبوعہ سائنٹیفک سوسائٹی علیگڑھ و انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا وغیرہ۔ (س م ح)

(۱۲) اس کا نام مہر النسا بیگم تھا اور نور محل اور نور جہاں خطاب تھے۔

(۱۳) عالمگیر نامہ میں جس کے مسودے بادشاہ کے ملاحظہ کے بعد صاف ہوتے تھے اور جس میں مؤرخوں کے شیوہ کے برخلاف عالمگیر کے مخالفوں کا ذکر جابجا نہایت ہی سخت کلامی کے ساتھ کیا گیا ہے، دارا شکوہ کے مذہب کی نسبت جس طرح پر لکھا ہے اس کے بہت سے ناملائم اور مکرر الفاظ کو چھوڑ کر اس جگہ نقل کیا جاتا ہے: ”قولہ: واز شنایع اطوار آں بہ گشتہ روزگار (یعنی دارا شکوہ) کہ عنقریب بہ وبال آں گرفتار آید و باعث التہاب نوایر قہر و انتقام ایں خدیو اسلام (یعنی اورنگ زیب) بیشتر ہماں شد ایں بود کہ در اواخر حال از برگشتہ بختی باظہار مراتب اباحت و الحاد کہ در طبعِ اُو مرکوز بود و آں را تصوف نام مے نہاد اکتفا نہ نمودہ بدیں ہندواں مائل شدہ بود۔ ہموارہ با برہمناں و جوگیاں و سناسیاں صحبت می داشت۔ و آں گروہ را مُرشدانِ کامل و عارفانِ حق واصل می دانست و کتابِ آنہا را کہ بہ بید موسوم است کتابِ آسمانی می دانست و مصحفِ قدیم می خواند و از کمال اعتقادے کہ بہ بید میداشت برہمناں و سناسیاں را از اطراف و اکناف بہ سعی ہائے بلیغ و رعایت ہائے عظیم جمع آوردہ در صدد ترجمہ آں شد و ہموارہ اوقاتش مصروف ایں شغلِ ناصواب و تفکر و تدبّر در مضامینِ

آن کتاب مے شد و بجائے اسمائے حسنائے الٰہی اسمے ہندوی کہ ہنود آن را پرھو مے نامند واسم اعظم مے دانند بخطِ ہندوی بر نگینہ ہائے جواہرے کہ مے پوشید منقش کردہ بآن تبرک مے جست و چوں معتقدش آن بود کہ تکلیف عبادات ناقصاں راست وعارف کامل را عبادات درکار نیست و کریمہ واعبد ربك حتیٰ یاتیك الیقین را مشربِ ملاحدہ فراگرفتہ دلیل این معنی مے ساخت و بنا بریں عقیدۂ فاسدہ نماز و روزہ دسائر تکالیف شرعیہ را خیرباد گفتہ بود و ایں خدیو دیں پرور پاک اعتقاد را ہمیشہ حمایت دینِ مبین نصب العین ضمیر منیراست از استماع ایں عقاید ردیہ واطوارِ باطلہ ازاں بے سعادت عرقِ حمیت دیں بحرکت مے آمد۔ (س م ح)

(۱۴) مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور والیٔ جودھ پور مراد ہے جس کو شاہ جہاں کے عہد میں بادشاہ کے ننہال میں ہونے کی وجہ سے بڑا اقتدار اور خطاب مہاراجگی حاصل ہو گیا تھا۔ ہمارے اس زمانہ میں بھی یہ ریاست اسی خاندان میں قائم ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح مصنف کے زمانہ میں اس ریاست کے فرماں روا کا نام جسونت سنگھ تھا، مترجم کے زمانہ کے فرماں روا کا نام بھی جسونت سنگھ ہی ہے۔ اس ریاست کی خالص آمدنی سوائے جاگیروں اور معافیات کے بموجب کتاب تاریخ جلسہ قیصری واقع دہلی مصنفہ ٹالبائے دھیلر صاحب اب پچیس لاکھ روپیہ اور رقبہ پینتیس ہزار چھ سو ستر میل مربع اور آبادی بیس لاکھ آدمی کی ہے۔ (س م ح)

(۱۵) یہ شہر باوجود تلاش دستیاب نہیں ہو سکا۔ (س م ح)

(۱۶) مصنف کی یہ معلومات جو اکثر غلط ہیں بعینہٖ ترجمہ کی گئی ہیں۔ ترکانِ روم کو عثمان لو یا عثمان لی صرف اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس سلطنت کا فرماں رواخاندان سلطان عثمان خاں کی اولاد سے ہے جو دراصل ایک ملازم سلطان علاء الدین سلجوقی کا تھا اور اپنی لیاقت کی وجہ سے اوّل سپہ سالاری اور پھر اس بادشاہ کی دامادی کے درجہ تک پہنچا اور آخر کار بہ سبب اس کے بے اولاد جانے کے ۱۲۹۹ء مطابق ۶۹۹ ہجری میں رضامندیٔ عام سے اس کا جانشین ہوا تھا۔ کتاب سنینِ اسلام میں لکھا ہے کہ یہ بادشاہ ایسا کریم اور سپاہ پرور تھا کہ ایک حبہ اپنے پاس نہ رکھتا تھا اور جو اس کو ملتا تھا سپاہ پر خرچ کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے مرنے کے بعد سوائے ایک خفتان اور کمر بند اور تلوار کے کوئی شے جواہرات، سونا، چاندی وغیرہ کی قسم سے اس کے پاس بر آمد نہ ہوئے اور انہتر برس کی عمر میں سنہ ۱۳۲۷ء

مطابق ۷۲۷ ہجری میں مرا تھا۔ (س م ح)

(۱۷) اورنگ زیب نے اپنی اور اپنے بھائیوں کی خصلت کی نسبت جو کچھ خود لکھا ہے مناسبتِ مقام کی وجہ سے بطورِ خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سلطان محمد معظم کو جو محمد سلطان کی وفات کے بعد اورنگ زیب کے بیٹوں میں سب سے بڑا وہی تھا لکھتا ہے "مہیں پور خلافت باوجود سلامت نفس فتح اللہ خاں را چرا ناخوش کردید ما در ایامِ شہزادگی با امرا ہمچو سلوک می کردیم کہ ہمہ راضی بودند در حضور و غیبت خوشدلی تعریف و توصیف می کردند بل باوصفِ اقتدار برادرِ نا مہربان (یعنی دارا شکوہ) بعضے ہا ترکِ رفاقتِ او کردہ ملازمتِ ما اختیار کردند و جمعے کہ باشارۂ برادرِ نامہربان حرکاتِ نا ملایم کردہ حرفہائے بے ادبانہ بر زبان آوردند بہ تازیانۂ اغماض و تحمل متنبہ شدہ از سرِ انصاف اقرار بہ صاحب حوصلگی ما کردند تا نقشِ سرداری و بہادریٔ ما بر لوحِ خاطرِ اشرافِ اقدس اعلیٰ حضرت (یعنی شاہ جہاں) مُرتسم گشت و کارہائے دست بستہ بزور بازوئے ایں مورِ ضعیف صورت گرفت"۔ ایک دوسرے رقعے میں سلطان محمد اعظم کو لکھتا ہے "فرزندِ عالی جاہ روزے اعلیٰ حضرت در خلوت بدارا شکوہ ارشاد نمودند کہ در حقِ امرائے بادشاہی کج خلق و بد گمان نباشد و ہمہ را مشمول عواطف و الطاف دارد و عرضِ غرض آمیز و سخن سازان در حق ایں جماعت نشنود کہ ایں حرف وقتے بکار خواہد آمد از بسکہ دل مے سوزد حرفِ ناگفتنی میگویم نفاق بامردم کار ضائع کاریست"۔ پھر ایک اور رقعہ میں محمد اعظم کو لکھتا ہے "فرزندِ عالیجاہ ایں نقل زبانی شخصے معتبر بگوش رسیدہ بود در رشتہ تحریر کشیدہ شد کہ بہوشِ آں فرزند ہم برسد۔ روزے اعلیٰ حضرت علی مردان خاں و سعد اللہ خاں را در خلوتِ خاص عزاختصاص بخشیدہ از زبانِ گوہر فشان فرمودند کہ بعضے اوقات اندیشہ بخاطر راہ مے یابد کہ مہیں پور خلافت (یعنی دارا شکوہ) اگرچہ اسبابِ شان و شوکت و سامانِ تجمل و صولت ہمہ دارد لیکن عدوے نیکوان و دوستِ بدان واقعہ شدہ۔ شجاع غیر از سیر چشمی وصفے ندارد۔ و مراد بخش مجہول الکیفیت بأکل و شرب ساختہ دایم الخمر است مگر فلانی یعنی این عاجزِ فانی ذی عزم و مآل اندیش بنظر می آید۔ اغلب کہ متحمل امر خطیر ریاست تواند شد"۔ (ماخوذ از کتاب کلماتِ طیبات معروف بہ رقعاتِ عالمگیری)۔ (س م ح)

(۱۸) یہ افواہ خواہ اصل میں صحیح ہو یا غلط مگر جو لوگ اس ملک کی راہ و رسم سے واقف ہیں بخوبی جانتے ہیں کہ ایسے معاملہ میں کوئی بے حیا سے بے حیا شخص بھی ایسا استفتا نہیں

کر سکتا۔ (س م ح)

(۱۹) بیگم صاحب کا بے حد اقتدار و اختیار اور اس کا شاہ جہاں کو اپنی اولاد میں سب سے زیادہ عزیز ہونا اس خاندان کی فارسی زبان کی تاریخوں سے بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی نہایت بڑی آمدنی کی جاگیر ہی سے جو ساٹھ لاکھ روپیہ سال کی تھی یہ بات بخوبی ثابت ہے۔ (س م ح)

(۲۰) بالکل ممنوع ہونا تو صحیح نہیں ہے کیونکہ اسی خاندان کی کئی شاہزادیوں کی شادی کا اس خاندان کے بعض شہزادوں اور بعض مشائخ زادوں کے ساتھ ہونا اس خاندان کی فارسی زبان کی تاریخوں میں مشروحاً درج ہے۔ مگر ہاں اکثریہ حالت یہی تھی جو مصنف نے بیان کی ہے۔ (س م ح)

(۲۱) انگریزی رسم الخط میں ناظر خاں اور نذیر خاں ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے مگر غالباً نذیر خاں صحیح ہو گا کیونکہ ناظر خاں محاورے کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ (س م ح)

(۲۲) میر عسکری المخاطب بہ عاقل خاں جو اورنگ زیب کے مشہور امیروں میں سے تھا لکھتا ہے کہ ۱۰۶۲ھ میں جبکہ شاہ جہاں کابل میں مقیم تھا اس نے دور اندیشی کی راہ سے ان شہزادوں کو ان کے نامزد کیے ہوئے صوبوں کو رخصت کیا اور کابل سے چل کر جب شجاع اور اورنگ زیب آگرہ میں پہنچے تو دارا شکوہ کے ضرر سے بچنے کے لئے آپس میں بڑے بڑے مستحکم عہد و پیمان کئے اور کہا کہ اگر ہم باہم ملے رہیں تو دارا شکوہ کے شر سے جو ہمارے خون کا پیاسا ہے، بچے رہیں گے اور اس معاہدہ کے مزید استحکام کے لئے شجاع نے اپنی بیٹی اورنگ زیب کے بیٹے محمد سلطان سے منسوب کی اور اورنگ زیب نے اپنی لڑکی کا رشتہ شجاع کے بیٹے سلطان زین العابدین سے کیا۔ (س م ح)

(۲۳) فارسی زبان کی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ جہاں نے دارا شکوہ کو حقیقتاً اپنا ولی عہد مقرر کر کے شاہِ بلند اقبال کا خطاب دیا ہوا تھا۔ اور صاحبِ سیر المتاخرین نے بضمن وقائع ۱۰۶۷ ہجری لکھا ہے کہ اخیر میں اس کا سالانہ مواجب دو کروڑ اور ساڑھے سات لاکھ روپیہ مقرر ہو گیا تھا۔ (س م ح)

(۲۴) اصل کتاب کے حاشیہ اور بعض فارسی زبان کی تاریخوں میں اس نامور شخص کا حال یوں لکھا ہے کہ یہ قوم کا سید اور ایران کا باشندہ تھا اور اردستان میں جو نواح اصفہان میں ہے پیدا ہوا تھا۔ اس کے والدین اگرچہ خاندانی تھے مگر بہت ہی غریب تھے۔ بہر حال اس نے

کسی طرح کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا اور ایک جوہری کے پاس، جو تجارت کے لئے اکثر گول کنڈ کو آیا کرتا تھا، گماشتہ بن گیا۔ اب بعضوں کا تو یہ قول ہے کہ نوکری چھوڑ کر گول کنڈا کی سلطنت میں بطور خود تجارت کرنے لگ گیا تھا اور بعض یوں کہتے ہیں کہ وہ سوداگر مرتا ہوا اپنا سب مال و دولت اسی کو دے گیا تھا۔ خیر خواہ کوئی صورت ہو یہ نوجواں شخص اسی تجارت کے ذریعہ سے نہایت مالدار ہو گیا اور کچھ روپیہ خرچ کر کے سلاطینِ قطب شاہی کے دربار میں جو ملک تلنگانہ اور کلاں تر حصہ ملک گول کنڈا کے بادشاہ تھے، ایک عہدہ حاصل کر لیا اور اس عہدہ کے کاروبار کو ایسی خوبی سے انجام دیا کہ بادشاہ نے نہایت خوش ہو کر بہ ترقی منصب فوج ماموره تلنگانہ کا اس کو اعلیٰ افسر مقرر کر دیا اور آخر کار سلطان عبداللہ قطب شاہ والی گول کنڈا کا وزیر مقرر ہو کر میر جملہ یعنی سردارِ کل کا خطاب پایا۔ (س م ح)

(۲۵) مترجم انگریزی نے اس موقع پر بطور حاشیہ یہ لکھا ہے کہ "ہیرے زیادہ تر سلطنت گولکنڈا بیجاپور بنگالہ اور جزیرہ برنیو میں دستیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک کان تو راول کنڈ میں ہے جو گول کنڈا سے پانچ منزل پر ہے، دوسری گانی میں جسے گولوز بھی کہتے ہیں، گول کنڈ سے مشرق کی طرف سات منزل پر ہے۔ بنگالہ میں قصبہ سلیم پور کے نزدیک جو گویل نامی ایک ندی ہے اس کی ریت میں سے بھی ہیرے نکلتے ہیں اور اس لئے سلیم پور کی جگہ اس کان کو گویل والی کہنا زیادہ مناسب ہے اور جزیرہ بورنیو میں سکادن میں سے ہیرے نکلتے ہیں جو وہ بھی ایک ندی ہے اور اب سے ایک سو برس پہلے تک بجز ہندوستان یا اس کے جزیروں کے اور کسی جگہ ہیرے کی کان معلوم نہیں ہوئی تھی۔ البتہ ایک کان ۱۷۲۸ء میں ملک برازیل میں جو جنوبی امریکہ میں ہے، دریافت ہوئی ہے"۔ اب ہمارے اس زمانہ کی کیفیت سنئے کہ ہندیل کھنڈ کی بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے سوا ہندوستان میں ہیرے کسی جگہ پر برآمد نہیں ہوتے اور وہاں بھی بہت کم اور بہت چھوٹے نکلتے ہیں اور غیر ملکوں کا یہ حال ہے کہ افریقہ کے ایک حصہ یعنی کیپ آف گڈ ہوپ میں بھی چند سال سے ہیرے نکلنے لگے ہیں اور بڑے بڑے اور بہت کثرت سے نکلتے ہیں مگر رنگت اکثر زردی مائل ہوتی ہے اور ہندوستان کی پرانی کانوں کے سفید ہیروں کے برابر خوشنما اور بیش قیمت نہیں سمجھے جاتے اور تراشنے میں بھی ویسے سخت نہیں ہیں۔ اور اگرچہ فنِ طب کی خواص ادویات کی عربی اور فارسی زبان کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جزیرہ قبرص (سائپرس) اور مقدونیہ میں بھی ہیرا نکلتا تھا۔ مگر مسٹر ایڈون سٹریٹر کی بیش بہا کتاب سے جو خاص جواہرات کے باب میں بہت عمدہ اور

حکیمانہ تحقیق سے لکھی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ہیرا ہندوستان اور اس کے قریب کے جزائر سماٹرا اور بورنیو اور ملک برازیل واقع جنوبی افریقہ اور جزیرہ آسٹریلیا کے کوہستان یورال ہی میں نکلتا ہے اور بقول ان کے صرف سفید اور زرد ہی نہیں ہوتا بلکہ سبز اور نیلا اور سرخی مائل اور داغدار لوہے کے رنگ کا بھورا اور شفاف اور غیر شفاف دونوں طرح کا ہوتا ہے۔ (س م ح)

(۲۶) یہ بات ہندوستان کی کسی فارسی زبان کی تاریخ میں راقم کی نظر سے نہیں گزری۔ (س م ح)

(۲۷) صحیح نام محمد امین خاں ہے اس لئے آئندہ اس ترجمہ میں اس کو اسی نام سے لکھا جائے گا۔ (س م ح)

(۲۸) اس کا قدیم نام دیوگڑھ تھا جس کو غلطی سے اکثر مسلمان مصنفوں نے دیوگیر لکھا ہے چنانچہ بدر چاچ جو محمد شاہ تغلق کے دربار کا ایک مشہور شاعر تھا اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے:

تو دیوگیر مخوانش کہ دولت آبادست

کہ چار طاق دَر اوست ہشت باب جناں

اور سیر المتاخرین میں لکھا ہے کہ راجہ بھوج کے زمانہ میں اس کا نام دھارا نگری تھا۔ بہر حال محمد شاہ تغلق نے (جو ۷۲۹ ہجری میں ہندوستان کے تخت پر بیٹھا تھا) جب اس کو ہندوؤں سے فتح کیا تو دولت آباد نام رکھ دیا، جس کے قریب گوداوری کے کنارے اورنگ زیب نے اپنی حکومتِ دکن کے زمانہ میں اورنگ آباد آباد کیا جو خجستہ بنیاد اورنگ آباد کے نام سے سرکاری کاغذات میں لکھا جاتا تھا۔ ہمارے اس زمانہ میں اگرچہ دولت آباد کی نمود باقی ہے مگر حاکم جانشین مقام اورنگ آباد ہی ہے، جہاں ریاست حیدر آباد کی طرف سے ایک حاکم صدر تعلقہ دار کے لقب سے رہتا ہے۔ (س م ح)

(۲۹) صاحب تاریخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ "سلطان محمد قلی قطب شاہ نے جس کے ہاں ایک ہزار کسبیاں ناچنے گانے کے لئے نوکر تھیں اس کو ۹۵۰ ہجری سے کچھ پہلے اپنی معشوق بھاگ متی کے نام پر جو انہی میں سے ایک پاتر یعنی ہندو کسبی تھی آباد کیا تھا۔ لیکن پھر کچھ پشیمان ہو کر یہ نام بدل دیا اور حیدر آباد نام رکھ دیا"۔ مگر اب ہمارے اس زمانہ میں وہ پہلا نام بالکل محو ہو گیا ہے اور صرف حیدر آباد ہی مشہور ہے اور گول کنڈا کا قلعہ بھی اب تک قائم

ہے اور دونوں ریاست حیدر آباد دکن کے قبضہ میں ہیں جو اس وقت ہندوستانی ریاستوں میں سب سے بڑے اور سلطنتِ مغلیہ کی طرز نظم و نسق اور طور وطریق کا گویا ایک نمونہ ہے اور جس کا رقبہ بموجب بیان مسٹر ٹالبائے وھیلر صاحب مؤلف تاریخ جلسہ قیصری واقع دہلی تقریباً اٹھانوے ہزار میل مربع اور آبادی تقریباً نوے لاکھ اور آمدنی تین کروڑ اکتیس لاکھ ہے اور جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد سے نواب نظام الملک آصف جاہ بہادر صوبہ دار دکن کی اولاد کے قبضہ میں چلی آتی ہے۔ (س م ح)

(۳۰) عاقل خاں نے اس واقعہ کو یوں لکھا ہے کہ جب میر جملہ نے اپنے آقا کو ناراض دیکھا تو اورنگ زیب سے مدد چاہی۔ اس نے شاہ جہاں کو اطلاع دی۔ وہاں سے فرمان صادر ہوا کہ جس طرح ہو سکے اس کو عبداللہ قطب شاہ کے ہاتھ سے بچا کر ہمارے پاس بھیج دو۔ اس حکم کے آنے پر اورنگ زیب نے اس مضمون کا اپنا ایک نشان (اس وقت کی اصطلاح میں بادشاہوں کی تحریر کو "فرمان" اور شہزادوں کی تحریر کو "نشان" کہتے تھے) قطب شاہ کے نام لکھا کہ محمد سلطان اپنے چچا شجاع کے پاس اوڑیسہ کی راہ سے بنگالہ کو جانا چاہتا ہے (کیونکہ بقول الفنسٹن صاحب، راستہ کی صورت یہ تھی کہ اورنگ آباد سے بنگالہ کو مچھلی پٹن کے پاس اس طرح چکر کھا کر جاتا تھا کہ گونڈوانہ کے جنگل بیچ میں نہ پڑیں۔ حاصل یہ کہ اورنگ زیب کی راہ گول کنڈا کی دارالسلطنت بھاگ نگر سے تھوڑے فاصلہ پر رہ جاتی تھی) آپ خاطر داری سے اپنے ملک سے گزر کرا دیں۔ اب ادھر وہ بے چارہ تو اس پیغام کو واقعی سمجھ کر مہمانداری اور خاطر تواضع کی تیاری میں مصروف ہوا اور ادھر محمد سلطان لڑائی کے ساز و سامان سے خوب درست ہو کر کوچ بکوچ روانہ ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے خود حضرت بھی چل کھڑے ہوئے اور قطب الملک کو اس فریب کی اس وقت خبر ہوئی کہ جب محمد سلطان بھاگ نگر کے بہت قریب جا پہنچا اور وہ نہایت سراسیمگی اور اضطراب کی حالت میں بقدر گنجائش وقت جو کچھ جواہرات اور عمدہ چیزیں ساتھ لے سکا لے کر تا بڑ تا قلعہ حیدر آباد یعنی گول کنڈا میں جا داخل ہوا اور یہ مصیبت ایسی ناگہانی تھی کہ مارے گھبراہٹ کے اس کی بیگمیں بے چاری پاپیادہ بلکہ ننگے سر اور ننگے پاؤں بھاگ کر قلعہ میں پہنچیں اور محمد سلطان نے آکر بھاگ نگر پر قبضہ کر لیا اور بعض مؤرخوں نے صرف اتنا ہی لکھ دیا ہے کہ پہلے قاضی عارف کشمیری کو اورنگ زیب نے قطب شاہ کے پاس میر جملہ کے باعزت وآبرو رخصت کر دینے کے لئے مع فرمان شاہی بھیجا تھا۔ ابھی وہ پہنچنے نہیں پایا تھا کہ قطب شاہ نے میر جملہ

کے بیٹے محمد امین خاں کو قید کر کے اس کا مال واسباب ضبط کر لیا اور اس سبب سے شاہ جہاں کی طرف سے اس کے نام ایک اور خفگی آمیز فرمان جاری ہوا اور اورنگ زیب کے نام حکم صادر ہوا کہ اگر قطب شاہ ارشاد شاہی کی تعمیل میں توقف کرے تو اس کو سزا دو۔ اس حکم کے آنے پر اورنگ زیب آگے آگے محمد سلطان کو روانہ کر کے پیچھے سے خود بھی چل پڑا اور چونکہ قطب شاہ کے لوگوں کی طرف سے محمد سلطان کے بھاگ نگر پہنچ جانے کے بعد کچھ "حرکات شوخی" ظہور میں آئی تھیں اس سبب سے محمد سلطان اور اورنگ زیب نے بھاگ نگر کو تاخت و تاراج کر کے گول کنڈا کو گھیر لیا تھا۔ فقط۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مؤرخوں نے اورنگ زیب کی ان دھوکے بازی کی چالوں کا ذکر، جن کا حال برنیئر اور عاقل خاں نے لکھا ہے دانستہ چھوڑ دیا ہے۔ (س م ح)

(۳۱) عاقل خاں اس لوٹ کی نسبت یہ لکھتا ہے "کہ شہزادۂ فیروز مند (محمد سلطان) در کمال عظمت و استقلال بہ بھاگ نگر در آمدہ رایت اقتدار برافراشت و اکثر کارخانجات و بیوتات قطب الملک عرض نہب و غارت ساخت و کتب نفیسہ و چینی آلات و دیگر اشیاء و اجناس افزوں از اندازۂ شمار و قیاس بسرکار سلطنت رسید و از عقب بندگان حضرت جہاں پناہی (اورنگ زیب) بدولت و اقبال تشریف آوردہ طنطنہ عظمت و جلال آنحضرت در زمین و زمان پیچیدہ بسیارے از اسباب و آلات غریبہ کہ از تحفِ روزگار بود از اموالِ قطب الملک بسرکار عالم مدار ضبط شد و کثرت و افزونی ذخائر و اشیاء و اسباب و مواد مکنت و ثروتِ آن دولتمند (قطب الملک) بمرتبہ بود کہ بعد از کوچ فرمودن بیجتاں خانہاد مخزنہا مالا مال گزاشتند اصلا محسوس نے شد کہ دست کسے مایں خزاین و ذخائر رسیدہ باشد و نقصے دراں راہ یافتہ و حالانکہ ازیں جہت در سرکار سلطنت سامان ثروت و سرانجام مکنت پدید آمد"۔

(س م ح)

(۳۲) اصل کتاب میں غلطی سے جا بجا اس کو سلطان محمود کر کے لکھا ہے اور صحیح نام محمد سلطان ہے۔ (س م ح)

(۳۳) عاقل خاں اور خافی خاں نے اس شرط اور سکہ جاری کرنے کی شرط کا ذکر نہیں لکھا۔ (س م ح)

(۳۴) فارسی کتابوں میں اکثر اس قلعہ کا نام بیدر (بے دَر) لکھا ہے۔ (س م ح)

(۳۵) گول کنڈہ اور بیجاپور کے بادشاہوں کا حال اس کتاب کے خاتمہ کے قریب متن

اور حاشیہ میں دیکھنا چاہئے۔ (س م ح)

(۳۶) سعد اللہ خاں کو عہد شاہ جہاں کے مؤرخوں میں سے بعض نے لاہور اور بعض نے چنیوٹ کا رہنے والا بیان کیا ہے جو پنجاب کے ضلع جھنگ میں ایک پرانا قصبہ ہے۔ لیکن میرے ایک دوست جو جھنگ کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہیں بعد تحقیق یہ لکھتے ہیں کہ "اصل میں وہ پترا کی کا رہنے والا تھا جو چنیوٹ سے پانچ کوس شمال کی طرف ایک موضع ہے مگر اپنے ایام امارت میں اس نے چنیوٹ کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور اگرچہ اس ملک میں اب اس کی اولاد کا کوئی شخص نہیں ہے مگر اس کی بنائی ہوئی ایک بہت عالی شان مسجد اور اس کے محلوں کے کھنڈر چنیوٹ میں موجود ہیں۔ اس کے زمانہ کے مؤرخوں نے اس کی قومیت کا کچھ ذکر نہیں لکھا۔ البتہ خافی خاں نے اس کو شیخ سعد اللہ کر کے لکھا ہے۔ جو ہندوستان میں اکثر نو مسلم لوگوں کو بھی لکھا اور بولا جاتا ہے۔ مگر اس کے وطن داروں کا یہ بیان ہے کہ وہ تھیم تھا جو ایک ایسی قوم ہے کہ وہاں کی مسجدوں اور مکتبوں کے ملا اکثر اسی ذات کے ہوتے ہیں۔ اگرچہ میرے نزدیک تو ظنِ غالب یہی ہے کہ یہ کوئی ہندوی الاصل قوم ہے مگر چونکہ ان کے میراثی اول ان کے سلسلۂ نسب میں کچھ عجیب و غریب نام بیان کر کے پھر اس کو کھینچ تان کر ملک عرب تک پہنچاتے ہیں اس لئے میرے ایک اور دوست جو بالفعل خاص چنیوٹ کی منصفی کے عہدہ پر مامور ہیں اور جنہوں نے براہِ مہربانی تکلیف فرما کر میری خواہش کے موافق اس کی تحقیق کی تھی، یہ خیال کرتے ہیں کہ "شاید یہ لفظ تمیم کی خرابی ہو جو عرب کے مشہور قبیلہ بنی تمیم کے نام کا ایک جزو ہے اور ان گنواروں نے اپنی جہالت اور بے علمی کی وجہ سے جو فی زمانا ان اضلاع میں معموماً ہے، بگاڑ کر اور اس میں سے ایک لفظ حذف کر کے تھیم بنالیا ہو"۔ سعد اللہ خاں جو لاہور میں تحصیلِ علوم کرنے کے سبب سے ملا سعد اللہ لاہوری کے نام سے معروف تھا ۱۰۵۰ ہجری میں شاہ جہاں کے جلوس کے چودھویں سال کے شروع میں سید موسوی خاں صدر یعنی وزیرِ اوقاف کی سفارش سے بادشاہ کے حضور میں پہنچا تھا مگر چار ہی برس کے اندر اپنی لیاقت اور کمال کی وجہ سے ہندوستان کا وزیر اعظم بن گیا اور ساتویں برس ہفت ہزاری کے منصب پر، جس سے بڑا کوئی اس وقت تک منصب نہ تھا، فائز ہوا اور شاہ جہاں کے مزاج میں یہاں تک دخل پایا اور اعتماد حاصل کیا کہ کوئی چھوٹا یا بڑا کام اس کی رائے بغیر ہونا دشوار تھا اور مرتے دم تک اسی اعتماد اور اقتدار کے ساتھ اپنے عہدہ پر قائم رہا۔ (س م ح)

(۳۷) شیر شاہ کا خاندان مراد ہے جس نے شاہ جہاں کے پردادا ہمایوں کو ہندوستان سے مار کر نکال دیا تھا اور خود بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ (س م ح)

(۳۸) ان افواہوں اور دارا شکوہ کے سعد اللہ خاں کو مروا ڈالنے کا ذکر اورنگ زیب کے طرفدار مؤرخوں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا حالانکہ دارا شکوہ کی کسی بُرائی کا چھپانا ان کے مدعا کے خلاف تھا بلکہ سب نے سیدھے اور صاف طور سے اس کا مرنا قولنج کے مرض سے بیان کیا ہے جس میں وہ کئی مہینے تک مبتلا رہ کر سنہ ایک ہزار چھیاسٹھ ہجری میں سینتالیس برس کی عمر میں مرا تھا۔ اور حکیم داؤد مخاطب بہ تقرب خاں شاہ جہاں کا طبیبِ خاص اس کا معالج تھا اور لکھا ہے کہ خود بادشاہ کئی بار اس کی عیادت کو گیا تھا اور خافی خاں نے اگرچہ اس کی نسبت دارا شکوہ کے نہایت درجہ شک و حسد اور بے جا کاوشوں کا ذکر کیا ہے لیکن یہ صاف لکھا ہے کہ باوجود قربِ ولی عہدی اور اختیارِ سلطنت کے سعد اللہ خاں کے مرتے دم تک اس کی جان یا آبرو کو ضرر نہیں پہنچا سکا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ایشیائی اہلِ دربار کی عادت ہے کہ کسی اپنی ناجائز غرض سے کسی بڑے آدمی کی موت کو اکثر زہر وغیرہ سے منسوب کر دیا کرتے ہیں اسی طرح یہ شہرت ہو گئی ہو گی جس کو برنیئر نے اجنبی ہونے اور اس ملک کے لوگوں کی عادت سے بخوبی واقف نہ ہونے کی وجہ سے صحیح سمجھ کر لکھ ڈالا اور غالباً یہی وجہ ہو گی کہ الفنسٹن صاحب نے اپنی تاریخ ہندوستان میں باوجودیکہ جابجا برنیئر کی تحریر کے حوالہ سے اکثر باتیں درج کی ہیں اس کی اس روایت کا ذکر نہیں کیا۔

(س م ح)

(۳۹) ان واقعات کو عاقل خاں اور خافیؔ خاں نے جس طرح پر بیان کیا ہے اس کا ماحاصل یہ ہے کہ میر جملہ جب اورنگ زیب کے پاس پہنچ گیا تو شاہ جہاں نے اس کو وہیں معظم خاں کا خطاب اور پانچ ہزاری کا منصب اور ایک بڑا بھاری خلعت عطا فرما کر حضور میں طلب فرمایا اور ۱۰۶۶ھ ہجری میں جب بمقام شاہ جہان آباد حاضر ہوا تو اسد خاں بخشی استقبال کر کے حضور میں لایا اور اس نے ایک خوان اشرفیوں کا اور دو خوان جواہرات کے اور اور عمدہ عمدہ چیزیں نذر گزرانیں اور چونکہ سعد اللہ خاں کے انہی دنوں میں انتقال کر جانے کے سبب سے وزارت خالی تھی اس لئے اس عہدہ کا مرصع قلمدان چھ ہزاری، چھ ہزار سوار کا منصب اور "خلعتِ خاص باشمشیرِ مرصع" اور شاہی گھوڑوں اور ہاتھیوں میں سے دو سو گھوڑے اور ایک ہاتھی اور ایک ہتھنی مع سونے چاندی کے ساز کے اور پانچ لاکھ روپیہ عنایت ہوا اور بقول

صاحب سیر المتاخرین خطاب میں لفظ عمدۃ الملک بھی بڑھایا گیا۔ مگر چونکہ اس نے دکن میں نشوونما پائی تھی اور وہاں کی آب و ہوا کا خوگر تھا اور اس کے اور اورنگ زیب کے باہم آئندہ کے منصوبوں کی نسبت بھی کئی طرح کے مخفی عہد و پیمان تھے اس لئے ہمیشہ واپس جانے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔ اب حسنِ اتفاق سے جو بیجاپور کے بادشاہ علی عادل شاہ نے لاولد قضا کی اور اورنگ زیب نے باپ کو اطلاع دی کہ لوگوں نے سکندر نامی ایک مجہول النسبت لڑکے کو جس کو عادل شاہ نے فرزند کے طور پر پالا تھا تخت پر بٹھادیا ہے اور شاہ جہاں نے بھی اورنگ زیب کو بیجا پور پر فوج کشی کا حکم دے دیا اور اس کے مہم سے واپس آنے تک شائستہ خاں کو دولت آباد پہنچ کر صوبہ داری کا کام کرنے کی ہدایت ہوئی تو میر جملہ نے موقع دیکھ کر ایک بڑا بھاری پیش کش (جس کی کل قیمت پندرہ لاکھ روپیہ جانچی گئی تھی) اور جس میں دوسو سولہ رتی وزن اور دو لاکھ سولہ ہزار روپیہ قیمت کا ایک ہیرا اور چار ہتھنیاں اور ساٹھ ہاتھی سونے کے ساز کے اور سولہ ہتھنیاں چاندی کے ساز کی تھیں، پیش کیا اور عرض کیا کہ بیجا پور کیا بلکہ دکن کا تمام ملک آسانی کے ساتھ فتح ہو سکتا ہے اور اس کا ذمہ میں لیتا ہوں اور اس طرح پر معہ مہابت خاں اور راؤ ستر سال و شاہنواز خاں و نجابت خاں وغیرہ "دکنی" افسروں کے "مغلیہ اور راجپوتیہ" بیس ہزار فوج کا سپہ سالار بناکر رخصت ہوا تاکہ اورنگ زیب کے تحت میں اس مہم کا سرانجام کرے اور محمد امین خاں کو حکم ہوا کہ باپ کی جگہ وزارت کا کام باتفاق رائے رایان رگھناتھ نائب وزیر کے انجام دیتا رہے اور اس طرح سے اورنگ آباد پہنچ کر وہاں سے مع اورنگ زیب کے بیجاپور کے ملک پر چڑھائی کردی اور کلیانی وغیرہ اُن کے قلعوں کو جا گھیرا۔ (س م ح)

(۴۰) مترجم انگریزی نے حاشیہ میں بحوالہ تحریر کرنل ڈو صاحب (Mr.Dow) یہ لکھا ہے کہ "شاہ جہاں کی طاقت و توانائی میں بسبب افراط و بے ہنگام شوق عیاشی کے نہایت خلل آگیا تھا۔ چنانچہ اسی سبب سے سترہویں ستمبر ۱۶۵۷ء کو ناگہاں اسے فالج ہو گیا اور اس کے ساتھ سوزاک کا بھی خلل تھا اور کئی دن تک حالت بے ہوشی اس پر طاری رہی تھی"۔ مگر فارسی کتابوں سے فالج کا ہونا غلط معلوم ہوتا ہے اور ان کتابوں میں یوں لکھا ہے کہ شروع ماہ ذی الحجہ ۱۰۶۷ ہجری کو بمقام دہلی سرسٹھ برس کی عمر میں شاہ جہاں کا پیشاب بند ہو گیا اور اعضائے اسفل پر ورم ہو کر ایک ہفتہ تک نہایت سخت بیمار رہا اور کچھ تخفیف ہو گئی تھی کہ اسی حالت میں داراشکوہ اپنے بھائیوں کے منصوبوں کے روکنے کے

لئے دہلی کی بہ نسبت اکبر آباد کو ایک بہتر مقام سمجھ کر بسواری کشتی اس کو وہاں لے گیا اور اگرچہ یہ سفر ایک مہینے میں ختم ہوا مگر مرض کو بھی بہت سا افاقہ ہو گیا۔ (س م ح)

(۴۱) جب ۱۰۳۶ہجری میں کشمیر سے واپس آتے ہوئے جہانگیر کا انتقال ہو گیا اور نور جہاں بیگم نے جہانگیر کے بھتیجے سلطان شہریار کو جس سے نور جہاں کی بیٹی جو اس کے پہلے خاوند سے تھی بیاہی ہوئی تھی اور جو بیماری کے سبب سے رخصت لے کر پہلے ہی لاہور میں پہنچ گیا تھا، سلطنت کے لئے ابھارا اور نور جہاں کے بھائی آصف خاں وزیر نے اپنے داماد شاہ جہاں کو بنارسی نامی اپنے ایک نہایت معتمد ہندو قاصد کی معرفت جس کو ضیقِ فرصت کی وجہ سے عریضہ کی جگہ اپنی مہر حوالہ کر دی تھی خفیہ پیغام بھیج کر بلایا اور نور جہاں کی سازشوں کی روک تھام کے لئے شاہ جہاں کے دکن سے آگرہ میں پہنچنے تک جہاں وہ باپ سے باغی بنا پھر رہا تھا، جہانگیر کے پوتے سلطان داؤد بخش عرف مرزا بلاقی خلف سلطان خسرو کو جو ارادت خاں کے سپرد تھا برائے نام بادشاہ بنا کر لاہور کی طرف کوچ کیا اور نور جہاں کو اپنے خیمہ میں لا کر قابو میں کر لیا اور لاہور پہنچ کر شہریار کو جو بادشاہت کی ہوس میں لاہور کے بادشاہی خزانہ کا بہتر لاکھ روپیہ خراب کر کے پندرہ ہزار فوج کی جمعیت سے صرف راوی تک مقابلہ کو آیا تھا، گرفتار کر کے قلعہ لاہور میں قید کر دیا اور داور بخش کو تخت پر بٹھا دیا تو شاہ جہاں کا خاص اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ حکم آصف خاں کے پاس پہنچا کہ مناسب اور مصلحتِ وقت یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو داور بخش اور اس کے بھائی گرشاسپ اور مرزا دانیال کے تینوں بیٹوں شہریار اور طہمورث اور ہوشنگ کو اندھا کر کے ہمارے پاس لے آؤ ورنہ پانچوں کے پانچوں کو چلتا کرو تو آصف خاں نے باتفاق ارادت خاں اور خواجہ ابوالحسن وغیرہ امرا کے سکہ و خطبہ شاہ جہاں کے نام کا جاری کر دیا اور ان بے چارے پانچوں بے گناہوں کو رات کے وقت دنیا سے رخصت کیا اور ادھر آٹھویں جمادی الثانی ۱۰۳۷ہجری کو شاہ جہاں نے آگرہ پہنچ کر تختِ سلطنت پر جلوس کیا۔ (س م ح)

(۴۲) عاقل خاں نے لکھا ہے کہ اس وقت اورنگ زیب کے پاس تیس ہزار سوار جرار تھے۔ (س م ح)

(۴۳) فارسی زبان کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ اس وقت شاہ جہاں کی بڑی بیٹی معروف بیگم صاحب کی جاگیر میں تھی۔ (س م ح)

(۴۴) اورنگ زیبی چالوں اور ہتھکنڈوں پر خیال کرنے سے تو ظاہرا ڈاکٹر برنیئر ہی کا لکھنا

صحیح پایا جاتا ہے کہ مراد بخش نے جو کچھ کیا وہ اورنگ زیب کی تحریک و ترغیب سے کیا۔ مگر اس وقت کی فارسی تاریخوں سے بالاتفاق یوں معلوم ہوتا ہے کہ مراد بخش نے جب باپ کے سخت بیمار ہونے کی خبر پائی تو اس کا مر جانا فرض کر کے خود بخود شورش کی اور صوبہ گجرات کے بادشاہی دیوان سید علی نقی کو جو اس کی خرابیوں کی اصلاح کے لئے مامور تھا اپنا بد خواہ سمجھ کر بے جرم و خطا خود اپنے ہاتھ سے قتل کر ڈالا اور بادشاہ بن کر تخت پر ہو بیٹھا اور دستورِ خاندان کے موافق اپنا شاہانہ لقب مروج الدین مقرر کر کے سکہ اور خطبہ بھی جاری کر دیا اور سازو سامان کی درستی کے لئے نہ صرف شاہی خزانہ پر تصرف کر لیا بلکہ گجرات کے سوداگروں اور اور دولتمندوں سے بھی بہت سا روپیہ جبراً وصول کیا۔ اورنگزیب ان سب حالات کو دیکھ رہا تھا مگر از راہِ احتیاط ایک برس کے قریب تک خاموش تھا۔ مگر جب شجاع نے بھی بنگالہ سے کوچ کر دیا تو زیادہ توقف مصلحت نہ دیکھ کر اس نے بھی چڑھائی کرنے کی ٹھان لی۔ اور بقول عاقل خاں جس کے بیان اکثر ناطرفدارانہ اور صاف ہیں یہ خیال کر کے کہ مراد بخش جو تخت نشین ہونے کی بھی حرکت کر چکا ہے ایسے باحوصلہ شخص کا دارالحکومت دکن سے آگرہ کی طرف میرے چلے جانے کی حالت میں ایسے قریب مقام میں رہنا مناسب نہیں ہے اس لئے سخت سخت قسموں کے ساتھ مراد بخش سے یہ معاہدہ کیا کہ ہم تم متفق ہو کر آگرہ پر حملہ کریں اور بصورتِ فتح کل مال غنیمت میں سے ایک ثلث تمہارا اور دو ثلث میرے اور سلطنت میں سے کابل اور کشمیر اور سندھ اور ملک پنجاب تمہارے تصرف میں آئے گا اور اس میں سکہ و خطبہ اور حکومتِ شاہانہ تمہاری رہے گی۔

اور سیر المتاخرین میں یوں لکھا ہے کہ سلطنت اور مال و دولت کی تقسیم بالمناصفہ ٹھہری تھی۔

اور منشی محمد ذکاء اللہ صاحب دہلوی سلمہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب تاریخ ہند میں مکتوبات عالمگیری سے اس عہد نامہ کا خلاصہ یہ لکھتے ہیں کہ ہمارا دوست آپ کا دوست اور ہمارا دشمن آپ کا دشمن اور بعد انفصال تمام جھگڑوں کے صوبہ جات لاہور' کشمیر' کابل' ملتان' ٹھٹہ' بھکر اور تمام اضلاع خلیج عمان تک تم کو دیئے جائیں گے۔ (س م ح)

(۴۵) عاقل خاں نے اس خط کا مضمون بیان نہیں کیا مگر الفنسٹن صاحب نے اپنی تاریخ ہندوستان میں خافی خاں کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ "میں تمہارا خیر خواہ اور برادر مخلص ہوں اور تخت نشینی تم کو مبارک ہو۔ باقی میرا تو یہ ارادہ ہے کہ میں مکہ کو جاؤں اور کنج عزلت

میں بیٹھ کر خدا کی یاد کروں اور دنیا کو چھوڑ دوں اور باوصف اس کے لا مذہب دارا شکوہ کے مقابلہ پر تمہارا ساتھی بھی ہوں اور اب تک کہ ہمارا باپ جیتا جاگتا ہے، تو ہم کو چاہئے کہ اس کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اگر وہ ہم سے بعنایت پیش آئے تو اس کو اس ناواجب رعب و داب سے بچائیں جو دارا شکوہ نے اس پر ڈال رکھا ہے اور اس سے غلط فہمی کی معافی چاہیں اور اب اسی عرصہ میں ہم کو یہ مناسب ہے کہ ہم اپنی فوجیں اکٹھی کریں اور کافر جسونت سنگھ سے بمقابلہ پیش آئیں جو ہمارے روکنے کے لئے روانہ کیا گیا ہے۔ (س م ح)

(۴۶) عاقل خاں کی تاریخ سے صحیح نام شہباز خاں معلوم ہوتا ہے اور یہ شخص پنج ہزاری کے منصب کا ایک امیر تھا اور آئندہ اس ترجمہ میں شہباز خاں ہی لکھا جائے گا۔ (س م ح)

(۴۷) فارسی زبان کی تاریخوں سے اس کی گرفتاری کے واقعہ کی تفصیل و تشریح یوں پائی جاتی ہے کہ جب مہابت خاں و میر جملہ وغیرہ بادشاہی امیروں نے جو بیجاپور کی مہم میں اورنگ زیب کے ماتحت کام کر رہے تھے اوّل قلعہ بیدر (بدر) اور پھر کلیانی کے بھی نہایت مضبوط اور مستحکم قلعہ کو سخت مقابلہ کے بعد بجاریوں سے چھین لیا اور شاہ جہاں نے اورنگ زیب کی عرائض فتح ملاحظہ فرما کر بیدر کا مفتوحہ ملک مع قلعہ رام گڑھ اورنگ زیب کو حسنِ خدمت کے صلہ میں بخش دیا اور اس کی تنخواہ بارہ کروڑ دام یعنی ایک کروڑ سالانہ علاوہ اور عطیوں کے مقرر کر دی اور معظم خاں، شاہ نواز خاں، مہابت خاں، نجابت خاں وغیرہ امیروں کو بھی، جنہوں نے اس مہم میں نمایاں کام کئے تھے، اضافہ مناسب اور عطائے خلعت وغیرہ سے سرفراز کیا گیا اور دلاور حبشی قلعہ دار کلیانی قلعہ چھوڑ کر جب بیجاپور پہنچا اور بیجاپور والوں کو یقین ہو گیا کہ اب بغیر اطاعت کے چارہ نہیں انہوں نے اپنا ایک معتمد شہزادہ اورنگ زیب کے پاس بھیج کر امان چاہی اور آخر الامر یہ ٹھہر گیا کہ ایک ایسی بھاری پیشکش داخل کریں جو جواہرات اور ہاتھی اور نقدی وغیرہ ملا کر ڈیڑھ کروڑ روپیہ کی تعداد سے کم نہ ہو اور قلعہ ''پرینڈا'' مع مضافات اور ملک ''کوکن'' کے تمام قلعے اور کچھ اور محالات بھی بادشاہی عمدہ داروں کے حوالہ کریں اور جب یہ سب حال اورنگ زیب نے بادشاہ کو لکھا اور اس نے بیجاپوریوں پر رحم کر کے پیشکش کی تعداد میں پچاس لاکھ کی تخفیف کر دی اور شہزادہ کے نام فرمان لکھا گیا کہ قاضی نظاما کو تحصیل پیشکش کے لئے مامور کر کے خود دولت آباد کو چلا جائے اور معظم خاں جب ملکِ مفتوحہ کے قلعوں کے قرار واقعی بندوبست سے فارغ ہو جائے تو بیجاپور کی پیشکش جو قاضی نظاما لے کر

آ ئے اس کو ساتھ لے کر حضور میں حاضر ہو جائے۔ ابھی ان شرطوں کی تعمیل نہیں ہوئی تھی اور اورنگ زیب قلعہ گلبر گہ کو گھیرے ہوئے تھا کہ اسی اثناء میں بادشاہ بیمار ہو گیا اور دارا شکوہ نے ایسے بڑے امیروں کا اورنگ زیب کے پاس اس وقت موجود رہنا اپنے حق میں بہتر نہ سمجھ کر مہابت خاں راؤ ستر سال وغیرہ کے نام بادشاہی فرمان جاری کرا دیئے کہ اس کی اجازت اور عدم اجازت کی مطلق پروا نہ کر کے بلا توقف آگرہ کو چلے آئیں۔ چنانچہ سوائے نجابت خاں اور شاہ نواز خاں اور میر جُملہ کے سب چلے آئے بلکہ میر جملہ کو تو عہدۂ وزارت سے معزول کر کے حاضر دربار ہونے کا حکم بھیجا گیا (کیونکہ اورنگ زیب کا متوسل خاص سمجھا جاتا تھا) اور محمد امین خاں کو جو باپ کی جگہ نیابتاً وزارت کرتا تھا کام سے علیحدہ کیا گیا، اور رائے رایان دیوان رگھناتھ سرانجام کار کے لئے قائم مقام کے طور پر مامور ہوا۔ دارا شکوہ نے ان امیروں کے واپس بلانے کے لئے یہ بہانہ بنایا تھا کہ شجاع نے بنگالہ سے بہ ارادۂ فاسد کوچ کر دیا ہے اس لئے ان کا مع ان کی فوجوں کے پایۂ تخت میں حاضر ہو جانا مناسب ہے۔ ان امیروں کے چلے آنے سے اورنگ زیب کو نہایت وقت پیش آئی۔ کیونکہ اوّل تو بادشاہ کی سخت بیماری ہی کی خبریں سن کر بیجاپوریوں کے دل بہت بڑھ گئے تھے اور اس پر ایسے نامور اور صاحبِ فوج امرا کے چلے جانے سے ان کو اور بھی زیادہ دلیری ہو گئی اور اورنگ زیب کے لشکر میں جو ہنوز گلبر گہ کو گھیرے ہوئے تھا بہت ابتری اور کمزوری پھیل گئی مگر وہ اپنی معمولی ثابت قدمی اور استقلالِ طبع سے نہایت متانت اور وقار کے ساتھ جس طرح بن پڑا بندوبست مناسب کر کے عزت اور نیک نامی کے ساتھ دولت آباد میں واپس آ گیا اور جب اس نے سنا کہ میر جُملہ بھی جواب تک پیش کش کی تحصیل اور مفتوحہ قلعوں کے نظم و نسق سے فارغ نہیں ہوا تھا مہابت خاں اور ستر سال کی طرح آگرہ کو جانے والا ہے تو اسے یہ خوف پیدا ہوا کہ اگر ایسا دولتمند باتدبیر صاحبِ فوج و لشکر امیر ایسے وقت میں دارا شکوہ کے پاس جا پہنچا تو میری ساری امیدیں خاک میں مل جائیں گی۔ پس اس کے پھانسنے کے لئے یہ تدبیر نکالی کہ اس کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ چونکہ ہم آپ کو اپنا دلی ہوا خواہ اور خیر اندیش جانتے ہیں اگر آپ ہم سے مل کر اور رخصت ہو کر آگرہ کو جائیں تو مناسب ہے اور جب اس نے آنے سے پہلو تہی کی اور لکھا کہ "میرے نام فرمان آ چکا ہے اس لئے مجبور ہوں" تو اورنگ زیب نے اس کے قابو میں لانے کے لئے اس مرتبہ اپنے بڑے بیٹے محمد سلطان کو بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ چونکہ آپ حضور میں حاضر ہونے کو جاتے ہیں اس

لئے بعض ضروری باتیں تخلیہ میں آپ سے کہنی سنی واجبات سے ہیں اور اس صورت میں آپ کا ہم سے مل کر جانا ہماری نہایت ہی خوشی کا باعث ہوگا اور محمد سلطان نے باپ کی فہمائش کے موافق ایسی چکنی چپڑی باتیں بنائیں اور ایسا مطمئن کیا کہ وہ بلا دغدغہ خوش خوش ملنے کو چلا آیا۔ اب چونکہ یہاں پہلے ہی سے سب تیاری کی ہوئی تھی اور یار لوگ تواضع کے لئے منتظر تھے، جونہی اس نے خلوت خانہ میں قدم رکھا جناب امارت مآب فوراً گرفتار کر لئے گئے اور اس کے عمر بھر کے جمع کئے ہوئے خزانے اور مال و اسباب اور سامان ثروت و حشمت سب قابو کر لیا گیا اور اس کے نوکر چاکر اور فوج اپنی نوکر کر لی گئی اور ان خزانوں اور مال اور سپاہ کے ہاتھ آجانے سے اورنگ زیب اس بڑی مہم کے انجام دینے کے بخوبی قابل ہو گیا اور چونکہ اس نے اب تک پردہ نہیں اٹھاڈالا تھا باپ کو یہ لکھ بھیجا کہ فدوی کو معظم خاں کے اوضاع و اطوار سے بے وفائی اور روگردانی کی بو آئی تھی اس لئے میں نے اس کو پکڑ کر قید کر دیا ہے اور اگر ایسا نہ کرتا تو بے شبہ وہ بھاگ کر پھر دکن کے سرداروں سے جا ملتا۔ (ماخوذ از سیر المتاخرین و تاریخ عاقل خاں) (س م ح)

(۴۸) اصل کتاب میں جا بجا برم پور لکھا ہے مگر صحیح نام بُرہان پور ہے اس لئے آئندہ اس ترجمہ میں بُرہان پور ہی لکھا جائے گا۔ یہ شہر اس وقت صوبہ خاندیس کا دارالحکومت تھا اور دکن کا دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس زمانہ میں ناگ پور کی چیف کمشنری میں ضلع نماڑ کے متعلق ایک تحصیل کا مقام ہے۔ یہ دریائے تاپتی کے کنارے آباد ہے اور قریب تیس ہزار آدمی کے اس میں رہتے ہیں۔ (س م ح)

(۴۹) یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ اس واقعہ سے چھبیس ستائیس برس پہلے ۱۰۴۲ ہجری میں شاہ جہاں کے سرداروں نے پُرسیکروں پر مقام ہوگلی سرنگ ہی اڑا کر فتح پائی تھی جس کا حال ہم آئندہ ایک اور مقام پر کتاب بادشاہ نامہ سے نقل کریں گے۔ (س م ح)

(۵۰) فارسی زبان کی تاریخوں میں لکھا ہے کہ شاہ جہاں کی بیماری کے شروع سے ایک برس بعد یکم جمادی الاول ۱۰۶۸ ہجری میں اورنگ زیب نے باپ کی عیادت کے بہانہ سے دولت آباد سے بُرہان پور کی طرف کوچ کیا تھا اور مراد بخش کو ساتھ لینے کی نسبت یہ حیلہ بنایا تھا کہ سکہ اور خطبہ وغیرہ جاری کرنے کی بے ادبی جو اس سے ہو گئی ہے اس لئے اس کو خطا معاف کرانے کی خاطر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں اور یہ دونوں شہزادے بمقام تالاب دیال پور اُجین سے تقریباً دس فرسنگ کے فاصلہ پر ملاقی ہوئے تھے۔ (س م ح)

(۵۱) راجہ جے سنگھ کچھواہا رئیس جے پور سے مراد ہے جس کو لفظ راجہ کے علاوہ شاہی خاندان کے شہزادوں کی طرح میرزا کا معزز خطاب بھی ملا ہوا تھا۔ واضح ہو کہ جے پور کی ریاست ہمارے اس زمانہ میں بھی کچھواہا قوم ہی کے راجپوت خاندان میں قائم ہے اور خالص آمدنی اس ریاست کی سوائے جاگیروں اور معافیات کے سینتالیس لاکھ سے کچھ زیادہ ہے اور چھبیس ہزار دو سو باون میل مربع رقبہ ہے جس میں تقریباً بیس لاکھ آدمی بستے ہیں۔
(س م ح)

(۵۲) فارسی زبان کی تاریخوں میں جے سنگھ کے ساتھ دوسرے امیر کا نام بہادر خاں لکھا ہے اور دیر خاں تو صریح غلط ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلیر خاں کی جگہ غلطی سے دیر خاں چھپ گیا ہے کیونکہ انگریزی میں حرف لام اور بے کی شکل قریب قریب ہے۔ میرزا محمد کاظم مصنف عالمگیر نامہ لکھتا ہے کہ باقی بیگ المخاطب بہ بہادر خاں جو دارا شکوہ کے عمدہ نوکروں میں سے تھا اس کو اس مہم میں دارا شکوہ نے سلیمان شکوہ کے ساتھ بطور اتالیق کے بھیجا تھا اور اپنی کل فوج کی سرداری بھی اسی کے حوالہ کی تھی اور اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ دلیر خاں بھی ایک امیر منجملہ ان نامور امرا کے تھا جو اس مہم میں سلیمان شکوہ کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔ (س م ح)

(۵۳) عالمگیر نامہ میں اس واقعہ کو یوں لکھا ہے اور اس وقت کی اور کتابوں سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ سلیمان شکوہ اور راجہ جے سنگھ کچھواہا جو شجاع کے مقابلہ کو چوتھی ربیع الاول ۱۰۶۸ ہجری کو آگرہ سے روانہ ہوئے تھے انہوں نے کوچ بکوچ بہادر پور میں پہنچ کر جو بنارس سے ڈھائی کوس آگے گنگا کے کنارہ پر ایک گاؤں ہے شجاع کے لشکر سے ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر ڈیرہ کیا تھا جو بنگالہ کے نواڑے یعنی کشتیوں کے بیڑہ کو ساتھ لئے ہوئے دریا کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا اور فوج کو ذرا آرام دے لینے کے بعد دھوکا دینے کی غرض سے یہ مشہور کر کے کہ لشکر کی جائے قیام بدلنا چاہتے ہیں اکیسویں جمادی الاول کو علی الصباح شجاع کے لشکر پر ناگہاں حملہ کر دیا اور چونکہ اس نے غفلت کے سبب سے اپنی فوج کی صف بندی بھی نہ کی تھی خفیف سے مقابلہ کے بعد لڑائی ہار گیا اور نواڑے میں بیٹھ کر پیچھے کو بھاگا اور تمام مال و اسباب لٹ گیا اور اس کے بعد سلیمان شکوہ نے اول پٹنہ اور پھر مونگیر سے نکال دیا اور وہ مجبور ہو کر اپنے اصلی صوبہ یعنی بنگالہ کو چلا گیا۔ اور مونگیر سے پٹنہ تک دارا شکوہ کا قبضہ ہو گیا۔ لکھا ہے کہ ان لڑائیوں میں شجاع کے نوکروں میں سے جو

لوگ قید ہو گئے تھے دارا شکوہ نے ان کو آگرہ میں منگوا کر اوّل تشہیر وغیرہ سے بے عزت کیا اور پھر ان کے ہاتھ قلم کرا دیئے جس کے باعث سے کتنے ہی بے چارے اپنی جانوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ (س م ح)

(۵۴) اس دریا سے شپرا ندی مراد ہے جس کا اصل سنسکرت زبان کا نام کھشپرا ہے۔

(۵۵) اودے پور کا رانا مُراد ہے۔

(۵۶) مصنف نے دریا کا نام نہیں لکھا مگر مترجم انگریزی نے حاشیہ میں نربدا لکھ دیا ہے جو صریح غلط ہے کیونکہ اُجین کے پاس تو وہی شپرا ندی ہے جس کا ذکر ہم ابھی ایک حاشیہ میں کر چکے ہیں۔ (س م ح)

(۵۷) خافی خاں کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ (س م ح)

(۵۸) ہندوستانی مؤرخوں نے ان واقعات کو یوں بیان کیا ہے کہ جب مُراد بخش کے بادشاہ بن بیٹھنے کی خبر آگرہ میں پہنچی تو اس کو گجرات کی صوبہ داری سے معزول کئے جانے اور ملک بُرار میں جو پہلے سے اورنگ زیب کی جاگیر میں تھا (غالباً دونوں کے لڑانے کی خاطر) جاگیر لے کر صرف اس پر قناعت کرنے کا حکم دارا شکوہ نے بادشاہ سے دلوا دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی قاسم خاں میر آتش اس کی جگہ گجرات کی صوبہ داری پر نامزد کیا گیا تھا اور چونکہ مالوہ کا صوبہ دار شائستہ خاں (وہی جوان چاروں شہزادوں کا حقیقی ماموں تھا) اورنگ زیب کے ساتھ زیادہ موافقت رکھتا تھا اس کا بھی اُجین میں دکن کے راستہ پر رہنا مناسب نہ جان کر اس کی جگہ اپنے دلی خیر خواہ مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور جودھپور والہ کو اس مراد سے بھجوا دیا تھا کہ اورنگ زیب جو اس وقت تک بظاہر خاموش تھا اگر وہ بھی جیسے کہ دارا شکوہ کو اس سے توقع تھی کچھ حرکت کرے تو راجہ قاسم خاں کی مدد سے اس کا سدِ راہ ہو۔ اور اگر بدستور خاموش رہے تو قاسم خاں مراد بخش کو گجرات سے بُرار کی طرف نکال دے اور جسونت سنگھ بشرطِ ضرورت اس کی مدد کرے۔ چنانچہ ان دونوں کو اب تک یہی خبر تھی کہ مراد بخش گجرات سے مالوہ کے راستہ آگرہ کی طرف بڑھا آ رہا ہے اور اس خیال میں اُجین سے بان برلہ کے راستہ روانہ ہو کر بمقام کاچرودہ بزعم خود اس کا راستہ روکے پڑے تھے۔ اور اگرچہ اورنگ زیب خاندیس کے دارالحکومت بُرہان پور سے بھی چل کر اور اکبر پور کے گھاٹ نربدا سے پایاب اتر کر مالوہ میں داخل ہو گیا اور دیالپور کے قریب مراد بخش بھی اس سے آملا مگر راستوں اور گھاٹوں کو جو اس نے نہایت ہوشیاری سے روک رکھا تھا اس

لئے ان کو مطلقاً اس کے ایسے نزدیک پہنچ جانے کی خبر تک نہ ہوئی بلکہ اس نے بادشاہی سپاہ کی کثرت کے اندیشہ سے جو مراد بخش کو یہ لکھ بھیجا تھا کہ میرے آنے تک جلدی کر کے ان سے بھڑ نہ جانا اور وہ اس وجہ سے کاچرودہ سے صرف اٹھارہ کوس کے فاصلہ پر پہنچ جانے کے بعد پیچھے کو ہٹ کر دیال پور کی طرف چلا گیا تھا تو انہوں نے اپنے خیال میں اس کو اس کے بھاگ جانے پر محمول کر کے بادشاہ کو مبارک باد کی عرضی کر دی تھی اور بادشاہ بھی کسی قدر مطمئن ہو کر اٹھارہویں رجب سنہ ایک ہزار اڑسٹھ ہجری کو مع داراشکوہ تبدیل آب و ہوا اور آگرہ کی گرمی سے بچنے کے لئے اپنے طبیبوں کی صلاح کے موافق (مگر داراشکوہ کی مرضی کے برخلاف) دہلی کو چلا گیا تھا مگر جب یہ دونوں لشکر آن کر باہم مل گئے اور راجہ شیورام گوڑ نے جو قلعہ مانڈو میں تھا اور داراشکوہ کے ان نوکروں نے جو دھار کے قلعہ سے اورنگ زیب کے نزدیک آ پہنچنے سے خوف زدہ ہو کر مہاراجہ کے لشکر میں بھاگ آئے تھے جسونت سنگھ کو اطلاع دی تو اس وقت اس کی آنکھیں کھلیں اور کاچرودہ سے پیچھے ہٹ کر دھرمات پور کے متصل جو اُجین سے سات کوس کے قریب ہے اورنگ زیب کے لشکر سے ایک کوس کے فاصلہ پر اس کا راستہ آروکا۔ اب چونکہ اورنگ زیب کا اصل مقصود یہ تھا کہ اگر ہو سکے تو راجہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لے۔ اور پیغام سلام کے حیلہ سے اپنے تھکے ماندے لشکر کو ذرا آرام دے لے۔ اس لئے کب رائے کو جو ایک ہوشیار اور فہیم برہمن تھا اس کے پاس بھیج کر پیغام سلام شروع کئے اور وہی معمولی حیلہ کہ "ہم بادشاہ کی خدمت میں صرف عیادت اور حصول ملازمت کی خاطر جاتے ہیں" اور ظاہر کیا کہ اول تو مناسب یہ ہے کہ تمام ہمارے پاس حاضر ہو جاؤ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو راستہ چھوڑ کر اپنے وطن جودھپور کو چلے جاؤ"۔ مگر جب راجہ نے کوئی بات بھی نہ مانی اور لشکر نے بھی ذرا دم لے لیا تو بائیسویں رجب ۱۰۶۸ ہجری مطابق اپریل ۱۶۵۶ء کو لڑائی کے قصد سے چڑھ آیا اور سخت لڑائی ہوئی۔ جس میں اس شمار کے موافق جو اورنگ زیب نے فتح کے بعد کرایا تھا قریب چھ ہزار کے سپاہی جو زیادہ تر راجپوت ہی تھے، کام آئے اور بہت سے بڑے بڑے نامی راجپوت سردار مارے گئے اور جسونت سنگھ خود بھی زخمی ہوا بلکہ لکھا ہے کہ کچھ خفیف زخم قاسم خاں کے بھی آیا مگر ان مؤرخوں نے باوجود راجپوتوں کی بہادری کی تعریف و توصیف کرنے کے اس شکست کو زیادہ تر راجہ کی سوئے تدبیری اور ناواقفیت فن جنگ سے منسوب کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس نے اپنے لشکر کو ایسی اونچی نیچی جگہ میں قائم کیا تھا اور ندی سے کچھ پانی

کاٹ کر لشکر کے اردگرد کیچڑ کر دی تھی جس سے اس کی سوار فوج لڑائی کے وقت اچھی طرح کام نہ دے سکی۔

خافی خاں نے اس لڑائی کا ہونا شیپرا نامی ندی کے کنارے بیان کیا ہے اور جغرافیہ کے نقشوں میں بھی اس ندی کا نام شیپرا ہی لکھا ہے مگر عالمگیر کے خاص مؤرخ میرزا محمد کاظم نے عالمگیر نامہ میں اس کا نام نالہ "چورنرائنا" لکھا ہے۔ (س م ح)

(۵۹) فارسی تاریخوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باوجودیکہ داراشکوہ میر جملہ کا سخت مخالف تھا مگر شاہ جہاں کو اس کے حال پر توجہ تھی۔ چنانچہ پیچھے لکھا جا چکا ہے کہ شاہ جہاں کے شروع مرض کے دنوں میں جب داراشکوہ نے مہابت خاں اور راؤستر سال وغیرہ امرا کو بیجاپور کی مہم سے آگرہ میں واپس بلایا تو میر جملہ کو بھی اورنگ زیب کے ساتھ سازش رکھنے کے شبہ میں عہدۂ وزارت سے معزول کرا کر دکن سے طلب کیا تھا اور اس کے بیٹے محمد امین خاں کو بھی ممانعت کر دی تھی کہ باپ کی جگہ کام نہ کرے اور اوّل رائے رایان راجہ رگھناتھ قائم مقام وزیر مقرر ہو کر بعد ازاں جعفر خاں مستقل وزیر مقرر ہو گیا تھا۔ مگر شاہ جہاں نے پھر بھی محمد امین خاں کو دانشمند خاں کی جگہ، جس نے میر بخشی کے نہایت بڑے عہدہ سے انہی دنوں استعفیٰ دے دیا تھا، مقرر کر دیا تھا اور جب جسونت سنگھ کی شکست کی خبر اس کو پہنچی تو محمد امین خاں کو اپنے مکان پر بلا کر قید کر لیا اور اگرچہ دو چار روز کے بعد شاہ جہاں کے سمجھانے سے قید سے چھوڑ دیا مگر بخشی کے عہدہ پر نہ رہنے دیا۔ چنانچہ داراشکوہ اور اورنگ زیب کی لڑائی کے وقت بادشاہی فوج کا میر بخشی عمدۃ الملک خلیل اللہ خاں تھا۔ (س م ح)

(۶۰) انگریزی میں زبدا ہی لکھا ہے مگر یہ مترجم کی غلطی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ آئے ہیں۔ (س م ح)

(۶۱) عاقل خاں لکھتا ہے کہ "قریب صد ہزار سوار کرار از اُمرائے نامدار و دیگر بندہائے سرکار عالم مدار و ملازمان سرکار خویش فراہم اوردہ"۔ (س م ح)

(۶۲) عاقل خاں لکھتا ہے کہ چونکہ داراشکوہ کو ناتجربہ کاری کی وجہ سے لڑائی بھڑائی کے کام کی بالکل لیاقت نہ تھی اور اس کی اکثر تدبیریں نامناسب اور خلاف عقل ہوتی تھیں اس لئے اس خاندان کے خیر خواہوں نے ہر چند عرض کیا کہ یہ آگ جو بھڑکی ہے آب تدبیر کے بغیر بجھنی مشکل ہے اور حضرت (بادشاہ) کو ایک فریق بنانا مناسب نہیں۔

اورنگ زیب اور مراد بخش کو آنے دینا چاہئے اور جب حضرت کے ارشاد سے بادشاہی اُمرا ان سے علیحدہ ہو جائیں گے تو ان میں خود ہی مقابلہ کی طاقت نہ رہے گی اور جو کچھ حضور فرمائیں گے اورنگ زیب کو اس کی مخالفت ناممکن ہو گی۔ مگر جب تک بادشاہی اُمرا ان کی رفاقت میں ہیں کوئی تدبیر پیش نہیں جا سکتی۔ چنانچہ بادشاہ نے بھی اس رائے کو نہایت پسند کیا۔ مگر داراشکوہ نے راؤ ستر سال اور رام سنگھ کے اغوا سے منظور نہ کیا بلکہ نفاق پر محمول کر کے علانیہ کہہ اٹھا کہ "من عنقریب ایں کوتہ پلچہ ہارا (یعنی شرعی پائچوں والے مسلمان امیروں کو) در جلیب (اردلی) ستر سال خواہم دوانید" اور اس بات کے سننے سے سب امرا، کیا تورانی اور کیا ایرانی، بیدل ہو کر در پردہ طرفِ ثانی کے جانب دار ہو گئے۔ (س م ح)

(۶۳) داراشکوہ نے اگرچہ اس دریا کے معروف گھاٹ سبھی روک لئے تھے مگر دھولپور کے گھاٹ کو جہاں سے گوالیار اور دکن کا عام راستہ ہے خصوصیت کے ساتھ روکا تھا۔ یہ مقام اس زمانہ میں خاص بادشاہی عملداری میں تھا مگر ہمارے اس وقت میں بمرولیا گوت کے جاٹ قوم کے ان رئیسوں کا دارالحکومت ہے جو بزمانہ سابق گوہد کے رانا کہلاتے تھے اور گوالیار بھی انہی کی عملداری میں تھا۔ مگر مرہٹوں کے زور کے زمانہ میں وہ ریاست ان کے ہاتھ سے نکل گئی اور اس کے عوض سرکار انگریزی کی اعانت سے دھولپور کی نئی ریاست قائم ہو گئی جس کا رقبہ ایک سو ساٹھ میل مربع اور آبادی قریب دو لاکھ اور آمدنی دس اور گیارہ لاکھ کے اندر ہے۔ نوجوان رئیس حال مہاراج رانا نہال سنگھ صاحب بہادر عالی شان خاندان پٹیالہ کے نواسہ ہیں اور یہ باختیار ریاست ہے اور گورنمنٹ قیصریہ کی طرف سے رئیس کے لئے پندرہ توپ کی سلامی مقرر ہے۔ (س م ح)

(۶۴) چونکہ شہزادگی کے زمانہ میں اورنگ زیب ریاکاری سے اپنی نسبت اکثر فقیر کا لفظ استعمال کیا کرتا تھا اس لئے مصنف کہیں کہیں طنزاً اس لفظ کا اعادہ کرتا ہے۔ (س م ح)

(۶۵) یہ بھداور کا راجہ تھا جو باشندوں کی قوم کے نام کی مناسبت سے آگرہ کے قریب چنبل کے دونوں طرف کے اس قطعہء ملک کو کہتے ہیں جس میں بھدوریہ گوت کے راجپوتوں کی آبادی ہے۔ اورنگ زیب چنبل کے جس گھاٹ سے پایاب اترا تھا باوجود کوشش کے اس کا پتہ نہیں لگ سکا مگر عاقل خاں کی تاریخ اور عالمگیر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بھداور کے راجہ نے نواح گوالیار میں حاضر ہو کر اس خدمت کے بجالانے کا ذمہ کرایا تھا اور اورنگ زیب نے کارخانہ جاتِ شاہی کو کواری کی سرائے میں چھوڑ کر اس ملک کے پچیس کوس کی

مسافت کو دو منزلوں میں طے کر کے ماہ رمضان کی پہلی تاریخ ۱۰۶۸ھ ہجری کو ایک غیر مشہور گھاٹ سے جو گوالیار سے دھولپور کی طرف آتے ہوئے داہنے ہاتھ تھا عبور کیا تھا۔

(س م ح)

(۶۶) اس موقع پر بیگم صاحب نے جو خط اورنگ زیب کو لکھا تھا (جس کو خود شاہ جہاں کی طرف سے سمجھنا چاہئے اور اس کے جواب میں جو عریضہ اس نے باپ کی خدمت میں بھیجا تھا وہ دلچسپ سمجھ کر تاریخ عاقل خاں سے یہاں نقل کئے جاتے ہیں "للہ الحمد والمنت کہ ذاتِ مقدس شاہنشاہِ معدلت پژوہ دقیقہ رس اعلیٰ حضرت ظلِ سبحانی منظور انظار عنایات ربانی صاحبقران ثانی از سایر عوارض و امراض جسمانی کہ لازمہ نشاء بشریت و طبیعت انسانی است منزہ و مبراست و توجہ عالم آرا در بابِ رفاہیت برایا کہ ودایع بدایع الہی اند وامنیت ملک بہ وجہ اتم مبذول و بہ مقتضائے طبع نصفت آگین اشرف ہیچ معنے را نمی پسندند کہ مصدر حرکتے و مظہر امرے کہ مستلزم بے جمیعتی خلائق و متضمن ضرر وضیر طوائف انام باشد گردد خاصۂ از فرزندان نامدار وابنائے کامگار سیما دریں ایام کہ خاطر مقدس بتدارک و تلافی دہن وفتورے کہ بسبب بیماری آں برگزیدۂ انفس و آفاق حال کافۂ برایا و عامۂ رعایا راہ یافتہ باقصی غایت متوجہ و متعلق است التہاب نوایر فتنہ و فساد اشتعال آتشِ کین و عناد کہ مورثِ ویرانیٔ بلاد و خرابیٔ عباد است معاذ اللہ موجب مزید آزار خاطر ہمایوں و سببِ کثرتِ حزن و ملالِ طبعِ مقدس خواہد بود بہ تخصیص ظہور ایں نشاءٔ ناپسندیدہ و وقوع ایں امرِ نامرغوب از آں برادر ہوش مند بیدار مغز کہ آراستہ بمزایائے لطیفہ و اخلاقِ کریمہ و صاحبِ آدابِ حمیدہ و طبعِ سلیمہ است بغایت زشت و نازیبا۔ لاجرم بنا بر خیر طلبی ایں چند کلمہ کہ ہر آئینہ متضمن فوائدِ عظیمہ و موجب تنزیہ و تقدیس ساحت باطن و تصفیہ طریق معاد از خس و خاشاک امورِ ردیۂ و شیون ذمیمہ است حسن نگارش پذیرفت اگر غرض آں برادر والا گہر ازیں توجہ تہیج غبار فساد و عناد و التہاب نوایر حرب و قتال است خود انصاف فرمایند کہ در برابر مرشد و قبلۂ حقیقی کہ رضائے او موجبِ خوشنودیٔ خدائے عز و جل و رضامندیٔ رسول اوست۔ ہنگامہ جنگ و جدال و حرب و قتال آراستن و بر سفک دمائے بے گناہاں ہمت گماشتن و بر روئے آنحضرت تیر و تفنگ انداختن چہ مایۂ ناشایان است و ثمرہ آں دریں نشاءٔ جز بدنامی و در آں نشاءٔ غیر بدسرانجامی نیست و اگر آرائش ہنگامہ مخاصمہ و مقاتلہ از بہر شاہِ بلند اقبال (دارا شکوہ) است نیز در آئینِ دین و خرد صواب گزین

پسندیدہ نباشد زیراکہ برادر بزرگ شرعاً و عرفاً حکم پدر دارد واین معنی را بامرضیات خاطر مقدسِ حضرت ظل الٰہی ومبتغیات طبع والائے شہنشاہی مباینت تامہ متحقق است۔ بالجملہ انبعاث غبار بے جا و ایقاد نوایر دغا و ترتیب اسباب رزم وخونریزی و تصمیم عزیمت حرب و فتنہ انگیزی ازاں برادر ہوشمند والا گہر کہ محامد اوضاع ومحاسن اطوار، مکارم اخلاق موصوف ومعروف جہاں گشتہ پیوستہ دراسترضائے خاطر اقدس خاقان نجستہ منظر وشاہنشاہِ فرشتہ سیر میکوشندہ بہیچ وجہ وباہیچ کس پسندیدہ نیست چہ توقف چند روزہ دریں دار بے ثبات وقرار ومستلذات ابلہ فریب ایں سرائے مستعار کہ باعث ارتکاب چنیں امر مذموم وناپسندیدہ باشد موجب ملالت نشاء ابد وطراز سآمت سرائے مخلد است۔ع مکن مکن کہ نکو گوہراں چنیں نکنند۔ مناسب آنست کہ آں برادر نامدار ازیں امور ردیہ وافعال شنیعہ کہ منتج سوئے خاتمت ومثمر وخامت عاقبت ست اجتناب لازم شمردہ دراسترضائے خاطر قدسی مناظر شاہنشاہِ دیں پرور و خاقان معدلت گستر تا ممکن و مقدور سعی نماید و خوشنودی آنحضرت رااز موجبات حصول سعادتِ دارین فراگرفتہ ازاراقت دم متابعان حضرت خاتم النبیین درماہِ مبارک رمضان محترز باشد واحکام مرشد و ولی نعمت و والی سلطنت راجان و دل امتثال نماید کہ فی الحقیقت بمقتضائے " اولی الامر منکم" امتثال امر شاہنشاہِ حقیقی است، قدم در راہِ خلاف خلیفہ الٰہی سپردن مخالفتِ فرمان مالک الملک نمودن است و اگر مطلبے، غرضے غیر ازیں مرکوزِ خاطر عزیز بودہ باشد۔ پس پسندیدۂ عالم خرد آنست کہ در سرزمینے کہ مضرب خیام شدہ باشد توقف اختیار نمودہ ہر مطلبے کہ ملحوظ خاطر گرامی است مرقوم گرداند تا بعرض اقدس وارفع رسانیدہ مطابق ابتغائے خاطر عزیز وتمنائے طبع گرامی سرانجام دادہ آید و دراسعاف وانجاح مقاصد ومآرب آن قرۂ باصرہ سلطنت وجہانبانی سعی واجتہاد وافی بہ تقدیم رسانیدہ شود"۔

اورنگ زیب نے کسی مصلحت سے بہن کو تو اس کا جواب نہ لکھا مگر خود باپ کے نام مندرجہ ذیل عرضی بیگم صاحب کے منشی محمد فاروق کو جو یہ خط لایا تھا، دے دی اور آگرہ کی جانب کوچ کر دیا۔

"دریں ایام زمام مہام سلطنت ودارائی وعنان امور ملکی و مالی از قبضہ اختیار حضرت بیروں رفتہ و اعلام تغلب واقتدار شہزادہ کلاں (داراشکوہ) در قبض وبسط امور سلطنت وفرماں دہی بغایتے ارتفاع پذیرفتہ کہ اندازۂ آن حوصلہ تقریر وتحریر نمی آید و او بنا

بر قدرت و مکنت خویش ہمت باستیصال نہال وجود اخواں مقصور گردانیدہ روز بروز سعی و اجتہادش دریں باب ست تزاید مے پزیرد۔ چنانچہ سلیماں شکوہ را بافواج گران بر سر شاہ شجاع کہ پسر رشید آں حضرت است تعین کردہ ناموس و نام سی‌ و دو سالہ (کیونکہ یہ واقعہ شاہ جہاں کے بتیسویں سال جلوس میں ہوا تھا) بباد فنا دادہ و آنجناب (شاہ شجاع) چہ مایۂ مذلت و خفت از نواسہ پرویز (شاہ جہاں کے ایک سوتیلے بھائی کا نام تھا جس کی بیٹی سلیمان شکوہ کی ماں تھی) کشیدہ در پیش اہلِ جہاں شرمسار و خجل گردیدہ و ہمچنیں بہوائے نفس و خواہش طبع خویش بنائے کار بر آں نہادہ پیوستہ در تنقیص تضئیق احوال و تضیع و تخریب مہام ایں نیاز مند بذل جہد مینماید و ہمیشہ کارہائے میاین دین و ملت کہ مستلزم فساد امور بلاد عباد باشد از و بظہور میرسد و ابواب منافع و مداخل برروئے روزگار ایں خیر خواہ مسدود گردانیدہ انواع مقصت و اقسام مضرت رسانیدہ در لیامے کہ حسب الاشارۂ اقدس بر ولایت بیجاپور لشکر کشیدہ بہ تسخیر بعضے از قلاع آں ولایت مے پرداخت و امرا و سپاہ بہ محاصرہ اشتغال درزیدہ داد جانفشانی میدادند و مخالفان از اطراف و جوانب ہجوم آوردہ در صدد ممانعت و مدافعت بودند و اخبارِ موحشہ بیماری ذاتِ مقدس شیوع یافتہ باعثِ تحیر و تفکر اولیاء و خیرگی و شوخی اعدا شدہ بود و محصوران گلبرگہ کہ جانبازان موکب اقبال بعد از تسخیر قلعہ بیدر و کلیانی محاصرۂ بلدۂ مذکور پرداختہ بودند در مضیق محاصرہ دلتنگ تر از غنچہ شدہ کار بداں قریب گشتہ بود کہ صورت افتتاح رونماید و مسند آرائے بیجاپور از ترکتاز بہادراں اقلیم ستاں بستوہ آمدہ در فکر آں فرو افتادہ بود کہ پیشکشے لایق سرانجام دادہ ولایتِ خود را از صدمہ سپاہ فیروزی دستگاہ مصوؔن گرداند و الا عزم آں داشت کہ دلاوران موکب اقبال او را عنقریب مستاصل ساختہ ولایتش راضمیمہ ممالک محروسہ گردانند در خلال ایں حال شہزادہ کلاں ملازمان خود را بطلب امرائے بادشاہی و تسلی و استمالت حاکم بیجاپور تعین نمود۔ آں ہا پیغامہائے عنایت آمیز و مہربانی انگیز بہ والی بیجاپور رسانیدہ او را در وادی لجاج و عناد نسبت بایں مرید دلیر تر ساختند و سرداران بادشاہی را بمبالغہ و اہتمام تمام از پیرامون بلدہ گلبرگہ کہ کارش نزدیک بگشایش رسیدہ بود برداشتہ در رواں کردن و بر دن آنہا بداں غایت مراتب تاکید و اجتہاد بطور رسانیدند کہ فرصت رخصت و مجال وداع نیافتہ و ایں خیر خواہ را ندیدہ برجناح استعجال عازم درگاہ جہاں پناہ شدند ازیں جہت قافیۂ وقت بریں نیاز مند بغایت تنگ گشتہ بورطۂ تحیر و تفکر درافتاد و بحکم ضرورت کار صورت

یافتہ و بانجام رسیدہ را برہم زدہ محض بہ نیروے اقبال بے زوال خود ازاں سیہ چال خطر برآوردہ و بہزاراں جر ثقیل و اصابۂ تدابیر از میان انبوہِ غنیم برآمدہ سالماً بمامنے رسید۔ عیاذاً باللہ اگر چشم زخمے مے رسید در اکناف و اطراف جہاں شہرت یافتہ لکہ بدنامی و خال خفت و مذلت سالہائے دراز بروئے دولت پائیدار مے ماند و بر جرائد روزگار ثبت مے گردید۔ پیداست کہ تدارک و تلافی آن بواسطہ عدم دور بینی و ناعاقبت اندیشی شہزادۂ کلاں کہ محض روائی کار خویش مطمح نظر داشتہ اگر عالمے را آب فرو بردِ غمے ندارد از دائرہ امکان و حیز قدرت بندہائے بادشاہی بیروں بود۔ ایں مرید از بس ممارست در امر جانبازی و مہارت در کار نبرد و پیکار و آشنائی باشیوہ ستیزہ وراں ایں دیار از ہجوم و ازدحام اعدا حسابی نگرفتہ بہ چقماقِ جلاوت فرق مخالفان کوفتہ بااستظہار اقبال لشکر را ازاں گرداب شورش و فساد در ضمان سلامت بیروں آورد و غریب تر آنکہ بایں بے مددی و خسارت و کار شکنی و خصومت کہ در ایران و توران اشتہار پذیرفتہ اکتفا نکردہ محال بڑار را (یعنی برار جو فی زمانِنا ریاست حیدر آباد دکن کا ایک جزو مگر گورنمنٹ انگریزی کے زیر انتظام ہے) بے سابقہ تقصیر و کوتاہی از جاگیر ایں خیر خواہ رضا طلب کہ جز ارادت و اعتقاد امرے دیگر را بخاطر راہ نداوہ تغیر کردہ بآنچناں ناخلفی زیادہ سرے (مراد بخش) کہ پا از حد بیروں نہادہ مرتکبِ انواعِ گستاخی و مصدرِ تقصیراتِ عظیم گشت و لوائے بے اعتدالی و افساد در عرصہ بغی و عناد برافراشتہ تنخواہ نمود و کیفیتِ حال داعی را بواسطۂ خواہش نفس خویش خلاف واقع بعرض اشرف رسانیدہ بہ محض بہتان و افترا اذیال حال ایں خیر اندیش را غبار آلود جرائم و لوث آمود ذمائم وانمود و بالحاح تمام جسونت سنگھ را بالشکر گراں بر سر ایں داعی گماشت و مطمح نظر انداشت کہ دریں ضمن ولایتِ مختصر (یعنی صوبہ داری دکن) کہ از پیشگاہ عاطفت و اشفاق حضرت بایں مرید مرحمت شدہ بہر بہانہ کہ میسر آید انتزاع نماید و ایں فدوی را آوارہ فیافی بیکسی و غربت و آسیمہ رِ صحرائے محن و غربت گرداند و بسعہ از راہ دمدمہ دوستاں در مزاج اقدس تصرف کردہ حضرت قول اُورا تصدیق فرمودہ سائر فرزنداں اخلاص طینت را دشمن دولت فرا گرفتہ در حق ایں سرگردانان سراب گاہِ حیرت ہرچہ او تجویز مے نماید بے تامل حکم مے فرمایند و قطعاً تفحص و تفتیشِ حال ایں بے گناہان توجہ و غور در امور ملکی و مالی نفرمودہ زمام رتق و فتق مہام جزئی و کلی بکف اختیار و قبضہ اقتدار ش باز گزاشتہ اند و او خود بے غائلہ شک و شائبہ ریب تشنہ خون ایں بے گناہان ست۔ چوں کار بایں حد رسیدہ و صورتِ حال

بدیں منوال انجامیدہ حفظ جان و پاس ناموس خود از متحتمات عالم عقل و متحتماانشاء خرد دانستہ عازم استلام سدہ سدرہ منزلت سپہر احتشام گردید تا صورت حال بہ ج و براہین معقولہ در خدمت عاکفان پایہ اورنگ جہانبانی مکشوف گرداند۔ فرد

عدل سلطاں گر نپرسد حالِ مظلومانِ عشق
گوشہ گیراں را ز آسائش طمع باید برید

چوں ایں خیر خواہ قطع مسافت نمودہ بحوالی اُجین فایز گردید جسونت سنگھ باشارہ شہزادۂ کلاں بایذا و آزار ایں خیر خواہ مامور بود بہ سلسلہ جنبانی جہل و نادانی سنگ راہ گشتہ بہ قدم ممانعت پیش آمد و بے ملاحظہ آداب و حقوق دلیرانہ تحکم نمود چندانکہ مردم ہوشمند سخنداں فرستادہ بعنوان معقول آن جہول را بارادہ خود آگاہی بخشید و تصریح نمود کہ محرز سعادت حضور فایض النور و محرم طواف کعبہ آمانی و امال بندگان نزدیک و دور ست چرا مانع سعادت میشود۔ آن ناعاقبت اندیش اصلاً معقولیت آشنا نشدہ بہ تکلیف جہالت و غرور بیشتر در مراسب منع افزود لاجرم پنبہ جہل و پندار پوچ از گوشِ ہوش او دور کردن و آن ظلوم جہول راز پیش راہ برداشتن بحکم ضرورت بر ذمۂ ہمت عقیدت نہ ہمت واجب گردید و اگر غیر از تحصیل سعادت زمیں بوس اشرف و اعلیٰ امرے دیگر مرکوز خاطر ے بود بر ضمیر خورشید تنویر ہمایوں روشن و ہویداست کہ اسیر کردن او و رفقائش کہ چنیں شکستِ فاش یافتہ بحال منکر سراسیمہ گرداوی انہزام گشتہ بودند چنداں تعذرے نداشت واکنوں کہ شہزادۂ کلاں خود باسپاہ گراں تا دھولپور تشریف آوردہ معابر چنبل و مسالک راہ مسدود ساختہ و جابجا مردم خود گماشتہ باعتقاد خویش! راہ عبور بریں خیر اندیش بستہ بودند۔ چوں ایں مرید را غیر از ادراک دولت حضور پر نور باہیچ کس سر مقابلہ و پیکار نبود و نیست۔ از راہ بھدا ور از آب چنبل عبور نمودہ عازم زمیں بوس اقدس گشت و چنیں شنیدہ میشود کہ آنجناب! (دارا شکوہ) حرمان ایں ارادت سرشت اخلاص کیش از سعادت خاک بوس ہمایوں خواستہ قصد اشتعال نائرہ قتال پیش نہاد ہمت دارند۔ چوں آنجناب را باچوں من مریدِ ارادت پرست بمقابلہ و ممانعت پیش آمدن و ہنگامۂ حرب و مصاف آراستن عقلاً و نقلاً سنجیدۂ میزان استحسان نیست لازم کہ از سلوک مسلک عناد و اعتساف انحراف نمودہ از اقدام بر امرے کہ منتج اختلال احوال خلایق باشد اجتناب واحتراز نمایند و اگر بنا بر توغل در لجہ غرور استکبار و نظر بر کثرتِ اعوان و بسیاریٔ انصار خواہ مخواہ بافروختن آتشِ کارزار و گرم نمودن بازارِ پیکار ہمت گمارند۔ فدوی عقیدت گزین

نیز بحکم الضرورت المحظورات صرفہ نخواہد کرد پسندیدہ عالم صواب آنست کہ بزرگی را کار فرمودہ بساط کرو فر در توردند و بالفعل بہ صوب ولایت پنجاب کہ در جاگیر آنجناب مقرر است شتافتہ چندے خدمتِ حضور ہمایوں را بایں خیر خواہ سراپا اعتقاد واگزارند بعد ازاں ہرچہ در مرآت رائے جہاں آرا جلوۂ ظہور فرماید شرف بروز خواہد یافت"۔ (س م ح)

(٦٧) شاہ جہاں نے جو حتی الامکان لڑائی کو روکنا چاہتا تھا باوجود ضعف و نقاہت اور سخت گرمی کے موسم کے یہ چاہا تھا کہ خود جاکر دونوں لشکروں کے مابین اتر پڑے۔ یہاں تک کہ پیش خیمہ بھی بھیج دیا تھا اور بیماری و کمزوری کی وجہ سے بسواری کشتی موقع فساد پر پہنچنا چاہا تھا مگر اس وقت کے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ دارا شکوہ نے اس تجویز کو اپنے مدعا کے برخلاف سمجھ کر عمل میں نہ آنے دیا۔ (س م ح)

(٦٨) ہندوستان کے بہادر سردار کڑے وقت میں بھاگنے کی بہ نسبت جان دے دینے کو بہتر سمجھ کر ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ (س م ح)

(٦٩) رام سنگھ کا مراد بخش پر حملہ کرنا اور مراد بخش کے تیر سے اس کا مارا جانا تو صحیح ہے مگر اس کے ہاتھی کے چھار بند کو کاٹنے کے لئے کوشش کرنا درست نہیں کیونکہ فارسی تاریخوں سے بالاتفاق ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دلیرانہ حملہ خود اورنگ زیب کے ہاتھی پر ہوا تھا اور جس نے یہ حملہ کیا تھا وہ مہاراجہ جسونت سنگھ جودھپوریہ کا چچیرا بھائی راجہ روپ سنگھ راٹھور تھا جو اورنگ زیب کے منع کرتے کرتے جو اس کی اس بے مثل بہادری کی وجہ سے اس کو بچانا چاہتا تھا، لڑائی کے ہڑبونگ میں اورنگ زیب کے سپاہیوں کے ہاتھ سے وہیں مارا گیا۔ (س م ح)

(٧٠) تیروں کے زخم منہ پر لگے تھے۔ (س م ح)

(٧١) اورنگ زیب سے سازش رکھنے کے شبہ میں مالوہ کی صوبہ داری سے تو یہ پہلے ہی معزول ہو چکا تھا جیسا کہ ایک حاشیہ میں ہم لکھ آئے ہیں۔ مگر اس کے بعد جاگیر بھی ضبط ہو گئی تھی بلکہ دو چار روز قید رہنے کی بے عزتی کا بھی صدمہ اٹھا چکا تھا۔ (س م ح)

(٧٢) عالمگیر نامہ میں سلیمان شکوہ کے سری نگر جانے کے حالات کو بہت طوالت سے لکھا ہے مگر ہم اس کا خلاصہ یہاں لکھتے ہیں کہ "جب سلیماں شکوہ الٰہ آباد سے تین منزل اس طرف آپہنچا تو لڑائی کے چوتھے دن باپ کی شکست کی خبر ملی اور اس تشویش کی حالت میں جو راجہ جے سنگھ سے صلاح پوچھی تو اس نے یہ مشورہ دیا کہ اول تو جس طرح بنے دہلی پہنچ کر

اپنے باپ کے ساتھ شامل ہو جائیے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو ہٹ کر الہ آباد جا ٹھہریئے اور موقع وقت کا انتظار کیجئے اور جب وہ الہ آباد جانے کو تیار ہوا تو رفاقت سے جواب دے دیا بلکہ عین روانگی کے وقت اپنے دوست دلیر خاں کو بھی اونچ نیچ سمجھا کر ساتھ جانے سے روک لیا اور اس حالت کو دیکھ کر اور سرداروں نے بھی اسی کی پیروی کی اور اگرچہ شہزادہ کی ذاتی رائے دہلی پہنچنے کی تھی مگر اس کا اتالیق بہادر خاں اس کو الہ آباد لے گیا کیونکہ یہاں کا مستحکم قلعہ دارا شکوہ کے ایک معتمد ملازم سید قاسم عرف سید کاسو بارہ وال کے قبضہ میں تھا اور چند روز ٹھہر کر لکھنو کی راہ سے قصبہ نگینہ کی طرف (جو دارا شکوہ کی بڑی بہن معروف بیگم صاحب کی جاگیر میں تھا اور جس کو اس کتاب میں ندینہ چاندپور کر کے لکھا ہے) روانہ ہوا تاکہ گنگا کے کسی گھاٹ سے اتر کر اور پھر سہارنپور کے قریب بوڑیہ کے گھاٹ سے دریائے جمنا کو عبور کر کے پنجاب کو باپ کے پاس چلا جائے مگر جب دشمن کے مقرر کیے ہوئے سرداروں کی مزاحمت کے باعث اس طرف سے گنگا کو عبور نہ کر سکا تو مراد آباد کے نواح سے ہوتے ہوئے ہردوار کے قریب وہاں کے راجاؤں خصوصاً راجہ سری نگر کی مدد سے اس دریا سے اترنا چاہا اور اس ارادہ سے بمقام چانڈی پہنچ کر (جس کو صاحب عالمگیر نامہ نے "محاذی ہردوار و متصل ولایتِ سری نگر" لکھا ہے) بھوانی داس نامی اپنے دیوان "بیوتات" کو جو پہلے بھی دارا شکوہ کا بھیجا ہوا وہاں ہو آیا تھا کچھ تحائف دے کر سری نگر کے راجہ کے پاس کشتیوں کے بہم پہنچانے میں مدد کرنے کے لئے بھیجا۔ مگر اتنے میں جو امیر الامراء شائستہ خاں اور فدائی خاں بہت سی فوج کے ساتھ سامنے آموجود ہوئے اور بجز سری نگر جانے کے کچھ چارہ نہ رہا تو چانڈی سے اٹھ کر بمقام کاناتال جو سری نگر کی حد میں داخل تھا، جاڈیرہ کیا اور یہاں سے راجہ کے اہلکار پہاڑ پر لے گئے اور چار منزل راجہ خود آگے آیا اور سری نگر لے گیا اور کہا کہ آپ مختصر طور پر یہاں تشریف رکھ سکتے ہیں مگر ان ہاتھی گھوڑوں اور فوج و لشکر کی میرے اس پہاڑی اور چھوٹے سے ملک میں گنجائش نہیں۔ اب بہادر خاں تو مرض الموت کے سبب اجازت لے کر شہزادہ سے کیا بلکہ پہاڑ سے اترتے ہی دنیا سے رخصت ہوا اور باقی ماندہ سردار جو ناامیدیوں کے باعث ادھر ادھر کھسک جانا چاہتے تھے مگر شہزادے کی مرضی اور راجہ کے ملازموں کی رہنمائی کے بغیر اس پہاڑی ملک میں سے نکل نہیں سکتے تھے، انہوں نے کچھ جھوٹ سچ بول کر اس کو پھر الہ آباد جانے کے لئے آمادہ کیا تاکہ شجاع کے ساتھ شامل ہو جائے (کیونکہ اپنی شکست کے بعد دارا شکوہ نے بذریعہ خط و کتابت مصالحہ کر کے اس کو

آگرہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی) الغرض شہزادہ راجہ کا شکریہ ادا کر کے اور کچھ تحفے تحائف دے کر رخصت ہوا مگر نگینہ میں واپس پہنچتے ہی یہ دغا باز اور خود غرض خیر خواہ اس کو چھوڑ کر ادھر ادھر چل دیئے اور ناچارے پھر سری نگر کی طرف لوٹنا پڑا اور اب سوائے سید احمد کے جس کا بھائی سید قاسم اب تک قلعہ الٰہ آباد کو تھامے ہوئے تھا اور اس کے کوکے محمد شاہ اور دو تین اور سرداروں اور بے چاری مصیبت زدہ بیگم اور چند اور عورتوں اور ستره نوکر چاکروں اور ہمراہیوں کے اس تمام فوج و لشکر میں سے کوئی بھی ساتھ نہ رہا اور چونکہ اس کے پہاڑ سے اترنے کی خبر سن کر اورنگ زیب کے بعض سردار پھر اس کا راستہ روکنے کے لئے آپہنچے تھے اس لئے یہ خوف زدہ شہزادہ گھبراہٹ میں جس قدر جواہرات اور اشرفیاں ساتھ لے سکا لے کر راتوں رات نگینہ سے چل کھڑا ہوا اور خوف کے سبب معمولی راستہ چھوڑ کر راجہ کے آدمیوں کی رہنمائی سے ایک اور راستہ سے سری نگر کو چلا گیا جہاں شہر سے نیچے آ کر راجہ اسے اپنے ہاں لے گیا۔ اس راجہ کا نام جس نے سلیماں شکوہ کو پناہ دی تھی فارسی زبان کی تاریخوں میں پرتھی سنگھ اور پرتی پت لکھا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ کا لفظ سلاطینِ مغلیہ کے ادب کے منافی سمجھ کر لفظ سنگھ اور پت کے ساتھ دانستہ بدل دیا ہے جیسا کہ گولکنڈا اور بیجاپور کے بادشاہوں کو بجائے قطب شاہ قطب الملک اور بجائے عادل شاہ عادل خاں لکھتے تھے۔ (س م ح)

(۷۳) اصل کتاب میں "تاتاری عورتیں" ہے مگر چونکہ وہ ترک قوم کی عورتیں جو محل کے چوکی پہرہ کا کام دیتی تھیں ان کو قلماقنیاں کہتے تھے اس لئے ترجمہ میں وہی لفظ اختیار کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ قلماق بھی ایک تاتاری ہی قوم ہے۔ (س م ح)

(۷۴) اصل کتاب میں تاج کا لفظ ہے جس کی جگہ ہم نے ہندوستان کے محاورہ کے بموجب تخت کا لفظ اختیار کیا ہے۔ کیونکہ ہم کو یاد ہے کہ دہلی کے خاندان شاہی کے اکثر لوگ غدر ۱۸۵۷ء تک بھی (جس میں اس خاندان کا نام و نشان ہی مٹ گیا) بات بات پر تخت ہی کی قسم کھایا کرتے تھے حالانکہ نہ کچھ تخت ہی رہا تھا نہ تاج، مطلب یہ کہ تخت کی قسم اس خاندان میں بہت ہی مؤکد اور مقدس سمجھی جاتی تھی۔ (س م ح)

(۷۵) محمد سلطان کے قید میں ڈالے جانے پر اشارہ ہے جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔ (س م ح)

(۷۶) عالمگیر نامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعتبار خاں اس وقت دکن میں تھا۔ اس کو نہیں

بلکہ ذوالفقار خاں کو قلعہ دار بنایا گیا تھا۔ (س م ح)

(۷۷) داراشکوہ کی مخالفت کے باعث میر بخشی کے عہدہ سے استعفیٰ دے کر اس وقت تک یہ دہلی ہی میں خانہ نشین تھا اور عالمگیر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اورنگ زیب دارا شکوہ کے تعاقب میں آگرہ سے دہلی کے قریب پہنچا تو یہ خضر آباد کے مقام (جو پرانی دلی کے پاس تھا) اس کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ (س م ح)

(۷۸) باپ بیٹے کی منافقانہ کارروائیاں۔ امراء کا اورنگ زیب کے پاس حاضر ہو جانا اور آخر کار شاہ جہاں کا قید ہونا۔ ان سب واقعات کو "عالمگیر نامہ" "تاریخ عاقل خاں" "عمل صالح" اور "سیر المتاخرین" میں جس تفصیل و ترتیب سے لکھا ہے اس کا خلاصہ مع پوری نقل اس خط و کتابت کے جو باپ بیٹے کے باہم ہوتی رہی مفید اور دلچسپ سمجھ کر اسی ترتیب سے اس جگہ درج کیا جاتا ہے اس خط و کتابت کی نقلیں جو "عملِ صالح" اور "تاریخ عاقل خاں" میں درج ہیں ان کے الفاظ مختلف اور مطلب واحد ہے مگر عاقل خاں جو اورنگ زیب کے خاص امیروں میں سے تھا اس کی تحریروں کو زیادہ سندی سمجھ کر سب نقلیں اسی کتاب سے لی گئی ہیں بجز ایک عرضی کے جو اس میں نہ تھی اور "عملِ صالح" سے لی گئی۔

اگرچہ اورنگ زیب کی وہ تحریر جس کو برنیئر نے نقل کیا ہے ان دونوں کتابوں میں نہیں ہے مگر عالمگیر نامہ میں (جس کے مسودات خود اورنگ زیب کے ملاحظہ کے بعد صاف ہوتے تھے) داراشکوہ پر فتح پا کر اس سے دوسرے دن بمقام عماد پور عرف سموگڑھ اورنگزیب کے ڈیرہ کرنے کا ذکر لکھ کر یہ عبارت تحریر کی ہے کہ "دریں روز خجستہ معذرت نامہ مشتمل بر صورت حال و اعتذار وقوعِ صف آرائی و قتال کہ باعث وبادی آن داراشکوہ بے خرد مغرور بود و جنود منصور بہ حکم شرع و فتوائے عقل در اقدام بر آن معذور۔ نگاشتۂ کلکِ ادب دانی ساختہ بخدمت اعلیٰ حضرت فرستادند"۔

اور لڑائی سے تیسرے دن شہر آگرہ کے قریب جب باغ نور منزل معروف باغ دھرہ میں ڈیرہ ہوا تو اس کے اس معذرت نامہ کے جواب میں شاہ جہاں نے جو شقہ اپنے قلم خاص سے لکھا تھا اس کا خلاصہ بقول عاقل خاں یہ ہے۔

"چوں مقتضائے مشیتِ بیچونی درمیان آن قرہ باصرہ سلطنت و جہانبانی و غرہ ناصیہ عظمت کامرانی و شاہ بلند اقبال صحبت بہ کدورت و ملال انجامید و آنچہ در پردہ غیب و حجاب تقدیر مستور بود بروئے بروز افتاد و از انجا کہ در فرمان قضا و قدر واردات خالق خیر و شر چون و

چرائے بشر را مدخلے نیست اغماض عین ازاں از متممات نشاخودشناسی خداوانی دانستہ باظہار
امرے کہ اکنوں انشراح خاطر وانبساطِ طبع اقدس بداں متعلق ومنوط آمدہ بذل توجہ والا
ناگزیر شرف وقوع پذیرفت وغرض از تمہید ایں مقولہ آنکہ تقاضائے باطن تمنائے خاطر بہ
تماشائے جمال لقائے فرحت انتمائے آن فرزند ہوشمند بیدار خرد کہ چراغ ضیا بخش وفروغ
افزائے ایں دودمان دولت واقبال است بغایت است کہ حوصلہ تقریر وبیان اندازہ آن را
برنمی‌تابد خاصۃً کہ آن درۃ التاج خلافت ودارائی وثمین فریدہ زینت افزائے اکلیل فرمان روائی را
بنا بر ارادت لم یزلی پس از روزگار دراز وزمان طویل باایں ہمہ قرب مکان ومحل قریب
اتفاق نزول افتادہ و ما را پس ازاں چناں امراض متضادہ شدیدہ کہ رشتہ امید توقف دریں
نشاءاں سوز حوادث اندوز قطعاً مقصور ومنقطع بود از شفاخانہ عنایت حکیم علی الاطلاق شربت
گوارائی صحت کرامتِ وصول پذیرفتہ فی الحقیقت حیات تازہ وزندگی دوبارہ عطا گردید التہاب
نیران شوق ونوایر اشتیاق باقصے نہایت رسیدہ یقین کہ خواہش قلبی وآرزوئے باطنی آں
فرزند نیک اختروالا گہر نیز دریں باب ازباب غلیان نشاء محبت وکیفیت طلب عزیز مصر بلقائے
بزرگ کنعاں خواہد بود چوں زیادہ بریں حوصلہ طاقت بانتظار را برنمی تابد پسندیدہ عالم
استحسان آنست کہ آں ادب دان خورد و رسم شناس عقل بزودی ہرچہ تمام تر مرہم راحت
بر جراحت ترصد نہادہ خاطر اقدس را بمشاہدہ جمال لقائے بہجت افزائی خود فرحت آگین و
مسرت آمود سازد۔ ع زود آو دل تنگ مرا مونسِ جاں باش"۔

اس شقہ کے پہنچنے پر اورنگ زیب نے تملق کی راہ سے نہایت ہی ادب اور فرمان
برداری کا اظہار کیا اور فاضل خاں میر سامان اور سید ہدایت اللہ صدر یعنی منتظم اوقاف کو جو
یہ شقہ اور الفت ومحبت اور شوق ملاقات کے پیغام زبانی لے کر آئے تھے بڑے بھاری خلعت
عنایت کئے اور جواب میں یہ عرضی حوالہ کر کے بہت خاطر ومدارت کے ساتھ رخصت کیا۔

"مراسم سجدہ وسلام ولوازم تعظیم وتکریم بجا آوردہ بعرض می رساند کہ فرمان
فرخندہ عنوان مشتمل بر کیفیت آرزومندی خاطر فیض مظاہر وزود رسیدن ایں پروردہ نعمت و
برآوردہ تربیت بزمین بوس حضور فائض النور شرف صدور وعز ورود دریافتہ۔ از دریافت مضمون
اشفاق مشحون آن جریدہ فیض کہ ہر کلمہ اش سرمایہ دہ انوار برکات وہر فقرہ اش پیرایہ
پیرائے حیات بود سرتاسر صفحہ خاطر زینت جمعیت وطراز شگفتگی یافتہ روکش نسخہ رنگین بہار
گردید و فروغ ایں آیات رحمت وشموس سمائے عاطفت ازسر نو بر بام وطارم دماغ گستردہ

سر شار نشہ مسرت وطراوت ساخت۔ شکر ایں عنایات تازہ ومرحمت بے اندازہ کہ از ظرف طاقتِ تحریر وتقریر بیروں است از تنگیِ دستگاہِ لفظ و معنی چگونہ بتقریر زبان کو ثربیان راست آید۔ ع ہم مگر لطف شما پیش نہد گامے چند الحمد للہ والمنۃ کہ خاصیت صدق ارادت مضمر و خلوصِ عقیدتِ مکنوں در ضمیر منیر آن حضرت کار خود کردہ تازگی فروغ از نہان کدۂ باطن بر روئے بروز انداخت و سلسلہ جنبانی اقبال آسمانی وفیضِ خواہش جسمی وروحانی بفوز کمال عنایت حضرت ظل سبحانی رسیدہ گلشن امید و مراد را شگفتہ و خنداں ساخت اکنوں کار از اظہار عوطف رسمی ومراحم ظاہری گزشتہ نخواہش حقیقت رسید وزائچہ التفات معنوی بمشام آرزو و فایز گشتہ باعث مزید حیات گردیدہ امیدوار است کہ اسباب مواصلتِ ایں دور افتادہ در وقت مسعود و ساعت سعادت آمود دست بہم وہد واز فیض قدمبوس مبارک آن حضرت کہ فی الحقیقت برکتِ روزگار وآیۂ رحمتِ پروردگارند روزگار ان انتظار ایں وقت و آرزوئے روزی شدن ایں روز داشت بر مراد خاطر فیروز گشتہ از تجلی دیدار فایض الانوار روزنۂ منظر دیدہ را روکش دریچہ مشرق مہر انور سازوزیادہ ازیں دراز نفسی کوتہ اندیشی میداند“۔

اگرچہ اورنگ زیب کے ہتھکنڈوں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ تعین وقت مسعود و ساعت سعادت آمود کا اظہار اس دیر و توقف میں اپنے بندوبستوں کے پورا کرنے کے لئے محض ایک حیلہ تھا کیونکہ اس عرصہ میں بادشاہی سردار اور امیر وزیر روز بروز اس کے پاس حاضر ہوتے جاتے تھے اور اس حالت میں بادشاہ کے پاس جانے سے بجز ضرر کے کوئی فائدہ متصور نہ تھا اور بقول صاحب ”سیر المتاخرین“ حاضر ہونے کا ارادہ ظاہر کرنے کی وجہ صرف اتنی ہی تھی کہ لوگوں کی زبانِ طعن ذرا بند رہے۔ مگر عاقل خاں اور صاحبِ ”عملِ صالح“ کے بیان سے (جو اورنگ زیب کے خوشامدی مؤرخ نہیں ہیں) معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ارادہ فی الحقیقت باپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا تھا۔ مگر فاضل خاں کے چلے جانے کے بعد بعض امرا نے اسے خوب بہکایا اور شاہ جہاں کے پاس جانے سے ڈرا دیا۔ چنانچہ فاضل خاں جب اگلے روز اس امید میں کہ باپ بیٹے کی ملاقات اب جلد ہونے والی ہے خوش خوش پھر آیا اور بادشاہ کی طرف سے بطورِ علامت اس کی رضامندی اور خوشنودی کے بعض عمدہ تحائف مع ایک مشہور تلوار کے جس کا نام عالمگیر تھا اور (جس کی نسبت مؤرخ لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب اور اس کے رفیقوں نے اسے ایک ایسی فالِ مبارک سمجھا تھا کہ آخر کار تخت نشینی کے وقت اس لفظ کو اپنے القاب شاہی کا اس نے ایک جزبنالیا) لایا اگرچہ اورنگ زیب نے ادب

اور اطاعت کی ظاہری باتیں تو اب بھی بہت سی بنائیں مگر شاہ جہاں کے پاس حاضر ہونے کی اصل بات پر نہ آیا جس کو فاضل خاں نے بھی تاڑ لیا اور بادشاہ سے جاکر صاف کہہ دیا۔ ناچار شاہ جہاں نے دوسرے روز پھر ایک رقعہ لکھا بلکہ اورنگ زیب کی بدگمانی رفع کرنے کے خیال سے خلیل اللہ خاں کو بھی فاضل خاں کے ساتھ بھیجا اور وہ یہ تھا۔ نقل شقہ ثانی:

"باوجود حقوق پرورش بناز و نعیم و ترتیب و تلقین و تعلیم و وجوہ از شات بیکراں، عنایات بے پایاں اختصاص بخشیدن و بمناصب بلند و مراتب ارجمند فائز گردانیدن و با ایں ہمہ حقوق ابوت و اولوالامری کہ بفرمان شہنشاہ علی الاطلاق اطاعت و امتثال حکم لازم و واجب است و کلام ربانی و کتب آسمانی بدان ناطق۔ ازاں فرزند سعادت مند کہ آراستہ بمزایائے حسن اعتقاد و مجموعہ دانش و بینش خداداد است و پیوستہ عمر گرامی را برضاجوئی و نیک نامی و حق شناسی و خداوانی صرف کردہ بسیار بعیدی نماید کہ قدر مہربانی و رتبہ شوق و خواہش خاطر اقدس راہد ریافت دیدار فرحت آثار خویش نہ دانستہ بنابر اغواء اضلال صاحب اغراض فاسدہ چند بیت "دود شوند ار بد ماغے رسند باد شوند ار بچراغے رسند از احراز سعادت حضور باز ایستد و بواسطہ دوست کامی مشتی بے مہر بد طینت مارا دشمن کام پسند و خفت مارا او فرماں فرمایاں جہاں و اہل روزگار تجویز کردہ از وخامت عاقبت نیندیشد و برائے دو روزہ زندگی ایں سرائے حادثہ اثر مساری و تجالت لبد در پیش خدا و رسول بر خود گوارا و آسان گیرد۔ زنہار اے فرزند بکارے جرأت منما کہ آخر منتج ندامت و پشیمانی گردد ندامت سود نہ دہد۔

اے خلف از راہ مخالف بتاب
تیغ میفگن کہ منم آفتاب

گر ز خود ایں نقش گرفتی بدست
سوئے خدابیں و مشو خود رست

ورز بد آموز شد ایں رہ پدید
گفتِ بدآموز نباید شنید

گرچہ کنی دعوئ دانش ولیک
نیک بدانم کہ ندانی تو نیک

چوں تو شب و روز ادب افزوں کنی

بے ادبی با چو منے چوں کنی

گرچہ جوانی ہمہ فرزانگی است
ایں نہ جوانی است کہ دیوانگی است

اے پسر ارچہ بسری در خوری
لیک مکن باپدراں سروری

بر سر خوان آئے کہ ہم توشہ
یاد نمک کن کہ جگر گوشہ

خون منی و دل من مہر جوست
جوشش بسیار مکن زیر پوست

☆☆☆

چنانچہ جب یہ دونوں امیر اورنگ زیب کی ڈیوڑھی پر پہنچے تو صرف خلیل اللہ خاں جو پہلے سے گٹھا ہوا تھا اندر بلا لیا گیا جس نے جا کر یہ کہہ دیا کہ آپ ہرگز نہ جایئے وہاں آپ کی نسبت ارادہ برا ہے۔ بلکہ بادشاہ کو قید کر لینے کی صلاح دے کر اور رفع بدنامی کے لئے خود اپنی درخواست سے بظاہر نظر بند ہو کر وہیں رہ گیا اور اورنگ زیب نے فاضل خاں کی زبانی بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ مجھے وہاں جانے میں کئی طرح کا خوف اور اندیشہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ یکایک مجھ سے کچھ اور سلوک کر بیٹھیں قلعہ کے دروازے بند کرا دیئے۔ جس کی خبر پہنچتے ہی ذوالفقار خاں اور بہادر خاں اورنگ زیب کے سرداروں نے آن کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا اگرچہ انہوں نے رات کو قلعہ کی فصیل کے نزدیک پہنچ کر بقول عاقل خاں بہت سا کر و فرد کھایا مگر یہ قلعہ ایسا نہ تھا کہ وہ ایسی آسانی سے اس پر قابض ہو جاتے۔ اس باعث سے اورنگ زیب کے سردار اور سپاہی قلعہ کے نزدیک کے مکانوں اور درختوں اور دیواروں کی آڑ میں اتر پڑے اور دونوں طرف سے توپ اور بندوق کی لڑائی شروع ہو گئی۔ اگرچہ بادشاہ کی طرف سے بعض چھوٹے سردار اور بندوقچی پیادے نمک حلالی اور بہادری سے بخوبی مقابلہ اور مدافعت کرتے رہے مگر اکثر بڑے امرا اور منصب دار پہلے ہی روز یہ بہانہ بنا کر چمپت ہوئے کہ دریچہ کے راستے دریا سے پانی لانے والوں کی مدد کو جاتے ہیں۔

چونکہ گرداگرد کی عمیق خندق کی وجہ سے اس قلعہ میں نہ تو سرنگ ہی لگ سکتی

تھی اور نہ بلہ ہی ہو سکتا تھا اس لئے اہل قلعہ کو پیاسا مار کر مغلوب کرنے کے قصد سے دوسرے دن اورنگ زیب کے لوگ ذرا جرأت کر کے خضری دروازہ تک جا پہنچے اور قلعہ میں پانی پہنچنے کا راستہ بند کر دیا۔ وہ لو کا موسم اور آگرہ کی سخت گرمی، بے چارے اہل قلعہ لاچار ہو گئے۔ اس بیمار اور بڈھے بادشاہ نے یہ حادثہ دیکھ کر بجز غیر مشروط اطاعت کے (جس کو ان فارسی تاریخوں میں "مصالحہ" لکھا ہے) اور کوئی صورت نہ دیکھی اور پھر اپنے اسی دلی خیر خواہ بیچارے فاضل خاں کو فرزند بلند اقبال کی خدمت میں ایک اور تحریر دے کر روانہ کیا جس کا مضمون یہ تھا:

"مالک الملک تعالیٰ شانہ کہ مملکتش از تغیر و زوال مصون است کوکب اقبال فرزند برومند قوی طالع راچوں کوکب جہاں فروز فروغ بخش شبستان دولت و ضیا افزائے ساحت جہاں دار و از لجبازی سپہر نیرنگ ساز و ناسازی روزگار شعبدہ باز امرے کہ اصلاً بہ تصور و حیز تعقل در نمی آمد بعین الیقین شاہدہ فتاد۔ آں فرزند اقبال مند طالع بلند یکبارگی مہ فرزندی بریدہ بر آتش شوق کہ در کانون دروں اقدس سمت التہاب پذیرفتہ نظرے نیفگند و چشم از حقوق ابوت و تربیت عمرے پوشیدہ مارا دشمن کام پسندیدہ و ایذا و آزار مارا کہ موجب بدنامی دنیا و مورث ناکامی عقبیٰ است سہل و آسان انگاشتہ از باز پرس روز شمار غافل و بےخبر افتادہ اما در یوم یقوم الحساب ازیں جرأت وارتکاب حق شکنی چہ جواب خواہد داد۔ نظم:

پیش کہ گویم ز خودت شرم باد
کز پئے خون خودم اندر فتاد

بندہ کہ باشاہ بود کینہ جو
خلق چہ گویند تو ہم خود بگو

در ز تو در قلب من آمد غبار
ہم تو شوی در رخ خود شرمسار

باش بکامم کہ بکام توام
زندہ و نازندہ بنام توام

بہر خدا صورت خویشم نما
روئے مگردان و بترس از خدا

☆☆☆

لایق آنست کہ آں قرہ باصرہ دولت ووارائی بر صف شکنی و کشور کشائی خود مغرور نبودہ تکیہ و اعتماد بر سازگاری زمانہ ور فاقت روزگار نکند کہ ایں چرخ پر نیرنگ و جہاں دورنگ اصلا اعتماد را نشاید وازیں پیماں شکن بد عہد قطعاً وفا نیابد و دریں صورت شائستہ خرد آنست کہ کارے کہ موجب وہن و فتور ایں دودمان عالیشان گردد از ارتکابِ آن اجتناب واجب شمردہ و حفظ ناموس سلطنت چندیں سالہ ما کہ طنطنہء عظمت و شکوہ مکنت و اقتدار ایں دولت در ساحت زمین و زمان پیچیدہ و سائر فرماں روایان روئے زمیں ازان شمارے بر میگرفتند کوشیدہ آنچہ از فرزندان قابل توقع باشد بظہور آرد کہ نام نیک واسم قابلیت آں نوبادۂ گلشن جاہ و جلال در صحیفہ روزگار و صفحہ لیل و نہار ثابت وپایدار ماند"۔

جس کے جواب میں اورنگ زیب نے یہ عریضہ لکھا۔

"للہ الحمد والمنتہ کہ ایں نیاز مند درگاہ شاہنشاہ بے مثل و مانند از بدو اہتراز روائح عقل و تمیز الی الآن باندازۂ امکان بشری و طاقت انسانی در تمہیدِ قواعد ارادت و اعتقاد و تشئید مبانی صدق و سداد خود را مقصر نساختہ در ضبط سر رشتہ استرضائے خاطر ہمایوں کوشیدہ از سراط مستقیم عبودیت و جانفشانی انحراف جائز نداشتہ و نمی دارد و در راہِ بندگی و عقیدت ثابت و راسخ است۔ لیکن از مر ظہور ایں مقدمات کہ بنابر ارادات ازلی و مشیت لم یزلی درمیان آمدہ مقتضائے طبیعت بشری مغلوب واہمہ و ہراس گشتہ جرأت آں نماندہ کہ باطمینان قلب و جمعیت باطن عازم احراز سعادت حضور پرنور تواند شد والا آرزوئے خاطر فاتر ایں مستمند سراپا ارادت واخلاص بہ نیل دولت استلام سدہ سپہر القیام زیادہ ازانست کہ حوصلہ تقریر و تجنین آن را برتابد و زبان از شکر عنایات سرشار و مراحم واشفاقِ بے شمار اقدس قاصر۔ اگر آئین مرید نوازی مرئی فرمودہ حکم والا بشرف نفاذ رسانند کہ بعضے از مردم ایں مرید نخست بقلعہ باریافتہ بجائے جمعے از ملازمان سرکار عالم مدار کہ بمحافظت مداخل و مخارج مامور ند قرار گیرند واز پیشگاہ عنایت خسروانی بفراست ابواب قلعہ امتیاز و اختصاص یابند ایں فدوی جاں سپار خاطر جمع و سکون باطن و اطمینان دل بحضور اقدس رسیدہ سعادت زمیں بوس اشرف حاصل نماید و زبان عقیدت بیان بعد تقصیرات بخشاید غایت مرید نوازی خواہد بود۔"

اس کاغذ کے پہنچنے پر شاہ جہاں نے ناچار یہ حکم بھی دے دیا کہ سب بادشاہی ملازم قلعہ سے باہر چلے جائیں اور قلعہ کے دروازے کھول دیئے اور شہزادہ محمد سلطان مع ذوالفقار

خاں اور شیخ میر اور بہادر خاں اور اسلام خاں کے روز جمعہ گیارہویں رمضان ۱۰۶۸ھ کو داخل قلعہ ہو گئے۔ اور جب سب جگہ اپنا بند وبست کر چکے اس وقت محمد سلطان اسلام خاں کے ساتھ کورنش کے لئے دادا جان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اگرچہ اب بیچارہ بادشاہ قلعہ بھی حوالہ کر چکا مگر جب اس پر بھی حضرت اورنگ زیب ملاقات کو نہ آئے تو اگلے روز شاہ جہاں کی بڑی بیٹی معروف "بیگم صاحب" باپ کی طرف سے ملاقات وغیرہ کے پیغام لے کر اورنگ زیب کے لشکر کو خود گئی مگر اس طرف سے اس کے اعزاز واحترام کے معمولی دستور کے برخلاف اس کا استقبال وغیرہ نہ کیا گیا اور یہ کہلا بھیجا کہ آپ محل سرا میں چلیں، میں وہیں آتا ہوں اور جب وہ محل سرا میں پہنچ گئی تو اورنگ زیب نے کسی قدر اعزاز واکرام سے ملاقات کی۔ بیگم صاحب نے پہلے تو باپ کی طرف سے اپنے فتح مند بھائی کی نسبت اظہار عنایت اور شوقِ دیدار بیان کیا۔ بعد اس کے یہ بے موقع پیغام دیا کہ حضرت ظل سبحانی کی شاہانہ مرضی اس طرح پر ہے کہ ملک پنجاب مع اس طرف کے اور اضلاع کے دارا شکوہ کو عنایت فرمائیں اور گجرات پر مراد بخش اور بنگالہ پر شجاع کا بدستور تصرف رہے اور ملک دکن محمد سلطان کو عطا ہو اور شاہِ بلند اقبال کا خطاب اور باقی کل ممالکِ محروسہ کی ولی عہدی کا منصب عالی آپ کو مبارک ہو۔ پس آپ قبول کیجئے اور غرض مند لوگوں کی باتوں پر نہ جائیے۔ بغیر دغدغہ اور وسواس کے حضرت کی خدمت میں چل کر اپنے دیدار سے ان کی خاطر مشتاق کو مسرور کیجئے۔

اورنگ زیب نے اس کے جواب میں دارا شکوہ کی خصومت کی سخت شکایتیں کر کے ان باتوں کی قبولیت سے انکار کیا اور صاف کہہ دیا کہ دارا شکوہ کا معاملہ یکسو ہونے تک حضور میں حاضر ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ بیگم صاحب یہ جواب لے کر نہایت رنج و افسوس کے ساتھ واپس ہوئیں اور سب اندوہناک ماجرا بادشاہ سے عرض کیا۔ اس کے بعد پھر بھی اسی طرح پیام وسلام ہوتے رہے۔ اور جب آخر کار بہت سی گفت وشنید کے بعد اورنگزیب تیسرے دن شاہ جہاں کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کر کے باغ نور منزل سے سوار ہو کر چل پڑا تو یکایک شائستہ خاں اور شیخ میر نے سامنے سے آکر عرض کیا کہ "حضور کہاں جاتے ہیں! یہ ارادہ عقل اور دور اندیشی کے برخلاف ہے۔ خدا کے واسطے اس سے احتراز فرمائیے اور جب خدا کے فضل سے قلعہ میں حضور کا عمل ودخل خاطر خواہ ہو چکا ہے اور اعلیٰ حضرت کا اختیار واقتدار کچھ بھی نہیں رہا تو بلاضرورت اندیشے اور خطر کی جگہ

میں جانے سے اب کیا حاصل"۔

ان باتوں سے اورنگ زیب کی طبیعت میں پھر ایک تذبذب سا پیدا ہو گیا اور وہ اپنے ڈیرہ کو چلا آیا اور بادشاہ کے پاس جانے نہ جانے کی نسبت ابھی گفتگوئیں درمیان ہی تھیں کہ اسی اثنا میں ناہر دل نامی ایک چیلے نے شاہ جہاں کا ایک شقہ جو اس نے دارا شکوہ کے نام اپنے ہاتھ سے لکھ کر بڑے اعتماد اور احتیاط سے اس کو سپرد کر کے یہ ہدایت کی تھی کہ نہایت جلد دہلی پہنچ کر اس کا جواب لائے' پیش کیا۔ خلاصہ اس کاغذ کا عاقل خاں نے یہ لکھا ہے کہ "دارا شکوہ در شاہ جہان آباد ثبات قدم ورزد۔ کی خزانہ و لشکر در انجانیست۔ زینہار از آنجا پیشتر نگذرد کہ مابدولت در سنجا مہم را فیصل مبفر مائم" اس آخر فقرہ کا پڑھنا تھا کہ اورنگ زیب کو اپنے خیر خواہوں کی باتوں کا یقین ہو گیا اور اس نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ بالکل ترک کر دیا اور چونکہ بیگم صاحب کے آنے کے بعد جعفر خاں وزیر حکیم تقرب خاں (جو قرب و منزلت میں یہ بھی وزیر سے کم نہ تھا) اور رائے رایاں راجہ رگھناتھ دیوان سلطنت بھی مع عملہ فعلہ دیوانی حاضر ہو چکے تھے اب اس نے ایک نہایت شان دار دربار عام (مگر شہزادوں کے دستور کے موافق بہ نشست مسند) منعقد کر کے سب امرا اور منصب داروں کی نذریں (شاہانہ طور پر) لیں اور بعد ازاں بڑے طمطراق اور کروفر کے ساتھ بسواری فیل قلعہ کے دروازہ کے آگے سے گزر کر دارا شکوہ کی حویلی میں جا ڈیرہ کیا اور محمد سلطان نے باپ کے حکم سے تمام بادشاہی خزانوں، کارخانوں، توشہ خانوں کو ضبط کر کے سربمہر کر دیا اور اکیسویں رمضان سنہ مذکور سے شاہ جہاں ایسا سخت قیدی ہو گیا کہ حرم سرائے سے باہر نکلنے کی بھی اجازت نہ رہی۔ بلکہ بقول مصنف عملِ صالح مدت تک بجز چند خادمہ عورتوں کے کوئی خدمت گار تک پاس پھٹکنے نہ پاتا تھا۔

ذوالفقار خاں آگرہ کا قلعہ دار اور شاہ جہاں کا محافظ مقرر ہوا۔ اسلام خاں کو آگرہ کی صوبہ داری دی گئی اور آپ صرف تین روز دارا شکوہ کی حویلی میں ٹھہر کر دلی کو کوچ کر دیا اور اگرچہ پولیٹیکل مصلحتوں کے لحاظ سے اپنی غیبت میں محمد سلطان کو بھی آگرہ رہنے کا حکم دیا مگر نہ تو اس کو فوج وغیرہ پر اختیار کلی ہی دیا نہ قلعہ میں رہنے کی گنجائش دی بلکہ اسلام خاں کو اس پر اتالیق مقرر کر کے یہ حکم دیا کہ دارا شکوہ کی حویلی میں ڈیرہ رکھے اور اگرچہ بادشاہ کے قید اور بے بس کر دینے کے لئے ایک طرف تو مذکورہ بالا اہتمام و انتظام تھے مگر اپنی معمولی مکاری سے ان حرکتوں پر پردہ ڈالنے اور لوگوں کی طعن و تشنیع سے بچنے کی خاطر دلی کو

کوچ کرنے سے پہلے فاضل خاں میر سامان کو بادشاہ کی خدمت گذاری اور ''پرداخت مہمات بیوتات وانتظامِ کارخانہ جات خاصہ شریفہ'' کے لئے (جو اکثر وہیں تھے) مقرر کیا اور تقرب خاں کہ شاہ جہاں کا مزاج داں معالج تھا، واسطے علاج بقیہ مرض کے مقرر کر کے تین ہزار اشرفیوں کے انعام اور عنایات ''خلعتِ خاص و جمدھر مرصع با علاقہ مروارید'' سے سرفراز کیا اور جب آگرہ سے چل کر پہلا ڈیرہ بہادر پور میں ہوا تو اپنے فرزند ثالث محمد اعظم کو بھی سلام کے لئے روانہ کیا جس نے جدِ امجد کو پانچ سو مہریں اور چار ہزار روپیہ نقد نذر کیا اور بادشاہ نے بھی تملق اور ظاہری پیار محبت کے بعد بہت کچھ دے دلا کر رخصت کیا۔ شاہ جہاں کی قید کے پُر عبرت واقعہ کا مادہ تاریخ جو نہایت ہی حسبِ حال ہے، عاقل خاں نے یہ لکھا ہے: واعتبروا یا اولی الابصار۔ (س م ح)

(۷۹) پچھلے حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے کہ اس وقت اسلام خاں کو آگرہ کا صوبہ دار بنایا گیا تھا البتہ شائستہ خاں بھی آگرہ کا صوبہ دار مقرر ہوا تھا مگر اس سے کچھ عرصہ بعد۔ (س م ح)

(۸۰) شیخ میر اور سید میر دونوں بھائی تھے ان میں سے سید میر اورنگ زیب کا بے تکلف مصاحب تھا اور غالباً اس جگہ وہی مراد ہے۔ (س م ح)

(۸۱) مسٹر اِرونگ براک صاحب اصل کتاب کے مترجم انگریزی نے کرنل ڈو صاحب کی تاریخ ہندوستان سے اس موقع پر مندرجہ ذیل حاشیہ لکھا ہے۔

قولہٗ ''جب مراد بخش کیمپ میں جو متھرا کے قریب تھا آ پہنچا تو اس سے اگلے دن سلطان مراد بخش نے اورنگ زیب کو ضیافت کا پیغام بھیجا اور چونکہ وہ طبعاً کشادہ مزاج اور رنگین طبع شخص تھا اس وجہ سے اورنگ زیب نے بغیر کسی طرح کے شک و شبہ کے اس کی دعوت کو قبول کر لیا مگر جب دونوں بھائی دستر خوان پر بیٹھ گئے اور شہباز نے جو مراد بخش کے محلات کا ناظر اور اس دعوت کے اصلی منصوبہ کا رازدار تھا یکایک کان میں آ کر کہا کہ ''عمدہ پوشاک میں چاک کرنے کا اب وقت ہے'' یعنی اورنگ زیب سے یہیں سمجھ لینا چاہئے تو اورنگ زیب جو لوگوں کی صورتوں اور چہروں سے دلوں کے بھید سمجھ لیتا تھا، اس سرگوشی اور بھائی کی بناوٹی رنگینیوں سے جو اس وقت دکھا رہا تھا، اصل مدعا کو تاڑ گیا مگر تحمل اور متانت کی راہ سے خاموش ہو رہا اور جب مراد بخش نے سمجھا کر شہباز کو رخصت کر دیا کہ فلاں علامت اور اشارہ کا منتظر رہے تو اورنگ زیب نے یہ سمجھ کر کہ اس وقت میرے قتل کا منصوبہ ہے یکایک یہ ظاہر کیا کہ میرے پیٹ میں سخت درد ہے اور مجلس سے اٹھ کر جھٹ پٹ باہر چلا

آیا اور اپنے اہالی موالی اور ہمرکاب سپاہیوں کے پاس جو ڈیوڑھی پر حاضر تھے آپہنچا اور وہاں سے سیدھا اپنے لشکر میں آگیا اور اس تمارض کی چال کو ایسی خوبصورتی سے چلا کہ مراد بخش یہی خیال کرتا رہا کہ وہ فی الواقع بیمار ہے اور اس کو گمان بھی نہ ہوا کہ وہ اس منصوبہ کو سمجھ گیا ہے۔ چنانچہ آخر تین روز کے بعد جب اورنگ زیب کا مصنوعی دردِ شکم جاتا رہا تو مراد بخش نے بہت خوشیاں منائیں اور بڑے تپاک سے مبارکبادیں دیں اور اس سے اگلے دن اورنگ زیب نے دعوت کی تیاری کی اور پیغام دیا کہ آپ کی تفریحِ طبع کے لئے ایسی حسین و جمیل اربابِ نشاط بلائی گئی ہیں جو اپنے حسن و جمال اور لطافت و نزاکت اور گانے بجانے کے فن میں ایسی بے نظیر ہیں کہ ایسے کمالات کی رنڈیاں اس سے پہلے کبھی ہندوستان بھر میں نہیں دیکھی سنی گئیں اور اس مضمون کو ایسی آب و تاب سے بیان کیا گیا کہ مراد بخش جو بالطبع عیش و عشرت کا پتلا اور راگ رنگ کا شیدا تھا، ہزار جان سے ان کا مشتاق ہو گیا اور اپنے تمام خیر خواہوں میں سے کسی کی بھی نہ سنی اور اپنے مکار بھائی کے خیمہ گاہ میں چلا ہی گیا۔ چنانچہ جب بادشاہ سلامت (جیسا کہ اورنگ زیب اس کے بے وقوف بنانے کو کہا کرتا تھا) خیمہ گاہ میں داخل ہوئے تو وہ نازنینیں اس کو ایک اور اندر کے خیمہ میں لے گئیں اور یہ مغلوب النفس شہزادہ ان کے حیرت افزا حسن و جمال کو دیکھ کر جو فی الواقع بے مثال تھا بالکل لٹو ہو گیا۔ الغرض ناچ رنگ شروع ہوا اور عیش و نشاط کا وہ سماں بندھا کہ مراد بخش نے مزے میں آکر شرابِ شیرازی منگائی۔ اب دور چل رہا ہے اور "بادشاہ سلامت" پریوں کے اکھاڑے میں راجہ اندر بنے بیٹھے ہیں اور اورنگ زیب بھی اپنے معمولی تقویٰ و طہارت سے ہاتھ دھوئے اس بزمِ شراب میں شریک ہے۔ آخر جب حضرت کے ہوش و حواس رخصت ہونے لگے تو اورنگ زیب نے شیراز کی خام شراب کی جگہ تیز شراب کے پیالوں کی اور بھی بھرمار شروع کر دی۔ جس سے وہ تھوڑی ہی دیر میں بے ہوش ہو کر ایک نازنین کی بغل میں سر دے کر سو گیا اور چونکہ اورنگ زیب نے اپنے سرداروں کو حکم دے رکھا تھا کہ جو امرا وغیرہ مراد بخش کے ساتھ آئے ہیں ان کی تواضع بھی اسی تکلف سے کی جائے، اس لئے اس کے باڈی گارڈ کے لوگوں تک کو بھی شرابیں پلا پلا کر مدہوش کر دیا گیا اور اس تدبیر سے وہ بدبخت شہزادہ بالکل بے حفاظت رہ گیا اور اورنگ زیب نے موقع پا کر ظفر جنگ اور تین اور امیروں کو حکم دیا کہ خیمہ میں جا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ لیں۔ چنانچہ وہ عورت تو ان کو آتے دیکھ کر کھسک گئی اور انہوں نے آکر مراد بخش کو جو پلنگ پر پڑا ہوا تھا اور جس کے ہتھیار تلوار اور خنجر

وغیرہ اورنگ زیب نے چالاکی سے پہلے ہی اٹھوا لئے تھے، آن گھیرا اور آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ باندھنے شروع کر دیئے۔ پس اس حرکت سے مراد بخش چونک پڑا اور جھنجھلا کر باندھنے والوں کے کچھ لاتیں وغیرہ مارنے لگا، جس سے وہ ذرا ڈر گئے اور شہزادہ پکار پکار کر اپنی تلوار مانگنے لگا۔ اب اورنگ زیب نے جو اس کارروائی کے وقت خیمہ کے دروازہ پر کھڑا تھا پردہ کے پیچھے سے سر نکالا اور اپنے امیروں کو خوب ڈانٹ کر کہا کہ اگر یہ کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے تو ابھی قتل کر ڈالو۔ جس کو سن کر مراد بخش نے کچھ برا بھلا تو کہا مگر آخر کار چپ ہو کر ہاتھ پاؤں بند ھوالئے اور ناظر شہباز جو اس کا دلی رفیق اور خیر خواہ اور عمدہ مشیر تدبیر تھا، اس کو بھی اسی وقت اس طرح قید کر لیا گیا کہ وہ شامیانہ جو میر بخشی کے ڈیرہ کے آگے لگا ہوا اور یہ اس کے نیچے بیٹھا ہوا تھا اشارہ ہوتے ہی اس کی چاروں چوبوں کی طنابیں یک لخت کاٹ کر گرا دیا اور قبل اس کے کہ وہ اس ناگہانی الجھیڑے سے اپنے تئیں نکال سکے پکڑ لیا گیا اور باقی امرا کو مسلح آدمیوں نے گھیر لیا اور اورنگ زیب کے حضور میں حاضر کئے گئے، جنہوں نے فرمانبرداری قبول کر لی۔

اس واقعہ سے اگرچہ خفیف سا چرچا مراد بخش کے لشکر میں پھیلا مگر اس سے کوئی ضرر پیدا نہیں ہوا اور اہلِ فوج تھوڑی دیر کے بعد اس طرح سے چپ چاپ ہو گئے جیسے کوئی شخص خوابِ پریشاں سے ذرا چونک کر پھر سو جاتا ہے۔

جب سلطان مراد بخش کو قید کیا گیا تھا اس وقت کچھ زیادہ رات نہیں گئی تھی اور دن نکلنے سے پہلے ہی اس کو اور اس کے رفیق کو ایک ہاتھی پر زنانی عماری میں بند کر کے حفاظتِ کامل آگرہ کو روانہ کر دیا گیا۔ (انتہےٰ کلامہٗ)

مگر واقعات کی ترتیب اور ان چالوں اور منصوبوں کی تفصیل جو داراشکوہ پر فتح پانے سے مراد بخش کے قید ہونے اور اس کے سلیم گڑھ میں بھیج دینے تک اورنگ زیب اپنے اس سادہ لوح بھائی کی نسبت عمل میں لاتا رہا، جس طرح پر کتاب عالمگیر نامہ، عملِ صالح اور سیر المتاخرین میں بطورِ محل اور عاقل خاں کی تاریخ میں مفصل درج ہے (اور ذو صاحب کی تحریر سے زیادہ اعتماد کے لائق ہے) خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جب اورنگ زیب داراشکوہ پر فتح پا چکا تو مراد بخش کے ساتھ بہت ہی چرب زبانی اور ملائمت سے پیش آیا اور چونکہ اس لڑائی میں اس نے زخم کھائے تھے اس لئے اطبایانِ حاذق و جراحانِ ماہر" اس کے علاج کے واسطے مامور کئے اور جب دونوں بھائی آگرہ کے قریب پہنچ کر باغ نور منزل میں ڈیرہ کر چکے تو اب

اورنگ زیب نے یہ چاہا کہ بغیر مراد بخش کی شرکت کے شہر آگرہ (یعنی دارالسلطنت) پر خاص اپنا قبضہ کرے۔ اس لئے اس بہانہ سے کہ اہل شہر اس ہنگامہ اور شور و شر کے باعث بہت خوف زدہ ہو رہے ہیں اور مراد بخش کی سپاہ کے لوگ اپنے آقا کی بے پروائی کے سبب سے براہ خودسری بر خلاف حکم شہر میں داخل ہو کر دست درازیاں اور بے اعتدالیاں کرتے ہیں رعایا کی تسلی اور انتظام کا حیلہ بنا کر اپنے بیٹے محمد سلطان کو مع اپنی سپاہ کے شہر میں بھیج کر اپنا عمل و دخل کر لیا اور جب بادشاہ کے قید کر لینے کے بعد بڑی شان و شوکت کے ساتھ شہر میں خود داخل ہوا تو اس روز بھی مراد بخش کو اس حیلہ سے کہ آپ کے زخم ابھی آلے ہیں سواری وغیرہ کی حرکت مناسب نہیں، وہیں باغ نور منزل میں پڑا رہنے دیا اور خود دارا شکوہ کی حویلی میں (جو ولی عہد سلطنت اور مدعی بادشاہ کی حویلی تھی) آ ڈیرہ کیا۔ مگر میاں مراد بخش باوجود ان تمام حالتوں کے اپنے خیال میں بدستور بادشاہ بنے ہوئے تھے اور تخت و چتر وغیرہ سلطنت کا سارا سوانگ گجرات سے لے کر اب تک اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

مذکورہ بالا مؤرخوں کا قول ہے کہ اب اس کے دل میں اورنگ زیب کا یہ عروج دیکھ کر کچھ تو خود ہی حسد ہوتا تھا اور کچھ اس کے سردار اور امیر خواہ از راہِ خیر خواہی خواہ از راہِ خود غرضی اس کو سمجھاتے تھے کہ اورنگ زیب کے قول و قسم اور عہد و پیمان پر بھروسہ نہ کر کے اپنا بندوبست کرنا چاہئے۔ چنانچہ کچھ نئے سپاہی بھی بھرتی کئے جاتے تھے اور سرداروں اور امیروں کو بھی فضول رعایتیں کر کے اپنی طرف ملانے میں کوششیں کی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ قریب بیس ہزار سوار کے مراد بخش کے لشکر میں جمع ہو گئے۔ بلکہ سردار اور سپاہی عالمگیر کے ساتھ سے بھی جدا ہو کر اس کے لشکر میں جا شامل ہوئے۔

جب اورنگ زیب نے آگرہ سے بائیسویں رمضان ۱۰۶۸ ہجری کو کوچ کر کے پہلا ڈیرہ بہادر پور میں کیا اور وہاں سے چوبیسویں کو سامی گھاٹ پہنچ کر وہاں بھی دو روز مقام کیا تو اس کو خبر ملی کہ مراد بخش' جس نے اب تک آگرہ سے کوچ نہیں کیا تھا' اس مہم میں شامل ہونا نہیں چاہتا۔ پس اورنگ زیب کو نہایت اندیشہ ہوا اور اس نے اس امر کو اپنے مدعا کی خرابی کا باعث سمجھ کر معتمدوں کی زبانی مراد بخش سے ترکِ رفاقت کا سبب دریافت کیا اور جب اس نے اس کے جواب میں اپنی ناداری اور اس وجہ سے فوج کی پریشان حالی کا اظہار کیا تو ایک لاکھ روپیہ بھیج دیا اور یہ کہلا بھیجا کہ بالفعل اس کو اپنی اور اپنی فوج کی ضروریات میں خرچ کیا جائے اور جیسا کہ آپ کے ساتھ قرار پا چکا ہے کہ تیسرا حصہ خزانہ اور لوٹ کا

آپ کو دیا جائے گا، وہ بھی جلد پہنچ جائے گا اور خدا نے چاہا تو بعد اتمام مہم دارا شکوہ کے ملک پنجاب اور کابل اور کشمیر اور ملتان بے شک آپ کو ملے گا۔ پس اس معاملہ کی طرف سے مطمئن رہئے اور جلد تشریف لائیے تاکہ بالاتفاق اس مہم عظیم کو جو در پیش ہے حسب دلخواہ انجام کو پہنچایا جائے اور جب تک دارا شکوہ کا معاملہ درمیان ہے اس تکرار کا موقع نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ مراد بخش دم میں آ کر آگرہ سے سوار ہو آیا۔ مگر اب بھی اورنگ زیب کے لشکر سے ایک کوس پیچھے ڈیرہ کیا اور اسی طرح آگے پیچھے اترتے ہوئے جب متھرا پہنچے تو اس سے بھی کچھ زیادہ فاصلہ پر قیام کیا۔

پس اس کے ان اوضاع واطوار کو دیکھ کر یہ صلاح ٹھہری کہ مراد بخش کو قید کر لینا چاہئے۔ چنانچہ پہلے تو طرح طرح کے لالچ اور وعدے دے کر اس کے مقربوں اور بڑے بڑے امیروں کو گانٹھ لیا اور پھر مشورہ اور صلاح کے بہانہ سے مراد بخش کو اپنے ہاں بلانا چاہا مگر وہ اپنے بعض خیر اندیش اور ہوا خواہوں کے منع کرنے سے کچھ بہانہ بنا کر اس روز نہ آیا۔ چونکہ اورنگ زیب اس کا کھٹکا مٹانے میں زیادہ دیر لگانا مناسب نہیں جانتا تھا اس لئے متھرا میں (کہ جہاں حسنِ اتفاق سے عید الفطر کا بنا بنایا عمدہ حیلہ بھی موجود تھا) مقام کر دیا اور اس کے پھسلانے کی غرض سے کبھی تو نہایت ہی شوقِ ملاقات ظاہر کیا جاتا تھا اور کبھی معاملات ملکی میں صلاح مشورہ کا حیلہ پیش کیا جاتا تھا۔ غرض کہ جب مراد بخش اپنی صاف دلی سے جانے کو تیار ہوا تو اس کے ہوا خواہوں اور خیر اندیشوں نے جو اس فریب کی بھنک پا چکے تھے پھر روکا اور کہا کہ ہم کو اورنگ زیب کی طرف سے نہایت کھٹکا ہے ایسا نہ ہو کہ دغا کرے اور پھر پچھتانا کچھ کام نہ آئے۔ مگر بد قسمتی سے مراد بخش نے ان کی بات پر یقین نہ کیا بلکہ یہ جواب دیا کہ "ایں محض واہمہ است کہ بر طبیعتِ شما غالب گشتہ وباوجود عہد و پیمان موکد بہ غلاظِ ایمان از اں حضرت (اورنگ زیب) ایں واہمہ بارا بخاطر راہ دن از طریقہ مسلمانی نباشد" مختصر یہ کہ وہ دن بھی یوں ہی گزر گیا اور اورنگ زیب نے اس معاملہ کو ادھورا چھوڑ کر آگے کو کوچ کرنا کسی طرح سے مناسب نہ جانا اور ہر روز کئی کئی دفعہ یہ کہہ کر بھیجتا رہا کہ چونکہ بڑے بڑے معاملات در پیش ہیں اور بغیر ان کے صلاح و مشور کے آگے کو کوچ نہیں کیا جا سکتا اور آپ کے تشریف لانے کا انتظار حد سے زیادہ گزر گیا ہے پس اگر تشریف لائیں تو ملاقات کی خوشی کے علاوہ امر مرجوعہ کی درستی کی تدبیر بھی ہو جائے۔ مراد بخش سادہ لوحی سے اس کے ان فقروں کو سچ مان کر ملاقات کرنے پر رضامند تو ہو ہی گیا تھا پس علی الصباح میر و شکار

کے ارادہ سے جب باہر گیا تو واپس آتے ہوئے نور الدین نامی اسی کا ایک ملازم خاص ! جو اورنگ زیب سے گٹھا ہوا تھا سامنے سے گھوڑا دوڑائے آیا اور عرض کیا کہ اورنگ زیب کے پیٹ میں یکایک سخت درد پیدا ہو گیا ہے اور وہ بستر پر پڑا لوٹ رہا ہے اور محبت کے سبب سے بار بار آپ کو یاد کرتا ہے۔ پس ایسی حالت میں اب تو بہت جلد اس کے پاس تشریف لے جانا ہی مناسب ہے۔ مراد بخش جو بیچارہ ایک سیدھا سادا اور مکر و فریب سے محض نا آشنا تھا اس کے قول کو سچ سمجھ کر وہیں سے اورنگ زیب کے لشکر کی طرف چل پڑا اور چھڑی سواری صرف چند خدمتگاروں اور خاص خاص لوگوں کے ساتھ گھوڑا دوڑائے بپائے خود بگور آمد کا مصداق بن گیا۔ اور اورنگ زیب کے چالاک ملازم جو منصوبہ سے واقف تھے، نہایت اچھی طرح استقبال کر کے اس کے خیام خاص میں (جو کئی ڈیوڑھیوں کے اندر محل سرا کے قریب بیماری کا بہانہ بنائے پڑا تھا) لے گئے اور جگہ کی تنگی کے عذر سے اس کے ملازموں کو باہر ٹھہرا گئے اور اندر پہنچنے پر خود اورنگ زیب نہایت ہی شوق و اشتیاق اور تعظیم احترام سے پیش آیا اور حد سے زیادہ مسرت اور خوش دِلی کا اظہار کیا کیونکہ سموگڑھ کی لڑائی کے بعد اس تمام عرصہ میں مراد بخش کا اس کے پاس آنا نہیں ہوا تھا۔ غرض کہ بہت سے تکلفات کے بعد اپنی خلوت گاہِ خاص میں یعنی اور بھی زیادہ دُور لے گیا اور کہا کہ اب تو حاضری تناول فرمانے کا وقت ہو گیا ہے اوّل کچھ ماحضر نوش فرما کر ذرا قیلولہ اور استراحت فرمایئے اور قیلولہ سے فارغ ہو کر معاملاتِ سلطنت میں فراغ خاطر سے گفتگو اور مشورہ کیا جائے گا۔ چنانچہ مراد بخش کچھ کھانا کھا کر پلنگ پر لیٹ گیا اور اورنگ زیب بھی اب یہ دیکھ کہ سب کام ٹھیک ہو گیا استراحت کے بہانہ سے حرم سرا کو چلا گیا اور اورنگ زیب کے خدمت گار مراد بخش کی چپنی وغیرہ کرنے لگے اور اورنگ زیب کا جو اس تمام تدبیر سے یہ مدعا تھا کہ مراد بخش اپنے ہتھیار کھول ڈالے وہ پورا ہو گیا یعنی اس بے وقوف نے نہایت بے تکلفی سے ہتھیار بھی کھول کر رکھ دیئے اور اپنے نصیب کی طرح سو گیا۔ جوں ہی مراد بخش کی ذرا آنکھ لگی اورنگ زیب کے اشارہ سے خدمت گار تو باہر چلے گئے اور ایک لونڈی اندر سے آکر اس کی تلوار و ہتھیار اٹھا کر لے گئی اور شیخ میر اور بعض اور لوگ جو اسی امر کے منتظر تھے فوراً خواب گاہ میں آن گھسے۔ ان کے پاؤں کی آہٹ اور شیخ میر کی ڈھال کے اتفاقاً کھڑک جانے کی آواز سے جو آنکھ کھلی تو عجیب صحبت دیکھی۔ متحیر ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور جب ہتھیاروں کا پتہ نہ پایا تو اب سمجھا کہ معاملہ کیا ہے۔ پس ناامیدی سے ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "آخر باہجو منے درست

اخلاص صاف باطن چنیں کردید۔ و حق عہد و پیمان درست کہ قرآن مجید ضامن طرفین بود چنیں بجا آورد ید" جس کو حضرت اورنگ زیب نے پردہ کے پیچھے سے فرمایا کہ "برادر عزیز چونکہ تم سے ان دنوں میں کچھ ایسی باتیں سرزد ہوئیں جن سے فتنہ و فساد اور خلقت اور ملک کی بربادی کا گمان ہوتا تھا اور چند احمق اور شریر لوگوں کے بہکانے سے، جو تمہارے گرد و پیش جمع تھے، تمہارے دماغ میں کچھ ایسا غرور اور نخوت سمائی تھی کہ عقلمند اور سمجھ دار لوگوں کو ملک کے امن و امان میں خلل پڑنے اور سلطنت کے انتظام میں فتور آجانے کا یقین ہو گیا اس لئے تمہارے مزاج کی اصلاح اور ملک و سلطنت کی مصلحت کے لئے کچھ دنوں تم کو گوشۂ عافیت میں بٹھانا اور زمانہ کی کشمکش سے چھڑانا لازم ہوا ورنہ خدانخواستہ کوئی ایسا امر کہ جو آپ کی پیاری جان کے اندیشہ کا باعث ہو ہمارے دل میں نہیں ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس عہد و پیمان میں جو آپ کے ساتھ کیا گیا ہے کسی طرح کا خلل و فتور نہیں آیا اور تمہاری جان عزیز خدا کے حفظ و حمایت میں ہے۔ پس مقتضائے عقل یہی ہے کہ اس کو اپنے لئے موجب بہتری سمجھ کر حزن و ملال کو طبیعت میں جگہ نہ دیجئے ع "در طریقت ہر چہ پیش سالک آمد خیر اوست"۔

غرض کہ یہ بے چارہ سیدھا سادا شہزادہ متھرا کے مقام شوال کی چوتھی ۱۰۶۸ھ ہجری کو اپنے مکار بھائی کے دامِ تزویر میں پھنس گیا اور اسی وقت دلیر خاں اور شیخ میر کی حفاظت میں ہاتھی پر بٹھا کر شاہ جہان آباد کو ایسی جلدی اور سرعت کے ساتھ چلتا کیا گیا کہ اس کی فوج کو جو قریب بیس ہزار سوارِ جرار کے تھی، اس روز مطلقاً خبر نہ ہوئی اور صرف اس وقت معلوم ہوا کہ جب موقع ہاتھ سے جاتا رہا اور یہ قصہ مشہور عام ہو گیا۔ پس بناچارے فوج نے بھی اورنگ زیب کی اطاعت اور نوکری قبول کر لی اور اس کے بعض ملازم جو ساتھ آئے تھے مثل شہباز خاں خواجہ سرا کے جو پنج ہزاری کا منصب رکھتا تھا اور دو تین اور سردار بھی اسی وقت گرفتار کر لئے گئے۔ فقط

کرنل ڈو صاحب کی منقولہ بالا تحریر میں اکثر باتیں تو صریحاً غلط ہیں مگر کھانے کے وقت جلد غافل کرنے کے لئے شراب پلانے اور خواب گاہ میں کسی عورت کے پہنچا دینے کا مضمون خواہ وہ رنڈی ہو یا لونڈی قریب القیاس اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ شراب کے بغیر اس کو جلد غافل بنانا مشکل تھا اور کسی عورت کے بغیر اس کے مصاحب اور خدمتگار بلا اندیشۂ بدگمانی الگ کر کے باہر نہیں بھیجے جا سکتے تھے۔ (س م ح)

(۸۲) شیر شاہ سے ہمایوں کا شکستیں کھا کر ہند سے ایران جانا اور شاہ طہماسپ صفوی فرمانروائے ایران کی امداد سے پھر ہند کو آنا اور دوبارہ متسلط ہونا نہایت مشہور واقعہ ہے۔ (س م ح)

(۸۳) ان واقعات کو جس طرح عالمگیر نامہ میں لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے روانہ ہونے سے پہلے خلیل اللہ خاں اور بہادر خاں کو دارا شکوہ کے تعاقب میں روانہ کر دیا تھا۔ بعد ازاں متھرا سے دلی پہنچ کر باغ اعز آباد متصل شہر دلی سے ذیقعد کی ساتویں ۱۰۶۸ ہجری کو مطابق سترہویں امرداد (بھادوں) کے پنجاب کو خود روانہ ہوا۔ دارا شکوہ نے کرنال انبالہ کے معمولی راستہ سے تلون کے گھاٹ، جو اس زمانہ میں پھلور کی طرح ستلج کا مشہور گھاٹ تھا، عبور کر کے تعاقب کرنے والوں کے روکنے کے لئے چونکہ یہ بندوبست کر دیا تھا کہ اس کا نامی سردار داؤد خاں پٹنی تلون کے اس پار اور اسی طرح سپہر شکوہ بیاس کے دوسرے کنارے کچھ عرصہ تک ٹھہر کر اور کشتیوں کو جلوا کر اور غرق کرا کر بعد ازاں لاہور میں شامل ہو جائیں۔ اس لئے جب اورنگ زیب کو کرنال کے مقام خلیل اللہ خاں کی عرضی سے یہ حال معلوم ہوا تو وہاں سے روپڑ کو ہو لیا اور کشتیوں کی قلت کی وجہ سے کئی دن میں لشکر کو ستلج سے پار اتار کر ماچھی واڑہ راہوں، گڑھ شنکر کو ہوتا ہوا گوبندوال کے گھاٹ دریائے بیاس سے بھی پار ہو گیا اور چھبیسویں ذی الحجہ کو قصور جا پہنچا۔ چونکہ دارا شکوہ لاہور سے ملتان کو بھاگ گیا تھا اور وہ سردار جو تعاقب میں مامور تھے کچھ سستی کرنے لگ گئے تھے اس لئے یلغار کے طور پر یعنی بہت کڑے اور بلا توقف کوچ کرتا ہوا ملتان کو روانہ ہوا اور ساتویں محرم کو جبکہ دارا شکوہ ملتان سے سندھ کی طرف بھاگ چکا تھا ملتان جا پہنچا اور اس جگہ سے اوّل صف شکن خاں کو مع اور چند سرداروں کے اور بعد ازاں اس خیال سے کہ اب بھی دارا شکوہ کے پاس بارہ چودہ ہزار سوار اور ایک اچھا توپخانہ اور بہت سامال و دولت موجود تھا، شیخ میر کو بھی جو اورنگ زیب کے نہایت محلِ اعتماد ہونے کے علاوہ بڑا صاحبِ تدبیر اور شجاع امیر سمجھا جاتا تھا اور جس کو برنیئر میر بابا لکھتا ہے روانہ کر کے خود واپس ہو پڑا اور معمولی منزلیں کرتا ہوا چوتھی ربیع الاول ۱۰۶۹ ہجری کو دلی پہنچ گیا۔ پس جس غیر معمولی چستی اور جفاکشی کی برنیئر نے تعریف کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس "یلغار" سے مراد ہے جو اس نے قصور سے کی تھی۔ (س م ح)

(۸۴) خدا جانے مصنف نے یہ کیا بے سر و پا قصہ لکھ دیا ہے کیونکہ عالمگیر نامہ سے

معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان شکوہ کی رفاقت چھوڑ کر اوّل دلیر خاں متھرا کے قریب بمقام سلیم پور اور پھر چار پانچ روز بعد راجہ جے سنگھ خاص متھرا میں اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہو گیا تھا بلکہ ستلج سے عبور کرنے کے بعد یہ دونوں سردار بہادر خاں اور خلیل اللہ خاں کی مدد کے لئے جو اورنگ زیب کی سپاہ خاص کے آگے آگے دارا شکوہ کے تعاقب میں لاہور کو جاتے تھے، بھیجے گئے تھے۔ (س م ح)

(۸۵) شاہ نواز خاں جس کا نام میرزا بدیع الزمان تھا ایران کے بادشاہ شاہ سلیمان صفوی کی اولاد سے تھا اور اس کا باپ میرزا رستم جو بہت خوش سلیقہ اور شاعر شہزادہ تھا قندھار سے آکر شاہ جہاں کا ملازم ہو گیا تھا اور شرافت اور علوِ خاندان کی وجہ سے شاہ جہاں نے اپنے بیٹے سلطان شجاع کی شادی اس کی بیٹی اور اورنگ زیب اور مراد بخش کی شادی اس کی دو پوتیوں یعنی شاہ نواز خاں کی بیٹیوں سے کر دی۔ چنانچہ اورنگ زیب کا تیسرا بیٹا محمد اعظم اور مشہور و معروف بیٹی زیب النسا بیگم اسی بیگم سے تھی جس کا نام دل رس بانو بیگم تھا۔ پس مصنف کی یہ غلطی ہے کہ اس کو سلاطینِ مسقط کے خاندان میں سے بتایا ہے۔ کیونکہ خاندان صفوی کا مسقط سے کچھ تعلق نہ تھا بلکہ اس کی نشوونما اردبیل سے ہوئی جو ملک ایران کا ایک مشہور شہر ہے اور اپنے بزرگ شاہ صفی کے نام کی مناسبت سے جو قوم کا سید اور صوفی مشرب تھا صفوی مشہور ہوا اور اس وقت کی فارسی تاریخوں میں اس کے دارا شکوہ سے مل جانے کی بھی اصل وجہ یہ لکھی ہے کہ جب اورنگ زیب دکن سے چڑھائی کر کے برہانپور سے آگرہ کی طرف چلنے کو تھا تو شاہ نواز خان یہ خیال کر کے کہ خدا جانے انجام اس مہم کا کیا ہو اس کی رفاقت سے بچنا چاہتا تھا۔ اس وجہ سے اورنگ زیب نے ناراض ہو کر قلعہ برہانپور میں قید کر دیا تھا مگر جب سموگڑھ کی لڑائی میں دارا شکوہ پر فتح پائی تو قید سے چھڑا کر گجرات کا صوبہ دار کر دیا۔ مگر وہ اپنی اس بے عزتی کو ہنوز بھولا نہیں تھا اور اس وجہ کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ فوج بھی اس کے پاس کچھ زیادہ نہ تھی کہ جس سے دارا شکوہ کا مقابلہ کر سکتا۔ (س م ح)

(۸۶) فارسی تاریخوں میں اس جگہ کا نام کھجوہ کا تالاب لکھا ہے جو قصبہ کوڑا اور جہان آباد سے پانچ کوس کے فاصلہ پر اب ضلع فتح پور قسمت الٰہ آباد میں ہے۔ یہاں جمنا اور گنگا کا ایک بہت ہی تنگ دوآبہ ہے اور یہ سب مقامات اسی میں ہیں۔ (س م ح)

(۸۷) دارا شکوہ کی شکست کے چند روز بعد میر جملہ کو اورنگ زیب کے احکام کے بموجب سلطان محمد معظم نے جو باپ کی غیبت میں دکن کا منتظم تھا، رہا کر دیا اور تمام مال و

متاع واپس دے دیا تھا اور اس وقت وہ خاندیس کی صوبہ داری کے عہدہ پر برہانپور میں تھا اور حسب الطلب وہیں سے آن کر اس لڑائی میں جو دارا شکوہ کی شکست سے آٹھویں مہینے ہوئی تھی شامل ہوا تھا۔ (س م ح)

(۸۸) پانچویں جنوری ۱۶۵۹ء کو یہ لڑائی ہوئی تھی جو عین جاڑے کا موسم تھا۔ پھر معلوم نہیں ہوتا کہ مصنف نے گرمی کا ذکر کیوں کیا ہے۔ شاید یہ وجہ ہو کہ لڑائی لڑنے والوں کو پانی کی ضرورت ہر موسم میں ہوتی ہے۔ (س م ح)

(۸۹) شاہ جہان کی بیماری کی خبر پا کر جب شجاع نے بنگالہ سے فوج کشی کی تھی اس وقت اللہ وردی خاں بہار کا صوبہ دار تھا۔ پس جب شجاع پٹنہ پہنچا اس نے لڑے بھڑے بغیر ہی اس کی اطاعت کر لی اور اس وقت سے یہ اس کے پاس بجائے وزیر کے تھا اور وہ اس کی اس قدر عزت کرتا تھا کہ ہمیشہ اس کو "خان بھائی" کہتا تھا۔ عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ سنجر نامی اس کا بڑا بیٹا کھجوہ کی شکست کے بعد شجاع سے جدا ہو کر اورنگ زیب کے پاس حاضر ہو گیا تھا اور جب ان واقعات کے بعد شجاع نے میر جملہ اور محمد سلطان کے قریب پہنچ جانے کی وجہ سے مونگیر سے پیچھے راج محل کی طرف کوچ کر دیا تو اللہ وردی خاں فوج مخالف میں آ ملنے کی نیت سے مونگیر میں ٹھہر گیا اور بعض اور دو دلے لوگ بھی اس کے شامل ہو گئے اور چونکہ ایسے بڑے ذمہ دار کے علیحدہ ہو جانے سے نہایت اندیشہ تھا اس لئے شجاع واپس آ کر مونگیر کے باہر اپنے باغ میں آن اترا اور بعض سردار اور کچھ سپاہ اللہ وردی خاں کے حاضر کرنے کو جو مقابلہ کو آمادہ ہو بیٹھا تھا، مامور کی، جو ذرا دھمکا کر اس کو پکڑ لائے اور شجاع نے اس کو مع سیف اللہ نامی اس کے بیٹے کے تہ تیغ کرا دیا۔

پس ان حالات پر خیال کرنے سے تعجب نہیں معلوم ہوتا کہ اس نے بھی ہاتھی سے اتر پڑنے کی صلاح خیانت ہی سے دی ہو۔ (س م ح)

(۹۰) جب اورنگ زیب دارا شکوہ کو مغلوب کر کے شاہ جہاں کو قابو میں لا چکا تو سب سے پہلے یہ کام کیا کہ شجاع کے ساتھ اپنا قدیمی حسنِ سلوک جتانے کو بادشاہ سے بڑے اصرار کے ساتھ اس مضمون کا فرمان حاصل کیا کہ صوبہ بنگالہ کے علاوہ صوبہ بہار بھی، جس کا سلطان شجاع نہایت خواہشمند تھا اور اس کے سلیمان شکوہ سے شکست کھانے کے بعد دارا شکوہ نے بادشاہ سے اپنے نام کرا لیا تھا، شجاع کو دیا گیا اور اس کو اپنے ایک نہایت پرتپاک اور محبت آمیز خط میں ملفوف کر کے جس میں دارا شکوہ کی شکست اور تباہی اور اپنے قدیمی اتحاد کی یاد دہانی

کے علاوہ یہ چلتا ہوا فقرہ بھی درج تھا کہ بالفعل آپ اس طرح پر اپنے اس نقصان کا تدارک کیجئے جو سلیمان شکوہ کے مقابلہ میں اٹھا چکے ہیں اور جب دارا شکوہ کے معاملہ سے فارغ ہو کر میں پنجاب سے واپس آؤں گا تو ملک اور مال دونوں سے آپ کے ساتھ اور بھی رعایتیں کی جائیں گی اس کے پاس بھیجا جس کو لے کر وہ بہت ہی شکر گزار ہوا۔ مگر پٹنہ میں آکر جب دیکھا کہ اورنگ زیب دارا شکوہ کے پیچھے پنجاب کی طرف بہت دور نکل گیا ہے تو آگرہ پہنچنے اور سلطنت پر ہاتھ مارنے کے قصہ سے بنارس اور الٰہ آباد کی طرف بڑھنا شروع کر دیا اور چونکہ دارا شکوہ نے پنجاب کو بھاگنے سے پہلے بذریعہ خط و کتابت شجاع سے صلح کر لی تھی اور اورنگ زیب کی چال بگاڑنے کے لئے پٹنہ سے الٰہ آباد تک اپنے تمام قلع داروں کے نام اس کی اطاعت کرنے کے احکام بھیج دیئے تھے اس سبب سے وہ بلا مزاحمت الٰہ آباد پر قابض ہو گیا۔ ادھر اورنگ زیب کا یہ حال تھا کہ دو طرف لڑائی ڈالنا مناسب نہ سمجھ کر یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح شجاع لڑے بھڑے بغیر ہی واپس چلا جائے اور آگے نہ بڑھے۔ اس لئے پنجاب سے جلد دلی پہنچ کر اوّل شہزادہ محمد سلطان کو آگرہ سے، جو اب تک وہیں مامور تھا، اس کی راہ روکنے کو روانہ کیا اور بعد ازاں موقع سے قریب رہنے کی خاطر شکار کھیلنے کا حیلہ کر کے خود بھی سورون میں جو الٰہ آباد کے رخ گنگا کے کنارے ایک جگہ ہے، جا پہنچا اور اس عرصہ میں شجاع کے پاس کئی بار نصائح آمیز خط اور پیغام بھیجے مگر جب اس نے نہ مانا اور الٰہ آباد سے بھی آگے کھجوہ تک بڑھ آیا تو سترہویں ربیع الاول ۱۰۶۹ ہجری مطابق تیسری جنوری ۱۶۵۹ء کو محمد سلطان کے لشکر سے کوڑہ میں جا ملا جو شجاع کے لشکر سے قریب چار کوس کے تھا اور انیسویں ربیع الاول کو خیمہ گاہ اور کارخانہ جاتِ شاہی کو اسی جگہ کھڑا چھوڑ کر نوے ہزار سواروں کے ساتھ لڑنے کو روانہ ہوا۔ اگرچہ طرفین سے لڑائی ہوتی رہی لیکن دور دور سے صرف توپوں کی تھی اور جب شام کو لڑائی بند ہوئی تو شجاع نے یہ غلطی کی کہ اس کا توپ خانہ جو اونچی جگہ پر تھا اور اس وجہ سے اچھا کام دیتا رہا تھا اپنے لشکر گاہ کے قریب بلا لیا اور میر جملہ نے موقع پا کر اس کی جگہ اپنی توپیں جا جمائیں۔ اور چونکہ شجاع کی سپاہ اور توپخانہ کے پیچھے ہٹ جانے سے اس طرف والوں کو شب خون کا اندیشہ ہو گیا تھا اس لئے اورنگ زیب پیچھے ہٹ کر اپنے لشکر گاہ کو نہ گیا بلکہ اس کی کل فوج اور تمام امیر جس ترتیب سے میدان جنگ میں قائم تھے، وہیں اتر پڑے اور حکم دیا گیا کہ گھوڑوں کے زین اور سپاہیوں کی کمریں اسی طرح بندھی رہیں۔ علاوہ بریں ہوشیار اور خبردار رہنے کے لئے میر جملہ امرا

اور سرداروں کو بہت تاکیدیں کرتا پھرا اور بعد نمازِ عشا جب اورنگ زیب اپنے مختصر سے خیمہ گاہ میں جو میدان جنگ ہی میں لگادیا گیا تھا جاکر سورہا تو آخر شب کو ایک عجیب ہنگامہ برپا ہوا جس سے اس کے لشکر کو بڑا نقصان پہنچا۔ یعنی مہاراجہ جسونت سنگھ جس کی تقصیر معاف کرکے اورنگ زیب دہلی سے اپنے ہمراہ لے آیا تھا اور اس وقت اس کے لشکر کے دائیں پرہ کا سردار تھا، شجاع کو یہ خبر بھیج کر کہ ادھر میں فساد اور شورش برپا کرتا ہوں ادھر آپ آئیں اور اس تدبیر سے اورنگ زیب کو تباہ کرڈالیں، بڑے بڑے راجپوت امیروں کو جو اس پرہ میں تھے ساتھ لے کر میدان جنگ سے پیچھے کو نکل بھاگا اور اوّل محمد سلطان کے کیمپ کو جو بر راہ تھا اور بعد ازاں اور امیروں اور خود اورنگ زیب کے لشکر گاہ اور کارخانہ جاتِ شاہی کو خوب بے دھڑک لوٹتا ہوا چلا گیا۔ اس حادثہ سے ایک عجیب پریشانی اور ابتری پیدا ہوئی اور بہت سے لوگ رات ہی کو شجاع سے جا ملے مگر ابھی کچھ رات باقی تھی کہ اورنگ زیب اس حال کی خبر پاکر تخت رواں پر سوار ہو کر کمال استقلال سے اپنے خیمہ کے باہر آن کھڑا ہوا اور ہنس ہنس کر اپنے رفیقوں اور امیروں کو اس طرح پر تسلی دیتا رہا کہ خوب ہوا کہ ہمارا لشکر منافقوں کے خس و خاشاک سے پاک ہو گیا اور اگرچہ اس ناگہانی فساد کے سبب سے نصف فوج رہ گئی تھی مگر بڑے استقلال سے باقی ماندہ سپاہ کو از سر نو جا بجا جنگی ترتیب سے پھر مامور کیا اور اس غرض سے کہ فوج اس کو اور یہ فوج کو دیکھتا رہے اپنے معمول کے موافق صبح کو ایک بڑے ہاتھی پر سوار ہو کر اور شہزادہ محمد اعظم کو ساتھ بٹھا کر لڑائی کے لئے نکلا۔ چنانچہ اوّل تو توپوں اور بانوں کی لڑائی شروع ہوئی پھر دونوں لشکر باہم لپٹ گئے اور شجاع کے لشکر نے اس کی فوج کے دائیں بازو کو شکست دے کر ہٹا دیا، جس سے بڑی پریشانی ہوئی اور بہت سے سپاہی دشمنوں سے جا ملے اور بعد ازاں انہوں نے فوج کے قلب کو جہاں یہ خود موجود تھا خوب دبایا اور کئی دفعہ یہاں جان جوکھوں میں پڑا۔ چنانچہ ایک جنگی ہاتھی تو اس کے ایسا قریب پہنچ گیا کہ گویا آن ہی لپٹا تھا اور اگر اورنگ زیب کا ایک بندوقچی جو ساتھ کے ہاتھیوں کے ایک ہودے میں بیٹھا ہوا تھا اس کے فیلبان کو گولی سے نہ اڑا دیتا تو خدا جانے اورنگ زیب پر کیا گزرتی۔ غرض اورنگ زیب اپنے استقلال سے ہر خطرناک محل میں غالب آیا اور دشمنوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور ایک سو چودہ توپیں اور بہت سے ہاتھی ہاتھ آئے اور تالاب کھجوہ پر جہاں شجاع کا لشکر مقیم تھا جاکر ڈیرہ کیا اور اسی روز محمد سلطان کو شجاع کے تعاقب میں روانہ کیا اور پھر میر جملہ کو "ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار" کا منصب دے کر اس کی مدد کو بھیجا اور خود آگرہ ہوتا

ہوا اجمیر کو چلا گیا کیونکہ دارا شکوہ گجرات سے اور مہاراجہ جسونت سنگھ اپنے وطن جودھ پور سے بالاتفاق اجمیر پر چڑھ کر آنے والے تھے۔ (ماخوذ از عالمگیر نامہ وغیرہ) (س م ح)

(۹۱) فارسی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شجاع کی بربادی کے بعد اس کو خان خاناں سپہ دار بنگالہ کے خطاب سے لکھا جاتا تھا اور امیر الامراء کا خطاب شائستہ خاں کو تھا۔ (س م ح)

(۹۲) عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ مونگیر کے ایک طرف جو قدرتی پہاڑ اور دوسری جانب دریائے گنگا ہے، افغانوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں پہاڑ سے لے کر دریا تک سوا کوس لمبی دیوار کھنچوا کر اس کے مقابل کی سمت میں خندق کھدوادی تھی۔ شجاع نے ان باہمی فساد کے دنوں میں اس دیوار کی مرمت کرا کر ہر تیس گز پر ایک ایک برج بنوا دیا تھا اور خندق کو پانی تک گہرا کرا دیا تھا۔ (س م ح)

(۹۳) جلال الدین محمد اکبر کے زمانہ سے پہلے وہاں اکثر آگ لگتے رہنے کے سبب سے عوام الناس اس جگہ کو آگ محل کہنے لگ گئے تھے۔ جب راجہ مان سنگھ بنگالہ کا صوبہ دار ہوا ، اس نے اپنے رہنے کے لئے وہاں اینٹ مٹی سے ایک مستحکم حصار تیار کرا کر اس کا نام راج محل رکھ دیا۔ بعد ازاں اس جگہ کا نام بادشاہی دفتروں میں اکبر نگر لکھا جاتا رہا اور اب بدستور راج محل مشہور ہے۔ (س م ح)

(۹۴) یہ عجیب اتفاق ہے کہ انتیسویں رمضان ۱۰۶۹ھ کو ادھر تو یہ شہزادہ باغی ہوا ادھر دارا شکوہ اور سپہر شکوہ ٹھیک اسی تاریخ داور میں ملک جیون کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔

(س م ح)

(۹۵) فارسی تاریخوں سے محمد سلطان کی بغاوت کا سبب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو شہزادگی اور لیاقت کا غرور تو تھا ہی اس پر میر جملہ کی ماتحتی اور بھی ناگوار تھی اور کوتاہ اندیش مصاحبوں کی ترغیبیں اور سلطان شجاع کے دم بھانسے اور اپنی لڑکی سے شادی کر دینے کا وعدہ جس کا ذکر پیچھے ایک حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے سب مل کر اس حرکت کا باعث ہوئے تھے۔ چنانچہ جب یہ شجاع کے پاس جا پہنچا تو بمقام ٹانڈہ جہاں مونگیر اور راج محل کے چھن جانے کے بعد شجاع نے برسات کا موسم بسر کیا تھا اس لڑکی سے اس کی شادی کر دی اور اس کے واپس آنے کا سبب شجاع کی سرد مہری نہ تھی بلکہ روزمرہ کی شکستوں سے جب اس نے دیکھ لیا کہ شجاع کی بہبودی کی کوئی امید نہیں ہے تو مایوس اور نادم ہو کر آٹھ مہینے سے کچھ زیادہ اس کے پاس رہ کر واپس چلا آیا۔ (س م ح)

(۹۶) عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ محمد سلطان اوّل پانچویں شعبان ۱۰۶۹ ہجری کو سلیم گڑھ میں قید کیا گیا اور پھر چھبیسویں جمادی الاوّل ۱۰۷۰ ہجری کو یہ اور سلیمان شکوہ جو سری نگر سے گرفتار ہو کر آیا تھا دونوں گوالیار بھیج دیئے گئے تھے۔ مگر ۱۰۸۱ ہجری میں ملتفت خاں کو بھیج کر محمد سلطان اور دارا شکوہ کے دوسرے بیٹے سپہر شکوہ کو وہاں سے بلالیا اور کچھ دنوں پھر سلیم گڑھ میں زیرِ حراست رکھ کر تقریباً چودہ برس کی قید کے بعد شروع ۱۰۸۳ ہجری میں خلعت وغیرہ دے کر چھوڑ دیا اور مراد بخش کی بیٹی دوستدار بانو بیگم سے نکاح کر دیا اور اپنے ہاتھ سے موتیوں کا سہرا باندھ کر قلعہ کے اندر کی مسجد میں سلام کرانے لے گیا اور بارہ ہزار روپیہ سالانہ مقرر کر دیا اور جشنِ عیدالاضحی کے موقع پر ایک گوسفند کو تو خود قربانی کیا اور ایک اونٹ محمد سلطان سے کرایا اور ۱۰۸۶ ہجری میں کشتواڑ کے راجہ کی بیٹی بائی نھوب دنی نامی سے اس کا نکاح کیا گیا اور سات لاکھ روپیہ کا زیور عطا ہوا اور کتاب مآثر عالمگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۸۵ ہجری میں درّہ خیبر کے پٹھانوں کی بغاوت کی وجہ سے جب اورنگ زیب کو ایک عرصہ تک بمقام حسن ابدال رہنا پڑا تھا، محمد سلطان کو بست ہزاری دہ ہزار سوار کا منصب مع خلعت کے اور ایک لاکھ روپیہ نقد اور نقارہ ونشان وغیرہ عطا ہو گیا تھا اور وہاں سے معاونت کے بعد اگلے برس سات لاکھ روپیہ نقد عنایت ہوا۔ مگر باوجود اس کے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ قید سے چھوٹنے کے بعد کسی جگہ کی صوبہ داری ملی ہو یا اس کے اور بھائیوں کی طرح اس کو کسی مہم میں سر لشکر بنا کر بھیجا گیا ہو بلکہ ایسا پایا جاتا ہے کہ بادشاہ کی سرد مہری اپنے اس بیٹے کی نسبت چلی ہی جاتی تھی۔ کیونکہ جب یہ شہزادہ اڑتیس برس دو مہینے کا ہو کر ۱۰۸۷ ہجری میں مرا ہے اس کی نسبت اسی کتاب (مآثر عالمگیری) میں یہ عبارت لکھی ہے کہ "پادشاہزادہ را امراض شدید عارض شد۔ مدتے بستر گزین بیتابی بودند مقام خاص شکار خبر ملالت اثر رسید کہ صرصر فنا آں نخل باغ مجد وعلا را از باغ دنیا برداشتہ حدیقہ عقبیٰ نشاند باوجود قوت حوصلہ حضرت راز اسماع ایں واقعہ ناگزیر پائے قرار از جا رفتہ دل پُر غم و دیدہ پُر نم شد و بروح اللہ خاں خانساماں وسیادت خاں و عبدالرحیم خاں وشیخ نظام ملا محمد یعقوب فرمان رفت کہ در روضہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی برحمت حق سپارند"۔ جس سے بہر حال یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ باوجود اس کے مرض الموت میں مبتلا ہونے کے بھی اورنگ زیب نے اس کو جا کر نہیں دیکھا۔ بلکہ سیر و شکار میں مصروف رہا اور اسی کتاب میں عالمگیر کی اولاد کے ذکر میں مصنف نے اس شہزادہ کی لیاقت اور قابلیت کی نسبت

یہ عبارت لکھی ہے ”اولیں فروغ دودمانِ مجد احسان پادشاہزادہ محمد سلطان ولادت ایشاں از بطن نواب بائی چہارم رمضان ۱۰۴۹ ہجری وقوع یافت بشرایف آداب و محاسن اوصاف متصف وحفظِ کلامِ مجید و اکثر کمالات و خواندن و نوشتن عربی و فارسی وترکی بہرہ دانی داشتند و رمحاربانے کہ آنحضرت راپیش از جلوس با اعادی دولت اتفاق افتادہ مصدر ترددات شائستہ شدہ داد شجاعت و دلیری دادند سنہ بست ویک جلوس حضرت اعلیٰ خاقانی بسیر ریاض آخرت رفتند“۔ (س م ح)

(۹۷) جہانگیر سے اس کی اکثر ان بن ہی رہتی تھی اور جب وہ مرا ہے تب تو یہ دکن میں علانیہ باغی تھا۔ (س م ح)

(۹۸) محمد سلطان اور محمد معظم دونوں ایک ہی ماں سے تھے اور محمد معظم قریب چار سال کے اس سے چھوٹا تھا اور اورنگ زیب کے بعد یہی بادشاہ ہوا تھا اور اپنی چند سالہ بادشاہی کے مختصر زمانہ میں ایک نیک سیرت بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ لکھا ہے کہ یہ چھٹپن ہی میں قرآن مجید کا حافظ ہو گیا تھا اور فنِ قرأت اور تجوید سے خوب واقف تھا اور علم حدیث و فقہ میں تو ایسا کامل تھا کہ ہمعصر حال بھی مانتے تھے اور مسائل فقہ کا استنباط و استخراج خود قرآن و حدیث سے کر سکتا تھا۔ عربی ایسی بولتا تھا کہ فصحائے عرب پسند کرتے تھے اور ترکی اور فارسی تو گویا اس کے گھر کی زبانیں تھیں۔ خوشنویسی میں بھی کامل تھا اور کئی طرح کے خط لکھنے جانتا تھا۔ نیک اوقات ایسا تھا کہ راتیں نماز و وظائف اور تلاوتِ قرآن مجید اور مطالعہ کتب تفسیر و حدیث و فقہ و تصوف میں بسر کرتا تھا اور صبح کی نماز ہمیشہ اوّل وقت ادا کر کے کچھ دن چڑھے تک اوراد اور وظیفے پڑھتا اور اس کے بعد منتظرانِ دیدار کے لئے ’جھروکہ درشن‘ میں بیٹھتا اور مستغیثوں اور فریادیوں کی داد دیتا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر دیوانِ خاص یا عام میں بیٹھ کر ملکی و مالی معاملات سنتا اور نمازِ ظہر کے بعد محل سرا میں جا کر کھانا کھاتا اور کسی قدر سوتا اور نمازِ عصر پڑھ کر فریادیوں کی دادرسی کرتا اور لوگوں کا سلام مجرا لیتا اور نمازِ مغرب کے بعد درود و وظائف میں مصروف رہتا اور قریب ڈیڑھ پہر رات گزرے نمازِ عشا پڑھ کر محل سرا میں چلا جاتا تھا۔ مگر باوجود ان تمام صفاتِ حمیدہ اور کمال اطاعت کے آخر کار اس کو بھی بدگمان باپ کے قہر و غضب کا نشانہ بننا ہی پڑا۔ یعنی جب اورنگ زیب نے سکندر عادل شاہ نابالغ والی بیجاپور کی بربادی کے لئے محمد معظم کے سوتیلے بھائی محمد اعظم شاہ کو اور ابوالحسن تانا شاہ والی حیدر آباد دکن کی بیخ کنی کے لئے اس کو مامور کیا تو اعظم شاہ اور لوگوں کی در اندازی

سے یہ شبہ ہو گیا کہ والی دکن سے اس کی سازش ہے اور باوجودیکہ خود بادشاہ کے بعض معتمدان خاص نے اس کی بے جرمی کی شہادت دی مگر بد گمانی رفع نہ ہوئی اور ۱۰۹۷ ہجری میں بیوی بچوں اور متوسلوں سمیت نہایت ذلت اور سختی سے قید کر دیا اور پانچ برس سے زیادہ تک قید رکھا اور تمام مال واسباب اور جاگیر وغیرہ ضبط کی گئی، یہاں تک کہ اس کی زوجہ نورالنسا بیگم کے کانوں اور گلے کے زیور تک چھین لئے گئے اور اس کو اور اس کے بیٹوں کو حجامت بنوانے، ناخن کٹوانے، ٹھنڈا پانی پینے، گرم روٹی کھانے اور مناسبِ حال لباس پہننے سے مدتوں ممانعت اور محرومی رہی اور لطف یہ ہے کہ مآثر عالمگیری میں (جس کا مصنف التزام کے ساتھ بڑے ادب اور اعتقاد سے ہمیشہ اورنگ زیب کی تعریف لکھتا ہے) لکھا ہے کہ اگرچہ حضرت اورنگ زیب کو اس کی قید کے زمانہ میں اس امر کا بھی اقرار تھا کہ ہمارے ہاتھ سے اس پر ظلم ہو گیا ہے، مگر فرماتے تھے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ خداوند کریم ہمارے دل کو اس کے حال پر مہربان کر دے۔ (ماخوذ از مآثر عالمگیری و سیر المتاخرین) (س م ح)

(۹۹) دارا شکوہ کے تعاقب میں پنجاب کو جاتے ہوئے اگرچہ سرسری طور پر تخت نشینی کی رسم بمقام باغ اعز آباد جو شاہ جہان آباد کے قریب لاہور کے راستہ پر تھا پہلی ذیقعد ۱۰۶۸ ہجری کو عمل میں آچکی تھی مگر باقاعدہ جلوس اس وقت کیا گیا تھا جبکہ شجاع کو بمقام کھجوہ شکست دینے کے بعد مراد بخش کو قلعہ گوالیار میں بھیج دیا گیا اور دارا شکوہ کو بمقام اجمیر انتیسویں جمادی الثانی ۱۰۶۹ ہجری کو دوبارہ بھی شکست ہو چکی اور وہ الٹے پاؤں احمد آباد کی طرف نہایت بے سروسامانی کے ساتھ بھاگ گیا۔ اس تخت نشینی کو مصنف نے دارا شکوہ کی شکست کے واقعہ سے پہلے خدا جانے کس طرح لکھ دیا ہے اور یہ جلوس چوبیسویں رمضان سنہ مذکور کو قلعہ شاہ جہان آباد میں (جس میں اب تک یہ داخل نہیں ہوا تھا) ہندو اور مسلمان نجومیوں کے مجوزہ مہورت کے موافق جبکہ شمسی حساب سے اس کو اکتالیسواں برس تھا معمولی تکلفات کے ساتھ کیا گیا اور اورنگ زیب نے اپنا لقب حسب ذیل قرار دیا "ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی" اور بے اولی کے خیال سے سکہ میں کلمہ طیبہ اور خلفائے اربعہ کے ناموں کی جگہ سونے اور چاندی کی مناسبت سے باختلاف لفظ مہر و بدر یہ بیت تجویز ہوئی:

سکہ زد در جہاں چو مہر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اور اگر چہ کسی کتاب تاریخ میں نہیں دیکھا گیا مگر مشہور ہے کہ جب خطیب دستور کے موافق اس کے بزرگوں کو کسی کو جنت آشیانی اور کسی کو خلد مکانی وغیرہ وغیرہ کہہ کر گننے لگا اور جہانگیر کے نام پر پہنچا تو اورنگ زیب نے فراست سے معلوم کیا کہ یہ اس امر میں حیران ہے کہ جیتے جاگتے شاہ جہاں کا کیا کہہ کر نام لے، فوراً اس کی طرف مخاطب ہو کر قیدی باپ کے لئے یہ حسب حال اور لطیف لقب تجویز کر دیا اور کہا کہ خطیب ہو۔ (تارک تاج ودیہم ثانی سلطان ابراہیم شہاب الدین محمد شاہ جہاں بادشاہ غازی صاحبقران ثانی)۔ (س م ح)

(۱۰۰) عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ گجرات میں داراشکوہ کے پاس بائیس ہزار سوار اور ایک اچھا توپ خانہ موجود ہو گیا تھا اور کھجوہ کی لڑائی میں جسونت سنگھ کی بغاوت سے جو افواہیں اڑی تھیں ان کو سن کر جلد بازی سے جسونت سنگھ کی عرضیوں کے پہنچنے سے پہلے ہی اجمیر کو چل پڑا تھا۔ (س م ح)

(۱۰۱) عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ جے سنگھ نے اورنگ زیب کی خواہش کے موافق اپنے خط کے ساتھ اسی مضمون کا بادشاہی فرمان بھی اپنے ایک خاص آدمی کے ہاتھ جسونت سنگھ کے پاس بھیجا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر چہ وہ جودھپور سے سوار ہو آیا تھا مگر راستے میں سے الٹا پھر گیا۔ (س م ح)

(۱۰۲) اس لڑائی کا حال عالمگیر نامہ میں یوں لکھا ہے کہ نواح اجمیر میں جو پہاڑیاں ہیں چونکہ ان کی سب گھاٹیاں روک کر مورچہ بندی اچھی طور سے کی گئی تھی اور داراشکوہ کا توپخانہ بھی مناسب جگہ قائم کیا گیا تھا اس لئے اورنگ زیب کے امیروں کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ حملہ کریں۔ یہاں تک کہ تین دن یوں ہی گزر گئے اور صرف توپ بندوق سے دور دور کی لڑائی ہوتی رہی۔ آخر اورنگ زیب نے مجبور ہو کر ان کو غیرتیں بھی دلائیں اور ڈرایا دھمکایا بھی اور انعام واکرام کے وعدے بھی کئے مگر پھر بھی حالت بدستور رہی تھی۔ اتفاق سے راجہ راجروپ جموں والے کے کوہستانی سپاہی کوکلہ پہاڑی کے پیچھے کی طرف ایک ایسی جگہ دیکھ آئے کہ جہاں سے پیادے سپاہی چڑھ کر مخالف کے مورچہ پر حملہ کر سکتے تھے۔ راجہ نے اورنگ زیب کو اس حال کی اطلاع کر کے کچھ اپنے سپاہی اس پہاڑی کو روانہ کئے اور خود بھی اپنی باقی ماندہ فوج لے کر ان کی مدد اور نگہبانی کے طور پر مخالف کے مورچوں کی طرف چلا گیا۔ چونکہ اتفاقاً اس وقت اورنگ زیب کے توپ خانہ سے توپیں چلنی بند ہو گئی تھیں اس باعث

سے ذرا دلیر ہو کر دارا شکوہ کی فوج میں سے کوئی ایک ہزار سوار راجہ راجروپ پر حملہ کرنے کو اپنے مورچوں سے باہر نکل آئے اس پر اورنگ زیب کے مسلمان امیروں میں سے اول دلیر خان اور پھر شیخ میر نے اپنی اپنی فوجیں ساتھ لے کر ایسے زور سے حملے کئے کہ ان کے مورچوں تک جا پہنچے اور اس طرح پر ایک اچھی لڑائی ہو پڑی، جس میں شیخ میر جو ہاتھی پر سوار اپنی سپاہ کو لڑاتا تھا بندوق کی گولی سے مارا گیا مگر اس کا ایک ہم قوم سید جو پیچھے بیٹھا ہوا تھا، اس نے ہشیاری سے اس کی لاش کو ایسے طور کے ساتھ تھامے رکھا جس سے دشمنوں کو بلکہ خود اس کی سپاہ کو لڑائی کے خاتمہ تک اس کا مارا جانا معلوم نہ ہوا اور دلیر خاں تو جرأت کر کے دارا شکوہ کے مورچوں ہی میں جا گھسا اور اس کے ایک نامور سردار کو خاص اپنے تیر سے ہلاک کیا اور خود بھی زخمی ہوا اور ان حملوں میں اس طرف سے شاہ نواز خاں اور کئی اور نامی سردار بھی مارے گئے۔ اتنے میں راج روپ کے کوہستانی پیدلوں نے کوکلہ پہاڑی پر اپنا نشان جا گاڑا اور راجہ جے سنگھ بھی اپنی فوج لے کر ان سب سرداروں کی مدد کو جا پہنچا۔ دارا شکوہ کی سپاہ راج روپ اور دلیر خان کی جرأت اور دلیری سے پہلے ہی ہمت ہار چکی تھی اور خود دارا شکوہ کا تو یہ حال تھا کہ اس نے مایوسی کے مارے اپنی بیگمات کو اوّل ہی ہاتھیوں پر سوار کرا کر اور ضروری مال و اسباب اور روپیہ اشرفی اونٹوں اور خچروں پر لدوا کر "اناساگر" تالاب کے کنارے میدان جنگ سے کچھ فاصلہ پر کھڑا کر رکھا تھا۔ مگر جب رات ہو گئی تو ساری امیدیں قطع کر کے اس قدر سراسیمہ ہو کر بھاگا کہ اپنی بیگموں کو ساتھ لینا تو درکنار ان کو اپنے بھاگنے کی خبر بھی نہ کر سکا۔ اور جن کو اس کا ایک معتمد خواجہ سرا یہاں سے لے جا کر دوسرے دن بمشکل شامل ہو سکا۔ اور سوائے فیروز خاں میواتی کے اور کسی رفیق نے اس کا ساتھ نہ دیا یہاں تک کہ جو راجپوت اس کے مال و دولت کے لدے ہوئے اونٹوں اور خچروں کے محافظ تھے اور جن پر اس کو وفاداری کا بہت بڑا بھروسہ تھا وہی ان کو ہانک کر اپنے اپنے گھروں کو لے گئے۔ اس طرح پر لڑائی سے تیسرے دن باوجود اورنگ زیب کے امرا کی کم ہمتی کے جس کو عالمگیر نامہ والے نے مفصل لکھا ہے، اس کو اپنے خیمہ میں بیٹھے بٹھائے ۲۹ جمادی الآخر ۱۰۶۹ ہجری کو ایسی فتح حاصل ہو گئی کہ جس سے وہ اب بے کھٹکے بادشاہ ہو گیا، اگرچہ اور امیر بھی مثل شائستہ خان و ہوشدار خاں وغیرہ اپنی اپنی فوجیں ساتھ لے کر لڑنے کو گئے تھے مگر عالمگیر نامہ میں اس فتح کو صرف راجہ راج روپ، شیخ میر بہادر خاں اور راجہ جے سنگھ ہی کی کارگزاری سے منسوب کیا ہے۔ (س م ح)

(۱۰۳) داراشکوہ کو جب داور میں ملک جیون کے پاس جانے کا اتفاق ہوا تو اس کا بڑا سبب ایک یہ بھی تھا کہ جب داراشکوہ اس نواح میں پہنچا تو ملک جیون کی اکثر عرضیاں اس کے پاس باظہار تابعداری و یاد حقوق جان بخشی آئی تھیں۔ (س م ح)

(۱۰۴) اس سے پہلے حاشیہ میں لکھا جاچکا ہے کہ شیخ میر جس کو مصنف جا بجا میر بابا لکھتا ہے داراشکوہ کے مقابلہ میں۔مقام اجمیر اس سے پہلے ہی مارا جاچکا تھا۔ (س م ح)

(۱۰۵) عالمگیر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ داراشکوہ نے گجرات کو جاتے ہوئے ایسی کڑی منزلیں کی تھیں کہ آٹھ دن کے عرصہ میں احمد آباد کے قریب پہنچ گیا تھا۔ مگر چونکہ اس کی شکست کی خبر سن لینے کی وجہ سے سردار خاں نامی ایک منصب دار نے جو اس کے مقرر کئے ہوئے حاکم سید احمد بخاری کو گرفتار کرلیا اور مقابلہ کے لئے تیار ہو بیٹھا تو اس کو ناچار کانہ جی نامی کولی سے جو بقول صاحب سیر المتاخرین رہزنوں کا سرغنہ اور احمد آباد کے نزدیک ہی کا رہنے والا تھا، ملتجی ہونا پڑا۔ اور اس نے یہ آدمیت کی کہ ساتھ ہو کر کچھ کے راجہ کے ملک میں پہنچا دیا مگر وہاں کے راجہ نے جو پہلے اس قدر اطاعت سے پیش آیا تھا کہ اپنی لڑکی بھی سپہر شکوہ سے منسوب کردی تھی، ایسی رکھائی دکھائی کہ ملاقات تک کو نہ آیا اور فیروز خاں میواتی بھی کھسک کر اورنگ زیب کے پاس چل دیا تو وہ صرف دو روز وہاں ٹھہر کر بھکر کی طرف چلا گیا اور دریائے سندھ سے اتر کر ایک سرحدی رئیس کے علاقہ میں جس کو عالمگیر نامہ کے نسخہ مطبوعہ کلکتہ میں علی اختلاف النسخ "ولایت چاند خاں یا چاندیاں" لکھا ہے جا پہنچا جہاں کے لوگوں نے اس کو خوب لوٹا کھسوٹا اور پکڑ لینے کے درپے ہوئے لیکن ابھی اس کے پاس کچھ جمعیت باقی تھی اس لئے لڑتا بھڑتا ایک اور سرحدی سردار کے علاقہ میں جس کو "ولایت مگسیاں" کے نام سے لکھا ہے جہاں سے قندھار دس بارہ منزل تھا جا داخل ہوا۔ اور "میرزائے مگسی" وہاں کا رئیس استقبال کر کے اپنے ہاں لے گیا۔ اور بہت خاطر داری کی اور ساتھ ہو کر قندھار پہنچا دینے کا ذمہ دار ہوا۔ مگر داراشکوہ نے بدقسمتی سے ملک جیون رئیس داور کو (جو جیکب آباد سندھ کی چھاؤنی سے پرے مقام سبی کے نزدیک درہ بولان کے راستہ پر واقع ہے) جان بخشی کے احسانوں کا ممنون اور خیر خواہ سمجھ کر لکھ بھیجا تھا کہ میں چند روز تیرے ہاں ٹھہر کر آرام لوں گا اس لئے اس نے ایوب نامی اپنے ایک معتمد کو اس کے لینے کو سرحد پر بھیج دیا اور ایک کوس تک خود استقبال کر کے اپنے ہاں لے گیا۔ چنانچہ یہ اپنی بیگم کی نعش ساتھ لئے ہوئے جو سل کی بیماری سے مرگئی تھی اس کے گھر پہنچا اور چونکہ اس

نے وصیت کی تھی کہ مجھ کو میاں میر بدخشی کے مزار واقع لاہور میں جن کو دارا شکوہ اپنا پیر سمجھتا تھا دفن کرنا، ملک جیون کی وفاداری کے بھروسہ پر اپنے بہادر اور وفادار نوجوان سردار گل محمد اور معقول نامی خواجہ سرا اور ان ستر جاں نثار سواروں کے جو تمام فوج میں سے اب صرف وہی باقی رہ گئے تھے، بیگم کی نعش کے ساتھ لاہور کو بھیج دیا اور آپ صرف چند خدمتگاروں اور خواجہ سراؤں کو پاس رکھ کر قندھار جانے کے ارادہ سے وہاں ٹھہر گیا۔ مگر ملک جیون نے یہ پاپی پن کیا کہ انتیسویں رمضان ۱۰۶۹ ہجری کو قندھار جانے کی راہ میں آن کر گرفتار کر لیا اور باقر خاں فوجدار بھکر اور بہادر خاں اور راجہ جے سنگھ کو جو اس کے تعاقب میں بھکر کے قریب پہنچ گئے تھے لکھ بھیجا اور بہادر خاں نے باوجود ملک سندھ کی گرمی اور باد سموم کے بیسیل یلغار داور پہنچ کر جا سنبھالا اور اپنے اور جے سنگھ کے لشکر میں جو اس وقت بھکر کے قریب پہنچ گیا تھا، لے آیا۔ (س م ح)

(۱۰۶) صحیح نام خضر آباد ہے۔ یہ جگہ دہلی اور آگرہ کے معمولی شاہراہ پر واقع تھی۔ کتاب آثار الصنادید مصنفہ سید احمد خاں بہادر سی ایس آئی اور آرکیالوجی آف دہلی مصنفہ مسٹر کارسٹیفن صاحب بہادر سے جو اس کے بعد لکھی گئی ہے، اصلیت اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ خضر خاں سید بادشاہ دہلی نے جو ۱۴۱۴ء سے ۱۴۲۱ء تک بادشاہ رہا تھا اس جگہ سے جہاں ہمایوں کا مقبرہ ہے، قریب دو میل جنوب مشرق کی طرف جمنا کے کنارے اس نام کا ایک شہر آباد کرنا چاہا تھا۔ مگر اب اس کا کوئی نشان بجز ایک ٹوٹے ہوئے مقبرہ کے جو عوام میں "خضر کی گمٹی" کے نام سے مشہور ہے، باقی نہیں ہے۔ (س م ح)

(۱۰۷) کتاب عمل صالح میں لکھا ہے کہ حکیم داؤد ابن حکیم عنایت اللہ، شاہ عباس صفوی بادشاہ ایران کا طبیب خاص اور اس کا مقرب تھا۔ مگر جب شاہ کا انتقال ہو گیا تو کچھ دنوں خانہ نشین رہ کر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو چلا گیا اور پھر وہاں سے لاہری بندر واقعہ ملک سندھ کی راہ سے شاہ جہاں کے سترہویں سال جلوس مطابق ۱۰۵۳ ہجری میں یہاں چلا آیا، فن طبابت میں کامل ہونے کی وجہ سے رفتہ رفتہ یہاں تک قرب حاصل کیا کہ پنج ہزاری کا منصب اور تقرب خاں کا خطاب پایا۔ مگر اس کے بے عزت اور ذلیل ہو کر قتل ہونے کا حال جیسا کہ مصنف نے متن میں لکھا ہے باوصف تلاش ہم کو کسی کتاب میں نہیں ملا۔ (س م ح)

(۱۰۸) فارسی کتابوں میں نذیر بیگ چیلہ لکھا ہے اور واضح ہو کہ شہنشاہ اکبر نے اپنے عہد میں کئی ہزار غلاموں کو جن کو "بندہ ہائے بادشاہی" کہا جاتا تھا آزاد کر کے چیلہ کا لقب دے دیا

تھا اور اس کا قول تھا کہ خدا کے بندوں کو اپنا بندہ کہنا مناسب و شایان نہیں ہے اور غالباً لفظ چیلہ اس لئے اختیار کیا گیا ہوگا کہ اس زمانہ میں ان بادشاہوں کو تحریر و تقریر میں اکثر پیر و مرشد کہا جاتا تھا۔ (س م ح)

(۱۰۹) داراشکوہ کی بیگم کا دادر کے قریب پہنچ کر سل کی بیماری سے مرنا پہلے لکھا گیا ہے زہر کھا کر مرنا صحیح نہیں ہے اور اب داراشکوہ کی تشہیر اور قتل کا حال جس طرح عالمگیر نامہ اور سیر المتاخرین میں لکھا ہے اس کا اس جگہ تحریر کیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے مگر چونکہ عالمگیر نامہ کا بیان اس واقعہ کے جزئیات اور اورنگزیب کے دلی خیالات کی نسبت کسی قدر رکا رکا ہے اس لئے "سیر المتاخرین" کی عبارت جو واضح تر ہے اور جس کا بڑا ماخذ تاریخ خافی خاں اور تاریخ "مرآۃ العالم" ہے جو اورنگ زیب کے ایک بڑے معتمد خواجہ سر اختاور خاں کی تصنیف ہے یہاں بعینہ نقل کی جانی زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ وھوھذا:

"ہمدریں ایام بہادر خاں کہ داراشکوہ را با پسر شکوہ از مختیار خاں (ملک جیون) گرفتہ مقید بسلاسل بآئین ناسزا حسب الامر ای آوردہ بظاہر دارالخلافہ رسید۔ نذیر بیگ چیلہ از فرط خوشی معین شد کہ پیش رفتہ داراشکوہ را بصورتیکہ عالمگیر میخواست دیدہ بیاید۔ شانزدہم ذی الحجہ چیلہ مذکور برگشتہ دولت زمیں بوس دریافت و حقیقت حال آن بیچارہ باز نمودہ باز مرخص شد و سہ شنبہ ہفدہم ذی الحجہ حکم فرمود کہ داراشکوہ را مسلسل باپسرش در حوضہ سر کشادہ بر مادہ فیل نشانیدہ بیارند و نذیر بیگ چیلہ در عقب فیل نشستہ باشد و بہادر خاں بافواج ہمراہ گشتہ داخل شہر سازند و از میان شہر و بازار بہ دہلی کہنہ بہ خرآباد رسانند و در جائے محفوظے در عمارات خواص پورہ آن کہ برائے بود نش قرار یافتہ نگاہدارند و بموجب حکم بعمل آمد۔ روز دوم کہ مختیار خاں داخل شہر شد بعضے از نوکران شاہ جہاں آن تبہ کار را دیدہ از خود رفتند و بازاریان شہر نیز از عمل او نفرت نمودہ بشوریدند و بے اختیار بر سر او و افاغنہ ہمراہش ریختہ بزیر چوب و سنگ گرفتند تا آنکہ چند کس ازان سیاہ رویان از پائے در آمدند و برخے مجروح و خستہ و سر و گردن شکستہ کنند و نزدیک بود کہ فتنہ عظیمی بلند شود۔ کوتوال شہر با جمعیت خود رسیدہ آشوب را فرو نشانید و مختیار اہام اہیانش بقلعہ رسانید۔ بادشاہ حق پرست امعدلت کیش از علمائے مذہب خویش فتویٰ طلبید۔ علمائے سو حکم نمودند کہ خون چنیں ملحد کہ (در رسائل نوشتہ خود کفر و اسلام را برادر توام خواندہ و گفتہ است "کفر و اسلام در رہش پوریاں۔ وحدہ لاشریک لہ گویاں") و کسانیکہ خونی او بر خلاف رضائے خلیفہ خواہند درست است۔ بادشاہ دیں پرور حق

شناس! استحکام اساس سلطنتِ خود در قتل آن بیچارہ سراسر یاس دیدہ حکم القتل او در دوستدار انش کہ بر سر ختیار خاں ریختہ بودند داد و دارا شکوہ آخر روز چار شنبہ بست ویکم ذی الحجہ مطابق ہژدہم شہریور (آسوج) مقتول گشت و لاش اور بعد تشہیر و مقبرہ ہمایوں دفن کردند و سپہر شکوہ را بردہ در قلعۂ گوالیار محبوس داشتند وبعضے از احدیان پادشاہی کہ بازی فتنہ و شورش بر ختیار خاں شدہ بودند در پیشگاہ عدالت رسیدہ حسب الامر علمائے دیندار! از قید دنیائے ناپایدار رہائی یافتند"۔ اور عالمگیر نامہ میں یہ عبارت زیادہ لکھی ہے۔

"آخر روز چہار شنبہ بست ویکم ماہ مذکور مطابق ہژدہم شہریور کہ ہماں روز قضیۂ اوباشان شہر رو دادہ بود فرمان قہرمان جلال صادر شد کہ آن وخیم العاقبت (دارا شکوہ) را در خضر آباد از قیدِ ہستی بر آرند و باہتمام سیف خاں ونذیر بیگ چیلہ وچندے دیگر از چیلہ ہائے معتمدِ او لیلِ شب پنجشنبہ ۱۰۶۹ ہجری چراغ زندگانی او خاموش شدہ بہ نہان خانہ عدم شتافت وباشارۂ معلی پیکر فتنہ سرشتِ پُر شور و شرش را بمقبرۂ حضرت جنت آشیانی ہمایوں پادشاہ نقل کردہ درتہ خانہ کہ زیرگنبدِ مرقد آنحضرت است وشاہزادہ دانیال وشاہزادہ مراد پسران حضرت عرش آشیانی جلال الدین محمد اکبر آنجا مدفون اند دفن نمودند۔ و روز دیگر فرمان جہاں مطاع بنفاذ پیوست کہ سیف خاں سپہر شکوہ را بقلعۂ گوالیار رسانیدہ بخارسان آن حصنِ عالی اساس سپارد و بمستقر الخلافۂ اکبر آباد معاودت نمودہ بہ صوبہ داری آنجا از تغیر مخلص خاں کہ بہ بنگال تعین یافتہ بود قیام نماید بست سوئم" راجہ جے سنگھ کہ از بہادر خاں در عقب ماندہ بود (جو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے بدنامی کے موقع سے دانستہ بچ جاتا تھا) بجبہ سائے عتبۂ سپہر آسا گشت وملک جیون کہ قبل ازیں بمنصب ہزاری ودو صد سوار و خطاب ختیار خانی کامیاب وعنایت شدہ بود باضافہ صد سوار ومرحمتِ خلعت و خنجر مرصع واسپ عربی با زین وساز مطلا ویک زنجیر فیل باساز میناکار مشمول مراحم گوناگوں گردید و چوں حکم جلیل القدر از پیشگاہ معدلت بہ تحقیق منشائے قضیۂ شور انگیزی اوباشان شہر کہ نسبت بافغانان او روئے نمود صادر شدہ بود بعد از تحقیق وتفحص بہ ثبوت پیوست کہ ہیبت نام فتنہ جوئے از خیل احدیانِ پادشاہی بادی ایں جرأت و محرک سلسلہ فساد بودہ است لہذا شحنہ شہر او را گرفتہ بہ پیشگاہ عدالت حاضر ساختہ و ازیں جہت کہ منشائے ایں قسم جسارتے شدہ باعث ہلاک جمعی از مسلمانان گشتہ بود مورد انظار قہر و عتاب بادشاہانہ گردیدہ حکم شدہ کہ او را بیاسا رسانند"۔

صاحب عالمگیر نامہ نے دارا شکوہ کی تشہیر کی وجہ تو اگرچہ صاف صاف لکھ دی ہے کہ "تا ہمگی خلائق آن رمیدہ بخت را بے شائبہ شک و ریب برای العین مشاہدہ نمایند و من بعد ژاژ خایان بے ہودہ گود واقعہ طلبان فتنہ جو راجائے سخنان لاطائل و مجال تصورات باطل نماند و در حدود و اطراف مملکت اوباشان رابہانہ فساد و دستاویز شورش بہم نرسد وبموجب حکم جلالت آثر آن سیہ روز برگشتہ اختر را با پسرش بر یک حوضہ فیل نشانیدہ آشکارا براہ بازار داخل شہر کردند و از پائے قلعۂ مبارکہ گزرانیدہ بوئیے کہ ہمہ کس دیدند و احدے را در وجود بے سود او شک و شبہ نماند بشہر کہنہ بردند"۔

مگر اس کتاب میں ہاتھی پر ڈال کر اس کی نعش کی تشہیر کا ذکر جس کو صاحب "سیر المتاخرین" نے بہت وضاحت سے اور بہ تکرار لکھا ہے تحریر نہیں کیا اور تاریخ "عمل صالح" میں لکھا ہے کہ دارا شکوہ کو نیلا لباس پہنا کر دہلی میں داخل کیا گیا تھا اور اسی لباس سے دفن کیا گیا۔

چونکہ اس شہزادہ کی پیدائش ۱۰۲۴ ہجری کی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پینتالیس برس کی عمر میں قتل کیا گیا۔ (س م ح)

(۱۱۰) عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ اگرچہ سلیمان شکوہ کا قابو میں آجانا حسب ظاہر ایک "امر بدیع تھا لیکن بادشاہ کی خوش اقبالی سے یہ مشکل یوں حل ہو گئی کہ سری نگر کا راجہ اپنے ملک کی تباہی کے اندیشہ سے کیونکہ تربیت خاں رعد انداز خاں وغیرہ کئی امیر اس کی تسخیر کے لئے مامور تھے راجہ جے سنگھ کی معرفت سلیمان شکوہ کے سپرد کر دینے کا وعدہ کر کے معافی کا خواستگار ہوا اور بادشاہ نے سلیمان شکوہ کے لانے کے لئے جے سنگھ کے بیٹے کنور رام سنگھ کو سری نگر کو روانہ کر دیا۔ چنانچہ اس نے رام سنگھ کا قریب پہنچ جانا سن کر سلیمان شکوہ کے گرفتار کر لینے کو جہاں وہ رہتا تھا اپنے آدمی بھیج دیئے۔ شہزادہ مقابل سے پیش آیا اور اس کا کوکہ محمد شاہ (جس کا نام بعض نسخوں میں محمد شاہ اور بعض میں محمد شاکر لکھا ہے) اور کئی اور رفیق خوب بہادری سے لڑ کر مارے گئے اور وہ خود گرفتار ہو گیا اور پانچویں جمادی الاول ۱۰۷۰ ہجری کو راجہ پرتھی سنگھ نے اپنے بیٹے میدنی سنگھ کے ساتھ رام سنگھ اور تربیت خاں اور رعد انداز خاں کے پاس پہاڑ سے نیچے بھیج دیا۔ اس خبر کے آنے پر دربار میں بڑی خوشیاں منائی گئیں اور حسب مذکورہ بالا امرا اس کو دہلی میں لے کر آئے تو شہزادہ محمد سلطان کے پاس قلعہ سلیم گڑھ میں قید کیا گیا۔ (س م ح)

(۱۱۱) کتاب "عمل صالح" میں بھی سلیمان شکوہ کی وفات کی نسبت اسی مضمون مندرجہ متن کی تائید پائی جاتی ہے جس کی بجنسہٖ عبارت بعینہٖ یوں ہے کہ "در شہر شوال ۱۰۷۲ ہجری در سن سی سالگی سلطان سلیمان شکوہ نیز بسعی محافظان از مطمورۂ زندان بفراخ نائے عالم بقا انتقال نمودہ وباجلِ طبعی در گزشتہ متصل شہزادہ مراد بخش مدفون شد"۔ اور مآثر عالمگیری میں بہ ذیل واقعات ۱۰۸۲ ہجری مطابق سنہ پندرہ جلوسِ عالمگیری سلطان مراد بخش کے بیٹے ایزد بخش کی نسبت لکھا ہے کہ گوالیار سے منگا کر اورنگ زیب نے اپنی بیٹی مہر النساء بیگم کے ساتھ اس کا عقد کیا اور محمد سلطان اور سپہر شکوہ کو کہ وہ بھی وہاں سے منگائے گئے تھے 'سلیم گڑھ میں رکھنے کا حکم ہوا اور اگلے برس محمد سلطان کا مراد بخش کی بیٹی دوستدار بانو بیگم اور سپہر شکوہ کا خود اورنگ زیب کی بیٹی بدر النساء بیگم سے نکاح کیا گیا اور محمد سلطان کا بارہ ہزار اور سپہر شکوہ کا چھ ہزار اور ایزد بخش کا چار ہزار روپیہ سالانہ گزارہ مقرر ہوا۔ پس جبکہ مراد بخش کے بیٹے ہی کی جان بخشی ہو کر خود اورنگ زیب کی بیٹی سے اس کا عقد ہو چکا تھا تو پوتے کی نسبت کسی زیادہ بد سلوکی کا گمان 'جیسا کہ ڈاکٹر برنیئر نے کیا ہے' درست نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کسی کتاب میں میری نظر سے گزرا ہے کہ یہ لڑکا اپنی طبعی موت سے مرا تھا۔

(س م ح)

(۱۱۲) کتاب "عمل صالح" میں لکھا ہے کہ "پسران علی نقی را کہ مدعی خون پدر بودند ہمراہ خواجہ بہلول بہ گوالیار فرستادہ امر فرمودند کہ بعد از ثبوتِ شرعی مراد بخش را بقصاص رسانند۔ چوں مدعیاں درانجا رسیدہ بحضور قاضی گوالیار گفتگو آغاز نہادند شہزادہ مجیب گشتہ بر زبان آورد کہ اگر حضرت خلافت مرتبت پاس عہود و وفایِ موعود در نظر داشتہ از خون ایں نامراد می گذشتند نقصانے بدولت و سلطنت والا نداشت۔ اگر خواہ نخواہ توجہ اشرف مصروف بریں ست کہ وجود بے بود ایں ضعیف درمیان نباشد مواجہہ بایں قسم مردم کم مایہ چہ لطف دارد ہرچہ میخواہند بکنند آگاہ باشارۂ قاضی آخر روز چہار شنبہ بست و یکم ربیع الثانی ۱۰۷۲ ہجری دو نفر چیلہ بہ دو زخم شمشیر آن شاہزادۂ رفیع الشان راز تنگائے ساحت زندان نجات دادہ جسدش را بقلعہ گوالیار بخاک سپردند"۔ واضح ہو کہ سید علی نقی دیوان گجرات کے قتل کا حال ہم ایک حاشیہ میں مفصل لکھ آئے ہیں اور مراد بخش کے قتل کرانے پر اورنگ زیب کے آمادہ ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ جس زمانہ میں وہ قلعہ گوالیار میں قید تھا اس کے بعض ہوا خواہان مخلص اس کو خفیہ طور پر قید میں سے نکال لے جانا چاہتے

تھے۔ (س م ح)

(۱۱۳) "سیر المتاخرین میں اس کے بیٹوں کے نام زین الدین وبلند اختر وزین العابدین لکھے ہیں۔ غالباً یہ نام اس کے بڑے بیٹے زین الدین کا اسم ثانی یعنی عرف ہو گا۔ کیونکہ فارسی تاریخوں سے ظاہر ہے کہ شہزادہ زین الدین ہی نے اراکان کے راجہ سے پناہ لینے کا ہندواست کیا تھا اور اصل کتاب انگریزی میں اس نام کو جس تہجی سے لکھا ہے اس کو یا تو باقی پڑھ سکتے ہیں یا بانکے اور کچھ تعجب نہیں ہے کہ وہ سلطان باقی کے دعائیہ نام یا میرزا بانکے کے لاڈلے لقب سے مشہور ہو۔ (س م ح)

(۱۱۴) چونکہ فارسی مؤرخوں نے اس ملک کا نام زخنگ لکھا ہے اور انگریز اراکان کہتے ہیں اس وجہ سے یہ بات تحقیق طلب تھی کہ لفظ اراکان کو بگاڑ کر انہوں نے زخنگ بنالیا تھا یا انگریزوں نے زخنگ کو اراکان بنا دیا۔ اس لئے صاحب کمشنر بہادر اراکان سے اس کے صحیح کر دینے کی استدعا کی گئی تھی۔ ہم نہایت ممنون ہیں مسٹر۔ جی۔ ڈی۔ برجس صاحب کمشنر اراکان کے کہ انہوں نے محض براہ اخلاق و علم دوستی نہایت ہی عمدہ اور محققانہ جواب بھیجا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "اس ملک کا نام اراکانیوں کے تلفظ کے موافق دراصل راکینگ ہے اور برہما والے اس کو حرف رے کی جگہ یے کے ساتھ یاکینگ کہتے ہیں اور لفظ اراکان انگریزوں کا اختراع ہے۔ اور سر آرتھر فیر نے اپنے مسود تاریخ اراکان مطبوعہ ۱۸۴۴ء میں اور اپنی تاریخ برہما مطبوعہ ۱۸۸۳ء کے پانچویں باب میں لفظ راکینگ کی نسبت یہ لکھا ہے کہ یہ لفظ راکھیگ (یعنی راکچھس) کا بگڑا ہوا معلوم ہوتا ہے جو پالی زبان کے لفظ یاکھا سے نکلا ہے جس کے معنے ایسے آدم خور دیو کے ہیں جو نصف حیوان اور نصف انسان ہو اور جس زمانہ میں بودھ مذہب کے واعظ ہندوستان سے اس ملک میں پہنچے تو انہوں نے اس ملک کا نام یاکھ پورہ (یعنی راکچھس پورہ) رکھ دیا یا تو اسی وجہ سے کہ انہوں نے وہاں پہنچ کر یہ روایتیں سنی ہوں گی کہ قدیم زمانہ میں ایسے دیو سیرت لوگ وہاں رہتے تھے جو ملک کو تباہ اور برباد کرتے تھے یا اس وجہ سے کہ انہوں نے "میام ما" قوم کے لوگوں کو بھوتوں اور دیؤوں کی پرستش کرتے دیکھا ہو گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ آدم خور دیوؤں کے وجود کی نسبت یہ روایتیں اس طرح پیدا ہوئی ہوں کہ جب "میام ما" قوم کے لوگ اراکان میں پہلے پہل دخیل ہوئے تو اس وقت اس ملک کے وحشی خصال باشندوں کی عادتوں کی نسبت انہوں نے مبالغہ آمیز باتیں سنی ہوں"۔ سر آرتھر فیر صاحب کے ان اقوال کو نقل کر کے مسٹر برجس بطور اپنی

رائے کے یہ لکھتے ہیں کہ اس ملک کے نام راکھینگ کو لفظ راکھشا یا یاکھش سے مشتق سمجھنا ایک قیاسی بات ہے اور اراکان کے باشندوں سے جو تحقیق کیا گیا تو کوئی شخص قابلِ اطمینان جواب نہیں دے سکا اور حقیقت یہ ہے کہ مرورِ زمانہ کے باعث اس کے اشتقاق کی اصلیت محو اور فراموش ہو گئی ہے"۔

پس ظاہر ہے کہ لفظ زخنگ درست اور اصلیت کے قریب تھا اور جس طرح انگریزوں نے اس کے ہمسایہ ملک کا نام صحیح لفظ "میام ما" یا" مرم ما" کی جگہ برھما بنالیا ہے۔ اسی طرح کا یہ بھی ایک تصرف ہے جو غیر ملک کے لوگ اکثر کر لیا کرتے ہیں۔ سلطنت مغلیہ کے مؤرخوں نے اراکان کو "ذلیل ترین معمورہ ہائے عالم" اور "ایک قطعہ جہنم" لکھا ہے اور وہاں کے لوگوں کو نہایت ہی وحشی اور حیوانوں سے بدتر اور ملک کو "مسکن دام ودد" بتایا ہے اور اس کے راستہ میں ان کے نزدیک فنِ جہاز رانی کی ناواقفیت کے باعث لجہ ہائے خونخوار" حائل تھے۔ (س م ح)

(۱۱۵) عالمگیر نامہ اور مآثر عالمگیری وغیرہ سے شجاع کی بیگم یا بیٹیوں کا ساتھ جانا ثابت نہیں ہوتا بلکہ عام طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ٹانڈہ سے بھاگنے کے وقت جس کو راج محل کے بعد اس نے اپنا جائے قیام بنایا تھا اس کے محل کی عورتیں اور مستوراتیں وہیں رہ گئی تھیں۔ جن کو میر جملہ نے بڑی احتیاط اور احترام کے ساتھ شجاع کے خزانہ اور جواہر خانہ اور مال و اسباب سمیت اخلاص خاں نامی ایک سردار کی حفاظت میں اورنگ زیب کے پاس بھیج دیا تھا۔ لیکن تعجب نہیں کہ اپنی خاص بیگم اور بیٹیوں کو وہ ساتھ لے گیا ہو اور وہ عورتیں جن کا ذکر کتب مذکور میں کیا گیا ہے، اس کی خواصیں وغیرہ ہوں۔ (س م ح)

(۱۱۶) اب سے پچاس برس پہلے تک ہندوستان میں یہ عموماً رواج تھا کہ امرا کی سواری کے وقت روپیہ اشرفی وغیرہ لٹایا کرتے تھے اور اس رسم کا یہاں تک رواج تھا کہ وہ فرانسیسی افسر جو اب سے اسی برس پہلے مرہٹوں کی طرف سے ہمارے اس ملک این روئے ستلج میں آئے تھے اظہار امارت و شان و شوکت کے لئے وہ بھی اپنے ہاتھ پر سے کچھ روپیہ اشرفی اور سونے کی نتھیں لٹاتے تھے بلکہ ریاست حیدر آباد دکن جس میں ہندوستانی درباروں کی پرانی رسمیں اب تک بھی بہت کچھ زندہ ہیں جلوسی سواریوں کے موقعوں پر وہاں اب بھی یہ رسم کچھ کچھ جاری ہے۔ (س م ح)

(۱۱۷) عالمگیر نامہ اور ماثر عالمگیری اور سیر المتاخرین سے تو بالاتفاق یہ ظاہر ہوتا ہے کہ

اس مصیبت کے وقت میں اس کے رفیقوں اور نوکروں میں سے سوائے سید عالم بارھہ وال اور سید قلی ازبک کے جن کے ساتھ سادات بارہ میں سے شماری دس سید اور بارہ مغل تھے اور چند اور سپاہیوں اور خدمتگاروں وغیرہ کے پورے چالیس آدمی بھی بنگالہ سے اس کے ہمراہ نہ آئے تھے۔ (س م ح)

(۱۱۸) مآثر عالمگیری میں ضمن وقائع ۱۲ بارہ جلوس عالمگیری مطابق ۱۰۷۹ ہجری لکھاہے کہ "عالمگیر کے حضور میں یہ خبر پہنچی کہ مورنگ میں یعنی آسام اور کوچ بہار کے مابین ایک مصنوعی شجاع نے شورش برپا کی ہے جس پر نہایت تاکید کے ساتھ وہاں کے حکام ابراہیم خاں اور فدائی خان کے نام فرمان جاری ہوئے کہ اگر وہ کسی طرف سر نکالے تو سر کاٹ کر حاضر کرو جس سے ثابت ہے کہ فی الواقع اس کی تباہی سے نو برس بعد تک بھی لوگوں کو اس کی موت وحیات میں شک ہی تھا۔ (س م ح)

(۱۱۹) اصفہان اس زمانہ میں ایران کا دارالسلطنت تھا۔ (س م ح)

(۱۲۰) چونکہ ۱۰۶۷ ہجری کے اخیر میں شاہ جہاں سخت بیمار ہوا تھا اور اس کی بیماری کی خبر پاکر سب بھائیوں سے پہلے مراد بخش نے گجرات میں بغاوت کی تھی اور آخر کار شجاع کے اراکان میں چلے جانے کے بعد سلیمان شکوہ سری نگر سے قید ہو کر دہلی میں چھبیسویں جمادی الاولی ۱۰۷۰ ہجری کو پہنچا تھا۔ اس حساب سے یہ لڑائی بھڑائی تین برس سے زیادہ نہیں رہی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس قصہ کا شروع اس وقت سے لیا ہے جبکہ شاہ جہاں نے فساد کے اندیشہ سے شہزادوں کو علیحدہ علیحدہ صوبے دے کر کابل سے روانہ کیا تھا۔

(س م ح)

(۱۲۱) شجاع کی شکستوں اور اراکان کو جانے کا حال جس طرح پر بلا اختلاف عالمگیر نامہ اور ماثر عالمگیری اور سیر المتاخرین میں لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ مونگیر سے بھاگنے کے بعد اس نے ٹانڈہ کو اپنا محل ومرکز قرار دیا اور برسات یہیں بسر کی اور جب میر جملہ کی آمد آمد سے ڈر کر یہاں بھی ٹھکانا نہ دیکھا تو مع اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں اور قریب تین سو نوکروں چاکروں کے دو کشتیوں میں بیٹھ کر راج محل کو بھاگ گیا جہاں پہلے سے اس کا بڑا بیٹا زین الدین اس غرض سے گیا ہوا تھا کہ وہاں کے حاکم رشید خاں نامی نے جو نمک حرامی کر کے میر جملہ سے سازش کر لی تھی اور اس کی تحریک سے راج محل کے رئیس معصوم خاں کے بیٹے منور خاں نے کسی قدر فساد برپا کر رکھا تھا اس کو فرو کرے۔ چنانچہ رشید خاں کو تو اس نے

جاتے ہی جبکہ وہ سلام کو حاضر ہوا عین دربار میں قتل کرادیا تھا اور بہ لحاظ اپنی تنگ حالت کے اراکان کے راجہ سے پیام و سلام کر کے اور تحفے تحائف بھیج کر منور خاں کی سرکوبی کے لئے اس کی بہت سی جنگی کشتیاں منگائی تھیں اور انہوں نے اس کے ساتھ ہو کر منور خاں کو شکست دینے میں اپنی عادت کے موافق راج محل کی رعیت کو بھی بہت تباہ کیا اور اکثر لوگوں کو جن میں بہت سے مسلمان بھی تھے قید کر کے ساتھ لے گئے اور زین الدین نے اس مدد کے صلہ میں ان کو بہت سا نقد و جنس دے کر رخصت کیا اور راجہ سے یہ ٹھہرالیا کہ اگر شجاع کو مجبوراً اراکان میں آنا پڑے تو اس کی کچھ فوج راج محل میں آکر اس کو وہاں لے جائے۔ چنانچہ راجہ نے اپنے رشتہ دار چاٹگام کے حاکم کو جو اس وقت تک یہ مقام ملک اراکان میں داخل تھا یہ حکم بھیج دیا تھا کہ جب شجاع طلب کرے تو کچھ فوج اس کی مدد کو بھیج دے۔ پس جب شجاع راج محل میں پہنچا تو ناچار اپنے چند معتمد شخصوں کو فوج لانے کو بھیجا تاکہ ساتھ ہو کر اس کو اراکان لے جائے اور ایک مہینے تک اس کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ لیکن چونکہ میر جملہ برابر اس کے تعاقب میں چلا آتا تھا اس لئے اپنے تینوں بیٹوں اور دو چار سرداروں اور چند سپاہیوں اور خواجہ سراؤں وغیرہ کے ساتھ جواب آنے کے بغیر ہی پھر کشتیوں میں بیٹھ وہاں کو چل دیا۔ راج محل چھوڑنے کے تیسرے دن وہ لوگ جو زین الدین نے آنبہ سے تین مہینے پہلے راجہ اور چاٹگام کے حاکم کے پاس روانہ کئے تھے مع اکاون اراکانی اور فرنگستانی کشتیوں کے جو مسلح اور ساز و سامان سے بخوبی درست تھیں اور جن کو چاٹگام کے حاکم نے راجہ کے منشا کے موافق روانہ کیا تھا مع راجہ اور چاٹگام کے حاکم کی تحریروں کے عین رہ روی کی حالت میں آملے۔ مگر اراکانی سرداروں نے یہ کہا کہ اگرچہ ہم آپ کی مدد کے لئے آئے ہیں اور راجہ کا خود بھی ارادہ تھا کہ کمک کے لئے چاٹگام میں آکر ٹھہرے اور پیچھے سے جنگی کشتیوں کا اور بھی زیادہ مضبوط "نواڑہ" یعنی بیڑہ روانہ کرے اور خشکی کی راہ سے بھی کچھ مدد بھیجے لیکن یہ سب کچھ اس صورت میں تھا کہ آپ راج محل یعنی اپنے ملک میں ٹھہر کر میر جملہ کے مقابلہ کا سامان کرتے اور آپ کے اراکان میں لے جانے کا ہم کو حکم نہیں ہے اب چونکہ یہاں سے قریب ہی موضع بھلوہ میں (جو غالباً وہی مقام ہے جس کو حال کے انگریزی نقشوں میں بھلویا لکھا ہے اور ڈھاکہ سے نیچے تقریباً ڈھاکہ اور چاٹگام کے وسط میں دریا کے کنارے ہے) انتہائے سرحد پر بادشاہی قلعہ اور تھانہ تھا اس لئے شجاع کا ارادہ ہوا کہ اس پر قبضہ کرے اور وہاں ٹھہر کر اراکانیوں کی مدد سے آئندہ کے لئے کچھ بندوبست کرے مگر جب قلعہ پر

تصرف نہ ہو سکا تو شجاع نے اراکان والوں سے خشکی پر اتر کر قلعہ پر حملہ کرنے کی درخواست کی۔ لیکن انہوں نے کہا کہ یہ ہمارے معمول کے بر خلاف ہے البتہ پانی پر ٹھہر کر توپ بندوق سے آگ برسانے کو ہم حاضر ہیں اور شجاع کے اصرار سے ناراض ہو کر آخر کار رو کھے پھیکے بن گئے اور صاف کہہ دیا کہ اگر قلعہ آپ کی کوشش سے ہاتھ آجاتا تو مضائقہ نہ تھا کہ ہم آپ کو اس میں بٹھا کر آپ کے ایک لڑکے کو اراکان لے جاتے اور راجہ آئندہ کے لئے جو حکم دیتا وہ کرتے۔ لیکن اب تو یہی بہتر ہے کہ آپ خود اراکان کو تشریف لے چلیں۔ چنانچہ وہ اس پر راضی ہو گیا۔ اور چھٹی رمضان ۱۰۷۰ ہجری کو وہاں چلا گیا۔ اور سوائے ان چالیس رفیقوں کے جن کا حال پیچھے ایک حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے۔ اس آفت میں اور کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا اور جس وقت سے وہ وہاں پہنچا اور جو مصیبتیں وہاں پیش آئیں ان کی نسبت صاحب عالمگیر نامہ نے مجملاً یوں لکھا ہے کہ "بعد از قطع مراحل ادبار و طے لجہ ہائے خونخوار بہ جزیرۂ زخنگ کہ ارذل معمورہ ہائے عالم و مسکن کفرہ ضلالت شیم است رسیدہ از تیرہ بختی و بد فرجامی بادو دوام آن سرزمین محشور شد و خامت حال و سوئے مآلش باعث عبرت ہمگناں شد و سرانجام کار آن بد عاقبت بعد از وصول بآن ولایت ضلالت بنیاد و ملاقات باسر گردہ آن قوم بدنژاد کہ بہ ہزاراں مرحلہ از شہرستان آدمیت و کشور انسانیت دور و از حلیہ دین و دانش و شعار مروت و مردمی مہجور ند بعد ازیں در محل خود مشروح و مذکور خواہد شد"۔ مگر اس مصنف نے اپنے اس وعدہ کے موافق کوئی تفصیلی حال اس بد نصیب کا آگے کہیں بیان نہیں کیا اور نہ کسی اور کتاب میں میری نظر سے گزرا۔ (س م ح)

(۱۴۲) امام قلی خان اور نذر محمد خاں ازبک قوم کے دو بادشاہ اور سگے بھائی تھے اور ان کے باہم ملک اس طرح پر تقسیم تھا کہ سمرقند اور بخارا امام قلی خاں اور بلخ و بدخشان نذر محمد خاں کے پاس تھا۔ لیکن جب امام قلی خاں زوال بصارت کی وجہ سے مکہ معظمہ کو ہجرت کر گیا تو سمرقند اور بخارا بھی نذر محمد خاں کے قبضہ میں آ گیا مگر اس کی سخت گیری اور سوئے تدبیری سے امرا نہایت تنگ آ گئے اور انہوں نے اس کے بڑے بیٹے عبدالعزیز خاں کو پھر بخارا اور سمرقند کا علیحدہ بادشاہ بنا لیا اور صرف وہی ملک اور بدخشاں اس کے پاس رہ گیا۔ لیکن چونکہ وہاں بھی بے انتظامی اور ابتری پھیل گئی تو مجبور ہو کر اس نے یہ حماقت کی کہ شاہ جہاں سے امداد کا طالب ہوا جو بلخ و بدخشاں و سمرقند و بخارا کو اپنا ملک موروثی سمجھ کر اس کو اپنے قبضہ میں لانے کا نہایت آرزو مند تھا اور اس کی اس حرکت کو بھی نہ بھولا تھا جو اس نے جہانگیر کا مرنا

سنتے ہی کابل کو آن گھیرا تھا۔ پس اس نے موقع کو غنیمت سمجھ کر شہزادہ مراد بخش اور امیر الامراء علی مراد خان کو امداد کے حیلہ سے بلخ کو روانہ کیا اور خود بھی لاہور سے کابل کو کوچ کر دیا۔ چنانچہ بلخ سے ایک منزل پر نذر محمد خاں نے اپنے دو بیٹوں بہرام اور سبحان قلی کو شہزادہ کے استقبال کے لئے بھیجا تو بعد بہت سی خاطر و مدارات کے ان کو یہ پیغام دے کر واپس بھیج دیا گیا کہ آپ اطمینان رکھیں ہم بے شمار لشکر کے ساتھ آپ کی مدد کے لئے آن پہنچے ہیں۔ مگر جب اگلے روز بلخ پہنچا تو امداد کی جگہ قلعہ پر قابض ہو جانا چاہا اور یہ دیکھ کر نذر محمد خاں مع اپنے ایک بیٹے کے مجبور ایران کو بھاگ گیا اور انہوں نے بارہ لاکھ روپیوں اور جڑاؤ اور طلائی چیزوں اور ڈھائی ہزار گھوڑوں اور تین سو اونٹوں پر جو قلعہ میں تھے قبضہ کر لیا اور اس کے دو بیٹوں اور تین لڑکیوں کو شاہ جہاں کے پاس کابل بھیج دیا جن میں سے بہرام کو مصلحتاً پنجہزاری کا منصب عطا ہوا اور عبدالرحمٰن کو تربیت کے لئے دارا شکوہ کے سپرد کیا گیا اور لڑکیوں کو بادشاہ کی بڑی بیٹی معروف بیگم صاحب نے بہت اعزاز سے اپنے پاس رکھا مگر جب مراد بخش چند عرضیاں بھیج کر بلا انتظار حکم کے واپس چلا آیا اور سعد اللہ خاں وزیر سے بھی وہاں کا کوئی نظم و نسق نہ ہو سکا تو شاہ جہاں نے اورنگ زیب کو بھیجا جو جمادی الاول ۱۰۵۶ ہجری کی پہلی تاریخ کو وہاں پہنچ گیا اور نذر محمد خاں کے بیٹے عبدالعزیز خاں والی بخارا اور سمرقند اور اور ازبک سرداروں سے جو نہایت ہجوم کئے ہوئے تھے خوب لڑائیاں ہوئیں اور اورنگ زیب نے وہ چستی و چالاکی اور جوانمردی دکھائی کہ دشمن بھی دنگ ہو گئے چنانچہ ایک روز جبکہ ازبکوں نے اپنی زبردست کمانوں سے تیروں کا مینہ برسا رکھا تھا فوج کا دل بڑھانے کو اپنی زرہ اتار ڈالی اور ڈھال کھول کر پھینک دی اور کہا آج اسی طرح لڑیں گے اور ایک اور لڑائی میں جبکہ مخالفوں نے نہایت ہی انبوہ کر رکھا تھا سواری سے اتر کر ایسی بے فکری اور اطمینان کے ساتھ نماز ظہر باجماعت ادا کی کہ جس کی کیفیت سننے سے عبدالعزیز خاں کو اس کے آگے سر جھکانا اور شاہ جہاں کے حضور میں حاضر ہونا ہی پڑا اور نذر محمد خاں نے بھی اورنگ زیب کی خدمت میں اپنا خط متضمن اطاعت و اخلاص بھیج کر اس کے ذریعہ سے امن اور صلح کی درخواست کی جس کو شاہ جہاں نے نہایت عقلمندی کر کے اس وجہ سے قبول کر لیا کہ چار کروڑ روپیہ اب تک خرچ ہو چکا تھا اور فائدہ کچھ بھی نہ تھا اور اورنگ زیب اسی طرح ملک کو خالی کر کے واپس چلا آیا جس طرح کہ اب ہمارے سامنے تین برس کی لڑائی اور بائیس کروڑ روپیہ کے ضائع اور امیر شیر علی خاں کے خاندان کے بالکل برباد کر ڈالنے کے بعد لارڈ لٹن وائسرائے

ہندوستان نے آخر کار شیر علی خاں کے چچازاد بھائی امیر عبدالرحمٰن خاں کو ملک افغانستان حوالہ کردینا ہی مناسب خیال کیا اور جنرل سر ڈانلڈ اسٹوارٹ اور جنرل سر فریڈرک رابرٹسن اور چیف پولیٹیکل افسر سر لیپل گرفن اس کو کابل سپرد کرکے واپس چلے آئے اور یہ ڈاکٹر برنیئر کی غلطی ہے جو لکھا ہے کہ اورنگ زیب خاں سمرقند کی امداد کو جو خان بلخ سے لڑ رہا تھا بھیجا گیا تھا۔ (ماخوذ از بادشاہ نامہ و عالمگیر نامہ) (س م ح)

(۱۲۳) ۷۱۵ ہجری میں ایک شخص ساہو نامی جو اپنے کو گرشاسپ کی نسل سے (یعنی ایرانی نژاد گنتا تھا) راجہ سہدیو فرمانروائے کشمیر کا (جس کو بعض کتابوں میں شاید رسم الخط کی غلطی سے مہدیو اور اولاد راجہ ارجن پانڈو سے لکھا ہے) ملازم ہو کر عمدہ خدمتوں کے باعث رفتہ رفتہ نہایت صاحب اقتدار ہو گیا تھا چنانچہ ۷۴۷ ہجری میں جب سہدیو کا بیٹا جو برائے نام راجہ تھا مر گیا تو اس کا مقتدر اور مسلط وزیر شاہ میر جو اس ساہو کا بیٹا تھا سلطان شمس الدین لقب مقرر کر کے خود ہی راجہ بن بیٹھا۔

اس طرح پر ہندو راجاؤں کی حکومت کا سلسلہ تو منقطع ہو گیا اور دو سو تیرہ برس تک شمس الدین کی اولاد کے لوگ متواتر حکمرانی کرتے رہے۔ مگر جب اس سلسلہ کے اخیر بادشاہ حبیب شاہ ابن نازک شاہ کو (جو سہدیو کے بیٹے کی طرح صرف برائے نام بادشاہ تھا) ۹۶۲ ہجری میں اس کے کشمیری وزیر غازی خاں چک نے بے دخل کر دیا تو سلطنت چکوں کے خاندان میں منتقل ہو گئی اور غازی خاں کی وفات کے بعد جو اس کے بھائی حسین شاہ اور علی شاہ نوبت بنوبت بادشاہ ہوئے تو حسین شاہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی خدمت میں تحفہ تحائف بھیج کر اظہارِ اطاعت کرتا رہا اور علی شاہ نے تو یہاں تک تابعداری اختیار کی کہ اکبر کا خطبہ اور سکہ بھی جاری کر لیا اور شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے لئے اپنی بیٹی کا ڈولہ بھی روانہ کیا۔

جس واقعہ کا ڈاکٹر برنیئر اشارہ کرتا ہے وہ یہ ہے کہ جب سید مبارک خاں نامی ایک کشمیری سردار نے علی شاہ کے بیٹے یوسف شاہ کو کشمیر سے خارج کر دیا اور وہ مرزا سید یوسف خاں مشہدی صوبہ دار پنجاب کے ذریعہ سے استمداد کے لئے بمقام فتح پور سیکری اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے میرزائے مذکور اور راجہ ملتان سنگھ والیِ جودھپور کو اس کی مدد کے لئے مامور فرمایا اور ۹۸۷ ہجری میں خفیف مقابلہ کے بعد کشمیر پھر اس کے قبضہ میں آ گیا۔ ۹۸۹ ہجری میں اکبر نے کابل سے آتے ہوئے جلال آباد سے ایک ایلچی مع فرمان کے روانہ کیا

اس نے فرمان کا استقبال کیا اور حیدر خاں عرف یعقوب اپنے بیٹے کو بہت سے تحفہ تحائف کے ساتھ اکبر کی خدمت میں بھیج دیا۔ یہ شہزادہ ایک برس تک حاضر دربار رہا۔ مگر کم بختی جو آئی کسی باعث سے گھبرا کر بلا اجازت کشمیر کو چلا گیا۔ اب اکبر کو ملک پر قبضہ کر لینے کے لئے خاصہ بہانہ مل گیا اور یوسف شاہ کے نام ایک سخت فرمان جاری ہوا کہ خود حاضر ہوئے یا بیٹے کو حاضر کرے۔ مگر جب تعمیل میں (جیسی کہ پہلے ہی سے توقع تھی) حیلے بہانے ہوئے تو کشمیر کو فوج بھیج دی گئی اور جب یوسف شاہ اپنے بیٹے کے جو اس مصیبت کا باعث ہوا تھا میرزا شاہ رخ اور راجہ بھگونت داس امرائے شاہی مامورہ مہم کے لشکر میں حاضر ہو گیا تو کشمیریوں نے جو اپنی آزادی کو قائم رکھنا چاہتے تھے اس سے ناراض ہو کر حسین چک کو اپنا حاکم بنا کر مقابلہ کی تیاری کر دی مگر یعقوب باپ کو چھوڑ کر پھر کشمیر کو بھاگ گیا اور کشمیریوں نے اسے شاہ اسماعیل کا لقب دے کر بادشاہ بنا لیا۔ لیکن بعد ایک سخت لڑائی کے کشمیری سردار مغلوب ہو کر حاضر ہو گئے اور ۹۹۳ ہجری میں اکبر کا سکہ خطبہ پھر جاری ہو گیا اور زعفران اور ریشم اور شکاری پرندے بطور خراج مقرر ہو گئے۔

بعد اس کے اگرچہ یوسف شاہ بادشاہ کی خدمت میں بذات خود حاضر تھا مگر یعقوب اب بھی جیسی چاہئے اطاعت نہیں کرتا تھا اس لئے پھر فوج کشی ہوئی اور اگرچہ وہ اور شمش چک کچھ عرصہ تک مقابل کرتے رہے مگر آشکار شمس چک وغیرہ کشمیری سردار سب حاضر ہو گئے اور ملک کشمیر ضمیمہ سلطنت مغلیہ ہو کر مرزا یوسف خاں مشہدی جو لیاقت اور دانشمندی میں مشہور شخص تھا صوبہ دار مقرر ہو گیا اور اب کشمیری ایسے مغلوب ہوئے اور ان کا یہ کوتاہ اندیش بادشاہ یعقوب اس حالت کو پہنچ گیا کہ ۹۹۷ ہجری میں جب شہنشاہ کشمیر کی سیر کو گیا تو دربار عید الفطر کے روز مرزا یوسف خاں کی سفارش سے جو اس کی تقصیر معاف ہوئی تو اکبر نے بجائے تاج بخشی کے اس کو اپنی پاپوش عطا کی!! جس کو وہ اپنی پگڑی پر باندھ کر دربار میں حاضر ہوا۔ (ماخوذ از سیر المتاخرین و گلزار کشمیر وغیرہ) (س م ح)

(۱۲۴) کتاب مخزن الادویہ میں لکھا ہے کہ کاشغر واقع ترکستان کا سنگ لاجورد سب سے بہتر ہوتا ہے۔ (س م ح)

(۱۲۵) شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے زمانہ سے جس نے لباس اور رسوم دربار وغیرہ میں تالیفِ قلوب کے لئے بہت کچھ ہندو راجاؤں کا طرز اختیار کر لیا تھا لوگ جس طرح راجاؤں کو ڈنڈوت کرتے تھے دربار کے وقت بجائے سلام کے بادشاہ کو سجدہ کیا جاتا تھا مگر شاہ جہاں

نے تخت پر بیٹھتے ہی اس کی ممانعت کی اور مہابت خاں سپہ سالار کی رائے سے اس کی عوض آداب زمیں بوس مقرر ہوا۔ یعنی جب کوئی سلام کو حاضر ہو تو چاہئے کہ بادشاہ کے سامنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر ان کی پشت کو چوم لیا کرے اور سادات اور علماء اور مشائخ اور درویشوں کو حکم ہوا کہ صرف سلام کرلیا کریں اور رخصت کے وقت فاتحہ پڑھ دیا کریں مگر چونکہ اس میں بھی سجدہ کے ساتھ ایک طرح کی مشابہت تھی چند سال بعد اس کو بھی موقوف کردیا اور اس کی عوض چوتھی تسلیمات مقرر کردی جو ایک مقام خاص سے جس کو "اداب گاہ" کہا جاتا تھا لوگ بجالاتے تھے۔(ماخوذ از بادشاہنامہ) (س م ح)

(۱۲۶) عالمگیر نامہ اور مآثر عالمگیری سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں سفیر ایک ہی وقت میں نہیں آئے تھے بلکہ سبحان قلی خاں خلف نذر محمد خاں والی بلخ کا سفیر چھبیسویں جمادی الثانی ۱۰۷۰ ہجری کو حاضر ہوا اور شاہی میر تزک شہر سے باہر استقبال کر کے اس کو دربار میں لایا اور خلعت کے علاوہ مرصع پٹی اور پندرہ ہزار روپیہ نقد عطا ہوا تھا اور چونکہ دیر سے بیمار اور ناتوانی اور ضعف کی حالت میں یہاں پہنچا تھا اس لئے چوتھی رجب سنہ مذکور کو ایک مرصع چھڑی جو بڑے بڑے امیروں کو اعزازا اس غرض سے عطا ہوتی تھی کہ اس کے سہارے سے دربار میں کھڑے رہا کریں عطا ہوئی اور دوسو تولہ کی ایک اشرفی اور اسی وزن کا ایک روپیہ عنایت ہوا مگر وہ چند روز بعد یہیں مر گیا اور اس کے ہمراہیوں کو آٹھ ہزار روپیہ نقد دے کر رخصت کیا گیا تھا اور عبدالعزیز خاں کا سفیر ۱۰۷۱ ہجری میں آیا تھا اور اس کا کابل میں پہنچ جانا سن کر بادشاہ نے ایک سردار کو اس کی خاطر تواضع اور مہمانداری کے لئے روانہ کیا تھا اور جب وہ چوتھی ربیع الثانی سنہ مذکور کو شاہ جہان آباد کے قریب پہنچا تھا تو دو بڑے امیر استقبال کر کے دربار میں لائے تھے اور یہ ترکی گھوڑوں اور اونٹوں اور اور چیزوں کے علاوہ چالیس ہزار روپیہ کی قیمت کا ایک لعل بھی تحفہ میں لایا تھا اور چونکہ یہ بھی بیمار ہی آیا تھا اس لئے خلعت اور مرصع خنجر اور آٹھ ہزار روپیہ نقد کے علاوہ ایک مرصع چھڑی اس کو بھی عنایت ہوئی تھی اور رخصت کے روز پھر خلعت مع خنجر مرصع اور تیس ہزار روپیہ نقد کے مرحمت ہوا تھا اور آنے کے دن سے رخصت کے روز تک کل ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ اس کو دیا گیا تھا۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر برنیئر نے غالباً اپنی یاد کی غلطی سے ان دونوں سفیروں کے آنے کو ملا کر لکھ دیا ہے۔ (س م ح)

(۱۲۷) اصل کتاب میں لفظ راگو لکھا ہے جو یورپ میں ایسے سالن کو کہتے ہیں جو کئی قسم

کے گوشت کی بوٹیاں اور مصالحے ملا کر بہ تکلف تیار کیا جاتا ہے۔ (س م ح)

(۱۲۸) افغانستان اور ترکستان کے لوگ چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر کھانے کو ایک زنانہ پن سمجھتے ہیں اور چینیوں کے سوا جن کے کھانا کھانے کا طرز اہل یورپ سے بہت کچھ مشابہ ہے چھری کانٹے اور چمچہ سے کھانا کھانے کا رواج ممالک ایشیا میں کبھی بھی نہ تھا اور اب تک بھی اس نے کچھ زیادہ رواج نہیں پایا اور کھانے کے وقت کم بولنا آدابِ طعام میں سمجھا جاتا ہے اور ترکستان میں گھوڑے کے گوشت کا عام رواج ہے۔ چنانچہ میرے محترم دوست مولوی محمد حسین صاحب آزاد جنہوں نے ترکستان کی خوب سیر کی ہے اپنے ایک خط میں یوں ارقام فرماتے ہیں "گھوڑے کا گوشت اس ملک میں عام ہوتا ہے۔ بازار ہائے قصائی میں جو بڑا عریض اور طویل بازار ہوتا ہے میں نے دیکھا ہے کہ گوشت کی رانیں اور بچے دکانوں پر اور دکانوں کے آگے جو لکڑ گڑے ہوئے ہوتے ہیں ان پر لٹکے ہوتے ہیں جس لکڑ پر گھوڑے کی دم لٹکتی ہے وہ گویا ٹکٹ لگا ہوا ہے کہ یہ گھوڑے کا گوشت ہے! اور جس پر گائے کی دم لٹکتی ہے سمجھ جاؤ کہ یہ گائے کا گوشت ہے! جس پر اونٹ کی دم لٹکتی ہے یہ اونٹ کا گوشت ہے! جب ہم کابل سے بلخ کو روانہ ہوئے تو کتل دنداں شکن سے اترتے ہوئے ہمارے قافلہ سالار کا گھوڑا گرا۔ وہ اترائی بھی میل بھر سے کم نہ تھی ایسے مقاموں میں گر کر گھوڑے یا اونٹ کا سنبھلنا تو ممکن ہی نہیں گھوڑا چور چور ہو گیا۔ سامنے ہی ایک گاؤں تھا لوگ وہاں کے سنتے ہی چھرے لے کر دوڑے اور تکہ بوٹی کر کے لے گئے اور اپنی ہانڈیاں جا گرم کیں" کیا تعجب کی بات ہے کہ جس قوم کا ایک مصنف گھوڑے کے گوشت کھانے پر ازبکوں کی ہنسی اڑاتا ہے اس کی قوم کے لوگ جب ۱۸۷۰ عیسوی کی لڑائی میں سپاہ جرمنی نے ان کا تخت گاہ پیرس کو گھیر لیا اور اہل شہر گھوڑے وغیرہ جانوروں کے گوشت کھانے پر مجبور ہوئے تو صلح ہو جانے کے بعد بھی کچھ عرصہ تک بڑے شوق اور تکلف سے گھوڑوں کی رانوں کے کباب اپنی میزوں پر لگاتے اور اور اقوامِ یورپ کی ہنسی اور مذاق کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے۔ (س م ح)

(۱۲۹) امیزن Amazon اس کا اشتقاق یونانی لفظ "میزاس" سے ہے جس کے معنی پستان کے ہیں اور جس طرح قدیم فارسی اور سنسکرت میں اسم کے پہلے الف لگائے جانے سے اس کے معنی نفی کے ہو جاتے ہیں اسی طرح حرف اے کے ملنے سے جو بمنزلہ الف کے ہے اس کے معنی بن چھاتی والی عورت کے ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں یورپ کے مشرق میں عورتوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جو اپنی داہنی چھاتی اس غرض سے کاٹ ڈالتی

تھیں کہ تیر اندازی اور نیزہ بازی کرنے میں کچھ الجھاؤ نہ رہے اور مردوں کو اپنی صحبت میں دخل نہ دیتی تھیں اور ایسی قوی اور جنگجو تھیں کہ بحر اسود کے ساحل معروف یوگزن Eux-ine پر ایشیائے کوچک میں تھرموڈن Thermodon ندی کے کنارے ایک سلطنت قائم کرلی تھی اور ہمتِ مردانہ اور قوتِ دلیرانہ سے قرب وجوار کی قوموں کو مسخر اور مغلوب کر رکھا تھا۔ مگر بعض مؤرخ ان روایتوں کو صرف افسانہ خیال کرتے ہیں۔ بہر حال اس روایت کی وجہ سے یورپ میں بہادر اور مردانہ روش عورتوں کے لئے یہ لفظ عموماً ایک لغت قرار پایا ہوا ہے۔ (س م ح)

(۱۳۰) پیچھے لکھا جا چکا ہے کہ ان دونوں کی مائیں علیحدہ علیحدہ نہ تھیں بلکہ ایک ہی رانی یعنی نواب بائی کے پیٹ سے تھے اور محمد اکبر کی ننہال کا شاہان مسقط کی نسل سے ہونا بھی جیسا کہ ہم پہلے ایک حاشیہ میں لکھ آئے ہیں صحیح نہیں ہے۔ (س م ح)

(۱۳۱) ظاہراً یہ صرف مصنف کا قیاس معلوم ہوتا ہے ورنہ ممالکِ ایشیا کی رسم کے موافق مہمان کا زیادہ دیر تک ٹھہرانا خوش خلقی کی نظر سے ہوتا ہے۔ (س م ح)

(۱۳۲) بٹویا ملک ہالینڈ کا قدیم نام ہے اور لفظ بٹی سے مشتق ہے جو ایک چھوٹی سی قوم تھی جو جرمنی کے ان ضلعوں میں رہتی تھی جو زمانہ حال میں ھس کے نام سے مشہور ہیں یہ قوم سنہ عیسوی سے ایک سو برس پہلے وہاں سے اٹھ کر ہالینڈ میں آبسی تھی اور اس کی وجہ سے پرانے زمانہ میں ہالینڈ کا نام بٹویا مشہور ہو گیا تھا مگر جس بٹویا کا ذکر مصنف نے کیا ہے وہ جزیرہ جاوہ میں کوئی پچاس ہزار آدمی کی آبادی کا ایک شہر اور ڈچوں کے مقبوضات کا دارالحکومت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ملک کی مناسبت سے اس کا یہ نام رکھ دیا ہے۔ (ماخوذ از جامِ جم) (س م ح)

(۱۳۳) مصنف نے باوصف اس قدر قابلیت کے خدا جانے یہ کیا لکھ دیا ہے۔ حالانکہ سیدھی بات ہے کہ اس کے خوجہ بنانے میں کوئی کسر رہ گئی ہوگی۔ (س م ح)

(۱۳۴) عالمگیر نامہ میں اس کا نام حسین پاشا لکھا ہے جو اول ٹرکی کی طرف سے بصرہ کا حاکم تھا اور پھر سلطان کی ناراضگی کی وجہ سے اورنگ زیب کا آن کر نوکر ہو گیا تھا۔ (س م ح)

(۱۳۵) اس کا نام عالمگیر نامہ میں سیدی کامل لکھا ہے اور دوسرے شخص کا اس کتاب میں کچھ ذکر نہیں ہے۔ (س م ح)

(۱۳۶) چونکہ ایک کراؤن پانچ شلنگ کا ہوتا ہے جو انگلستان کا چاندی کا ایک سکہ اور

ہندوستان کی اس وقت کی ایک اٹھنی کے برابر ہے۔ پس اس حساب سے ان غلاموں کو قریب ڈھائی ہزار روپیہ کی قیمت کا سمجھنا چاہئے۔ (س م ح)

(۱۳۷) سیویٹ مشک وغیرہ خوشبودار حیوانی مادوں کو بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر خصوصیت کے ساتھ اس خوشبودار اور بہت گاڑھی چیز کو کہتے ہیں جو مشک بلائی کی دم کے نیچے ایک تھیلی میں چربی کے طور کی ہوتی ہے۔ (ماخوذ از او گلوبز ڈکشنری) (س م ح)

(۱۳۸) یورپ میں دستور ہے کہ دربار وغیرہ جلوس کے موقعوں پر بادشاہ ایک عصا ہاتھ میں لئے رہتے ہیں۔ جس کو رایل سیپ ٹر یعنی عصائے شاہی کہا جاتا اور تخت و تاج وغیرہ کی طرح ایک بادشاہی علامت سمجھا جاتا ہے۔ (س م ح)

(۱۳۹) تربیت خاں کو بھیجا گیا تھا۔ (س م ح)

(۱۴۰) شاہ عباس ماضی سے مراد ہے جو اکبر کا معاصر تھا اور شاہ جہاں کے زمانہ تک فرماں روائے ایران رہا۔ (س م ح)

(۱۴۱) اصل انگریزی میں لفظ ھیم سٹرنگ Hamstring ہے جس کے معنی بموجب فن تشریح و اصطلاح طبی رباط کے ہیں۔ (س م ح)

(۱۴۲) اس سفیر سے اورنگ زیب کے ناراض ہو جانے کا ذکر کسی جگہ نظر سے نہیں گزرا مگر اور حالات مندرجہ متن کی تشریح اس وقت کی فارسی کتابوں سے یوں پائی جاتی ہے کہ جب سے شاہ جہاں کے عہد سلطنت میں شاہ عباس ثانی نے قندھار کو ۱۰۵۸ ہجری میں عمال دولت ہندوستان سے پھر چھین لیا تھا دونوں سلطنتوں کے باہم دوستانہ راہ و رسم بند تھی۔ مگر جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو شاہ موصوف نے ایلچی بھیجنے میں سبقت کر کے اس راہ و رسم کو پھر تازہ کیا۔ چنانچہ صاحب عالمگیر نامہ نے اس حال کو ۱۰۷۱ ہجری کے واقعات میں (جو اورنگ زیب کے تیسرے اور چوتھے سال جلوس کے مطابق تھا) بہت تفصیل سے لکھا ہے اور چونکہ اس سے سفیر کی مدارات کا طور و طریق مع اور بہت سی درباری رسموں اور دلچسپ باتوں کے زیادہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے اس لئے اس کا پورا ترجمہ لکھ دینا مناسب معلوم ہوا۔

ان ایام میں وقائع صوبہ ملتان سے دریافت ہوا کہ والیِ ایران نے بھی بمقتضائے مصلحت و دانائی رسم اتحاد کے تازہ کرنے کے لئے بوداق بیگ تفنگچی آقاسی (یعنی بندوقچیوں کی فوج کے سردار) کو جو اس کے امرائے دربار میں سے تھا "مع تحائف و نامہ دوستانہ متضمن

مبارک باد تخت نشینی" روانہ کیا ہے اور وہ قندھار سے گزر کر ملتان کے راستے دلی کو آتا ہے اس لئے اورنگ زیب نے لبدال بیگ نامی اپنے ایک مقرب ملازم کو مامور کیا کہ استقبال اور مہمانداری کے لئے ملتان تک جائے۔ چنانچہ اس شخص کو حسب معمول خلعت رخصت دے کر رجب کی پہلی تاریخ روانہ کیا گیا اور اسی کے ہاتھ بوداق بیگ کے لئے بھی ایک خلعت بھیجا گیا اور تربیت خاں حاکم ملتان اور خلیل اللہ خاں صوبہ دار "دارالسلطنت" لاہور اور اثنائے راہ کے سب حاکموں کو احکام بھیجے گئے کہ لوازم ضیافت و مہمانداری بجالا کر اپنے اپنے مقدور کے موافق نقد و جنس سے بھی تواضع کریں۔ تیسری شعبان کو بوداق بیگ کے بھیجے ہوئے "خربزہ ہائے کاریز" اور کچھ اور میوے بادشاہ کے حضور میں پیش ہونے اور لانے والوں کو خلعت کے علاوہ ڈھائی ہزار روپیہ انعام مرحمت ہوا۔

بعد ازیں خبر آئی کہ بوداق بیگ آخر تاریخ شعبان کو ملتان پہنچ گیا اور تربیت خاں نے ضیافت کے بعد پانچ ہزار روپیہ نقد اور ہندوستان کی ساخت کے نو پارچے بطور تحفہ اس کو دیئے اور جب لاہور پہنچا تو خلیل اللہ خاں نے نہایت عمدہ ضیافت کی جس میں بڑے تکلف سے چار سو قابیں انواع و اقسام کے کھانوں کی اور سات سو خوان قسم قسم کے نقلوں اور عطریات کے چنے گئے اور بیس ہزار روپیہ نقد اور ایک خنجر اور ایک تلوار جن کے ساز میناکار تھے اور سات کشتیاں ہندوستان کے بنے ہوئے نفیس کپڑوں کی تواضع کیں۔

اٹھارہویں رمضان کو بوداق بیگ کا ایک عریضہ لاہور سے روانہ ہونے کی اطلاع میں پہنچا اور چونکہ اس نے عریضہ کے ساتھ باز' جرہ' چرغ اور شاہین وغیرہ کچھ شکاری جانور بھی بھیجے تھے اس لئے لانے والوں کو خلعت عطا ہوئے۔

اٹھائیسویں رمضان کو جب بوداق بیگ باغ اعز آباد کے نزدیک بمقام سرائے بادلی پہنچ کر ٹھہر گیا تو بادشاہ نے براہ اظہار عنایت اس کے لئے "الوش خاص" بھیجا اور دربار میں حاضر ہونے کے لئے شوال کی تیسری کو ایک "ساعت نیک" مقرر ہوئی چنانچہ اس مہورت کے موافق جب یہ سفیر شہر کے قریب پہنچا تو اسد خاں' سیف خاں اور ملتفت خاں میر تزک" تین بڑے امیر شہر کے باہر تک استقبال کر کے دیوان خاص و عام میں جہاں بادشاہ سالانہ جشن کے دربار میں تخت پر بیٹھا ہوا تھا لائے اور اس نے (بقول صاحب عالمگیر نامہ جس کے بیان کو اس امر خاص میں ڈاکٹر برنیئر کی بے غرضانہ اور چشم دیدہ شہادت کے مقابلہ میں صحیح نہیں سمجھا جا سکتا) اسی طرز و قانون سے جو اس سلطنت کا معمول بہ تھا "آداب کورنش و

تسلیم بجالاکر "شاہِ ایران کا نامہ پیش کیا۔ اور بادشاہ نے "بعطائے خلعت فاخرہ وجیغہ و خنجر مرصع و ارگجۂ جشن باپیالہ وخوانچہ طلا و پان با پاندان و خوان طلا" عین مجلسِ جشن میں ممتاز فرمایااور دربار برخاست ہونے کے بعد رستم خاں کی حویلی میں جو جمنا کے کنارے ایک عمدہ مکان تھا اور سفیر کی خاطر سرکاری فرش وفروش سے آراستہ کیا گیا تھا اتارا گیا اور میر عزیز بدخشی جو ایک سنجیدہ اور معقول شخص تھا' مہماندار مقرر ہوا۔ بادشاہ نے دوسرے دن سفیر کو پھر حضور میں طلب کیااور ایک "شمشیر باساز مرصع" عنایت کی اور اس کے ہمراہیوں میں سے نذر قلی نامی سوغات کے گھوڑوں کے میر آخور (داروغہ اصطبل) اور محمد حسین تحویلدار تحائف اور احمد بیگ ایلچی کے داماد اور اس کے ملا میر زین العابدین کو خلعت عنایت کئے اور چونکہ رات کو دریائے جمنا میں بادشاہ زادوں کے کار پردازوں اور بڑے بڑے امیروں کے اہتمام سے جشنوں کے معمولی دستور کے موافق کشتیوں پر نہایت تکلف سے چراغوں کی روشنی کی گئی تھی اس لئے بادشاہ نے غسل خانہ کے دربار خاص میں سفیر کو بھی مع اس کے ہمراہیوں کے طلب کر کے اس تماشے کے ملاحظہ میں شریک کیا اور ساتویں شوال کو سفیر نے حسب الطلب حاضر ہو کر بادشاہِ ایران کے تحائف جن میں چھیاسٹھ عراقی گھوڑے نہایت ہی قابل تعریف تھے اور ایک بہت بڑا نایاب موتی جو وزن میں سینتیس قیراط (یعنی ایک سو گیارہ رتی یا ایک رتی کم چودہ ماشے تھا اور جس کی قیمت بادشاہی جوہریوں نے ساٹھ ہزار روپیہ آنکی تھی مع اور تحفوں کے جن کی قیمت مع گھوڑوں اور اس موتی کے چار لاکھ بائیس ہزار روپیہ سمجھی گئی تھی' پیش کئے اور سفیر نے اپنی طرف سے بھی کچھ عراقی گھوڑے اور "شتر بختی" (یعنی دو کوہان والے اونٹ) اور ایران کی اور نفیس چیزیں پیش کش کیں جن کو اورنگ زیب نے قبول فرما کر ساٹھ ہزار روپیہ نقد اور چاندی کے ہودے اور زربفت کی جھول کے ساتھ ایک ہتھنی عطا کی اور محمد حسین تحویلدار تحائف کو پانچ ہزار روپیہ اور نذر قلی میر آخور اور ملا میر زین العابدین کو تین تین ہزار روپیہ اور ایلچی کے داماد احمد بیگ کو دو ہزار روپیہ عنایت کئے اور "بروز جشن سالگرہ چہل و پنجم اور پاندان با خوانچہ طلا اور ایک سپر باساز مرصع اور ایک بندوق خاص" اور محمد حسین کو تین ہزار اور نذر قلی اور حکیم یوسف سفیر کے طبیب کو دو دو ہزار اور اس کے کئی "قورچیوں" (سلحدار) اور ہمراہیوں کو تیرہ ہزار روپے مرحمت فرمائے اور تیسری ذی الحجہ کو تین اشرفیاں جو وزن میں کل سات سو تولہ کی تھیں اور پان پان سو تولہ کے تین روپے عطا ہوئے۔

اور بروز عید ذی الحجہ بوداق بیگ کو رخصت کر کے ایک لاکھ روپیہ نقد اور خلعت فاخرہ مع خنجر مینا کار باعلاقہ مروارید لو ایک گھوڑا بازین و لگام طلا اور ہاتھی با زین طلائی و ساز نقرہ و جل زربفت اور ایک فیل دریائی جس کی شکل و صورت (بقول صاحب عالمگیر نامہ) "خالی از طرفگی و غرابت نہ تھی اور ایک پالکی معہ ساز و سامان" عطا کی اور نامہ کے جواب کی نسبت یہ ارشاد ہوا کہ ایک فہمیدہ اور سنجیدہ بڑے امیر کے ہاتھ ہندوستان کے عمدہ عمدہ تحفوں کے ساتھ پیچھے سے بھیجا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ ایلچی کو اوّل سے آخر تک پانچ لاکھ روپیہ اور اس کے ہمراہیوں کو پینتیس ہزار روپیہ عطا ہوا اور خواجہ صادق بدخشی کو ملتان تک مشایعت کے لئے مامور کیا گیا۔

واضح ہو کہ عالمگیر نامہ میں جو فیل دریائی کا ذکر ہے مآثر عالمگیری میں بھی فیل دریائی ہی لکھا ہے یہ کوئی خیالی جانور نہیں ہے۔ اس کو انگریزی میں ہپو پوٹامس کہتے ہیں جس کا لفظی ترجمہ ہے اسپ دریائی۔ مگر اس کو گھوڑے سے کچھ مشابہت نہیں البتہ گینڈے سے بہت مشابہ ہے اور اگر سونڈ اور چوڑے کان بھی ہوتے تو پورا ہاتھی ہی ہوتا۔ تھن دار جانور کی نوع میں سے ہے اور مختلف اقسام کا ہوتا ہے اور بڑے سے بڑا دم کی طرف سے لے کر سر تک سترہ فٹ کا لمبا ہوتا ہے۔ اکثر سواحل افریقہ پر اور بعض جگہ دریائے نیل میں بھی پایا جاتا ہے۔ اگرچہ اکثر پانی میں خوش رہتا ہے مگر دریا کے کنارے نباتات کو چر کر زندگی بسر کرتا ہے۔

اور شاہ عباس کا وہ نامہ جو یہ ایلچی لایا تھا اور جس کے مضمون کی نسبت ڈاکٹر برنیئر نے بعض افواہیں نقل کر کے اپنے قیاس سے ان کی تردید کی ہے انشائے ملا طاہر وحید میں جو شاہ عباس کا نہایت مقرب اور "مجلس نویس خاص" تھا مع ایک "رقم" یعنی فرمان موسومہ ایلچی مذکور (جس کی اس کے صحیح نام اور خطاب بوداق سلطان کی جگہ صاحب عالمگیر نامہ وغیرہ شاہی مورخوں نے اپنے ہاں کے شہزادوں کا لقب سلطان ہونے کے لحاظ سے خواہ مخواہ بوداق بیگ بنا دیا ہے) بجنسہٖ موجود ہے۔ اس کے ملاحظہ سے ثابت ہوتا ہے کہ فی الواقع اس نامہ میں کوئی بھی ایسا فقرہ نہ تھا جو اورنگ زیب جیسے عالی منزلت بادشاہ کی شان کے برخلاف ہو بلکہ برعکس اس کے تمام الفاظ اور طرزِ تحریر نہایت حسبِ حال اور معقول اور مؤدب ہے اور اگرچہ اس میں اورنگ زیب کو اصل نام سے مخاطب کیا ہے بلقب عالمگیر نہیں لکھا مگر یہ بات کچھ اس کی توہین کے ارادہ سے نہیں معلوم ہوتی کیونکہ نامہ کی طرزِ عبارت کے علاوہ بوداق بیگ

کے نام کے فرمان سے بے شبہ اور صاف طور پر شاہ عباس کا یہ خیال پایا جاتا ہے کہ وہ اورنگ زیب کے ساتھ دوستی اور اتحاد پیدا کرنے کا بہ دل خواہشمند تھا۔ چنانچہ نامہ اور فرمان کے بعض فقرات زاید کو جو اس حاشیہ کے مدعا سے علاقہ نہیں رکھتے حذف کر کے بعینہٖ اس جگہ نقل کیا جاتا ہے۔

"نامہ کہ بہ بادشاہ والا جاہ اورنگ زیب نوشتہ شد"

بعد از حمد جناب کبریا و بسطِ بساطِ نعت سید انبیاء و منقبت زبدہ اصفیا بر مرآتِ ضمیر قدسی تخمیر اعلیٰ حضرتِ رفیع المنزلت گردوں بسطتِ مشتری سعادت خورشید طلعت عطارد فطنت کیواں وقار سپہر اقتدار زینت بخشِ دسادہ جاہ و جلال متکی ارایکِ فرخندگی و اقبال مصقل مرآت نمائے دولتِ خداداد شیرازہ بند اوراقِ پریشان بلاد و عبادِ فارس مضمارِ خصم افگنی و دشمن شکاری منظور انظارِ حضرتِ باری۔ پیشرو سالکان صراطِ مستقیم وصول۔ نظر یافتہ مقربان پیشگاہ قبول فرور دمنِ ریاضِ ہمیشہ بہار سلطنت گورگانی۔ حدیقہ طرازِ گلستان خلد نشان جہانبانی سیراب منہلِ عذبِ انتباہ و آگاہی۔ دقیقہ شناسِ خبایائے اسرار کماہی شہاب ثاقبِ سپہر جرأت و جلادت نہنگ لجج بحر شہامت و بسالت المويد بعنايات الملک الحسيب نظاماً للسلطنه المنصيفة والمعدلته والشهامة والبسالته والجلالته والرفعته والعزة والامتنان سلطان اورنگ زیب منطبع میگرداند کہ دریں وقت ارجمند و زمانِ سعادت پیوند کہ بہ نیروئے خالق انس و جان و جاعل کمین و مکان اسباب کامیابی و خوش دلی من جمیع الوجوہ آمادہ ابواب فیوضات از شش جہت بر چہرۂ اقبال کشادہ است ہمیانجی مخبران صدق آئیں مژدۂ جلوسِ آن گوہر فروزان بحر بسالت و شجاعت و جوہر تیغ دشمن شکار جرأت و جسارت بر سریر والائے سلطنت موروثی گورگانی دو سادۂ لازم السعادتِ جہانبانی کہ بفحوائے صدق انتمائے تؤتي الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء و تعز من تشاء و تذل من تشاء و بمقتضائے آیہ وافی الہدایہ ان الارض لله يورثها من يشاء من عباده والعاقبة للمتقين و بہ نیروئے اصابتِ تدبیر و موافقت کارگزاران تقدیر پیرایہ حسن وقوع پوشیدہ سامعہ افروز گشتہ مسرت بر مسرت و خوشدلی بر خوشدلی افزودہ ہموارہ بر سیر گردوں نظیر دولت متمکن باشند از انجاکہ مبانی صداقت و التیام فیمابین برگزیدگان ایں دو سلسلہ والا مقام سپہر احتشام استحکام تمام داشتہ در عالم دوستی قدیم مترقب می بود کہ آں زیبندۂ ارایکِ اقبال و چراغ افروزِ دودمان مجد و اجلال راہر گونہ

ہمیشہ در باب استقرار امر جہانبانی درکار باشد بمقام اعلام در آید کہ کارگزاران دولت ابد مقرون بانجام آن مامور گردند جوں تدارک مافات بعون عنایتِ الٰہی مقدور و مراعات شیوہ ستودۂ دوستی پیوستہ منظور است بدستور ہر گونہ مطلبے کہ در خاطر والا مرکوز باشد زبان زد خامہ اظہار خواہند نمود"۔ فقط انتہٰی۔

"رقعے کہ بہ بوداق سلطان تفنگچی آقاسی در ایام ایلچی گری ہند نوشتہ"

امارت پناہ بوداق سلطان بعنایتِ بے غایت شاہانہ و مرحمتِ بے نہایت بادشاہانہ مفخر و سرفراز و ممتاز بودہ بداند۔ کہ عریضہ کہ دریں وقت مصحوب رفعت و معالی پناہ علی قلی بیگ بدرگاہ جہاں پناہ و استانِ خلایق امید گاہ مشتمل بر خوشنودی از الطافِ پادشاہ والا جاہ گردوں بارگاہ ستارہ سپاہ فرستادہ بود در ہنگامیکہ گلہائے کامجوئی و کامرانی در بوستان بے خزان صاحبقرانی بریزش سحابِ عنایت سبحانی شگفتہ و گرد و غبار عوایق و موانع عیش و عشرت بجسایم الطافِ الٰہی رفتہ و ولایتِ اطرافِ در دربار جاہ و جلال عرش آستان و سلاطین با تمکین در محفل بہشت مشاکل مانندِ ساغر خدمت در دوران بودند بنظر کیمیا اثر رسید "برگِ پان" کہ بدفعات ارسال یافتہ بود تخصیص "بار جامۂ لاہوری" (یعنی لاہور کی بنی ہوئی وہ بوری یا گون جس میں پان بھیجے تھے) بوئے نو بہارِ دار الخلد بزم ارم نشان سرسبز دریاں وارد گردید بنا بر عنایتِ شاہانہ در بارۂ آن غلام زادہ خلاع فاخرہ پوشیدہ مصحوب رفعت و معالی پناہ سہراب بیگ غلام خاصۂ شریفہ فرستادہ شد معروض داشتہ بود کہ اعلیٰ حضرت پادشاہ والا جاہ کامیاب مالکِ رقاب بنا بر مراعات یکجہتی و یگانگی مقرر فرمودہ اند کہ بعاقب ارسال برگ سبز پان بوستان یاد آوری شگفتہ و خنداں باشد این معنی موجب اہتزاز از اہیر بوستان سرائے خاطر ہمایوں شد چوں از طرفین بساط یکتا دلی ممہد و ابواب منافرت و بیگانگی بالکلیہ مندست انچہ از اثمار حلاوت آثار مختصہ ایں دیار مرغوب خاطر والائے آن پادشاہ جم اقتدار عدالت شعار پسندیدہ اطوار بودہ باشد معروض خواہد داشت کہ بندگانِ درگاہ گردوں پیشگاہ بارسال آں مامور گردند۔ در عریضہ علیحدۂ اظہار میلانِ خاطر خورشید مآثرِ اعلیٰ حضرت پادشاہِ گردوں بارگاہ بارسالِ عمدۃ الاماثل والا شباہ برہان الدین خویش ایالت و شوکت پناہ فاضل خاں شدہ بود بر آن غلام زادہ بواجبی ظاہر است کہ درحینیکہ جاں نثار خاں برسم حجابت بدرگاہ خلایق پناہ آمدہ از جملہ مطالبے کہ بعرض آں مامور شدہ استدعائے رخصت جمعے از مردم ایں دیار بود و چوں در آں وقت تراکم غبار نفار مانع دخول شاہد مسئول بحجلہ اجابت و قبول بود

پیرایۂ حصول نہ پوشیدہ دریں وقت کہ بحمد اللہ تعالیٰ آن غبار از رہگذر خاطر رفتہ وگلہائے یکجہتی بر شاخسار مودّت شگفتہ است زبدۃ الاقران موی الیہ را مرخص فرمودہ ارقام مطاعہ لازم الاطاعت باسم بیگلر بیگیان عظام و امرائے کرام دوزرائے ذوی الاحترام ممالک محروسہ شرف صدور یافت کہ مانع ومزاحم مشار الیہ نشدہ او را درکمال رفاہ حال وفراغ بال با منسوبان ومتعلقان واحمال واثقال روانہ نمایندہ و علی قلی بیگ مشمول عنایات شاہانہ وانعامات خسروانہ شد........

........چوں خاطر والاو طبعِ اقدس واعلیٰ متوجہ رسیدن اخبارِ صحت آثار ذاتِ ستودہ صفاتِ کامل السجیاتِ اعلیٰ حضرت پادشاہِ والاجاہ ستارہ سپاہ می باشد و آن غلام زادہ نیر مدتیست کہ از شرفِ درگاہِ خلایق پناہ دور و از شرفِ بندگی مہجور شدہ درحینِ درودِ رقم اشرف رخصت انصراف حاصل نمودہ روانہ شود و بتوجہاتِ شاہانہ مُستمال باشد"۔ فقط۔

اور مصنف نے جو ایران کی کمزوری کے ثبوت میں یہ لکھا ہے کہ باہمی فساد کے دنوں میں دارا شکوہ' شاہ جہاں' سلطان شجاع اور شاید صوبہ دار کابل نے بھی ان سے مدد مانگی تھی مگر باوجود ایسے عمدہ موقع مداخلت کے وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ اس کے متعلق کتاب "طاہر وحید" میں اگرچہ شاہ جہاں' شجاع اور مہابت خاں صوبہ دار کابل کے نام کی تو کوئی تحریر نہیں ملتی۔ مگر شاہ عباس کی طرف سے مراد بخش دارا شکوہ اور والیان بیجاپور اور گولکنڈہ کے نام کے نامے بیشک موجود ہیں۔ جن سے پایا جاتا ہے کہ مراد بخش کو خالی وعدے تو بہت بڑے بڑے لفظوں میں دیئے گئے تھے مگر اخیر میں ایفائے وعدہ میں لیت ولعل اور امروز وفردا کر دینے کے لئے قصداً گنجائش رکھ لی گئی تھی۔ اور دارا شکوہ کو جو نواح سندھ میں پہنچ کر طالب امداد ہوا تھا' مدد کا وعدہ دے کر یوں ٹال دیا تھا کہ آپ اپنے دادا ہمایوں کی طرح اوّل ہمارے پاس اصفہان میں تشریف لے آیئے پھر سب طرح سے بندوبست ہو جائے گا۔

اور بیجاپور و گولکنڈا والوں کو جو شاہان صفویہ کے ہم مذہب تھے شاہان مغلیہ کا سنی المذہب ہونا بہت شدومد سے جتا کر اگرچہ یہ صلاح تو دی گئی تھی کہ اس وقت یہ اپنے خانگی فسادوں میں مبتلا ہیں تم دونوں متفق رہ کر ان کی بیخ کنی میں کوشش کرو مگر اپنی فوج وغیرہ بھیجنے کا کوئی وعدہ واقرار نہ تھا۔

ان حالات پر غور کرنے سے برنیئر کی یہ رائے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ اہل ایران ظاہری نمائش کے لئے خالی شیخیاں بہت بگھارتے تھے مگر اپنی طاقت کا اندازہ

اپنے دل میں خوب سمجھے ہوئے تھے۔ (س م ح)

(۱۴۳) شاہ جہاں کا مؤرخ خاص ملا عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامہ کے دو سالہ اول کے خاتمہ میں (جو ۱۰۴۷ ہجری کے مطابق تھا دربار شاہ جہانی کے علماء و فضلا کی فہرست میں اورنگ زیب کے استاد کی نسبت یہ عبارت لکھتا ہے۔ "میر محمد ہاشم معروف بہ حکیم ہاشم خلف میر محمد قاسم گیلانی مدت دوازدہ سال در حرمین شریفین بودہ منقولات را از شیخ محمد عربی محدث و شیخ عبدالرحیم حسانی و ملا علی نبیرہ ملا عصام الدین مشہور و معقولات راز میر نصیر الدین حسین پسر زادہ میر غیاث الدین منصور و میرزا ابراہیم ہمدانی فرا گرفتہ بہ ہندوستان آمدہ طب وریاضی تردسر آمد اطباء حکیم علی گیلانی در زبدہ چندے در احمد آباد گجرات بتدریس مشتغل بودچوں دانائی او در فنون وفضائل خصوصاً طب بعرض اقدس رسید حکم شد کہ در ہماں بلدہ بخدمت صدارت وطبابت پردازد۔ پس از انقضائے مدتے ملتزم عبودیت سدہ سنیہ گشتہ بامر خاقانی شرف تعلیم اختر برج سعادت بادشاہزادہ محمد اورنگزیب بہادر دریافت و اکنوں در ملازمت آن والا گوہر کامیاب است بہ تفسیر بیضاوی حاشیہ نگاشتہ بنام نامی حضرت شاہنشاہی مطرز گردانیدہ است"۔ فقط

اور چونکہ اورنگ زیب کی ولادت پندرھویں ذی قعد ۱۰۲۷ ہجری کی تھی اس حساب سے ظاہر ہے کہ ۱۰۴۷ھ میں اس کی بیس برس کی عمر تک اس کا یہی استاد اس کے پاس تھا اور اس وقت کے نامور عالموں کی مذکورہ بالا فہرست میں صالح نامی کسی شخص کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ صاحب "عمل صالح" نے شاہ جہاں کے عہد کے خوشنویسوں کے ذِکر میں میر عبداللہ مشکیں رقم کے بیٹوں میں محمد صالح و میر محمد مومن کے نام لکھ کر ان کی خوشنویسی کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ علاوہ خوشنویسی کے یہ دونوں بھائی ہندوستان کے فنِ موسیقی میں بھی نہایت کامل گویّے تھے اور شاعر بھی تھے۔ چنانچہ میر صالح اشعار فارسی میں کشفی اور ہندی اشعار میں سبحان اپنا تخلص کرتا تھا اور یہ دونوں اپنے اشعار زیادہ تر اہل بیت اطہار سلام اللہ علیہم کے مناقب میں لکھتے اور اہل تصوف سے بہت ربط و ضبط رکھتے تھے اور منصب داروں کی فہرست میں امیر صالح کو نہ صدی صد سوار کا منصب دار لکھا ہے مگر اورنگ زیب کا استاد ہونا کہیں نہیں لکھا۔ (س م ح)

(۱۴۴) ماثر عالمگیری اور سیر المتاخرین سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے جلوس کے اٹھارہویں سال (۱۰۸۵ ہجری) میں تمام منجموں کو جو بادشاہ اور شہزادوں اور

صوبہ داروں کے پاس ملازم رہتے تھے موقوف کر دیا تھا۔ بلکہ اس حکم کی تعمیل اس سختی سے کی گئی تھی کہ اس کے مقرب خاص بختاور خاں نے ان سے مچلکے لکھوا لئے تھے کہ آئندہ تقویم (جنتری) تک بھی نہ بنایا کریں اور باوجودیکہ حسابوں کی صحت کے لئے سرکاری دفتروں میں جنتریوں کا موجود رہنا ایک ضروری امر تھا۔ اور مذہب کی رو سے کچھ منع بھی نہ تھا مگر افراط تشرع سے ان کا رکھنا اور دیکھنا بھی موقوف کیا گیا اور مہورت نکلوا کر سفر کرنے کی جگہ یہ دستور مقرر کیا گیا کہ دوشنبہ اور پنجشبہ کو کوچ ہوا کرے۔ (س م ح)

(۱۴۵) سلطان بایزید یلدرم کے مغلوب اور قید ہونے کے ذکر میں یہ روایت نہ تیمور نامہ میں لکھی ہے نہ اکبر نامہ میں۔ (س م ح)

(۱۴۶) ایک حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے کہ اس کو خان خاناں سپہ دار بنگالہ لکھا جاتا تھا۔ امیر الامراء کا خطاب شائستہ خاں کو تھا۔ (س م ح)

(۱۴۷) میر جملہ کا ایک مغلوبانہ طور پر آسام سے واپس آنا (جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے) درست نہیں ہے اور اس کے علاوہ اور بھی غلطیاں ہیں اور اس مہم کا صحیح اور مفصل حال جو کوچ بہار اور آسام دونوں پر ایک ہی وقت میں کی گئی تھی عالمگیر نامہ میں اس خوبی سے لکھا ہے کہ اس وقت کی فارسی تاریخوں میں ایسے عمدہ طور کا بیان شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے اور اگرچہ تفصیل اور جزئیات سب کے سب نہایت ہی دلچسپ اور قابلِ دید ہیں لیکن اگر ان کو پورا نقل کیا جاتا تو بجائے خود ایک چھوٹی سی کتاب بن جاتی اس لئے کچھ اس کا خلاصہ لکھ کر بطور ایک حاشیہ کے اس کتاب میں صفحہ نمبر ۲۱۵ پر دیا گیا ہے اس کو ملاحظہ کرنا چاہئے۔ (س م ح)

(۱۴۸) راس ڈاس پال ماس۔ افریقہ کے اس مغربی ساحل کے نزدیک واقع ہے جس کو انگریزی میں گولڈ کوسٹ (یعنی ساحل الذہب) کہتے ہیں اور جزائر سینٹ طامس اور گالیس بھی اسی کے نزدیک ہیں۔ یہ سب مقام زمانہ سابق میں پرتگیزوں کے تحت حکومت تھی۔ اور چونکہ سینٹ طامس ایک جگہ مدراس کے قریب بھی پرتگیزوں کے قبضہ میں تھی۔ اس لئے سیاق کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ افریقہ کا سینٹ طامس مراد نہیں ہے۔

(س م ح)

(۱۴۹) یہ ماجرا بنی اسرائیل کے قصص تاریخی سے متعلق ہے اور مختصر بیان اس کا اس طرح پر ہے کہ الیاقیم ابن یوشیا بیت المقدس میں آل یہود ابن یعقوب علیہ السلام کا ۱۸ ۲ ہیوطی میں جس کو اب (۱۸۸۶ء اور ۱۳۰۴ھ) سے دو ہزار چھ سو ستاون برس کا عرصہ گزرا'

اس طرح پر بادشاہ ہوا تھا کہ مصر کے بت پرست بادشاہوں میں سے جو فرعون کہلاتے تھے' اس کے ایک ہمعصر فرعون نے اس کے بھائی یوحاز کو مغلوب اور قید کر کے الیاقیم کو بطور اپنے خراج گزار کے اور یویاقیم نام رکھ کر بنی یہودا کا بادشاہ بنا دیا تھا۔ یہ بادشاہ بہت ظالم تھا اور جیسا کہ اور بنی اسرائیل بھی بعض اوقات کرتے رہتے تھے اس نے شریعت موسوی کے برخلاف بت پرستی اختیار کر کے اس طریق کو رواج دینا شروع کیا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت اوریا نبی کو جو حضرت یرمیا نبی کی طرف سے شرع موسوی کے موافق بنی اسرائیل کو گمراہیوں اور جور و جفا اور سخت بدعتوں اور اعمال قبیحہ اور بت پرستی سے منع کرتے اور قہر الٰہی کے نازل ہونے سے ڈراتے تھے' ناراض ہو کر اس بادشاہ نے قتل کرنے کا ارادہ کیا اور آخر کار مصر سے کہ جہاں وہ بھاگ کر چلے گئے تھے ڈھونڈوا کر اور اپنے مربی فرعون کی معرفت پکڑ منگا کر بیت المقدس میں قتل کرا دیا۔ بطور انتقامِ الٰہی ان حرکتوں کا نتیجہ یہ ہوا......

......کہ بُخ تَنَصّرِ ثانی پسر نَبْ پَلَسّر کلدانیوں کے بت پرست بادشاہ نے جس کے خاندان کی سلطنت عراق عرب میں تھی اور دریائے فرات کے نزدیک شہر نینوا اور بابل (کربلائے معلٰی اور بغداد کے قریب) ان کے دار الحکومت تھے ۵۸۱؁ ہیوطی میں بادشاہ ہو کر اوّل تو ان قبائل کو جو ملک فلسطین میں رہتے تھے مملکت بابل کا مکرر مطیع کیا اور بعد ازاں یویاقیم کے گیارہویں سال جلوس میں ایک لشکر عظیم کے ساتھ اپنے دار الملک نینوا سے بیت المقدس پر چڑھائی کی اور یویاقیم جو اس کے مقابلہ میں محض بے حقیقت تھا بجز اطاعت کے کوئی چارہ نہ دیکھ کر مع سرداران آلِ یہود حاضر ہو گیا۔ چنانچہ بخ تنصر نے بلا مقابلہ و مزاحمت شہر میں داخل ہو کر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور جب کل بندوبست حسب دلخواہ کر چکا تو یویاقیم کو پا بزنجیر جکڑ کے مع اس کی ماں اور ملکہ اور بیٹوں اور دس ہزار اور یہودیوں کے جن میں سے ایک ہزار شہزادے اور سردار اور جنرل اور سات ہزار سپاہی تھے اور دو ہزار اور عوام الناس اور جن میں حضرت دانیال پیغمبر پسر یوحنا یویاقیم کے بھتیجے بھی بارہ برس کی عمر میں مع بعض اور صلحائے قوم کے تھے' سب کو قید کر کے بابل کو بھیج دیا اور اپنے سپہ سالار بوزردان کو حکم دے کر بیت المقدس کو جلا کر خاک سیاہ اور بے نشان کر ڈالا اور بے شمار باشندگانِ ملک کو قتل کرایا اور جو مال و دولت کہ مسجد اقصٰی اور خزانہ شاہی اور رعایا کے گھروں میں تھا' سب لوٹ کھسوٹ کر اور ۷۰ ہزار بوجھے لاد کر نینوا کو چلا آیا اور

بنی اسرائیل میں سے ایک اور شخص کو اپنی طرف سے وہاں کا حاکم بنا کر یہودا بن یعقوب کے خاندان کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ چونکہ بیت المقدس کی خرابی عبری. گیارہویں "مسھنی آب" کی نویں تاریخ کو ہوئی تھی اس لئے بنی اسرائیل اب تک اس دن سوگ مناتے ہیں۔ (ماخوذ از تاریخ التواریخ) (س م ح)

(۱۵۰) شاہ جہاں کے مؤرخ خاص ملا عبدالحمید لاہوری نے ہوگلی کے پرتیگیروں کے اس واقعہ کو بادشاہ نامہ میں یوں لکھا ہے کہ "بنگالیوں کے عہد میں (یعنی ہمایوں اور اکبر کے زمانہ سے پہلے جبکہ بنگالہ میں تیموریہ خاندان کی حکومت نہ تھی) یورپی سوداگروں کا ایک گروہ جو سراندیپ (لنکا) کے رہنے والے تھے سات گانوں (چاٹ گام) میں آمد و رفت رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے سات گانوں سے آگے بڑھ کر کھاڑی کے کنارے (جس کو ملا عبدالحمید "خور" لکھتا ہے) اس بہانہ سے کہ خرید و فروخت کے لئے کوئی جگہ چاہئے بنگالیوں کی اجازت سے جہاں اب شہر ہوگلی آباد ہے اول چند گھر بنائے اور بمرور ایام حکام بنگالہ کی بے شعوری اور لاپروائی سے اس نئی آبادی میں بہت سے یورپی لوگ جمع ہو گئے اور ان لوگوں نے یہ کام کیا کہ ایک طرف تو دریا موجود ہی تھا باقی تینوں طرف عمیق خندق کھدوا کر اور پانی سے بھر کر اس مقام کو ایک جزیرہ کی شکل بنا لیا اور اس کے اندر مضبوط اور عالیشان عمارتیں بنا کر توپ، بندوق اور سامان جنگ سے خوب مستحکم کر لیا اور یہ آبادی ایسی بڑھی کہ بندر سات گانوں کا بازار سرد ہو گیا اور یورپی جہازوں کی آمد و شد اور خرید و فروخت اسی جگہ مقرر ہو گئی اور یہ مقام ایک بڑا شہر بن کر بندر ہوگلی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں نے ہوگلی کی کھاڑی کے دونوں طرف جو پرگنے تھے تھوڑے معاملہ پر وہ بھی اجارے لے لئے اور وہاں کی رعایا کو زبردستی اور طمع دونوں طور سے کرسچن بنا بنا کر یورپ کو بھیجنا شروع کیا اور اگرچہ رعیت کے کم ہو جانے سے اجارہ کا روپیہ گرہ سے بھرنا پڑتا تھا مگر باوجود اس کے وہ اس فعل کو موجب ثواب سمجھ کر اس نقصان کو سوداگری کے نفع سے پورا کرتے تھے اور آخر کار ان کی یہ کارروائی محال اجارہ کے دیہات پر ہی محدود نہ رہی تھی بلکہ دریا کنارہ کا جو کوئی آدمی قابو چڑھ جاتا اس کو بھی پکڑ کر اسی طرح عمل کرتے تھے۔ شاہ جہاں کو جو اپنے باپ کے عہد میں بنگالہ جانے کا اتفاق ہوا تو بادشاہی رعایا اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا یہ طرز سلوک بہت ناگوار گزرا اور اس وقت سے ان کی بیخ کنی کا خیال اس کے دل میں ایسا جما کہ جب وہ بادشاہ ہوا اور قاسم خاں کو بنگالہ کی صوبہ داری پر مقرر کیا تو اس "عقدہ دشوار کشا" کے

کھولنے کو خشکی اور تری دونوں طرف سے حملہ کرنے کی تدبیریں اس کو اپنی زبان خاص سے سمجھائیں جس کے موافق خان مذکور نے صوبہ کے اور ضروری انتظاموں سے فارغ ہو کر سردی کے اخیر میں ماہ شعبان ۱۱۰۱ ہجری الہ یار خاں نامی ایک سردار کو مع عنایت اللہ اپنے بیٹے اور کئی اور سرداروں اور امیروں کے یہ تدبیر سمجھائی کہ اول بردوان جاکر ٹھہریں اور جائے ہوگلی کے یہ مشہور کردیں کہ بردوان کی طرف مقام تجلی کی تاخت و تاراج کے لئے یہ فوج آئی ہے اور بہادر نامی ایک سردار کو جو اس کا ذاتی ملازم اور نہایت محلِ اعتماد تھا مخصوص آباد (مرشد آباد) کے محال خالصہ کے بندوبست کے بہانہ سے اس کو یہ سمجھا کر روانہ کیا کہ ضرورت کے وقت الہ یار خاں اور عنایت اللہ کے پاس پہنچ کر شامل ہو جانا اور یہ سب احتیاطیں اس اندیشہ سے تھیں کہ کہیں اس ارادہ کی خبر پاکر پرتیگر لوگ مال و عیال کو لے کر اپنی کشتیوں میں نہ جا چڑھیں۔ علاوہ بریں یہ تدبیر کی گئی کہ چند سرداروں نے سری پور بندر سے نواڑہ میں بیٹھ کر اول کھاڑی کے دہانہ کو جا روکا اور بعد ازاں الہ یار خاں اور عنایت اللہ نے بردوان سے دفعتاً کوچ کر کے ایک جگہ سات گاؤں اور ہوگلی کے بیچ میں آ ڈیرا کیا اور بہادر نے پانچ سو سواروں اور پیادوں کی جمعیت کثیر سے مخصوص آباد سے آکر اور خواجہ شیر وغیرہ کے ساتھ جو نواڑہ میں سری پور سے آئے تھے شامل ہو کر ہوگلی کی کھاڑی میں ایک تنگ جگہ کشتیوں سے پل باندھ کر ان کے سمندر میں بھاگ جانے کا رستہ بند کر دیا اور بعد اس کے دوسری ذی الحجہ ۱۱۰۱ ہجری کو کھاڑی اور خشکی دونوں طرف سے آگے کو بڑھے اور قصبہ بالی میں پہنچ کر جو یہ بستی بھی خندق سے اس طرح پرتیگروں ہی کے متعلق تھی ان کے ایک گروہ کو تہ تیغ کیا اور جو کچھ ملا لوٹ لیا اور کچھ سپاہ نے کھاڑی کے دونوں طرف ان کے اجارے کے پرگنوں میں داخل ہو کر "نصرانی اجارہ داروں" کو قتل و قید کیا اور سب سے زیادہ کار آمد تدبیر یہ کی کہ ان کے نواڑہ کے ملازموں کے اہل و عیال کو بھی جو سب بنگالی تھے پکڑ لائے جس کے باعث سے ایسی ضرورت کے وقت چار ہزار ملاح ان کی نوکری چھوڑ کر بادشاہی لشکر میں حاضر ہو گئے اس کے بعد بادشاہی سرداروں نے خاص ہوگلی کو جا گھیرا اور ایام محاصرہ میں ساڑھے تین مہینے تک ان کی یہ حالت رہی کہ کبھی تو لڑائی لڑتے تھے اور کبھی صلح کے پیغام و سلام بھیجتے تھے اور اس کد و مریز سے اصل مقصود یہ تھا کہ یورپ سے کمک آنے کے منتظر تھے۔ چنانچہ اسی پیغام و سلام میں اگرچہ بطور تمہید صلح اور عذر و معذرت کے ایک لاکھ روپیہ نقد بھی نذر کر دیا مگر باوجود اس کے تقریباً سات ہزار ہندو و مچی جو حالت محاصرہ

میں ان کے پاس موجود تھے ان کو لڑنے کے لئے بھی مامور کئے رکھا اور جس باغ میں بادشاہی سپاہ اتری ہوئی تھی اس کے درختوں کو بھی چھٹوا دیا تاکہ بندوقوں کی زد سے پناہ نہ مل سکے۔ آخر کار بادشاہی سرداروں نے (جو دریائے لڑائی میں عموماً لاچار تھے) یہ تدبیر کی کہ بیلدار لگا کر گرجا کی طرف کی خندق میں (جس کا عرض اور عمق کم تھا) چھوٹی چھوٹی نالیاں کھدوا کر اس کو پانی سے خالی کر ڈالا اور اپنے مورچوں میں سے تین سرنگیں لگائیں جن میں سے دو کو تو خبر پا کر انہوں نے خراب کر دیا۔ مگر تیسری سرنگ ٹھیک اس مکان تک جا پہنچی جو سب میں اونچا اور زیادہ مضبوط تھا اور جس میں بہت سے یورپی لوگ جمع رہتے تھے اور جب اس سرنگ میں بارود بھر دی گئی تو چودھویں ربیع الاول کو اسی مکان کے سامنے صف لشکر آراستہ کی گئی تاکہ لڑائی کا زور اسی طرف سمجھ کر وہ سب ادھر ہی آن کر جمع ہو جائیں اور جب ایسا ہی ہوا تو اول توپ اور بندوق سے لڑائی شروع کر کے آخر کار سرنگ کو آگ دے دی جس سے وہ مکان اور بہت سے یورپی لوگ دھوئیں کی طرح اڑ گئے اور باقیماندہ جو اپنی کشتیوں میں جا چڑھنے کو بھاگے تو مارے گھبراہٹ کے اکثر تو پانی میں ڈوب گئے اور جو لوگ ڈوبتے اچھلتے کشتیوں تک جا بھی پہنچے ان کو بادشاہی نواڑہ کی فوج نے جالیا یہاں تک کہ پرتگیزوں نے اپنی تباہی کو یقینی جان کر اپنے ایک بڑے جہاز کو جس میں قریب دو ہزار کے مرد و عورت اور بہت سامان و اسباب اور بارود کا ذخیرہ تھا اس خیال سے کہ غنیم کے ہاتھ نہ پڑے بارود میں آگ دے کر از خود جلا دیا اور اسی طرح جو لوگ چھوٹی کشتیوں میں چڑھ گئے تھے انہوں نے بھی اپنے آپ کو جلا کر ہلاک کر ڈالا۔ غرضکہ چونسٹھ بڑے ڈونگوں اور ستاون غراب اور دو سو جلیوں میں سے صرف ایک غراب اور دو جلیے تو (محض اس وجہ سے کہ یورش کے وقت چند تیل کی شاہی کشتیوں میں آگ لگ کر کچھ راستہ کھل گیا تھا) بچ کر نکل گئے مگر اس کے سوا جو کچھ آگ اور پانی سے بچا سب بادشاہی لشکر کے قابو میں آگیا۔ اور شروع جنگ سے اس وقت تک اگرچہ لشکر شاہی میں سے تو صرف ایک ہی ہزار آدمی مارے گئے مگر محصوروں کی طرف عورت مرد بوڑھا جوان ان سب قسم کی آفتوں اور لڑائی میں دس ہزار کے قریب ضائع ہوئے اور باقی "نصرانی مرد و عورت" چار ہزار چار سو قید ہوئے اور رعایائے بادشاہی میں سے جو دس ہزار آدمی کے قریب ان کی قید میں تھے ان کو رہائی دی گئی اور ۱۱ محرم ۱۰۴۲ ہجری کو قاسم خاں کے بیٹے عنایت اللہ مذکور نے بنگالہ سے آکر چھوٹے بڑے چار سو مرد و عورت "اسیران فرنگ" (یا اگر چھاپہ میں کچھ غلطی ہو گئی ہو تو وہی چار ہزار چار سو) مع ان کے بتوں کے (جو رومن

کیتھلک عیسائیوں کے گرجاؤں میں اکثر ہوا کرتے ہیں) بادشاہ کی نظر سے گزرانے جس نے ان کی نسبت یہ حکم دیا کہ سختی کے ساتھ قید رکھے جائیں اور جو کوئی مسلمان ہو جائے اس کا گزارہ مقرر کیا جائے اور جو مسلمان نہ ہو وہ برابر قید رہے۔ چنانچہ بعضے تو مسلمان ہو کر مورد عنایات ہو گئے اور بعضے قید ہی میں مر گئے اور ان کے بتوں میں سے جو مورتیں کہ بعض پیغمبروں کی تھیں ان کو تو ادب کے خیال سے دریائے جمنا میں ڈبوا دیا باقی کو تڑوا ڈالا۔

صاحب "سیر المتاخرین" نے ملا عبدالحمید کی طرح ان کو محض سرندیپ کے یورپی لوگ نہیں بتایا بلکہ جیسا کہ چاہئے تھا بہ تخصیص قومیت "پرتگیس" لکھا ہے اور اس مصیبت کا باعث ان کا "تمرد اور بغاوت" اور قیدیوں کی تعداد چار ہزار چار سو زن و مرد لکھی ہے اور چونکہ سرنگ اڑنے کے بعد بادشاہنامہ میں بھی اتنے ہی آدمیوں کا قید ہونا لکھا ہے اس لئے اغلب ہے کہ یہی شمار صحیح ہو مگر ہاں یہ بھی ممکن ہے کہ چار ہزار چار سو نصرانی قیدیوں میں سے ہندوستانی نصرانیوں کو چھوڑ کر صرف چار سو گورے چٹے یورپی مردوں اور عورتوں ہی کو چھانٹ کر غلامی کے لئے حاضر کیا گیا ہو۔ (س م ح)

(۱۵۱) اس کتاب کے مترجم انگریزی مسٹر اروِنگ براک نے پرتگیزوں کے ہندوستان میں آنے اور ان کے عروج و زوال کا حال ایک حاشیہ میں بہت تفصیل سے لکھا تھا۔ چونکہ وہ دلچسپ مضمون کسی قدر طولانی ہے اس لئے خفیف کمی بیشی کے ساتھ ہم نے اس کو اس کتاب میں صفحہ نمبر ۲۴۷ پر درج کر دیا ہے۔ (س م ح)

(۱۵۲) یہ چھوٹا سا جزیرہ خلیج بنگالہ میں چاٹ گام کے نزدیک ہے۔ (س م ح)

(۱۵۳) اہل یورپ گیلی اور گیلی آس ایسی کھلی کشتیوں کو کہتے ہیں جیسی کہ اکثر پنجاب اور ہندوستان کے بعض بڑے دریاؤں پر ہوتی ہیں۔ چپوؤں سے کھیئی جاتی ہیں۔ ضرورت کے وقت ان پر پالیں بھی چڑھا سکتے ہیں۔ ایک مختصر سا بنگلہ بھی ایک سرے پر بنا ہوا ہوتا ہے اور "گیلی" اور "گیلی آس" میں صرف اتنا فرق ہے کہ "گیلی آس" قد میں اس سے زیادہ ہوتی ہے اور باقی ترکیب اور وضع سب وہی ہے اس وقت کی فارسی تاریخوں میں بنگالہ کی ان دریائی لڑائیوں کے ذکر میں تین قسم کی کشتیاں لکھی ہیں (۱) غراب یعنی ڈونگہ (۲) ڈونگہ کلاں (۳) جلیہ فرنگی۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ ڈونگہ کلاں تو گیلی سے مراد ہے اور جلیہ فرنگی "گیلی آس" سے اور ان پر توپوں کے چڑھانے کی بھی گنجائش ہوتی تھی۔ (س م ح)

(۱۵۴) اس مقام کو پرتگیزوں نے ایرانیوں سے چھینا ہوا تھا۔ مگر ۱۶۲۲ عیسوی میں

ایرانیوں نے انگریزوں کی مدد سے پھر واپس لے لیا۔ (تاریخ ہند منشی ذکاءاللہ)

(۱۵۵) ہندوستان کی دولتمندی کی شہرت نے مدتوں سے یورپ کی اکثر قوموں کو اس ملک کے ساتھ تجارت کا سلسلہ جاری کرنے کے لئے بے چین کر رکھا تھا۔ مگر خشکی کے راستہ کی مشکلات اور سمندر کی راہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے سب لاچار تھے لیکن پرتیگیزوں کے بادشاہ امان ویل کے عہد میں اس کا اولوالعزم امیر البحر واسکوڈی گاما جب اپنے بادبانی جہازوں کے ذریعہ سے ایک پُر صعوبت اور خطرناک اور طولانی سفر طے کر کے ماہ جولائی ۱۴۹۸ عیسوی میں ساحل ملابار پر آپہنچا (جس کا مفصل حال اس حاشیہ میں درج ہے جو اس جلد کے خاتمہ میں لگایا گیا ہے) تو اس وقت سے سو برس کے عرصہ تک تو مشرقی سمندروں اور جزیروں اور سواحل ہندوستان میں انہیں کا غلبہ اور دَور دَورہ رہا۔ مگر جب ۱۶۰۰ء عیسوی میں ڈچ لوگ سپین کی حکومت سے آزاد ہو گئے تو انہوں نے بھی ہندوستان کی تجارت کے لئے کمپنیاں بنائیں اور ایسے بڑھے کہ بحر الہند میں خط استوا کے قریب جزیرہ جاوا وغیرہ پر جہاں اب تک شہر بٹیویا ان کی حکومت کا صدر مقام ہے قابض ہو گئے اور پھر جہاں کہیں قابو پایا پرتیگیزوں کو بھی پسپا کرنا شروع کیا یہاں تک کہ مشہور اور زرخیز جزیرہ لنکا بھی جواب گورنمنٹ انگریزی کی حکومت میں ہے ڈچوں نے پرتیگیزوں سے چھین لیا اور اس قدر ترقی پائی کہ پرتیگیز پست ہو گئے اور خاص ہندوستان کی تجارت اور بندرگاہوں میں بھی آخر کار انہی کا غلبہ ہو گیا۔ اسی زمانہ کے قریب یعنی ۱۵۹۹ء میں انگریزوں نے بھی اپنی نامور ملکہ کوئین الزبتھ کی اجازت سے ہندوستان کی سوداگری شروع کی۔ اور ان کے بعد ۱۶۱۶ء میں ڈنمارک والوں نے جو یورپ کی ایک چھوٹی سی قوم ہے اور جن کو ڈینز کہتے ہیں اوّل مدراس کی طرف سمندر کے کنارے ترنگی بار میں (جس کا صحیح نام تلنگم باڑی معلوم ہوتا ہے) جو تنجور کے راجہ سے خرید لیا تھا اور پھر کلکتہ کے قریب سیرام پور میں اپنی کوٹھیاں کھولیں اور سب سے پیچھے ۱۶۶۴ عیسوی میں فرانس کے قابل ولائق وزیر کول برٹ نے بھی (جس کو ڈاکٹر برنیئر نے اپنا خط لکھا جو اسی کتاب میں نذر قارئین ہے) تجارتی کمپنی کھڑی کی اور فرانسیسیوں نے قصبہ چندر نگر معروف فرانس ڈانگا کے علاوہ جو کلکتہ کے پاس ہے مدراس کے قریب پانڈے چری کو اپنا صدر مقام قرار دے کر ایسے زور و شور سے قدم جمانے چاہے کہ گویا ہندوستان کے مالک ہی ہو چلے تھے۔ مگر اتفاقات وقت سے ان سب قوموں کا فروغ یکے بعد دیگرے گھٹ گیا اور خداوند تعالیٰ نے صرف انگریزوں کو جو ان سب میں دور تر جزیرہ کے رہنے والے اور تعداد میں

چار پونے چار کروڑ سے زیادہ نہ تھے اوصاف و اقبال خدداد کی وجہ سے اس ملک کا شہنشاہ اور یہاں کے چھبیس ستائیس کروڑ باشندوں کا مختار مطلق بنادیا۔ مجملہ ان پانچوں قوموں کے ہندوستان میں اب ڈچوں اور ڈنمارک والوں کی حکومت کسی جگہ نہیں ہے۔ البتہ گورنمنٹ انگریزی کی رعایت اور اس باہمی لحاظ و ملاحظہ سے جو ان سلطنتوں کے باہم یورپ میں ہے فرانسیسیوں کی حکومت پانڈیچری میں مع اس کے علاقہ متعلقہ کے اور نیز قصبہ چندر نگر میں چلی آتی ہے اور پرتگیزوں کی حکومت بھی گوآمیں اور نیز جزیرہ دیونا متعلقہ کاٹھیاواڑ میں باقی ہے مگر فی زمانناہ یہ دونوں حکومتیں ہندوستان کے عام نظم و نسق کے اعتبار سے ایسی غیر محسوس اور بے وقعت ہیں کہ یہاں کے امور پولیٹکل میں ان کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ (س م ج)

(۱۵۶) دریائے غارتگری اور رعایائے بادشاہی کو لوٹ لینے اور پکڑ لے جانے کے الزام جس تفصیل و توضیح سے مصنف نے اپنے اس تمام بیان میں چاٹ گام کے پرتگیزوں کی نسبت لکھے ہیں بہ سبب اس کے کہ اس کی یہ تحقیقات ایک یورپین قوم کے حالات سے متعلق ہے ہمارے نزدیک بھی بہ نسبت کسی فارسی مؤرخ کی تحریروں کے یہی بیان زیادہ تر اعتماد اور سند کے لائق ہے۔ مگر صاحب عالمگیر نامہ نے جس طرح پر اس مہم کے واقعات کو لکھا ہے وہ یوں ہے کہ اس نے چاٹگام کے پرتگیزوں کی نسبت کوئی الزام نہیں لگایا اور بیان واقعات میں جو عموماً برنیر کے بیان کے قریب قریب ہے ان کل حرکتوں کا ملزم خود اراکانیوں کو بتایا ہے اور دریائے لڑائی اور فن کشتی رانی میں جو فوقیت اس نے پرتگیزوں سے منسوب کی ہے صاحب عالمگیر نامہ نے اس کو بھی اراکانیوں ہی سے منسوب کیا ہے۔ بلکہ بلالحاظ خوشامد و چاپلوسی اپنے بادشاہ یا حکام سلطنت اس امر کو صاف صاف لکھ دیا ہے کہ بہ نسبت بادشاہی نواڑہ کے اپنے فن میں یہ لوگ مشاق بھی زیادہ تھے اور ان کی جنگی کشتیاں سامان توپ خانہ اور مضبوطی اور استحکام میں بھی بادشاہی کشتیوں سے بہت بڑھ کر اور زیادہ عمدہ تھیں اور وجوہ فوج کشی کے متعلق شجاع کے واقعہ کا تو کوئی اشارہ نہیں صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ یہ لوگ اپنی کشتیوں میں چڑھ کر چونکہ چاٹ گام کے رستہ سے صوبہ بنگالہ میں داخل ہو کر مذکورہ بالا بدعتوں کے مرتکب ہوتے تھے اس لئے شائستہ خاں نے علاوہ ماموری و گشت نواڑہ بادشاہی اور زیادہ مستحکم کرنے اپنی سرحد کے مقاموں نواکھالی اور سنگرام گڑھ اور بھلوہ وغیرہ کے خود چاٹ گام کا چھین لینا مناسب جانا اور اس ارادہ کی تکمیل کے لئے اول تو جزیرہ سوندیپ کو جو چاٹ گام کے قریب نواکھالی کے محاذی ہے دلاور نامی وہاں کے "زمیندار" یعنی راجہ سے جو شائستہ

خاں کے فرستادہ سرداروں کے ساتھ ایک دو بہت خاص لڑائیاں لڑا تھا چھین لیا اور اس کو
اور شریف نامی اس کے بیٹے کو جو لڑائی میں زخمی ہو گیا مع اہل و عیال کے قید کر لیا کیونکہ یہ
شخص ظاہر میں مطیع سلطنت اور باطن میں اراکانیوں کا مددگار تھا اور باوجودیکہ بذاتِ خود
حاضر ہو آنے اور امداد دینے کے وعدے کر چکا تھا۔ مگر اس مہم میں شریک خدمت نہ ہوا تھا
بعد اس کے لکھا ہے کہ ان یورپی لوگوں کی استمالت جو چاٹ گام میں رہتے اور راجہ اراکان
سے موافقت رکھتے تھے اس مہم کے سرانجام کے لئے امر ضروری تھی۔ اس لئے امیر
الامراء نے ان یورپی لوگوں کو جو اس کے ماتحت بنگالہ کی اور بندرگاہوں میں رہتے تھے بہت
سے وعدہ آمیز خطوط لکھ کر اس کی معرفت چاٹ گام کے یورپی لوگوں کے پاس روانہ کئے اتفاقاً
ان میں سے بعض خطوط "کرام کبری" نامی ایک اراکانی سردار نے جس کو راجہ نے اپنے
معمول کے موافق دریائے قزاقی کے لئے سوندیپ کی طرف بھیجا ہوا تھا پکڑ لئے اور راجہ
کے پاس بھیج دیئے۔ اس لئے چاٹ گام کے یورپی لوگوں سے راجہ بدظن ہو گیا۔ اور
کرام کبری کو لکھا کہ تم ان سب کو مع ان کے متعلقین کے اراکان کو بھیج دو۔ نتیجہ اس حکم کا
یہ ہوا کہ اراکانیوں سے یورپی لوگ لڑ پڑے اور ان کی کچھ کشتیوں کو جلا پھونک کر مع اپنے
متعلقوں اور متوسلوں کے پچاس جیلوں میں جو سامان جنگ اور توپ بندوق سے بخوبی تیار تھے
چاٹ گام سے بھلوہ کے تھانہ دار فرہاد خاں کے پاس نوا کھالی میں چلے آئے اور اس نے ان کے
بعض سرگروہوں کو امیر الامراء کے پاس بھیج کر باقی کو اپنے پاس ٹھہرالیا۔ امیر الامراء نے ان
کی بہت خاطر کی اور ان کے ساتھ کئی طرح کی رعایتیں کیں غرضیکہ چاٹ گام کی فتح کے لئے
جب یہ ابتدائی بندوبست پورے ہو چکے تو امیر الامراء نے اپنے بیٹے بزرگ امید خاں کو مع چند
مسلمان اور ہندو امرا اور منصبداروں کے خشکی کے راستہ سے اور فرہاد خاں مذکور اور ابن حسین
داروغہ نواڑہ (جو غالباً کوئی عرب تھا) اور میر مرتضیٰ داروغہ توپخانہ کو مع کپتان مور "سرگروہ
فرنگین چاٹ گام" اور بعض ان کے اور سرداروں کے انعام واکرام وغیرہ سے خوب طرح
راضی اور خوش کر کے مع ان کے کل نواڑہ کے بادشاہی نواڑہ کے ساتھ دریا کے راستہ سے
روانہ کیا۔ چونکہ بزرگ امید خاں کو منزل مقصود تک پہنچنے میں جنگلوں کو کٹوا کر اور ندیوں اور
دریاؤں کو عبور کرتے بڑی مشکلوں سے کوچ کرنا پڑتا تھا اس لئے بادشاہی نواڑہ پر جو خشکی کی
فوج سے کسی قدر آگے بڑھ گیا تھا اراکانیوں کے نواڑہ نے حملہ کیا اور جانبین سے توپ بندوق
اور تیروں سے ایک دریائی لڑائی ہو کر آخر کار اراکانی مغلوب ہو گئے اور دس غراب اور تین

جلیئے چھنوا کر بھاگ گئے۔ چونکہ ابھی پیچھے سے بڑی بڑی بادشاہی کشتیاں نہیں پہنچ سکتی تھیں اس لئے ابن حسین نے زیادہ تعاقب نہ کیا۔ اور اپنے نواڑہ کو ان کے نواڑہ سے کسی قدر فاصلہ پر روک لیا۔ جب بزرگ امید خاں اس کامیابی کے حال سے مطلع ہوا تو اس نے میر مرتضیٰ اور فرہاد خاں کو تاکید سے حکم بھیجا کہ جنگل وغیرہ کٹوا کر اور راستہ ہوا کر کوچ کرنے کا خیال تو چھوڑ دیں اور جس طرح بن پڑے ابن حسین کی مدد کو جا پہنچیں۔ چنانچہ جب یہ لوگ بھی ابن حسین کے نواڑہ کے پاس دریا کے کنارے پہنچ گئے تو ابن حسین نے دریائے کرن پھولی میں جہاں اراکانیوں کا نواڑہ ٹھہرا ہوا تھا پہنچ کر حملہ کر دیا اور جانبین سے چھ گھنٹہ تک سخت دریائے لڑائی ہوئی جس میں بہت سے اراکانی مارے گئے۔ بہت سے ڈوب گئے۔ بہت سے پکڑے گئے اور ابن حسین نے فتح یاب ہو کر اپنے بیڑے کو قلعہ چاٹ گام کے نیچے جا کھڑا کیا اور اس لڑائی میں کپتان مور مذکورہ صدر نے بھی نہایت عمدہ خدمتیں کیں اور جو یورپی لوگ چاٹ گام میں اب تک کسی قدر موجود تھے اور جو ارکان سے ان کی مدد کو آئے تھے سب ابن حسین کے پاس حاضر ہو گئے۔ اور اس سے دوسرے دن خشکی کے راستہ سے فوج لے کر بزرگ امید خاں بھی آن پہنچا اور قلعہ چاٹ گام پر دریا اور خشکی دونوں طرف سے حملہ شروع ہوا۔ اہل قلعہ نے اگرچہ کچھ عرصہ تک بہت سے ہاتھ پاؤں مارے مگر آخر امان چاہی اور عالمگیر کے آٹھویں سال جلوس میں آخر رجب ۱۰۷۵ ہجری کو چاٹ گام کا مشہور و مستحکم قلعہ اور بندرگاہ جس پر بقول صاحب عالمگیر نامہ اس سے پہلے کسی مسلمان بادشاہ کا تسلط نہ ہوا تھا۔ مع ولایت چاٹ گام اور توپ خانہ اور نواڑہ کے حوالہ کر کے چاٹ گام کا حاکم جو راجہ اراکان کے بچا کا بیٹا تھا مع اپنے بیٹے اور چند رشتہ داروں اور کئی سو اور ہالی موالی کے قید ہو گیا۔ اور ایک سو بتیس جنگی کشتیاں اور ایک ہزار چھبیس برنجی اور آہنی توپیں اور بہت سی بندوقیں اور زنبورک اور سلہ و بارود بے شمار مع اور مصالحہ توپ خانہ اور چند ہاتھیوں کے قبضہ میں آیا اور بنگالہ کی رعایا میں سے جو ایک خلق کثیر مدتوں سے ان کی قید میں تھی انہوں نے رہائی پائی۔ اگرچہ اس کے بعد بزرگ امید خاں کے حکم سے میر مرتضیٰ نے قلعہ بندر رامبو کو بھی جو چاٹ گام سے چار منزل آگے مابین چاٹ گام اور اراکان کے تھا اور بیچ میں دشوار گزار جنگل اور ندیاں نالے اور پہاڑ واقع تھے' راجہ اراکان کے بھائی سے جنگ و جدال کے بعد چھین لیا مگر چونکہ ایام برسات میں چاٹ گام اور رامبو کے درمیان پانی ہی پانی ہو جاتا ہے اور گھنے جنگلوں اور ندیوں نالوں اور پہاڑوں کے علاوہ وہ ایسے دریا بھی ہیں کہ جن سے بدون کشتی کے عبور نہیں ہو سکتا' اس لئے قرب

برسات کے اندیشے اور قلتِ رسد کے خیال سے فتح کے بعد اس مقام کو چھوڑ دیا گیا اور عالمگیر نامہ میں جو تفصیلات ہیں ان کا حساب لگانے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم میں دس بارہ ہزار سے کم فوج مامور نہ تھی۔

(۱۵۷) ایک ملین دس لاکھ روپیہ کا ہوتا ہے۔ (س م ح)

(۱۵۸) کے پوشین عورتوں کی طرح برقعہ پہننے والے عیسائی درویشوں کے ایک فرقہ کا نام ہے۔ (س م ح)

(۱۵۹) اصل میں رام راس لکھا ہے۔ (س م ح)

(۱۶۰) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ بج نگر کی خرابی ہے جو راجہ رام راج کا دارالحکومت تھا۔ (س م ح)

(۱۶۱) گول کنڈا اور بیجاپور کے بادشاہوں کا حسب و نسب جس طرح برنیئر نے بیان کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ بادشاہ راجہ رام راج کے غلام نہ تھے بلکہ بہمنیہ خاندان کے بادشاہوں کے غلام تھے۔ چونکہ بہمنیہ خاندان کا ذکر لکھے بدون مضمون مکمل نہیں ہو سکتا اس لئے پہلے ہم کچھ اسی کا حال لکھیں گے اور بعد ازاں ان کا۔

پس واضح ہو کہ سلطنتِ بہمنیہ کا بانی حسن نامی ابتدا میں ایک گمنام اور ایسا مفلس شخص تھا جو فخر الدین جونا المشہور سلطان محمد شاہ تغلق بادشاہ دہلی کے ایک نجومی برہمن کے پاس کہیں سے آ کر نوکر ہو گیا تھا اور دہلی کے پاس جو کچھ اس کی زمین تھی اس میں کاشتکاری کیا کرتا تھا۔ اس جوتشی کا نام تاریخ فرشتہ میں "کانگو بھمن" لکھا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے نووارد مسلمان صحیح لفظ "کان کبج برہمن" کی جگہ اس کو "کانگو بھمن" کہتے ہوں گے۔

اتفاقاً حسن مذکور کو اپنے مالک کی اس زمین میں ہل چلاتے ہوئے کچھ دفینہ مل گیا جو اس نے اپنے آقا کی خدمت میں بے کم و کاست حاضر کر دیا۔ اس ایمانداری کے باعث سے وہ جوتشی اس کو اس قدر چاہنے لگا کہ تعریف و توصیف کر کے محمد شاہ کی سرکار میں نوکر کروا دیا۔ اب حسن نے یہ ایک اور حق شناسی کی کہ بادشاہ کا ملازم ہو کر جو کسی قدر عروج پایا تو مہر میں اپنا نام ہی حسن کانگو بھمن کندہ کرا لیا۔ جب محمد شاہ تغلق نے دیوگڑھ واقع دکن کا نام دولت آباد رکھ کر اس کو ہندوستان کا دارالسلطنت بنانا چاہا تو یہ شخص بھی مثل اور ماتحت سرداروں نے قتلغ خاں اور ملک لاچین اس کے نامیوں کے پاس دیوگڑھ میں تھا اور جب اس

بادشاہ کی خبطیانہ اور ظالمانہ حرکتوں سے سلطنت میں خلل پیدا ہوئے اور دکن میں بغاوت ہو کر ملک لاچین مارا گیا۔ اور تغلقوں کی حکومت جاتی رہی تو اتفاقات وقت سے ۷۴۸ھ میں یہ شخص دکن کا بادشاہ بن بیٹھا اور اپنے پہلے نام اور لقب پر علاء الدین کا لفظ بڑھا کر "علاء الدین حسن کانکو بھمن" کہلانے لگا۔ حسن آباد گلبرگہ اور احمد آباد بیدر (بدر) اس خاندان کے دارالحکومت تھے اور اس گھرانے کے سترہ بادشاہ ایک سو ستتر برس تک ممالک دکن کے فرمانروا رہے۔ گول کنڈا اور بیجاپور کے سوا ملک برار و خاندیس وغیرہ بھی اسی سلطنت میں داخل تھے۔

نظام شاہ بہمنی بارہویں بادشاہ سے لے کر اس خاندان کے اخیر شخص ولی اللہ شاہ بہمنی تک بادشاہی کا تو ایک نام ہی نام تھا۔ کیونکہ امرائے سلطنت اپنے اپنے متعلقہ صوبوں میں خود مختارانہ حکومتیں کرتے تھے۔ مگر آخر کار ۹۳۵ ہجری میں انہوں نے اس نام کو بھی مٹاڈالا اور بیجاپور، گول کنڈا، برار، خاندیس، وغیرہ میں خود اپنے اپنے نام سے جدا جدا بادشاہتیں قائم کر لیں۔ چونکہ اکبر کے وقت سے شاہ جہاں کے زمانہ تک خاندیس و برار وغیرہ کی حکومتیں سب دہلی کی شہنشاہی میں جذب ہو چکی تھیں اس لئے ہم ان کا ذکر قلم انداز کرتے ہیں اور خاندان گولکنڈا اور بیجاپور کا حال لکھتے ہیں۔

گولکنڈا کے خاندان کا بانی سلطان قلی نامی ہمدان کا رہنے والا ایک ترک اور محمود شاہ بہمنی کا غلام تھا اور رفتہ رفتہ ایسا بڑھا کہ اس سلطنت کا وزیر ہو گیا۔ قطب الملک کا خطاب پایا۔ گولکنڈا کا "طرفدار" یعنی صوبہ دار رہا۔ اور آخر کار (جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے) ۹۳۵ ہجری میں خود اپنے ہی نام سے سکہ و خطبہ جاری کر کے قطب شاہ بن بیٹھا۔ اس کی نسل کے چار بادشاہ ایک سو چھبیس برس تک حکومت کرتے رہے۔ لیکن جب اس خاندان کا اخیر فرمانروا عبداللہ قطب شاہ ساٹھ برس بادشاہت کر کے مر گیا تو اس کا داماد سید ابوالحسن معروف تاناشاہ اس کا جانشین ہوا۔ ڈاکٹر برنیئر اپنے بیان مندرجہ متن میں غفلت اور سستی کا اشارہ اسی کی طرف کرتا ہے اور فی الواقعہ یہ بادشاہ اپنے وقت کا راجہ اندر اور گویا عیش و عشرت کا پتلا تھا۔ جس کے عیش و نشاط اور لطافت و نفاست مزاج کے فسانے اب تک زبان زد خلایق اور ضرب المثل چلے آتے ہیں چونکہ یہ اس قدر سست اور کاہل مزاج تھا کہ اپنی پندرہ برس کی حکومت کے زمانہ میں شہر حیدر آباد اور قلعہ گولکنڈا یا اپنے باغ میں جانے آنے کے سوا اس نے اپنے ملک کو کبھی سیر و شکار کی خاطر بھی جا کر نہ دیکھا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا

کہ اپنے سابقہ ہم جنسوں کی طرح آخر یہ بادشاہی بھی دہلی کے اعلیٰ سلطنت کا ایک جزو ہو گئی۔ یعنی جفاکش اور اولوالعزم شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنی عمر کے بہترویں سال مطابق ۱۰۹۶ ہجری میں شہر حیدر آباد کو اور بعد ازاں ۱۰۹۸ ہجری میں قلعہ گولکنڈا کو مدت کے محاصرے اور سخت حملوں کے بعد تاناشاہ سے چھین لیا۔ اور اس کی پچاس ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر کر کے قلعہ دولت آباد میں نظر بند کر دیا۔

اسی طرح بیجاپور کی سلطنت کا بانی گرجستان کا رہنے والا محمد یوسف نامی ایک دوسرا غلام تھا۔ جس کو بعض خوشامدی مؤرخوں نے سلاطینِ آلِ عثمان یعنی روم کے ترک بادشاہوں کی نسل میں جا ملایا ہے۔ اس کو شہاب الدین محمد بھمنی نے خریدا تھا جو خوش قسمتی سے رفتہ رفتہ بیجاپور کا طرفدار اور آخر کار خود سر ہو کر عادل خاں سے عادل شاہ بن گیا۔ اسی کے پوتے ابراہیم عادل شاہ کی کتاب نورس پر ملا نور الدین ظہوری ترشیزی نے اپنی وہ فصیح و بلیغ نثریں جو خوبی و لطافت انشا کی وجہ سے ایران و ہندوستان میں اب تک متداول و مشہور اور نثر ظہوری کے نام سے معروف ہیں، لکھی تھیں۔ یہ سلطنت بھی ۱۰۹۷ ہجری میں اورنگ زیب نے چھین لی اور سکندر عادل شاہ کو جو ایک لڑکا تھا، اپنے امیروں کی ذیل میں داخل کر کے اور خان کا خطاب دے کر لاکھ روپیہ سالانہ گزارہ مقرر کر دیا۔ اگرچہ یہ دونوں گھرانے اخیر تک بادشاہ کہلاتے اور اپنے آپ کو خود مختار سمجھتے تھے۔ مگر سلاطینِ مغلیہ نہ توان کو خود مختار ہی مانتے تھے اور نہ ان کے لقب شاہی کو ہی تسلیم کرتے تھے۔ اور ہمیشہ پیشکشوں اور نذرانوں کے متقاضی اور طلبگار اور اس وقت کے دستور کے موافق ہر ایک جائز و ناجائز حیلہ سے ان کے پامال کرنے کے لئے آمادہ اور تیار رہتے تھے اور خط و کتابت میں ان کے وہی اصلی خطاب قطب الملک اور عادل خاں اور الفاظ القاب اپنے نوکروں اور صوبہ داروں کی طرح لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ نمونے ان دونوں کے القابوں کے یہ ہیں۔

عنوان فرمان از طرف شاہ جہان بنام قطب شاہ ۱۰۴۵ھ

"ایالت و امارت پناہ ارادت و عقیدت دستگاہ عمدہ اماجد کرام سلالہ اکارم عظام نقاوۂ خاندان عزو علا عضادۂ دودمان مجد و اعتلا زبدۂ مخلصان صلاح اندیش خلاصہ مختصان سعادت کیش مورد الطاف شہنشاہی مصدر آیات خیر خواہی جوہر مراۃ صفا و صفوت فروغ ناصیہ دولت و رفعت سزاوار عاطفت بیکران المخصوص بعنایت الملک المنان قطب الملک مشمول عنایات بادشاہانہ بودہ بداند"

ایضاً بنام عادل شاہ بہ سنہ مذکور

"ایالت و شوکت پناہ عدالت و نصفت دستگاہ زبدۂ ارباب ودل عمدۂ اصحابِ ملل خلاصہ مریدان عادل خاں بو فوز عنایات بادشاہانہ مفتخر و مستظہر بودہ بداند"۔

بہمنیہ خاندان کے غلام اور متوسل بادشاہ (جیسا کہ برنیر نے لکھا ہے) سب کے سب شیعہ نہ تھے۔ مگر ہاں گولکنڈا اور بیجاپور والے ضرور شیعہ تھے۔ چنانچہ سلاطینِ مغلیہ ان سے کاوش کرنے کے لئے کبھی کبھی کسی مذہبی بحث کو بھی حیلہ بنا لیتے تھے مگر آخری وجہ گولکنڈا اور بیجاپور کی بربادی کے لئے یہ تھی کہ یہ لوگ سیواجی کے بیٹے سنبھاجی کو مدد دیتے تھے اور اورنگ زیب نے بذات خود دکن میں پہنچ کر گولکنڈا' بیجاپور' اور سنبھاجی تینوں پر ایک ہی زمانہ میں فوج کشی شروع کی تھی۔

اور راجہ رام راج کا ذکر جس طرح پر ڈاکٹر برنیر نے لکھا ہے وہ بھی درست نہیں ہے بلکہ (بقول سر مونٹ الفنسٹن صاحب) صحیح حال اس کا یوں ہے کہ وہ خاص دکن میں (یعنی مدراس کی طرف) شہر بیجے نگر میں ایک بہت بڑا زبردست راجہ تھا۔ بہمنیہ خاندان کے سب غلام بادشاہوں نے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے متفق ہو کر اس کا ملک چھیننے کا ارادہ کیا اور پچیسویں جنوری ۱۵۶۵ء مطابق بستم جمادی الثانی ۹۷۲ ہجری کو دریائے کرشنا کے کنارے تالی کوٹ کے قریب جانبین سے بڑے اہتمام اور جوش و خروش کے ساتھ ایک نہایت خونریز لڑائی ہوئی جس میں یہ ضعیف العمر اور بہادر راجہ مغلوب ہو کر پکڑا اور مارا گیا۔ مگر اصل مطلب کے لحاظ سے نتیجہ اس کا فتح مندوں کے حق میں چنداں مفید نہ ہوا۔ کیونکہ ملک مفتوحہ کی تقسیم پر باہم جھگڑے پیدا ہو گئے اور اس وجہ سے اس راج کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر وہاں کے "پالی کار" یعنی زمیندار ہی اپنے اپنے علاقوں میں راجا بن گئے اور رام راج کے بھائی نے بیجے نگر سے اپنی دار الریاست کو مشرق کی جانب منتقل کیا اور آخر کو چندر گڑھی کو اپنی ریاست گاہ بنایا۔ جو مدراس سے شمال و مغرب کی طرف سترہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

اور زمین کا وہ قطعہ جو انگریزوں نے اپنے کارخانہ کے لئے پہلے پہل مدراس میں لے کر آخر کار قلعہ سینٹ جارج تعمیر کیا اسی شخص کی اولاد کے ایک راجہ سے ۱۶۴۰ء میں لیا تھا۔

(ماخوذ از تاریخ فرشتہ' عالمگیر نامہ' ماثر عالمگیری' سیر المتاخرین' تاریخ الفنسٹن۔ تاریخ منشی ذکاءاللہ) (س م ح)

(۱۶۲) سیواجی کا مختصر حال جو ڈاکٹر برنیئر نے لکھا ہے اس کو پڑھ کر خواہ مخواہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس عجیب شخص کا حسب ونسب کیا تھا اور اس نے اس قدر اقتدار کس طرح پایا اور اس کے متعلق جو واقعات برنیئر نے لکھے ہیں ان کی مفصل اور صحیح روداد کیا تھی۔

پس واضح ہو کہ انسائکلو پیڈیا برطانیکا میں اس کو غیر صحیح النسب طور پر اودے پور کے رانا کی نسل سے (یعنی چھتری) لکھا ہے۔ مگر سر مونٹ الفنسٹن صاحب سابق گورنر بمبئی جن کی تحقیق ادھر کی قوموں وغیرہ کے بارہ میں زیادہ بھروسہ کے قابل ہے اپنی مشہور تاریخ ہندوستان میں سیواجی کے ان تمام ہم قوم لوگوں کو جو مہاراشٹر (مہاراشٹر ....؟.... ہندوؤں کی حکومت کے قدیم زمانہ میں مہاراشٹر کا اطلاق ملک کے اس وسیع قطعہ پر ہوتا تھا جو دریائے نربدا کے جنوب کی طرف فی زمانناچیف کمشنری ناگپور اور ریاست حیدر آباد دکن اور پریذیڈنسی بمبئی کی مختلف حکومتوں میں منقسم ہے۔ چنانچہ خاندیس و برار و کوکن وغیرہ کے علاقے جو علی الترتیب مذکورہ بالا حکومتوں میں واقع ہیں مہاراشٹر کے عام لفظ میں داخل تھے) دیس کی سکونت کے باعث مرہٹے کہلائے عموماً شودر بتاتے ہیں اور سیواجی کے حسب ونسب کی حقیقت کو اس طوالانی تمہید سے بیاں کرتے ہیں کہ گولکنڈا' بیجاپور' اور احمد نگر کے مسلمان بادشاہوں کے وقت میں مرہٹوں کو قلعوں وغیرہ کے پیدل سپاہیوں میں نوکریاں ملا کرتی تھیں' مگر جب معلوم ہوا کہ جنگی سواروں میں بھی اچھی خدمت دے سکتے ہیں تو رسالوں میں بھرتی ہونے لگے اور ان میں سے ایسے لوگ جو ہمارے ملک کے دیہات میں چوہدری اور نمبردار وغیرہ کہلاتے ہیں اور اس ملک میں ان کا لقب پٹیل اور دیس مکھ وغیرہ ہوتے تھے موروثی عزت کے باعث سے رسالداریوں اور جمعداریوں کے عہدوں تک مامور ہو جاتے تھے۔ منجملہ ان کے اگرچہ بعضوں نے قدر و منزلت بڑھانے کو راجپوت ہونے کا دعویٰ کیا ہے مگر الفنسٹن صاحب کی تحقیق میں قومیت کی حیثیت سے سارے ہی شودر تھے اور سولہویں صدی عیسوی سے پہلے نہ تو مرہٹے بطور ایک قوم ہی کے مشہور تھے اور نہ ان میں کوئی ایسا سردار تھا جو پولیٹکل لحاظ سے نامور اور ذی اقتدار گنا جاتا ہو۔ مگر اس صدی کے آغاز میں ان کے اقبال کا زمانہ اس طرح شروع ہوا۔ کہ ملک عنبر نے (جو احمد نگر والوں کے ہاں ایک مشہور اور نہایت زبردست امیر تھا) مرہٹوں کو اپنے سواروں میں زیادہ بھرتی کیا۔ چنانچہ اس کی فوج میں لکھی نامی ایک سردار نے (جس کو بطور اعزازی لقب کے جادوراد کہتے تھے) ایسی ترقی پائی کہ دس ہزار سواروں کی سرداری کے منصب پر سرفراز ہو گیا اور یہاں

تک اقتدار حاصل کیا کہ شاہ جہاں اور احمد نگر والوں کی لڑائی کے زمانہ میں جب اس نے شاہ جہاں سے سازش اور یوستگی کر لی تو ملک عنبر کی تقدیر الٹ گئی اور لڑائی ہار گیا۔ الفنسٹن صاحب خیال کرتے ہیں کہ مرہٹوں میں اگر کسی کو راجپوت ہونے کا دعویٰ پہنچتا ہو تو البتہ یہ دعویٰ اسی کے گھرانے کو شایاں و سزاوار ہو سکتا تھا کیونکہ دیوگڑھ (دولت آباد) کا وہ راجہ جو دکھنی راجاؤں میں سب سے بڑا تھا اور جس سے مسلمانوں نے ملک دکن کو فتح کیا تھا جادو جسی ہی کہلاتا تھا۔ اس لئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ شخص غالباً دیوگڑھ کے کسی قریب ضلع کا دیس مکھ اور جادو جسی راجپوتوں کی نسل سے ہونے کے باعث جادو راؤ کہلاتا ہوگا۔ المختصر مالوجی بھونسلا۔ سیواجی کا دادا اس کے متوسلوں میں ایک ایسا شخص تھا جو اگرچہ کسی قدر خاندانی اور ذی عزت گنا جاتا تھا مگر حیثیت اس کی اس سے زیادہ نہ تھی کہ چند خواہ اسپہ سواروں سمیت اس کے ماتحتوں میں تھا۔

قضائے کردگار ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ جادو راؤ کے یہاں کسی تہوار وغیرہ کی تقریب میں بہت سے لوگ جمع ہوئے۔ جس میں مالوجی بھی اپنے پانچ برس کے بیٹے ساجو کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس محفل میں جہاں حسب معمول ہنسی خوشی کی باتیں ہو رہی تھیں اتفاقاً جادو راؤ نے ساہو جی اور اپنی سہ سالہ لڑکی دونوں کو زانوؤں پر بٹھا کر ہنسی اور پیار کے طور پر کہیں یہ بات کہہ دی کہ یہ دونوں بالک تو بیاہے جانے کے قابل ہیں! جادو راؤ کا یہ کہنا تھا کہ مالوجی فوراً بول اٹھا کہ ساری سبھا گواہ رہے میرے بیٹے کا رشتہ جادو راؤ جی کی لڑکی سے ہو گیا اگرچہ جادو راؤ اپنے خاندان و منصب کے غرور کے باعث مالوجی کے اس بڑے بول سے ایسا ناراض ہوا کہ دونوں کے باہم بدمزگی ہو گئی مگر مالوجی برابر اس سگائی کا دعویٰ کئے جاتا تھا اور چونکہ تھوڑے ہی عرصہ میں خوش قسمتی سے یہ بھی ایسا بڑھا کہ اس ریاست میں پانچ ہزار سواروں کی رسالداری کے منصب پر سرفراز اور صاحب جمعیت ہو گیا اور مضافات ملک کوکن میں بمقام پونا (جو اب پریزیڈنسی بمبئی میں ایک مشہور شہر ہے) اس کو ایک بڑی سی جاگیر مل گئی جس میں چاکنہ اور سوپا کے دو قلعے بھی شامل تھے۔ تو آخر کار لکہ جی جادو راؤ کو بھی یہ خواہ مخواہ کی سگائی کا دعویٰ ماننا ہی پڑا اور ساہو جی کی شادی اس کی بیٹی سے ہو گئی جس سے دو بیٹے پیدا ہوئے ایک ونکاجی دوسرا سیواجی (جو ماہ مئی ۱۶۲۷ عیسوی میں پیدا ہوا)۔

جب شاہ جہاں نے والی بیجاپور کے اتفاق سے احمد نگر کی حکومت کو پامال کر کے

ملک کو آپس میں بانٹ لیا اور منجملہ اس کے کوکن کا علاقہ بیجاپور کے حصہ میں آیا تو ساہو جی نے والی بیجاپور کی نوکری اختیار کر لی اور اس کی جاگیر واقع پونا بھی جو بیجاپور کے حصہ میں آ گئی تھی بدستور اس کے قبضہ میں رہی اور وہ بیجاپور کی طرف سے کرناٹک میں ملک گیری کرتا رہا جس کے باعث سے میسور کے نزدیک بھی اس کو ایک بہت بڑی جاگیر حاصل ہوئی جس میں بنگلور وغیرہ بڑے بڑے شہر داخل تھے۔

الغرض ونکاجی تو اپنے باپ کے ساتھ کرناٹک میں رہتا تھا۔ اور خورد سال سیواجی پونا میں۔ اس زمانہ میں مرہٹے سردار خود تو ناخواندہ ہوتے تھے اور ان کے کاروبار کا انتظام ان اہل قلم برہموں کے اختیار میں ہوتا تھا۔ جو دکن کے مسلمان بادشاہوں کے عہد میں بڑے بڑے کارآمد عہدوں پر مامور ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ ساہو جی کی اس جاگیر کا اہتمام اور سیواجی کی سرپرستی داداجی کنڈو نامی ایک برہمن کو سپرد تھی اس وقت کے نوجوان مرہٹوں کو شہسواری' شکار بازی' اور نیزہ بازی وغیرہ سپاہیانہ ریاضتوں کے سیکھنے کا شوق ہوتا تھا اور چونکہ پونا ایسی جگہ ہے کہ وہاں میدان اور پہاڑی ملک آپس میں ملتے ہیں تو ان سپاہیانہ شوق اور سیر و شکار کے سپاٹوں کے باعث سے سیواجی کے بڑے رفیق ابتدا ہی سے ایسے لوگ ہوئے جو یا تو اس کے باپ کے سواروں میں بھرتی تھے یا گھاٹوں (یعنی کوہستان سی اوری کے سلسلوں کے) پاس پڑوس کے رہنے والے ڈاکو اور لٹیرے تھے اور کہتے ہیں کہ کبھی کبھی ایسا بھی اتفاق ہوا کہ بعض ڈکیتی کی وارداتوں میں مخفی طور سے یہ ان کا شریک بھی ہوتا رہا غرض کہ ان جفاکش اور مضبوط آدمیوں کی صحبت سے اور ان دیہاتی راگوں (یعنی ساکھوں) کے سننے سے جن میں اس ملک کے بعض سورما لوگوں کی کہانیاں گائی جاتی تھیں اس کی طبیعت میں بڑے بڑے خیال پیدا ہوئے۔ اور جب یہ آفت کا پرکالہ سولہ برس کی عمر کو پہنچا تو اپنے اتالیق داداجی کے قابو سے بھی نکل گیا اور باپ کی جاگیر کے کاروبار میں خواہ مخواہ دخل دینے لگا اور جب تھوڑے عرصہ بعد وہ برہمن بھی مر گیا۔ تو قلعہ چاکنہ پر قلعدار سے مل کر قبضہ کر لیا اور قلعہ سوپا کو چھاپہ مار کر چھین لیا اور وہ جفاکش مرہٹے جو پونا کی سمت مغربی کے اجاڑ علاقہ کے رہنے والے (اور ایک پرانے قصبہ ماہول متصل شولاپور کے قرب وجوار کی سکونت کی مناسبت سے) ماہولی کہلاتے تھے اور بھیل اور کولی اور راموسی وغیرہ لٹیرے لوگوں کو جو پونا کے پاس ملک کوکن کے پہاڑوں اور جنگلوں میں بستے اور مثل اس کی سب بیجاپور کی رعایا تھے جمع کر کے آس پاس کے ملک کو کہ جہاں کے حالات سے سیر و شکار اور چوریوں ڈکیتیوں کی

شرکت اور ان لٹیروں کی رہنمائی سے بخوبی واقف ہو چکا تھا لوٹنا شروع کیا اور کہیں زور سے کہیں تابعداری سے اور کہیں فریب اور مکاری سے محمد عادل شاہ فرمانروائے بیجاپور کی حکومت کے اخیر زمانہ میں بسبب حاکموں کی غفلت اور ضعف وغیرہ کے علاقہ کوکن کے بہت سے قلعوں پر اپنا دخل کر لیا۔ اور منجملہ انہی حرکتوں کے ایک حرکت یہ بھی تھی کہ اپنے مقاصد کا مخالف سمجھ کر ایک راجہ کو جو پونا کے جنوب میں اکثر پہاڑی علاقوں پر حکومت رکھتا تھا کسی حکمت سے قتل کرا دیا تھا۔ اور علی عادل شاہ کے ایام خورد سالی میں باوجودیکہ اس کا باپ اور بڑا بھائی ان کے نوکر تھے اور اس کو ان حرکتوں سے بہت منع کرتے تھے علانیہ باغی ہو کر یہ عجیب داؤ کھیلا کہ ۱۶۹۹ء میں افضل خاں نامی ان کے ایک بہت بڑے سردار کی خدمت میں جو اس کی سزادہی کے لئے فوج لے کر آیا تھا اور جس کی شجاعت اور زور و قوت سے فی الحقیقت یہ خائف تھا یہ درخواست پیش کی کہ اگر خان صاحب میرے حال پر ترس کھائیں تو مہربانی فرما کر میرا خوف اور اندیشہ دور کرنے کے لئے ایک جگہ لشکر سے اکیلے ہو کر تشریف لے آئیں اور اسی طرح میں بھی اکیلا ہی حاضر ہو جاتا ہوں اور جب وہ میری معروضات سن کر تسلی و تشفی فرما دیں گے تو فرمانبرداری اور اطاعت سے مجھے کچھ عذر نہیں۔ چنانچہ جب اس قرارداد کے موافق خانصاحب باریک ململ کا جامہ پہنے ہوئے اور صرف شان و زیبائش کے لئے ایک سیف ہاتھ میں اٹھائے اور محض ایک خدمتگار ساتھ لئے ہوئے خراماں خراماں آگے کو بڑھے اور سیواجی بھی قلعہ پرتاب گڑھ سے سہمی صورت بنائے لرزتا کانپتا سامنے سے صرف ایک ہمراہی سمیت نظر آیا۔ اگرچہ ظاہر میں کوئی ہتھیار اس کے پاس موجود نہ تھا۔ مگر روئی کے دگلے کے نیچے زرہ پہنے اور ایک آبدار تیغہ چھپائے ہوئے اور انگلیوں پر فولادی کانٹے جس کو بجھ نوہ یعنی ناخنِ شیر کہتے تھے چڑھائے ہوئے تھا افضل خاں نے اس کو خوف زدہ دیکھ کر اظہار عنایت کے لئے بغلگیر ہونے کو جوں ہیں ہاتھ پھیلائے تو اس نے چھپ سے فولادی پنجہ کو جو آستین میں چھپا ہوا تھا بڑے زور سے اس کے پیٹ میں گاڑ دیا۔ اور ہنوز وہ اس حرکت بے جا کے تعجب سے فارغ نہ ہوا تھا کہ بغل سے تیغہ نکال کر کام تمام کیا اور خان صاحب نے جو پنجہ کھا کر سیف کا وار کیا تھا وہ اس کی زرہ کے باعث سے کارگر نہ ہوا۔ اس کامیابی کے بعد اور اس دشوار گزار پہاڑی ملک میں جس کی حد سمندر تک منتہی ہوتی ہے ایسا زبردست شخص ہو گیا کہ ۱۶۶۲ عیسوی تک اس کے پاس سات ہزار سوار اور پچاس ہزار پیدل کی جمعیت ہو گئی تھی جن کی معاش کا مدار بہ نسبت مقررہ تنخواہ کے زیادہ تر

لوٹ کھسوٹ پر تھا اور سمندر کے کنارہ تک مع چند بندرگاہوں کے اپنی حکومت کو وسعت دے کر کچھ کچھ مغلیہ سلطنت کے علاقوں واقع دکن میں بھی غارت گری اور دست درازی شروع کر دی تھی اس لئے امیر الامرا شائستہ خاں صوبہ دار نے عالمگیر کے دوسرے سال جلوس میں دولت آباد سے فوج کشی کر کے قصبہ پونا اور چاکنہ کے مضبوط قلعہ کو سیواجی سے چھین لیا۔ مگر اس کے ناہموار اور پہاڑی ملک کی دشوار گزاری اور مرہٹوں کی سخت جفاکشی کی عادت سے شائستہ خاں کو حسب دلخواہ کامیابی نہ ہوئی۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ سیواجی کے اس ابتدائی زمانہ میں اس کے گروہ کے لوگ اور بھی زیادہ جفاکش ہوں گے مگر اس کے مرجانے کے بعد بھی مرہٹوں کا یہ حال تھا کہ جب اورنگ زیب اپنے بڑھاپے کے دنوں میں گولکنڈا اور بیجاپور کو نیست ونابود کر کے مرہٹوں کے پیچھے دوڑ دھوپ کر رہا تھا تو الفنسٹن صاحب نے اس عالی ہمت بڈھے بادشاہ کی ناکامیابی کی وجوہات کے ذکر میں مرہٹوں کی عادت جفاکشی کا بیان اس طرح پر لکھا ہے کہ "ان کی سواری میں چالاک اور دور دم گھوڑے ہوتے تھے جن پر بجائے زین کے کمبل کے تہرو پر صرف ایک گدی سی کس لیتے تھے اور توڑہ دار بندوق اور ڈھال تلوار کے علاوہ عموماً ایک لمبا برچھا رکھتے تھے خوراک ولباس میں اسی پر قناعت تھی کہ جوار کی ٹکیہ اور کچی پیاز ان کی معمولی غذا تھی اور لباس میں ایک پگڑی چست جانگیہ اور ایک چھوٹی سی کمری۔ سوائے سرداروں کے خیمہ کسی کے پاس نہ ہوتا تھا اور لڑائی بھڑائی کے موقعوں میں مرہٹے سوار اپنے برچھوں اور بھالوں کو زمین میں گاڑ کر گھوڑوں کی لگامیں اپنے اپنے بازو سے باندھ کر زمین پر پڑ رہا کرتے تھے" غرض کہ اس شعر کے مصداق تھے۔

"لنگ کے زیر لنگ کے بالا
نے غم دزدے نے غم کالا"

نہ باربرداری کی ضرورت نہ کمسریٹ کی حاجت۔ اور ان کے مقابلہ میں مغلیہ فوجوں کی یہ صورت تھی کہ اگرچہ بہادری اور سپاہ گری کی تو ان میں بھی کچھ کمی نہ تھی مگر عموماً یہ خرابی پھیلی ہوئی تھی کہ امیر سے لے کر سپاہی تک سازوسامان بہت رکھتے تھے یہاں تک کہ ان کے لشکروں میں اہل خدمت اور اہل بازار وغیرہ کی یہ بھیڑ بھاڑ ہوتی تھی کہ بھیر کے لوگ سپاہیوں سے دس گنے ہو جاتے تھے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ رسد اور باربرداری دونوں کی نہایت ہی غیر ضرورتی ضرورت رہتی تھی اور اس کے باعث سے کوچ ومقام میں وہ چستی وچالاکی جو مرہٹوں جیسے جفاکش اور سبک بار دشمنوں کے مغلوب کرنے کو خصوصاً ایسے پہاڑی ملک میں

ضروری تھی۔ ان سے نہیں ہو سکتی تھی۔ بلکہ جہاں کہیں ان کا لشکر جا کر ٹھہرتا تھا رسد و باربرداری کی ضرورتوں کی وجہ سے وہاں کے باشندوں پر ایک تباہی آن پڑتی تھی۔

غرض کہ جب شائستہ خاں کو کامیابی نہ ہوئی تو مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور صوبہ دار گجرات کو بھی مع اس کی کل فوج کے مدد کے لئے بھیجا گیا۔ اگرچہ یہ بھی مدت تک مامور رہا مگر کوئی کار نمایاں اس سے بھی ظہور میں نہ آیا۔ بلکہ اورنگ زیب کے جلوس کے چھٹے سال ۱۰۷۳ ہجری میں جبکہ شائستہ خاں پونا میں اترا ہوا تھا سیواجی نے یہاں تک جسارت کی کہ ایک روز سر شام اپنے پہاڑی قلعہ سنگم نیر سے جو پونا سے بارہ میل کے فاصلہ پر تھا روانہ ہوا اور راستہ میں تھوڑے تھوڑے سپاہی اس خیال سے چھوڑتا آیا کہ اگر ضرورت پڑے تو کام آئیں اور خود صرف پچیس ماہولی مرہٹوں کو ساتھ لے کر ایک برات میں جو حسب اتفاق پونا کو جاتی تھی مل کر شہر میں داخل ہو گیا اور اس طرح پر شائستہ خاں کے چوکی پہروں کی مزاحمت سے بچ نکلا۔ چونکہ شائستہ خاں اسی مکان میں رہتا تھا جس میں سیواجی نے پرورش پائی تھی۔ اور اس وجہ سے اس کو اس مکان کی کل حالت بخوبی معلوم تھی اس لئے اس کے ایک دروازہ سے جو پشت مکان کی طرف تھا چپکے سے شائستہ خاں کی خواب گاہ میں جا گھسا اور یکایک اس طرح سے حملہ کیا کہ اس ہڑبڑاہٹ میں ایک کھڑکی کے راستہ نیچے کے مکان کی طرف کود کر بھاگتے ہوئے شائستہ خاں کی تو ایک انگلی کٹ گئی اور ابو الفتح اس کا بیٹا مقابلہ میں مارا گیا۔ چونکہ سیواجی اپنے ارادہ کے موافق شائستہ خاں کو قتل یا گرفتار نہ کر سکا تو قبل اس کے کہ باہر کے پہروں والے اس حادثہ سے خبردار ہوں پھرتی سے باہر نکل آیا اور جوں جوں آگے بڑھتا گیا تو وہ لوگ جو راستہ میں بٹھائے ہوئے تھے ساتھ ملتے گئے اور صحیح و سلامت اپنے قلعہ میں جا داخل ہوا اور اس کامیابی کی اس قدر خوشی منائی گئی کہ چراغوں اور مشعلوں کی روشنی بادشاہی فوج کو پونا میں بخوبی دکھائی دیتی تھی سیواجی کے اس کارنامہ سے اس کے اور اس کی قوم کے حق میں ایک نہایت ہی مفید اثر پیدا ہوا۔ بادشاہ نے اس حادثہ کو امیر الامراء کی غفلت پر محمول کیا اور میر جملہ کی وفات کے باعث سے بنگالہ کی صوبہ داری پر بدل دیا اور بجائے اس کے شہزادہ محمد معظم کو دکن کا صوبہ دار مقرر کر کے راجہ جے سنگھ کچھواہہ کو جو لیاقت اور دانائی میں مشہور اور ایک بڑا رکن سلطنت تھا راجہ جسونت سنگھ کی جگہ جس کی نسبت سیواجی کے ساتھ سازش رکھنے کا شبہ تھا اپنے جلوس کے ساتویں سال ۱۰۷۵ ہجری میں مع دلیر خاں و راجہ رائے سنگھ سسودیہ اور اور دس بارہ ہندو اور مسلمان بڑے مسلمان

سرداروں کے چودہ ہزار سواروں کی جمعیت سے روانہ کیا۔ خلاصہ یہ کہ راجہ جے سنگھ نے اورنگ آباد پہنچ کر اول شہزادہ سے ملازمت حاصل کی اور بعد ازاں پونا میں جاکر راجہ جسونت سنگھ سے مہم کا چارج لیا اور قلعہ "رودرمال" وغیرہ خصوصاً سیواجی کے کلاں تر قلعہ پورن دھر کو کہ جس میں اس کا بہت سا ساز و سامان اور چار ہزار لڑکے سپاہی اور تین ہزار او مرد و عورت اور بعض عزیز و اقارب اور کتنے ہی کار آزمودہ افسر موجود تھے زور شور سے دلیر خاں اور کیرت سنگھ نے گھیر لیا سیواجی جو اس وقت قلعہ راج گڑھ میں مع اہل و عیال خود موقعہ جنگ سے قریب ہی تھا حملہ آوروں کی شجاعت و لیاقت کے باعث پورن دھر کے بچاؤ سے مایوس ہو گیا اور مجبور ہو کر عجز و نیاز کا اظہار شروع کیا۔ جس کے جواب میں راجہ نے یہ کہلا بھیجا کہ اگر مجرموں کی طرح ہتھیار کھول کر حاضر ہو جائے تو اس کی اطاعت قبول کی جائے گی غرض کہ جب وہ ۱۰۷۵ہجری عالمگیر کے آٹھویں سال جلوس میں اسی طرح حاضر ہو گیا تو راجہ نے اس کی بہت خاطر کی اور اوّل قلعہ پورن دھر کو جو قریب الفتح ہو گیا تھا مع کل سامان جنگ وغیرہ اس سے لے کر آخر ان شرایط پر صلح کر لی کہ ملک کوکن کے پینتیس قلعوں میں سے جو اس وقت اس کے قبضہ میں تھے تئیس قلعے مع بندر چیول و علاقہ جات جمعی دس لاکھ ہن... (لفظ ہن کی وضاحت و تشریح اس حاشیہ کے فوراً بعد ۶۲ الف کی ذیل میں ملاحظہ کریں)... کے سرکار بادشاہی میں آگئے اور باقیماندہ بارہ قلعے مع علاقہ جمعی ایک لاکھ ہن سیواجی کے پاس چھوڑے گئے اور اس کے ہشت سالہ بیٹے سنبھاجی کے نام پنجہزاری پنجہزار سوار کا منصب عطا ہو گیا اور سیواجی نے یہ بھی قبول کر لیا کہ اس نواح میں اگر کوئی مہم پیش آئے گی تو بذات خود بادشاہی فوج میں شامل ہو کر خدمت کروں گا۔ غرض کہ جب شرطیں طے ہو چکیں اور سنبھاجی بھی راجہ کے لشکر میں پہنچ گیا تو سیواجی کو جو بغیر ہتھیار باندھے دربار میں آیا کرتا تھا راجہ جے سنگھ نے اپنے سامنے ہتھیار بندھوا دیئے اور خلعت دے کر عزت کے ساتھ رخصت کر دیا اور چونکہ راجہ کو اسی جگہ سے بیجاپور پر فوج کشی کرنے کا حکم آگیا تھا۔ اس لئے سیواجی بذاتِ خود مع پندرہ سو سواروں اور سات ہزار پیادوں کے اس مہم میں کام دیتا رہا اور اگرچہ اس سے کچھ عرصہ بعد اس نے اوّل سنبھاجی کو عالمگیر کے دربار میں بھیج دیا اور راجہ جسونت سنگھ کی معرفت جان و عزت کی حفاظت اور حسن سلوک کا وعدہ لے کر اور اپنی جگہ فوج کی سرداری پر اپنے داماد کو راجہ کے پاس چھوڑ کر دربار جشن سالانہ کے موقع پر بادشاہ کو سلام کرنے کے ــــ بطور جریدہ اکبر آباد کو چلا آیا۔ اور بادشاہ کی

طرف سے بھی یہ مدارات ہوئی کہ کنور رام سنگھ پسر راجہ جے سنگھ اور مخلص خاں نامی ایک اور امیر اس کو استقبال کر کے دربار جشن میں لائے اور بادشاہ کے حضور میں اس کے کھڑے ہونے کو بقول صاحب عالمگیر نامہ جگہ بھی ایسی معقول دی گئی کہ جو امراء خاص کے لئے تھی اور اسی دن کچھ اور اعزاز واکرام بھی ہونے والے تھے اور یہ امر مقرر ہو چکا تھا کہ چند روز حاضر دربار رکھ کر عزت وتوقیر کے ساتھ رخصت کر دیا جائے گا۔ مگر اس اکھڑ مزاج شخص کو اپنے کھڑے ہونے کی جگہ جو بعض مؤرخوں کے نزدیک تیسرے درجہ کے امیروں یعنی پنجہزاری کے منصب والوں کے لئے مقرر تھی اور اور رسوم درباری کچھ ایسی ناگوار اور اپنی عزت کے منافی معلوم ہوئیں کہ اس نے کنور رام سنگھ کو علیحدہ لے جا کر اسی وقت سخت شکایت کی اور بقول صاحب عالمگیر نامہ جو "تو قاعت بے جاو مقاصد دور از کار وخیال ہائے خام" پکائے ہوئے تھے نہایت رنجیدگی سے ان کا اظہار کیا۔ اگر چہ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اس کو مارے رنج وغیرت کے دربار میں غشی ہو گئی تھی۔ مگر یہ قول کچھ معتبر نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ صاحب عالمگیر نامہ کو اس کے چھپانے کی حسب ظاہر کچھ ضرورت نہ تھی المختصر بادشاہ نے اس حرکت سے ناراض ہو کر بغیر ان مراسم اعزاز وعنایت کے جو اس کے لئے تجویز ہوئے تھے حکم دیا کہ ڈیرہ کو چلا جائے اور کنور رام سنگھ کو جو اس کے معاملات میں متوسط تھا یہ ارشاد ہوا کہ اس کو اپنے ڈیرے پاس (جو شہر سے باہر تھا) اتار کر نگرانی کرتا رہے۔ اور اس کے بیٹے سنبھاجی کو جو منصب پنجہزاری پر بدستور مامور تھا کبھی کبھی اپنے ساتھ دربار میں لاتا رہے اور اس کے بھاگ جانے کے اندیشہ سے فولاد خاں کو توال کو حکم ہوا کہ اس کے ڈیرہ کے ارد گرد پہرے لگا دے۔ اور راجہ جے سنگھ کو کہ جس کی وساطت سے وہ حاضر ہوا تھا لکھا گیا کہ اس کے معاملہ میں جو مناسب جانے رپورٹ کرے اس عرصہ میں اگر چہ سنبھاجی دربار میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ مگر سیواجی کو ایسا ہراس غالب ہوا کہ وہ سب ہوا اس کے دماغ سے نکل گئی اور امرا کے پاس جا جا کر گڑگڑانے لگا۔ اسی اثنا میں راجہ جے سنگھ کا جواب بھی آ گیا کہ چونکہ میں اس کے ساتھ عہد کر چکا ہوں اور ہنوز بیجاپور کی مہم میں مشغول ہوں اگر در گزر کی جائے تو اس میں میری بھی سرخروئی ہے اور کاروبار مہم کے لئے بھی یہ مناسب اور قرین مصلحت ہے۔ اس پر بادشاہ نے اس کی خطا معاف کر دی اور پہرے اٹھوا دیئے اور سنبھاجی پر بھی کچھ اور زیادہ اظہار عنایات ہونے لگا اور ارادہ تھا کہ چند روز بعد خود اس کو بھی حاضر دربار ہونے کی اجازت دے کر باعزاز واکرام رخصت کر دیا جائے گا۔ مگر سیواجی کو اپنی سابقہ اور

حالیہ حرکتوں کے باعث اور بادشاہ کے "قہر و غضب" کے اندیشہ سے ایسی بے قراری تھی کہ جب اس نے دیکھا کہ پہرے اٹھ گئے اور کنور رام سنگھ نے بھی خواہ غفلت سے خواہ سازش سے نگرانی میں کوتاہی کی تو ستائیسویں صفر ۱۰۷۷ ہجری مطابق سال نہم جلوس عالمگیری کو بھیس بدل کر آگرہ سے ایسا بھاگا کہ پھر کبھی قابو میں نہ آیا۔ اور جب آٹھ نو مہینے کے بعد خدا جانے کن کن حکمتوں اور تدبیروں سے اپنی اور اپنے بیٹے کی تلاش اور تعاقب کرنے والوں سے جان بچا کر ماہ دسمبر ۱۶۶۶ عیسوی میں راج گڑھ واپس جا پہنچا تو فروغ اس کا زیادہ سے زیادہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس نے تیرہویں سال جلوس مطابق ۱۰۸۰ ہجری میں نہ صرف بندر سورت کو ہی لوٹا اور جلایا بلکہ اکثر قلعے وغیرہ بھی جو اس سے چھین لئے گئے تھے ان پر بھی پھر قابض ہو گیا۔ اور چونکہ وہ کسی طرح بادشاہی فوجوں کے قابو میں نہ آتا تھا اورنگ زیب نے دق ہو کر اس مناسبت سے کہ اس ملک کے پہاڑوں اور جنگلوں میں چوہے بہت کثرت سے ہوتے ہیں اس کا نام "موش کوہی" رکھ دیا تھا۔

اس نے عالمگیر کے جلوس کے تیئسویں سال میں چوبیسویں ربیع الثانی ۱۰۹۰ ہجری کو (حسب قول مصنف ماثر عالمگیری) بقول الفنسٹن صاحب پنجم اپریل ۱۶۸۰ عیسوی کو ترپین برس کی عمر میں راج گڑھ میں جو اس کا دار الریاست تھا انتقال کیا۔ اس کی موت کا باعث مأثر عالمگیری میں یہ لکھا ہے کہ "کہیں سواری سے آکر شدت گرمی سے دو دفعہ خون کی قے کی اور مر گیا" اور انسائیکلوپیڈیا میں اس کا مرنا ذات الصدر کی بیماری میں اور مرہٹوں کی تاریخ میں مرنے سے پہلے وجع المفاصل یا نقرس کے باعث سے گھٹنوں کے درد اور تپ میں اس کا مبتلا ہونا لکھا ہے۔

انتقال کے وقت اس کی حکومت چار سو میل طول اور ایک سو بیس میل عرض کے قطعہ زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور راج تلک کی رسم باقاعدہ اور آزادانہ طور پر بڑی شان و شوکت سے ادا کر کے خود سر راجہ بن چکا تھا۔ جس کو چھ جون ۱۶۷۴ عیسوی کو ایسٹ انڈیا کمپنی انگریزی کے کارخانہ بمبئی کے ایک ایجنٹ نے جو مبارکباد دینے کے لئے ایلچی بن کر گیا تھا چشم خود دیکھا تھا اور اس نے ایک ایسی مستقل اور دیرپا حکومت قائم کر لی تھی اور اپنی قابلیت اور تدبیروں سے پولیٹکل اغراض کو مذہبی تعصبات کا رنگ چڑھا کر اور سادہ لوح لوگوں کو ایسے اشارے اور کرشمے دکھا کر جس سے معلوم ہو کہ اس کے حال پر دیوی دیوتاؤں کی طرف سے بھی دیا کی نگہہ ہے۔ جیسا کہ دنیا کے اکثر حصوں میں ہوتا رہا ہے اپنے ملک کے

بھوکے اور جاہل باشندوں میں ایک ایسی سپاہیانہ امنگ اور مذہبی جوش پیدا کر دیا اور اپنے ملک کے گمنام باشندوں کا پیشرو بن کر ان کو بہادر اور جنگجو قوم مرہٹہ کے نام سے ہندوستان کی تاریخ میں نامور اور مشہور کر دیا اور ایک ایسی بنیاد ڈال گیا جو اس کے پیچھے آنے والوں کے لئے مغلیہ سلطنت کے ضعف کے زمانہ میں ملک و حکومت حاصل کرنے میں بہت ہی کار آمد ہوئی۔

عالمگیر نامہ وغیرہ فارسی تاریخوں میں جو اس کے مخالفوں کی لکھی ہوئی ہیں جہاں اس کی مکاری اور غارت گری اور فن و فریب وغیرہ کی ہجو لکھی ہے اس کے ساتھ اس کی چستی چالاکی اور بے حد دلاوری و جرأت کا بھی اقرار کیا ہے۔ اور الفنسٹن صاحب لکھتے ہیں کہ بلحاظ اس وقت کے اس کا ملکی اور فوجی انتظام دونوں عمدہ تھے۔

انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ ''اس کی حکومت کا کل زمانہ مسلسل لڑائیوں اور پولیٹکل سازشوں کا ایک ایسا منظر ہے کہ جس میں وہ ایک نہایت ہوشیار جنرل اور ایک قابل مگر مکار مدبر کی سی لیاقتیں ظاہر کرتا رہا۔ اور ہر ایک خوفناک ضرورت کے وقت خواہ وہ کیسے ہی انتہا درجہ کی اور یکایک پیش آئی ہو اس کی شجاعت و جرأت میں ذرا بھی فرق نہ آتا تھا۔ بلکہ فی الفور اس کا ایسا تدارک کرتا جو عین موقعہ وقت کے موافق ہوتا اور کسی جان جوکھوں میں پڑتے وقت موت و زندگی کی اس کو مطلق پروا نہ ہوتی تھی''۔

خلاصہ یہ کہ حضرت محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بہادر اور سیواجی مہاراج اپنے اپنے طور پر دونوں ہی عجیب و غریب شخص تھے اور اگرچہ مختلف قالبوں میں ڈھلے ہوئے تھے مگر مادہ ایک ہی تھا۔ (س م ح)

(۱۶۲ الف) لفظ ہُن کی تشریح و توضیح (حاشیہ)

ہندوستان کے ساحل مغربی و جنوبی پر ملک کا وہ تنگ اور طولانی قطعہ جس کو کنہڑ کہا جاتا ہے اور شمال کی طرف علاقہ ''کوکن'' سے شروع ہو کر جنوب کی سمت میسور کے قریب ختم ہوتا ہے وہاں کی زبان میں جسے کنہڑی کہتے ہیں ''ہن'' یا ''ہونو'' سونے کو کہتے ہیں اور اس جگہ اس سے سونے کا سکہ مراد ہے اور تعجب نہیں کہ فارسی اور بھاشا میں جو ''سین'' اور ''ہا ہوز'' کہیں کہیں (مثل آماسیدن و آماہیدن۔ وماہ و ماس و دہ و دس یا ہورد و سورد پوس و پوہ و بیاس و بیاہ وغیرہ) باہم بدل جایا کرتے ہیں اسی طرح اس لفظ میں

سونے کا "سین" "ہوتو" کی "ہے" سے بدل گیا ہو۔ اگر چہ یہ امر تحقیق ہے کہ بہت قدیم زمانہ سے ممالک دکن میں سکہ رائج الوقت سونے ہی کا ہوتا تھا۔ لیکن ٹھیک طور پر یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ بودھ مت والوں کے زمانہ میں یا اس سے پہلے ان سکوں کا عام نام کیا تھا۔ مگر البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں اس خاندان کے راجاؤں نے جن کو ڈاکٹر بیدی صاحب چلوکیہ لکھتے ہیں جب اودھ سے جاکر دکن میں اپنی بادشاہی قائم کی تو منجملہ ان علامتوں کے جو بطور اپنے نشان کے وہ سکوں وغیرہ پر لگاتے تھے ویراہ کی تصویر (جو سنسکرت میں سؤر کو کہتے ہیں خواہ ویراہ اوتار کی مناسبت سے یا کسی اور وجہ سے) ان کے سکہ پر منقش ہوا کرتی تھی۔ چونکہ اس خاندان کی شاہانہ حکومت مدراس' حیدر آباد دکن اور بمبئی کے ایک بہت بڑے حصہ پر تقریباً اٹھ نو سو برس تک بڑی شان و شوکت سے قائم رہی تو اس وجہ سے اس ملک میں ان کا سکہ عموماً ویراہا مشہور تھا اور اگرچہ ان کی حکومت تقریباً ۱۲۵۰ عیسوی میں جاتی رہی تھی مگر اس ملک کے سونے کے سکہ پر لفظ ویراہا کا اطلاق بعد میں بھی جاری رہا۔ چنانچہ کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی نے جو نویں صدی ہجری مطابق ۱۴۴۱ عیسوی میں سلطان شاہ رخ والیِ خراسان کی طرف سے راجہ دیورائے کے پاس (جس کو چلوکیہ خاندان سے کچھ تعلق نہ تھا) اس کی دارالحکومت وجے نگر میں سفارت پر آیا تھا اپنی کتاب مطلع السورین و مجمع البحرین میں وجے نگر کے عظیم الشان راجہ کے سکہ کا نام ویراہا ہی لکھا ہے اور وزن اس کا ایک مثقال (یعنی ساڑھے چار ماشہ) بتایا ہے۔

اغلب ہے، کہ جب مسلمانوں کی حکومت دکن و مدراس میں قائم ہوئی تو ویراہ (سؤر) کے لفظ کو مکروہ سمجھ کر اس سکہ کو اس کی جنس کے نام سے بجائے ویرھا کے ہن کہنا شروع کردیا۔ جیسا کہ فی زماننا بخارا کے سونے کے سکہ کو عموماً طلا کہتے ہیں۔ غرض کہ دکن میں زمانہ دراز سے ہندوؤں کے مختلف العلامت سونے کے سکوں کا نام ہن ہے۔ مگر اقوام یورپ اور اہل اسلام کے سکوں کی طرح ان پر اکثر صاحب سکہ کا نام اور سال و مقام ضرب نہیں ہوتا۔ اس لئے ان سے علم تاریخ کے لئے چنداں فائدہ نہیں پہنچتا اور اگرچہ ان سکوں کا مقدار وزن کسی قدر مختلف رہا ہے اور ایک بڑے مقدار کا سکہ رام ٹنکہ کے نام سے بھی مضروب ہو چکا ہے۔ مگر اکثر یہ وزن اس سکہ کا قریب ایک ثلث مروجہ اشرفی کے رہا۔ چنانچہ ایک ہن جو ہمارے کرم فرما مولوی چراغ علی خاں صاحب بہادر عمدہ دار گورنمنٹ نظام نے

مع بعض کوائف تاریخی متعلقہ سکہ ہن کے حیدر آباد دکن سے بھیجا ہے۔ اس کا وزن ساڑھے تین ماشہ ہے اس کے رد کی طرف تین ہندوانی مور تیں ہیں جن میں سے ایک بیچ کی بڑی اور دو آس پاس کی چھوٹی چھوٹی ہیں۔ اور پشت کی جانب صرف باریک باریک دانے یا نقطے سے ہیں اور اس کا قطر انگریزی دونی سے کچھ کم ہے اور اسی طرف سے یہ کسی قدر محدب یعنی کچھ ابھرا ہوا ہے اور ایک اور "ہن" جو ہمارے کرم فرما کرنل سی۔ ایچ۔ ٹی مارشل صاحب بہادر نے حیدر آباد ہی سے بھیجا ہے اس سے چھوٹا ہے اور اس کے نقوش بھی اس سے مختلف ہیں۔ یعنی رد کی طرف گرڑ پرندہ (نیل کنٹھ) بنایا ہوا ہے۔ اور اس کی دونوں چونچوں اور دونوں پنجوں میں ہاتھی لٹکتے ہیں اور پشت کی جانب سنسکرت کے کچھ حروف ہیں اور حسب ظاہر شکل اس کی مطابق اس نقشہ کے پائی جاتی ہے جو ڈاکٹر بیدی نے راجہ دیورائے وجے نگر والے کے ایک سکہ کا اپنے مضمون کے خاتمہ میں چھاپا ہے۔ جب پرتگالیوں 'ڈچوں انگریزوں نے ہندوستان کے ساحل جنوبی و مغربی پر ابتداد خل پایا تو بعض راجاؤں کے ہنوں پر مندر کی صورت مضروب دیکھ کر انہوں نے بجائے پہلے ناموں ویراہا یا ہن کے عموماً اس کا نام پگوڈا رکھ دیا۔ جس کو بعض انگریزی ڈکشنریوں میں لفظ بت کدہ کی خرابی بتایا ہے۔ لیکن بارتال میو نامی ایک یورپین محقق سیاح نے جو مدراس میں ۱۷۷۶ عیسوی سے لے کر ۱۷۸۹ عیسوی تک رہا تھا اس کی اصل یہ بتائی ہے کہ بعض پر "بھگوتی یا بھگودی (دیوی) کی تصویر ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اس کو بھگوتیہ یا بھگودتیہ کہتے تھے تو ان نو وارد فرنگیوں نے اس کو پگوڈا بنالیا۔ بہر حال حیدر نایک اور اس کے بیٹے سلطان ٹیپو کے زمانہ میں بھی ہن مضروب ہوتے تھے جو بہادری اور سلطانی ہن کہلاتے تھے اور آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی دکن کی ٹکسالوں میں بھی برابر ۱۸۱۸ء تک پگوڈا مضروب ہوتے رہے اور سرکاری حساب کتاب اور لین دین میں بھی بجائے روپیہ کے پگوڈا ہی کا چلن تھا۔ مگر ۱۸۱۹ عیسوی سے حکام انگریز نے آخر کار بجائے اس طلائی سکہ کے روپیہ کو تمام ہندوستان کے لئے سکہ رائج الوقت قرار دے دیا اور ویراہا' ہن' پگوڈا سب متروک ہو کر ان کے نام کتابوں میں لکھنے کو رہ گئے۔

ماخوذ از:

خط مولوی چراغ علی خاں صاحب بہادر عہدہ دار گورنمنٹ نظام۔
چٹھی مسٹر چارلس راجرس صاحب سابق پرنسپل مشنری نارمل سکول امرتسر حال
از جیولاجیکل سروئیر۔

رسالہ ڈاکٹر بیدی صاحب سرجن میجر و سپرنٹنڈنٹ عجائب خانہ مدراس مندرجہ
جنرل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال مطبوعہ ۱۸۸۳ء جلد ۳۲ حصہ اوّل نمبر اوّل۔

(س م ح)

(۱۶۳) شاہجہاں کی وفات کا احوال جو کچھ عالمگیر نامہ میں لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس قیدی بادشاہ کو بارہویں رجب ۱۰۷۵ ہجری کو حبس بول کا وہی پرانا عارضہ' جس کو مرض الموت کہنا چاہئے' پھر لاحق ہوا۔ حکیم مومنائے شیرازی نے جو اس وقت کے شاہی طبیبوں میں ایک مشہور شخص تھا' ہر چند علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ اسہال وغیرہ کئی طرح کے اور عوارض پیدا ہو کر زندگی سے یاس ہو گئی۔ جب یہ خبر عالمگیر کو پہنچی تو باپ کی آخری زیارت کو دلی سے آگرہ جانے کا ارادہ کیا۔ مگر چونکہ بادشاہی کوچ و مقام کے لیے دستور سلطنت کے موافق نہایت بھاری سامانوں کی ضرورت تھی اس لئے باوجود تاکید اختصار سامان کے بھی چند روز کا توقف ہونا ضروری تھا۔ اس وجہ سے اپنے بڑے بیٹے محمد معظم کو اپنی روانگی سے پہلے احتیاطاً جلدی سے روانہ کر دیا۔ ابھی شہزادہ آگرہ سے سات کوس اس طرف ہی تھا کہ شاہ جہاں پر حالت نزع طاری ہو گئی اور چھبیسویں رجب شب یکشنبہ کو آدھی رات سے پہلے انتقال ہو گیا۔ بے چاری مصیبت زدہ بیگم صاحب نے جو باپ کے ایام قید میں ایک وہی اس اس کی غمخوار اور رنج و راحت کی شریک تھی' رعد انداز خان قلع دار اور بہلول خواجہ سرا کو جو قیدی بادشاہ اور قلعہ کے محافظ تھے مکان معروف غسلخانہ میں طلب کر کے اور ان کی معرفت اسی وقت قلعہ کے دروازوں کی کھڑکیاں کھلوا کر غسل و کفن کی تیاری کے لئے سید محمد قنوجی کو جو بڑے عالم اور درویش مسلک تھے اور اس قید کے زمانہ میں اکثر شاہ جہاں کی صحبت میں رہا کرتے تھے مع ملا قربان قاضی دارالخلافہ آگرہ قلعہ میں بلوالیا۔ چنانچہ آدھی رات کے وقت جب وہ دونوں حاضر ہوئے تو قضائے روزہ و نماز کے عوض (اگرچہ بقول صاحب عالمگیر نامہ اس کی نماز و روزہ کبھی قضا نہ ہوئے تھے) برسم "اسقاط" اوّل بہت سا روپیہ خیرات کیا گیا اور بعد ازاں برج مثمن سے کہ جہاں انتقال کیا تھا' لاش کو اٹھا کر ایک قریب کے مکان میں غسل و کفن دے کر صندل کے تابوت میں رکھا گیا۔ اور برج مثمن کے نیچے کا دروازہ جو مسدود کیا ہوا تھا کھلوا کر اس کے راستہ سے اور فصیل بیرونی کے اس دروازہ سے جو اس کے محاذی تھا' جنازہ کو باہر لائے اور ہوشدار خاں صوبہ دار نے مع اور بادشاہی ملازموں کے ساتھ ہو کر "بآئین شائستہ" (یعنی مراسم اعزاز و احتشام شاہانہ کے

ساتھ) علی الصباح جمنا کے کنارہ جا پہنچایا۔ اور دریا سے پار ہو کر سید محمد قنوجی قاضی قربان وغیرہ علماء و صلحا نے جنازہ کی نماز پڑھ کر اسی کی زوجہ ممتاز الزمانی ارجمند بانو بیگم معروف بہ تاج محل کے مقبرہ میں کہ جس کا حال اس کتاب کے بعض اور مقامات میں مفصل درج ہے دفن کر دیا۔ لکھا ہے کہ اورنگ زیب کو جب باپ کے انتقال کی خبر پہنچی تو بہت رویا اور سوگواری کی اور رسموں کے علاوہ اس نے اور تمام اہل دربار نے جیسا کہ اب بھی ہندوستانی ریاستوں میں دستور ہے لباس سفید پہنا اور بسواری کشتی دہلی سے آگرہ پہنچ کر زیارت قبر کے وقت بھی بہت سا گریہ و بکا کیا۔ اور مجالس مولود اور ختم و فاتحہ جیسا کہ بادشاہوں کی وفات کے موقع پر دستور تھا منعقد کر کے دھوم دھام سے خیر و خیرات کی اور اپنی غمزدہ بڑی بہن بیگم صاحب کے پاس بھی کئی بار قلعہ میں گیا۔ اور نہایت تسلی و تشفی کی بلکہ اس قدر بڑھ کر خاطر و مدارات کی کہ تمام اہل دربار کو حکم دیا کہ ان کی ڈیوڑھی پر حاضر ہو کر نذریں پیش کریں۔ چنانچہ جب ایسا ہی ہوا تو بیگم صاحب نے بھی جو دریا دلی اور فیاضی میں مشہور اور بڑی ہی سیر چشم شہزادی تھی تمام اہل دربار کو عموماً ہزاری کے منصب تک بھاری بھاری خلعت مرحمت کئے اور اس کے بعد جب اورنگ زیب پھر ملنے کو گیا تو رسم پائے انداز و رسم نثار بجا لا کر ایک انتہایت قیمتی پیشکش جس کا برنیر نے اشارہ کیا ہے نذر کیا۔ اگرچہ صاحب عالمگیر نامہ اس امر کو نہیں لکھ سکتا تھا کہ شاہ جہاں کا جنازہ شاہانہ احتشام سے نہیں اٹھایا گیا۔ اور ایسے سادہ طور سے دفن کیا گیا جو اس کے مرتبہ کے شایان نہ تھا اور یہ عمل خواہ عالمگیر کے حکم سے ہوا ہو خواہ قلعہ دار و صوبہ دار کی کم فہمی سے مگر صاحب "عمل صالح" نے اس امر کو بہت ہی رنج و افسوس کے ساتھ عبرت ناک الفاظ میں جتایا ہے۔ اور چونکہ شہزادہ محمد معظم (بموجب بیان مندرجہ عالمگیر نامہ) شاہ جہاں کے انتقال کے وقت آگرہ سے صرف سات کوس کے فاصلہ پر موجود تھا اور ابھی پہنچا بھی نہ تھا کہ جنازہ بہت سویرے ہی دفنا دیا گیا۔ تو اس سے مصنف "عمل صالح" کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال اورنگ زیب کے جلوس کے آٹھویں سال ۱۰۷۵ ہجری کے ماہ رجب میں بے چارے شاہ جہاں نے جو ہندوستان کے نہایت نیک نام بادشاہوں میں سے تھا چھہتر برس تین مہینے ستائیس دن کی عمر میں بحساب قمری اور تین دن کم چوہتر برس کی عمر میں بحساب شمسی قلعہ آگرہ میں آٹھ برس کے قریب قید رہ کر قید ہستی سے رہائی پائی۔ جس میں سے اکتیس برس دو مہینے تئیس دن بحساب قمری اور تیس برس چار مہینے اٹھارہ دن [illegible]ب شمسی تخت نشین رہا۔ فقط

صاحب عالمگیر نامہ نے اس کے سال انتقال کی نسبت اپنی تصنیف کی ہوئی ایک تاریخ لکھی ہے جس کو ہم بھی پُر مضمون سمجھ کر اس جگہ نقل کرتے ہیں۔

چوں شاہ جہاں خدیو قدسی ملکات
برخاست بعزمِ عقبیٰ از تختِ حیات
جستم از عقل سالِ تاریخش را
گفتا خِردم "شاہ جہاں کرد وفات"

(۱۶۴) عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ کوچ بہار کے علاقہ کے لوگ نارائن کی مورت پوجتے ہیں، اس لئے لفظ نارائن ہمیشہ یہاں کے راجہ کے نام کا جزوِ اخیر ہوتا ہے۔ بلکہ اسی وجہ سے یہاں کے سونے کے سکہ کو بھی نارائنی کہتے ہیں اور قدامتِ خاندان کے باعث سے کوچ بہار اور آسام کے راجہ اس زمانہ میں اس طرف کے لوگوں کی نظر میں بہت معزز اور محترم خیال کئے جاتے تھے۔ اس کی ریاست بنگالہ کے شمال و مغرب میں مائل بہ شمال پچپن کوس کے طول اور پچاس کوس کے عرض میں دس لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کی تھی اور دریائے سنکوش جو تبت اور بنگالہ کو آتا ہے، آسام اور کوچ بہار میں فاصل تھا۔ (س م ح)

(۱۶۵) عالمگیر نامہ وغیرہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی اصطلاح میں لفظ ولایت کا اطلاق ایسے علاقوں کی نسبت کیا جاتا تھا جو بادشاہی حکومت سے آزاد اور خود مختار ہوتے تھے۔ (س م ح)

(۱۶۶) بھوٹنت میں جس کو آج کل انگریزی نقشوں میں اکثر بھوتان لکھتے ہیں، ہمیشہ دو راجہ ہوتے ہیں۔ ایک دینی، دوسرا دنیاوی۔ دینی راجہ کا لقب دیب راج اور دُنیوی کا دھرم راج ہوتا ہے۔ (س م ح)

(۱۶۷) اسمٰعیل جوگی۔ لوناچماری اور کوم گپھا کے مندروں کا ذِکر

عالمگیر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے جادوگروں کی استانی لوناچماری اور ان کے گرو گھنٹال میاں اسمٰعیل جوگی، جن کے شیطانی نام جادو ٹوٹوں کے منتروں میں کام روپ دیس کے ساتھ ایسی باتوں کے معتقد اکثر جپا کرتے ہیں، ان کے اور کوم گپھا کے مندر اس جگہ قلعہ نانڈو کے متصل پہاڑ کی چوٹی پر نیچے سے اوپر تک قریب ایک ہزار زینہ کے پتھر تراش کر بنائے ہوئے ہیں۔

(۱۶۸) فارسی تاریخوں میں زیمورن کو سامری لکھا ہے اور زمانہ حال کی بعض اردو تصانیف

میں کالی کٹ کا تلفظ کلی کوڈو اور کسی جگہ کالی کوٹ درج ہے۔اس لئے ہم نے مدراس گورنمنٹ کے ایک عالی منزلت عہدہ دار کی معرفت خود صاحب کلکٹر ملابار سے ان کی اصلیت دریافت کی تھی۔ مگر افسوس کہ صاحب موصوف کوان پرانے لفظوں کی اصلیت کا کچھ پتہ نہ مل سکا۔ آخر کار ہم نے حضور مہاراجہ صاحب بہادر سر گیاشی والی ٹراونکور جو بہت صاحبِ علم رئیس تھے اور ان کی ریاست بھی ساحل ملابار ہی پر واقع ہے، سے ان کی تحقیق چاہی۔ چنانچہ حضور ممدوح کے حکم سے ان کے سکریٹری نے جو جواب بذریعہ انگریزی چٹھی کے لکھا،اس کا خلاصہ یہ ہے کہ زیمورن تو یورپین لوگوں نے بنالیا ہے۔ میم کی پیش کے ساتھ صحیح لفظ سامُری ہے۔ مگر اس کے معنی اور اشتقاق معلوم نہیں۔

اور کالی کٹ کی اصل کالی کوڈو بتا کر اس کی وجہ تسمیہ کی نسبت یہ روایت لکھی کہ شاہ ملابار مسمی چیرومان پیرومال نے جب اپنے باجگذار کے طور پر سب سے پہلے سامُری کو ریاست عطا کی تو ایک تلوار اور مرغا دے کر یہ حکم دیا تھا کہ مقام تالی کیل کو (جو بعد ازاں سامُریوں کا دارالحکومت ہوا) کو جائے اور جہاں تک مرغ کی آواز پہنچے اس قدر علاقہ پر قبضہ کرے۔ اس وجوہ سے کالی کلوڈو نام پڑ گیا۔ جس کے معنی وہاں کی زبان میں "مرغ کی ریاست" ہوتے ہیں۔ جس کو ہمارے ملک کے ہندی محاورہ کے موافق "کوکڑ راج" کہنا چاہئے۔ بیورج صاحب کی تاریخ ہند سے بھی (جو ایک عمدہ اور جامع کتاب ہے) اسی روایت کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ صاحب موصوف نے ڈاکٹر بکانن صاحب کے سفرنامہ کے حوالہ سے یوں لکھا ہے کہ اس ملک میں افسانہ کے طور پر عام روایت یوں چلی آتی ہے کہ شاہ ملابار نے ایک روز اپنے سرداروں کو تمام ملک بانٹ دیا تھا۔ یہاں تک کہ جب ٹامُری نامی ایک سردار نے اپنے لئے بھی علاقہ مانگا تو اس کے پاس دینے کو تو کچھ باقی ہی نہ تھا اس وجہ سے اپنی تلوار دے دی اور کہا کہ وہ سامنے مندر پر بیٹھا ہوا جو ایک مرغ بانگ دے رہا ہے ،جہاں تک اس کی آواز جائے اس قدر ملک پر تُو بھی قبضہ کر لے۔

صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ یہ مرغ والی بات جو کالی کٹ کے قدیمی نام کالی کوڈو کی اصل بیان کی جاتی ہے اس کی اصلیت خواہ کچھ ہو یا نہ ہو مگر اس میں شک نہیں کہ خود بادشاہ کے ہاتھ کی تلوار مل جانے سے ان سب سرداروں پر ٹامُری ہی غالب آ گیا اور تمام ملک پر اسی کی حکومت ہو گئی اور غالباً ٹامُری ہی سے اس کے جانشینوں کا لقب رفتہ رفتہ سامُری بن گیا۔ (س م ح)

(۱۶۹) ملک مراکش جو افریقہ کے ساحل شمال و مغرب پر یورپ کے قریب واقع ہے اصل میں وہاں کے باشندوں کو جو مسلمان ہیں انگریزی میں "مور" کہتے ہیں۔ مگر جس طرح کل ممالک مختلفہ افریقہ کے سیاہ رنگ باشندوں کو ملکِ حبش کے قرب کے باعث ہم عموماً حبشی کہتے ہیں یا کُل یوروپین لوگوں کے لئے فرانس کے قرب کی وجہ سے بلالحاظ اختلاف اقوام لفظ فرنگی بولا جاتا ہے، اسی طرح انگریزی میں لفظ مور کا اطلاق مجازاً ان سب عرب اور افریقی سانولے رنگ کے مسلمانوں پر کیا جاتا ہے جن سے یورپ کے لوگوں کو مشرقی سمندروں میں سابقہ پڑتا تھا۔ (س م ح)

(۱۷۰) یہ عالی منزلت شخص جس کا پورا نام "جی آن بیپ ٹسٹ کولبرٹ" ہے اور "مارکوئیس آف سگنی لے" کے خطاب سے مخاطب تھا فرانس کے وزرا میں ایک ایسا نامور مدبر سلطنت ہو گزرا ہے کہ ایسے لائق و فائق وزیر کم ہوتے ہیں۔ ۱۶۱۹ء میں بمقام پیرس پیدا ہوا تھا اور کہتے ہیں کہ اس کے بزرگ دراصل سکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے اور کسی اتفاق سے فرانس میں جا رہے تھے۔ اس کا دادا شراب کا سوداگر تھا مگر اس کا باپ کچھ عرصہ کے بعد یہ شغل چھوڑ کر نوکری پیشہ ہو گیا تھا۔ کولبرٹ نے بعد تحصیلِ علوم و فنون بذریعہ اپنے برادر نسبتی کے جو اس وقت فرانس کا منسٹر آف سٹیٹ یعنی وزیر السلطنت تھا امورِ سلطنت میں دخل پایا اور رفتہ رفتہ حسنِ لیاقت اور کارگزاری اور ایمانداری کے باعث لوئیس چہاردہم کا' جو اس وقت کے یورپین بادشاہوں میں نہایت ہی نیک نام بادشاہ تھا' وزیر ہو گیا۔ اس خوش تدبیر شخص نے اپنے عہدِ وزارت میں انواع و اقسام کی ایسی عمدہ عمدہ اصلاحیں کیں اور ایسے مفید قاعدے اور قانون جاری کئے کہ جن سے حقیقتاً اس کی قوم اور سلطنت کو بڑی ہی نامور ی اور ترقی حاصل ہوئی۔ (از انسائیکلوپیڈیا برطانیکا) (س م ح)

(۱۷۱) شاہان مغلیہ جو جلال و عظمت اور ترفع کے اظہار کے لئے دیوان عام کے شہ نشین میں زمین سے کئی ہاتھ اونچے ہو کر تخت پر بیٹھتے تھے دامن قبا وغیرہ کو بوسہ دینے کی رسم ان کے دربار میں نہ تھی چنانچہ بعض سفیروں کے حاضر دربار ہونے کے چشم دید حالات جو خود مصنف نے اس کتاب میں لکھے ہیں ان سے بھی یہی ظاہر ہے کہ ایسا دستور نہ تھا اور درحالیکہ برابر کے بادشاہوں کے سفیروں کو بھی اس قدر قرب نصیب نہ ہو تو غریب برنیئر کو یہ رتبہ کہاں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اس وقت دربار فرانس میں کوئی ایسی تعظیمی رسم ہوگی جس کے لحاظ سے مصنف نے شرف یابی کے اس عام مطلو کو مجازاً ان الفاظ خاص میں

استعمال کیا ہوگا یا ایک ایسے مسلمان بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کی رسم کو جس کے درباری آداب و رسوم سے مصنف کے ہم وطنوں کو واقفیت نہ تھی اس وجہ سے ان لفظوں میں بیان کیا ہوگا کہ خلفائے بنی عباس کے زمانہ میں ان کی آستین وغیرہ کو بوسہ دینے کی رسم تھی جن کے تاریخی حالات سے اہلِ یورپ اکثر واقف تھے۔ (س م ح)

(۱۷۲) صفحہ گزشتہ اور اس صفحہ کے ان الفاظ سے جن پر خط ہے اور بادشاہ اور وزیر دونوں کو علیحدہ علیحدہ نذریں دینے کی مندرجہ صدر تمہید سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے کتاب کا یہ حصہ جس میں شاہ جہاں کے بیٹوں کی لڑائیاں اور انقلابِ سلطنت کے واقعات لکھے ہیں اپنے بادشاہ کو نذر کیا اور یہ خط اس کے وزیر کو۔ (س م ح)

(۱۷۳) یہ بات بالکل سچ ہے۔ چنانچہ ان اسباب کے بیان میں جن کے باعث کوچ بہار کی فتح کے بعد اس علاقہ کی رعایا نے بغاوت کی اور اپنے بھاگے ہوئے راجہ بیم نرائن کو واپس بلا کر پھر قائم کر لیا' خود صاحب عالمگیر نامہ نے بضمن واقعات ۱۰۷۱ ہجری مطابق سال چہارم و پنجم جلوس اورنگ زیب جو کچھ لکھا ہے مزید وثوق کے لئے ہم اس جگہ بعینہٖ نقل کرتے ہیں:

واین سانحہ بداں جہت وقوع یافت کہ جمعے کہ بہ نظم و نسق مہمات مالی آن ولایت متعین گشتہ بودند با قتضائے مصلحت و تدبیر کار نکردہ بدستورے کہ در ممالک محروسہ بادشاہی معمول است شروع در جمعبندی آن ولایت و مطالبتِ اموال از رعیت نمودند۔ از انجا کہ زمینداران مملکتِ ہندوستان بمقتضائے تدبیر بجہت تسخیر قلوب واستمالتِ رعایا کہ سر از ربقۂ اطاعت و مالگذاری آنہا بر ندارند در محال زمینداری خویش مسابلہ در اخذِ مال بکار می برندو دستور و قانونے کہ در ممالک محروسہ معمول است بعمل نمی آرندو بیم نرائن نیز بریں وتیرہ عمل میکرد کافہ رعایائے آنجا از وقوع آن معاملہ و قرار آن دستور کہ از آئینِ معہودِ آن دیار بعید بود و بایستے بتدریج سمت ظہور و استمرار گیرد متوحش و نفور گشتہ خواہاں بیم نرائن شدند و او را بفرد و آمدن از کوہستان و تحریک سلسلہ فساد ترغیب نمودند وہمگی اہل آن دیار بہ او پیوستند و دگربارہ او را حکومت و ریاست برگرفتہ بر سر محمد صالح نام یکے از منصب دارانِ پادشاہی کہ در موضع کتل باڑی بود ریختند"۔ (س م ح)

(۱۷۴) معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ سور کی سلطنت سے مراد ہے۔ (س م ح)

(۱۷۵) لودھیوں کی سلطنت سے مراد ہے۔ (س م ح)

(۱۷۶) یہ وہی شخص ہے جس کا نام نظامی نے سکندر نامہ میں "پور" لکھا ہے جو ایک

زبردست راجا تھا جس کا راج کوہ کمایوں سے لے کر قنوج تک تھا اور جو ستلج کے شمالی کنارہ پر سنہ مسیحی سے تین سو اٹھائیس برس پہلے مقدونیہ کے مشہور و معروف بادشاہ سکندر اعظم سے لڑ کر مغلوب ہو گیا تھا اور سکندر کی سلطنت ہندوستان میں قنوج تک ہو گئی تھی۔
(س م ح)

(۱۷۷) سلاطین عثمانیہ کے عثانی کہلانے کی وجہ اور مصنف کے اس بیان کی غلطی ہم ایک حاشیہ میں شروع میں لکھ چکے ہیں اس کو ملاحظہ کرنا چاہئے۔ (س م ح)

(۱۷۸) مصنف کے زمانہ میں یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ شاہان صفوی فرمانروائے ایران ذات کے سید تھے مگر ان کا امام یا خلیفہ مانا جانا بالکل غلط ہے۔ گو سیادت کے باعث سے کیسے ہی واجب الادب سمجھے جاتے ہوں۔ (س م ح)

(۱۷۹) یورپ کے لارڈوں وغیرہ سے مراد ہے۔ (س م ح)

(۱۸۰) آئین اکبری میں جو درجہ وار فہرستیں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ امرا اور منصب داروں کو باندازہ اپنے اپنے منصب کے گھوڑے' یابو' ہاتھی' اونٹ' خچریں اور چھکڑے گاڑیوں کا ایک مقررہ تعداد کے موافق اپنے پاس موجود رکھنا امر لازمی تھا۔ مثلاً پنجہزاری امیر کو تین سو سینتیس گھوڑے اور یابو اور ایک سو ہاتھی اور اسی قطار اونٹ اور بیس قطار خچریں اور ایک سو ساٹھ ارابہ یعنی چھکڑے اور گاڑیاں رکھنی واجب تھیں اور ان کے خرچ خوراک وغیرہ کے لئے پنجہزاری کے منصب دار کو (علاوہ تنخواہ فوج کے جو اس کو رکھنی پڑتی تھی) تیس ہزار روپیہ ماہوار سرکار شاہی سے ملتا تھا۔ اور چار ہزاری کے منصب دار کو دو سو ستر گھوڑے اور اسی ہاتھی اور پینسٹھ قطار اونٹ اور سترہ قطار خچریں اور ایک سو تیں ارابہ رکھنے پڑتے تھے۔ اور بائیس ہزار روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ (س م ح)

(۱۸۱) امراء اور منصب داروں کی اسم وار فہرستیں جو بادشاہ نامہ میں موجود ہیں ان سے ظاہر ہے کہ شاہ جہاں کی حکومت کے دہ سالہ اوّل کے خاتمہ تک کل امیر اور منصب دار ہفت ہزاری سے پانچ صدی تک پانچ سو بانوے تھے جن میں سے ایک سو اڑسٹھ شخص اسی دہ سالہ میں مر گئے تھے اور ان کے علاوہ شہزادہ دارا شکوہ پندرہ ہزاری اور شجاع اور اورنگ زیب دو از دہ ہزاری تھے اور شہزادہ مراد بخش کو محض پانچ سو روپیہ روزینہ ملتا تھا۔ کیونکہ شہزادوں کے لئے (بقول خافی خاں) دستور یہ تھا کہ جب تک امرا کی طرح کسی مہم وغیرہ پر مامور نہ ہوں منصب نہیں دیا جاتا تھا۔ اور صرف یمین الدولہ آصف خاں خانخاناں سپہ سالار وزیر اعظم ۱

بطور ایک غیر معمولی عنایت کے) نہ ہزاری تھا اور دہ سالہ دوئم کے خاتمہ میں جو فہرست ہے اس میں شہزادہ دارا شکوہ بست ہزاری اور شجاع اور اورنگ زیب پندرہ ہزاری اور مراد بخش دوازدہ ہزاری تھے اور آصف خاں کے مر جانے کے بعد نہ ہزاری کا منصب پھر کسی کو نہیں ملا۔ ہفت ہزاری کے درجہ تک (جو معمولی طور پر اس سے زیادہ منصب ہی نہ تھا اور "بقول خافی خاں" "ایک وقت میں چار امیروں سے زیادہ ہفت ہزاری نہ ہوتے تھے) اس دہ سالہ میں صرف چھ امیر پہنچے تھے۔ خان دوراں بہادر نصرت جنگ علیم دان خاں امیر الامراء سعید خاں بہادر ظفر جنگ اسلام خاں علامی سعد اللہ خاں افضل خاں اور شش ہزاری کا منصب سید خان جہاں بارہہ وال اعظم خاں عبداللہ خاں بہادر فیروز جنگ صدر الصدور سید جلال بخاری خسرو ولد نذر محمد خاں ازبک والی ترکستان صرف پانچ شخصوں نے پایا تھا۔ ہندو امراء کی حد ترقی (جن کو آج کل کی انگریزی اصطلاح کے موافق نیٹو (Native) کہنا چاہئے) دوسرے دہ سالہ تک پنجہزاری سے زیادہ نہ تھی) اور اس دہ سالہ کی فہرست میں کل پانچ سو اسی نام ہیں جن میں سے ایک سو آٹھ بقدر پانچویں حصہ کے ہندو ہیں۔ اور ایک اور فہرست سے جو تاریخ "عمل صالح" کے خاتمہ میں مندرجہ ہے شاہ جہاں کے عہد اخیر تک امرا اور منصب داروں کی تعداد آٹھ سو اڑسٹھ معلوم ہوتی ہے۔ جس میں ایک سو تریسٹھ ہندو امیروں کے نام درج ہیں۔ مگر چونکہ اس میں آصف خاں و علیم دان خاں و سعد اللہ خاں وغیرہ کے نام بھی درج ہیں جو شاہ جہاں کے مقید ہونے سے پہلے ہی مر چکے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس فہرست میں اس بادشاہ کے سب زندہ و مردہ امیروں کو گن ڈالا ہے۔ اور اگرچہ حسب شرح بالا دہ سالہ اوّل و دوم میں کوئی نیٹو (Native) امیر پنجہزاری سے زیادہ نہ تھا مگر دور اخیر میں یہ قید بھی توڑ دی گئی تھی۔ چنانچہ مہاراجہ جسونت سنگھ ہفت ہزاری اور راجہ میرزا جے سنگھ شش ہزاری ہو گئے تھے۔ (س م ح)

(۱۸۲) بادشاہ نامہ میں جو شاہ جہاں کے عہد سلطنت کے بیس سال کی بہت معتبر تاریخ ہے سوار فوج کی تعداد بموجب تفصیل ذیل دو لاکھ لکھی ہے۔ منصب دار آٹھ ہزار احدی اور برقنداز سات ہزار عام سوار ایک لاکھ پچاسی ہزار اور پیدل فوج کی تعداد جس میں گولنداز بان انداز اور بندوقچی سب شامل ہیں چالیس ہزار لکھی ہے جس میں سے دس ہزار حاضر رکاب اور تیس ہزار صوبوں اور قلعوں میں متعین رہتی تھی۔ (س م ح)

(۱۸۳) شاہ جہاں اکتیس برس دو مہینے تئیس دن بحساب قمری اور تیس برس چار مہینے اٹھارہ

دن حساب شمسی تخت نشین رہا۔ (س م ح)

(۱۸۴) اس کا مفصل حال "دربار اور تخت طاؤس" کے حاشیہ میں دیکھنا چاہئے۔ (س م ح)

(۱۸۵) شاہ جہاں کی سلطنت کے بیسویں سال کے خاتمہ پر ملا عبدالحمید لاہوری نے بادشاہنامہ میں جو عبارت خزانہ اور جواہرات کی نسبت لکھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے "خزانہ کہ امروز دریں دولت خداداد فراہم آمدہ محاسب و ہم خیال در درک اندازہ آن بعجز و قصور معترف است۔ اگرچہ خزانہ کہ حضرت عرش آشیانی (محمد اکبر بادشاہ) در مدت پنجاہ و یک سال فرمانروائی جمع نمودہ بودند و اکثر آنرا حضرت جنت مکانی (جہانگیر بادشاہ) در سلطنت بست و دو سال خرج نمودند ہیچ یکے از سلاطینِ ہندوستان را میسر نشد تا بفرمانروایانِ دیگر ولایت چہ رسد۔ اما آنچہ دریں عہد ہمایمن نیست عالم آرا و معدلت گیتی پیرا باوجود فراواں اخراجات گرد آمدہ بمراتب ازاں افزون است و آنچہ در سرکار مقدس از افراد کاملہ اقسام جواہر زواہر و زر سرخ و سفید و طلا آلات و نقرہ آلات جمع شدہ غالباً بحسب کمیت و کیفیت نزد کل فرمانروایان عالم نباشد"۔

اور میر محمد ہاشم خافی المخاطب بہ ہاشم علی خاں و آخر کار مخاطب بہ خافی خاں نظام الملکی نے اکبر اور شاہ جہاں دونوں کے خاتمہ احوال میں جو عبارتیں لکھی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔ (عبارت متعلق ذکر خزانہ عہد اکبر)

"در وقتِ وفاتِ محمد اکبر بادشاہ زیادہ از پنجہزار فیل کہ گاہ قریب شش ہزار میرسید در فیل خانہ او موجود بود و دوازدہ ہزار اسپ در طویلہ و ہزار یوز در چیپہ خانہ داشت و بعد وفات او کہ عرض خزانہ گرفتند دہ کرور روپیہ را اشرفی یازدہ ماشہ و سیزدہ ماشہ و چہاردہ ماشہ سوائے اشرفیہائے کلاں کہ از صد تولہ پانچ صد تولہ ہزار اشرفی در خزانہ موجود بود و دو صد و ہفتاد دو من طلائے غیر مسکوک و سہ صد و ہفتاد من نقرہ و یک من جواہر خاصہ کہ قیمت آن از سہ کرور روپیہ تجاوز نمودہ بود بر آمد" (عبارت متعلقہ حال خزانہ عہد شاہ جہاں)

"بر عقلا ظاہر است کہ اگرچہ در ملک گیری و استقلال بہ از محمد اکبر بادشاہ رونق افزائے سلطنتِ ہندوستان در تیموریہ نبودہ اما در بندوبست و نسق فراہم آوردن خزانہ و آبادکاری ملک و قدر دانی سپاہ و رفاہ لشکر بہ از شاہ جہاں بادشاہ در عرصہ بند وسعت ہندوستان فرماں فرمائے نگر دیدہ سوائے خرج لازم و ملزوم سلطنت و آنچہ بخرج عمارات و قلعہ و مساجد شاہ جہاں آباد و دیگر بلاد و بانعام ایلچیان و مہمِ قندھار بلخ کہ آخر رائیگاں رفتہ در آمدہ۔ بست و چہار کرور

روپیہ و از جنس اشرفی سوائے طلا و نقرہ غیر مسکوک و ظروف طلائی و نقرئی و جواہر کہ تخمینا پان زدہ شانزدہ کرور آن نیز ے شد ماندہ بود"۔ (س م ح)

(۱۸۶) شائد فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ ہونے کے وقت کچھ غلطی ہوئی ہے۔ کیونکہ ہندوؤں میں کوئی ایسا عام عقیدہ نہیں ہے غالباً اصل میں یوں ہوگا کہ مرنے کے بعد اولاد کے کام آئے گا۔ (س م ح)

(۱۸۷) خافی خاں نے بھی اپنی تاریخ میں (جو اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے صرف بارہ برس بعد محمد شاہ کے زمانہ میں لکھی گئی تھی) جلال الدین محمد اکبر کے عہد دولت اور اس کے مشیر خوش تدبیر راجہ ٹوڈر مل کے ذکر میں زمینداروں کی پرورش اور مالگذاری کے عمدہ بندوبستوں کی تعریف و توصیف لکھ کر پھر اپنے زمانہ کے عاملوں اور مستاجروں کے ظلم و ستم کی جو دردناک کیفیت نہایت ہی افسوس کے ساتھ لکھی ہے ہم اس کو اس جگہ نقل کرتے ہیں۔ یہ شخص اور اس کا باپ ابتدا اورنگ زیب کے بھائی مراد بخش کے ملازموں میں سے تھے اور اس نے شاہ جہاں کے خوشحال عہد سلطنت سے لے کر محمد شاہ کے پر اختلال زمانہ حکومت تک بہت کچھ دیکھا بھالا تھا۔ جن خرابیوں کا اس نے ذکر لکھا ہے ان کی نسبت یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اورنگ زیب کے بعد یا سدا رنگیلے محمد شاہ ہی کے زمانہ میں پیدا ہو گئی تھیں بلکہ ظاہر ہے کہ انتظامی اصولوں کی خرابی کے باعث پہلے ہی سے چلی آتی تھیں۔

قولہ: اما بر عقلائے باہوش تجربہ کار ظاہر است کہ الحال موافق تقاضائے وضع روزگار طریقۂ غور امور ملکی و رعیت پروری آبادی ملک و افزونیِ محصول از میاں بر خاستہ و عمال اجارہ دار کہ مبلغہا خرج دربار دادہ بر سر محالات می روند و باعث وبال حال رعایائے مال گزار میگردند آنہا را اصلا نظر بر آبادیِ ملک و خرابیِ حال رعایا نیست و از انکہ اعتماد بر حال ماندن سال دیگر بلکہ تمام سال ندارند ہر دو حصہ محصول را فروختہ میگیرند و زہے خداترسی کہ بر ہمیں ظلم اکتفا نمودہ کار بفروختن گاؤ و ارابہ کہ مدار قلبہ رانی بر آنست نرسانند و باز خرج دربارہ سہ بندی و نقصان تعہدے کہ نمودہ وفا نماید و بساط باقیماندۂ رعایا راحتی اشجار میوہ دار و زمینِ ملکی و موروثی آنہا را بفروش نیارد و تاخت و تاراج مسفدان آن نواح علاوہ موجبِ ویرانیِ ملک و خرابی حال رعایا میگردد و از آنست کہ دہ کردہ بست کردہ زمین نامزروع افتادہ بجائے زراعتِ اشجار خاردار دامنگیر مسافران و نشتر جگر جاگیرداران بے سرمایہ است بسا پرگنہ و قصبہ جات سیر حاصل بمرتبۂ خراب و ویران از تعدی حکام بدانجام

گردیدہ کہ بیشہ شیر و مسکن سباغ گشتہ و آنقدر دیہات خراب محض و بے چراغ شد کہ نام آبادی را بر خاستہ اگرچہ از شامت نفس رعایاو تقاضائے ایام بد فرجام است کہ روز بروز ملک زیادہ ازیں خراب شود و رعایا پامال جور و جفائے عمال بدمآل گردد و جاگیرداران گرفتار وبال آہ عیال مزارعان مظلوم گردند اما ظلم و تعدی وبیداد حاکمان از خدائے بے خبر بجائے رسیدہ کہ اگر خواہد عشر عشیر آنرا باحاطۂ بیان آرد از سررشتہ کلام دورے افتد در صورتیکہ یکے از عمال کہ فی الجملہ اندیشۂ روزِ جزا داشتہ باشد و خواہد برخلاف دیگر ظلم پیشگان سختی و تعدی را جزو اعظم شیوۂ عاملی نداند و ترحمے بر حال رعایا نماید و در پرداخت حال رعیت مال گزار وافزونی محصول سال بسال و نیکی عاقبت و مآل کار خود و فرزندان خود داند مردم روزگار او را مطعون ساختہ از جملہ بے وقوفان ناکردہ کار محسوب می نمایند و اگر خدا نکردہ سال را بتمام نرسانید و تغیر گردید خراب و پامال خرج سہ بندی وغیر ذلک گشتہ بوبال نقصان مایہ و شماتت ہمسایہ گرفتار میگردد۔ چنانچہ مکرر بر مسود اوراق گزشتہ !! حق سبحانہ و تعالیٰ ہمہ بندہائے عاصی را ازیں آفت در پناہ خود نگاہ دارد۔ بحق محمدؐ و آلہ الامجاد "۔

(س م ح)

(۱۸۸) الحق۔ طلب الکل فوت الکل۔ (س م ح)

(۱۸۹) کنٹری ہاؤس: مکان مع باغیچہ کو کہتے ہیں، جو اہلِ یورپ تبدیلِ آب و ہوا اور تفریح طبع کے لئے آبادی سے دور مضافات شہر میں بنالیتے ہیں۔ (س م ح)

(۱۹۰) ملک برہما کے باشندے چونکہ بدھ مت کے پیرو ہیں اس لئے ان کے مذہبی مقتدا اگرچہ برہمن نہیں ہوتے مگر اصل کتاب میں ایسا ہی لکھا ہے۔ (س م ح)

(۱۹۱) مجرموں کے تلووں پر قاضیوں کا چوٹیں لگوانا جو مصنف نے لکھا ہے چونکہ تعزیر کا یہ وحشیانہ طریقہ نہ تو شرع اسلام کے موافق ہے نہ ہندوستان کی رسوم متعارفہ میں سے ہے اس لئے کچھ اس کا حال لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ سزادہی کے اس طریقہ کو ایرانی لوگ چوب و فلک یا چوب و فلک کرون کہتے ہیں۔ اور پایا جاتا ہے کہ اس ملک میں سینکڑوں برس سے یہ سزا نہ صرف چوروں بدمعاشوں کو دی جاتی ہے بلکہ ایرانی میانجی اپنے مکتبوں کے شریر لڑکوں بھی یہی سزا دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ رائے ٹیک چند بہار کی کتاب مصطلحات بہار عجم میں جو آج سے ایک سو باون برس پہلے یعنی ۱۱۵۲ ہجری کی تصنیف ہے لکھا ہے کہ "فلک چوبے باشد طولانی کہ در ہر دو

سر ش دو جا سوراخ کنند و ریسمانے ازاں بگزرانند و معلمان ہر دو پائے اطفال بازی کوش را دراں بند کردہ تاب دہند آنگاہ چوب زنند و چوب و فلک نیز عبارت از ہمیں عمل است۔ علی خراسانی گفتہ ۔

تا مکتب سرگشتگی گردید پیدا در فلک
مانند طفلاں باشدم پائے تمنا در فلک

ایضا محمد قلی سلیم گفتہ ۔

زمانہ مکتب اطفال گشتہ پنداری
کہ ہر کہ ہست در و شکوہ از فلک دارد

ایضا محمد سعید اشرف گفتہ ۔

چوں ز دلم بروں جہد نالہ چرخ بر ستم
چارہ بلے فلک بود طفل گریزپائے را

ملا محسن تاثیر گفتہ ۔

رود چو طفل سرشکم بروں ز مکتبِ چشم
نہد بہ پاش ز مژگاں ادیبِ غم فلکے

ملا نورالدین ظہوری گفتہ ۔

گرچہ تادیب خلق بر فلک است
کہکشان ہم برائے او فلک است

واغلب چوبے بود کہ در وسط آن تسمہ باشد"

اور رائے ٹیک چند کے استاد سراج الدین علی خان آرزو نے اپنی کتاب مصطلاحات فارسی مسکے بہ چراغ ہدایت میں جو بہار عجم سے چند سال پیشتر کی تصنیف ہے یوں لکھا ہے کہ "فلک کردن" نوعے از تعذیب اطفال باشد کہ معلمان کنند و آن داژونہ آویختن است" اور اس الٹے لٹکانے کے معنی کا استنباط اپنے شاعرانہ خیال میں محمد قلی سلیم کے مذکورہ بالا شعر سے ہمناسبت لفظ فلک (یعنی آسمان) کر کے پھر ملا نورالدین ظہوری کا وہی شعر نقل کیا ہے اور اس میں کہکشاں کو اپنے تصور میں تسمہ سے مشابہ گردان کر یہ عبارت لکھی ہے کہ "لیکن ازیں شعر ظہوری بمعنی تسمہ کہ معلمان بر اطفال زنند معلوم می شود" چونکہ فارسی زبان کے ان ہندوستانی نامور محققوں نے "چوب و فلک" کے معنوں میں احتمالی باتیں لکھی ہیں

اس سے ظاہر ہے کہ ان کے وقت میں جو سنہ و سال کا حساب لگانے سے محمد شاہ کا عہد سلطنت معلوم ہوتا ہے جس نے ۱۱۳۱ء ہجری تخت نشین ہو کر ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی تھی ہندوستان میں یہ سزا مروّج نہ رہی تھی۔ انگریزی زبان میں اس طرح سزا دینے کا نام بسسٹی نیڈو ہے۔ چنانچہ ویبسٹر کی ڈکشنری میں جو زمانہء حال کی معتبر کتب لغات میں سے ہے اس کی تصویر بھی لکھی ہے اور بیان کیا ہے کہ دراصل یہ لفظ زبان فارسی کا ہے۔ اور اٹلی اور سپین اور فرانس کی زبانوں میں جو لفظ بسسٹی نیڈو کے لئے قریب التلفظ الفاظ ہیں منجملہ ان کے زبان فرنچ میں پہلے اس لفظ کو بستن کہتے تھے اور اب بتن کہتے ہیں۔ اور وہی مصنف لکھتا ہے کہ اس کے معنی ہیں ایک سخت مار ساتھ چھڑی یا سوٹھ کے۔ اور خصوصاً اس طریق سزا کو کہتے ہیں جو ٹرکی یا چین وغیرہ سلطنتوں میں اس طرح پر دی جاتی ہے کہ مجرم کے تلوؤں پر لاٹھیاں مارتے ہیں اور اسی کتاب میں اس کی تصویر اس طرح بنائی ہے کہ ایک شخص کو منہ کے بل اوندھا لٹایا ہوا ہے اور اس کے دونوں پاؤں گھٹنوں تک اس طرح اونچے کئے ہوئے ہیں جیسے کہ پانی میں تیرنے کے وقت اکثر لوگ کر لیا کرتے ہیں اور دونوں پاؤوں کے برابر دو مضبوط کھونٹے گڑے ہیں اور اس کے ٹخنوں میں تسمہ یا رسی ڈال کر ان کھونٹوں کے ساتھ مضبوط باندھ دیا ہے۔ اس طرح سے کہ تلوے روبآسمان ہیں اور اس کے پاس ایک شخص دونوں ہاتھوں میں لاٹھی اٹھائے کھڑا ہے جس کو آج کل کے رومی ترکوں کا سا یورپئین نما لباس پہنایا ہوا ہے وہ زور سے اس کے تلوؤں کو کوٹ رہا ہے۔ چوب و فلک کی شکل و صورت اور اس کے طریق استعمال کی نسبت جہاں تک ہم کو اہلِ ایران سے معلوم ہو سکا ہے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ڈنڈے کے طور کی کوئی دو گز لمبی اور ایک فٹ دور کی موٹی لکڑی کے دونوں سروں میں سوراخ کر کے ان میں کمان کے چلّے کی طرح کوئی تین بالشت طول کی ایک ڈھیلی رسی یا تسمہ ڈالے رکھتے ہیں اور جب مجرم کو سزا دینا چاہتے ہیں تو اس کے پاؤں کو اوّل اس رسی میں بل دے کر کس لیتے ہیں اور بعد ازاں دو آدمی اس ڈنڈے کو دونوں سروں سے پکڑ کر مجرم کے تلوے اس طرح سے روبآسمان کر دیتے ہیں گویا گھوڑے کی نعل بندی کراتے ہیں اور تیسرا شخص اکثر درخت انار کی شاخوں سے جو لچک دار ہونے کی وجہ سے زمانہء حال کی عدالت ہائے انگریزی کے ضرب بید کا سا جو چوروں بدمعاشوں کی پشت پر مارتے ہیں کام دیتی ہیں مجرم کے تلوؤں کو پیٹتا ہے۔ غرض کہ لفظ چوب سے وہ شاخیں مراد اور فلک سے وہ ڈنڈا اور فی زمانا ایران کے مکتبوں میں اس ڈنڈے کو فلکہ بھی کہتے ہیں۔ ہمارے ایک

ایرانی دوست نے بمبئی سے مکتب کے بچوں اور چوروں کی سزا کے طریق میں جو فرق لکھا ہے بہتر ہے کہ اس کو انہی کے الفاظ میں بیان کیا جائے۔ وھو ھذا:

چوب زدن مخصوص حکام و سلاطین است کہ دزد وغیرہ را تنبیہ می کنند ولے فلک در مکتب خانہ مخصوص بہ اطفال کوچک است و چوب آن یک ذرع و شاخ انار باریک دو طفل دیگر گرفتہ خود معلم میزند بر کف پائے طفل کہ چنداں صدمہ نرسد۔ ولے گماشتگان شاہی بقسمے چوب میزنند بر کف پائے شخص مجرم کہ تمام پائے شخص مجروح میشود و خون می آید بقسمے میزنند کہ سر چوب بہ قلم پامیخورد۔ و زخم میشود بسیار بد است! حال در ایران مروج است۔ فقط۔ (س م ح)

(۱۹۲) بعض فرانسیسی نام جو اس کتاب میں ہیں معلوم نہیں کہ خاص ان کے لب و لہجہ کے موافق ان کا صحیح تلفظ کیا ہے اگرچہ یہ دقت انگریزی میں بھی ہے کہ جن حروف سے کسی لفظ کو لکھتے ہیں تلفظ اس کا اکثر مطابق اصوات مقررہ ان حروف کے نہیں ہوتا۔ مگر یہ دقت فرانسیسی الفاظ و اسماء کی ہجی میں اور بھی زیادہ ہے اور خاص اہل زبان سے سنے بدون تصحیح ناممکن ہے۔ (س م ح)

(۱۹۳) اصل کتاب میں بجائے جست کے ٹین لکھا ہے۔ (س م ح)

(۱۹۴) جب کوئی ہستیاں جسم مثلاً پانی، مٹی کے ایک ایسے برتن میں بھرا جائے جس پر کانچ پھرا یا ہوا نہ ہو تو پانی کے اجزا برتن کے مسامات سے بھاپ بن کر اڑ جاتے ہیں اور بھاپ کے ساتھ بہت سی حرارت بھی جو پانی میں جذب رہتی ہے، نکل جاتی ہے تو اس برتن میں پانی بیشک ٹھنڈا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اسی طرح جم بھی سکتا ہے اور یہ تاثیر اس وقت اور بھی زیادہ پیدا ہو جاتی ہے جبکہ برتن کو دھوپ میں رکھا جائے اور اس کے باہر کی سطح کو جس سے بھاپ خارج ہوتی رہتی ہے، ہر طرف سے برابر تر کپڑا لپیٹا جائے۔ اگلے زمانہ کے علم کیمیا کے علماء کا یہ قیاس تھا کہ کوئی نہایت لطیف شے، جس کے انہوں نے مختلف نام رکھے ہوئے تھے اس عمل کے وقت برتن کے مسامات سے خارج ہوتی ہے اور زمانۂ حال کے علماء اس شے کو کیلورک یعنی جوہر حرارت کہتے ہیں۔ (مترجم انگریزی)

(۱۹۵) یعنی تین سو پچھتر (۳۷۵) میل ہے۔ (س م ح)

(۱۹۶) تاکہ اس مضمون کی زیادہ تشریح ہو جائے اس سفر کا حال عالمگیر نامہ سے بطور انتخاب نقل کیا جاتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ بادشاہ کشمیر کی سیر بھی کرنا چاہتا تھا اور بعض

مصالح ملک داری کے لحاظ سے بھی پنجاب کا جانا ضروری تھا اس لئے غرہ جمادی الاول ۲ے۱۰ا
ایک ہزار بہتر ہجری کو کہ اس کے جلوس کا سال پنجم اور "روز جشن وزن مقدس" یعنی تل
وان کا دن بتقریب سالگرہ آغاز سال چہل پنجم بحساب شمسی اور روز شروع سال چہل و
ششم بحساب قمری تھا دار الخلافہ شاہ جہاں آباد سے خیمہ جات شاہی باغ اعز آباد میں (جس کو
اس کتاب کے مصنف یعنی برنیئر نے شالا مار لکھا ہے) نصب ہوئے اور ساتویں ماہ جمادی
الاول کو مطابق ۲۷ ماہ آذر فارسی ساعت مقررہ یعنی مہورت کے موافق حضرت شاہ شریعت
پناہ نے سوار ہو کر باغ مذکور میں ڈیرہ کیا۔ گیارہویں کو یہاں سے کوچ کر کے چند روز ان شکار
گاہوں میں جو وہاں سے قریب تھیں بسر کئے اور پھر قصبہ سونی پت یعنی سیپت کی راہ سے
۲۷ کو کرنال پہنچا۔ یہاں سے فاضل خاں میر سامان کو مع لشکر و اسباب زاید سیدھا لاہور کو
روانہ کیا اور آپ معمولی شاہراہ چھوڑ کر مخلص پور کی سیر و شکار کو چلے گئے اور وہاں سے شکار
کھیلتے ہوئے پانچویں جمادی الآخر کو قصبہ خضر آباد میں (جو جمنا کے دائیں کنارے فی زمانا
ضلع انبالہ تحصیل جگادھری کے متعلق ہے) دریا کے اس پار آپہنچے اور نواحی خضر آباد کے شکار
کے بعد گیارہویں تاریخ کو انبالہ میں ڈیرہ کیا۔ پندرہویں کو سرہند اور انیسویں کو لدھیانہ
پہنچے۔ دریائے ستلج پر پہلے سے کشتیوں کا پل بندھ چکا تھا اس لئے دوسرے دن پھلور ڈیرہ
کیا۔ چونکہ بادشاہی "قراولوں" یعنی میر شکاروں نے پھلور کے نزدیک کے جنگلوں میں دو شیر
دیکھے تھے اس لئے بادشاہ سوار ہوئے اور دونوں کو بندوق سے شکار کیا۔ اس کے بعد
چھبیسویں کو نواحی تلونڈی میں ڈیرہ کیا (وہ تکلیف اور سرگردانی جو شیر کے شکار میں کل اہل
لشکر کو اس سفر میں اٹھانی پڑی تھی اور جس کا ذکر ڈاکٹر برنیئر نے آگے بہت تفصیل سے لکھا
ہے' معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہی جگہ مابین پھلور اور تلونڈی کے تھی) بعد ازیں دریائے "بیاہ"
یعنی بیاس کو بعضوں نے بذریعہ کشتی کے اور بعضوں نے پایاب عبور کیا اور فتح آباد میں مقام
ہوا اور دوسری رجب کو لاہور پہنچ کر باغ فیض بخش میں (جو شاہ جہاں کے وقت میں شالا مار
کشمیر کی طرز پر تعمیر ہوا تھا اور جسے ہمارے زمانہ میں عموماً شالا مار کہتے ہیں) ڈیرہ کیا اور چونکہ
شہر اور قلعہ لاہور میں داخلہ کی ساعت دسویں رجب غرہ اسفند ماہ فارسی وقت دوپہر سے
پہلے نہیں تھی اس لئے تاریخ مقررہ تک اس باغ میں بدستور مقام رہا۔ واضح ہو کہ جمنا کی وہ
نہر جو اس دریا کے بائیں کنارے سے دہلی کو گئی ہے اور جس کو نہر جمن شرقی کہتے ہیں' فی زمانا
مخلص پور کوئی بستی نہیں ہے البتہ کچھ کھنڈر جن کو لوگ بادشاہی محل کہتے ہیں' مابین

فیض آباد موضع کھارا کہ جن کے باہم تخمیناً چار میل کا فاصلہ ہے اور جہاں ہمارے زمانہ میں اس نہر کا سرا واقع ہے' ان عمارتوں کا پتہ بتاتے ہیں۔ فیض آباد ضلع سہارنپور کے متعلق اور خضر آباد کے محاذی جمنا پار ایک مختصر سا قصبہ ہے۔ (س م ح)

(۱۹۷) اس جگہ لفظ چھپر کھٹ ہندوستانی مذاق کے موافق ترجمہ کیا گیا ہے مگر اصل کتاب میں لفظ (سکرین) ہے جس کے معنی چھپر کھٹ کے نہیں ہیں بلکہ اوٹ اور پردہ کے ہیں اور چونکہ انگریزوں کے گھروں میں اکثر ایک قسم کے کپڑے سے منڈھے ہوئے لکڑی کے ایسے چوکھٹے دیکھنے میں آتے ہیں جو تہہ کئے جا سکتے ہیں اور جن کو کمرے کے اندر کسی مناسب جگہ پر کھڑا کر کے قنات یا پردہ کا کام لیا جاتا ہے تو اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً مصنف نے کسی ایسی ہی قسم کی چیز سے خرگاہ کو تشبیہ دی ہے۔ (س م ح)

(۱۹۸) ان بھینسوں سے جنگلی بھینسے جن کو ارنا بھینسا کہتے ہیں' مراد ہیں۔ (س م ح)

(۱۹۹) قور (ق ور) بہ معنی ہتھیار' ترکی لفظ ہے اور اس سے بادشاہی اسلحہ خانہ مراد ہے۔ آئین اکبری میں لکھا ہے کہ شہنشاہ اکبر نے یہ آئین باندھا تھا کہ مختلف قسم کے اسلحہ جات مثلاً تلوار نیزہ خنجر کمان جمدہر کٹار وغیرہ جیسے کہ اس وقت مروج تھے' روز مرہ ایک مقررہ تعداد کے موافق منصب داروں اور احدیوں کی ایک جماعت کو اس مطلب سے سپرد رہتے تھے کہ بادشاہ سفر اور حضر میں جس وقت چاہے ان میں سے کوئی ہتھیار لے کر خواہ خود استعمال کرے خواہ رسم وقت کے موافق کسی سردار یا سپاہی کو حسب ضرورت بخش دے اور سفر کے وقت جب یہ اسلحہ خانہ چلتا تھا تو شان و شوکت دکھانے کے لئے سامان جلوس شاہی یعنی نشانوں اور ماہی مراتب اور نقاروں وغیرہ کے ساتھ مل جل کر چلتا تھا گو دراصل یہ کارخانے قور سے علیحدہ تھے۔ (س م ح)

(۲۰۰) بیوس فلا یونانی میں بیل کے سر کو کہتے ہیں اور اس گھوڑے کا یہ نام اس مناسبت سے رکھا تھا کہ اس کے اس شکل کا داغ دیا ہوا تھا اور اس کے مرنے کی جگہ یادگاری کے واسطے ایک شہر اس کے نام پر بسایا گیا تھا۔ (س م ح)

(۲۰۱) عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ انیسویں رمضان سن ایک ہزار بہتر ہجری کو لاہور سے کوچ ہوا تھا۔ (س م ح)

(۲۰۲) اس بالیاقت بوڑھے ہندو وزیر نے اسی سفر میں انتقال کیا اور اس کے بعد جو نبی فاضل خاں وزیر ہوا تو وہ بھی صرف چند روز زندہ رہ کر اسی سفر میں بمقام کشمیر چل

بسا۔ (س م ح)

(۲۰۳) ملک یونان کے ایک ضلع کا نام ہے۔ (س م ح)

(۲۰۴) یورپ میں سینگ والے ہرن کم ہوتے ہیں اس لئے مصنف نے ہرن کے لفظ کے ساتھ سینگوں والے کا لفظ لکھا ہے۔ (س م ح)

(۲۰۵) یہ پہاڑ یونان کے صوبہ تھسے لی اور میسی ڈونیا (مقدونیا) کے مابین سرحدی خط پر واقع ہے اور مقدونیہ کے میدان سے جو اس کے شمال میں اور خوشنما وادی ٹمپ سے جو اس کے جنوب میں ہے نو ہزار سات سو چون فٹ اونچا اور آس پاس کے سب پہاڑوں کی چوٹیوں سے بلند ہے۔ اور شاہ بلوط اور اخروٹ وغیرہ درختوں کے جنگلوں سے لدا ہوا ہے۔ اس کا چٹان دار جسم کچھ آگے بڑھ کر بہت سی چوڑی چوڑی کھوؤں میں منقسم ہو گیا ہے اور اس کی چوڑی چوٹی برف کی سفید اور چمکدار چادر اوڑھے ہوئے گویا آسمان سے باتیں کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اولیمپس کے اس عظمت و شان کی وجہ سے قدیم یونانیوں نے اس کو اپنے دیوتاؤں کا مسکن خیال کیا تھا اور ان کا یہ اعتقاد تھا کہ ان کا دیوتا جوو جو جیوپیٹر یعنی مشتری کا دوسرا نام ہے اور جس کو اہلِ ہند کے معتقدات کے لحاظ سے اس جگہ تمثیلاً ''اندر'' کہنا چاہئے اسی پہاڑ پر بیٹھ کر آسمان کو گرجنے والے بادلوں سے پُر کرتا اور اپنی بجلی کے آتشیں تیروں کو ادھر ادھر پھینکتا تھا اور وہ اپنے محل میں جس کو ولکن نے (جو یونانیوں کے اعتقاد میں پاتال یعنی زیرِ زمین کی آگ اور دھاتوں کا دیوتا تھا) اس کے لئے یہاں بنایا تھا تمام دیوتاؤں کو جمع کر کے بسھا اور جگ رچا کرتا تھا اور ایک راستہ سے جو اس آسمانی محل کے دھاتی گنبد میں بنایا گیا تھا اور جس کے دروازہ پر نہایت گاڑھے بادل تختوں کا کام دیتے تھے' جب چاہتا تھا اس جہان کے اس طرف چلا جایا کرتا تھا۔ یونان کے قدیم شاعروں نے اس پہاڑ کی تعریف میں بہت کچھ کہا ہے اور فی الواقع وہ اب بھی اپنے سرسبز اور ہرے بھرے سایہ دار جنگلوں اور اپنی دھاروں اور کھوؤں اور سفید سفید چمکیلی چوٹیوں کے سبب سے ایسا ہی قابل تعریف ہے۔ فقط۔ ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا۔ (س م ح)

(۲۰۶) اصل کتاب میں لفظ فری سٹون ہے Free Stone۔ (س م ح)

(۲۰۷) یہ وجہ تسمیہ خلاف محاورہ ہونے کی وجہ سے غلط ہے کیونکہ سرسبز پہاڑ کو ہری پربت نہیں کہہ سکتے بلکہ ہرا پربت کہنا چاہئے۔ اور وہ وجہ تسمیہ صحیح معلوم ہوتی ہے جو دیوان کرپا رام صاحب آنجہانی دیوان ریاست جموں و کشمیر مئولف تاریخ موسوم بہ گلزار کشمیر نے

اپنی اس کتاب مطبوعہ ۱۸۷۰ء میں لکھا ہے یعنی یہ کہ چونکہ کشمیری زبان میں ہاری 'شارک کو کہتے ہیں جو ایک معروف جانور ہے پس اس پہاڑ پر "شارکا دیوی" کے مندر کے ہونے کی وجہ سے اس کا یہ نام مشہور ہو گیا ہے اور صحیح نام ہاری پربت ہے۔ (س م ح)

(۲۰۸) عیسائی اگرچہ حضرت سلیمان کے ملہم اور صاحب وحی ہونے کے قائل ہیں مگر مسلمانوں کی طرح ان کو پیغمبر نہیں جانتے بلکہ ایک نہایت ہی دانا اور عاقل بادشاہ کہتے ہیں۔ (س م ح)

(۲۰۹) ٹیک چند بہار نے اس کا نام شالامار لکھا ہے اور اس کو سنسکرت کا لفظ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ شالا اور مار سے مرکب ہے جو بمعنی خانہ اور قوت شہوی کے ہے اور مجازاً باغ کے معنی میں مستعمل ہو گیا ہے اور اس کی سند میں مرزا عبدالغنی قبولؔ کا یہ شعر لایا ہے ؎

زباغ زلف و رخ یار دادہ است فراغم
کہ سنبل سہیش کم زشالامار نباشد

لیکن ان معنوں کی غلطی خود ظاہر ہے کیونکہ شاعر نے اس لفظ کو باغ کے عام معنوں میں نہیں لیا ہے اور ظاہراً یہ ترکیب قواعد زبان سنسکرت کے بھی خلاف معلوم ہوتی ہے کیونکہ اگر یہ لفظ ہندی ہوتا تو مار شالا ہونا چاہئے تھا۔ جیسے دھرم شالا۔ پاٹ شالا۔ گئو شالا۔ وغیرہ! اصل یہ ہے کہ یہ صرف اس جگہ کا نام تھا جہاں شہنشاہ جہانگیر کے پندھرویں سال جلوس میں شاہ جہاں نے باپ کی فرمائش سے باغ بنایا تھا اور مقام تعمیر کی مناسبت سے اس کا نام شالامار پڑ گیا تھا۔ جس کو شاہ جہاں نے اپنے عہد کے ساتویں سال میں بدل کر فرح بخش نام رکھا چنانچہ تزک جہانگیری اور شاہ جہاں نامہ وغیرہ کتب تاریخ میں صاف اور صریح لکھا ہے اور دیوان کرپارام صاحب نے جو اپنی کتاب موسوم بہ "گلزار کشمیر" کے صفحہ دو سو دس پر شاہ جہاں کا ایک فرمان نقل کیا ہے۔ اس کے ایک فقرہ سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اور وہ فقرہ یہ ہے "دباغ فرح بخش کہ واقع ہست در موضع معروف شالمار نما بدولت و اقبال در ایام فرخندہ فرجام شاہزادگی احداث فرمودہ بودیم"۔ (س م ح)

(۲۱۰) اصل کتاب میں لفظ "سمر ہاؤس" ہے۔ (س م ح)

(۲۱۱) یہاں وہ سرینگر مراد ہے جہاں سلیماں شکوہ نے پناہ لی تھی۔ (س م ح)

(۲۱۲) مترجم کہتا ہے کہ شاعر کا یہ شعر کہ ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

کشمیر کے خوب حسب حال ہے۔ (س م ح)

(۲۱۳) ایک کشمیری سے تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ تبت کی طرف سے جو پشم آتی ہے اس کو تبتی لوگ توسا کہتے ہیں جس کو اصل کتاب کے مصنف یا غالباً مترجم انگریزی نے اپنی زبان کے لہجہ کے مواقق حرف زیڈ یعنی زے کے ساتھ لکھدیا ہے۔ (س م ح)

(۲۱۴) ہمارے اس زمانہ میں تین چار سو روپے سے کم قیمت کی شال امیرانہ پوشش کے لایق نہیں سمجھی جاتی اور فرمائشی شالیں تو ایک ہزار سے لے کر دوڈھائی ہزار روپیہ تک کی قیمت کی بھی بن سکتی ہیں مگر عموماً معمولی قیمت اچھی شال کی دو سو روپیہ سے لے کر سات آٹھ سو تک ہے۔ پس اِس وقت اور اُس وقت کی قیمت میں جس کا ذِکر مصنف نے کیا ہے اختلاف کا سبب شاید یہ ہو کہ اس وقت ایسا عمدہ اور باریک کام نہ بنتا ہو گا یا یہ سبب ہو کہ اس وقت کی بہ نسبت چاندی کی قیمت متناسبہ کم ہو گئی ہے۔ (س م ح)

(۲۱۵) ضُمراں ایک قسم نازبو کی ہے۔ (س م ح)

(۲۱۶) فرانس کے ایک ضلع کا نام ہے۔ (س م ح)

(۲۱۷) عالمگیر نامہ میں اس شخص کا نام "مراد خاں" لکھا ہے۔ (س م ح)

(۲۱۸) عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے کشمیر سے واپس آکر سیف خاں صوبہ دار کشمیر کے پاس دلدل نجل بڑی تبت کے "زمیندار" یعنی راجا کے نام کا ایک فرمان اس مضمون کا لکھ کر روانہ کیا کہ اگر تم ہماری اطاعت اختیار کر کے اپنے ملک میں ہمارا سکہ اور خطبہ جاری کر دو اور مسجد بنوا کر شعائر اسلام کو رواج دو تو بہتر تمہارا ملک و مال بحال رہے گا ورنہ فوج کشی کی جائے گی۔ چنانچہ یہ فرمان ہدایت شاہی کے مواقق محمد شفیع نامی ایک بادشاہی سردار کے ہاتھ کشمیر سے اس کے پاس بھیجا گیا جس کا دلدن نجل نے تین میل تک استقبال کیا اور بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ فرمان کو اپنے سر پر رکھا اور فرستادگان شاہی کی بہت خاطر و مدارات کی اور اس سے دوسرے روز جو جمعہ کا دن تھا۔ ایک بڑے مجمع عام میں بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور جب محی الدین محمد اورنگ زیب کا نام خطبہ میں لیا گیا تو خطیب کے سر پر بہت سا سونا چاندی لٹایا گیا اور خطبہ کے بعد مسجد کی نیو رکھی گئی اور بہت سے سونے چاندی پر بادشاہ کا سکہ لگایا گیا اور اس کے بعد ایک عریضہ جس میں بہت سے عجز ونیاز اور وفائے عہد کے وعدے تھے مع ایک طلائی کنجی کے جو بطور علامت سپردگی اپنی

ولایت کے تھی اور ایک ہزار اشرفی اور دو ہزار روپیہ جس پر بادشاہ کا سکہ لگایا تھا مع اور اپنے ملک کے تحائف کے حوالہ کر کے محمد شفیع کو رخصت کیا اور لکھا ہے کہ اس کارروائی کے بامراد سرانجام پانے میں چھوٹی تبت کے راجہ مراد خاں نے بہت کچھ کوشش کی تھی اور یہ پہلی ہی دفعہ تھی کہ بڑی تبت والوں نے کسی مسلمان بادشاہ کی اطاعت اختیار کی تھی۔ اسی کتاب میں اس ملک کی حدود کا حال اس طرح پر درج ہے کہ اس کا طول چھ مہینے کے راستہ سے زیادہ اور عرض بعض مقامات میں دو مہینے کا اور بعض جگہ ایک مہینے کا راستہ ہے۔ اس کے مغرب میں کشمیر ' کمایوں' سری نگر' بہار اور بنگالہ اور مشرق میں ملک ارژنگ اور خطا اور شمال رو تبت خورد کا کاشغر اور تمام مغولستان اور جنوب رُو دشت قبچاق ہے اور یہاں کے راجہ کی فوج بارہ ہزار سوار اور بہت سے پیادے ہیں اور سپاہ میں اکثر فرقہ قلماق قوم کے لوگ ہوتے ہیں۔ (س م ح)

(۲۱۹) بدھ مذہب والے اپنے گرو اور پیشوائے مذہب کو لاما کہتے ہیں اور سب سے بڑا لاما شہر لاسا دارالحکومت ملک تبت میں رہتا ہے اور تبت اور چین کے وہ لوگ جو بدھ مذہب رکھتے ہیں لاسا کے بڑے لاما کو مجسم بدھ جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ حیات ابدی رکھتا ہے اور جب کبر سن کے باعث اس کا جسم بوسیدہ ہو جاتا ہے تب نئے قالب میں چلا جاتا ہے۔ لیکن یورپین سیاح اس کی نسبت یہ خیال کرتے ہیں کہ جب لاما مر جاتا ہے تو اس کے کارپرداز مخفی طور سے کسی ثروت کے پیدا ہوئے لڑکے کو لا کر لاما کی مسند پر بٹھا دیتے ہیں۔ اور اس کو ایسے طور پر پالتے پوستے اور سکھاتے پڑھاتے ہیں کہ وہ تمام باتیں پہلے لاماؤں کے وقت کی بتانے لگتا ہے اور اس کے ناواقف اور جاہل پیرو اس کو لاما کے کشف و کرامات کا کرشمہ سمجھ کر یقین کر لیتے ہیں۔ کپتان ٹرنر صاحب جو ۱۷۸۳ء میں سرکار آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے تبت کے راجہ کے پاس 'جو لاما کا نائب ہوتا ہے' بطور سفارت لاسا کو گئے تھے لکھتے ہیں کہ "اس وقت جو لاما تھا اگرچہ اس کی عمر صرف ڈیڑھ برس کی تھی لیکن صاحب موصوف کی ملاقات کے وقت وہ بڑی شان و شوکت اور تحمل و استقلال کے ساتھ مسند پر بیٹھا رہا اور برابر ان کی طرف متوجہ رہا۔ صاحب موصوف جب کوئی بات کہتے تو جواب میں اس انداز سے گردن ہلاتا کہ جیسے کوئی امیر کسی بات کو سمجھ کر اشارہ کرے۔ جب صاحب موصوف کا چائے کا پیالہ خالی ہوتا تو لاما ناک بھوں چڑھا' سر کو ہلا کر چیختا اور اپنے نوکروں کو اور چائے دینے کا اشارہ کرتا بلکہ ایک دفعہ تو ایک سونے کی طشتری میں سے کچھ مٹھائی اٹھا کر اپنے

ہاتھ سے ان کو دی۔ لاما جب قالب تبدیل کرتا ہے تو اس کے مردہ جسم کو سکھا کر اور چاندی سے منڈھ کر مندر میں پرستش کے لئے رکھ دیتے ہیں"۔ (ماخوذ از جامِ جہاں نما) (س م ح)

(۲۲۰) جہاں دریا پہاڑوں کے اندر بہت زور سے بہتے ہیں اور پتھروں کے سبب سے کشتی کو خوف ہوتا ہے وہاں لوگ جھولے یا چھینکے کے ذریعہ سے پار اترتے ہیں۔ جھولا اس کو کہتے ہیں کہ دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک کئی مضبوط رستے برابر برابر باندھ کر تختوں سے پاٹ دیتے ہیں جن کی چوڑائی اکثر ہاتھ دو ہاتھ سے زیادہ نہیں ہوتی اور سہارے کے واسطے دونوں جانب برابر رسیاں باندھ دیتے ہیں۔ لیکن چھینکا اس سے بھی بدتر ہے وہ صرف ایک رسا ہوتا ہے اس کنارے سے اس کنارے تک بندھا ہوا جس میں لوہے کے قلابے کے ساتھ ایک چھینکا لٹکا دیتے ہیں اور اس میں مسافر کو بٹھاتے ہیں۔ اس چھینکے میں دو رسیاں بندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ایک رسی کا سرا اس کنارے والے کے ہاتھ میں اور دوسری رسی کا سرا دوسرے کنارے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس طرف کے مسافر کو اس کنارے والا اور اس طرف کے مسافر کو اس کنارے والا اپنی رسی سے کھینچ لیتا ہے۔ (س م ح)

(۲۲۱) یہ مقام مع اپنے متعلقہ علاقہ کے بالفعل مہاراجہ صاحب والی جموں و کشمیر کی عملداری میں ہے اور گورچی اور چیکر غیر معروف مقام ہیں مگر چیکر کا صحیح نام ایک تبت کے رہنے والے نے ہم کو 'شگر' بتایا تھا اور فی الحقیقت ایک مستند انگریزی نقشہ میں بھی ایسا ہی لکھا ہوا ہے مگر گورچی کی صحت کچھ معلوم نہیں ہو سکی علی ہذاالقیاس جور سندہ وغیرہ ناموں کا بھی پتہ نہیں لگ سکا۔ (س م ح)

(۲۲۲) توریت میں اس شخص کا نام سلما نعسار آیا ہے۔ مگر انگریز مؤرخ "شال مینے سر" یا "شال مینے زر" لکھتے ہیں یہ ملک شام کا بادشاہ تھا اور مشہور شہر بابل اس کا پایۂ تخت تھا اس نے سات سو انیس برس قبل از سنہ عیسوی ملک یہودا کے بادشاہ "ہوشاع" پر جو بنی اسرائیل میں سے تھا مگر بت پرست ہو گیا تھا چڑھائی کی اور اس کو اپنا باج گزار بنالیا۔ لیکن پھر یہ سن کر کہ وہ فرعون مصر کے ساتھ سازش رکھتا ہے دوبارہ اس کے شہر شومرون کو جا گھیرا اور تین برس کے محاصرہ کے بعد اس کو فتح کر لیا اور "ہوشاع" اور اس کی تمام قوم کے لوگوں کو قید کر کے بابل میں لے آیا اور ان کی جگہ بابل کے لوگ آباد کئے۔۔ اور تیرہ برس سلطنت کر کے آ کر وہ بھی اس دنیا سے چل بسا۔ (ماخوذ از تاریخ التواریخ و انسائیکلوپیڈیا۔)

(س م ح)

(۲۲۳) اس لفظ کی تحقیق نہیں ہو سکی مگر شاید خاقان ہو جس سے اس جگہ پیشوا اور امام مراد ہو۔ (س م ح)

(۲۲۴) کرنل جارج فاسٹر صاحب نے اپنی ایک چٹھی میں جو کشمیر سے ۱۷۸۳ء میں لکھی تھی! لکھا ہے کہ "جب پہلی پہل میں نے کشمیریوں کو کشمیر میں دیکھا تو ان کے لباس اور چہرے کی ساخت سے جو لمبا اور سنجیدہ طور کا ہے اور ان کی داڑھی کی وضع سے یہ خیال کیا کہ گویا میں یہودیوں کے ملک میں آ گیا ہوں"۔ (مترجم انگریزی)

(۲۲۵) تعجب ہے کہ ایسی بے سر و پا باتوں کو مصنف نے اپنی رائے کی بنیاد قرار دیا ہے اور شاید اس کو معلوم نہ ہوگا کہ مسلمان اکثر حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور پیغمبروں کے نام پر قدیم سے اپنے نام رکھتے چلے آئے ہیں۔ (س م ح)

(۲۲۶) مدراس پریذیڈنسی کے متعلق ساحل مالابار پر سمندر کے کنارے ایک ہندوستانی ریاست ہے مگر بندرگاہ کوچین خاص گورنمنٹ انگریزی کی حکومت میں ضلع مالابار میں ہے۔ (س م ح)

(۲۲۷) ملک نوبیا یا نوبہ کا جو افریقہ کا ایک حصہ ہے قدیم نام ہے۔ (س م ح)

(۲۲۸) ملک فلسطین اور شام کی دو بندرگاہوں کا نام ہے۔ (س م ح)

(۲۲۹) شراب کے اس قسم کے مرکب کو جو بغرض تفریح تیار کیا جاتا ہے انگریزی میں پنچ کہتے ہیں۔ (س م ح)

(۲۳۰) صاحب فرہنگ رشیدی نے اس کا تلفظ دُلفِین لکھا ہے اور اس کی عادت جو ظاہراً ایک افسانہ ہے یہ لکھی ہے کہ ڈوبے ہوئے آدمی کو دریا سے نکال کر کنارے پر ڈال دیتی ہے چنانچہ اس کی اسی عادت کے اعتبار سے شیخ ابراہیم ذوق نے بھی اپنی ایک مثنوی میں محبوب کے بازوؤں کی تعریف میں لکھا ہے:

مچھلی بازو کی ماہی دُلفین
غرقہ کش بحر خوں سے مردمِ عین

اور کتاب مخزن الادویہ میں اس کی نسبت یہ عبارت لکھی ہے کہ "اسم یونانی است وبعضے گفتہ اند بلغت رومی (یعنی لاطینی) اسم نوعی از سمک است کہ بعربی خنزیر البحر و بفارسی خوک ماہی و ماہیِ بینی دراز و بہ دیلمی گجہ ماہی و بہندی سوس نامند" اور انگریزی کتابوں میں یہ ہے کہ یہ

لفظ لیٹن زبان کا ہے اور انہوں نے اس کو ایک قسم وھیل مچھلی کی لکھا ہے اور وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب طوفان آنے کو ہوتا ہے تو یہ مچھلی اچھلنے کودنے لگتی ہے جس سے ملاح ہوشیار ہو جاتے ہیں اور اس باعث سے اس کو انسانوں کا دوست کہتے ہیں اور یہ بھی مشہور ہے کہ یہ قریب المرگ ہوتی ہے تو گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلنے لگتی ہے۔ (س م ح)

(۲۳۱) قمری قوس قزح کو بعض ہمارے اس زمانہ کے لوگوں نے بھی دیکھا ہے چنانچہ کتاب "نامہ دانشوران" میں جس کو علماء فضلا کی ایک کمیٹی نے بحکم ناصر الدین شاہ بادشاہ حال ایران مشہور و معروف اہل علم کے تذکرے کے طور پر تالیف کیا ہے اور خوش قسمتی سے مطبع شاہی طہران کی چھپی ہوئی ہمارے کتب خانہ میں موجود ہے) ابن ابطلان طبیب کے تذکرے کی ذیل میں لکھا ہے کہ شہزادہ علی قلی میرزا وزیر علوم (ڈائریکٹر سر رشتہ تعلیم ایران) نے اپنی ایک تالیف میں لکھا ہے کہ ۱۲۶۹ ہجری میں جبکہ ہم وبا کے خوف سے بادشاہ کے ساتھ موضع امامہ میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے ایک رات کو جو شب ماہ تھی اور خفیف سا ترشح ہو رہا تھا آدھی رات کے وقت جو میں ایک کام کے لئے اپنے خیمہ سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چاند افق کے قریب ہے اور اس کے مقابل مشرق میں قوس پڑی ہوئی ہے۔ چونکہ دیکھنا تو کیا' چاند سے قوس کا پڑنا کبھی سنا بھی نہ تھا' مجھ کو نہایت حیرت ہوئی اور میں نے امیرزادہ محسن میرزا اور ملا علی محمد اصفہانی اور حکیم قاآنی اور شمس الشعرا سروش اور جناب نصیر الدولہ میرزا عبدالوہاب خان وزیر تجارت کو جو میرے ساتھ تھے جگا کر دکھایا اور وہ بھی متعجب ہوئے۔ پھر میں نے اس کا ذکر جو اکثر اہل کمال سے کیا تو میں دیکھتا تھا کہ وہ بظاہر ہاں ہاں تو کرتے تھے مگر دل سے اس کا ان کو یقین نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے کتاب تاریخ الحکما میں قمری قوس کا ہونا پڑھا جس سے مجھ کو نہایت تقویت ہوئی اور ہمیشہ میں اپنے قول کی صداقت کی خاطر اس کتاب کا حوالہ دیتا تھا۔ مگر چونکہ مجھ کو ہمیشہ اس کی تحقیق کا خیال تھا پھر میں نے علم طبیعات کی کئی کتابوں میں دیکھا کہ حکماء یورپ میں سے کئی شخصوں نے قمری قوس کو دیکھا ہے۔ چنانچہ کتاب "فزیک کانو" کا مصنف لکھتا ہے کہ سورج کی طرح چاند سے بھی قوس پڑتی ہے مگر قمری قوس کے رنگ بہت ہلکے ہوتے ہیں اور کتاب فریک راکن میں جو چار جلدوں میں ہے لکھا ہے کہ قمری قوس کے رنگ بہ نسبت آفتاب کے چاند کی روشنی کم ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے کم ممتیز ہوتے ہیں اور ایک اور کتاب میں لکھا ہے کہ کبھی کبھی چاند سے بھی قوس پڑتی ہے چنانچہ ماہ ستمبر ۱۷۹ء میں شہر شوٹر میں جو ملک فرانس کا ایک

شہر ہے دیکھی گئی تھی۔ (س م ح)

(۲۳۲) عیسائیوں کے رومن کیتھلک فرقہ کی ایک دعا کا نام ہے۔ (س م ح)

(۲۳۳) اس غرض سے کہ دریائے نیل کے منبع وغیرہ کی بابت مصنف کے بعد کے زمانے میں جو تحقیقاتیں عمل میں آئی ہیں اس مضمون کے ساتھ ناظرین ان کو بھی پڑھ لیں ہم تاریخ مصر میں جس کو سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ نے ڈاکٹر رولن صاحب کی تاریخ اقوام قدیم میں سے انتخاب کر کے باضافہ بعض مفید مضامین اور اور حاشیوں کے ۱۸۶۴ء میں چھاپا تھا عبارات ذیل نقل کرتے ہیں۔ (س م ح)

دریائے نیل کی طغیانی کا بیان۔

مصر میں دریائے نیل بھی ایک عجیب چیز ہے۔ اس ملک میں مینہہ بہت ہی کم برستا ہے۔۔ مگر اس دریا کی طغیانی سے تمام ملک سیراب ہو جاتا ہے۔ اور مینہہ برسنے کی کمی سے جو نقصان ہوتا ہے اس کا بدلہ یہ دریا دے دیتا ہے۔ کیونکہ اور ملکوں کی بارش کو بطور محصول کے جمع کر کر مصر میں پہنچا دیتا ہے چنانچہ ایک شاعر نے مصر کے کھیتوں کے حق میں خوب کہا ہے ~

عجیب طور کی تھیں مصر کی چراگاہیں
کہ عین قحط میں بارش کی وہاں نہ تھی پروا

اس فیض رسان دریا سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لئے مصریوں نے زمینوں کے اندازہ پر اور مناسب مناسب موقعوں پر بے شمار نہریں مناسب مناسب عرض وطول کی بنائی تھیں اور ان کے ذریعہ سے دریائے نیل اپنی فیاض دھاروں سے ہر جگہ کو زرخیز کرتا تھا۔ نہروں کی راہ سے لوگ سفر کرتے تھے اور خشکی پر چلنے اور خشکی کے سفر کی مصیبت جاتے رہنے سے گویا اس دریا نے شہروں کو پاس پاس کر دیا تھا۔ اور دریائے قلزم کو بحیرہ روم سے ملا دیا تھا اور اس سبب سے ملک کی اندرونی و بیرونی تجارت بہت رونق پر تھی۔ اور دشمنوں سے بھی ملک محفوظ تھا ان سب باتوں کے سبب کہا جاتا ہے کہ حقیقت میں یہ دریا مصر کا مربی اور اس کا بہت بڑا محافظ ہے۔ مصر والے کھیتوں میں دریا کے پانی کو جانے سے نہ روکتے تھے مگر شہروں میں جو بڑی محنت سے بنے تھے اور چوطرف پانی بھر جانے سے جزیروں کی طرح دکھائی دیتے تھے پانی نہیں جا سکتا تھا۔ وہاں کے رہنے والے ان میدانوں کو جو دریائے نیل کے پانی سے بھر جاتے

تھے اپنے اپنے مکانوں پر چڑھ کر نہایت خوشی سے دیکھتے تھے۔

دریائے نیل کے مخرج کا بیان

متقدمین خیال کرتے تھے کہ دریائے نیل کا مخرج ان پہاڑوں میں ہے جو کوہ قمر کے نام سے مشہور ہیں اور جو خط استوا سے دس درجہ عرض جنوبی میں واقع ہیں۔ "تقویم البلدان" میں بو علی سینا کا یہ قول لکھا ہے کہ دریائے نیل تمام دنیا کے دریاؤں سے بڑا اور لمبا ہے مگر یہ پرانے زمانہ کی بات ہے۔ یورپ کے سیاحوں اور جغرافیہ دانوں نے جو نئی نئی تحقیقات کی ہیں ان سے معلوم ہو گیا ہے کہ دنیا میں بہت سے دریا دریائے نیل سے بڑے اور لمبے ہیں۔ سب سے بڑا دریا دنیا میں امریکہ کے ملک میں امیزن ہے اور دریائے نیل کی لمبان سے دوگنے سے بھی زیادہ لمبا ہے۔ دریائے نیل کا مخرج اگلے زمانہ میں اچھی طرح تحقیق نہیں ہوا تھا۔ عربی جغرافیہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ خط استوا کے جنوب کی طرف بالکل ویرانہ ہے اور اس سبب سے وہاں کا حال دریافت نہیں ہو سکتا اور جو کچھ یونانیوں نے لکھا ہے اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہوا۔ رولن صاحب لکھتے ہیں کہ ہمارے زمانہ کے سیاحوں نے یہ تحقیق کیا ہے کہ خط استوا سے بارہ درجے عرض شمالی میں اس کا منبع ہے اور اس سبب سے متقدین کی تحقیقات کی بہ نسبت اس دریا کی لمبان کو قریب بارہ یا پندرہ سو میل کے کم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "دریائے نیل نکلتا ہے ایک بڑے پہاڑ کی جڑ میں سے جس کا نام گویام ہے اور مملکت ابی سینا میں واقع ہے۔" مگر زمانہ حال میں انگلستان کے شاہی جغرافیہ کی سوسائٹی نے اس دریا کے مخرج دریافت کرنے کو بہت سی کوششیں کیں اور کپتان اسپیک صاحب تین دفعہ اس کا مخرج دریافت کرنے کو افریقہ میں گئے۔ اخیر سفر ان کا ۱۸۵۹ء میں تھا انھوں نے اپنے سفروں میں عین خط استوا کے نیچے ایک بہت بڑی جھیل پائی۔ اور وکٹوریا نینزا اس کا نام رکھا۔ ان کے نزدیک وہی جھیل در حقیقت دریائے نیل کا مخرج ہے۔ جنوبی سرا اس جھیل کا قریب تیسرے درجہ عرض جنوبی کے واقع ہے جو گویا سرا دریائے نیل کا ہے۔ اس حساب سے دریائے نیل چونتیس درجوں کی لمبان میں یعنی دو ہزار تین سو میل کے طول میں بہتا ہے۔ اس جھیل کے جنوبی سرے سے مغرب کی طرف آؤ تو کیٹنگول نامی ایک دریا ملتا ہے جو اس جھیل میں پڑتا ہے مگر کپتان اسپیک صاحب کہتے ہیں کہ اس دریا سے اور دریائے نیل سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔ اور اگر جھیل کے اسی جنوبی سرے سے مشرق کی طرف جاؤ تو وہاں کوئی

بڑا دریا نہیں ہے۔ کیونکہ عرب کے سیاحوں سے انہوں نے تحقیق کیا کہ کوہ "کلی ماند جارو" کے مغرب کی طرف نمک کی جھیلیں اور نمک کے میدان ہیں اور پہاڑی ملک ہے' پانی کی بہت قلت ہے' کبھی کبھی کوئی چھوٹی ندی بہ آتی ہے۔ اس جھیل کے شمالی کنارے سے دریائے نیل نکلتا ہے۔ اس جھیل کے شمال مشرق کو ایک اور جھیل ہے مگر کپتان اسپیک صاحب کا وہاں تک جانا نہیں ہوا۔ مشہور ہے کہ وہاں ایک آبنائے ہے جو ان دونوں جھیلوں کو ملا دیتی ہے۔ اس پچھلی جھیل سے بھی ایک دریا نکلتا ہے جس کا نام "اسو" ہے اور تخمیناً سوا تین درجہ عرض شمالی تک بہہ کر دریائے نیل میں مل جاتا ہے۔ وکٹوریا نینزا جھیل کے شمالی کنارے میں سے تین دھاریں نکلتی ہیں اور تھوڑی دور بہہ کر سب آپس میں مل جاتی ہیں اور ایک دریا یعنی دریائے نیل ہو جاتا ہے۔ ان میں سے مشرقی دھار اس طرح پر نکلی ہے کہ جھیل میں سے ایک حصہ پانی کا شمال کی طرف نکلا ہے۔ اسپیک صاحب نے اس کا نام نپولین چینل فرانس کے بادشاہ کے نام پر رکھا ہے۔ کیونکہ فرانسیسی جغرافیہ کی شاہی سوسائٹی نے اس کا حال تحقیق کرنے کے صلہ میں ان کو سونے کا تمغہ دیا تھا۔ اس چینل سے ایک بہت بڑی چادر پانی کی نہایت زور و شور سے جس کا عرض چار سو پانچ سو فٹ تک ہے گرتی ہے اور وہ بہہ کر دریا کی دھار بن جاتی ہے۔ کپتان اسپیک صاحب نے اس چادر کا نام رائپن رکھا ہے۔ کیونکہ جب وہ دریائے نیل کے مخرج کی تحقیقات کو روانہ ہوئے تو انگلستان کے جغرافیہ کی شاہی سوسائٹی کے پریذیڈنٹ رائپن صاحب تھے! کپتان اسپیک صاحب کے نزدیک جو کچھ ضروری امر متعلق جغرافیہ در باب تحقیق مخرج نیل کے تھے وہ پورے ہو چکے ہیں۔ مگر اکثر محققین کے نزدیک ابھی اور زیادہ تحقیقات کی ضرورت ہے۔

دریائے نیل کی آبشاروں کا بیان

جن مقاموں میں کہ دریائے نیل سخت پتھروں میں ہو کر زور سے نیچے گرتا ہے ان کو آبشار کہتے ہیں۔ ملک مصر میں آنے سے پہلے یہ دریا اتھوپیا کے جنگل میں آہستہ آہستہ بہہ کر آبشار کی طرح گرتا ہے اور پھر وہاں سے دفعتاً نہایت تیزی اور زور شور سے بہتا ہے اور رفتہ رفتہ تمام رکاوٹوں سے نکل کر اور چند پہاڑیوں سے گذر کر اس قدر زور شور سے بہتا ہے کہ اس کی آواز نو میل پر سے سنائی دیتی ہے! اس ملک کے رہنے والے جن کو اس دریا میں آنے جانے کی عادت ہو گئی ہے ان لوگوں کو جو یہاں سیر کرنے کو آتے ہیں ایک عجیب تماشا دکھاتے ہیں

جس میں بہ نسبت دل لگی کے خوف زیادہ معلوم ہوتا ہے! ملک ایک چھوٹی سی ڈونگی میں دو آدمی بیٹھ کر دریا میں جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو ڈونگی کھیتا ہے۔ اور دوسرا ڈونگی میں سے پانی الیچتا جاتا ہے۔ بہت دیر تک وہ ڈونگی لہروں کی تیزی سے ٹکراتی ہے مگر وہ لوگ ہر طرح کا صدمہ اٹھا کر اور ڈونگی کو ہوشیاری اور چالاکی سے اپنے قابو میں لا کر تیز دھار پر لے جا کر بہاؤ پر چھوڑ دیتے ہیں اور تیر کی طرح اس میں سے نکل جاتے ہیں خوف زدہ تماشا دیکھنے والے یہ گمان کرتے ہیں کہ جس بلندی سے ان لوگوں نے اپنی ڈونگی کو چھوڑا ہے اس کے نیچے جا کر وہ لوگ ڈوب گئے لیکن وہ لوگ جب اصلی دھار پر جا پڑتے ہیں تو بہت دور تک بہہ جاتے ہیں اور جہاں پانی دھیما ہو جاتا ہے وہاں سے نکل آتے ہیں اس عجیب تماشے کا بیان سینکا صاحب نے کیا ہے اور حال کے زمانہ کے سیاح بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

دریائے نیل کی طغیانی کے اسباب کا بیان

اگلے زمانہ کے لوگوں نے مثل ہیروڈوٹس اور ڈایوڈورس اور سیکولس اور سنیکا صاحب کے دریائے نیل کی طغیانی کے باریک باریک سبب بیان کئے ہیں۔ لیکن وہ پرانی باتیں اور صرف نا تحقیق خیالات تھے حال کے زمانہ میں کچھ زیادہ التفات کے لائق نہیں رہے۔ اس زمانہ میں سب کا اتفاق ہے کہ اتھوپیا میں جہاں سے یہ دریا آتا ہے نہایت کثرت سے بارش ہونے کے سبب دریائے نیل کو اس قدر طغیانی ہوتی ہے کہ اول ایتھوپیا کو اور اس کے بعد مصر کو غرقاب کر دیتا ہے اور یہی دریا اس بارش کے سبب سمندر بن کر تمام ملک میں پھیل جاتا ہے۔ سٹرےبو صاحب کہتے ہیں کہ متقدمین کا صرف یہ قیاس تھا کہ نیل کی طغیانی ایتھوپیا میں کثرت سے بارش ہونے کے سبب سے ہوتی ہے۔ لیکن اس قیاس پر وہ یہ بات زیادہ کرتے ہیں کہ بہت سے سیاحوں نے اس کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ چنانچہ ٹولیمی فلیڈلفس یعنی بطلیموس ثانی بادشاہ مصر نے جو علوم اور فنون کی تحقیقات میں نہایت شوق رکھتا تھا اس امر کی تحقیقات کے لئے نہایت قابل قابل شخصوں کو وہاں بھیج کر اس امر کو تحقیق کیا تھا۔

دریائے نیل کی طغیانی کے موسم کا بیان

ہیروڈوٹس صاحب اور اسی طرح ڈایوڈورس اور سیکولس صاحب اور اور بہت سے مصنف بیان کرتے ہیں کہ دریائے نیل گرمی کے موسم میں یعنی ماہ جون کے اخیر میں بڑھنا شروع ہوتا ہے اور ستمبر کے اخیر تک روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اور اکتوبر اور نومبر میں

رفتہ رفتہ گھٹنا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ اپنے اصلی حال پر آجاتا ہے۔ اس زمانہ کے لوگ بھی اس بیان کی تصدیق کرتے ہیں اور حقیقت میں جو اصلی سبب اس دریا کی طغیانی کا ہے اسی پر اس کی بنیاد ہے اور وہ سبب وہی ایتھوپیا کی بارش ہے۔ جو لوگ وہاں گئے ہیں وہ بیان کرتے ہیں کہ اپریل کے مہینے میں وہاں بارش شروع ہوتی ہے۔ اور پانچ مہینے تک یعنی اگست کے نصف اخیر یا ستمبر کے نصف اول تک برابر بارش رہتی ہے 'اس لئے مصر میں دریائے نیل کا چڑھاؤ تین ہفتے یا ایک مہینے بعد انی سینا میں بارش شروع ہونے سے ہوتا ہے۔ سیاحوں کا قول ہے کہ دریائے نیل مئی کے مہینے سے بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ مگر اول نہایت آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور اپنے کناروں سے باہر نہیں نکلتا اور جون کے ختم ہونے کے قریب تک بھی اس میں طغیانی نہیں ہوتی۔ ہیرڈوٹس صاحب کہتے ہیں کہ اس کے بعد جو تین مہینے آتے ہیں انہیں تین مہینوں میں اس دریا میں طغیانی ہوتی ہے۔ اگلے مصنفوں کی اصل کتابوں میں ایک اختلاف ہے جس کو میں بیان کرتا ہوں۔ ہیرو ڈوٹس اور ڈایوڈورس ایک طرف ہیں اور سٹرے بو صاحب اور پلے نی صاحب اور سولینس صاحب دوسری طرف ہیں۔ یہ تینوں صاحب دریائے نیل کی طغیانی کے زمانہ کو بہت کم گنتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ تین مہینے یا سو دن میں کنارے کے باہر کی زمینوں میں سے لوٹ جاتا ہے اور زیادہ تر تعجب یہ ہے کہ پلے نی صاحب اپنی رائے کی بنیاد ہیرو ڈوٹس کی گواہی پر قائم کرتے ہیں۔

دریائے نیل کی طغیانی کی بلندی کا بیان

پلے نی صاحب بیان کرتے ہیں کہ طغیانی کے دنوں میں دریائے نیل ٹھیک ٹھیک چوبیس فٹ اونچا چڑھ جاتا ہے جبکہ اس کا چڑھاؤ اٹھارہ یا ساڑھے اٹھارہ فٹ اونچا آتا ہے تو ملک میں قحط سالی ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور جبکہ چوبیس فٹ اونچا چڑھاؤ آتا ہے تو غرقی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ شہنشاہ جولین نے ایک چٹھی موسومہ ایکڈ شیئس مورخہ بیسویں ستمبر ۳۶۲ء میں دریائے نیل کی طغیانی کی بلندی بائیں ۲۲ فٹ لکھی ہے۔ دریائے نیل کے چڑھاؤ کی بلندی میں باہم متقدمین کے اور نیز زمانہ حال کے مؤرخوں میں اتفاق نہیں ہے۔ مگر بہت سا تفاوت بھی ان میں نہیں ہے۔ اور اس کے سبب یہ ہوں گے! اول یہ کہ اگلے زمانہ کے اور زمانہ حال کے بیانوں میں شاید کچھ تفاوت ہو جس کا دریافت کرنا مشکل ہے۔ دوسرے متقدمین مؤرخوں نے بے پروائی سے اپنے بیانوں کو لکھا ہو۔ تیسرے یہ کہ خود نیل کی طغیانی میں

تفاوت ہوتا ہے کیونکہ وہ دریا جس قدر سمندر کے پاس آتا جاتا ہے اسکے چڑھاؤ کی بلندی کم ہوتی جاتی ہے جو کہ مصر کے ملک کی زرخیزی دریائے نیل کی طغیانی پر منحصر تھی اس لئے مصریوں نے اس کے چڑھاؤ کے تمام حالات کو اور اس کے مختلف درجوں کو بخوبی غور کیا تھا اور ایک مدت تک باقاعدہ امتحانوں سے جو بہت سے برسوں میں ہوئے تھے خود دریائے نیل کے چڑھاؤ سے یہ بات معلوم ہونے لگی تھی کہ اس سال میں چڑھاؤ سے کیسی فصل پیدا ہو گی۔ مصر کے بادشاہوں نے شہر ممفس میں ایک پیمانہ لگایا تھا اور اس پر دریائے نیل کے چڑھاؤ کے مختلف درجے لکھتے تھے۔ اور ان درجوں پر حساب کر کر تمام ملک میں اطلاع دی جاتی تھی کہ اب کی فصل میں کیا نقصان آوے گا یا کیا فائدہ ہوگا۔ سٹرے بو صاحب کہتے ہیں کہ اسی مطلب کے لئے شہر سیئین کے قریب دریائے نیل کے کنارے پر بھی ایک کنواں بنا ہوا ہے۔ آج تک یہ رسم شہر قاہرہ میں جاری ہے کہ ایک مسجد کے صحن میں ایک مینار ہے اور اس پر دریائے نیل کے چڑھاؤ کے درجوں کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ شہر کے ہر گلی کوچہ میں ہر روز منادی ہوتی ہے کہ دریائے نیل میں اس قدر چڑھاؤ ہوا! زمین کا خراج جو بادشاہ کو دیا جاتا ہے اس کا تصفیہ نیل کے چڑھاؤ پر منحصر ہے۔ جس دن دریائے نیل کا چڑھاؤ ایک معین بلندی پر پہنچ جاتا ہے اس دن بہت خوشی ہوتی ہے اور عیش و عشرت کی جاتی ہے اور آتشبازی چھوٹتی ہے اور آپس میں دعوتیں ہوتی ہیں اور جو جو باتیں ہر طرح کی خوشی میں ہوتی ہیں وہ سب کی جاتی ہیں۔ قدیم زمانہ میں بھی دریائے نیل کی طغیانی ہونے سے تمام مصر میں عام خوشی کی جاتی تھی اس لئے کہ اس ملک کی خوشی اور آسودگی کی بنیاد یہ ہی دریا ہے۔ اگلے زمانہ میں مصر کے لوگ جو بت پرست تھے دریا کی طغیانی کو اپنے دیوتا سراپس کا سبب جانتے تھے اور جس مینار پر اس کے چڑھاؤ کے درجوں کے نشان لگے ہوئے ہیں اس کو اس مندر میں مقدس سمجھ کر رکھا تھا۔ شہنشاہ قسطنطین نے اس مینار کو وہاں سے اکھاڑ کر اسکندریہ کے گرجا میں لے جانے کا حکم دیا۔ اس پر مصریوں نے یہ مشہور کیا کہ سراپس دیوتا کی خفگی کے سبب دریائے نیل میں کبھی چڑھاؤ نہیں آئے گا۔ دوسرے سال دریائے نیل میں معمولی قاعدہ پر چڑھاؤ آیا شہنشاہ جولین مرتد نے جو بت پرستی کا مربی تھا' اس مینار کو اسی مندر میں بھجوا دیا مگر شہنشاہ تھیوڈوشیئس نے پھر اس کو وہاں سے اٹھوا منگایا۔

نیل کی نہروں اور پانی کے کھینچنے کی کلوں کا بیان

اگرچہ خدا تعالیٰ نے مصر کے ملک کو ایسا فیض رسان دریا دیا تھا مگر اس پر بھی یہ

نہیں چاہا کہ وہاں کے رہنے والے سست اور کاہل ہو جائیں اور بغیر محنت و مشقت کے ایسی بڑی نعمت کا فائدہ اٹھائیں۔ یہ بات از خود معلوم ہو سکتی ہے کہ دریائے نیل تمام ملک کو سیراب نہیں کر سکتا تھا اس لئے بہت سی محنت اور مشقت زمین کے پانی دینے میں کی جاتی تھی اور بہت سی نہریں ہر جگہ پانی پہنچانے کے لئے کاٹی گئی تھیں۔ جو دیہات دریائے نیل کے کنارے کے پاس اونچی زمینوں پر تھے ان میں نہریں بنائی تھیں اور مناسب وقت پر بہت سے دیہات میں پانی پہنچانے کے لئے کھولی جاتی تھیں۔ جو دیہات کہ بہت دور دراز فاصلہ پر ملک کی سرحد پر تھے ان میں بھی پانی پہنچانے کے لئے نہریں بنی ہوئی تھیں۔ اور اس طرح سے نہایت دور دور کے مقاموں میں بھی نہر سے پانی پہنچتا تھا جب تک کہ دریائے نیل ایک معین حد پر نہ چڑھ جاتا تھا۔ اس وقت تک لوگوں کو پانی لینے اور نالیاں کاٹنے اور دہانوں کے کھولنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ اگر اس سے پہلے پانی لینا شروع ہو جاتا تو بعض زمینوں کو بہت سا پہنچ جاتا اور بعض کھیتوں کو کم پہنچنے کا احتمال ہوتا۔ بموجب ان قاعدوں کے جو ایک کتاب میں لکھے ہوئے تھے اور جس میں سب طرح کے اندازے مقرر تھے' پہلے اوپر کے حصہ ملک مصر میں اور پھر نیچے کے حصہ میں نہروں کا کھولنا شروع ہوتا تھا۔ اس طرح پر پانی کی ایسی احتیاط سے تقسیم ہوتی تھی کہ تمام زمینوں کو بخوبی پہنچ جاتا تھا۔ جن ضلعوں میں کہ دریائے نیل کا پانی از خود پھیلتا تھا وہ اس قدر کثرت سے ہیں اور ایسے نیچے ہیں اور ان میں اس قدر نہریں بنی ہوئی ہیں کہ جس قدر پانی جون اور جولائی اور اگست میں مصر میں پھیلتا تھا یقین ہوتا ہے کہ اس کا دسواں حصہ بھی سمندر تک نہیں جاتا تھا۔ مگر باوجود اس قدر نہروں کے بہت سی زمینیں ایسی بلند ہیں کہ نیل کی طغیانی کا پانی وہاں تک نہ پہنچتا تھا اس لئے پچھ ار کلوں سے ان زمینوں میں پانی پہنچا دیتے تھے۔ ان کلوں کو بیل پھراتے تھے اور پانی نلوں میں جا کر ان اونچی زمینوں میں پہنچتا تھا۔ ڈایوڈورس صاحب کہتے ہیں کہ جب آرکی میڈیز صاحب بطریق سیر کے مصر میں گئے تو انہوں نے لوگوں کے لئے یہ کل ایجاد کی تھی۔

مصر کی زرخیزی کا بیان جو دریائے نیل کے سبب سے ہوتی ہے

دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس کی زمین مصر کی زمین سے زیادہ زرخیز ہو اور وہ صرف دریائے نیل کا باعث ہے اور دریاؤں کا یہ دستور ہے کہ جب ان کی رو زمین پر پھر جاتی ہے

تو وہ ریت دے جاتی ہے یعنی زمین کی مٹی جس کے سبب زمین نم رہتی ہے بہہ جاتی ہے مگر برخلاف اس کے دریائے نیل اپنی رو میں اوپر سے چکنوٹ مٹی بہالاتا ہے اور وہاں چھوڑ جاتا ہے اور زمینوں کو زرخیز کر دیتا ہے اور اس سبب سے اگلی فصل ہونے سے زمین جس قدر کمزور ہو جاتی ہے پھر اتنی ہی زور آور ہو جاتی ہے۔ کاشتکار کو ملک میں ہل چلانے اور زمین توڑنے کی حاجت نہیں پڑتی۔ جب دریائے نیل ہٹ جاتا ہے تو بجز اس کے کہ زمین کے اوپر جو چکنوٹ مٹی رہ گئی ہے اس کو الٹ پلٹ کر نیچے کی ریتلی مٹی سے ملا کر اس کے مزاج کو معتدل اور اس کی قوت کو کمزور کیا جائے اور کچھ کام کرنا نہیں پڑتا۔ اس کے بعد نہایت آرام سے اس میں بیج ڈال دیا جاتا ہے۔ اور اس سبب سے کھیتی کرنے میں کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ دو مہینے میں سب زمینیں پھول پھل کر سبز ہو جاتی ہیں اور کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں اور ان میں کثرت سے اناج پیدا ہوتا ہے۔ مصر والے اکثر نومبر اور اکتوبر میں جبکہ دریائے نیل کا پانی کم ہونے لگتا ہے کھیتی بوتے ہیں اور مارچ واپریل میں فصل تیار ہو جاتی ہے۔ مصر کی زمینیں فصلی اور چو فصلی ہیں۔ یعنی ایک زمین میں ہر سال تین یا چار قسم کی مختلف چیزیں بوئی جاتی ہیں۔ پہلی دفعہ کھیرا کاہو بو کر کاٹ لیتے ہیں اس کے بعد اناج بوتے ہیں اور جب اناج کی فصل تیار ہو کر کٹ لیتی ہے تو مختلف قسموں کی ترکاریاں جو خاص کر مصر میں ہوتی ہیں بوتے ہیں اور جو کہ مصر میں آفتاب بہت تیزی سے نکلتا ہے اور دھوپ کی تپش بہت ہوتی ہے اور مینہ بہت کم برستے ہیں۔ اگر اس ملک میں نہریں اور چشمے بکثرت نہ ہوتے جن سے نالیاں بنا کر کھیتوں اور باغوں میں بخوبی پانی دیا جاتا ہے تو قیاس چاہتا ہے کہ وہاں کی زمینیں جلد خشک ہو جاتیں اور ایسی شدت کی گرمی سے اناج اور ترکاریاں جل جاتیں۔ دریائے نیل سے مویشی کی پرورش میں بھی جو مصر کی دولت کا دوسرا ذریعہ ہے کچھ کم مدد نہیں ہوتی۔ مصر والے اپنے مویشی کو نومبر کے مہینے میں چرنے کو باہر نکال دیتے ہیں اور مارچ تک چراتے ہیں۔ لفظوں میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ان چراگاہوں کی زرخیزی کا بیان ان میں ادا ہو سکے۔ مویشیوں کے ریوڑ کے ریوڑ جو بسبب معتدل اور خوش آئند ہوا کے دن رات باہر رہتے ہیں' تھوڑی ہی مدت میں بہت تازہ اور فربہ ہو جاتے ہیں۔ جن دنوں میں کہ نیل کی طغیانی ہوتی ہے ان دنوں میں مویشی کو کئی اور گھاس اور جو اور بٹر کھلا کر پرورش کرتے ہیں۔

مسٹر کارنیل کی برونئن صاحب اپنی سیاحی کے حال میں لکھتے ہیں کہ مصر کے ملک پر خدا کی بہت بڑی عنایت ہے کہ ایک معین موسم میں ایتھوپیا میں اس قدر مینہ برستا ہے کہ

مصر کو پانی دے کر نہال کر دیتا ہے جہاں بالکل بارش نہیں ہوتی۔ اور اس اپنی عنایت سے ایسی خشک اور ریتلی زمین کو دنیا کا ایک عمدہ زرخیز ملک بنا دیتا ہے۔ ایک اور بات بھی نہایت عمدہ ہے جس کو یہاں کے رہنے والے بیان کرتے ہیں کہ جون میں اور اس کے اگلے چار مہینے میں شمال اور مشرقی ہوائیں چلتی رہتی ہیں تاکہ دریائے نیل کا پانی رُکا رہے اور جلدی سے بہہ کر سمندر میں نہ چلا جائے۔ اگلے لوگوں نے بھی اس قدرتی حکمت کے نکتہ کو بہت غور سے خیال کیا تھا۔

(۲۲۴) مسٹر تھیوی نٹ سے مراد ہے۔ (س م ح)

(۲۲۵) بطلیموس۔ اس شخص کا نام انگریزی مورخ کلاڈیس ٹولیمی اور مسلمان مصنف بطلیموس ابن قادیس لکھتے ہیں۔ یہ اصل میں یونانی تھا اور اسکندریہ میں آ رہا تھا۔ لکھا ہے کہ جب اس نے ذرا ہوش سنبھالا تو مشہور حکیم جالینوس کی شاگردی اختیار کی اور جب علوم حکمیہ میں اچھی دستگاہ ہو گئی تو ریاضیات کی طرف اس کو زیادہ توجہ ہوئی۔ چنانچہ جب یہ اذریانوش کے عہد میں جو "ادریان" قیصر روم کی طرف سے ملک مصر کا حاکم تھا اور جو اس کو بہت عزیز رکھتا تھا اپنے وطن سے اسکندریہ میں آیا تو رات دن ریاضیات ہی کا اس کو شغل تھا۔ یہاں اس نے ستاروں اور افلاک کی گردش وغیرہ دریافت کرنے کے لئے رصد خانہ بنایا اور متقدمین علمائے اہل ہیئت خصوصاً ہپارکس (ابرخس) کے سیاروں اور ثوابت کی فہرستوں کی تصحیح کی اور ایسی جدولیں بنائیں جن سے سورج چاند وغیرہ کی گردش کا حساب لگ سکتا ہے اور یہ پہلا شخص ہے جس نے اصطرلاب وغیرہ آلاتِ رصدی ایجاد کئے اور اگرچہ بعض مؤرخوں کی یہ رائے ہے کہ ہپارکس ان کا موجد ہے لیکن اعمال ریاضی اور آلات رصد جو بالفعل معمول بہ ہیں ان کی تصحیح اور توضیح تو فی الواقع اسی نے کی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی مشہور کتاب مجسطی کے تیسرے مقالہ کی آٹھویں نوع میں خود لکھا ہے۔ "اس کتاب کے برابر اس فن میں آج تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ چنانچہ نامور مسلمان علمائے ہیئت فضل بن یحییٰ تبریزی و محمد بن جابر و ابو ریحان خوارزمی جنہوں نے اس کتاب پر حاشیے اور شرحیں لکھی ہیں جس قدر انہوں نے اس کتاب کے مسائل کی تحقیق و تدقیق کی' اسی قدر بطلیموس کی فضیلت کا اعتراف کیا۔ اس کتاب کے تیرہ مقالوں کا ترجمہ اول چند یونانی علمانے خلیفہ ہارون رشید عباسی کے وزیر یحییٰ بن خالد برمکی کے حکم سے جو ۱۷۰ ہجری مطابق ۷۸۶ عیسوی سے ۱۸۷ ہجری مطابق سن آٹھ سو دو عیسوی تک وزیر رہا تھا' یونانی سے عربی زبان میں کیا تھا۔ لیکن وہ اس کو پسند نہ آیا اور

اس نے ابو حیان اور ایک اور عالم کو اس کے دوبارہ ترجمہ کرنے کا حکم دیا جنہوں نے نہایت عمدگی سے اس کام کو انجام دیا اور حجاج بن مطر ثابت بن قرہ اور اسحاق نے اس کے الفاظ کی اصلاح کی اور قریب ۱۲۳۰ء کے اسی عربی ترجمہ سے یہ کتاب زبان لیٹن میں ترجمہ ہوئی۔ بطلیموس نے اس فن میں ایک اور رسالہ بھی اپنے شاگرد سئوری کے واسطے لکھا تھا جس کا ترجمہ ابراہیم بن صلت نے عربی میں کیا اور حنین بن اسحاق نے اس کی اصلاح کی۔ غرض بطلیموس متقدمین ہیئت دانوں کا بادشاہ خیال کیا جاتا ہے جو اس علم کو مکمل کر کے ہمارے لئے چھوڑ گیا۔ اس کے نظام مقررہ کو نظام بطلیموسی کہتے ہیں جس کا بڑا اصول یہ ہے کہ زمین مرکز عالم ہے اور تمام ستارے اور افلاک اس کے گرد حرکت کرتے ہیں مخلاف نظام مسلمہ حال کے جو نظام فیثاغورسی کہلاتا ہے جس میں آفتاب کو مرکز عالم قرار دیا گیا ہے اور بطلیموس نے مارینس باشندہ شہر ٹائر کے اصولوں کی بنیاد پر فن جغرافیہ میں بھی ایک کتاب لکھی تھی جس کا کندی نے عربی میں ترجمہ کیا اور لیٹن میں بھی اس کا ترجمہ ہوا جو اب موجود ہے۔ طول شرقی اور خط شمالی اسی نے قائم کئے اگرچہ اس کا یہ کام مکمل نہیں سمجھا جاتا مگر تاہم نئے جغرافیہ بنانے والوں کے لئے بڑا مفید ہے اور متن میں بطلیموس کی اسی کتاب کی طرف اشارہ ہے۔ یہ علم موسیقی کا بھی بڑا ماہر تھا اور اس کی ایک نہایت عمدہ کتاب تین جلدوں میں اس فن میں بھی موجود ہے۔ اس کی وفات اٹھتر برس کی عمر میں ۲۰۹ عیسوی میں واقع ہوئی۔ (ماخوذ از ناسخ التواریخ و انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا) (س م ح)

(۲۳۶) کسی مصنف کی کوئی ایسی رائے جو کسی قوم یا فرقہ کے مذہبی خیالات کے مخالف ہو اس قوم یا فرقہ کے لوگوں کو اکثر ناگوار ہوا کرتی ہے۔ خصوصاً جبکہ الفاظ بھی کسی قدر سخت ہوں۔ پس اس کتاب کی اس فصل کے ترجمہ کرنے میں اگرچہ مؤرخ کی رائے پر تو ہمارا اختیار نہ تھا کہ اس کو بدل دیا جاتا مگر ہاں بلا اندیشۂ فوتِ مطلب جس جگہ ترجمہ میں کوئی ملائم لفظ اختیار کیا جا سکتا تھا پاسِ خاطر اپنے ہموطنوں کے وہاں ایسا کیا گیا ہے بلکہ بعض لفظ چھوڑ بھی دیئے گئے ہیں۔ امید ہے کہ ناظرینِ دقت پسند ہماری اس فروگزاشت کو معاف فرمائیں گے۔

(السید محمد حسین)

(۲۳۷) گے سینڈی ملک فرانس کے نامی حکما میں گنا جاتا ہے۔ یہ ۱۵۹۲ عیسوی میں پیدا ہوا تھا اور سن سولہ سو پچپن میں مرا۔ یہ ابتداء عمر ہی سے علوم ریاضی کی طرف مائل تھا چنانچہ سولہ برس کے سن میں تحصیل علم سے فارغ ہوا اور اٹھارہ برس کی عمر میں بمقام "ای" علم

الادیان اور فلسفہ کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اسی زمانہ میں اسے ارسطو کی تردید میں ایک کتاب لکھ کر چھپوائی جس کے باعث یہ تمام یورپ میں مشہور ہو گیا۔ سن سولہ سو اٹھائیس عیسوی میں یہ جب ملک ہالینڈ سے اپنے ملک میں واپس آیا تو علم ہیئت کی طرف زیادہ متوجہ ہوا اور سنہ سولہ سو اکتیس میں عطارد کے آفتاب کے سامنے سے گزرنے کی خبر دی جس کو انگریزی میں ٹرین زٹ اور عرب ہیئت داں لوگوں کی اصطلاح میں قران یا مروز کہتے ہیں۔ (ماخوذ از کتاب روضۃ الحکماء) (س م ح)

(۲۳۸) رابرول ایک فرانسیسی عالم تھا اور ریاضیات اور خصوص ہندسہ میں بہت بڑی دستگاہ رکھتا تھا مگر علما اور حکما کے طریق کے بر خلاف مخل اور خود غرضی سے ان مسائل کو جو اس نے اپنے زور طبیعت سے نکالے تھے اور لوگوں کو کم بتاتا تھا۔ (ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا)

(س م ح)

(۲۳۹) ہندوستان کی تاریخ میں یہ واقعہ بھی قابل یاد رکھنے کے ہے کہ ۱۵۶۷ء مطابق ۹۷۴ ہجری میں جو شہنشاہ اکبر لاہور سے دہلی کی طرف آتا ہوا تھانیسر میں ٹھہرا تو اتفاق سے وہاں سورج گہن کے ''نہان کا میلہ'' تھا۔ پس کسی بات پر تکرار ہو کر سنیاسیوں اور جوگیوں میں جھگڑا اٹھا اور دونوں بادشاہ کے پاس فریادی آئے اور درخواست کی کہ ہم کو تلوار سے لڑ کر آپس میں فیصلہ کر لینے کی اجازت ملے۔ بادشاہ نے اوّل تو بہت سمجھایا مگر جب انہوں نے نہ مانا تو یہ عجیب فیصلہ کیا کہ لڑنے کی اجازت دے دی اور حکم دیا کہ سنیاسی جو جوگیوں سے تعداد میں کم یعنی قریب تین سو کے تھے اور جوگی پانچ سو تھے' ہمارے سپاہی ان میں شامل ہو کر جوگیوں سے لڑیں۔ پس بادشاہی سپاہی بھی بھبوت مل کر سنیاسیوں کے ساتھ میدان میں آ کودے اور بادشاہ کی آنکھ کے سامنے خوب لڑائی ہوئی اور حضرت شہنشاہ بڑے لطف سے بیٹھے تماشا دیکھا کئے۔ آخر کار جوگیوں کا ناس کر کے سنیاسی غالب آئے اور اس کے بعد بادشاہ نے انتظام کر دیا کہ یہ کچھ اور زیادہ فساد نہ کرنے پائیں۔ یہ روایت بدایونی کی ہے مگر ابوالفضل نے لکھا ہے کہ پُری اور گری جو دونوں سنیاسیوں ہی کے فرقے ہیں ان میں اس بات پر جھگڑا ہو گیا کہ میلے میں تیرتھ کے کنارے ''پُریوں'' کے بیٹھنے کی جو جگہ تھی اور جہاں خوب چڑھاوا چڑھتا تھا وہ گریوں نے چھین لی تھی۔ (س م ح)

(۲۴۰) ہندو راجہ اور بڑے بڑے امیر سورج گہن کے موقع پر اکثر ہاتھی کا دان ایک قسم کے برہمنوں کو جو معمولی برہمنوں سے ذات میں کم سمجھے جاتے ہیں اور جن کو ہمارے ملک

"ایں روئے ستلج" میں ڈکوت یا مہا برہمن یا گجراتی یا اچارج کہتے ہیں ذیا کرتے ہیں۔
پس غالب ہے کہ بادشاہ کی طرف سے یہ ہاتھی اور پوشاک برہموں کو بطور دان دیا جاتا ہوگا۔
اور یہ بات کچھ تعجب کی نہیں ہے کیونکہ سلاطین مغلیہ نے ہندوؤں کی تالیف قلوب کے لئے
ان کی بعض رسمیں اختیار کرلی تھیں جو اکبر کے عہد سے لے کر اس سلسلہ کے اختتام تک
سب بادشاہ ان کو بجالاتے تھے مثلاً تل دان یعنی سال شمسی اور قمری کے حساب سے جب
بادشاہ کی عمر کا کوئی سال شروع ہوتا تو بادشاہ کو سونے اور چاندی کے ساتھ تولا جاتا تھا اور
وہ سب سونا اور چاندی مستحقین کو بطور خیرات دیا جاتا تھا اور اس موقع پر ایک بڑا جشن کیا
جاتا تھا۔ (س م ح)

(۲۴۱) ہمن جوپیٹر کا ایک دوسرا نام ہے جو قدیم بت پرست یونانیوں اور رومیوں کا سب
سے بڑا دیوتا تھا۔ یہ مندر جس کا ذکر متن میں ہے لیبیا کے (افریقہ کا ایک قدیم نام ہے) اس
ضلع میں تھا جس کا ہمارے زمانہ میں شہر برقہ دار الحکومت ہے۔ جہاں یہ مندر بنا ہوا تھا اس
سے کسی قدر فاصلہ پر اب صیوہ نامی ایک گاؤں آباد ہے جو برقہ اور قاہرہ کے مابین قاہرہ سے
مغرب کی طرف تخمیناً تین سو بیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ رومیوں کی سلطنت کے زمانہ میں
یہ بے حد و شمار جواہرات اور سونے چاندی سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن ان کی سلطنت کے زوال کے
بعد ان لوگوں نے جو وندل کے نام سے مشہور تھے اس کو لوٹ کر برباد کر دیا۔ جس ضلع میں یہ
مندر بنا ہوا تھا اس کے چاروں طرف کی زمین بالکل بیابان تھی جس میں نہ گھاس تھا اور نہ
پانی۔ مگر اس مندر کے آس پاس کی زمین نہایت سرسبز اور شاداب تھی۔ اور اس بیابان میں
صرف وہی ایک قطعہ تھا جہاں اوس پڑتی تھی۔ مشہور رومی مؤرخ ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ اس
مندر کے نزدیک ایک ایسا چشمہ تھا جس کا پانی صبح کو گرم اور دوپہر سے ذرا پہلے ٹھنڈا اور ٹھیک
دوپہر کو نہایت سرد ہوتا تھا جس کی خنکی دن کے گھٹنے کے ساتھ گھٹتی جاتی تھی۔ یہاں تک
کہ شام ہونے تک گرم ہو کر رفتہ رفتہ آدھی رات کو کھولنے لگتا تھا۔ ۱۷۹۲ عیسوی میں
برونی نامی ایک سیاح نے اس مندر کا مقام دریافت کیا اور سن سترہ سو اٹھانوے میں ہوارنی مین
نامی ایک دوسرے سیاح نے اس چشمہ کو معلوم کیا۔ اور ان کے بعد سن اٹھارہ سو میں ایک اور
سیاح نے جس کا نام بلزونی تھا اس مقام کو دیکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ چشمہ کھجوروں کے ایک
خوشنما جنگل کے درمیان واقع ہے اور چونکہ اس کے پاس تھرمامیٹر نہ تھا اس لئے اس نے
اس کے پانی کی نسبت قیاساً یہ لکھا ہے کہ اس کی گرمی صبح کو اسی، دوپہر کو چالیس، شام کو

ساٹھ اور آدھی رات کو سو در بجے ہو جاتی ہے (ماخوذ از جام جم انسائیکلو پیڈیا بریٹینکا)

(س م ح)

(۲۴۲) مصنف کی مراد اس عبارت سے وہ بیہودہ ناچ معلوم ہوتا ہے جو اب تک بھی بنگالہ میں مروج ہے اور نوجوان بنگالی اپنے عیش و عشرت کے بے تکلفانہ جلسوں میں رنڈیوں کو برہنگی مطلق کی حالت میں نچاکر خوش ہوتے ہیں اور اس قسم کے ناچ کو ان کی زبان میں کھیمٹا کا ناچ کہتے ہیں۔ بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۰۳ء میں جب وہ صوبہ جہاں یہ مندر ہے سرکار انگریزی کے ہاتھ آیا تو اس وقت تین سو ناچنے والی عورتیں مندر کی ملازم تھیں جو گورنمنٹ کے حکم سے موقوف کی گئیں اور مندر کی آمدنی خزانہ سرکار میں داخل ہوتی تھی اور اس کے وصول کے لئے ایک عہدہ دار مقرر تھا مگر کچھ زمانہ بعد پادریوں نے جو مندر کے چڑھاوے کی آمدنی کا لینا اپنی عیسائی سرکار کے لئے حرام جانتے تھے حکام سرکاری کے ساتھ جھگڑا کر کے خزانہ سرکار میں اس کا آنا موقوف کرا دیا اور اس طرح پر یہ آمدنی خالص حق پجاریوں کا ہو گیا۔ (س م ح)

اس کتاب کے انگریزی مترجم مسٹر اورنگ براک صاحب نے اس موقع پر ڈاکٹر کلاڈیئس بکانن صاحب کی کتاب "یادداشت" سے ایک حاشیہ لکھا ہے جس کو مناسبت مقام کے سبب سے ترجمہ کر کے اس جگہ نقل کیا جاتا ہے۔

قولہ: ڈاکٹر کلاڈیئس بکانن صاحب (جنہوں نے سن اٹھارہ سو چھ میں ملک اوڑیسہ کے دورہ کرنے کے موقع پر مندر جگن ناتھ کی نسبت اپنی کتاب "یادداشت" میں بعض حالات تحریر کئے ہیں) یوں لکھتے ہیں کہ آج بتاریخ ۳۰ مئی ۱۸۰۶ء ہم مقام بھدریک مقیم ہیں اور اگرچہ جگن ناتھ اب بھی پچاس میل سے زیادہ فاصلہ پر ہم سے ہے لیکن ہم کئی دن سے برابر انسانوں کی ہڈیاں شاہراہ پر پڑی ہوئی دیکھتے آتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم جگن ناتھ کے قریب پہنچتے جاتے ہیں۔ اس مقام پر قریب دو ہزار کے یاتری ہم کو آ ملے ہیں جو ہندوستان کے اضلاع شمالی کے مختلف مقامات سے آئے ہیں۔"

چنانچہ بعض ان میں سے یوں کہتے ہیں کہ ہم کو اپنا گھر چھوڑے دو مہینے ہوئے اور باوجودیکہ آج کل موسم سخت گرمی کا ہے مگر اس پر بھی یہ لوگ صرف تنہا نہیں بلکہ مع عیال واطفال آئے ہیں۔ یہ یاتری لوگ بہت سے راستہ ہی میں مر جاتے ہیں اور ان کی لاشوں یا

ہڈیوں کو کوئی دفن تک نہیں کرتا اور اسی طرح شاہراہ پر پڑی رہتی ہیں۔ چنانچہ اس منزل پر جہاں ہم مقیم ہیں ندی کے کنارے جو یاتریوں کے اترنے کے لئے ایک سرائے بنی ہوئی ہے' کوئی قریب سو کھوپڑیوں کے ہم نے پڑی دیکھیں۔ آج ہم کو ایک ایسا خوش اعتقاد یاتری ملا جو ہر قدم پر پوری ڈنڈوت کرتا اور گویا اپنے جسم سے جگن ناتھ کا راستہ ناپتا جاتا تھا اور اپنی دانست میں دیوتا کے خوش کرنے کے واسطے اس طریق کو نہایت عمدہ سمجھ کر بجا لا رہا تھا۔ پھر وہ چودھویں جون سن اٹھارہ سوچھ کو خاص جگن ناتھ سے یوں لکھتے ہیں" کہ میں نے جگن ناتھ کو دیکھا کوئی کتاب تاریخ اس "دار الفنا" اور "وادی موت" کا ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کر سکتی۔ البتہ اس کے مشابہ وادیٔ ہنم {ملک شام میں بیت المقدس کے قریب ایک جگہ کا نام ہے جہاں ایام سلف میں مولک نامی ایک بت ایستادہ تھا اور اس پر اکثر لوگ اپنی اولاد کو قربانی کرتے تھے۔ (س م ح)} ہو تو ہو' جیسا کہ مولک کی مورت پر شہر کنعان میں اگلے وقتوں میں انسان کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں ویسا ہی اگر جگن ناتھ کی مورت کو اس زمانہ کا "مولک" کہا جائے تو کچھ ناواجب نہیں ہے۔ کیونکہ جگن ناتھ کے آگے اپنے تئیں بلی دان اور قربانی کرنے والے لوگ بھی نہ تو "مولک" کی قربانیوں سے تعداد ہی میں کم ہیں اور نہ اس بڑے طور پر جان کھونے ہی میں۔ جگن ناتھ کے ساتھ اس کے بھائی اور بہن بلرام اور سوبھدرا کے نام سے دو اور مورتیں بھی ہیں اور تینوں کی پوجا ہوتی ہے اور تقریباً تینوں کی "مانتا" ایک ہی سی ہے۔ کیونکہ تینوں کے سنگھاسن بلندی میں قریباً برابر ہیں۔ آج صبح کو میں مندر کے دیکھنے کو گیا۔ نہایت وسیع اور عالی شان عمارت ہے اور فی الواقع لائق شان اور منزلت ایسے ہی ہولناک بادشاہ کے ہے اور جیسا کہ سب مندروں میں اس مندر کے دیوتا کے حالات اور خیالات اور معتقدات کی مناسبت سے اس شکل کی مورتیں وغیرہ بنا کر قائم کی جاتی ہیں ویسا ہی اس مندر میں وہ سب ناشائستگی اور عیوب کی بے شمار اور مختلف مورتیں موجود ہیں جو خاص اس کی پوجا کے طریق کا لب لباب ہیں۔ چنانچہ مندر کی دیواروں اور دروازوں کے تختوں پر ایسی خلافِ تہذیب شکل کی مورتیں جن کو دیکھ کر شرم آتی ہے' بھاری بھاری اور پائیدار پتھروں سے تراشی ہوئی کھڑی ہیں۔ میں سمندر کے کنارے کی ریتی کو بھی دیکھنے گیا تھا' وہاں بھی بعض مقامات یاتریوں کی ہڈیوں سے بالکل سفید نظر آتے تھے۔ شہر کے نزدیک میں نے ایک اور جگہ' جس کو انگریز "گلگوتھا" کہتے ہیں دیکھی' جہاں یاتریوں کی لاشیں یونہی پھینک دی جاتی ہیں اور کتے اور گدھ وغیرہ وہاں ہمیشہ جمع رہتے ہیں۔

میں جیمس ہنٹر صاحب کے مکان میں جو سرکار آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے جگن ناتھ کے مندر کے منتظم اور یاتریوں سے سرکاری محصول کے وصول کے ذمہ دار ہیں اترا ہوا ہوں جو سمندر کے کنارے مندر سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ صاحب شہر کے قریب اس واسطے نہیں رہتے کہ وہاں متعفن لاشوں کے باعث نہایت بدبو آتی ہے اور ان لوگوں کے گوناگوں توہمات کے مشاہدہ سے قطع نظر 'شہر میں اور بھی بہت سی ایسی ناز یبا باتیں دیکھنے میں آتی ہیں جن سے آدمی کے حواس پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً فاقوں کے مارے ہوئے ہزاروں یاتری نیم مردہ اور بھوت کی سی ڈراوئی صورت کے ساتھ شہر میں دیکھے جاتے ہیں۔ جن میں سے اکثر بھوک اور بیماریوں کے مارے شہر کے گلی کوچوں ہی میں مر جاتے ہیں یا یہ کہ اکثر وہ لوگ جو بڑے بھگت اور خوش عقیدہ ہوتے ہیں بالوں کے جوڑے باندھے اور بدن کو کئی طرح کے رنگ لگائے اور اپنی جان کو طرح طرح کے عذاب دیئے ہوئے جس کو وہ عبادت سمجھتے ہیں' نظر آتے ہیں۔ اس کے سوا عورتیں اور مرد بغیر کسی قسم کے ستر اور حجاب کے شہر کے قریب رہتے ہیں قضائے حاجت کے لئے برابر بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ جن کے فضلہ کو سانڈ' جن کو یہ لوگ مقدس سمجھ کر چھوڑ رکھتے ہیں' بے تکلف آکر چٹ کر تے ہیں۔ پھر صاحب موصوف اٹھارویں جون سن اٹھارہ سو چھ عیسوی کو جگن ناتھ ہی سے یوں لکھتے ہیں کہ :''میں ابھی ایک تماشا دیکھ کر جس کو عمر بھر نہ بھولوں گا اپنے مکان پر آیا ہوں۔ آج اس دیوتا کا ایک بڑا دن ہے۔ چنانچہ دوپہر کے وقت ہندو جگن ناتھ کی مورت کو مندر سے باہر لائے اس وقت لاکھوں یاتری اور عقیدت مند لوگ اپنے جے جے کار سے نہایت شور و غل کرتے ہوئے ساتھ تھے اور جب مورت کو سنگھاسن پر بٹھایا اس وقت تو ایسا غل پڑا کہ میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ پھر تھوڑی سی خاموشی کے بعد دور سے کچھ شور سا سنائی دیا۔ اور تمام خلقت کی آنکھیں اس طرف کو اٹھ گئیں اور میں نے دیکھا کہ درختوں کا ایک جھنڈ سا چلا آتا ہے ذرا قریب آنے پر معلوم ہوا کہ بہت سے آدمیوں کا ایک غول بڑی جلدی سے چلا آتا ہے اور ہر ایک کے ہاتھ میں کھجور یا کسی اور درخت کی سبز ٹہنی ہے۔ اس غول کے لئے خلقت نے راستہ چھوڑ دیا اور جب وہ جگن ناتھ کے سنگھاسن کے سامنے جس پر مورت رکھی ہوئی تھی پہنچے تو زمین پر سرتاپا گر کر ڈنڈوت اور پوجا بجالائے۔ اس وقت جگن ناتھ کا سنگھاسن ایک بہت اونچے رتھ پر رکھا گیا جو مثل ایک برج کے ساٹھ فٹ بلند تھا اور جس کے پہیے بوجھ کے مارے زمین میں دھنسے جاتے تھے۔ اس رتھ میں جہاز کی سی بھاری اور لمبی لمبی چھ زنجیریں لگی

ہوئی تھیں اور ہزاروں مرد عورت اور بچے ان کو کھینچتے تھے اور اس قدر اژدھام تھا کہ بعض لوگ صرف ایک ہی ہاتھ لگا سکتے تھے۔ہنوں سے اس زنجیر کے کھچوانے کی یہ وجہ تھی کہ ایسے دیوتا کی زنجیر کو کھینچنا ایک بڑے دھرم کی بات سمجھی جاتی ہے۔ رتھ کے اوپر سنگھاسن کے پاس برہمن اور پجاری لوگ کھڑے تھے اور میں نے سنا کہ شاید ایک سو بیس پوجاری رتھ پر موجود تھے۔ جگن ناتھ کی مورت ایک لکڑی کا بنا ہوا قالب ہے (جسے ہندو کلے ور کہتے ہیں) اس کا چہرہ کالا رنگا ہوا اور نہایت مہیب ہے اور منہ بڑا سا اور کھلا ہوا لال رنگ سے بھرا ہوا ہے۔بازو سونے کے ہیں اور پوشاک نہایت مکلّف اور نفیس پہنائی ہوئی ہے اور وہ دونوں مورتیں جو اس کے ساتھ ہیں ایک کا رنگ سفید اور دوسری کا زرد ہے۔پانچ ہاتھی جن کے اوپر بڑی اونچی اونچی جھنڈیاں بھی تھیں اس تین گنبد والے رتھ کے آگے آگے چلتے تھے ان ہاتھیوں پر لال رنگ کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں اور دونوں جانب معمولی گھنٹے بھی لٹکتے تھے۔ میں بھی اس جلوس میں جا شامل ہوا بلکہ خاص رتھ کے قریب پہنچ گیا۔ جس کو بہت سے لوگ بمشکل تمام کھینچتے تھے۔ اور اس کے پہیے جو بہت سے تھے ان میں سے گرج کی سی آواز نکلتی تھی۔ چند لمحہ بعد رتھ رک گیا اور پوجا شروع ہوئی یعنی مندر کے بڑے پوجاری نے رتھ پر چڑھ کر اور مورت کے سامنے آ کر چند فحش گیت گائے اور بیان کیا کہ جگن ناتھ جی کو ایسے گیت بہت پسند ہیں اور جب ان گیتوں سے خوش ہوتے ہیں تب ہی ان کا رتھ چلتا ہے۔ چنانچہ ان گیتوں کے گانے کے بعد رتھ ذرا سا آگے بڑھ کر پھر کھڑا ہو گیا۔ تب ایک لڑکا جس کی عمر کوئی بارہ برس کی ہو گی سامنے کیا گیا اس نے اس پجاری سے بھی بڑھ کر چند قابل شرم گیت اس امید سے گانے شروع کئے کہ شاید ان کا دیوتا قدم آگے بڑھائے اس لڑکے نے دیوتا کی تعریف اور "استت" بڑی دلربا آواز سے کی اور گیت کے مضامین کو جسمانی حرکات یعنی بتانے سے بھی ادا کیا کہ جس سے دیوتا خوش ہو گیا اور لوگوں نے ایک مصنوعی خوشی کا شور کر کے رتھ کو ذرا آگے بڑھا دیا مگر چند لمحہ بعد رتھ پھر ٹھہر گیا۔ پھر اس دیوتا کے ایک بڈھے پجاری نے کھڑے ہو کر اور اپنے ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی لے کر اور اس کو تھوڑے عرصہ تک ناشائستہ طور پر ہلا ہلا کر اس مکروہ تماشے کو ختم کیا۔

واضح ہو کہ جگن ناتھ کی پوجا جس کو میں ہندوستان کا مولک کہتا ہوں' فحش اور خوں ریزی دو باتوں سے مرکب ہے۔ چنانچہ فحش کا ذکر تو ہو چکا اب خوں ریزی کا بیان سنیے! جب رتھ تھوڑی دور اور آگے بڑھا تو ایک یاتری بولا کہ میں جگن ناتھ جی پر اپنی جان

قربان کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ اس نے چلتے ہوئے رتھ کے پہیوں کے آگے اپنے تیئں ہاتھ پھیلا کر منہ کے بل زمین پر ڈال دیا۔ اس وقت اژدھام خلائق نے اس کے لئے جگہ چھوڑ دی اور رتھ کے پہیوں سے وہ کچل کر مر گیا۔ اس حرکت پر یاتریوں کے اژدھام نے مورت کی طرف دھیان کر کے بڑے زور سے جے جے کار کی صدا بلند کی۔ کیونکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب اس طرح سے دیوتا کو خون چڑھایا جاتا ہے تو دیوتا مسکراتا ہے۔ پھر ان لوگوں نے اس یاتری کی لاش پر بمرادِ اظہار استحسان اس کے اس فعل کے کوڑیاں پھینکنی شروع کیں۔ پھر بیسویں جون سن اٹھارہ سو چھ کو اسی مقام سے صاحب موصوف یہ لکھتے ہیں کہ "یہ ہولناک رسمیں ابھی بدستور جاری ہیں۔ چنانچہ کل پھر ایک عورت نے اپنے تیئں قربانی کیا۔ مگر وہ رتھ کے نیچے چونکہ سیدھی نہیں پڑی تھی اور معمول کے خلاف آڑے طور پر پڑ گئی تھی اس وجہ سے فوراً ہلاک نہ ہوئی بلکہ کئی گھنٹوں میں اس کی جان نکلی۔ مگر آج صبح کو جب میں اس مردوں کی کھوپڑیوں والی جگہ سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ اس عورت کی لاش میں بجز ہڈیوں کے اسوقت اور کچھ باقی نہ رہا تھا"۔ پھر اکیسویں جون سن اٹھارہ سو چھ عیسوی کو یوں لکھتے ہیں کہ "ابھی رتھ یاترا کے تماشے بدستور جاری ہیں لیکن ایسے افعال اور بے رحمیوں کو دیکھتے دیکھتے میں اس قدر تنگ آ گیا ہوں کہ اب دل یہی چاہتا ہے کہ یہاں سے جلد بھاگ چلئے! آج صبح کو اس مقام پر جہاں مردوں کو پھینکا جاتا ہے میں نے ایک اور بھی زیادہ دردانگیز واقعہ دیکھا کہ ایک عورت جو مردہ یا قریب المرگ پڑی ہوئی تھی اس کی لاش کو کتے اور گدھ چمٹے ہوئے تھے۔ اس کے دو بچے اس کی لاش کی طرف حسرت تک رہے تھے۔ اور یاتری لوگ جو اس طرف ہو کر جاتے تھے ان بچوں کی حالت پر کوئی بھی اصلاً ملتفت نہ ہوتا تھا۔ میں نے ان بچوں سے دریافت کیا کہ تمہارا گھر کہاں ہے؟! انہوں نے کہا کہ جہاں ہماری ماں ہے وہیں ہمارا وطن ہے! افسوس کہ اس جگہ میں رحم نام کو بھی نہیں ہے۔ اس وقت یاتری لوگ یہاں اس قدر جمع ہوئے ہیں کہ ان کی تعداد کا اندازہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ خاص تہواروں پر جس قدر یاتری جمع ہوتے ہیں ان کی تعداد کی نسبت یہاں کے لوگ ذکر کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں کہ اگر بالفرض میلے میں سے ایک لاکھ آدمی چلا جائے تو کثرت خلائق میں کچھ کمی محسوس نہیں ہو سکتی۔ میں نے ایک برہمن سے پوچھا کہ بڑے سے بڑے میلے پر تمہاری دانست میں کس قدر یاتری آتے ہوں گے تو اس نے یہ جواب دیا کہ میں کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ مٹھی بھر ریت میں کتنے ذرے ہوتے ہیں۔

انگلستان میں انگریزوں کو اس بات پر یقین نہیں آنے کا کہ یہ سب خونریزیاں جو جگن ناتھ میں ہوتی ہیں' آیا کلکتہ میں حکامِ انگریزی کو بھی معلوم ہیں یا نہیں۔ لیکن افسوس کہ گورنمنٹ ہاؤس کے دروازے کے آگے اور سپریم گورنمنٹ کی نظروں کے سامنے یہ سب باتیں ہوتی ہیں۔ خاص بنگالے میں بھی جو ایک خوشنما اور ایسا سرسبز اور شاداب ملک ہے جس کو دنیا کا باغ کہا جاتا ہے' اس ہندوستان کے "مولک" کے کئی مندر ہیں۔ چنانچہ ایشٹرا... ؟... (ایشٹرا کی وضاحت کے لئے دیکھئے ذیل میں حاشیہ نمبر ۲۴۳)... جو کلکتہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر گنگا کے کنارے ایک خوشنما گاؤں ہے (اور جہاں پہلے وارن ہیسٹنگز صاحب گورنر جنرل ہندرہا کرتے تھے اور اب بھی گورنر جنرل حال کے باغ... ؟... (دیکھئے ذیل کا حاشیہ نمبر ۲۴۴) سے یہ جگہ سامنے نظر آتی ہے۔) خاص اس کے متصل ہی جگن ناتھ کا مندر موجود ہے۔ جہاں اکثر انسان کی قربانی کا خون بت کو چڑھایا جاتا ہے۔ چنانچہ ماہ مئی ۱۸۰۷ عیسوی جبکہ ڈاکٹر بکانن صاحب رتھ یاترا کے میلے پر اس جگہ موجود تھے ایک بہت خوبصورت اور تازہ توانا نوجوان شخص نے کہ جس کے لمبے لمبے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے اور گلے میں پھولوں کا ہار پہنے ہوئے تھا یہ حرکت کی کہ اچھلتا کودتا آیا اور رتھ کے سامنے تھوڑی دیر تک اوّل تو بہت ذوق و شوق سے ناچتا اور گاتا رہا اور پھر یکایک اس کے پہیوں کے نیچے جا گھسا اور اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا۔

(س م ح)

(۲۴۳) شاید یہ لفظ دراصل چترا ہے۔ جس کو بنگالی چھترا کہتے ہیں کیونکہ ایشٹرا کا نام ہندوستان کے نقشوں میں کلکتہ کے نزدیک کہیں نہیں ملتا۔ اور وہ باغ شاید بارک پور المعروف "اچانک" سے مراد ہے۔ (س م ح)

(۲۴۴) اصل کتاب میں لفظ "کنٹری ہاؤس" ہے۔ شہروں کے رہنے والے ذی مقدور یوروپین لوگوں میں رسم ہے کہ ایسے مکان مع باغ بیرونجات میں اس مدعا سے بنا رکھتے ہیں کہ جب کبھی شہر میں رہتے رہتے طبیعت دق ہو جاتی ہے تو تفریحِ خاطر اور تبدیلِ آب و ہوا کے لئے وہاں جا رہتے ہیں۔ (س م ح)

(۲۴۵) ستی کی رسم ہندوستان میں بہت عرصہ سے تھی اور چونکہ منو سمرتی میں باوجودیکہ بیوہ عورتوں کے وفادارانہ چلن وغیرہ کا ذکر آیا ہے' ستی کی نسبت کچھ اشارہ پایا نہیں جاتا۔ اس لئے انگریز مؤرخ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ یہ رسم منوجی کے زمانہ سے پیچھے جاری ہوئی

تھی اور چونکہ یجر وید کی تالیف وترتیب کا زمانہ سن چودہ سو قبل مسیح انہوں نے ثابت کیا ہے اس لئے منو سمرتی کا تقریباً نو سو برس قبل سن مسیحی مرتب ہونا قرار دیتے ہیں۔ بہر حال دو ہزار برس سے زیادہ عرصہ سے ہندوؤں میں اس رسم کا ہونا یقینی معلوم ہوتا ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے اس کے امتناع کی نسبت کچھ توجہ نہیں کی اور ایک بے پروائی سے کبھی کبھی اس کی مزاحمت کی۔ (س م ح)

(۲۴۶) مشہور و معروف سیاح شیخ ابو عبداللہ محمد ابن عبداللہ افریقی معروف بہ ابن بطوطہ جو ۷۴۳ ہجری میں محمد شاہ تغلق کے زمانہ میں ہندوستان میں آیا تھا اپنے سیاحت نامہ میں جو عربی زبان میں ہے اور جس کی ایک نقل خوش قسمتی سے ہمارے کتب خانہ میں بھی موجود ہے لکھتا ہے کہ جب کبھی ستی کا کوئی واقعہ سلطان ہند کی قلمرو میں ہوتا ہے تو اول سلطان سے اجازت حاصل کی جاتی ہے اور اس کے بعد عورت ستی ہوتی ہے اور پھر ایک اپنی آنکھوں دیکھے واقعہ کا یوں ذکر کرتا ہے کہ "میں ملک سندھ ہی میں تھا کہ ایک شہر کے قریب (جس کا نام اس نے ابہری لکھا ہے) قزاقوں نے جو نزدیک ہی کے رہنے والے تھے اور سلطان کی حکومت نہیں مانتے تھے چند مسافروں کو لوٹ لیا اور حاکم شہر کے ہمراہیوں میں سے جو مسلمان تھا اور اس سے لڑنے کو نکلا تھا چند ہندو آدمی مارے گئے تو ان میں سے تین کی عورتوں نے ستی ہونے کا ارادہ کیا۔ جو ہندوؤں کے نزدیک اگرچہ فرض نہیں مگر ثواب کا کام ہے اور جو عورت ستی ہو جاتی ہے وفادار اور اپنے خاندان کے لئے باعث عزت سمجھی جاتی ہے۔ اور جو ستی نہیں ہوتی وہ موٹے جھوٹے کپڑے پہنتی اور بے وفائی کی وجہ سے کنبہ والوں کے نزدیک بد نصیب اور ذلیل خیال کی جاتی ہے۔ اگرچہ ستی ہونے پر مجبور نہیں کی جاتی۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنا ستی ہونا ٹھان لیا تو تین دن تک گانے بجانے اور خوشیاں منانے میں مصروف رہیں گویا دنیا سے رخصت ہوتی ہیں اور ادھر ادھر کی عورتیں ان کی ملاقات کو آتی رہیں۔ چوتھے روز کی صبح کو خوب بناؤ سنگار کر کر اور عطر وغیرہ لگا کر گھوڑوں پر سوار ہوئیں اور دائیں ہاتھ میں ایک ایک ناریل اور بائیں میں ایک ایک آئینہ لیا جن کو اچھالتی اور ان میں اپنا منہ دیکھتے جاتی تھیں اور ہندو آدمی ان سے کہتے جاتے تھے کہ "ہمارے باپ یا ماں یا بھائی یا دوست کو ہمارا سلام کہہ دینا" جس کے جواب میں وہ ہنس کر کہہ دیتی تھیں کہ "اچھا!" میں اپنے ساتھیوں سمیت ان کے ستی ہونے کی کیفیت دیکھنے کو گیا اور کوئی تین میل چل کر ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں بہت سا پانی اور گھنے سایہ کے درخت تھے اور ان میں چار مٹ بنے ہوئے تھے جن

میں پتھر کی ایک ایک مورت تھی اوران مٹوں کے بیچوں بیچ ایک بڑا اور پختہ تالاب تھا
جس پر درختوں نے ایسا گھنا سایہ کیا ہوا کہ دھوپ نہیں پڑ سکتی تھی۔ یہ عورتیں جب ان
مٹوں کے قریب پہنچیں تو تالاب کے پاس جا کر اتر پڑیں اور کپڑے اور گہنا پاتا اتار کر
خیرات کر دیا اور پانی میں غوطہ لگا کر ایک ان سلا موٹا سوتی کپڑا سر سے پاؤں تک اوڑھ لیا!
تالاب کے قریب ہی ایک نشیب زمین میں بہت سی آگ جلائی جا رہی تھی جس پر بھڑ کانے
کے لئے تلوں کا تیل ڈالا جا رہا تھا اور کوئی پندرہ آدمی باریک ایندھن کے مٹھے ہاتھوں میں
لئے کھڑے تھے اور قریباً دس آدمیوں کے پاس بڑی لکڑیاں تھیں۔ اور ڈھول اور سنکھ
بجانے والے لوگ ان عورتوں کے منتظر کھڑے تھے۔ اور اس خیال سے کہ کہیں دیکھ کر ڈر نہ
جائیں لوگوں نے آگ کے سامنے قنات سے پردہ کر رکھا تھا جس کو ہاتھوں سے تھامے ہوئے
تھے۔ القصہ ان میں سے ایک عورت کو میں نے دیکھا کہ جب قنات کے پاس پہنچی تو اس کو
لوگوں کے ہاتھ سے جھٹک کر کھینچ لیا اور ہنس کر بولی کہ "ما را می ترسانی از آطیش (آتش)
من مے دانم کہ او آطیش است رہا کنی مارا"۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ کیا تم مجھ کو آگ سے
ڈراتے ہو میں جانتی ہوں کہ یہ جلا ڈالنے والی آگ ہے۔ پھر اس نے آگ کو سلام کرنے کی
خاطر اپنے دونوں ہاتھ سر پر جوڑے اور اس میں کود پڑی اور معاً نقارے اور سنکھ اور نفیریاں
بجنے لگیں۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں ایندھن تھا وہ انہوں نے اس پر ڈال دیا۔ پھر اور لوگوں
نے لکڑیاں ڈال دیں تاکہ ہل نہ سکے اور بڑا شور و غل ہوا اور یہ سانحہ دیکھ کر میری ایسی حالت
ہوئی کہ اگر میرے ساتھی مجھ کو نہ سنبھالتے اور پانی سے میرا منہ نہ دھوتے تو قریب تھا کہ
میں اپنے گھوڑے سے گر پڑتا"۔ (س م ح)

(۲۴۷) مندرجہ ذیل ضرب المثل سے بھی جو عورتوں کی ہجو کے موقع پر استعمال کی جاتی
ہے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ بعض عورتیں اس طرح بھی ضرور ستی ہوتی تھیں "تریا چلتر
جانے نہ کوئے، خصم مار کے ستی ہوئے"۔ (س م ح)

(۲۴۸) ڈاکٹر برنیئر کے اس خط میں ڈائنا۔ ایگے مم نن اور انجینیا کا ذکر چونکہ قصہ طلب
باتیں ہیں اس لئے انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا اور کتاب جام جم وغیرہ سے ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر اس
جگہ لکھ دینا مناسب معلوم ہوا۔

ڈائنا

ڈائنا قدیم زمانہ کے یونانیوں اور رومیوں کی ایک دیوی تھی جس کو وہ شکار وغیرہ کی

دیوی کہتے تھے۔ اور اس میں مار ڈالنے اور بچا لینے کی دونوں قدرتیں خیال کرتے تھے اور اس مناسبت سے اس کی مورت ایک ایسی سرو قد کنواری اور جوان عورت کی سی بناتے تھے جس کے سر کے بال گردن کے نیچے تک پڑے ہوئے ہوں اور دائیں ہاتھ میں ترکش میں سے تیر نکالتی اور بائیں ہاتھ سے بارہ سنگے کو جو بھاگنا چاہتا ہو' سینگ سے پکڑے ہوئے اور پاؤں تک ایک لمبی پوشاک پہنے ہوئے ہو۔ اور اس خیال سے کہ وہ چاند کی اوتار ہے اس کے ماتھے کو ہلال کی صورت سے سجاتے تھے۔ ایشیا کوچک کے لوگ بھی اس کو پوجتے تھے مگر مثل ہندوستان کی وشنو دیوی کے یونانیوں کے عقیدہ کے برخلاف وہ اس کو صرف مخلوق کے پالنے والی خیال کرتے تھے۔ اور اس لئے اس کی صورت ایک ایسی عورت کی سی بناتے تھے جس کی بہت سی چھاتیاں ہوں اور اس کے پجاری خوجے ہوتے تھے۔ اس کا مندر جو شہر افیسس واقع ایشیائے کوچک میں تھا' لکھا ہے کہ دو سو بیس برس میں بن کر تیار ہوا تھا۔ اور اس مدت میں ایک سو ستائیس بادشاہوں نے اس کی تعمیر کے واسطے روپیہ دیا تھا۔ یہ مندر چار سو پچیس فٹ لمبا اور دو سو پچیس فٹ چوڑا تھا اور سنگ مرمر کے ایک سو ستائیس ستونوں پر جو ساٹھ ساٹھ فٹ اونچے اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو ٹن (ایک ٹن اٹھائیس من انگریزی کا ہوتا ہے) کے وزنی تھے بنایا گیا تھا اور بیس ہزار آدمی اس میں بفراغت بیٹھ سکتے تھے۔ تین سو چھپن برس قبل از سن عیسوی یعنی جس رات کو سکندر اعظم کی ولادت ہوئی اور اراس طرتوس نامی ایک شخص نے اس مجنونانہ خیال سے جلا ڈالا کہ اس حرکت سے اس کا نام دنیا میں باقی رہے گا۔ یہ مندر اگرچہ دوبارہ بھی بنایا گیا مگر ویسا نہ بنا اور پھر اس کو بھی گاتھ قوم کے لوگوں نے (جو پرانے زمانہ میں ملک جرمنی کی ایک مشہور لڑاکا اور وحشی قوم تھی) دو سو چھپن عیسوی میں جلا ڈالا اور اس کے بعد پھر کسی نے اس کو تعمیر نہیں کیا۔ شہر افیسس شہر ازمیر سے جو ایشیا کوچک میں بالفعل سلطنت ترکیہ عثمانیہ کا ایک حاکم نشین مقام ہے' ستائیس میل جنوب کی طرف ہے اور ہمارے زمانہ میں اس کا نام لیازلوک مشہور ہے۔

ایگے ممنن اور افیجینیا

قدیم زمانہ میں بحیرہ شام کے کنارے ایشیائے کوچک میں ترائے ایک نہایت عظیم الشان شہر تھا جس کے گرد نہایت مضبوط پچاس ہاتھ اونچی دیوار جس کا محیط چار میل تھا بنی ہوئی تھی۔ پوڈ کیز ملقب بہ پرائم جب یہاں کا راجہ ہوا تو اس نے اپنے دشمن

یونانیوں کے پاس اپنے بیٹے پیرس نامی کو صلح کا پیام دے کر بھیجا۔ پیرس نے یہ نالائق حرکت کی کہ سپارٹا کے راجا منی لاس کی رانی ہیلن کو بھگا لایا۔ اس پر یونان کے تمام راجاؤں کو نہایت غصہ ہوا اور اس امر کا بدلہ لینے کو ان کی متفقہ فوج جو ایک لاکھ آدمی کے قریب تھی ایک ہزار ایک سو چھیاسی جہازوں پر بندرگاہ آلس سے جو یونان کے صوبہ بوبیا میں ہے' سوار ہوئے اور منی لاس کا بھائی ایگے ممن ان کا سپہ سالار بنا۔ اتفاق سے ایک بارہ سنگا جو ڈائینا کا خاص جانور سمجھا جاتا تھا' ایگے ممن کے ہاتھ سے شکار میں مارا گیا۔ اور اس کے بعد موافق ہوا بند ہو گئی اور جو لوگ جہازوں میں ایک قسم کی وبا سے مرنے لگے جس کو اپنی جہالت سے انہوں نے ڈائینا کی خفگی سے منسوب کیا اور ایگے ممن نے بارہ سنگا مارنے کی ہتیا کا یہ پراچت (یعنی کفارہ) تجویز کیا کہ اپنی بیٹی افجینیا کو ڈائینا پر قربانی چڑھانا چاہا۔ جس وقت قریب تھا کہ وہ قربانی ہو جائے تو ڈائنا نے خوش ہو کر افجینیا کو معاف کر دیا۔ اور اس کے عوض کوئی اور بدنصیب عورت قربانی کی گئی اور یونانی اپنے جہاز ٹرائے کی طرف بڑھالے گئے اور دس برس کے محاصرہ کے بعد ایک فریب سے شہر میں داخل ہو کر باشندوں کو قتل کر ڈالا اور شہر کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ۱۱۸۴ قبل از سن عیسوی وقوع میں آیا تھا۔ (س م ح)

(۲۴۹) سرمد کاشان کا رہنے والا اور قوم کا یہودی تھا مگر مسلمان ہو گیا تھا اور صاحبِ علم اور تجارت پیشہ تھا۔ لکھا ہے کہ جب یہ بتقریب تجارت اپنے وطن ایران سے شہر ٹھٹھہ واقع ملک سندھ میں آیا تو ایک مہاجن کے لڑکے پر جس کا نام ابھے چند تھا' عاشق ہو گیا اور تمام مال و دولت کھو بیٹھا اور دیوانگی کی سی حالت ہو گئی۔ رفتہ رفتہ وہ لڑکا بھی مال و دولت سے ہاتھ اٹھا اسی کے رنگ میں مل گیا۔ اور شاہ جہاں کے عہد میں دونوں بالاتفاق دہلی میں آئے۔ اس وقت کے اکثر لوگ اس کو بڑا خدا رسیدہ اور عارف مؤحد اور صاحبِ کشف سمجھتے تھے۔ چونکہ دارا شکوہ بھی جو فقیر دوست تھا اکثر سرمد کے پاس آتا جاتا۔ اور بادشاہ سے اس کے کشف و کرامات کے تذکرے کرتا رہتا تھا۔ اس لئے شاہجہاں نے عنایت خاں نامی ایک امیر کو اس کے تفحص حال کے واسطے مامور کیا اور اس نے سرمد کو دیکھ بھال کر بطور عرض حال یہ شعر پڑھا۔

بر سرمد برہنہ کرامات تہمت است
کشفے کہ ظاہر است ازو کشف عورت است

جب شاہجہاں کو اورنگ زیب نے قید کر لیا۔ اور داراشکوہ گرفتار ہو کر قتل کیا گیا تو ملا شیخ عبدالقوی کو جو بڑا عالم تھا اور اعتماد خاں کا خطاب اور پنج ہزاری کا منصب رکھتا تھا' حکم ہوا کہ سرمد کو کپڑے پہننے کا حکم دیوے۔ پس سرمد طلب ہوا اور ملا نے اس سے پوچھا کہ "عریاں چرا میباشی" سرمد نے اس کا یہ ظریفانہ جواب دیا کہ "شیطان قوی است" پس ملا نے اور علماء کی اتفاق رائے سے اس کے قتل کا فتویٰ لکھا اور بادشاہ نے اس کو منظور کیا۔ لکھا ہے کہ جب جلاد تلوار لے کر سامنے آیا تو سرمد نے کہا

سر جدا کرد از تنم شوخی کہ با ما یار بود
قصہ کوتاہ کرد ورنہ دردِ سر بسیار بود

اور عاقل خاں رازی نے اپنی مختصر تاریخ عالمگیری میں لکھا ہے کہ جب جلاد قتل کرنے لگا تو سرمد نے نہایت بے تکلفی اور بے غمی کی حالت میں اخیر وقت یہ شعر پڑھا۔

عریانی تن بود غبارِ رہ دوست
آن نیز بہ تیغ از سر ما وا کردند

سرمد کو شعر گوئی میں بھی اچھا دخل تھا۔ چنانچہ اس کا دیوان رباعیات جو چھوٹا سا ہے انہی دنوں یعنی ۱۸۸۲ء میں جبکہ یہ کتاب تیار کی جا رہی ہے شہر دہلی میں چھپ بھی گیا ہے۔ سرمد کی قبر مسجد جامع دہلی کے قریب ہی ہے اور لوگ اس پر اکثر پھول چڑھاتے اور روشنی وغیرہ کرتے رہتے ہیں۔ اور سرمد کے قتل کی نسبت اب تک عام گمان یہ ہے کہ محض داراشکوہ کی دوستی اس بے چارہ کے قتل کا باعث ہوئی تھی۔ (س م ح)

(۲۵۰) زبان یونانی میں لفظ "سے نکس" کے معنی کٹ کھنے کتے کے ہیں اور حرف (س) علامت جمع کی ہے چونکہ اس قدیم فرقے کے حکما کو اپنے اس طرز زندگانی پر بڑا گھمنڈ تھا کہ ہم مال و دولت اور علوم و فنون اور حرفت و صناعت اور لہو و لعب سے نفرت کرتے ہیں اس لئے بلحاظ ان کی ترش روئی اور بد مزاجی کے ان کا یہ لقب پڑ گیا تھا۔ (س م ح)

(۲۵۱) دیو جانس جو حکماء یونان میں مشہور حکیم گزرا ہے۔ مذکورہ بالا "سے نک" فرقہ میں سے تھا اور اسی وجہ سے اہل عرب اس کو دیو جانس کلبی کہتے ہیں۔ یہ شہر کارنتھ کا رہنے والا تھا اور چار سو بیس برس قبل از سن عیسوی میں پیدا ہوا تھا اور چھیانوے برس کا ہو کر ۳۲۴ قبل از سن عیسوی میں فوت ہوا۔ یہ تارک الدنیا تھا اور موٹے جھوٹے کپڑے پہنے اور ایک لکڑی کا پیالا سر پر اٹھائے ننگے پاؤں پڑا پھرا کرتا تھا اور جو کچھ مل جاتا' کھا لیتا اور جہاں

چاہتا سو رہتا اور کبھی اس لکڑی کے پیپا میں بیٹھ کر آرام لے لیتا تھا۔ لکھا ہے کہ جب سکندر اعظم نے شہر کارنتھ کو فتح کیا اور اس کی ملاقات کو گیا تو اس وقت یہ سو رہا تھا۔ سکندر نے ٹھوکر مار کر کہا "تو پڑا سوتا ہے اور تیرا شہر میں نے فتح کر لیا"۔ اس نے جواب دیا "شہروں کا فتح کرنا بادشاہوں کا کام ہے لیکن لات مارنا گدھوں کی خصلت ہے"۔ سکندر نے خفا ہو کر کہا کہ "شاید تو یہ سمجھتا ہے کہ تجھ کو کبھی مجھ سے غرض نہ پڑے گی اور یہ ممکن نہیں"۔ اس نے کہا کہ "مجھ کو اپنے غلام کے غلام سے کبھی غرض نہ پڑے گی"۔ سکندر نے پوچھا "وہ کون ہے؟" کہا "تو! کیونکہ حرص و شہوت کو میں نے اپنا غلام بنا رکھا ہے اور تو ان کا غلام ہے!"

ایک روز سکندر نے اس سے پوچھا کہ "نیکی کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے؟" جواب دیا "نیک کام کرنے سے اور تو ایک دن میں وہ کچھ حاصل کر سکتا ہے جو اور لوگ برسوں میں نہیں کر سکتے!" لکھا ہے کہ ایک روز سکندر جو اس کی ملاقات کو گیا تو یہ اپنے اس لکڑی کے پیپا میں بیٹھا ہوا دھوپ کھا رہا تھا۔ سکندر نے کہا کہ "کوئی خدمت فرمائیے؟" جواب دیا کہ "بس یہی خدمت ہے کہ آپ پرے ہٹ جائیں اور میری دھوپ نہ روکیں"۔ ماخوذ از تاریخ التواریخ و جامِ جم۔ (س م ح)

(۲۵۲) افلاطون چار سو برس قبل سن عیسوی میں پیدا ہوا تھا اور اکیاسی برس کا ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوا۔ یہ سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد تھا۔ پس اسی سے سمجھ لینا چاہئے کہ یہ کیسا شخص تھا۔ ابتداء عمر میں اس کو کشتی اور شعر گوئی کا شوق تھا۔ اور بہت ہی خوب شعر کہتا تھا۔ مگر سقراط کی نصیحت سے شعر کہنا چھوڑ دیا اور تحصیل فلسفہ کی طرف متوجہ ہوا اور اوّل سقراط سے اور اس کی وفات کے بعد مصر وغیرہ میں تحصیل علوم کرتا رہا۔ یہ بہت خوبصورت خوش وضع اور خوش اخلاق آدمی تھا اور اپنے اور بیگانہ سے برابر احسان اور نکوئی سے پیش آتا تھا۔ اس نے مختلف علوم میں چھوٹی بڑی اکسٹھ کتابیں اپنی تصنیفات سے دنیا میں چھوڑیں۔ مرنے کے بعد یہ اس باغ میں دفن کیا گیا جو اس کی ملکیت سے تھا اور اس کی متروکات پانی پینے کا ایک پیالہ اور ایک لوٹا اور سونے کا ایک کان کا بُندا تھا جس کو بچپن میں پہنا کرتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اس دنیا کا کوئی بنانے والا اور بغیر کسی نمونہ کے پیدا کرنے والا ہے جو ہمیشہ سے بغیر کسی سہارے کے موجود ہے اور اپنی تمام مخلوقات کو جانتا ہے۔ اور ازل میں اس کے وجود کے ساتھ کوئی ظلی وجود نہ تھا مگر چند مثالیں جن سے اس کی مراد چند مجرد کلیات بسیط چیزیں ہیں جو پھیلی ہوئی ہیں اور تمام محسوس اور مادی صورتیں انہی کلیاتِ بسیط کی

جزئیات ہیں اور اس جہان میں جو کچھ موجود ہے وہ اس جہان یعنی عالم مثال کا نمونہ ہے اور یہ کہ ہر اثر کے لئے ایسے مؤثر کا ہونا ضروری ہے جو کسی نہ کسی طور پر اس اثر سے مشابہت رکھتا ہو۔ مطلب یہ کہ عالم مثال یا عالم مجردات عالم کلی ہے اور عالم مادی یا عالم مرکبات عالم جزئی ہے۔ اور جو کچھ اس عالم جزئی میں ہے وہ اس عالم کلی کا نمونہ ہے (س م ح)

(۲۵۳) جے روم کارڈن ملک اٹلی کا رہنے والا ۱۵۰۱ عیسوی میں پیدا ہوا تھا اور اپنے زمانہ کا ایک مشہور طبیب اور ریاضی دان اور فلسفی تھا۔ اس عجیب شخص کے سوانح عمری بھی عجیب ہی ہیں۔ اس کا باپ شہر میلان میں ایک اچھا ذی مقدور شخص تھا مگر جے روم اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ میں روز ولادت سے مصیبتوں اور افلاس میں رہا ہوں۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہ اپنے باپ کا شرعی بیٹا نہ تھا اور جب وہ حمل میں تھا تو اس کی ماں نے ہر چند اسقاط کے لئے کئی دفعہ کوششیں کیں مگر یہ سخت جان بچہ ہرگز نہ نکلا اور آخر کار جب نکلا تو اس طرح پر کہ اس کی ماں کا پہلو چیر کر نکالا گیا۔ روز پیدائش سے یہ بے چارہ ضعیف القویٰ تھا اور اس کے علاوہ اس کے باپ کے گھر میں اس کے ساتھ کئی طرح کی بدسلوکیاں بھی ہوتی رہتی تھیں مگر تحصیلِ ریاضیات میں اس نے پھر بھی بہت بڑی ترقی کی۔ اور اگرچہ ابتدا میں "فرانسیس کن" گروہ کے تارک الدنیا درویشوں میں شامل ہو گیا تھا مگر تھوڑے دنوں بعد اس نے اس گوشہ نشینی کو ترک کر کے بہت شوق سے علم طب اور علم فلسفہ کو حاصل کرنا شروع کیا' یہاں تک کہ اٹلی کے ایک مشہور و معروف مدرسہ طبی سے ایم۔ڈی کی ڈگری یعنی خطاب ڈاکٹری حاصل کیا۔ اس مدرسہ میں یہ ایسا مستعد طالب علم تھا کہ اپنے مدرس کی غیر موجودگی میں اقلیدس اور منطق کی جماعتوں کو خود تعلیم دیا کرتا تھا اور آخر اس کے علم و فضل وطبابت کی شہرت اس قدر ہوئی کہ اس وقت کے بڑے امرا اور بادشاہوں سے بھی اس کی ملاقاتیں ہوئیں اور کئی جگہ امرا نے اپنے طبی مدارس میں اس کو مدرس وغیرہ بھی مقرر کیا۔ مگر اس کا قدیمی رفیق افلاس اس کے ساتھ تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار ۱۵۷۰ء میں زیر باری قرض کے باعث کچھ عرصہ تک قید بھی رہا اور جب وہاں سے رہائی پائی تو پوپ گریگوری سیزدہم کے پاس چلا گیا۔ جس نے ازراہ قدردانی اس کو اپنے مدرسۃ الاطبا کا ایک ممبر مقرر کر کے گزر اوقات کے لئے کچھ پنشن بھی کر دی۔ اور اس نے بقیہ عمر شہر روم ہی میں بسر کر کے بعد اختتام اپنی کتاب "سوانح عمری" کے ۱۵۷۶ء عیسوی میں قضا کی۔ یہ شخص احکام نجوم کا اس قدر معتقد تھا کہ ایک بار اس نے ملک سکاٹ لینڈ کے ایک

مشہور و معروف پادری کو جو سخت مریض تھا اور جس کو جرمنی کے بڑے بڑے نامی ڈاکٹر جواب دے چکے تھے، اپنے معالجہ سے تندرست کیا۔ مگر اپنی اس کامیابی کی نسبت اس کو یہی خیال تھا کہ چونکہ میں نے اس کی جنم پتری کے حساب کو خوب طرح سمجھ کر علاج کیا تھا محض اسی وجہ سے یہ فائدہ ہوا ہے۔ اس کے شدت سے اعتقادِ نجوم کی نسبت اس کے زمانہ کے دو مشہور عالموں نے ایک یہ روایت بھی کی ہے کہ اس نے اپنی جنم پتری کی رُو سے اپنی عمر کی ایک حد قرار دے رکھی تھی۔ پس جب وہ وقت قریب آیا چونکہ یہ بھلا چنگا تھا اور کوئی بیماری وغیرہ نہ تھی جس سے مرگ کا گمان ہو سکتا اس وجہ سے آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مبادا میری جنم پتری کا حساب غلط ہو جائے اس لئے اس قدر بھوکا مرنا شروع کیا کہ آخر جنم پتری کی بدھ مل گئی۔ اس کی تصانیف کے رسالے اور کتابیں طبیعات، ریاضیات، علمِ ہیئت، فنِ احکامِ نجوم، فصاحت و بلاغت، تاریخ، اخلاق، منطق نیچرل ہسٹری یعنی علمِ ماہیت و حقائق طبیعات، موسیقی، علم الادویہ، فنِ تشریح وغیرہ میں جو بہ تعداد ایک سو بائیس ہیں اور ان میں طرح طرح کے بیان ہیں مگر اس شخص نے مسائلِ علمیہ کے ساتھ اپنے مبالغہ آمیز تخیلات اور بیہودہ تصورات کو ان سب میں شامل کر دیا ہے اور بسبب اس کے کہ وہ سنِ طفولیت سے آخر عمر تک بد سلوکیاں اور مصیبتیں جھیلتا رہا تھا اس کے مزاج میں تلخی و تندی اور انتقام پسندی کی عادت تھی اور اس کی خصلت اور مزاج اس درجہ نرالا اور انوکھا تھا کہ لوگ اس کو عموماً پاگل اور خبطی کہتے تھے اور وہ اپنے آپ کو نوعِ انسان سے بالکل علیحدہ سمجھتا تھا اور اس عجیب بات کا اس کو پکا یقین تھا کہ میرے سامنے ہمیشہ ایک ایسی روح جس کو میں بخوبی پہچانتا ہوں حاضر رہتی ہے اور اس کے باعث سے میں جب چاہتا ہوں عالمِ ارواح سے بات چیت کر لیتا ہوں (ماخوذ از انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا)۔ (س م ح)

(۲۵۴) اس شخص کا حال باوصف تلاش کے نہیں ملا۔ (س م ح)

(۲۵۵) یہ لوگ نہاتے تو نہیں البتہ کپڑا تر کر کے بدن کو اس سے ہمیشہ صاف کر لیتے ہیں۔ (س م ح)

(۲۵۶) یہ ظرف مٹی کا تو کم اور اکثر روغن کیا ہوا ایک کاٹھ کا برتن مثل لوٹے کے ہوتا ہے جس کے اکثر نہایت چھوٹے چھوٹے تین پائے بھی ہوتے ہیں۔ اس کو ان کی اصطلاح میں پاترا اور پاتری کہتے ہیں۔

(۲۵۷) ڈاکٹر پے کیٹ ایک فرانسیسی طبیب تعلیم یافتہ مدرسہ مونٹ پیلیر واقع فرانس کا

تھا۔اس نامور محقق نے ۱۶۴۷ء میں برخلاف عقیدہ جمہور اطباء متقدمین کے یہ نئی بات نکالی کہ جگر کو خون بنانے سے کچھ تعلق نہیں بلکہ عروق ماساریقا سے صفوت کیلوس اوّل بشکل ایک سفید رطوبت کے ایک بڑی رگ میں سے ہو کر قلب کے دائیں خانہ میں جا کر مبدل بہ خون ہو جاتی ہے۔ (س م ح)

(۲۵۸) ڈاکٹر ولیم ہاروے قوم انگریز سے تھا۔ یکم اپریل ۱۵۷۸ء کو شہر نوک سٹون واقع صوبہ کینٹ میں پیدا ہوا۔ انیس برس کی عمر میں کیمبرج کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کر کے شہر پاڈوا واقع ملک اٹلی کے مدرسہ طبی میں جو اس زمانہ میں بہت مشہور مدرسہ اس فن کا تھا' داخل ہوا اور بڑے بڑے نامی استادوں سے تعلیم پا کر چوبیس برس کی عمر میں ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی اور وہاں سے اپنے وطن انگلینڈ میں واپس آ کر لندن میں سکونت اختیار کی۔ ۱۶۱۵ء میں یہ شخص انگلستان کے ایک طبی مدرسہ میں فن تشریح اور جراحی کا لیکچرار مقرر ہوا اور یہاں اس نے اپنی تحقیقات کے جدید مسئلہ 'دوران خون' کو ظاہر کیا اور کئی برس تک اپنے اور یورپ کے اور ملکوں کے ڈاکٹروں کے ساتھ بحث مباحثہ کر کے اس مسئلہ کو ثابت کر دکھایا۔ ڈاکٹر ہاروے اپنی لیاقتوں کے باعث انگلستان کے بادشاہ جیمس اوّل کا طبیب مقرر ہوا اور اس کے بعد بادشاہ چارلس اول کا بھی بہت ذی اعتماد رہا اور جبکہ اس کی شہرت و ناموری تمام یورپ میں پھیل چکی تھی تیسری جون ۱۶۵۷ء کو اسی برس کی عمر میں مرض فالج سے قضا کی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں محققوں کے ان نئے مسائل خصوصاً ہاروے کے مسئلہ دوران خون نے فن طب میں ایسے عجیب انقلاب پیدا کئے ہیں کہ گویا طبابت قدیم کے اصول ہی کو بدل ڈالا ہے۔ (ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا) (س م ح)

(۲۵۹) ڈس کارٹس جس کو ڈی کارٹس بولتے ہیں مشاہیر حکما سے فرانس سے ہے جو ۱۵۹۶ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۶۵۰ء میں مرا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے علم مناظر و مرایا کے مسائل کو دلائل ہندسی سے ثابت کیا اور خواص مقناطیس کے باب میں تجربات کثیر حاصل کئے اور بسبب اپنی خاص رایوں کے مجدد علم فلسفہ مشہور ہے۔ اثبات نفس ناطقہ کی بحث میں اس نے یہ لکھا ہے کہ ہم ہر شے کے وجود کی نسبت شک کر سکتے ہیں لیکن اپنے شک کے وجود کی نسبت شک نہیں کر سکتے اور شک کرنا خود بمنزلہ مدرک ہونے کے ہے اور مدرک ہونا صاحب ادراک کے وجود کی دلیل ہے۔ پس ہمارا یہ کہنا کہ ہم ہیں یا ہم ذی وجود ہیں' ایک ایسا جملہ ہے کہ جب ہم اس کو زبان پر لائیں یا اس کے تصور کو دل میں جگہ دیں' ہر

حال میں اس کی صحت پر ہم کو اطمینان حاصل رہتا ہے اور اس کہنے سے ہم کو نہ صرف اپنے وجود ہی کا علم ہوتا ہے بلکہ اپنے ذی ادراک ہونے کا بھی علم ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد کہتا ہے کہ چونکہ ہم اپنے میں ایک ایسی غیر مادی شے پاتے ہیں جو ہر ایک نقصان سے منزہ ہے تو ضرور ہے کہ اس کے لئے کوئی علت ہو کیونکہ علت کے بغیر معلول کا وجود ناممکن ہے اور چونکہ ناقص کامل کی علت نہیں ہو سکتا اس لئے ہم جو ایک مادی اور ناقص وجود ہیں اس کی علت نہیں ہو سکتے اور اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے سوا اس کی علت کوئی اور ایسا ہی وجود ہو جس کی عظمت اور کمال اور قدرت سے یہ معلول ہمیں خبر دیتا ہے اور جس وجود نے بذریعہ اپنے اس معلول کے ہمارے نفس پر اپنا ایک نشان منقش کر دیا ہے۔ مگر اس نشان سے خود اس علت کا وجود مراد نہیں ہے۔ پس ہمارا ہونا ہم کو خدا کے ہونے کی بھی خبر دیتا ہے۔

(س م ح)

(۲۶۰) مترجم انگریزی نے اپنی زبان کے لہجہ کے موافق غالباً غلطی سے لفظ ایشر کو جس کے معنی خدا کے ہیں اچر سمجھا ہے اور اسی بنیاد پر اصل کتاب میں قوسین کے اندر اس کے معنی غیر متحرک کے لکھے ہیں۔ کیونکہ مصنف کی تحریر میں جو حروف سی ایچ حرف شین قرشت کے تلفظ کے لئے مستعمل ہوئے ہیں ان کا اکثر یہ تلفظ زبان انگریزی میں حرف چ یعنی جیم فارسی کا ہے۔ (س م ح)

(۲۶۱) جس طرح برہما کی عمر کا شمار بے انتہا برسوں سے کرتے ہیں اسی طرح ویدوں کی نسبت اہل ہند کا یہ ادعا ہے کہ لاکھوں برس سے ہیں۔ مگر یورپ کے محققوں نے بڑی چھان بین کے بعد ان کی تالیف کا زمانہ چودھویں صدی قبل از سنہ عیسوی قرار دیا ہے اور ان کی اس رائے کا صحیح ہونا بہت پختگی کے ساتھ ایک مقام سے جس کو سر ایڈورڈ کالبروک صاحب نے ویدوں میں دریافت کیا ہے صحیح ٹھہرتا ہے۔ چنانچہ تشریح اس کی وہ یوں لکھتے ہیں کہ ہر وید میں علم ہیئت کا ایک ایک رسالہ اس غرض سے لگا ہوا ہے کہ پترے کی ترتیب معلوم ہووے اور اس سے فرائض منصبی کے اوقات دریافت ہو جایا کریں۔ پس وہ صریح اور قطعی دلیل جس پر انہوں نے اپنی مذکورہ بالا رائے قائم کی ہے یہ ہے کہ جو مقام راس سرطان اور راس جدی کا اس رسالہ میں قرار دیا ہے وہ وہی مقام ہے جو چودھویں صدی قبل از سنہ عیسوی میں ان دونوں راسوں کا تھا۔ پس کچھ شک نہیں ہے کہ ویدوں کی تالیف اسی زمانہ میں ہوئی تھی۔ (ماخوذ از تاریخ ہند مؤلفہ الفنسٹن صاحب) (س م ح)

(۲۶۲) اگرچہ ہم نے اپنے بعض دوست پنڈتوں کی معرفت بہت سی کوشش کی کہ بشن پران کی جس کتھا سے ڈاکٹر برنیئر نے یہ مضمون لیا ہے اس سے صحت اور تشریح اس کی کی جائے سے خصوصاً بشن سہنسر نام میں سے بشن کا وہ لقب صحیح کر کے لکھا جائے جس کے معنی بلحاظ اس کتھا کے زخمی پہلو والے کے ہوں۔ مگر اطمینان کے لائق کوئی بات حاصل نہ ہوئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح غیر ملک کے لوگ بعض اوقات غلطیاں کیا کرتے ہیں اسی طرح یہاں بھی کچھ خلط مبحث ہو گیا ہے اور سری کرشن جی جو بشن کے اوتار تھے کچھ تو ان کی ولادت وغیرہ کی کتھا اور کچھ بشن کی کتھا کو باہم ایسے طور پر ملا دیا گیا ہے کہ جس سے کسی اصل کتھا کے ساتھ یہ بیان مطابق نہیں ہوتا۔ (س م ح)

(۲۶۳) مصنف نے پادری روآ کے قول کے موافق اوتاروں کی بابت جو یہ مضمون لکھا ہے اس میں کئی غلطیاں ہیں جس کو ہم پنڈتوں سے بڑی تحقیق کے بعد بیان کرتے ہیں۔ اول یہ کہ شیر کا اوتار کوئی نہیں ہوا۔ دوئم یہ کہ بونے برہمن کا اوتار ہوا ہے بونی برہمنی کا نہیں ہوا جیسا کہ پادری روآ نے بیان کیا ہے۔ سوئم یہ کہ بغیر دم کے بندر کا کوئی اوتار نہیں ہوا اور جیسا کہ آئین اکبری میں بہت سی شرح وبسط کے ساتھ درج ہے ہندو شاستروں کے موافق اوتار دو قسم کے ہیں۔ اول پورن اوتار، دوئم انش اوتار۔ پورن اوتار وہ ہیں جو علیٰ وجہ الکمال ذات الٰہی کے مظہر ہوئے ہیں اور انش اوتار وہ ہیں کہ جن میں ذات باری نے من وجہ ظہور کیا ہے۔ اگرچہ شمار اوتاروں کا چوبیس تک بھی مانتے ہیں مگر منجملہ ان کے دس اوتار مفصلہ ذیل بالاتفاق مانے جاتے ہیں۔ اول مچھ، دوئم کورم یا کچھ، سوئم باراہ، چہارم نرسنگھ، پنجم بامن معروف باون، ششم پرس رام، ساتواں رام یعنی رام چندر جی مہاراج، آٹھویں سری کرشن مہاراج، نہم بودھ، دسواں کلکی جس کا اب تک ظہور نہیں ہوا۔ (س م ح)

(۲۶۴) مترجم انگریزی نے کرنل جارج فاسٹر صاحب نامی ایک انگریز سیاح کی تحریروں سے شہر بنارس کی نسبت ایک حاشیہ لکھا ہے جس کو دلچسپ سمجھ کر ہم بھی اپنے اس ترجمہ میں بطور خلاصہ نقل کرتے ہیں۔ قول: شہر بنارس اپنی دولتمندی اور عالیشان عمارتوں اور کثرت آبادی کی وجہ سے ان شہروں میں جو بالفعل ہندوؤں کے قبضہ میں باقی ہیں اول درجہ کا شہر گنا جاتا ہے۔ اس شہر میں ہندوؤں کے بے شمار دیوتاؤں کے بے شمار مندر ہیں اور یہ شہر ہندوؤں کے باقی ماندہ علوم وفنون کا گویا مخزن ہے۔ جب کوئی شخص گنگا کے راستہ سے اس شہر کو آتا ہے تو اس کو آٹھ میل کے فاصلہ سے ایک مسجد کے دو بلند مینار نظر پڑتے ہیں۔ جس کو

اورنگ زیب نے مہادیو کے ایک قدیمی مندر کی بنیادوں پر تعمیر کرایا تھا۔ ہندوؤں کی ایسی متبرک جگہ پر ایسی باشان و شوکت اسلامی عمارت کے بنانے سے جو اپنی بلندی کی وجہ سے بزبان حال اپنے غلبہ اور فتح مندی کو جتا رہی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے دل میں یہ بے ہودہ خواہش پیدا ہوئی ہوگی کہ ہندوؤں کے مذہب کی تحقیر کروں۔ اگر فی الواقع اس کی یہی خواہش تھی تو وہ حقیقت میں کامل طور پر کامیاب ہوا۔ ان میناروں پر سے تمام شہر بخوبی نظر آتا ہے جو گنگا کے مشرقی کنارے پر طولاً ڈھائی میل اور عموماً ایک میل تک عرض میں آباد ہے۔ اکثر مکانات اس شہر میں پتھر کے بہت اونچے اونچے بنے ہوئے ہیں۔ مثلاً کوئی چھ منزل اور کوئی سات منزل کا ہے۔ یہ پتھر جو اس نواح میں بکثرت دستیاب ہوتا ہے اس قسم کا ہے جو یورپ میں پورٹ لینڈ کی کان سے نکلتا ہے۔ لیکن شہر کے گلی کوچے جس میں یہ اونچی اور مستحکم عمارتیں بنی ہوئی ہیں ایسے تنگ ہیں کہ دو گاڑیاں بھی برابر نہیں چل سکتیں۔ علاوہ اس مضر حبس کے جو ان مکانات کے بے ڈھنگے پن سے ہوا میں پیدا ہوتا ہے گرمی کے موسم میں اس پانی سے جو شہر میں بہت سی جگہ بھرا رہتا ہے ناقابل برداشت بو آتی ہے اور یہی پانی مع اپنے کناروں کی زمین کے اہل شہر کی حوائج ضروریہ کے لئے مختص ہے اس کے علاوہ میل کچیل جو اہل شہر اپنے گھروں سے نکال کر گلی کوچوں اور راستوں پر ڈال دیتے ہیں اسی جگہ پڑی رہتی ہے کیونکہ ہندوؤں میں ستھراپن بہت ہی کم ہے اور یہ ایک اور ذریعہ ہے جو اور بدبوؤں میں شامل ہو کر باعث کثرت عفونت ہو جاتا ہے۔ یہ شہر اپنی عمدہ عمدہ عمارات کے سبب سے ان تمام بڑے بڑے شہروں پر فوق رکھتا ہے جن کے دیکھنے کا مجھے ہندوستان میں اتفاق ہوا ہے۔ بشرطیکہ اس کی گلیاں ایسی بے قاعدہ اور تنگ اور طرزِ تعمیر ایسا گنجان نہ ہوتا جس نے عماراتِ شہر کی زیب و زینت کے لطف کو کھو دیا ہے۔ (س م ح)

(۲۶۵) ''اکثر ہوا ہے'' کہنا صحیح نہیں ہے۔ مؤلف کتاب ''آئینہ تاریخ نما'' جو زمانہ حال کے قابل لوگوں میں سے جین مت کا ایک بہت باخبر ہندو مصنف ہے اور جس کا طرزِ تحریر ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی نسبت نہایت متعصبانہ ہے اور جس نے ان کے عیب چن چن کر اپنی کتاب میں درج کئے ہیں، باوجود بڑی تلاش اور جستجو کے اس کو بھی اس قسم کی صرف ایک ہی بات ملی ہے۔ چنانچہ کتاب ''فتوحات فیروز شاہی'' کے حوالہ سے وہ لکھتا ہے کہ ''کچھ ہندوؤں نے مل کر موضع کوہانہ میں بت خانہ بنایا تھا۔ پس میں نے (یعنی فیروز شاہ تغلق نے) حکم دیا کہ ان کی پوتھیاں اور تمام بت اور پوجا کے برتن سب اسی جگہ پھونک دیئے

جائیں"۔ مگر ہندوؤں پر کیا منحصر ہے فیروز شاہ نے تو شیعہ مذہب کے مسلمانوں کی کتابیں بھی جلوادی تھیں۔ چنانچہ مؤرخ موصوف اسی مضمون کے ضمن میں فتوحات فیروز شاہی کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ "فرقہ شیعہ کے بعض لوگوں نے اہلِ سنت کو اپنے مذہب میں لانا چاہا تھا اور کتابیں اور رسالے بھی اس باب میں لکھے تھے۔ تب میں نے (یعنی فیروز شاہ نے) ان سب رافضیوں کو گرفتار کیا اور جو جو اُن کے سردار تھے ان کو سیاست میں ڈالا اور ان کی تمام کتابوں کو آگ سے جلوا دیا"۔ اور مسبوق الذکر مؤلف اس سے چند صفحے پہلے "طبقات ناصری" کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ "قطب الدین ایبک کے زمانہ میں ختیار خلجی نے شہر بہار کو جب فتح کیا تو ہندوؤں کا وہاں ایک کتب خانہ نہایت عظیم الشان دستیاب ہوا۔ لیکن قتلِ عام ہو جانے کے باعث سے کوئی آدمی ان پوتھیوں کا مضمون بتانے والا نہ مل سکا"۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ختیار نے ان پوتھیوں کو جلوایا نہیں بلکہ برعکس اس کے وہ ان کے مضمون سے واقف ہونا چاہتا تھا۔ (س م ح)

(۲۶۶) مصنف نے جن چھ فرقوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ ہیں: اول میمانسک یعنی میمانسا شاستر کے پیرو جس کی بنیاد جیمنی رشی سے ہے۔ اس کی دو شاخیں ہیں ایک قدیم جو جیمنی کے اصول کی پیرو ہے۔ دوسری جدید جس کا بانی بیاس جی کو بتاتے ہیں اور بیدانتی کہلاتے ہیں۔ تیسرا نیائک یعنی منطقی فرقہ جس کا بانی گوتم ہوا۔ اس فرقہ کے بعض مسئلے ارسطو کے مسائلِ منطق سے ملتے جلتے ہیں۔ چوتھا "بے شے شک" جس کا بانی کناڈمنی ہے۔ پانچواں سانکھیہ جس کا بانی کپل منی ہوا۔ چھٹا جوگی یعنی پاتجل شاستر کا پیرو جس کو پاتجل رشی نے قائم کیا۔ یہ دونوں مؤخر الذکر بہت سی رایوں میں متفق ہیں۔ ان سب فرقوں کے مسائل کی تفصیل اگر کسی کو دیکھنی ہو تو الفنسٹن صاحب کی "تاریخ ہندوستان" کے پہلے حصہ میں اور اس سے بھی زیادہ شیخ ابوالفضل کی آئین اکبری میں دیکھ لے۔ (س م ح)

(۲۶۷) یہ مشہور یونانی حکیم جو سنہ عیسوی سے چار سو اکہتر برس پہلے پیدا ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی تقلید کی ہے اور علوم حکمیہ اس سے سیکھے ہیں۔ چنانچہ اپی کیورس بھی جس کا ذکر متن میں ہے، اسی کا شاگرد تھا۔ اس کا یہ اعتقاد تھا کہ تمام اجسام کی بنیاد ایسے چھوٹے چھوٹے اجزا ہیں جو باعتبار اپنی طبیعتوں کے ہم شکل اور باعتبار صورتوں کے مختلف اور ایسے سخت ہیں کہ ان کی تقسیم صرف وہم ہی سے ممکن ہے اور یہ کہ یہ اجزا باعتبار شمار کے غیر متناہی اور ایسی خلا کے اندر جس کی کوئی حد نہیں، پھیلے ہوئے اور دائم الحرکت ہیں۔ پس کبھی

ایسا ہوتا ہے کہ یہ اجزا آپس میں ٹکراتے اور کسی خاص صورت پر اکھٹے ہو جاتے ہیں اور ان کے اس اتفاق اور اجتماع ہی سے جہان کا وجود ہے اور یہ کہ ہمارے اس جہان کے مانند بے شمار جہان ہیں جو ایسی ہی نظم و ترتیب کے ساتھ خلائے غیر متناہی کے اندر موجود ہیں۔ لیکن اس کی رائے میں امورات جزئی یعنی حیوانات اور نباتات کے وجود کا سبب اجزا مذکور کا اتفاقاً باہم ٹکرانا اور مجتمع ہو جانا نہیں ہے۔ اس کے شاگرد اپی کیورس کی بھی یہی رائے ہے اور اس کا قول ہے کہ ترکیب کی حالت میں یہ اجزا حقیقتاً آپس میں مل نہیں جاتے بلکہ صرف باہم چمٹ جاتے ہیں اور اجسام محسوس کے اندر بالفعل موجود ایک دوسرے سے متمیز رہتے ہیں۔ پس اجسام محسوسہ کا اتصال حقیقی اتصال نہیں ہے بلکہ صرف ان اجزا کے باہم چمٹے رہنے کا نام ہے۔ (ماخوذ از ناسخ التواریخ) (س م ح)

(۲۶۸) ابن رشد کا نام محمد تھا اور اپنے اجداد میں سے رشد نامی ایک شخص کی نسبت سے محمد ابن رشد کہلاتا تھا۔ یہ ان لوگوں کی نسل میں سے تھا جنہوں نے سنہ ترانوے ہجری مطابق ۷۱۱ء میں ملک اسپین کو فتح کر کے ممالک اسلامیہ میں شامل کیا تھا۔ یہ ملک اسپین کے مشہور شہر کاردوآ (قرطبہ) میں، جہاں اس کے باپ دادا قاضی رہے تھے ۵۲۰ ہجری مطابق گیارہ سو بیس عیسوی میں پیدا ہوا تھا۔ یہ نہایت مشہور حکمائے عرب میں سے تھا اور طب اور فلسفہ اور فقہ اور ہندسہ میں کمال کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے زمانہ میں علم فلسفہ اہل عرب میں کمال کو پہنچ گیا تھا اور اس کے بعد قوم عرب کی تاریخ میں کوئی بڑا فلسفی نہیں پایا جاتا۔ اس کی اکثر تصنیفیں زبان عربی اور عبری میں ہیں۔ چونکہ اس نے کتب ارسطو کی شرحیں لکھی تھیں اس لئے شارح حکمتِ ارسطو کے معزز لقب سے، جس کا وہ حقیقتاً مستحق تھا، مشہور آفاق تھا۔ بعض آزادانہ رایوں کے ظاہر کرنے کی وجہ سے لوگوں نے اس کو الحاد سے منسوب کر کے اس کو اس کے مولد کارڈوآ سے جلاوطن کرا دیا تھا۔ مگر اس کے کمال نے سلاطین وقت کی مہربانی کو پھر اپنی طرف کھینچ لیا اور دربار مراکش (مراکو) میں پھر آ حاضر ہوا جہاں کہ وہ ۱۱۹۸ء یا ننانوے میں مر گیا۔ (س م ح)

(۲۶۹) گلاڈی اس گالی نس جس کو انگریزوں نے گیلین اور عربوں نے جالینوس بتایا ہے، ملک اٹلی کے شہر پرگس کا رہنے والا تھا۔ یہ نامور شخص ۱۳۱ عیسوی میں پیدا ہوا تھا اور نوے برس کا ہو کر مرا۔ جالینوس اپنے باپ کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ ریاضیات اور فن تعمیرات اور علم ہیئت میں بہت سر بر آوردہ اور دقائق فلسفہ ارسطا طالیس سے بخوبی ماہر تھا۔

جالینوس نے سترہ برس کی عمر سے پہلے حکما کے چند مختلف طبقات کے مسائل فلسفہ کی تعلیم پائی تھی۔ اور وہ لکھتا ہے کہ جب میں اس عمر کو پہنچا تو میرے باپ نے خواب دیکھا تھا کہ اس لڑکے کو علم طب کی تعلیم ہونی چاہیے مگر اس نے صرف انیس برس کی عمر میں اول ایک استاد سے جس کا نام وہ بتانا نہیں چاہتا، فن طب کی تحصیل شروع کی اور پھر اس زمانہ کے بعض اور مشہور و معروف حکماء سے جو فن تشریح اور علم الادویہ میں نامور تھے ان فنون کی تعلیم پائی۔ ابھی بیس برس کی عمر بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کا وہ پہلا رہنما اور شفیق استاد مر گیا۔ بعد ازیں اس نے بہت سے شہروں میں کہ جہاں جہاں علمائے فلسفہ طب مشہور تھے سفر کیے اور آخر کار شہر اسکندریہ میں جا کر بعض استادوں سے فن تشریح کی تکمیل کی اور اٹھائیس برس کی عمر تک وہاں رہ کر ایسا ہو گیا کہ جو علوم اس زمانہ میں استادوں سے حاصل ہو سکتے تھے وہ سب سیکھ لئے اور اپنے شہر پرگس میں واپس آ کر انیس برس کی عمر میں بڑی شہرت پائی کیونکہ یہاں اس نے ایسے ایسے زخمیوں کو اچھا کیا جن کے زخم مہلک سمجھے جاتے تھے اور چونکہ بتیس برس کی عمر میں اس کے شہر میں کچھ بغاوت ہو گئی تھی اس لئے وہ شہر روم کو چلا گیا اور ایک دفعہ شہر پرگس میں پھر آ کر آخر کار روم میں ہی جا ٹھہرا۔ کیونکہ وہاں کے کئی بادشاہوں کا طبیب خاص رہا تھا مگر وفات اس کی شہر پرگس میں ہی ہوئی۔ فن تشریح کے مختلف شعبوں میں اس حکیم نے بہت سے رسالے اور کتابیں لکھی ہیں اور اس فن میں بہت سی ایسی اصطلاحیں قائم کر گیا ہے کہ اب تک بھی وہی چلی آتی ہیں اور یہ بڑے شوق اور سرگرمی سے ہمیشہ مردہ اور زندہ حیوانوں کو چیر چیر کر دیکھتا رہتا تھا اور اگرچہ زمانۂ حال کا فنِ تشریح اس کی معلومات سے بہت بڑھا ہوا ہے لیکن وہ اپنے وقت میں یکتائے روزگار اور اپنے تمام متقدمین سے اس میں ایسا بڑھا ہوا تھا کہ اس قدیم زمانہ میں اس کی وفات کو فن تشریح کی وفات کہنا کچھ بے جا نہ تھا۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا) (س م ح)

(۲۷۰) ہاتھیوں کے سروں پر دنیا کے اٹھائے ہوئے ہونے کی روایت کبھی سننے میں نہیں آئی اور نہ تحقیق سے اس کی کچھ صحت معلوم ہوئی۔ البتہ سیس ناگ یعنی ہزار سر والے مقدس سانپ کے سر پر اس دنیا کا ٹھہرے ہوئے ہونا ضرور مانا جاتا ہے اور ایک عام روایت یہ بھی ضرور زبان زد ہے کہ ایک بیل کے سینگوں پر یہ پرتھوی قائم ہے اور جب وہ اس بوجھ کو ایک سینگ سے دوسرے سینگ پر بدلتا ہے تو بھونچال آجاتا ہے۔ (س م ح)

(۲۷۱) مصنف کے نزدیک یہ ایسے اسباب ہیں کہ جن سے اصلی حقائق پر ایک تاریکی کا

پردہ پڑ جاتا ہے اور اس کے باعث سے لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے۔ (س م ح)

(۲۷۲) تعجب ہے کہ مصنف نے ہندوؤں کی پرستش کے طریقہ کو تو اعتراض کی نظر سے دیکھا لیکن اپنے طرزِ عبادت کی بے ہودگی پر جو گرجاؤں میں حضرت مسیح اور حضرت مریم کی شبیہیں اور پطرس حواری کے جوتے کی نقل رکھتے اور ان کو مقدس جان کر ان کی پرستش اور ہندوؤں کی طرح دھوپ دیپ کرتے اور گھنٹے بجاتے ہیں۔ غور نہ کی اور انجیل مقدس کی اس آیت پر عمل نہ کیا جو لکھا ہے "تو اگر اپنے بھائی کی آنکھ سے تنکا نکالنا چاہتا ہے تو اوّل اپنی آنکھ کا شہتیر نکال"۔ افسوس انسان خواہ کیسا ہی عقلمند اور ذی علم کیوں نہ ہو اس کو اپنے مذہب کی رسوم اور عقائد کی برائی کبھی نہیں معلوم ہوتی اور اس کی طبیعت ہمیشہ غیروں ہی کی عیب جوئی پر متوجہ اور مائل رہتی ہے اور ان کے ہنر اور خوبیاں بھی اس کو برائی اور عیب ہی معلوم ہوتے ہیں۔ (س م ح)

(۲۷۳) عیسائیوں بلکہ مسلمانوں کے پاس بھی بجز اس کے کہ توریت مقدس کا حوالہ دیں دُنیا کی عمر کے شمار کی نسبت کوئی دلیل نہیں ہے۔ (س م ح)

(۲۷۴) فارسی خواں ناظرین کو بیا پیک "باہمہ و بے ہمہ" کے مراد فی المعنی سمجھنا چاہئیں۔
(س م ح)

(۲۷۵) اس کتاب کے مصنف شیخ نجم الدین محمود ہیں جو تبریز کے قریب چیتر نامی ایک گاؤں کے رہنے والے اور مشاہیر مشائخ صوفیہ سے تھے۔ یہ کتاب انہوں نے ۷۱۷ ہجری کے ماہ شوال میں بعض مشائخ خراسان کی فرمائش سے تصنیف کی تھی۔ جیسا کہ خود ان کے اس شعر سے جو سبب تالیف کتاب میں لکھا ہے ظاہر ہوتا ہے "گزشتہ ہفت ودہ از ہفت صد سال زہجرت ناگہاں در ماہ شوال" یہ کتاب بڑے رتبہ کی سمجھی جاتی ہے اور اس لئے اکثر بزرگوں نے اس کی شرحیں لکھی ہیں لیکن شرح موسوم بہ مفاتیح الاعجاز جو ۸۷۷ ہجری کے خاتمہ میں لکھی گئی تھی اور جس کے مصنف شیخ شمس الدین محمد بن یحیٰی لاہجانی ہیں جو فقرا کے سلسلہ نوربخشیہ کے بانی سید محمد نوربخش کے اعظم خلفا میں سے تھے سب سے عمدہ سمجھی گئی ہے۔ چنانچہ علامہ قاضی نوراللہ شوستری نے اپنی مشہور کتاب "مجالس المومنین" میں لکھا ہے کہ جب مصنف نے اس شرح کو لکھ کر دیکھنے کے لئے ملا عبدالرحمٰن جامی کے پاس ہرات میں بھیجا تو انہوں نے اپنے جوابی خط کے شروع میں اپنی یہ رباعی لکھ کر بھیجی۔ رباعی:-

اے فقر تو نور بخش اربابِ نیاز
خرم زبہارِ خاطرت گلشنِ راز

یک رہ نظرے بر مسِ قلبم انداز
شاید کہ برم رہ تحقیق زمجاز

(س م ح)

(۲۷۶) رابرٹ فلڈ قوم کا انگریز تھا اور ۱۵۷۴ء عیسوی میں پیدا ہوا تھا۔ یہ اپنے زمانہ میں ایک مشہور طبیب اور ایک ایسے فرقہ حکما کا پیرو تھا جو یہ خیال رکھتے تھے کہ ہماری روحیں سیدھی اس مبداء فیاض سے تعلق رکھتی ہیں اور وہاں سے گوناگوں استفاضہ معلومات اور اسرار غیبی کا کرتی رہتی ہیں۔ اس شخص کے تخیلات کا بیان جن کا وہ معتقد تھا' مختصر طور پر کرنا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ منجملہ ان کے اس کا ایک یہ عقیدہ تھا کہ وہ اس عالم میں دو طرح کی قوتوں کو مؤثر سمجھتا تھا۔ ایک قوت انقباضی دوسری انبساطی اور ان پر کتنے ہی جنات کو مؤکل جانتا تھا اور ان کے خاص طور کے اجتماعات کو باعث وجود امراض قرار دیتا تھا اور اس بات کا بھی معتقد تھا کہ می کراکوزم کو جس کا ترجمہ عالم صغیر یا انسان کیا جاسکتا ہے۔ می کراکوزم یعنی عالم کبیر یا نیچر سے ایک خاص مشابہت اور مناسبت ہے۔ اس کے معتقدات خواہ کیسے ہی فضول اور لایعنی تھے مگر چونکہ اس نے ان کو بہت عمدگی سے معقولات کے پیرایہ میں بیان کیا تھا اس لئے اس زمانہ کے حکما کو بالضرور ان کی نسبت متوجہ ہونا پڑا' یہاں تک کہ اول کیپ لر نامی ایک حکیم نے اور بعد ازاں گیسنڈی نے اس کی تردید میں سن سولہ سو انیس میں کتابیں لکھیں۔ فقط۔ (ماخوذ از انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا) (س م ح)

(۲۷۷) مترجم کہتا ہے کہ اس مضمون کو ایک شاعر نے اپنے اس شعر میں خوب ادا کیا ہے۔

دریا سے حباب کے ہے سدا تو اور نہیں میں اور نہیں   مجھ کو نہ سمجھ اپنے سے جدا تو اور نہیں میں اور نہیں

(۲۷۸) اس سبب سے کہ اس خط میں ہندوستان کے متعلق کوئی امر درج نہ تھا اس کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ (س م ح)

(۲۷۹) شاہ جہاں نامہ میں لکھا ہے کہ اس کی آبادی شاہ جہاں کے جلوس کے بارہویں سال مطابق ۱۰۴۸ھ اور ۱۶۳۸ء میں شروع ہوئی تھی اور خافی خاں نے اپنی کتاب منتخب اللباب میں لکھا ہے کہ تاریخوں میں سے جو شعرا نے اس کی بابت کہی تھیں بادشاہ کو یہ مادہ پسند آیا (شد شاہ جہاں آباد از شاہ جہان آباد) جس کو صاحب اثار الصنادید اپنی سند پر میر یحیٰی کاشی کا نکالا ہوا بتاتے ہیں۔ (س م ح)

(۲۸۰) صاحب اثار الصنادید نے کتاب "مرأت آفتاب نما" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ۲۴ جلوسی مطابق ۱۰۶۰ھ موافق ۱۶۰۰ء شاہ جہاں کے حکم کے بموجب مٹی اور پتھر سے چار مہینے کے عرصہ میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ ہو کر یہ فصیل تیار ہوئی۔ مگر دوسرے برس برسات میں اکثر جگہ سے گر پڑی اس واسطے از سر نو چونہ اور پتھر سے بنانے کا حکم ہوا اور سات برس کے عرصہ میں چار لاکھ روپیہ خرچ ہو کر یہ فصیل تیار ہو گئی۔ طول اس کا چھ ہزار چھ سو چونسٹھ گز کا ہے اور چار گز کی چوڑی اور نو گز کی اونچی ہے اور اس میں ستائیس برج دس دس گز کے قطر سے ہیں۔ ۱۸۰۳ء میں جب سرکار عالیہ انگریزی کا تسلط ہوا تو یہ اکثر جگہ سے ٹوٹ رہی تھی جس کو بہت خوبی سے دست کرایا گیا۔ اور اجمیری دروازہ کے باہر جو غازی الدین خاں فیروز جنگ پدر نظام الملک آصف جاہ کا مقبرہ تھا جو مدرسہ کر کے مشہور ہے اس کو بھی اندر لے لیا گیا اور قریب ۱۸۱۱ء کے اس کے گرد بھی شہر پناہ بنائی گئی۔ (س م ح)

(۲۸۱) صاحب آثار الصنادید کی تحقیق کے موافق پہلے اس شہر کا نام اندرپت تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس باب میں بڑا اختلاف ہے کہ یہ نام بدل کر کب سے دہلی ہو گیا۔ "مرأت آفتاب نما" میں لکھا ہے کہ "یہ بات مشہور ہے کہ راجہ دلیپ نے جو چندر بنسیوں میں کا ایک راجہ ہے اپنے نام پر دلی آباد کی" لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی اس واسطے کہ ہندوؤں کی اگلی پوتھیوں میں باوجودیکہ راجہ دلیپ کا ذکر ہے مگر کہیں دلی کا نام نہیں ہے بلکہ جہاں لکھا ہے اندرپت ہی کر کے لکھا ہے اور تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ "۳۰۷ ہجری مطابق ۹۱۹ء میں تونوروں کے خاندان میں سے ایک راجہ نے شہر اندرپت کے برابر دہلی شہر بسایا اور اسی مصنف نے کتاب نزہۃ القلوب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ چونکہ وہاں کی زمین نرم تھی اور ہندی میں دہلی نرم زمین کو کہتے ہیں جہاں میخ نہ تھم سکے اس سبب سے وہ بستی دہلی کر کے مشہور ہو گئی مگر اس سنہ میں نہ تونوروں کے خاندان میں حکومت تھی اور نہ اس سبب سے دہلی نام پڑ جانا قرینِ قیاس ہے۔ اس واسطے یہ بات بھی قابلِ اعتماد نہیں اور مشہور بات جو صحیح بھی معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ بقول صاحب "مرأت آفتاب نما" راجہ دہلو قنوج کے راجہ نے اس سبب سے کہ دلی کے راجہ اکثر قنوج کے تابع رہے ہیں اندرپت میں اپنے نام پر شہر بسایا اور جب سے اس کا نام دہلی مشہور ہوا ہے۔ بلکہ اصل نام دہلی کا دہلو ہے جیسا کہ موافق روایت صاحب جواہر الحروف امیر خسرو نے جلال الدین فیروز شاہ کو خطاب کر کے دہلو کا لفظ اپنے اس شعر میں باندھا ہے۔

یایک اسم تخش یازاخور بفرما بارگی یابفرماں دہ کہ گردوں شبنم ودہلو روم
راجہ دہلو راجہ پورس یعنی راجہ فور والی کمایوں کا ہم عصر تھااور اس کی لڑائی میں مارا گیااور
قنوج تک راجہ فور کا عمل ہو گیااور اس کے بعد سکندر اعظم نے راجہ فور پر ستلج کے کنارے
فتح پائی اور گنگا کے کنارے یعنی قنوج تک عمل کر لیا۔ یہ واقعہ ۳۲۸ قبل ولادت مسیح علیہ
السلام میں ہوا کہ تخمیناً یہی زمانہ دہلی شہر بسنے کا معلوم ہوتا ہے۔ (س م ح)

(۲۸۲) شاہ جہاں نے اپنے جلوس کے بارہویں سال مطابق ۱۰۴۸ہجری ۱۶۳۸ء میں
شاہ جہان آباد کی آبادی کا حکم دیااور بارہویں ذی الحجہ کو قلعہ بننا شروع ہوا۔ استاد حامد اور احمد
معمار جو اپنے فن میں یکتا تھے' اس کی تعمیر کے لئے مقرر ہوئے۔ پہلے عزت خاں کو اس کا
اہتمام ملا۔ اور پانچ مہینے دو دن میں قلعہ کی بنیادیں کھدیں اور کچھ مصالحہ جمع ہوااور کہیں
کہیں سے بنیاد اونچی بھی ہو آئی یا پھر الہ وردی خاں کو یہ کام سپرد ہوا اور دو برس ایک مہینے
گیارہ دن میں قلعہ کے سب طرف کی دیوار بارہ بارہ گز اونچی ہو گئی پھر مکرمت خاں کا ذمہ
ہوا اور بیسویں سال جلوس یعنی قریب نو برس کے عرصہ میں سب کام تیار ہو گیا اور
چوبیسویں ربیع الاول ۱۰۵۸ھ ۱۶۴۸ء ہجری مطابق ۱۶۴۸ء یعنی تخت نشینی کے اکیسویں سال میں
بادشاہ نے اس میں پہلا جلوس کیا یہ ہشت پہل بنا ہے اور اس کا طول ایک ہزار گز اور عرض چھ
سو گز کا ہے جس کی کل زمین چھ لاکھ گز ہوئی اور اس حساب سے یہ اکبر آباد کے قلعہ سے دوگنا
ہے اس کی فصیل پچیس گز اونچی ہے اور گیارہ گز گہری بنیاد ہے دیوار کا آثار بنیاد سے پندرہ گز
اور اوپر سے دس گز کا ہے اس کی خندق چوبیس گز چوڑی اور دس گز گہری بنی ہوئی ہے۔ جس
کا محیط تین ہزار چھ سو گز کا ہے اس قلعہ کی تعمیر میں پچاس لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھااور کتاب
"مرأت آفتاب نما" میں لکھا ہے کہ کروڑ روپیہ صرف میں آیا تھا یعنی پچاس لاکھ قلعہ کے
بننے میں اور پچاس لاکھ اس کے اندر کے مکانوں کی تعمیر میں خرچ ہوا تھا۔ (از آثار الصنادید)
(س م ح)

(۲۸۳) ایک بڑے پل کا نام ہے جو شہر پیرس میں ندی پر بنا ہوا ہے۔ (س م ح)

(۲۸۴) غالباً بارہ دری مراد ہے۔ (س م ح)

(۲۸۵) یہ چھوٹے بڑے سات جزیرے ہیں جو شمالی حصہ بحر اٹلانٹک میں واقع ہیں۔ ان کا
عرض شمالی ستائیس سے لے کر چالیس اور انتیس سے لے کر تیس تک اور طول غربی نصف
النہار لندن سے تیرہ سے تیس اور اٹھارہ سے لے کر بیس تک ہے ان کا رقبہ بحساب انگریزی

میل مربع اور آبادی موافق شمار ۱۸۳۵ء حسب ذیل ہے۔

		آبادی	رقبہ
(۱)	جزیرہ ٹے ناریف	پچاسی ہزار	۸۷۷ء۷
(۲)	کناری کلاں	اڑسٹھ ہزار	۷۵۸ء۳
(۳)	پالاما	تینتیس ہزار	۷۱۸ء۵
(۴)	لین زے روٹ	سترہ ہزار چار سو	۳۲۳ء۵
(۵)	فیورٹی وین چورا	تیرہ ہزار آٹھ سو	۳۲۶ء۱
(۶)	گومے را	گیارہ ہزار سات سو	۱۶۹ء۷
(۷)	ہائی رو	چار ہزار چار سو	۸۲ء۲

ان میں سے پانچواں جزیرہ ساحل افریقہ کے سب سے زیادہ قریب ہے اور فاصلہ صرف پچاس اور ساٹھ میل کے اندر ہے۔ان کے سوا اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جو اکثر غیر آباد ہیں! رومیوں کو پہلے پہل شہنشاہ آگسٹس کے زمانہ میں ان کی خبر ہوئی پلوٹارک اور بطلیموس نے بھی اپنے جغرافیوں میں چند سرسبز جزیروں کا ذکر کیا ہے لیکن وہ ایسا نامکمل ہے کہ صاف نہیں معلوم ہوتا کہ وہ جزائرے ڈی راس کا ذکر ہے یا کناری کا یہ سب کے سب بالفعل شاہ سپین کے قبضہ میں ہیں اور لوگوں کی بلند قامتی کے لئے مشہور ہیں آب وہوا عموماً خوشگوار اور خشک اور صحت بخش ہے اپریل سے اکتوبر تک شمالی یا شمال مشرقی ہوا چلتی رہتی ہے اور مشرقی ہوا کے ساتھ کہر پڑنی شروع ہو جاتی ہے مگر جاڑے کے موسم میں کبھی کبھی جنوبی مشرقی بھی ہوا چلتی ہے جو براعظم افریقہ کی طرف سے آتی اور گرم ہوتی ہے اور اس سبب سے بہت خرابیاں پھیلتی ہیں اور بعض اوقات اس کے ساتھ ٹڈی بھی آتی ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ ۱۸۱۲ء میں اس قدر ٹڈی آئی تھی کہ زمین پر چار چار فٹ تہ چڑھ گئی تھی۔ انگور یہاں کثرت سے ہوتا ہے اور سب سے بہتر شراب گوشۂ شمال مغرب کے ساحل پر بنائی جاتی ہے۔(انسائیکلوپیڈیا بریٹیکا) (س م ح)

(۲۸۶) یہ بادشاہی محل جس میں سے پہلا فرانس میں اور دوسرا اسپین میں ہے۔(س م ح)

(۲۸۷) مآثر عالمگیری میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے گیارہویں سال جلوس مطابق ۱۰۷۸ ہجری میں پتھر کے دو پورے قد کے ہاتھی جو نہایت عمدہ صنعت سے بنے ہوئے اور دروازہ قلعہ کے دونوں جانب نصب تھے اور اسی وجہ سے اس دروازہ کو ہتھیاپول کہتے تھے

شریعت کے لحاظ سے انھوادیئے تھے۔ نعمت خان عالی نے اپنی مشہور کتاب وقائع میں انی رائے نامی صیغہ حساب تنخواہ کے ایک عہدہ دار کی ہجو میں پھبتی کے طور پر جو یہ شعر لکھا ہے۔

"آن صورت مہاوت فیلان ہتھیاپول   مارا چہ فیل بند حساب و کتاب کرد"

اس سے بھی ان ہاتھیوں اور ہتھیاپول کا وجود ثابت ہوتا ہے اگرچہ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ہتھیاپول قلعہ شاہ جہان آباد کے کون سے دروازہ کا نام تھا صاحب آثار الصنادید نے ان ہاتھیوں کو نقار خانہ کے دروازہ کے آگے بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اس دروازہ کو اسی سبب سے ہتھیاپول کہتے تھے۔ پس صحیح بات وہی ہے جو ڈاکٹر برنیئر اور مآثر عالمگیری نے اپنی آنکھوں دیکھی ہوئی لکھی ہے۔ (س م ح)

(۲۸۸) صاحب آثار الصنادید نے کتاب "مرأت آفتاب نما" کے حوالہ سے اس نہر کی بابت یہ لکھا ہے کہ اوّل اس کو سلطان جلال الدین فیروز خلجی نے ۶۹۱ ہجری مطابق ۱۲۹۱عیسوی میں پرگنہ خضر آباد میں دریا سے کاٹ کر تمیں کوس تک پرگنہ سفیدوں میں جہاں اس کی شکار گاہ تھی لاکر چھوڑ دیا تھا۔ پھر کسی بادشاہ کو اس کا خیال نہ رہا اور یہ بند ہوگئی۔ ۹۶۹ ہجری مطابق ۱۵۶۱ء میں شہنشاہ اکبر کے عہد میں شہاب الدین احمد خاں صوبہ دار دہلی نے اس کو پھر صاف کرایا اور اپنی جاگیر میں لایا اور نہر شہاب اس کا نام رکھا۔ مگر ایک مدت بعد پھر بند ہوگئی اور ۱۰۴۸ہجری مطابق ۱۶۳۸ء میں شاہ جہاں کے حکم سے سفیدوں تک پھر صاف کی گئی اور وہاں سے آگے شاہ جہان آباد تک نئی کھودی گئی اور جب قلعہ بن چکا تو قلعہ اور شہر میں جاری ہوئی۔ ایک عرصہ بعد اس کا پھر وہی حال ہوگیا تھا جو تخمیناً ۱۸۲۰ء مطابق ۱۲۳۶ ہجری میں سرکار عالیہ انگریزی نے اس کو پھر جاری کیا اور آج تک یعنی جولائی ۱۸۸۵ء مطابق ماہ شوال ۱۳۰۲ ہجری نہایت خوبی اور صفائی سے جاری اور نہر جمن مشرقی کے نام سے معروف ہے۔ (س م ح)

(۲۸۹) میر حسن نے اپنی بے نظیر مثنوی معروف بدر منیر میں کیا خوب کہا ہے۔

سہانی وہ نوبت کی دھیمی صدا   کہیں دور سے کان پڑتی تھی آ

(س م ح)

(۲۹۰) آثار الصنادید میں اس کو نشیمن ظل الٰہی یا تخت سنگین کر کے لکھا ہے اور اس کی کیفیت یوں بیان کی ہے کہ دیوان عام کے مکان کے بیچوں بیچ میں مشرقی دیوار سے ملا ہوا سنگ مرمر کا چار گز کا مربع تخت ہے جس پر چار ستون لگا کر بنگلہ کے طور پر اس کی چھت

بنائی ہے اور قد آدم سے زائد کرسی دی ہے اور اس کے پیچھے جو سنگ مرمر کا سات گز لمبا اور ڈھائی گز چوڑا ایک طاق ہے اس پر ہر قسم کے چرند و پرند کی تصویریں عجب عجب رنگین پتھروں کی بنی ہوئی ہیں اور ایک آدمی کی تصویر ہے جو دوتارا بجا کر گا رہا ہے۔ یہ تصویر ملک اٹلی کے رہنے والے ارفیوس نامی ایک کلاونت کی ہے جس کی کہانی یوں مشہور ہے کہ وہ علم موسیقی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا اور ایسا خوش آواز تھا کہ جب گانے بیٹھتا تو چرند پرند اس کی آواز سے مست ہو کر اس کے گرد آن بیٹھتے تھے اور اس کہانی کے موافق اسی ملک کے رہنے والے رفیل نامی ایک مصور نے جو اس فن میں بے مثل تھا اپنے خیال سے آرفیوس کے گانے کا ایک مرقع کھینچا تھا۔ یہ مصور ۱۵۲۰ء میں مرا مگر اس کا یہ مرقع اٹلی اور یورپی ملکوں میں بہت مروج اور نہایت مشہور ہے اور اب تک اس کی نقلیں موجود ہیں اور یہ وہی مرقع ہے جو پتھر کی پچی کاری میں یہاں بنایا گیا ہے اور جو کہ اس مرقع کا یورپ کے سوا اور کہیں رواج نہیں تھا اس سے یقین پڑتا ہے کہ اس قلعہ کے بنانے میں کوئی نہ کوئی اٹلی کا رہنے والا فرنگی شریک تھا۔ اس طاق کی بغل میں ایک دروازہ ہے اور اندر سے بھی آنے کا راستہ ہے۔ بادشاہ اس تخت پر دربار عام کے دن اجلاس کرتے تھے۔ اس تخت کے آگے ایک تخت سنگ مرمر کا بچھا ہوا ہے۔ امرا میں سے جس کسی کو کچھ عرض کرنا ہوتا تھا اس پر چڑھ کر بادشاہ سے عرض کرتا تھا۔ مگر بادشاہ کے بیٹھنے کا تخت اس قدر اونچا ہے کہ اس تخت کے چڑھنے پر بھی آدمی کا صرف گلا تخت تک پہنچتا ہے۔ اس تخت کے آگے سہ کونہ دالان در دالان ہے جو سرسٹھ گز لمبا اور چوبیس گز چوڑا ہے اور ہر ایک دالان کے نو نو در ہیں اور ان سب کے ستون سنگ سرخ کے ہیں اور ان پر بہت خوبصورت محرابیں بنائی گئی ہیں۔ اور سفیدی گھونٹ کر سنہری نقاشی کی ہے باہر کے دالان میں بیچ کے در چھوڑ کر سنگ مرمر کا کٹہرا لگایا ہے جس پر بہت خوشنما سنہری نقاشی کی ہے۔ باہر کے دالان میں بیچ کے در چھوڑ کر سنگ مرمر کا کٹہرا لگایا ہے جس پر بہت خوشنما سنہری کلسیاں تھیں جو اب ایک بھی باقی نہیں۔ یہ دالان امرا اور وزرا اور وکلا کے حسب مرتبہ کھڑے رہنے کا تھا۔ یہ دربار کا دالان در حقیقت ایک چبوترہ پر بنا ہوا ہے جس کا ایک سو چار گز کا طول اور ساٹھ گز کا عرض ہے اس کے بیچ میں یہ دالان ہے اور باقی تین طرف چبوترہ ہے جس کے گرد قد آدم سنگ سرخ کا کٹہرا لگا ہوا ہے جس پر سنہری کلسیاں تھیں۔ یہ جگہ چوبدار اور نقیب اور احدی وغیرہ لوگوں کے کھڑے رہنے کی تھی اور اس کو گلال باڑی کہتے تھے اور اس کے آگے دو سو چار گز

لمبا اور ایک سو ساٹھ گز چوڑا صحن ہے اور اس کے چاروں طرف قرینہ اور موقع سے مکانات بنے ہوئے ہیں اور شمال کی طرف دیوان خاص میں جانے کا دروازہ ہے۔ (س م ح)

(۲۹۱) خافی خاں اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ چونکہ شاہ جہاں سے پہلے بادشاہوں کے عہد میں دربار عام کے لئے کوئی ایسا بڑا مکان موجود نہ تھا جہاں دھوپ اور بارش سے بچاؤ ہو' اس لئے شاہجہاں نے اپنے جلوس کے پہلے سال میں حکم دیا کہ قلعہ آگرہ اور لاہور اور برہانپور میں دربار عام کے لئے چالیس چالیس ستون کی تین عالی شان عمارتیں بنائی جائیں اور تیار ہونے پر عام و خاص ان کا نام رکھا۔ چنانچہ آگرہ کا عام و خاص جب تیار ہو گیا تو ملک الشعرا طالبائے کلیم نے اس کی تعریف میں یہ رباعی کہی۔

رباعی

ایں تازہ بناکہ عرش ہمسایۂ اوست رفعت حرفے ززینۂ پایۂ اوست
بافیست کہ ہر ستون سبزش سروبست کا سائیش خاص و عام در سایۂ اوست

(۲۹۲) بادشاہ نامہ میں لکھا ہے کہ شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں قلعہ آگرہ میں محل سرا اور دیوان خانہ کے مابین ایک مکان تھا جس میں بادشاہ غسل کیا کرتا تھا اور خاص خاص لوگ اور وزیر اور بخشی بعض ضروری اور اہم معاملات میں وہاں حاضر ہو کر حکم حاصل کیا کرتے تھے۔ شاہ جہاں کے زمانہ میں جو نئی عمارتیں بنائی گئیں تو اگرچہ بادشاہ نے اس مکان کا نام جہاں سلطنت کے نہایت مخفی اور اہم معاملات امرا اور وزرا کے مشورہ سے طے کئے جاتے تھے دولت خانہ خاص رکھا لیکن لوگ اس کو بھی غسل خانہ ہی کہتے رہے اور اس لئے اگر بادشاہ سفر میں بھی ہوتا تھا تو خیام ہی سے ایک خیمہ غسل خانہ کے نام سے نامزد رہتا تھا اگرچہ اس میں دربار خاص ہوتا تھا اور وہ غسل کے کام سے کچھ علاقہ نہ رکھتا تھا۔ (س م ح)

(۲۹۳) آثار الصنادید میں اس برج کا نام برج طلا یا ثمن برج لکھا ہے اور سر سے پاؤں تک سنگ مرمر کا بتایا ہے جس میں سونے کا کام اور پر چین سازی اور منبت کاری کی ہوئی ہے جو کلس سمیت باہر سے بھی سنہری ہے اور ہشت پہلو ہونے کے باعث ثمن برج کہلاتا ہے۔ تین ضلعے اس کے خواب گاہ کی عمارت کی طرف ہیں اور پانچ دریا کی جانب اور پانچوں میں سنگ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں اور ایک نشیمن بطور برآمدے کے دریا کے رخ بنا ہوا ہے۔ (س م ح)

(۲۹۴) ملا عبدالحمید مؤرخ شاہ جہانی نے بادشاہنامہ میں اس تخت کی جو کیفیت بیان کی ہے

دلچسپ سمجھ کر ہم اس کو یہاں بلفظہٖ نقل کرتے ہیں اور وہ یہ ہے۔

''چوں بمرور ایام و کرور اعوام اقسام جواہر ثمینہ کہ ہر یک شائستہ گوشوارہ ناہید و کمر بند خورشید است در جواہر خانہ والا فراہم آمدہ بود۔ در آغاز جلوسِ مقدس بر ضمیر الہام پذیر من طبع گردید کہ از تحصیل چنیں تحف غریبہ نگاہ داشتن ایں نفائس عجیبہ مطمح نظر دوربین جز دولت آرائی و زینت افزائیِ امرے دیگر نیست۔ پس در جائے بکار باید برد کہ ہم تماشائیاں از حسن جہاں افروز ایں نتائج بحر دکاں بہرہ برگیرند و ہم کارگاہ سلطنت را فروغ تازہ پدید آید۔ حکم شد کہ سوائے جواہر خاصہ کہ در جواہر خانہ مشکوے مینو مثال مے باشد از قسم لعل و یاقوت والماس و مروارید قیمتی و زمرد کہ دو صد لک روپیہ قیمت آنست ہرچہ در تحویل خازنان بیرون است از نظر اطہر بگذرانند و جواہر ثمینہ گراں سنگ را کہ پنجاہ ہزار مثقال است و مبلغ ہشتاد و شش لک روپیہ بہائے آن شدہ بود انتخاب نمودہ بہ بے بدل خاں داروغہ زرگر خانہ حوالہ فرمودند تا بیک لک تولہ طلائے ناب کہ دو صد و پنجاہ ہزار مثقال ست و مبلغ چہاردہ لک روپیہ قیمت آن۔ تختے بطول سہ گز و ربع و عرض دو نیم گز و ارتفاع پنج گز سرکاری نمودہ جواہر مذکورہ ترصیع نمایند و مقرر شد کہ سقف آن را از دروں بیشتر میناکار و لختے مرصع و از بیروں بہ لعل و یاقوت و جز آن مرصع مغرق ساختہ بہ زمردیں اساطین دوازدہ گانہ برافرازد و بالائے آن دو پیکر طاؤس مکلل بزواہر جواہر و درمیان ہر دو طاؤس درختے مرصع بہ لعل و الماس و زمرد و مروارید تعبیہ کند و برائے عروج سہ پایہ نردبان مرصع بجواہر آبدار ترتیب دہد۔ در مدت ہفت سال ایں تخت عرش مثال بہ مبلغ صد لک روپیہ کہ سہ صد و سی و سہ ہزار تومان عراق و چہار کرور خانی رائج ماوراء النہر است صورت اتمام یافت۔ از جملہ یازدہ تخت مرصع کہ بر دور آن برائے تکیہ نصب نمودہ اند تختہ میانگی کہ خاقان سلیمان مکان بر آن دست حق پرست گزاشتہ تکیہ زدہ می نشیند دہ لک روپیہ قیمت دارد۔ از جواہر یکہ دریں تختہ نشاندہ اند لعلے است در وسطِ آن بقیمت یک لک روپیہ کہ شاہ عباس والی ایران مصحوب زنیبل بیگ برسمِ ارمغان نزد حضرت جنت مکانی ارسال داشتہ بود و آن حضرت در جلدوے فتح دکن بخاقان ممالک ستان حضرت صاحبقران ثانی بدست علامی افضل خان بہ دکن فرستادہ بودند نخست اسم سامی قطب الملۃ والدین حضرت صاحبقران اول و میرزا شاہ رخ و میرزا الغ بیگ بر آن منقوش بود و بعد از آنکہ بانقلاب ایام و انقضائے اعوام بدست شاہ عباس افتاد او نیز نام خود بر آن ہر قسم گردانید چون حضرت جنت مکانی

رسیدنام نامی خود را بانام سامی پدر بزرگوار بران نگاشتند۔ اکنوں باسم گرامی بادشاہ ہفت اقلیم شہنشاہ تخت و دیہیم آب و تاب تازہ وزیب وزینت بے اندازہ دارد۔ بامر خاقانی این مثنوی حاجی محمد جان قدسی کہ ختمش بر تاریخ است بہ مینائے سبز درون تخت کتابہ نمودہ اند۔

مثنوی

زہے فرخندہ تخت بادشاہی — کہ شد ساماں بتائید الٰہی
فلک روزے کہ میکروش مکمل — زر خورشید رابگداخت اول
تحکم زرکار فرما صرف شد پاک — بہ مینا کاریش مینائے افلاک
جزاین تخت از زر و گوہر چہ مقصود — وجود بحر و کان راحکمت این بود
زیاقوتش کہ درقید بہانیست — لب لعل بتان را دل بجانیست
برائے پایہ اش عمرے کشیدہ — گہر افر بسر خاتم بدیدہ
بحرجش عالم از زر شد چناں پاک — کہ شد از گنج خالی کیسہ خاک
رساند گر فلک خود را بپائش — دہد خورشید و مہ را رو نمائش
سر افرازے کہ سر برپایہ اش سود — زگردوں پایۂ برتخت افزود
خراج بحر و کان پیرایہ او — پناہ عرش و کرسی سایۂ او
زانواعِ جواہر گشتہ الوان — چراغ عالمی ہر دانۂ آن
در اطرافش بود گلہائے مینا — فروزان چوں چراغ از طورِ سینا
چو میکرد از فرازش کوتہی دست — نگین خویش جم بر پایہ اش بست
شب تار از فروغ لعل و گوہر — تواند صد فلک را داد اختر
دہد شاہِ جہان را بوسہ بر پائے — ازان شد پایہِ قدرش فلک سائے
کند شاہِ جہان بخشش جوان بخت — خراج عالمی را خرج یک تخت
خداوندے کہ عرش و کرسی افراخت — تواند قدرتش تختے چنیں ساخت
اثرہا قیست تا کون و مکاں را — بود بر تخت جا شاہجہاں را
بود تختے چنیں ہر روز جالیش — خراج ہفت کشور زیر پائیش
چو تاریخش زباں پرسید از دل — بگفت (اورنگ شاہنشاہ عادل)

دیگرے ایں تاریخ یافتہ۔ ع

"سریرِ ہمایون صاحبقرانی" ۱۰۴۴ھ۔ (س م ح)

(۲۹۵) فارسی میں ایک بڑے خیمہ کو کہتے ہیں۔ (س م ح)

(۲۹۶) پلوٹارک قدیم زمانہ کا ایک مشہور مصنف ہے۔ یہ کر دنیا کا رہنے والا تھا جو یونان کے ضلع لوئیا میں ایک شہر ہے۔ اس کی پیدائش کا زمانہ ٹھیک معلوم نہیں مگر خیال کیا گیا ہے کہ شہنشاہ کلاڈیس رومی کے اخیر زمانۂ سلطنت یعنی اڑتالیس سے لے کر ترپن سنہ عیسوی تک کسی سال میں پیدا ہوا تھا۔ یہ ایک اعلیٰ خاندان میں سے تھا اور اس نے ایمونیس حکیم سے فلسفہ کے دو اصول سیکھے جو نفس ناطقہ اور قوائے عقلی سے متعلق ہیں اور اس میں بڑی شہرت حاصل کی۔ علم اخلاق اور علم رجال میں اس کی بہت سے تصنیفات ہیں اور اس کی عمدگی خیالات اور مہارت علمی اور اس خاص طور کی خوبی کا اثر جو اس کی تمام تحریروں میں پائی جاتی ہے پڑھنے والوں کی زبان تک محدود نہیں رہتا تھا بلکہ دل تک پہنچتا اور گرویدہ کر لیتا تھا۔ اس کی تصنیفات میں سے جس کتاب نے اس کو حیات جاودانی بخشی وہ روم اور یونان کے چھیالیس مشہور و معروف لوگوں کا تذکرہ ہے جس کے بہت سے ترجمے فرانسیسی، انگریزی اور جرمن وغیرہ میں ہوئے ہیں۔ اس کی وفات کا سال بھی معلوم نہیں مگر قیاس کیا گیا ہے کہ شہنشاہ ہیڈرین رومی کے پانچویں سنہ جلوس میں ستر برس کی عمر میں مرا تھا۔ (انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا) (س م ح)

(۲۹۷) اس مسجد کی بنیاد ۱۰ شوال ۱۰۶۰ ہجری مطابق ۱۶۵۰ عیسوی شاہ جہاں کے چوبیسویں سال جلوس میں رکھی گئی تھی اور ہر روز پانچ ہزار راج مزدور بیلدار اور سنگ تراش کام کرتے تھے اور باوجود اس اہتمام کے چھ برس میں دس لاکھ روپیہ خرچ ہو کر تیار ہوئی۔ اس کے تین گنبد ہیں نوے گز طول اور تیس گز کے عرض میں اور اندر کو سات محرابیں ہیں اور باہر صحن کی طرف گیارہ دروازے جن میں سے ایک تو بہت بلند ہے اور پانچ پانچ ادھر ادھر والے ذرا نیچے ہیں اور بڑے دروازہ پر کلمہ "یاہادی" بطور طغرا ' اور باقی دروازوں پر شاہ جہاں کے نام کا کتبہ اور تاریخ تعمیر اور زر مصارف جس کو نور اللہ خوشنویس نے خط نسخ سے لکھا تھا' سنگ موسیٰ کی پچی کاری سے بنا ہوا ہے اور دروازوں کے دونوں طرف نہایت بلند اور خوشنما مینار ہیں جن میں اوپر جانے کے لئے زینے اور سروں پر بارہ دری کی برجیاں بہت دل کشا بنی ہوئی ہیں۔ شمالی مینارہ بجلی کے صدمہ سے گر پڑا تھا اور عمارت اور صحن کا فرش بھی جو تمام سنگ سرخ کا ہے جا بجا سے بگڑ گیا تھا مگر سرکار عالیہ انگریزی نے ۱۲۳۳ ہجری مطابق ۱۸۱۷ء میں اس مینار کو بنوا دیا اور فرش بھی درست کرا دیا۔ اس مسجد

میں چونکہ کوئی مکبّر بنا ہوا نہ تھا اور اس وجہ سے امام کی آوازِ تکبیر سب نمازیوں کو نہیں پہنچ سکتی تھی اس واسطے شاہزادہ میرزا سلیم ابن معین الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ نے ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۹ء میں بڑے دروازہ کے بیچ میں ایک مکبّر سنگ باسی کا بہت خوشنما ہوا دیا ہے۔ مسجد کے اندر تمام فرش سنگ مرمر کا ہے اور اس میں سنگ موسیٰ کی پچی کاری سے مصلے بنا دیئے ہیں۔ منبر بھی سنگ مرمر کا بہت خوش قطع بنا ہوا ہے۔ جانب شمال کے دالان میں کچھ تبرکات اجناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے رکھے ہیں اور وہ مقام درگاہ آثار شریف کہلاتا ہے۔ مسجد کا صحن ایک سو چھتیس گز کے عرض و طول سے اور اس کے بیچ میں پندرہ اور بارہ گز کا نرے سنگِ مرمر کا حوض ہے جس میں فوارہ لگا ہوا ہے۔ صحن کے چاروں طرف بڑے بڑے دالان اور حجرے اور مکانات بنے ہوئے ہیں اور چاروں کونوں پر بارہ دری کے چار برج ہیں۔ جنوبی اور مشرقی دالان کے سامنے دائرہ ہندسی نماز کا وقت دیکھنے کو بنا ہوا ہے اور مسجد کے تینوں دروازوں پر برنجی کواڑ چڑھے ہوئے ہیں۔ جنوبی دروازہ میں رہنے کے لائق حجرے بنے ہوئے ہیں اور ۳۳ سیڑھیاں ہیں جن پر تیسرے پہر کو مجمع عام ہوتا ہے اور بساطی اور فالودہ والے اور کبابی اور اصیل مرغ بیچنے والے اور شوقین جوان انڈے لڑانے والے آن کر جمع ہوتے ہیں۔ شمالی دروازہ پر بھی رہنے کے حجرے بنے ہوئے ہیں اور اس طرف انتالیس سیڑھیاں ہیں۔ اگرچہ اس طرف بھی کبابی بیٹھتے اور سودے والے دکانیں لگاتے ہیں لیکن بڑا تماشا اس طرف مداریوں اور قصہ خوانوں کا ہوتا ہے۔ قصہ خوان مونڈھا بچھا کر بیٹھتا ہے اور "داستان امیر حمزہ" یا "قصہ حاتم طائی" اور کہیں "داستان بوستان خیال" سناتا ہے جس کے سننے کو سینکڑوں آدمی جمع ہوتے ہیں۔ ایک طرف مداری تماشا کرتا ہے اور بھان متی کا کھیل ہوتا ہے اور بوڑھے کو جوان اور جوان کو بوڑھا بناتا ہے۔ مشرقی دروازہ پر بھی مکانات بنے ہوئے ہیں اور اس کے آگے پینتیس سیڑھیاں ہیں جن پر ہر روز گزری لگتی ہے جو گویا ہر روز کا میلہ ہے۔ بزاز طرح طرح کے کپڑے الگنیوں پر ڈالتے ہیں اور شوقین جوان طرح طرح کے خوش آواز جانور پنجروں میں لئے ہوئے سیر کرتے پھرتے ہیں۔ ایک طرف کبوتر والے کبوتر بیچتے ہیں ' ایک جانب گھوڑے والے گھوڑے لئے کھڑے ہیں۔ (آثار الصنادید) (س م ح)

(۲۹۸) مصنف کا مقصود غالباً دہرا ہے جس کو ہندوستان کے مشہور راجہ پرتھی راج عرف رائے پتھورا نے ۱۲۰۰ بکرماجیتی مطابق ۱۱۴۳ء اور ۵۳۸ھ میں اپنے قلعہ کے

ساتھ ہوا یا تھا اور ۵۸۷ھ مطابق ۱۱۹۱ء اور موافق ۱۲۴۸ بکرماجیتی میں معزالدین بن سام عرف شہاب الدین غوری کے سپہ سالار قطب الدین ایبک نے جو آخر کار دہلی کا بادشاہ ہوا اور سلطان قطب الدین کہلایا جب دہلی کو فتح کیا تو اس کو مسجد بنادیا اور مشرقی دروازہ پر فتح کی تاریخ اور اپنے نام کا کتبہ کھدوایا مگر کوئی ایسے حروف جن کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے اس پر کہیں کندہ نہیں ہیں۔ البتہ اس کے صحن میں ایک لاٹھ ہے جو سر سے پاؤں تک لوہے کی ڈھلی ہوئی ہے اور جو زمین پر سے بائیس فٹ چھ انچ بلند اور جس کی جڑ کی موٹائی کا محیط پانچ فٹ تین انچ ہے اور اس کی نسبت یہ کہانی مشہور ہے جو بالکل غلط ہے کہ رائے پتھورا کے وقت میں پنڈتوں نے اس کو باسک ناگ کے سر پر اس غرض سے گاڑا تھا کہ رائے پتھورا کے خاندان کی عملداری کبھی نہ ٹلے۔ اس پر سنسکرت زبان اور ناگری حروف میں تین اشلوک کندہ ہیں جن کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ سندھ کے راجہ نے راجہ ڈھاوا سے لڑنے کو فوج جمع کی تھی۔ بعد لڑائی کے راجہ ڈھاوا نے فتح پائی اور یہ لاٹھ بطور یادگار اپنی فتح کے بنائی مگر اس کے بننے سے پہلے مر گیا۔ صاحب آثار الصنادید لکھتے ہیں کہ جیمس پرنسب صاحب نے لکھا ہے کہ اس راجہ کا اور کچھ حال معلوم نہیں ہوا بجز اس کے کہ ہستناپور کے راجاؤں میں کا ایک راجہ ہے اور اس قسم کے ناگری حروف تیسری یا چوتھی صدی عیسوی میں جاری تھے اور اس سبب سے انہوں نے خیال کیا ہے کہ یہ لاٹھ پانچویں صدی سے بہت ورے بلکہ آٹھویں صدی میں بنی تھی مگر ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے کیونکہ راجاؤں کی تاریخ ۶۷ عیسوی سے مسلمانوں کی عملداری ہونے تک بصحت تمام ملتی ہے اور ان تاریخوں میں اس راجہ کا ذکر نہیں ہے۔ علاوہ اس کے اس لاٹھ پر سمت کندہ نہ ہونے سے یقین پڑتا ہے کہ بکرماجیت سے پہلے کی ہے کیونکہ بکرماجیت سے پیچھے سمت لکھنے کا اور کوئی نہ کوئی سنہ مقرر کرنے کا بالکل رواج ہو گیا تھا۔ اس کے سوا اس زمانہ میں ہستناپور کے راجاؤں کا راج بالکل جاتا رہا تھا۔ ان دلیلوں سے ہمارے نزدیک یہ لاٹھ راجہ میدھاوی عرف راجہ دھاوا کی بنائی ہوئی ہے۔ جو راجہ یدھشٹر کی اولاد میں سے انیسواں راجہ ہے اور اگرچہ یہ راجہ اندرپت میں آ بسے تھے الاقدیم تخت گاہ ان کا ہستناپور ہی تھا اور اسی سبب سے ہستناپور کے راجہ کہلاتے تھے۔ مذہب اس راجہ کا بشنوی تھا اور اس لاٹھ کے کتبہ سے بھی یہی مذہب معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ کی مروجہ کتابوں سے ظاہر ہے کہ راجہ میدھاوی ایک ہزار نو سو پانچ برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام مسند نشین ہوا الا انگریزی مؤرخوں نے جو صحیح حساب

راجہ یدھشٹر کی مسند نشینی کا نکالا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ راجہ آٹھ سو بچانوے سال قبل حضرت مسیح علیہ السلام مسند نشین ہوا تھا اور اس سبب سے ہماری رائے میں یہ لاٹھ نویں صدی میں قبل حضرت مسیح علیہ السلام بننی الا ناتمام پڑی رہی اور ایک مدت بعد کسی راجہ نے راجہ دھاوا کا فتح نامہ جس مقصد سے اس راجہ نے اس کو بنایا تھا کھدوا کر لاٹھ کو نصب کر دیا اور کچھ عجب نہیں کہ یہ بات تیسری یا چوتھی صدی عیسوی میں ہوئی ہو جب رائے پتھورا نے اس لاٹھ کے قریب قلعہ اور مندر بنایا تب یہ لاٹھ مندر کے صحن میں اور جب اس کو توڑ کر قطب الدین ایبک نے مسجد بنایا تب مسجد کے صحن میں آ گئی۔ چنانچہ اب تک وہیں موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر برنیئر نے غالباً اسی لاٹھ کے حروف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (س م ح)

(۲۹۹) اس لفظ کی تحقیق کتاب کے اس مقام میں جہاں کشمیر کے باغ شالامار کا ذکر ہے کی گئی ہے۔

(۳۰۰) یہ سڑک شہنشاہ جہانگیر نے اپنے جلوس کے چودھویں سال مطابق ۱۰۲۸ ہجری میں اکبر آباد سے لاہور تک بنوائی تھی۔ چنانچہ اس کے بعض بعض منارے اب تک بھی کہیں کہیں موجود اور قائم ہیں۔ (س م ح)

(۳۰۱) یہ صحیح نہیں ہے بلکہ اکبر اور جہانگیر کے وقت تک آگرہ ہی کہلاتا تھا اور موافق روایت صاحب "بادشاہ نامہ" شاہ جہاں نے اپنے جلوس کے پہلے دن یہ نام جو بے معنی تھا بدل کر اکبر آباد نام رکھا تھا۔ چنانچہ اسی روز سے اکبر آباد ہی مشہور ہے۔ (س م ح)

(۳۰۲) لاطینی زبان میں اسمفی بیضوی شکل کو کہتے ہیں۔ پس چونکہ یہ تھیٹر یعنی تماشا خانے بیضوی شکل کے بنائے جاتے تھے تاکہ لوگ ارد گرد بیٹھ کر آسانی کے ساتھ قریب سے تماشا دیکھ سکیں اس لئے ان کا نام اسمفی تھیٹر پڑ گیا تھا۔ سب سے بڑا تھیٹر جس کا نام "کالی سی ایم" ہے اور جس کو بنے ہوئے بہت عرصہ ہوا مگر مصالحہ کی خوبی کی وجہ سے ایسا ہے کہ اس کو کھنڈر کہنا مشکل ہے بلکہ اب تک بھی شہر روم کی نہایت عالیشان عمارات میں سے ہے اس وادی میں بنا ہوا ہے جو شہر روم کی سات پہاڑیوں کے بیچ میں ہے۔ یہ عمارت زینوں کی طرح اس لئے درجہ بدرجہ بنی ہوئی ہے کہ تماشائی اپنے اپنے رتبہ کے موافق اپنی اپنی جگہ کہ جو ان کے لئے مخصوص تھی بیٹھ کر تماشا دیکھ سکیں۔ چنانچہ سب سے اول درجہ کے چبوترہ پر شہنشاہ تخت پر اور ممبران سینیٹ اور بڑے بڑے مجسٹریٹ اور وہ مقدس کنواری

عورتیں جو معبدوں کی خدمت پر متعین رہتی تھیں' سونے چاندی اور ہاتھی دانت کی کرسیوں پر بیٹھتی تھیں اور ان سے پیچھے کے چبوترہ پر وہ بہادر اور نامدار سپاہی بیٹھتے تھے جن کو نائٹ کہتے تھے اور ان کے بعد عام لوگوں کی نشست تھی اور سب سے اوپر اور اخیر کے چبوترہ پر عام شریف زادیاں جو تماشا کرنے والوں کے برہنہ ہونے کی وجہ سے قریب سے دیکھنا پسند نہ کرتی تھیں' بیٹھتی تھیں۔ غرض اسی طرح ملاح اور کلوں کے چلانے والے اور تماشا خانہ کے اور اہل خدمت اس کے دونوں دروازوں کی چھتوں پر بیٹھتے تھے۔ اس عمارت کا عظم و شان اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ جب کبھی یہ تماشائیوں سے بالکل بھری ہوئی ہوتی تھی تو ستاسی ہزار سے کم بیٹھنے والے نہ ہوتے تھے۔ اس عمارت کے بیچ کا میدان ''ارینا'' کہلاتا تھا کیونکہ خون کی بدبو روکنے کی غرض سے اس میں ابتدائی زمانہ میں ارینا یعنی ریت بچھائی جاتی تھی مگر پھر یہاں تک تکلف بڑھ گیا کہ ریت کے عوض مختلف دھاتوں کا برادہ اور شنگرف بلکہ پسے ہوئے جواہرات کی تہہ بچھانے لگے۔ لیکن ایک ملائم قسم کے سفید پتھر کا چورا بچھایا جانا' جس سے ''ارینا'' کی سطح برف کی سی معلوم ہونے لگتی تھی زیادہ پر لطف خیال کیا جاتا تھا اور چھت نہ ہونے کی وجہ سے جب اس پر ارغوانی رنگ کا ایک بڑا ریشمی زری کار شامیانہ تانا جاتا تھا تو اس میں سے دھوپ کی شعاع جو ''ارینا'' کی سفید اور شفاف سطح اور رومی عہدہ داروں کے سفید چغوں پر پڑتی تھی تو نہایت ہی کیفیت دکھاتی تھی۔ ارینا کے گرداگرد پانی کی نہر بنی ہوئی تھی جس میں سے پانی چھوڑ کر ارینا میں تماشا کرنے کے لئے جہاز لے آتے تھے۔ یہ تماشا خانے رومیوں کی سلطنتِ جمہوری کے اخیر زمانہ کی ایجاد تھے اور چونکہ قدیم اہلِ روم ہر قسم کے خوں ریز اور خوفناک تماشوں کے دیکھنے کے بے اعتدالی کے ساتھ شائق تھے' اس لئے ان کے حکام اس شوق کو اس جنگی جوش کے ترقی دینے کی غرض سے جس نے ان کو دنیا کا مالک بنایا ہوا تھا' جاری رکھتے تھے۔ سب سے پہلا تماشا دو سو ساٹھ برس قبل مسیح علیہ السلام شہر روم میں ہوا تھا اور ۵۲ ء میں جبکہ رومیوں نے کارتھج والوں پر فتح پائی اور ان کو وہاں کی لوٹ میں ہاتھی بھی آئے تو وہ بھی اس تماشا خانہ میں داخل کئے گئے اور اس طرح سے ان میں وحشی حیوانات کے داخل کئے جانے کی ابتدا ہوئی اور رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جانوروں کے باہم لڑانے ہی پر منحصر نہ رہا بلکہ ملک میں لوگوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جن کا یہ پیشہ تھا کہ انعام حاصل کرنے کی غرض سے باہم ہتھیاروں سے لڑتے اور ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے۔ یہ لوگ گلیڈی ایٹر کہلاتے تھے اور

ان کے ساتھ وہ تمام خونخوار درندے بھی شامل کیے جاتے تھے جو تماشے کی رونق بڑھانے کے لئے افریقہ اور ایشیا کے جنگلوں سے پکڑے آتے تھے۔ قیصر جولیس اور پامپی کے زمانہ میں یہ وحشیانہ اور خوفناک تماشے قابلِ حیرت کثرت سے کئے جاتے تھے۔ تماشائی لوگ اکثر اس غرض سے اوّل وقت پر آتے تھے کہ بڑے بڑے اراکین سلطنت کو آتا ہوا دیکھیں جن کے آنے پر تحسین یا نفرین کا نعرہ بلند ہوتا تھا جو ان کے افعال کی عام پسندی یا ناپسندی پر موقوف تھا اور جب شہنشاہ آتا تو لوگ یہ فقرہ کہہ کر چلاتے کہ "اے سب کے مالک اور سب سے اعلیٰ اور سب سے خوش حال' تیرے لئے خوشی اور فتح ہمیشہ ہو"۔ جب بادشاہ آن کر بیٹھ جاتا تو طرح طرح کے تماشے ہونے لگتے۔ چنانچہ کبھی نہر میں سے ارینا میں پانی چھوڑ دیا جاتا اور ایک جہاز آتا اور تباہ ہو کر اس میں سے ایک غول عجیب و غریب جانوروں کا نکل پڑتا۔ بعض اوقات زمین پھٹ کر درخت نکلتے اور ان پر سنہری میوے لگے ہوئے ہوتے' کبھی آرفیوس کلانوت کا پرانا عشقیہ قصہ بطور اصل کے دکھایا جاتا اور یہ درخت اس خوش آواز عاشق کے راگ اور دوتارے کے ساتھ ساتھ چلتے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ تماشے کے مکمل کرنے کے لئے آرفیوس کی طرح آخر میں سچ مچ اس شخص کو جو آرفیوس بنتا تھا' ریچھوں سے پھڑوا دیا جاتا تھا اور اس کے بعد خونخوار اور اشتعال پسند رومی ارینا کے دروازے کھول دیتے اور قسم قسم کے وحشی درندے چاروں طرف سے باہم لڑنے اور ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کے لئے چھوڑ دیئے جاتے اور لوگ نہایت بے رحمانہ شوق کے ساتھ ان کی حملوں اور بچاؤ کے طریقوں پر غور کرتے اور بے درد رومی ان غریب حیوانات کے چیخنے اور شور و غل مچانے پر ترس کھانے کی جگہ نہایت خوش ہوتے اور اگر کبھی اتفاق سے کوئی جانور سب پر غالب آجاتا اور سب کا خاتمہ کر دیتا تو چاروں طرف سے انعام کے طور پر یہ صدا بلند ہوتی کہ اس بہادر کو چھوڑ دو تاکہ اپنے وطن میں آرام سے رہے۔ یہ لوگ اسی پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ان جانوروں سے انسان لڑائے جاتے تھے جو کوئی زرہ پہنے اور کوئی شکاری وضع میں ہوتا تھا اور بعض صرف خالی ہاتھ ہی اپنی پھرتی اور چالاکی سے حریف پر غالب آتے تھے۔ لیکن اس پر بھی اس وحشت کا خاتمہ نہ تھا بلکہ اہلِ روم انسان کو مرتا دیکھنا چاہتے تھے اور اس غرض سے گنہگار لوگ اور بے چارے عیسائی مذہب کے آدمی ان درندوں کا شکار کرائے جاتے تھے۔ اس کے بعد لاشیں اٹھوا دی جاتی تھیں اور تمام ارینا میں وہ جواہرات اور سفید پتھر کا چورا جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے خون کی بدبو رفع کرنے کے لئے بچھا دیا جاتا تھا اور سب سے عمدہ تماشے

کی نوبت آتی تھی یعنی گلیڈی ایٹروں کی لڑائی شروع ہوتی تھی، جن میں سے کسی کے پاس تلوار اور کسی کے ہاتھ میں نیزہ اور کوئی ہلکی اور کوئی بھاری زرہ پہنے ہوئے، کوئی گاڑی میں کوئی پیدل، کوئی گھوڑے پر سوار آتا تھا اور ارینا میں داخل ہو کر سب کے سب ہم آواز شہنشاہ کو یوں سلام کرتے تھے "مرحبا قیصر! مرنے والے تجھ کو سلام کرتے ہیں"۔ ان پیشہ وروں میں بعض عام لوگ بھی اپنی خوشی سے شامل ہو کر کچھ روپے لے کر لڑتے تھے جن میں سے کبھی کوئی بچ بھی جاتا تھا مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا کیونکہ رومی مغلوب پر رحم کرنا نہ جانتے تھے۔ یہ لوگ کبھی ایک ایک، کبھی اکٹھے ہو کر لڑتے اور جب کوئی اپنے حریف کو زخمی کرتا تو تماشائیوں کی طرف دیکھ کر کہتا "اس کے کاری زخم لگا" اور اس کو مار ڈالنے یا چھوڑ دینے کی اجازت چاہتا۔ چنانچہ تماشائی اپنا انگوٹھا اگر اوپر کو اٹھاتے تو چھوڑ دینے کا اور اگر نیچے کو کرتے تو مار ڈالنے کا اشارہ سمجھا جاتا اور بیچارہ مغلوب اگر اپنی گردن زخم اخیر کے لئے پیش کرنے میں تامل کرتا تو لعن طعن کا شور بلند ہوتا اور لوگ پکار کر کہتے کہ "لوہا حاصل کرو" یعنی لوہے کے ہتھیار کے سامنے جاؤ اور مقدس کنواریاں اور رحم دل مائیں اور سینیٹ کے دانا ممبر اس کو ایک کھیل سمجھتے تھے اور کسی کو بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ یہ کیا حرکت کی جاتی ہے۔ مگر ۴۰۳ مسیحی میں عیسائی مذہب کے ایک درویش کی برکت سے یہ وحشیانہ اور برے کھیل موقوف ہوئے۔ اگرچہ اس بے چارہ کی جان اس میں گئی یعنی وہ عین تماشہ کے وقت ارینا میں آ گھسا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا کہ "اس طرح خون بہانے سے باز آؤ اور جس خدا نے تم کو تمہارے دشمنوں پر غالب کیا ہے اس کے رحم کا عوض کشت و خون کے تماشوں کے رواج دینے سے مت کرو"۔ جس پر چاروں طرف سے غل ہوا کہ یہ وعظ کی جگہ نہیں بڈھے! پیچھے ہٹ جا اور گلیڈی ایٹروں نے دھکے دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا مگر وہ بہادر اور با استقلال شخص پھر ان کے بیچ میں آ گیا اور لڑنے سے روکنے لگا جس پر "بغاوت بغاوت" کا شور مچا اور حاکم نے بھی اپنی آواز اس میں شامل کی اور گلیڈی ایٹروں نے اس بے چارے کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور چاروں طرف سے اینٹ پتھر اور جو کچھ ملا لوگوں نے اس مظلوم پر برسایا۔ لیکن اس عجیب واقعہ کے بعد لوگوں کو یہ خیال آیا کہ یہ کیا حرکت کی گئی اور سب کے دل بدل گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ فی الحقیقت بڑی بے رحمی اور گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس روز کے بعد یہ تماشا پھر کبھی نہ ہوا۔ (ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا و کتاب گولڈن ڈیڈس) (س م ح)

(۳۰۳) ملک اٹلی کے ایک شہر کا نام ہے۔ (س م ح)

(۳۰۴) ولایت میں ایسے چکنے پتھر کو مرمر (ماربل) اور تعبیر باعتبارِ رنگ کر لیتے ہیں' جیسے مرمر سفید اور مرمر سیاہ اور مرمر سرخ' جس کو ہم سنگِ مرمر اور سنگِ موسیٰ وغیرہ بولتے ہیں۔ (س م ح)

(۳۰۵) پارٹیر کے لغوی معنی ہموار اور مسطح زمین کے ہیں مگر اصطلاح میں اس قسم کی چمن بندی کو کہتے ہیں جو طرح طرح کی چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنا کر امتیاز کے لئے ان کے ادھر ادھر سبز گھاس وغیرہ جما دی جاتی ہے جس کے عوض یورپ میں باکس جوڈوڈینیا کی طرح کی ایک بوٹی ہے لگاتے ہیں اور اس کو تراش کر کیاریوں کے ارد گرد مختلف شکل کے حاشئے اور جدولیں بناتے ہیں۔ (س م ح)

(۳۰۶) شہر پیرس کے ایک گرجا کا نام ہے۔ (س م ح)

(۳۰۷) یہ بے نظیر و عجیب و غریب عمارت شاہ جہاں کے پانچویں سال جلوس کی ابتدا میں بننی شروع ہوئی تھی اور سولہویں سال جلوس مطابق ۱۰۵۲ ہجری میں بن کر ختم ہوئی۔ بادشاہ نامہ میں لکھا ہے کہ پچاس لاکھ روپیہ اس پر خرچ ہوا۔ اس کی مرمت اور خدام کی تنخواہ اور بیگم کے ختم و فاتحہ کے خرچ کے لئے ایک لاکھ روپیہ سال کی آمدنی کے دیہات اور دو لاکھ روپیہ سال کی آمدنی کی دکانیں اور سرائیں جو اس کے آس پاس بنائی گئی تھیں اور جن سے مل جل کر یہ ایک اچھا شہر بس گیا تھا اور جس کا نام ممتاز آباد رکھا گیا تھا' بادشاہ نے وقف کر دی تھیں۔ (س م ح)